Young in Spirit and Appearance at 40
ڈرائیونگ موڈ
چالیس سال کی عمر میں آپ دیکھنے میں
جوان اور چلنے پھرنے میں پھرتیلی ہیں اور موٹر
بھی چلاتی ہیں۔ یہ حاذق نروائن پلز
(حب خاص) کے اثر کا نتیجہ ہے۔
KAP 12321
چالیس سال کے بعد عورت اپنے جسم میں ایک قدرتی اور فطری تبدیلی محسوس کرتی ہے جس کی وجہ سے دوران سر
بے خوابی، دھڑکن، جسم میں موٹاپا اور بدن میں سستی پیدا ہوجاتی ہے۔ اس کو اپنی جوانی ڈھلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے یہ سب
عصبی کمزوری کی نشانیاں ہیں جو بڑھتی ہوئی عمر کا فطری تقاضا ہیں۔ اور اس کا بہترین علاج حاذق نروائن پلز (حب خاص)
کا متواتر اور مسلسل استعمال ہے۔
سونا، فولاد، مشک، عنبر اور مروارید جیسے قیمتی اجزا کا یہ بے نظیر مرکب، جدید طبی اصولوں کے مطابق تیار کیا گیا ہے اور
صحیح عصبی خوراک اور عصبی ٹانک ہے۔ حکماء نے اسے سراہا ہے اور اپنے نسخوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اس کے متواتر استعمال
سے آپ چالیس سال کے بعد بھی جوان نظر آئیں گی اور جسم میں جوانی کا سا پھرتیلا پن محسوس کریں گی۔
80 گولی ۔ بینک کی قیمت 7/ روپیہ (علاوہ محصول ڈاک) ہے جو 40 یوم کی خوراک ہے اور سال بھر تک آپ کی طاقت اور قوت کو
بحال رکھنے کے لئے کافی ہے۔
نمونے کے لئے 20 گولی اور 40 گولی کا پیکنگ بھی مل سکتا ہے جس کی قیمت 2/ روپیہ اور 3/12 بالترتیب ہے۔
آپ کے شہر کے بڑے بڑے دوا فروشوں سے مل سکتی ہیں۔ یا براہ راست
حاذق دواخانہ۔ بندر روڈ۔ کراچی سے طلب کیجئے
مستند اور قابل اعتماد
یونانی مجربات کا ٹریڈ مارک
حاذق
نوٹ: مکمل فہرست ادویہ حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی نمبر 1 سے مفت طلب کیجئے!
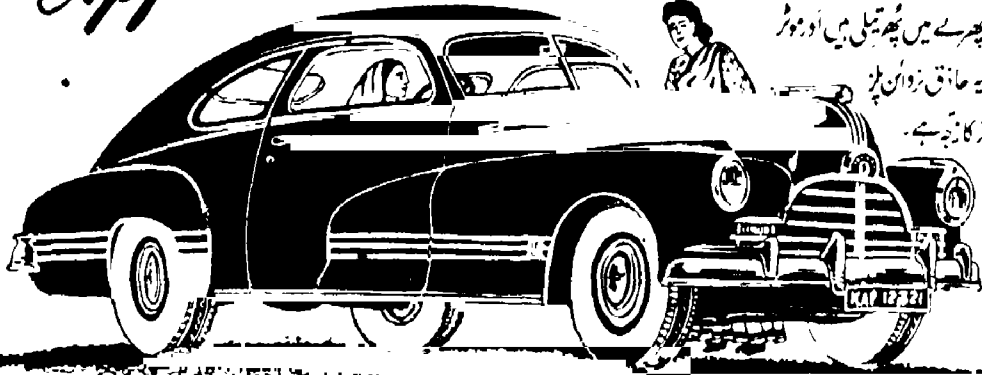
ارشد کاظمی •

اپوا کانفرنس!

لاہور کی رنگین سو دل آویز فضا میں!

• اپوا کے نظارے، کرتے ہیں اشارے
کھول آنکھ ذرا دیکھ اے شیر نیستاں
اللہ کے بندے۔ ملت کے نگہباں
اے مرد مسلماں

• ابرو کی کٹاریں، انداز کے بھالے
ہے کس میں یہ طاقت، جو دل کو سنبھالے
ہر چیز یہاں پر حیران و پریشاں
اے مرد مسلماں

• چھلکے ہوئے ساغر، مخمور ستارے
اس پاک زمیں پر، گردوں نے اتارے
میخانے سے بڑھ کر۔ نعمت خانۂ نسواں
اے مرد مسلماں

• یہ بھی تو ذرا سوچ، ہے کس کی کرامات؟
وہ رند سیہ کار، جو دن کو کہیں رات
ہیں قلب میں جن کے مچلے ہوئے ارماں
اے مرد مسلماں

• پیچیدہ مسائل، افکار کے بندھن
گفتار کی مستی، کردار کا مدفن
شیدائی محفل، پردے سے گریزاں
اے مرد مسلماں

• اسلام کا دعویٰ، شیطاں کے پجاری
قرآں کے مفسر، باطل کے حواری
عورت کے محافظ، اپوا کے نگہباں
اے مرد مسلماں

• یہ طرز تخاطب، یہ حُسنِ تکلّم!
پھولوں کی ادائیں، غنچوں کا تبسّم
بے باک نگاہیں، اور کاکل پیچاں
اے مرد مسلماں

• اسلاف نے تیرے، خیبر کو اکھاڑا
مرحب کو گرایا، باطل کو لتاڑا
اب توڑ یہ افسوں، غارت گرِ سلطاں
اے مرد مسلماں

بشکریہ تسنیم

پاکیزہ ادب اور صحیح اسلامی مشورے لئے ہوئے

ماہنامہ مُشیر کراچی

فہرست مضامین ـــــــ مئی سنہ ۱۹۵۲ء

35660

جلد ـــــــــ ۳

شمارہ ـــــــ ۵

مرتبہ :- عبدالغفور بیگ

بدل اشتراک :-

پاکستان :- سالانہ ، تین روپے
" فی پرچہ ، چھ آنے

بھارت :- سالانہ ، ساڑھے چار روپے
" فی پرچہ ، آٹھ آنے

(پرنٹر پبلشر عبدالغفور بیگ نے مشہور آفسٹ لیتھو پریس میں چھپوا کر دفتر رسالہ مشیر بندر روڈ کراچی نمبر ۲ سے شائع کیا) کتبہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"اپوا"

اپوا (APWA) آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن کا مخفف ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سارے پاکستان کی عورتوں کی انجمن ہے یہ انجمن ۱۹۴۹ء میں بیگم لیاقت علی خاں کی سرپرستی میں قائم ہوئی تھی اور پاکستان کی خواتین کی فلاح و ترقی، ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا، ان کی صحت کا خیال رکھنا، ان کے اندر اتحاد و یکجہتی پیدا کرنا، اور ان کو سوشل سروس کی تربیت دینا اس کے مقاصد قرار دیئے گئے تھے ظاہر ہے کہ مقاصد نہایت بلند اور پاکیزہ ہیں جن سے کسی بھی پاکستانی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ لیکن آج کی صحبت میں دیکھنا یہ ہے کہ ان پاکیزہ مقاصد کو حاصل کرنے کیلئے آج تک اس انجمن نے کیا کیا کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں۔

اپوا کی گزشتہ سہ سالہ ملی خدمات کا اگر غیر جانبدارانہ جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ انجمن نہ عوام کی جماعت ہے اور نہ عوام کیلئے ہے اور نہ ہی پاکستان کی عام عورتوں کو اس کی سرگرمیوں اور خدمتِ خلق کے کاموں میں حصہ لینے کا موقع دیا گیا ہے یہ انجمن محض سرکاری افسروں کی بیگمات کی ایک مخصوص جماعت بن کر رہ گئی ہے اس کے عہدوں پر صرف وزیروں، کمشنروں، ڈپٹی کمشنروں اور دوسرے سرکاری اعلیٰ عہدے داروں کی بیگمات کا قبضہ ہے اور گو اسے اس سرکاری سرپرستی کی وجہ سے ایک عام شہرت حاصل ہو گئی ہے مگر جہاں تک ملک کی عملی خدمت کا تعلق ہے" اپوا نے غربا اور مفلوک الحال لوگوں کی خدمت کی بجائے پاکستانی عورتوں میں مغربی تہذیب و تمدن کو فروغ دینے اور ملک میں بے حجابی و بے حیائی، نیم عریانی و زینت آرائی، نمائش جمال اور مرد و عورت کے بے محابا اختلاط کی طرح ڈالنے کے سوا کوئی مفید اور تعمیری کام آج تک نہیں کیا۔ بڑے بڑے ارباب حکومت کی بیگمات اس میں شریک ہیں۔ تقریباً سب بڑے شہروں میں اسکی شاخیں قائم ہیں۔ ۱۸۰۰ کے قریب اس کے ارکان ہیں اور اسکی زیادہ تر سرگرمیوں کا طور یہ ہے کہ کھاتے پیتے اور تعلیم یافتہ گھرانوں کو مغربی زندگی سے روشناس کیا جائے۔ سب سے پہلے ان گھرانوں کی خواتین کا پردہ اتارا جائے ان کو زیادہ سے زیادہ بے حجاب اور آزاد منش بنایا جائے اور اس کے بعد ان کو رقص و سرود اور دوسری تفریحی سرگرمیوں میں مشغول کیا جائے تاکہ پاکستان کی عورتیں بھی یورپ اور امریکہ کی عورتوں کے مرتبے کو پہنچ جائیں۔ اپوا آج تک اسی بنیادی حکمت کے مطابق کام کر رہی ہے۔

گزشتہ ماہ اس انجمن کا سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہوا جسے 'اپوا کانفرنس' کے نام سے موسوم کیا گیا اور جس کی پانچ روزہ کارروائیوں کا تفصیلی جائزہ لینے سے ہمارے مندرجہ بالا خیالات کی حرف بحرف تائید ہوتی ہے" اپوا کانفرنس' کی دو اہم خصوصیات یہ تھیں کہ ایک تو اس میں دیگر اسلامی ممالک کی نمائندہ خواتین بھی شریک ہوئیں اور دوسرے اس کا افتتاح ہمارے گورنر جنرل جناب غلام محمد صاحب نے بنفس نفیس لاہور تشریف لیجا کر اپنے ہاتھوں سے فرمایا — دوسرے مسلم ممالک سے آنے والی خواتین وہ تھیں جو مغرب پرستی میں پاکستانی بیگمات کی تمدنی زندگیوں کے ساتھ مماثلت رکھتی تھیں۔ بلکہ شاید ان سے بھی چار ہاتھ آگے ہی تھیں اور ان کو اس کار خیر میں شریک کرنے کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان کی مسلمان خواتین کو بتایا جائے کہ حجاب و حیا کے جن وہموں اور اسلامی تمدن کے جن پرانے تصورات میں وہ اب تک مبتلا ہیں ان کا اسلام کیساتھ کوئی تعلق نہیں اگر تعلق ہوتا تو عالم اسلام کی یہ برگزیدہ خواتین بے پردہ کیوں ہوتیں اور ہمارے گورنر جنرل صاحب کا اس کانفرنس کے افتتاح کو شرف قبولیت بخشنا غالباً اسے نیم سرکاری حیثیت دینا تھا تاکہ پاکستانی خواتین یہ جان کر مرعوب ہوں کہ اپوا کی ان سرگرمیوں کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہے ورنہ خواتین کی اس کانفرنس سے ہمارے گورنر جنرل صاحب کا کیا تعلق تھا۔ حکومت پاکستان کے

فرائض میں تو یہ داخل نہیں ہے کہ "اپوا" کانفرنس کی کامیابی کیلئے اس کا سب سے بڑا عہدے دار زحمت سفر برداشت کرکے کراچی سے لاہور تشریف نے جاتے۔ اگر اپوا اور اسکی بیگمات اپنے طور پر مغربی زندگی اور اس کے اصولوں کو رائج کرنیکی جدوجہد کرتیں تو یہ ان کا حق تھا مگر افسوس ہے کہ یہ سارا کام حکومت کی سرپرستی میں کیا گیا اور حکومت کی ساری مشینری اور اثر و اقتدار اس مقصد کے حصول کے لئے صرف ہوا۔ مختلف صوبوں کے گورنروں اور وزیر اعظموں کی بیگمات کی سرکردگی میں ڈیلی گیشنوں نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔ ریڈیو پاکستان نے اس کانفرنس کی خبریں، اسکا آنکھوں دیکھا حال اور اس کے متعلق دوسرا پروپیگنڈا اس طرح نشر کیا گویا یہ کوئی بڑی اہم سرکاری تقریب تھی یا پاکستانی قوم کی کوئی بڑی اہم اور متفق علیہ کانفرنس تھی۔ حالانکہ اوپر کے مغرب پرست طبقے کی خواتین کے سوا بہت کم خواتین اس میں شامل ہوئیں اور پاکستان کی معروف اور عوامی زندگی سے تو اسکا کوئی تعلق ہی نہ تھا۔

سب سے بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ اس کانفرنس پر جس کا سارا دارومدار اسلام کی خلاف ورزی اور اس سے بغاوت پر مبنی ہے، اور جس کا مقصد ہی یہ ہے کہ پاکستان کے مسلمانوں کے گھروں سے اسلامی تہذیب کو کھرچ کھرچ کر نکال دیا جائے اور اسکی جگہ پر مغربی اور غیر اسلامی طور طریقہ کو رواج دیا جائے اور جسکا نتیجہ صاف طور پر بے حجابی، بے حیائی، رقص و سرود اور دوسرے فواحش کے فروغ کی صورت میں نکل رہا ہے' اسلام' اور اسلامی تعلیمات کا لیبل چپکایا گیا اس طرح غیر اسلام کو اسلام قرار دیکر اسلام پر بہت بڑا ظلم کیا گیا ہے اس کانفرنس میں ہمارے گورنر جنرل جناب غلام محمد صاحب نے فرمایا :-

"ہم مسلمانوں کے سامنے ایک مشن ہے جس کی تکمیل ہمیں زندگی میں کرنی ہے یہ مشن ہے ایک متوازن روحانی اور مادی زندگی کو خود اختیار کرنا اور دوسروں کے سامنے پیش کرنا تاکہ دنیا امن اور خوشحالی کی طرف بڑھے۔ اسلام نے عورت پر وہ حقوق و فرائض عائد کئے ہیں جو اسے مرد کے برابر کردیتے ہیں اور بعض اوقات تو مرد سے بھی زیادہ مرتبہ دیدیتے ہیں"

اب ذرا اسلام کا وہ تصور جس کے مطابق زندگی کے اس مشن کو پورا کرنے اور "متوازن روحانی اور مادی زندگی" کا وہ نقشہ بھی جسے اختیار کرنے کیلئے یہ وعظ ارشاد ہوا ہمارے گورنر جنرل صاحب کی اپنی زبان مبارک سے سن لیجئے، ارشاد فرمایا ہے :-

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پر نواسی سکینہ بڑی فاضلہ اور اپنے زمانہ کے شاعروں فقیہوں اور حکما کی سرپرست تھیں، بغداد کے خلیفہ مقتدر کی والدہ عدالت عالیہ کی صدارت کیا کرتی تھیں شہزادی عالیہ اپنے وقت کی ایک باکمال ماہر موسیقی تھیں، غرناطہ کی صفیہ ایک ممتاز خطیبہ اور شاعرہ تھیں، دمشق میں ام المومنین نے اور بغداد میں ملکہ زبیدہ نے امیہ اور عباسیہ کی سیاست میں اہم حصہ لیا"

اس امر سے قطع نظر کرکے جو تاریخی واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ صحیح ہیں یا غلط، قابل غور ذہن کا یہ رجحان فکر ہے کہ ہمارے محترم گورنر جنرل کو ملک کی خواتین کے سامنے پیش کرنے کیلئے مسلمانوں کی تاریخ میں سے صرف ان ہی خواتین کا "اسوہ حسنہ" ملا جو شاعری، موسیقی اور سیاست گری میں کمال رکھتی تھیں اور وہ تمام جلیل القدر خواتین ان کی آنکھوں سے اوجھل ہوگئیں جنہوں نے اسلامی زندگی کا صحیح اور پاکیزہ نمونہ پیش کیا۔ سیاست میں حصہ حضرت عائشہؓ نے بھی لیا حضرت فاطمہؓ نے بھی لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سالی حضرت ابوبکرؓ کی بیٹی حضرت اسماءؓ نے بھی لیا مگر ان میں سے کوئی خاتون اس قابل نہ نکلی کہ اس کے اسوہ اور طرز زندگی کو "اپوا" کی بیگمات کے سامنے پیش کیا جائے یہ شاید اس لئے کہ وہ نہ بے پردہ تھیں اور نہ ماہر موسیقی تھیں اور نہ شاعروں اور موسیقاروں کی سرپرست تھیں وہ صحیح اسلامی زندگی کا نمونہ تھیں اور شرعی پردہ کی پابند تھیں۔ اور بہرحال موسیقی اور شاعری سے ناواقف محض تھیں اور ان کی زندگیوں سے مغرب کی بے حیا تہذیب کو اپنانے کیلئے کوئی جواز نہ مل سکتا تھا۔ اس لئے ہمارے محترم گورنر جنرل صاحب نے بنی امیہ اور بنی عباس اور ہسپانوی خلافت کے ادوار کی خواتین کو پیش کیا حالانکہ

مورخ کا علی الاطلاق یہ فیصلہ ہے کہ اس زمانہ میں صحیح اسلامی زندگی باقی نہ رہی تھی اور ارباب سیاست عیش و عشرت میں مبتلا ہو کر شاعری، موسیقی اور رقص و سرود میں مبتلا ہو چکے تھے اور معاشرے کا بگاڑ شروع ہو گیا تھا تعجب ہے کہ فاضل مقرر نے واجد علی شاہ اور محمد شاہ رنگیلے کے عہد کے نظام حیات کو کیوں پیش نہیں کیا پھر لطف یہ ہے کہ اسی ایک سانس میں ہمارے گورنر جنرل صاحب نے یہ بھی فرما دیا کہ :-

" اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ خواتین کی توجہ ان انتہائی اہم فرائض سے ہٹ جائے جو وہ اپنے گھروں میں انجام دیتی ہیں ماں کی حیثیت سے وہ ان بچوں کی تربیت کرتی ہیں جو ہماری آئندہ نسل کے افراد ہوں گے ، بچوں کی تربیت کا کام زبردست قومی اہمیت رکھتا ہے اس لئے ان تمام عورتوں کے لئے جو بیویاں یا مائیں بننا چاہتی ہیں ، علم خانہ داری کا مطالعہ رفاہ عام اور ثقافتی سرگرمیوں کے کاموں سے بھی زیادہ اہم ہے !"

اب ہمارے گورنر جنرل صاحب کے خیال کے مطابق قوم کی عورتوں کو دو گروہوں میں تقسیم ہو جانا چاہیئے ، پہلے گروہ کو شاعری ، موسیقی اور رقص و سرود جیسے فنون لطیفہ میں مہارت حاصل کر کے رفاہ عام اور ثقافتی سرگرمیوں کے تعمیری پروگرام کو سنبھالنا چاہیئے اور دوسرے گروہ کو مائیں بن کر بچے جننے اور انکی تربیت کرنیکے فرائض سنبھالنے چاہئیں ۔ کیونکہ ایک عورت ان دو کاموں میں سے ایک ہی کام کر سکتی ہے یا تو وہ بیوی اور ماں بنکر چراغ خانہ ہو کر رہ جائے یا رقص و موسیقی میں مہارت پیدا کر کے شمع محفل بنے اور پروانوں کو اپنے گرد جمع کرے ۔ اب غور کرنے کا سوال یہی ہے کہ عورت قوم کی تعمیر امور خانہ داری میں دلچسپی لیکر اور بچوں کی پرورش صحیح طور پر کر کے آئندہ نسل کے لئے اچھے شہری پیدا کرنے سے کرے گی ، یا سیاست میں حصہ لینے ، فوجی پریڈ کرنے ، مشاعروں اور ڈراموں کے ہنگامے برپا کرنے نیم عریاں لباس میں مخلوط کلبوں میں حصہ لینے سے کر سکتی ہے ؟

اب ذرا ان بیگمات کے ارشادات بھی ملاحظہ فرمایئے جنھوں نے اس کانفرنس میں حصہ لیا بیگم سرفراز صاحبہ نے بڑے طمطراق سے فرمایا۔

" عورتیں اپنے حسن یا اپنی آرائش و زیبائش کی نمائش کے لئے باہر نکلنا نہیں چاہتی ہیں بلکہ وہ اپنی قوم کی تعمیر میں اپنا حصہ ادا کرنا چاہتی ہیں اور اسی لئے وہ باہر آ رہی ہیں !"

ونظ عورتوں کے اس مجمع میں ارشاد فرمایا گیا ہے جس کا ہر فرد مجسم زیب و زینت بنا ہوا تھا جس کا ہر فرد اپنی آرائش دکھانے کیلئے بے قرار تھا جس کا کوئی چہرہ ایسا نہ تھا جس پر غازے سے چمک پیدا نہ کی گئی ہو ، جہاں کوئی ہونٹ سرخی سے عاری نہ تھا ۔ جہاں کوئی لباس ایسا نہ تھا جس میں عریانی کا اہتمام نہ کیا گیا ہو جس کی حاضرین میں سے کوئی بندی ایسی نہ تھی جس نے اپنی زیب و زینت پر اپنی تمام چابکدستی ختم نہ کر دی ہو اور تو اور خود ...ز صاحبہ کا اپنا یہ حال تھا ۔ کہ انہوں نے خود جلسہ میں پہنچنے سے پہلے انتخاب لباس میں کئی گھنٹے صرف کئے ہونگے اور گھر سے نکلنے سے پہلے ...وں نے ایک طویل عرصے تک آئینہ کے سامنے اپنے " تیر ہائے مژگاں " اور " دشنہ ابرو " کو تیز کیا ہوگا ، غالباً ان بیگم صاحبہ کا یہ الفاظ ...تے وقت خیال ہوگا کہ جو سامعین سارے مجمع کو آنکھوں سے دیکھ رہی ہیں ان کے پاس سننے کے لئے کان نہیں ہیں اور جو سن رہی ہیں ، انکی ...یں بصارت سے عاری ہیں ، اگر بیگم صاحبہ اس نہج پر سوچتی ہیں تو انکی حالت ہمدردی کے قابل ہے وہ دوسروں کو فریب دینا چاہتی ...مگر خود ہی " خود فریبی " میں مبتلا ہیں ۔

پھر اس خود فریبی کی انتہائی روشن مثال نہایت سادہ لوحی سے اس جلسے میں بیگم بشیر احمد نے دی یعنی محترمہ نہایت قیمتی نیلی ساٹن کا ...ٹ زیب تن فرمائی ہوئی تھیں مگر اپنی تقریر میں فرمایا :-

" ہماری بہنوں کو چاہیئے کہ نہایت سادہ زندگی گذاریں !"

غالباً ان محترمہ کا خیال تھا کہ انکی سامعین میں سے ہر ایک کے پاس " گوش حقیقت نیوش " تو ہے لیکن " دیدہ عبرت نگاہ " نہیں ہے یا پھر ...

ان بیگم صاحبہ کا خیال ہوگا کہ وہ خود مستثنیات میں ہیں انکو سادگی کی ضرورت نہیں کیونکہ ان کے پاس رنگینی کے لئے کافی دولت ہے اور سادہ زندگی تو ان لوگوں کو ضرورت ہے جنکی آمدنی قلیل ہے یہ "عالم فریبی" نہیں بلکہ کھلی ہوئی خود فریبی ہے۔

اپوا کانفرنس کی لیڈرات نے جو زیادہ تر مغربی تہذیب کی دلدادہ ہیں اس کانفرنس کو ایک "خیرخواہ نسواں" عوامی اور خادم خلق کی حیثیت سے پیش کرنے کی نہایت چالاک کوشش کی اور یہ یقین دلانے کی انتہائی کوشش کی کہ وہ گھروں کی چاردیواری اور پردے کی سے صرف اس لئے باہر نکل آئی ہیں تاکہ پس ماندہ مفلوک الحال اور مظلوم طبقہ نسواں کی دادرسی کریں۔ مگر اس کانفرنس کی ایک رکن محترمہ فا کی تقریر نے اپوا کانفرنس کے "روئے تجمل" سے اس "پردۂ فریب" کو ہٹا کر نہ صرف اس کے اصلی خد و خال کو نمایاں کر دیا بلکہ اس کے سارے کو باطل قرار دے دیا۔ محترمہ فاطمہ بیگم نے اپنی تقریر میں کہا:-

"اپوا ایک جماعت ہے سرکاری افسروں کی بیگمات کی جن کو اپنے خاوندوں کے عہدۂ منصب کی وجہ سے امتیاز حاصل ہے۔ اس کے عہدے صرف وزیروں، کمشنروں، ڈپٹی کمشنروں اور دوسرے اعلیٰ عہدیداروں کی بیویوں کے لئے وقف ہیں یہ نہ عوام کی جماعت ہے اور نہ عوام کیلئے ہے دوسری خواتین کو اسکی سرگرمیوں اور خدمتِ خلق کے کاموں میں حصہ لینے کا کوئی موقع نہیں دیا جاتا ——— اپوا ایک ایسی ہی نیم سرکاری تنظیم ہے جس طرح دوسری سرکاری تنظیمیں ہوتی ہیں اور سرکاری سرپرستی کی وجہ سے اسے دوسرے ممالک میں شہرت حاصل ہوگئی ہے۔ مگر جہاں تک عملی زندگی کا تعلق ہے اس نے غربا اور مفلوک الحال لوگوں کی بہت کم خدمت کی ہے ——— اپوا کے جلسے گورنمنٹ ہاؤس میں منعقد ہوتے ہیں جہاں کھاتے پیتے لوگوں کے فائدے کے لئے پروگرام بنائے جاتے ہیں اور سرگرم اور مخلص کارکنوں کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ اپوا اپنی نمائندہ حیثیت کو ختم کر چکی ہے اس کا سارا کاروبار غیر جمہوری طریق پر چل رہا ہے اسکے ثبوت میں میں اس جلسے کی قلیل حاضری کو پیش کرتی ہوں۔ ڈنروں، لنچوں اور پارٹیوں پر بے حساب روپیہ ضائع کر دیا جاتا ہے درحالیکہ لاکھوں محتاج اور مستحق افراد پیسے پیسے کو ترس رہے ہیں ——— میں پوچھتی ہوں کہ اپوا کی طرف سے کتنی بیوگان کی خبرگیری کی جا رہی ہے کتنے طالب علموں کو تعلیم کے لئے مالی امداد دی جا رہی ہے۔ اپوا کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنی ممبروں کے دلوں میں اپنے فوٹو چھپوانے اور اپنے بیانات اخباروں میں شائع کرانے کا بے پناہ شوق پیدا کر دیا ہے میں پوچھتی ہوں اپوا نے کتنے شفاخانے بیماروں اور زخمیوں کے لئے کھولے ہیں۔ عورتوں کے لئے اسٹڈی سرکل کھولنے کیلئے کتنی کتابیں مہیا کی ہیں کتنی لائبریریاں قائم کی ہیں۔ عورتوں کی بہتری کے لئے کتنے قوانین بنوائے ہیں!"

جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے مگر اس جادو کو جلسے کی صدر صاحبہ نے گھنٹی بجا کر سر چڑھنے سے روک دیا یعنی فاطمہ بیگم کو تقریر ختم کرنے پر مجبور کیا گیا ——— یہ ہے مختصر سا جائزہ "اپوا" اور اپوا کی حالیہ کانفرنس کا جو بڑے تزک و احتشام کے ساتھ پچھلے ماہ لاہور میں منعقد کی گئی۔

اب سوال یہ ہے کہ اس خراجی احوال کا علاج کیا ہے۔ ایک طرف "اپوا" کے ذریعہ پاکستان کے معاشرے کو بگاڑنے کی جدوجہد جاری ہے اور اس میں سرکاری سرپرستی بھی ممد و معاون ہے دوسری طرف ملت اسلامیہ کا یہ تہیہ ہے کہ وہ غیر اسلامی زندگی سے دامن بچا کر اسلامی زندگی اختیار کریگی پھر کیا اسلامی زندگی محض آرزوں کے ذریعے قائم ہو جائیگی؟ یا اس "سیلاب فسق" کو روکنے کیلئے ایک مقابل کا "سیلاب تقویٰ" بھی ضروری ہے اور ظاہر ہے کہ فیصلہ موخر الذکر ہی کے حق میں ہوگا۔ پاکستان میں اسلامی زندگی کا نظام اسی صورت میں قائم ہوگا کہ ملت کی وہ مسلمان عورتیں جو اسلامی زندگی بسر کرنا اور اپنی آئندہ نسلوں کو مسلمان بنا کر پروان چڑھانا چاہتی ہیں وہ اٹھیں اور عورتوں کو اسلامی حدود کے اندر رہ کر کام کرنا سکھائیں صحت تعلیم تربیت اولاد اور دوسری رفاہی سرگرمیاں حجاب نقاب اور شرم و حیا کیساتھ سرانجام دیں اور دنیا کو بتا دیں کہ مسلمان عورت اپنے فرائض کو اسلامی حدود کے اندر رہ کر بہتر طور پر سرانجام دے سکتی ہے +

(ماخوذ از تسنیم)

…یم صدیقی

دم کٹی لومڑی

(ایک لطیف طنز)

اسے وہ چھوٹی سی کہانی کبھی نہ بھولی جسے اس نے نانی اماں
[کی] زبانی اپنے بچپنے میں بار بار سنا تھا۔ جب اس کے سونے
[کا] وقت آتا تو وہ نانی اماں کے لحاف میں جا گھستی اور کہتی کہ نانی اماں
دُم کٹی لومڑی! ——— سناؤ! سناؤ! نانی اماں اپنے
[پوپ]لے منہ سے نکلنے والی آوازوں سے کہانی سنانے لگتی، بات
[کو دا]ستان گوئی کے انداز سے لمبا کر کے اس کی نانی اسے کہانی سناتی
[تھ]ی ——— پہلے لومڑی کی دم کٹ جاتی۔ پھر ذلت کا
[احس]اس اسے کاٹتا، پھر وہ اپنی ساری قوم کی دُمیں کٹوانے کی
[اسکی]م سوچتی۔ آخر اسکیم بن جاتی۔ جب اسے کوئی سہیلی چھیڑتی تو وہ بڑی
[سنج]یدگی سے اور بڑے انداز فخر سے بتاتی کہ بوا، میں نے یہ دُم جان
[بوجھ] کر کٹوائی ہے۔ اب مجھے آسمان کے اوپر اور زمین کے نیچے ایسے
[ایس]ے عجائبات نظر آنے لگے ہیں جو تمہاری سات پشتوں سے بھی
[کسی] کو معلوم نہیں، اور نہ آئندہ نسلوں کو معلوم ہونگے۔ ہوتے
[ہوتے] اس کی ایک سہیلی نے عجائبات کے مشاہدہ کے لالچ میں
[د]م کٹوالی ——— بچاری کو درد بھی ہوا۔ خون بھی بہا۔ دُم
[سے] بھی ہاتھ دھوئے مگر کوئی کشف نہ ہوا، کوئی جلوۂ جاناں نظر نہ
[آیا۔] اس نے اپنا سر پیٹ لیا اور تصوف کی استانی سے جا کے
[سا]ری حال بیان کی۔ استانی صاحبہ نے کہا کہ بوا، آہستہ
[آہستہ] سب کچھ ہو جائے گا۔ تمہیں دن کو تارے دکھائی دینے
[لگی]ں گے۔ تمہاری دم اچھی طرح جڑ سے نہیں کٹی ہے۔ مگر بس یہ
[بڑی] خرابی کی بات ہوگی کہ تم دوسری لومڑیوں کے سامنے یہ رونا
[رو]نے لگو۔ اس طرح تو وہ تمہارا مذاق اڑائیں گی اور عمر بھر کی ذلت
[کے س]وا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ تم ان کے سامنے بڑے فخر اور ٹھسے سے
مشاہدات غیب کا حال بیان کرو۔ جیسے
کہ میں اور تم دونوں مل کر ایک ایک لومڑی کی دم کٹوالیں۔ ورنہ یہ
دم والی لومڑیاں ہمیں جینے نہ دیں گی۔ چنانچہ دونوں لومڑیوں نے
مہم شروع کردی۔ اور آہستہ آہستہ ایک ایک کی دم کٹواتے کٹواتے
پوری برادری کو یک رنگ بنا دیا۔

نانی اماں تو اپنی کہتی چلی جاتیں اور بیچ بیچ میں ننھی منی نواسی،
"اوں" "ہاں" کرتے کرتے سو جاتی اور پھر ہر روز یہی ہوتا۔

ناصرہ کو یہ کہانی ساری عمر نہ بھول سکی۔ یہانتک کہ اس نے
مڈل پاس کر لیا۔ میٹرک میں اول آئی۔ گریجوایٹ ہوئی۔ تو جب بھی
نانی اماں کی یہ بار بار کی دہرائی ہوئی کہانی اس کے ذہن میں بالکل
تازہ رہی۔ پھر جب اس نے ایک نامور پائلٹ اسلام اللہ سے
آنکھیں لڑائیں تو یہ بھی یہ کہانی اس کی آنکھوں میں تھی اور پھر جب
اسلام اللہ کے ساتھ اس نے کلب میں جانا اور بال روم میں ناچنا
شروع کیا۔ تو بھی یہ کہانی ہمزاد کی طرح اس کے ساتھ رہتی۔ پھر
جب ایک دن اس نے آخری خزانہ ہائے عصمت اس اچکے کے
حوالے کر دیئے تو اسے یکایک ایسا معلوم ہوا کہ جیسے وہ بالکل دُم
کٹی لومڑی کی کہانی بن گئی ہے۔ جیسے اس کی دم کٹ گئی ہے
——— اور پھر دوسری لومڑیاں اس کا مذاق اڑانے لگیں۔ دُور سے
اس کی طرف اشارے ہونے لگے اور بسا اوقات بچاری ناصرہ
پر یہ فقرے بھی کسے جانے لگے۔ ایک دن محلے کی چند پرقعہ پرست
خواتین کے نرغے میں آگئی۔ اُنھوں نے اس کے بری طرح لتے
لئے۔ ناصرہ اکیلی چومکھی لڑتی رہی۔ مگر ادھر پانچ سات بڑی زبان
دراز عورتیں تھیں جنکو دم کٹانے کی قدر و قیمت کا اندازہ بھی نہ تھا

بچوں سے اس کا بھی شدت سے احساس تھا کہ اس کے بعض اعزہ نے بالکل آنا جانا ہی ترک کر دیا ہے اور سب سے زیادہ شاق جو چیز اس پر گذری وہ یہ تھی کہ اس کی پرانی ملازمہ نے ایک روز نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور اس کی کوئی وجہ بھی نہ بتائی۔ لیکن ناصرہ نے تنخواہ میں اضافہ کرنے کا لالچ دیا۔ اسے مزید آرام پہنچانے کا وعدہ کیا اور اس سے دریافت کیا کہ وہ جو شکایت بھی ہو سکتی ہو بتائے تاکہ اسے دور کر دیا جائے۔ ملازمہ پہلے تو کچھ بتانے پر تیار نہ ہوئی لیکن آخر کار اس نے دبے لفظوں میں یہ کہہ ہی دیا کہ بیگم صاحبہ آپ تو رئیس آدمی ہیں۔ میری محلے میں بدنامی ہو رہی ہے۔ اب بیگم صاحبہ بک دبک رہ گئیں کہ یہ تو "دم" کا معاملہ ہے۔ بس یہیں نہیں ہوئی بلکہ مسجد کے خطیب نے ایک جمعہ کو خطبے میں نام لئے بغیر ناصرہ کا معاملہ پبلک میں بیان کر دیا۔ اور اپیل کی محلے کو ایسی گندگی سے پاک کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اب تو چہ می گوئیوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا ایک اخبار نے بھی اس موضوع پر پے در پے سخت نوٹ لکھے آخر ہوا یہ کہ ناصرہ جس مکان میں رہتی تھی اس کی مالکہ نے جو ایک شریف خاندان کی بیوہ عورت تھی۔ ناصرہ سے مکان خالی کرنے کا تقاضا کیا۔ ناصرہ نے کرایہ دگنا دینے تک پر آمادگی ظاہر کی۔ مگر مالکہ نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ دس گنا کرایہ لے کر بھی مکان ناصرہ کے پاس نہیں چھوڑ سکتی۔ مگر کیوں؟ اس کا جواب ناصرہ کو خود ہی معلوم تھا۔ وہ اپنی دم کے بارے میں دنیا بھر سے زیادہ جانتی تھی۔

ان واقعات نے ناصرہ کے اندر ایک طوفان جذبات برپا کر دیا کہ اچھا! یوں تو یوں ہی سہی۔ میں اب ساری کی ساری لومڑیوں کی دُم کٹا کے چھوڑوں گی۔ وہ پڑوسی عورتیں۔ وہ میری نوکرانی۔ وہ مالک مکان، اس مسجد کے ملا اور اس اخبار کے ایڈیٹر کی بیویاں ایک دن خود دمیں کٹوائیں گی۔ ورنہ اپنی بیٹیوں اور بہوؤں کو تو دم کٹواتے دیکھیں گی۔ ناصرہ نے مہم شروع کر دی۔ وہ بن سنور کر نکلتی۔ پارکوں اور سڑکوں پر پہلے سے زیادہ گھومتی، دوستیاں لگاتی، ریڈیو پر گاتی، ڈراموں میں ناچ کرتی اور اس کی کٹی ہوئی دم پر ہنسنے والے اور ہنسنے والیاں رشک سے دیکھتے رہ جاتے ——— اس وقت کسی کو اس کی کٹی ہوئی دُم کی طرف توجہ نہ ہوئی

اس نے بھولی بھالی لڑکیوں اور بیگمات کو تلاش شروع کیا کہ جن کو بہکایا جائے۔ اس نے ایک ایک لومڑی کو شروع کیا کہ بوا دم کٹانے کے بعد سے مجھ پر ترقی پسندی کی ایسی راہیں کھلی ہیں۔ اور ایسی ایسی جنت ہائے نگاہ اور فردوس گوش ہاتھ لگے ہیں کہ بس کیا بتاؤں۔ یہ پرانے زمانے کی پرستی، چھوڑو۔ اور دیکھو کہ اس دنیا میں کیا کیا کچھ ہے۔ آخر تگ و دو کے بعد ایک بے وقوف خاتون پھنس گئیں۔ دم کٹ ——— مگر جب دم کٹ چکی تو اسے معلوم ہوا کہ استانی تو بڑی چال چل گئیں۔ اب پچھتائے کیا ہوت! استانی صاحبہ تسلی دلائی کہ اب تلملانے سے کیا فائدہ۔ الٹا اور نکو بنو گی۔ ا... تو دم کٹی۔ ناک بھی کٹواؤ گی۔ اب اگر بچنا چاہتی ہو تو میرے پاس اپنے اوپر ہنسنے والیوں اور بڑی دم والی بننے والیوں کی دم کی مہم مل کر چلائیں۔ مرتی نہ کیا نہ کرتی۔ شاگرد رشیدہ نے کی کہ "جب ناچ پڑی تو شرمانا کیا" دونوں نے مل کر ایک بنالی ——— انجمن ترقی پسند دم کٹی لومڑیاں!" ا... صدر بنیں، شاگردہ سکریٹری اور ممبروں کی بھرتی کا کام شروع کر دیا گیا۔

جب کوئی کسی کام کے پیچھے پڑ جائے اور مخالفین کی ... اور دنیا کے تمسخر کی پروا کئے بغیر اپنے مقصد کی خدمت میں ... رہے تو سعی رائیگاں نہیں جاتی۔ دنیا میں ہر پکار کو سننے والے دعوت کو ماننے والے موجود ہیں۔ جس میں مرزا غلام احمد جیسے اپنے آپ کو ہزاروں آدمیوں سے نبی منوا سکتے ہیں۔ جہاں پست اخلاق لوگ مومنوں کے امام اور جماعتوں کے لیڈر ... سکتے ہیں۔ جہاں گندے سے گندے مقرر کی تقریر سننے کے لئے جلسوں میں بے پناہ حاضری ہو سکتی ہے اور جہاں گھٹیا سے گھٹیا صحافی کو پڑھنے والوں کی تعداد کثیر ہاتھ آسکتی ہے و... آخر دم کٹانے والی لومڑیاں ہی کیوں نہ ملیں۔

ایک ایک کر کے ترقی کے مشاہدات کرنے کیلئے لو

بڑھنے لگیں اور دُمیں کاٹنے کا کام منظم طریق سے شروع ہو گیا
کر آہستہ آہستہ دم کٹی لومڑیوں کی ایک سوسائٹی پروان چڑھنے
نا یہ مال دار لومڑیاں تھیں ۔ یہ تعلیم یافتہ لومڑیاں تھیں یہ اونچے
لوں کی لومڑیاں تھیں ۔ یہ شہرت یافتہ لومڑیاں تھیں ———
جب انھوں نے دمیں کٹائیں تو ان کی تصویریں شائع
ہونے لگیں ۔ محفلوں میں انکے چرچے ہونے لگے ۔ حکومت نے
ان کی سرپرستی شروع کر دی ۔ ادیبوں اور صحافیوں نے ان کی
ذات میں قلم اٹھائے ۔ اور آہستہ آہستہ تعلیم گاہوں پر، پریس
پر، ریڈیو پر، فلمی دنیا پر، تقاریب پر، قومی مظاہرات پر ان دم کٹی
لومڑیوں کا اثر چھانے لگا اور وہ قابلِ تقلید معیار بننے لگیں ۔
اس کے دوسری طرف دم والی لومڑیوں کا مذاق اڑایا
لگا کہ یہ پرانے زمانے کی یادگاروں کی اندھی پرستش کرنے
اپنی دموں سے قومی ترقی کا راستہ روکے بیٹھی ہیں چنانچہ
پوش عورت اپنی جگہ احساس کہتری میں مبتلا ہو گئی ۔ اور
عصمت خاتون نے محسوس کیا کہ جیسے وہ دنیا بھر کی نگاہوں
گنہ گار ہے ——— بس اب کیا تھا ۔ تیزی سے لومڑیاں
آ آ کر دُمیں کٹوانے لگیں ۔ کام اتنا بڑھ گیا کہ دم کاٹنے کے
سے اور ادارات قائم کر دیئے گئے ۔ اس کام کے لئے
میلے اور بازار لگنے لگے ۔ اس مہم کو تیز تر کرنے کے لئے
ہونے لگیں ——— اور قوم نے بہت بڑا فنڈ
خیر کے لئے وقف کر دیا ۔

ناصرہ کا جذبۂ انتقام ترقی کی اس رو سے بڑی تسکین پا رہا
اس کی دم کٹنے سے جو زخم ہوا تھا اس پر جس سوسائٹی نے
چھڑک کر اس کی تکلیف کو مسلسل بڑھایا تھا ۔ اب اسی زخم
سوسائٹی مرہم رکھ رہی تھی ۔ اب اسے عصمت کے زخموں میں
کوئی ٹیس محسوس نہیں ہوتی تھی ۔ لیکن چند خاص ہستیاں
کی نگاہ میں تھیں ابھی وہ پوری طرح شکار نہیں ہوئی تھیں
انتقام کی آگ کا جوش تو کم ہو گیا تھا ۔ مگر وہ کچھ سلگتی محسوس
تھی ۔ آخر وہ دن آیا کہ اس کی پرانی محلہ دار عورتیں جنھوں نے

ایک دن اس کے لئے لئے تھے اپنی بہو بیٹیوں سمیت اس کے
دم کاٹنے کے نگار خانوں میں گھوم رہی تھیں ——— محض ناصرہ
کو دھوکا دینے کے لئے انھوں نے اگرچہ بہت " ادی " ایکٹ
کیا لیکن ناصرہ جانتی تھی کہ وار کارگر ہو گیا ہے ۔ پھر اس نے
دیکھا کہ اس کی پرانی ملازمہ اور مالک مکان کی بیٹیاں بھی " انجمن
ترقی پسند دم کٹی لومڑیاں " میں بھرتی ہونے کے لئے درخواستیں
اور للچائی ہوئی نگاہیں لئے حاضر ہیں ۔ پھر وہ زمانہ آیا کہ ایک نہیں
کئی خطیبانِ مساجد اور کتنے ہی اسلامی اخبارات کے مدیروں
کی بیویاں اور بہنیں دم کٹا کرنئے نئے مشاہدات غیبی سے لطف
اندوز ہو رہی ہیں ۔

اشتہارات برابر چھپ رہے تھے ۔ لٹریچر کا سیلاب
چھا رہا تھا اور چند رجعت پسند ملاؤں اور ملانیوں کی آوازیں
ناصرہ کے نقار خانے میں بالکل جذب ہو کر رہ گئیں ۔
اور ناصرہ کا ضمیر بڑا مطمئن تھا کہ
" شادم از زندگئی خویش کہ کارے کردم ! "
(بشکریہ کوثر)

فیضِ فرنگ !

اسد ملتانی

اب وہ حسن و عشق کی رنگینیٔ محفل کہاں
صورتیں تو اچھی اب بھی ہیں مگر وہ دل کہاں

پردۂ محمل سے تھا سب کی نگاہوں میں وقار
کارواں میں عزتِ لیلائے بے محمل کہاں

پھنس گیا سائنس داں گردابِ محسوسات میں
یہ کہاں اور علم کا دریائے بے ساحل کہاں

دشتِ گمراہی میں ہر ایک ایک کا رستہ جدا
کارواں کیسا کوئی رہبر کجا منزل کہاں

زندگی کا فلسفہ اب عشرتِ امروز ہے
عبرتِ ماضی کجا اور فکرِ مستقبل کہاں

حکمتِ مغرب نے دونوں پر چڑھایا ایک رنگ
اب تمیزِ نیک و بد، فرقِ حق و باطل کہاں

عام کیں تہذیب نے چالاکیاں عیاریاں
اب اسد وہ سیدھے سادھے بھولے بھالے دل کہاں

(مستقبل)

سازگارِ مُستقبل!

جذبۂ خاص و عام بدلے گا یعنی ہر اک نظام بدلے گا!
پیدا ہونگی، نئی نئی راہیں محورِ صبح و شام بدلے گا
جلوہ گر ہوگی شانِ آزادی صید بدلیں گے دام بدلے گا
ساقی مے فروش! بدلیں گے مینا بدلے گی! جام بدلے گا
ہوگی برباد مغربی تہذیب جو ہے رائج نظام بدلے گا
بے زبانوں کو مل سکیگی زباں بیکسوں کا مقام بدلے گا
ختم ہوں گے خوشامدی لہجے نغمۂ احترام بدلے گا
ٹوٹ جائیگا رشوتوں کا طلسم شغل " کارِ حرام" بدلے گا
اہلِ توحید کی نوازش سے دیر کا انتظام بدلے گا
زندہ ہو جائیں گے شہیدِ جفا اُن کا حُسنِ خرام بدلے گا
شادکامی کے دور آئیں گے صبح سے وقتِ شام بدلے گا
بارِ خاطر نہ ہو تو یہ کہہ دوں پست و عالی مقام بدلے گا
مقتدی تو بدلتے جاتے ہیں
جانے کیتک امام بدلے گا

شیخ عبدالرحیم (ایڈوکیٹ)

کلمۂ حق

رسالہ طلوع اسلام کراچی کے شمارہ بابتہ ماہ دسمبر ۱۹۵۱ء میں نقد ونظر کے تحت ایک صاحب (جو بقول خود "جناب مولینا ابوالمظفر محمد نذرالدین صاحب نذر" ہیں) کے رسالہ "فتنۂ مودودیت" نامی پر ایڈیٹر طلوع اسلام ریویو لکھنے بیٹھے۔ اس "ریویو" پر انھوں نے اپنے رسالے کے پورے چھ صفحے بظاہر "مولانا محمد نذرالدین نذر کی کتاب کے نذر کردیئے[1]۔ مگر نذریات" کے اس بحر بیکراں میں آپ غوطہ لگا کر بھی دیکھیں۔ تو اصل کتاب زیر تنقید پر آپ کو ایک لفظ بھی نہ ملیگا بلکہ معلوم یہ ہوگا کہ یہ مولانا نذرالدین نذر" کی یہ مختصر کتاب ایک فلیتہ تھی جس نے بغض وعناد اور رنج وغصہ کے اس کوہِ آتش فشاں میں ازسرنو آگ لگادی جو دفتر طلوع اسلام سے وقتاً فوقتاً پھٹتا ہے۔ اور مولانا ابوالاعلےٰ مودودی اور ان کی قائم کردہ جماعت اسلامی کے خلاف حاسدانہ[2] طعن وتشنیع کا زہر آلود لاوا ہر طرف اچھال دیتا ہے۔ طلوع اسلام کا یہ زہرافشاں پہاڑ مولانا مودودی کی تحریک اور جماعت اسلامی کو تباہ کرنے کیلئے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اکثر حرکت میں آتا ہے۔ مگر مولانا موصوف ہیں کہ اپنی کوہ وقار خاموشی (یا حقارت آمیز سکوت) سے طلوع اسلام کی موقت الشیوع زہر خانی کو درخور اعتنا ہی نہیں سمجھتے اور ایڈیٹر طلوع اسلام کے لئے یہ چیز بجائے خود سب سے بڑا اشتعال ہے۔

مگر اس سلسلے میں طلوع اسلام کے دماغی عدم توازن اور بدحواسی نے پہلا لطیفہ یہ پیدا کردیا ہے کہ مولانا ابوالمظفر محمد نذرالدین نذر کی کتاب کا تعارف کراتے ہوئے شروع میں ارشاد ہوتا ہے کہ

"کچھ دنوں سے مولوی صاحبان کی طرف سے بھی اسلامی جماعت کی تحریک کی مخالفت شروع ہوئی ہے اور ہندوستان اور پاکستان کے مفتی حضرات نے ان کے خلاف فتوے بھی شائع کئے ہیں۔ زیر نظر پمفلٹ اسی قسم کی کوششوں کا مظہر ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ان حضرات کی اس قسم کی کوششوں سے یہ تحریک اور زور پکڑ جائیگی"

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ "پچاس ساٹھ برس پہلے قادیان سے اسی قسم کی تحریک اٹھی جب تک مولوی صاحبان اس کی تائید کرتے رہے، یا کم از کم خاموش رہے وہ تحریک بے جان سی رہی جب انھوں نے اس کی مخالفت شروع کی تو وہ آگ کیطرح بھڑک اٹھی اور بڑھتی چلی گئی۔

اس پُر درد وعظ وتلقین کے بعد ایڈیٹر صاحب طلوع اسلام نے مولوی نذر صاحب کی کتاب زیر نظر کے متعلق تو ایک لفظ نہیں لکھا اور طلوع اسلام کے کم وبیش چھ صفحے مولانا مودودی کی ذا

---

[1] گزشتہ دو سال سے طلوع اسلام کا یہ مستقل مسلک ہا ہے کہ کسی بھی موضوع پر قلم اٹھاتا ہے تو اس کی لپیٹ میں جماعت اسلامی اور مولانا سید ابوالاعلےٰ مودودی کو ضرور لیتا ہے بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ کے بموجب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مخاصمت کا جذبہ اس بری طرح بھرا پڑا ہے کہ صبر وتحمل اور حدود وقیود کو توڑتا ہوا بہہ نکلتا ہے۔ ایک ہی باتیں ہیں جن کو بار بار دہرا کر انتقام کی حس کی تسکین کا سامان کیا جاتا ہے مگر یہ تونس اور بڑھتی ہی جاتی ہے۔

[2] "حاسدانہ" کا لفظ بہت سوچ سمجھ کر استعمال کیا گیا ہے۔ طلوع اسلام کا ذہن تحریک اسلامی کے مقابلے میں ایک سخت گھناؤنے "احساس کمتری کا شکار ہے۔ اگر فرصت ہوئی تو کبھی ہم اس کی تحریروں کا "نفسیاتی تجزیہ" کرکے یہ حقیقت واضح کریں گے۔

لا پروپیگنڈہ[ٹھ] اور شبہات [illegible] جماعت اسلامی کی خدمات اور سرگرمیوں
تذلیل و تضحیک میں سیاہ کر دیئے ہیں۔ گویا ایڈیٹر صاحب موصوف
"اس قسم کی کوششوں سے "جماعت اسلامی کی یہ تحریک اور
دور نہ بگڑ جائے گی۔ نہ وہ "آگ کیطرح بھڑک" اٹھے گی۔ اور نہ بڑھتی
لی جائے گی۔

طلوع اسلام کی اس تحریر کا ابتدائی حصہ پڑھتے ہی پہلا سوال
تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ ع

توبہ فرمایان چرا خود توبہ کمتر می کنند

اس کے بعد طلوع اسلام نے خبث باطنی اور بداندیشی سے
شاید نہ سہی، مگر حیرت انگیز بے باکی سے مولانا مودودی کی ذات
اور ان کی فکر و نظر کے بعض اجتہادات پر شرمناک غلط بیانیوں اور
بدگمانیوں کے تیر برسائے ہیں۔ ان میں سے اکثر باتوں کا جواب تو یہی
پروقار یا حقارت آمیز خاموشی ہے، جو ایک خاص قسم کے لوگوں
کے متعلق اختیار کرنی پڑتی ہے۔ مگر راقم الحروف، جو گذشتہ کئی سال سے
طلوع اسلام کو التزاماً پڑھتا رہا ہے اور مولانا مودودی کے تمام مضامین
اور تصنیفات سے بھی اس زمانہ سے روشناس ہے جب وہ آج
سے اٹھارہ بیس سال قبل حیدرآباد دکن سے رسالہ ترجمان القرآن شائع
کرتے تھے۔ اگر طلوع اسلام کی تازہ ترین تحریر کے متعلق اپنا ذاتی
ردعمل بیان کر دے۔ تو طلوع اسلام اور اس کی قماش کے بہت سے
دوسرے حضرات کے لئے بصیرت افروز تو نہ ہو کیونکہ ایسے لوگ
بصیرت ہی سے اکثر تہی دامن ہوتے ہیں، شاید کچھ عبرت آموز ثابت
ہو۔ مگر اپنا تاثر ظاہر کرنے سے پہلے اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ راقم محض
اپنی کوتاہ عملی کی وجہ سے جماعت اسلامی کا نہ رکن ہے اور نہ رفیق
البتہ راقم۔

الف : ۳۳-۱۹۳۲ء سے مولانا مودودی کے مضامین اور
تصنیفات کو بالاستیعاب پڑھتا رہا ہے۔

ب : تقسیم ملک سے کئی سال پہلے مولانا مودودی سے
ملنے اور متعدد مسائل کے متعلق ان سے بالمشافہ
گفتگو اور تبادلہ خیالات کے مواقع اس عاجز
کو ملے ہیں

ج : تقسیم ملک کے بعد جب سے مولانا مودودی پٹھانکوٹ
سے ہجرت کر کے جماعت اسلامی کے دوسرے
ارکین کے ساتھ مستقل طور سے لاہور میں آکر مقیم
ہوئے ہیں۔ اتفاق حسنہ سے وہ میرے پڑوس
میں میری رہائش گاہ سے چند ہی گز کے
فاصلے پر سکونت پذیر ہیں۔ اور مجھکو انکی پرائیوٹ
زندگی اور پبلک سرگرمیوں کو قریب سے دیکھنے اور
جانچنے کے بلا مبالغہ بیسیوں مواقع نصیب
ہوتے ہیں۔

لیجئے۔ مولانا مودودی اور انکی جماعت اسلامی کے متعلق
میرے مشاہدات اور تاثرات مختصراً حسب ذیل ہیں۔

(۱) میں مولانا مودودی کی غیر معمولی دماغی صلاحیتوں انکی
کثرت مطالعہ، تبحر علمی، وسعت معلومات، جدید
علوم و فنون سے واقفیت، صحت نظر اور توازن دماغ
کے علاوہ، ان کے سیرت و کردار کی بلندی کا ایجابی طور
سے اتنا کبھی معترف اور قائل نہیں ہوا تھا۔ جتنا ان کے
مخالفین کے اعتراضات اور تحریروں کو پڑھ کر ہوا خصوصاً
طلوع اسلام کے مضامین اور علمائے دہلی اور دیوبند کے
فتاوے دیکھ کر۔ لہٰذا ان حضرات نے سلبی طور سے
اکثر پڑھے لکھے لوگوں کو علی وجہ البصیرت مولانا مودودی
کی تحریک و خیالات سے مانوس اور قریب تر کر دیا ہے
اور اس طرح بعینہ وہی کچھ ہوا اور خدا کے فضل سے ہو کر
رہے گا جس کو طلوع اسلام روکنا چاہتا ہے۔ خدا کی شان
ہے کہ مولانا مودودی کی ذات اور ان کی جماعت کے متعلق

سے آپ کوئی بھی تحریر اٹھا کر دیکھیں اس میں "اخلاق کا تو کیا سوال ——— گفتگو اور خطاب اور اظہار اختلاف کی تمیز کا جواد فی سے ادنی معیار
ہو سکتا ہے وہ بھی مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کا تذکرہ آتے ہی ختم ہو جاتا ہے۔

طلوعِ اسلام کو جو بغض و عناد ہے۔ اس کے جنون نے اسے ان مولویوں کی صفوں میں لا کھڑا کیا جنکو وہ ہمیشہ پانی پی پی کر کوسا کرتا کرتا تھا ؎

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
کہ میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

(۲) جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں۔ مولانا مودودی نے متعدد اہم مسائل دینی کے سلسلے میں جو متکلمانہ مضامین جماعت اسلامی کے قیام سے قبل اور اسکے بعد ترجمان القرآن میں لکھے۔ ان میں شروع سے آخیر تک ایک مقصدی ربط اور تسلسل پایا جاتا ہے۔ البتہ یہ ضروری نہیں کہ تمام مسائل جن پر انھوں نے قرآن و سنت کے متوازن مطالعہ کے بعد اظہارِ خیال کیا ہے۔ بیک وقت پیدا ہوئے ہوں۔ پھر یہ کس قدر حیرت و افسوس کی بات ہے کہ مولانا کے یہ مضامین اس وقت تک تو قابلِ صد تحسین رہے۔ جب تک انھوں نے اسلام کو ایک مکمل ضابطۂ حیات کے طور پر مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں میں کارفرما کرنے کے لئے ایک مستقل اور فعال جماعت کے قیام کا اعلان نہ کیا اور جوں ہی یہ جماعت معرضِ وجود میں آئی۔ چاروں طرف سے ایک ہنگامہ برپا ہو گیا کہ یہ تدریجی نبوت کی طرف پہلا قدم ہے اسلام میں ایک نیا فرقہ پیدا کیا جا رہا ہے۔ یہ ایک خطرناک فتنہ ہے۔ کوئی دن میں قیامت ہوگا! وہی علمائے کرام اور صحافیانِ عظام جو کل تک ترجمان القرآن کے اکثر مضامین تمام و کمال اپنے اخبارات و رسائل میں پوری شرح صدر کے ساتھ نمایاں طور سے التزاماً شائع کرتے تھے اب مولانا مودودی کی تکفیر کے لٹھ چلانے لگے حتی کہ مولانا عبد الماجد دریابادی ایسے نیک نفس اور اہلِ دل بزرگ جو اپنے مشہور ہفت روزہ صدق [illegible] شہ پاروں کو ہفتوں تک لگاتار نقل فرمایا کرتے تھے دیکھیے اسی طرح جس طرح اب پنجاب کے اخبارات ان کے اخبار صدق کی یہی باتیں ہر ہفتے نقل کرتے ہیں مولانا مودودی کی تحریک جماعت اسلامی کے خلاف بعض نہایت رکیک اور غیر منصفانہ مضامین اور غیر ذمہ دارانہ اعتراضات شائع کرنے کے لئے اپنے اخبار میں گنجائش نکال لیتے ہیں۔ مگر جماعت اسلامی کے متعلق کلمۂ خیر شاذ و نادر ہی ان کے قلم سے نکلتا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ مولانا مودودی کے خیالات جب تک وہ ترجمان القرآن کی زینتِ اوراق رہے ہدایت و کامرانی کا راستہ دکھلاتے رہے اور جب انہی خیالات کو ایک منظم جماعت کی صورت میں عملی جامہ پہنانے کا اقدام شروع ہوا۔ تو وہ یک قلم ضلالت و گمراہی کا موجب بن گئے!

(۳) ایک طرف تو آئے دن یہ رونا رویا جاتا ہے کہ قدیم مکتبِ خیال کے مولوی صاحبان بعض مہماتِ مسائلِ دینی کی جو توجیہہ فرماتے ہیں۔ ان کی زبان اتنی مغلق۔ اندازِ بیان اس قدر الجھا ہوا اور استدلال اتنا بودا اور پھسپھسا ہوتا ہے کہ وہ جدید تعلیمیافتہ حضرات کے دل و دماغ کو اپیل کرنے کی بجائے خود دین سے منحرف اور متنفر کر دیتا ہے اور ایسے تعلیم یافتہ حضرات کا ترجمان اپنا فوس خصوصی کراچی کا رسالہ طلوعِ اسلام[1] ہے۔ مگر جب کوئی خدا کا بندہ اپنی معمولی ذہنی صلاحیتوں سے کام لے کر قرآن و سنت کا ناقدانہ مطالعہ کرنیکے بعد اپنے نتائجِ فکر کو خالص علمی اور سائنٹی فک زبان میں ایک نہایت دلنشین انداز اور بے پناہ قوتِ استدلال کے ساتھ پیش کر کے اسلام کا

[1] خود اس علمبردارِ جدت کا حال ملاحظہ ہو کہ ایک طرف تو یہ عام مولوی کو یہ کہہ کر کوسے گا کہ یہ جدید حالات سے بے خبر ہے، وقت کے تقاضوں کو نہیں جانتا، بسم اللہ کے گنبد میں پڑا ہے لیکن دوسری طرف جب کوئی داعیِ حق جدید علوم سے آراستہ ہو کر اور جدید تقاضوں کی پوری آگاہی کے ساتھ کام کرنے اٹھتا ہے تو یہی اس پر "موڈرن مولوی" کی پھبتی کستا ہے۔

حقانیت کا اسکو حق و صداقت کے متلاشیوں کے دل پر بٹھا دیتا ہے اور پھر قیامِ حق اور ردِ باطل کے لئے انہی لوگوں سے کام لینے لگتا ہے تو پھر تقلیدِ جامد اور تجددکے ڈانڈے آپس میں مل جاتے ہیں۔ ایک طرف علمائے کرام کی گروہی عصبیت اور خانقاہی تقدس خشمگیں ہوکر تکفیر کی آگ برسانا شروع کردیتے ہیں کہ یہ بزرگانِ سلف کے اجتہاداتِ فکر کو منزہ عن الخطا نہیں مانتا .... اور دوسری طرف طلوعِ اسلام کا نجترِ غضب آلود ہوکر پکار اٹھتا ہے کہ علما کی جماعت میں سے کسی کو یہ حق کیونکر پہنچتا ہے کہ وہ علم و عقل کے جدید ہتھیاروں سے مسلح ہوکر دشمنانِ حدیث کا مقابلہ کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:-

"مودودی صاحب نے اپنے ملازم کے لئے پیکر بالکل ماڈرن تجویز کئے اور اس طرح قادیانیت کے تتبع میں نوجوانوں کے اس گروہ کی نگاہوں میں اپنی تحریک کو جاذبِ[1] بنالیا ؎

زاہدِ تنگ نظر نے اِسے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے کہ مسلماں ہے یہ

طلوعِ اسلام اگر تمام دفترِ حدیث کو دفترِ بے معنی قرار دیکر کراچی کے قریب بحیرہ عرب میں ڈبو دے کے عطائے تو بہ لقائے تو، تو دیوبند، بریلی اور دہلی کی غیرتِ دینی جوش میں نہیں آئیگی لیکن مولانا مودودی آئمہ سلف کی عظمت و احترام کی کامل نگہداشت کے ساتھ اس بیسویں صدی میں کسی دینی مسئلہ کے متعلق قرآن و سنت کے طویل مطالعہ اور غور و فکر کے بعد علمائے قدیم سے کوئی اجتہادی اختلاف ظاہر کردیں تو وہ کشتنی اور گردن زدنی۔ ذرا ان بزرگانِ دین کا احساسِ تناسب ملاحظہ ہو

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

پھر کوئی خدا کا بندہ یہ بھی تو بتلادے کہ مولانا مودودی نے آجتک بلا مبالغہ ہزاروں صفحات کا جو لٹریچر قرآن و سنت کی تفسیر و تعبیر کے سلسلے میں شائع کیا ہے اس میں کسی بڑے کے اظہار میں اُنھوں نے مفتیانہ ادّعا اور مجتہدانہ زعم کے ساتھ اپنے قول کو قولِ آخر یا حرفِ ناطق کہا ہو۔ جہاں تک مجھے خیال ہے۔ اظہارِ رائے میں اُنھوں نے انتہائی احتیاط سے کام لے کر ہمیشہ یہی کہا کہ کتاب و سنت کی روشنی میں میری ذاتی رائے یہ ہے۔ جنکو علی وجہ البصیرت میری رائے کی صحت سے اختلاف ہو وہ اسکے پابند نہیں حتیٰ کہ اپنی جماعت کے لوگوں پر بھی اُنھوں نے ہر مسئلہ میں اپنے اجتہاد کو قابلِ پابندی نہیں ٹھہرایا۔

(۴) ایک لمحہ کے لئے مولانا مودودی کے اجتہادات سے قطع نظر، خدمتِ اسلام کے دعویدار حضرات، علمائے دہلی و دیوبند ہوں، یا طلوعِ اسلام کی طرح کے منکرینِ سنت اور (بزعمِ خود) خدامِ قرآن، صرف اتنا بتادیں کہ اسلام کی تعلیماتِ مسلّمہ کو مسلمانوں کی عملی زندگی میں ایک عالمگیر کارفرما قوت کی حیثیت سے نافذ کرنے کے لئے جماعت اسلامی جو کچھ کررہی ہے آپ حضرات کو آخر اس میں کیا اعتراض ہے۔ آپ میں اور مولانا مودودی کی جماعت میں کوئی چیز ما بہ الاشتراک بھی ہے یا نہیں، اگر ہے اور پھر بھی آپ کسی سنہری یا روپہلی مصلحت سے یا کسی مخلصانہ اختلاف کی بنا پر اس میں عملاً شریک نہیں ہونا چاہتے تو کم از کم انکے کام میں روڑے نہ اٹکائیں۔ انکو اپنے طریقہ پر اصلاحِ احوال کیلئے کام کرنے دیں اور آپ خود اپنے اصول و بصیرت[2] کے مطابق وہی کام ان سے بہتر طریقہ پر سرانجام

---

[1] ذرا ملاحظہ فرمایئے گا کہ "احساسِ کہتری" کس طرح ان الفاظ میں نمایاں ہورہا ہے۔
[2] کیونکہ آپکے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بصیرت تو قابلِ اتباع ہے نہیں، آپکی اپنی "بصیرتِ قرآنی" ہی آپ کی رہنما ہے۔

دیگراس کارِخیر میں سبقت لے جائیں۔ اور اگر آپ مولانا مودودی کی جماعت کو ایک نیا فرقہ ضالہ سمجھتے ہیں، تو ہم عامۃ الناس کی "رہبری" اور "ہدایت و تسلی" کے لئے اتنا تو کریں کہ مولانا موصوف کی تصنیفات سے وہ عبارتیں من وعن مع سیاق و سباق کو دیانت داری سے قائم رکھ کر نقل کر دیں جن سے یہ ظاہر ہو جس کا آپ ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں کہ

الف مولانا مودودی اپنی جماعت اسلامی کے سوا باقی تمام مسلمانوں کو خارج از اسلام سمجھتے ہیں [۱]

ب ایک صحیح و صالح مسلمان ہونے کے لئے اپنے ہاتھ پر تجدید ایمان کا مطالبہ کرتے ہیں

ج مجدد یا مہدی ہونے کے دعویدار ہیں اور تدریجی نبوت کی طرف قدم بڑھاتے جا رہے ہیں۔

د ان کے عقائد و اعمال کتاب و سنت کے خلاف ہیں وغیرہ وغیرہ۔

یہ کتنی ستم ظریفی ہے کہ ایک شخص باوجود جامع البحرین ہونے اور دین حق کی مسلسل اور ٹھوس خدمت کے، بار بار ایسے تمام دعاوی سے برأت اور بیزاری کا اظہار کرتا ہے، اور آپ ہیں کہ مسلمانوں کو بھڑکانے کے لئے یہ رٹ لگائے جا رہے ہیں کہ مولانا مودودی پنجاب کی "نبوت خیز" سرزمین میں آکر نبوت کا دعوٰے کرنے والے ہیں۔ اور اس غرض کے لئے وہ مجددیت اور مہدویت کی ارتقائی منازل ٹھیک قادیانی ٹیکنیک کے مطابق طے کر رہے ہیں چنانچہ طلوع اسلام نے مولانا مودودی کی بروزی نبوت کے صغرٰی کبرٰی بھی قائم کر کے رکھ دیئے۔

ان تمام لغویات کا جواب اس دنیا میں صرف یہی ہو سکتا تھا۔ اور وہ مولانا مودودی کئی بار دے چکے ہیں۔ یعنی یہ کہ جو لوگ مجھ سے یہ دعاوی منسوب کر رہے ہیں۔ میری نسبت ان کی یہ پیش گوئیاں سب جھوٹی ثابت ہو کر رہیں گی اس لئے کہ ایسے دعاوی میری طرف سے کبھی نہیں ہونگے۔ بات یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ مگر "طلوع اسلام" اپنے مطلع تاباں کی تابانی قائم رکھنے کے لئے غلط بیانیوں کی آگ بھڑکائے رکھنا چاہتا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ مولانا مودودی کا موقف یہ نہیں ہے کہ احادیث کی صحت کی جانچ پڑتال کے لئے علمائے سلف نے جرح و تعدیل کے جو اصول مقرر کر دیئے ہیں وہی کافی ہیں۔ بلکہ

"یہ بات کہ فلاں حدیث صحیح ہے اور فلاں غلط، صرف وہ بتا سکتا ہے جو مزاج شناس نبوت ہو"۔

اس کے معاً بعد پاکستان مرکزی سکریٹریٹ کا یہ عظیم (طلوع اسلام) بیک جنبشِ قلم اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ احادیث کے صحیح اور ضعیف ہونے کی سند مودودی صاحب کا فیصلہ ہے .... یعنی خدا کی حاکمیت سمٹ سمٹا کر اس مزاج شناس نبوت کے فیصلوں میں محصور ہو گئی"۔

اب سمجھ میں نہیں آتا کہ طلوع اسلام کی عقل و فہم کا ماتم کیا جائے یا اس کی دیانت و ایمانداری کا۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جن کا اپنا یہ دعوٰے ہے کہ قرآن کے مطالب و معارف پورے چودہ سو سال کے اندر پہلی دفعہ صرف انہی کے مطلع دماغ پر طلوع ہوئے ہیں ———

اقبالیات کے سینکڑوں طالب علم علامہ اقبال کی تصنیفات کے مسلسل مطالعہ کے بعد اگر اس قابل ہو جاتے ہیں کہ وہ علامہ

---

[۱] حالانکہ طلوع اسلام کا مقام اس سے سنز فرسنگ آگے ہی ہے وہ تو اس ساری بندار بحر جو کتاب و سنت پر قائم ہے از سرتا پا مولوی کا گھڑا ہوا مذہب ——— بلکہ سازش قرار دیتا ہے۔ لہذا اس مذہب کے اگلے پچھلے پیرو اور اس سازش کو چلانے اور اس کے زیر اثر آنے والے اکابر و اصاغر سب کے سب جو مقام ان حضرات کی نگاہوں میں پا سکتے ہیں وہ معلوم ہے۔ ان کی فہرست مسلمین میں تو آج کے دو درجن آدمیوں کے علاوہ گذشتہ بارہ صدیوں سے لیکر اب تک شاید ہی کوئی نام درج ہو سکے۔

[illegible] کے ہزاروں اشعار اور مخصوص الفاظ کو اپنی تحریر و [illegible] روز زبان بنالیں اور اسکے فکر و علم کی گہرائیوں میں اتر [illegible] کے فلسفہ و حکمت کے مزاج شناس ہو جائیں۔ تو جو شخص کتاب [و] سنت کا مطالعہ سالہا سال عقل و ہوش اور محبت و عقیدت [کے] تمام رنگ کر کرے گا۔ آخر وہ کیوں مزاج شناس نبوت نہ ہوگا۔ [کی]ا اس کے لئے بھی مامور من اللہ ہونا ضروری ہے اور کیا مولانا مودودی کا یہ دعوے ہے کہ دنیا میں وہی ایک مزاج شناس نبوت ہیں۔ اور دوسرا کوئی نہ ہوا ہے اور نہ آئندہ ہوگا۔ یا چونکہ وہی مزاج شناس نبوت ہیں۔ اس لئے مامور من اللہ بھی ہیں یا یہ کہ چونکہ وہ مامور من اللہ ہیں۔ اس لئے مزاج شناس نبوت بھی وہی ہیں اور کوئی نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ مزاج شناس نبوت ہونے کی سعادت ان لوگوں کے حصے میں نہیں آتی جنکے دل محبت رسول سے خالی ہوں اور جو سنت رسول کے تمام آثار و نقوش کو مٹا دینے پر تلے ہوئے ہوں

طلوع اسلام کے ایڈیٹر صاحب آخیر میں اپنی کم مائگی کا ثبوت دیتے ہوئے مولانا مودودی کی جماعت اسلامی اور تحریک قادنیت کی باہمی مماثلت ثابت کرنے کی کوشش فرماتے ہیں سچ کہا گیا ہے کہ بچھو کا ڈنگ اس کی دم میں ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ

"سب سے آخری چیز یہ کہ تحریک قادنیت اور مودودی صاحب کی تحریک دونوں کا مسئلہ معاشی ہے .... [1]

اس تحریک کے بانی مودودی صاحب ہیں تحریک سے پیشتر یہ صاحب حیدرآباد میں تھے۔ ہم ان سے پوچھنے کی جرأت کرتے ہیں کہ پنجاب آنے سے پہلے حیدرآباد میں ان کی مالی حالت کیا تھی؟ اس کا جواب ان سے لیجئے یا ان لوگوں سے پوچھئے جو ان کی اس زمانے کی حالت سے واقف ہیں۔ اس حالت کو سامنے رکھئے۔ اور آج لاہور میں ان کی کوٹھی پر جا کر دیکھئے کہ ان کی زندگی کے کیا ٹھاٹ ہیں۔ اس کے بعد ان سے پوچھئے کہ اس دوران میں اُنھوں نے کیا کاروبار کیا ہے جس سے ان کی حالت وہاں سے یہاں تک پہنچی ہے!"

طلوع اسلام کو الزامی جواب سے بہت چڑ ہے۔ مگر کیا کیجئے بعض اوقات علاج بالمثل ضروری ہو جاتا ہے۔ ع

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

خدانخواستہ تنقیص مقصود نہیں۔ مقطع کی سخن گسترانہ بات ہے کیا میں نہایت عجز و ادب سے یہ پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ طلوع اسلام کے بانی اور اس کے نفس ناطقہ جناب پرویز صاحب کا مشاہرہ آج پندرہ بیس سال قبل کیا تھا۔ جب وہ گورنمنٹ ہند کی سکریٹریٹ میں کلریکل اسٹاف کے ممبر تھے اور اب کیا ہے آمدنی اور خوش حالی کے لحاظ سے جناب ممدوح کے "جب" اور "اب" میں کتنا فرق ہے

حضرت مولانا اسلم جیراج پوری قبلہ کہ ایک درویش منش بزرگ ہیں کیا ان کی آمدنی ہمیشہ اتنی ہی رہی جتنی اسوقت تھی۔ جبکہ وہ آج سے تقریباً چالیس سال قبل علی گڈھ کالجیٹ سکول کی ابتدائی جماعت کو پڑھاتے، اور مارٹین کورٹ میں سب پہ اکثر تھے۔ [2]

---

[1] تحریک قادنیت اگر کوئی حقیقی وجہ مماثلت رکھتی ہے تو فتنۂ انکار حدیث کے ساتھ رکھتی ہے۔ تحریک قادنیت نے ایک نئی نبوت اس لئے پیش کی تھی کہ وہ زمانہ کے کچھ تقاضوں کے تحت شریعت میں ترمیم کر سکے۔ چنانچہ انگریز کی خدمت کو عین تقاضائے دین بنایا گیا، دین کو انفرادیت کے سانچے میں ڈھالا گیا اور جہاد کو منسوخ قرار دیا گیا۔ بالکل یہی روح ہے جو فتنۂ انکار حدیث کے اندر کام کر رہی ہے۔ حدیث کے پہرے قرآن کے دروازے سے اسلئے اٹھائے جارہے ہیں کہ طلوع اسلام صاحب رسول کی جگہ لیں اور دین میں جو جو کچھ نیا داخل کرنا چاہیں کر سکیں اور پرانا جو جو کچھ ہے اسے الگ کر کے پھینک دیں۔

[2] یہ فقرے انتہائی کم ظرفی اور پست ذہنیت کے مظہر ہیں۔ ان سے بالکل ظاہر ہے کہ بحث کسی اصولی اختلاف کی سر سے سے نہیں ہے بلکہ مقصود بغض و انتقام اور حسد و رشک کے جذبات کی تسکین ہے اور اس مقصد کیلئے حریف کو ہر طرف سے دکھ دینا ہی مفید ہو سکتا ہے

اب آیئے ۔ آپکے سوالات کا جواب کچھ اپنے ذاتی علم و
شاہدکی رو سے پیش کر دیا جائے
اور مجھ کو یہ تو معلوم نہیں کہ مولانا مودودی جب حیدرآباد دکن
سے رسالہ ترجمان القرآن شائع کرتے تھے ان کی مالی حالت کیسی
تھی ۔ ممکن ہے طلوع اسلام کے ایڈیٹر صاحب کو انھوں نے
اپنی مالی مشکلات کے سلسلے میں شریک راز کیا ہو ۔ مگر طلوع اسلام
کو اپنی بالغ نظری پر بہت ناز ہو معلوم نہیں آج سے تقریباً تیس
سال قبل غالباً ۱۹۲۰ء میں طلوع اسلام کی نظر حد بلوغت کو پہنچی
تھی یا نہیں ۔ اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی ۔ اس وقت مولانا مودودی
جمعیۃ العلماء دہلی کے ہفتہ وار اخبار الجمعیۃ کے ایڈیٹر تھے ۔ مولانا
موصوف کی عمر اس وقت اڑتالیس سال سے متجاوز نہیں ۔ سال ۱۹۲۰ء
میں ان کا سن بیس سال سے بھی کم ہوگا ۔ اس زمانہ میں مولانا
مودودی نے علماء ہند کی سب سے بڑی علمی مجلس کے اخبار کی ترتیب
و ادارت کے فرائض جس قابلیت اور ادبی شگفتگی سے سرانجام
دیئے اس پر ایک زمانہ سر دھنتا تھا ۔ اس وقت سے لیکر آج
تک کہ تیس سال کی طویل مدت گزر چکی ہے ۔ مولانا مودودی کا
مطالعہ کتب بھی جاری رہا اور روانیِ قلم بھی ۔ مولانا حسرت موہانی
مرحوم و مغفور نے اپنی آپ بیتی میں فرمایا تھا کہ ؏

ہے مشقِ سخن جاری اور چکی کی مشقت بھی

[مول]انا مودودی نے مطالعہ کتب کی چکی کے ساتھ تصنیف کتب
[کے] علاوہ خدمت علم و دین کے سلسلے میں بلا مبالغہ ہزاروں صفحات
[پ]ر "مشق سخن" بھی جاری رکھی ۔ پھر ان کی تصنیفات اور مضامین
[آج]کل اسلامی علم کلام میں ایسی مستقل علمی حیثیت رکھتے ہیں کہ کوئی
[دان]شمند اور غیرت مند قوم اپنے ہاتھوں ان کو ضائع نہ ہونے
[دے]ں ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی متعدد کتابوں کے ترجمے انگریزی اور
عربی زبانوں میں بھی ہوگئے ۔ اور پاکستان اور ہندوستان سے
باہر بلاد اسلامیہ میں بھی قدر و قبولیت نے ان کے لئے دامن
پھیلا دیا ۔ جماعت اسلامی کے ارکان کی تعداد تو مختصر سی ہے
مگر مولانا مودودی کی تصنیفات کے قدر شناس اکثر مسلمان ممالک
میں ہزاروں لاکھوں ہیں ۔ مولانا موصوف قادیانی حضرات کی طرح
اگر صرف پیٹ کے بندے ہوتے تو وہ اقامت دین کی کٹھن
منزل میں قدم رکھنے کی بجائے صرف اپنے قلم کی کمائی سے بلا مبالغہ
[ا]س وقت تک لاکھوں روپے کما چکے ہوتے ۔ اور یہ سرمایہ
ان کی سات پشتوں کے لئے کافی ہو رہتا ۔ مگر ———

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

طلوع اسلام کا کبوتر بام کیا جانے ——— تپیدنِ مرغانِ سر رشتہ بپا
اس وقت اقامت دین کے لئے جماعت اسلامی کی سرگرمیوں
پر جو ہزار ہا روپیہ خرچ ہو رہا ہے وہ مولانا مودودی کے قلم گوہر بار
کا صدقہ ہے اور پھر یہ صدقہ جاریہ ہے جب تک مودودی کا قلم
اور دماغ رواں دواں ہیں ۔
شب و روز دماغ کی شقت اور قلم کی حرکت سے مولانا
کو جس قدر بھی ملتا ہے اس کا ایک نہایت ہی معمولی جزو ان کے
اور انکے بیوی بچوں کے قوت لایموت پر صرف ہوتا ہے ۔ باقی
سب کچھ اقامت دین کے لئے اور جماعت اسلامی کی سرگرمیوں
پر صرف ہوتا ہے ۔ یا پھر جماعت کے لٹریچر کی نشر و اشاعت پر
خرچ ہوتا ہے ۔ جہانتک مجھ کو معلوم ہے امیر جماعت اسلامی نے
عام پبلک سے چندہ طلب کرنا تو رہا ایک طرف ! ارکین جماعت
پر بھی کوئی مستقل سالانہ یا ماہوار چندہ لازم نہیں کیا ۔ البتہ بعض
خوش حال ارکین یا ہمدرد حضرات کبھی کبھار جماعت کی ہنگامی
ضروریات کے لئے کوئی خاص رقوم بطور اعانت و عطیہ پیش کریں

[ی]ہاں اور بہت سے کتابیں لکھنے والے لوگ آپکے سامنے موجود ہیں کہ جنھوں نے اسلام کو برپا کرنے کے لئے کوئی اجتماعی حرکت شروع
[ن]ہ کرنے کی وجہ سے اپنے معتقدین کے حلقے بڑے وسیع رکھے ہوئے ہیں لیکن مولانا مودودی تو ایک ایسی خطا کر چکے ہیں جسکی وجہ سے
بہت سے حلقوں نے اپنے سامنے تعصب کی دیواریں کھڑی کر لی ہیں ۔ معاش کو محور فکر و نظر بنانیوالے لوگ مولانا مودودی کی سی
خطا نہیں کیا کرتے !

تو وہ قبول کر لی جاتی ہیں۔ مگر التزاماً ٹھیک انہی مقاصد و مصارف پر خرچ کی جاتی ہیں جن کے لئے وہ پیش کی گئی ہوں۔

جماعت اسلامی سے بعض ایسے ادیب اور اہل قلم حضرات وابستہ ہیں جنکے قلم میں خدا نے وہ قوت دی ہے اور جنکی علمی و ادبی صلاحیتیں اس قدر متنوع اور ہمہ گیر ہیں۔ مثلاً مولانا نصر اللہ خاں عزیز اور جناب نعیم صدیقی وغیرہ کہ اگر عام اخباری یا ادبی مذاق کی پیروی میں وہ ہفتے میں صرف چند گھنٹے بیٹھ کر قلم برداشتہ ایک آدھ مضمون لکھ دیا کریں۔ یا سرکاری ریڈیو اور پبلسٹی کے محکموں سے اپنا رشتہ استوار کر لیں تو ہزاروں روپیہ اور بہت بڑی شہرت پیدا کر لے سکتے ہیں۔ مگر ان کی ہیئت و لباس اور طریق بود و ماند کو آپ دیکھیں۔ تو حکومت کے ادنے کلرک بھی ان کو خاطر میں نہ لائیں۔ اب ذرا لاہور میں مولانا مودودی کی "کوٹھی" اور ان کی موجودہ "زندگی کے ٹھاٹھ" دیکھئے جن کو میں گزشتہ چار سال سے قریباً روزانہ دیکھ رہا ہوں

کوٹھی کی "شانِ حصول" یہ ہے کہ تقسیم ملک کے بعد ۴۷ء کے آخر میں جب مولانا اور انکے رفیقوں کو پٹھان کوٹ ضلع گورداسپور سے ہجرت کر کے لاہور آنا پڑا تو حکومت پنجاب کے محکمہ بحالیات کی خوش انتظامی اور مہاجر نوازی کے طفیل غربی پنجاب اور شہر لاہور کے ہزارہا لوگوں نے ہندو اور سکھ مالکان وطن کے عظیم الشان مکانات اور کوٹھیوں پر قبضہ جما لیا۔ ان مقامی "انصار" میں بلا مبالغہ سینکڑوں ایسے حضرات بھی تھے جن کے جدی اور ذاتی مکانات شہر لاہور کے اندر موجود ہیں! ان میں سلم لیگ۔ کے "ایثار پیشہ" کارکن بھی تھے۔ کچھ "علامہ قسم" کے حضرات تھے۔ اور کچھ ان سرکاری افسروں کے عزیز و قربا اور متوسلین جو تعلق رکھتے ہے ان ایام میں لاہور اور اسکے قرب و جوار میں تعینات ہونے کی وجہ سے دن رات اپنے آپکو خوش حال یا بحال کرنے میں مصروف تھے۔ چونکہ قبضہ قانون کا ۹/۱۰ حصہ ہوتا ہے" اس لئے ان غاصب حضرات کا قبضہ بعد میں اکثر و بیشتر جائز اور صحیح قرار دیا گیا۔ اسوقت بھی لاہور کے اندر کیفیت یہ ہے کہ بعض حضرات جنکو مشرقی پنجاب میں رہنے کو ایک کوٹھا (ایک کمرے کا کچا مکان) بھی میسر نہ تھا وہ بیچارے دو منزلہ اور سہ منزلہ کوٹھیوں میں "گذارہ" کر رہے ہیں۔ ایک طرف تو غلط بخشیوں کا یہ عالم اور دوسری طرف تمام لاہور میں مولانا مودودی اور انکے مہاجر رفیقوں کو سر چھپانے کیلئے ایک چھپر بھی الاٹ نہ ہوا کیونکہ الاٹمنٹ حاصل کرنے کے معنی یہ فرض تھا کہ پہلے آپ اپنا اصول و اخلاق الاٹ کر دیں اور اسکے لئے مولانا تیار نہ تھے۔ آخر ان کو لاہور کی مرکزی آبادی سے تین چار میل باہر قصبہ اچھرہ کے قریب ذیلدار پارک میں ایک سلمان کی کوٹھی خاصے معقول کرایہ پر لینی پڑی۔ یہ ایک معمولی یک منزلہ کوٹھی ہے جس کے ایک حصے میں مولانا کی ذاتی رہائش ہے اور باقی کمروں میں جماعت اسلامی کے مرکز سے متعلق مختلف دفتر ہیں۔

کوٹھی کے ٹھاٹھ تو بیان ہو چکے اب اس کوٹھی کے مکین یعنے جماعت اسلامی کے امیر کی دنیادی امارت کے ٹھاٹھ بھی ملاحظہ ہوں۔

وہ نہایت ہی سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ انتہا درجے کے خلیق، متواضع، منکسر، شگفتہ مزاج اور خوش گفتار آدمی ہیں۔

جبہ و دستار کی مولویانہ شانِ امتیاز، اور قائدانہ غرور اور کم آمیزی کی بجائے وہ سہ پہر کے وقت جب اپنا روزانہ مقررہ تصنیفی یا دفتری کام ختم کر لیتے ہیں تو باہر صحن یا برآمدہ میں جماعت اسلامی کے ارکین، ملازمین اور عام ملاقاتیوں میں اس طرح بیٹھے ہوتے ہیں کہ ایک نووارد یا ناواقف آدمی یہ تمیز نہیں کر سکتا کہ اس جماعت میں امیر جماعت کون ہے۔ اور دفتر جماعت کا چپڑاسی کون ہے

میں نے آجتک ان کی جماعت کے ادنیٰ ترین شخص کو بھی ان سے "حضرت، قبلہ حضور، یا جناب" کے الفاظ کہتے نہیں سنا وہ خود اور انکی جماعت کے تمام کارکن جو انکے قریب رہتے ہیں

رہتے ہیں۔ اپنے محلے کی ایک مسجد میں ایک معمولی ملا کے پیچھے نماز پڑھنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے۔

انکی اور انکے اہل وعیال کی معاشرت، لباس اور طریق بودوماند کو دیکھ کر ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ اس بے پناہ گرانی کے زمانے میں یہ خاندان کسی نہ کسی طرح اپنی سفید پوشی اور وضع داری قائم کئے ہوئے ہے۔

البتہ یہ صحیح ہے کہ جس طرح مولانا مودودی مبدءِ فیاض سے ایک سلجھا ہوا دماغ اور شگفتہ انداز گفتگو اور پاکیزہ ذوق سے بہرہ اندوز ہوئے ہیں۔ اسی طرح ان کا مذاق سلیم، ان کی معاشرت، لباس، دفاتر، دار المطالعہ، کتب خانہ، پبلک سرگرمیوں اور پرائیویٹ زندگی ہر چیز میں منعکس نظر آتا ہے۔ اور یہی وہ "ماڈرن ٹیکنیک" ہے جو ضروریات زمانہ کے لحاظ سے اگر کوئی عالم دین اختیار کرے تو وہ بقول طلوع اسلام۔ کے "قادیانی" تنظیم کے نقش قدم پر چل کر نہایت خطرناک فتنہ ثابت ہو کر رہے گا۔

گویا خوش تدبیری منظم سلیقہ اور قرینہ تعلیمات قرآنی کی حدود سے خارج ہیں! بہرحال مولانا مودودی کی موجودہ "زندگی کے نمونے" مختصراً اپنے مشاہدہ وعلم کے مطابق عرض کر دیئے گئے۔ "آئندہ حضور (طلوع اسلام) مالک ہیں"

مگر جماعت اسلامی کی سرگرمیوں میں یہ جو روز بروز وسعت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے متعلق (طلوع اسلام) کی تشویش وپریشانی واقعی ہمدردی کے قابل ہے۔

افسوس ہے کہ یہ حکایت جو "خوشتر" نہ تھی "دراز تر" ہو گئی۔ خدا کرے کہ "طلوع اسلام" پر مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے متعلق حقیقت حال کا سورج طلوع ہو جائے۔ مولانا مودودی اور ان کی جماعت کے متعلق سطور بالا میں طلوع اسلام کے ایڈیٹر صاحب کے لئے اپنے مشاہدات کی جنس "بے تا ن شعیر" پیش کی گئی ہے ورنہ بقول اکبر الہ آبادی ع

ہمارا کیا ہے اے بھائی نہ مسٹر ہیں نہ مولانا

ل‍ه درحقیقت یہ لوگ چاہتے ہیں کہ دین کے علمبردار انکے سامنے اس حالت میں آئیں کہ یہ ان کا مذاق اڑا سکیں ان کو کٹھ ملا کہہ سکیں ان پر فقرے چست کر سکیں تاکہ اصل دین کا وقار برباد ہو اور ملحدانہ خیالات کے فروغ کے لئے زمین ہموار رہے

مُفرّح فولادی

طاقت اور قوت کیلئے بیش بہا تحفہ

نیا اور تازہ خون پیدا کرتا ہے وزن بڑھاتا اور ہڈیوں کو مضبوط کرتا ہے۔ قوت وطاقت بخشتا ہے۔ کھانا ہضم کر کے بھوک بڑھاتا ہے

خوراک:۔ کھانے کا ایک چمچہ روزانہ تین چار مرتبہ کھانے کے بعد استعمال کریں۔ بچوں کے لئے نصف خوراک۔

قیمت فی شیشی دو روپے آٹھ آنے

حاذق دواخانہ بندر روڈ، کراچی نمبر (۱)

تو وہ قبول کر لی جاتی ہیں ۔ مگر التزاماً ٹھیک انہی مقاصد و مصارف پر خرچ کی جاتی ہیں جن کے لئے وہ پیش کی گئی ہوں ۔

جماعت اسلامی سے بعض ایسے ادیب اور اہل قلم حضرات وابستہ ہیں ، جنکے قلم میں خدا نے وہ قوت دی ہے اور جنکی علمی و ادبی صلاحیتیں اس قدر متنوع اور ہمہ گیر ہیں ۔ مثلاً مولانا نصر اللہ خاں عزیز اور جناب نعیم صدیقی وغیرہ کہ اگر عام اخباری یا ادبی مذاق کی پیروی میں وہ ہفتے میں صرف چند گھنٹے بیٹھ کر قلم برداشتہ ایک آدھ مضمون لکھ دیا کریں ۔ یا سرکاری ریڈیو اور پبلسٹی کے محکموں سے اپنا رشتہ استوار کر لیں تو ہزاروں روپیہ اور بہت بڑی شہرت پیدا کر لے سکتے ہیں ۔ مگر ان کی ہیئت و لباس اور طریق بود و ماند کو آپ دیکھیں ۔ تو حکومت کے ادنے کلرک بھی ان کو خاطر میں نہ لائیں ۔ اب ذرا لاہور میں مولانا مودودی کی " کوٹھی " اور ان کی موجودہ " زندگی کے ٹھاٹھ " دیکھئے جن کو میں گزشتہ چار سال سے قریباً روزانہ دیکھ رہا ہوں

کوٹھی کی " شانِ حصول " یہ ہے کہ تقسیم ملک کے بعد ۱۹۴۷ء کے آخر میں جب مولانا اور انکے رفیقوں کو پٹھان کوٹ ضلع گورداسپور سے ہجرت کر کے لاہور آنا پڑا تو حکومت پنجاب کے محکمہ بحالیات کی خوش انتظامی اور مہاجر نوازی کے طفیل غربی پنجاب اور شہر لاہور کے ہزار ہا لوگوں نے ہندو اور سکھ تارکان وطن کے عظیم الشان مکانات اور کوٹھیوں پر قبضہ جما لیا ۔ ان مقامی " انصار " میں بلا مبالغہ سینکڑوں ایسے حضرات بھی تھے جن کے جدی اور ذاتی مکانات شہر لاہور کے اندر موجود ہیں ! ان میں مسلم لیگ کے " ایثار پیشہ " کارکن بھی تھے ۔ کچھ " علماء ملت " کے حضرات تھے ۔ اور کچھ ان سرکاری افسروں کے عزیز و اقربا اور متوسلین جو اتفاق حسنہ سے ان ایام میں لاہور اور اسکے قرب جوار میں تعینات ہونے کی وجہ سے دن رات اپنے آپکو خوش حال بحال کرنے میں مصروف تھے ۔ چونکہ قبضہ قانون کا ۹/۱۰ حصہ

[illegible]

یہ ہے کہ بعض حضرات جنکو مشرقی پنجاب میں رہنے کو ایک کوٹھا " (ایک کمرے کا کچا مکان) بھی میسر نہ تھا وہ بیچارے دو منزلہ اور سہ منزلہ کوٹھیوں میں " گذارہ " کر رہے ہیں ۔ ایک طرف تو غلط بخشیوں کا یہ عالم اور دوسری طرف تمام لاہور میں مولانا مودودی اور انکے مہاجر رفیقوں کو سر چھپانے کیلئے ایک چھپر بھی الاٹ نہ ہوا کیونکہ الاٹمنٹ حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ پہلے آپ اپنا اصول و اخلاق الاٹ کر دیں اور اسکے لئے مولانا تیار نہ تھے ۔ آخر ان کو لاہور کی مرکزی آبادی سے تین چار میل باہر قصبہ اچھرہ کے قریب ذیلدار پارک میں ایک سلامت کی کوٹھی خاصے معقول کرایہ پر لینی پڑی ۔ یہ ایک معمولی یک منزلہ کوٹھی ہے ۔ اسی کے ایک حصے میں مولانا کی ذاتی رہائش ۔ ہے اور باقی کمروں میں جماعت اسلامی کے مرکز سے متعلق مختلف دفتر ہیں ۔

کوٹھی کے ٹھاٹھ تو بیان ہو چکے اب اس کوٹھی کے مکین یعنی جماعت اسلامی کے امیر کی دنیاوی امارت کے ٹھاٹھ بھی ملاحظہ ہوں ۔

وہ نہایت ہی سادہ زندگی بسر کرتے ہیں ۔ انتہا درجے کے خلیق ، متواضع ، منکسر ، شگفتہ مزاج اور خوش گفتار آدمی ہیں ۔

جبہ و دستار کی مولویانہ شانِ امتیاز ، اور قائدانہ غرور اور کم آمیزی کی بجائے وہ سہ پہر کے وقت جب اپنا روزانہ مقررہ تصنیفی یا دفتری کام ختم کر لیتے ہیں تو باہر صحن یا برآمدہ میں جماعت اسلامی کے ارکین ، ملازمین اور عام ملاقاتیوں میں اس طرح بیٹھے ہوتے ہیں کہ ایک نووارد یا ناواقف آدمی یہ تمیز نہیں کر سکتا کہ اس جماعت میں امیر جماعت کون ہے ۔ اور دفتر جماعت کا چپڑاسی کون ہے

میں نے آجتک ان کی جماعت کے ادنیٰ ترین شخص کو بھی ان سے " حضرت " " قبلہ " " حضور " یا " جناب " کے الفاظ کہتے نہیں سنا

رہتے ہیں۔ اپنے محلے کی ایک مسجد میں ایک معمولی ملّا کے پیچھے نماز پڑھنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے۔

انکی اور اپنے اہل وعیال کی معاشرت، لباس اور طریق بودوباند کو دیکھ کر ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ اس بے پناہ گرانی کے زمانے میں یہ خاندان کسی نہ کسی طرح اپنی سفید پوشی اور وضعداری قائم کئے ہوئے ہے۔

البتہ یہ صحیح ہے کہ جس طرح مولانا مودودی مبدء فیاض سے ایک سلجھا ہوا دماغ اور شگفتہ انداز گفتگو اور پاکیزہ ذوق سے بہرہ اندوز ہوئے ہیں۔ اسی طرح ان کا مذاق سلیم، ان کی معاشرت لباس، دفاتر، دارالمطالعہ، کتب خانہ، پبلک سرگرمیوں اور پرائیویٹ زندگی ہر چیز میں منعکس نظر آتا ہے۔ اور یہی وہ "ماڈرن ٹیکنیک" ہے جو ضروریات زمانہ کے لحاظ سے اگر کوئی عالم دین اختیار کرے تو وہ بقول طلوع اسلام۔ کے قادیانی[1] تنظیم کے نقش قدم پر چل کر نہایت خطرناک فتنہ ثابت ہو کر رہے گا۔

گویا خوش تدبیری، منظام سلیقہ اور قرینہ تعلیمات قرآنی کی حدود سے خارج ہیں! بہرحال مولانا مودودی کی موجودہ "زندگی کے ٹھاٹھ" مختصراً اپنے مشاہدہ وعلم کے مطابق عرض کردیئے گئے "؛ آئندہ حضور (طلوع اسلام) مالک ہیں"

مگر جماعت اسلامی کی سرگرمیوں میں یہ جو روز بروز وسعت پیدا ہوتی جارہی ہے۔ اس کے متعلق (طلوع اسلام) کی تشویش وپریشانی واقعی ہمدردی کے قابل ہے۔

افسوس ہے کہ یہ حکایت جو "خوشتر" نہ تھی "دراز تر" ہوگئی۔ خدا کرے کہ "طلوع اسلام" پر مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے متعلق حقیقت حال کا سورج طلوع ہو جائے۔ مولانا مودودی اور ان کی جماعت کے متعلق سطور بالا میں طلوع اسلام کے ایڈیٹر صاحب کے لئے اپنے مشاہدات کی جنس "بے نان شعیر" پیش کی گئی ہے ورنہ بقول اکبر الٰہ آبادی ع

ہمارا کیا ہے اے بھائی نہ مسٹر ہیں نہ مولانا

[1] دراصل یہ لوگ چاہتے یہ ہیں کہ دین کے علمبردار انکے سامنے اس حالت میں آئیں کہ یہ ان کا مذاق اڑا سکیں ان کو کٹھ ملا کہہ سکیں ان پر فقرے چست کر سکیں تاکہ اہل دین کا وقار برباد ہو اور ملحدانہ خیالات کے فروغ کے لئے زمین ہموار رہے

مُفرّح فولادی

طاقت اور قوت کیلئے بیش بہا تحفہ

نیا اور تازہ خون پیدا کرتا ہے وزن بڑھاتا اور ہڈیوں کو مضبوط کرتا ہے۔ قوت وطاقت بخشتا ہے۔ کھانا ہضم کر کے بھوک بڑھاتا ہے

خوراک:۔ کھانے کا ایک چمچہ روزانہ تین چار مرتبہ کھانے کے بعد استعمال کریں۔ بچوں کے لئے نصف خوراک۔

قیمت فی شیشی دو روپے آٹھ آنے

امین حزیں

"نوشتۂ دیوار"!
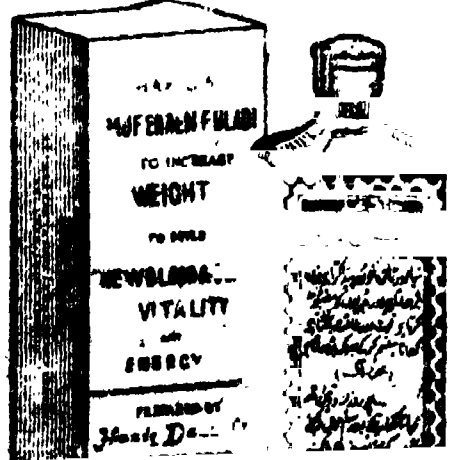
نگاہِ دل کہہ رہی ہے دل سے جہانِ کہنہ بدل رہا ہے
نیا ہی چاند اور نیا ہی سورج نئے افق سے نکل رہا ہے

نئے ستارے ابھر ابھر کر فضاؤں میں جگمگا رہے ہیں
نئے فلک کی بلندیوں پر نرالی تانیں اڑا رہے ہیں

وہ کہکشاں کا پرانا جھولا کیا فرشتوں نے پارہ پارہ
ہو کوئی، فطرت ابد تک اسکو عطا ہی کرتی نہیں اجارہ

نئے ادارے نئے اجارے نئے ارسطو نئے رواقی
نہ جامِ جم ہے نہ دستِ جم ہے نہ پینے والے رہے نہ ساقی

نئے مرض ہیں نئی دوائیں نئے نئے موت کے کچوکے
ہے کون جو اس کا وار ٹالے، ہے کون جو اس کا ہاتھ روکے؟

خرد نے فطرت پہ کرکے حملہ اسے غضبناک کر دیا ہے!
ذرا سی اک "جرأت رسا" نے بشر کو بیباک کر دیا ہے

جو آگ ذرے کے تھی جگر میں وہ آگ بھی اس نے جب چرا لی
تو منتقم اور غیور فطرت نے بھی قسم برملا یہ کھا لی

کہ پھونک ڈالے گی ابن آدم کو وہ اسی "شعلۂ خود شرر" سے
یہ دھوبیوں کے ذلیل کتے رہیں گے اب گھاٹ کے نہ گھر کے!

اسی "جہنم بکف شرر" سے یہ گبر جل کر کباب ہوگا ــــ!
اسے بھی جا کے ہوش آئیگا جب یہ وقفِ عذاب ہوگا

یہ دیر ہوگا نہ دیر والے وہ انقلابِ عظیم ہوگا!
یہ رطب و یابس نظر جو آتا ہے نذرِ نارِ جحیم ہوگا

یہ "دورِ حاضر کے را دمغبر" بزعمِ خود جو خدا بنے ہیں
جو "مشرقی بے نوا امم" کے امام اور پیشوا بنے ہیں!

یہ دینِ فطرت پہ ہنسنے والے ہوس کے مندر کے یہ پجاری!
جو مدعی ہیں پیمبری کے مگر جو در اصل ہیں مداری!

زمانۂ حال کے یہ قاروں سمیٹنے والے سیم و زر کے
خدائے جبار کی قسم ہے یہی "جو الہ مکھی" ہیں شر کے

جہانِ معصوم میں ہے سارا عناد ان سے فساد ان سے
فروغِ الحاد کا یہ باعث ہے برق پاش ارتداد ان سے

یہ منکرِ حشر و نشر ظالم ہوس کے بندے بنے ہوئے ہیں
کہ خشک و تر جہاں بھی جاؤ انہیں کے تنبو تنے ہوئے ہیں

جلی جو دیوار پر لکھا ہے انہیں نظر آ رہا نہیں کیا؟
عذاب جب سر پہ آ گیا پھر کسی کے ٹالے کہاں ٹلے گا!

یہ باد و باراں کے سخت طوفاں یہ ندی نالوں کی یم بدوشی
یہ غیظ "آتش فشاں پہاڑوں" کا شعلہ در بر یہ گرمجوشی

یہ آتیں یہ نشانیاں ہیں جہاں کو انتباہِ پیہم
ستم فلک کا انہیں نہ سمجھو کہ ہے سزاوار انکا آدم

اٹل امیںؔ ہے یہ "سنت اللہ[1]" یہ قاعدہ حشر تک رہیگا
خلافِ فطرت چلے گا جو بھی مثالِ حرفِ غلط مٹے گا!

"ساقی"

[1] قانونِ فطرت

جب کبھی آپ بیمار ہوں

جب کبھی اپنی صحت کی خاطر آپ کو کسی دواخانہ کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے تو اس وقت قدرتی طور پر آپکے دل میں یہ سوال پیدا ہوتے ہیں (الف) کیا وہ دواخانہ جس سے آپ دوائی لینا یا منگانا چاہتے ہیں اپنے مرکبات میں قیمتی اور اصلی ادویہ صحیح وزن کے مطابق ڈال رہا ہے؟ (ب) کیا تجربہ کار اور صحیح طبیب آپ کے لئے صحیح دوا تجویز کر رہے ہیں؟
خدا کا شکر ہے کہ اس کے فضل و کرم سے "حاذق دواخانہ بندر روڈ۔ کراچی" اس دھوکہ باز اور اشتہاری زمانہ میں بھی اس دوگونہ معیار پر پورا اتر رہا ہے۔

عالی جناب حکیم سید نذیر احمد صاحب دہلوی

کی سرپرستی حاذق دواخانہ کی اس صداقت کی بہترین دلیل ہے

حکیم صاحب موصوف کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ہندوستانی پبلک عموماً اور طب یونانی سے دلچسپی رکھنے والے خصوصاً مدت دراز سے حکیم صاحب کو اچھی طرح جانتے ہیں آپ ۲۷ سالہ تجربہ رکھتے ہیں آپکی زندگی کے آٹھ قیمتی سال مسلسل طور پر مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کے طبیب پیشی کی حیثیت سے انکے ساتھ سفر و حضر میں کٹے آپ ہندوستانی دواخانہ کے مسلسل چھ سال تک ہر شعبہ کے نگراں رہے۔ کتاب حاذق اور مطب کلاں آپکی وہ مایۂ ناز اور مقبول عام تالیفات ہیں جو محتاج تعارف نہیں۔ آپ طبیہ کالج دہلی کی اعلیٰ کلاسوں کے پروفیسر رہے ہیں۔ اور آپ کی خدمات کے اعتراف میں یونانی طبیہ کالج کے جشن سلور جوبلی کے اہم موقعہ پر مارچ ۱۹۴۷ء میں منتظمان کالج نے آپکو امام طب کی اعزازی ڈگری سے سرفراز فرمایا ؎

این سعادت بزور بازو نیست　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ان حقائق کے پیش نظر چونکہ حکیم صاحب موصوف بنفس نفیس حاذق دواخانہ کے جملہ امور کے نگراں ہیں، اور مطب کے علاوہ اپنا تمام وقت اور اپنی توجہ دواخانہ کی اصلاح اور درستی میں صرف کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی نگرانی میں تیار کرائے ہوئے اس دواخانہ کے مجربات اور مرکبات آپ کی صحت کے بہترین ضامن ہیں۔

منیجر :- حاذق دواخانہ بندر روڈ، کراچی نمبر (۱)

ابنِ فرید •

آنچل اور پرچم!

وہ اب تک یہ نہ سمجھ سکی تھی کہ وہ سوچ کیا رہی ہے یا یہ کہ وہ سوچنا کیا چاہتی ہے بس جیسے کسی نے اس کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ قنوطی ہوتی چلی جائے اور وہ بے بس سی خود کو اس کیفیت میں ڈھالتی چلی جا رہی تھی اور اس ذہنی تھکن کے ساتھ وہ احمد اور اسلم وغیرہ کا انتظار کر رہی تھی جن میں سے وہاں ابھی کوئی بھی نہیں آیا تھا

میز کا سبزی مائل شیشہ بالکل صاف تھا۔ کرسیاں دستور ازلی انداز میں جڑی ہوئی تھیں اور فرش پر ہلکی ہی نمی موجود تھی جس کو آنے والے قدموں نے پامال نہیں کیا تھا اور کافی ہاؤس کی صاف وشفاف دیواروں پر بجلی کی روشنی ایک عظمت پیدا کر رہی تھی ——— لیکن جیسے ان سب میں وہ تھکن کا ایک بہت بڑا امتزاج محسوس کر رہی تھی اور ہر چیز نہ معلوم کیوں کھوکھلی سی نظر آ رہی تھی۔

اس نے اپنا سر کرسی کی پشت پر ٹکا دیا اور آہستہ سے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر ایک گہری سانس لی اور دم سادھ لیا۔ دریچہ پر لٹکتا ہوا پردہ لہرایا اور نقرئی چاند کی کرنیں چوروں کی طرح دریچہ کے شیشوں سے جھانک کر پردہ کے پیچھے چھپ گئیں۔ اور ایک بار پھر اسیطرح پردہ لہرایا اور کرنیں جھپک کر پردہ کے پیچھے چلی گئیں۔ مگر وہ آنکھیں بند کئے ہوئے تھی اور کافی ہاؤس کی مانوس گھٹی گھٹی سی بھنبھناہٹ اس کے کانوں سے ٹکرا کر واپس جا رہی تھی اور آرکسٹرا سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے کتوں کی طرح رو رہا تھا۔

دو قدموں کی آواز اس کی طرف تیزی سے بڑھی ———

لیکن وہ اپنے کرب انگیز خیالات میں کھوئی رہی، جیسے وہ ان قدموں سے اچھی طرح مانوس تھی اور اسے کسی خاص توجہ کی ضرورت نہ تھی وہ تو یونہی کافی ہاؤس کی ایک میز سے دوسری میز تک اور ایک کونہ سے دوسرے کونہ تک تیز تیز گردش کیا کرتے ہیں اور ایک جانیوالے کے بعد دوسرے آنیوالے کا یونہی عجلت کے ساتھ خیر مقدم کیا کرتے ہیں وہ اپنی اس محدود چک پھیری کے بعد کچھ اور نہیں سوچ سکتے وہ ان آنے اور جانے والے خداوندوں کے اشاروں پر مکروہ دانتوں کی نمائش اور بھونڈے سلاموں کی مشق کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے ——— یہی انھوں نے اپنے لئے مقدر کر لیا ہے اور یہی ان کی دنیا ہو کر رہ گئی ہے ——— اس نے بے پروائی سے آنکھیں کھولیں۔ بیرا اس کی طرف آ رہا تھا اس کے پٹکے اور پگڑی کی لہریں کے سرخ اور نیلے رنگ آپس میں الجھتے اور مٹتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اس کی سفید وردی پر سیاہ کالر کے بہت ہی دھندلے سے دھبے عجیب المیہ پیش کر رہے تھے ——— لیکن نہ وہ اس سرخ اور نیلے رنگ کے پھیکے پن پر ٹکنا چاہتی تھی اور نہ ہی اسے یہ منظور تھا کہ اس کے تصورات کی رو کہیں آ کر رک جائے ——— اس لئے اس نے ایک تنہائی اور طویل وقفہ کی خواہش میں بیرے کو کافی آرڈر دے کر روانہ کر دیا اور خود پھر اسی طرح غم آگیں سی ——— آنکھیں بند کر کے کرسی کی پشت پر سر لٹکا کر بیٹھ گئی ——— مگر اب جیسے اس کو ایک اور خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ وہ لوگ جب آئیں گے تو خیالات کا یہ تسلسل پاش پاش ہو جائے گا۔ اور تصورات کا یہ بہاؤ ختم کر دیا جائے گا اور اس کی یہ کیفیت اس سے بالکل رخصت ہو جائے گی ——— پھر وہ کیا کرے؟ ——— جیسے اس خلش نے اسے اور بھی پراگندہ کر دیا ——— اور ڈوبے سہارا سی خیالوں اور تصوروں میں بھٹکنے لگی ———

میز پر ٹرے رکھنے کی ہلکی سی کھنک سنائی دی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور سنبھل کر بیٹھ گئی ——— بیرا پیالی اور کافی دان اس کے سامنے رکھ رہا تھا۔ اس نے ایک نظر غلط انداز اس پر

ڈالی اور اپنی سنجیدہ سی اکتاہٹ میں مدغم کافی بنانے لگی - پھر غیر ارادی طور پر سامنے دوسری میز کی طرف دیکھنے لگی۔ یہاں سیاہ سرج کی شیروانی والا وہ آدمی بیٹھا ہوا تھا جس کی صورت سے کافی ہاؤس ... آنے والا ہر شخص واقف تھا ——— وہ سگریٹ کے پھیلتے ہوئے دھوئیں میں سے آج اس نئی عورت کی طرف حریص نظروں سے دیکھ رہا تھا جس کے سامنے اس نے کافی ہاؤس کی نعمتوں کا ڈھیر لگا دیا تھا ——— اس عورت کے چہرے پر ایک غیر جذباتی پن تھا اور اس کی آنکھوں میں کوئی تاثر نہیں تھی ——— اور اس کی مسکراہٹ میں کوئی خلوص نہیں تھا جیسے وہ ایک اور معمولی لکھی پڑھی جوان نعمتوں کو دیکھ کر لپک آئی تھی اور پھر وہ یا تو وہاں سے ہٹا دی جائے گی یا خود ہٹ جائے گی بالکل اس عورت کی طرح جو آج اس سرج کی شیروانی والے شخص کی بجائے دور ایک اور میز پر ایک بدصورت سے آدمی کے ساتھ اس طرح باتیں کر رہی تھی کہ وہ اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھا لینا چاہتی ہے ——— آخر وہ عورت اتنی بے تاب کیوں نہ ہوتی اسے گھر کا خرچ جو چلانا تھا اور اپنے شوہر کے ظاہری ٹیپ ٹاپ کو بھی قائم رکھنا تھا۔ جو کسی نئے آدمی کے ساتھ بیٹھا ہوا سگریٹوں کو پھونکتا چلا جا رہا تھا اور کافی چڑھاتا چلا جا رہا تھا اور اپنے مربی سے یقیناً کسی حسین سی لڑکی کا تذکرہ کر رہا تھا - اور دل میں یہ اچھی طرح محسوس کر رہا تھا کہ یہ حسین لڑکی جو جلد ہی اس نو وارد کی آغوش کو گرم کرے گی اس کی اپنی ہی بیوی ہی ہو گی ——— ؟؟

نہ معلوم کیوں اسے کافی ہاؤس کی ہر چیز پر ایک پراسرار ساطاری نظر آ رہا تھا جیسے ان زمردی فصیلوں کے باہر کوئی بڑی حماقت نکرانے کیلئے بیقرار کھڑی ہوئی ہے - اس لئے وہ جلد ہی اس گھٹی گھٹی بھنبھناہٹ سے اکتا کر اپنے تصورات کے ویرانوں میں واپس آ گئی ——— اور دریچہ کا پردہ لہرا رہا - اور چاند کی خنک کرنیں شیشوں پر پھیلتی رہیں - مگر وہ اپنے تصورات میں بہتی رہی -

پھر غیر اختیاری طور پر کافی ہاؤس کے باہر اخبار والے رسالے بیچنے والا لڑکا اس کے تصوری مرکز میں رینگ آیا جو کافی ہاؤس میں ہر آنے والے اور کافی ہاؤس سے ہر واپس جانے والے کے سامنے اخبار بڑھا کر بے چارگی کے انداز میں کہا کرتا تھا۔ "بابو جی ——— آج کا تازہ اخبار" اور جواب میں خاموشیاں جھڑکیاں اور دھکے پاتا تھا ——— مگر وہ برابر تازہ اخبار پیش کیا کرتا تھا ممکن ہے کوئی اس کی دو پیسے کی آمدنی ہی کر دے -

اور جب یہ دو پیسے کی آمدنی ہوتی تھی اور وہ دو پیسے چھ پیسوں کے ساتھ مل کر آتے تھے تو ان میں گھستی ہوئی جو حقارت آتی تھی وہ اس کو کسی طرح الگ نہیں کر سکتا تھا۔ شاید وہ اسے نظر انداز کر چکا تھا۔ اور ہر بابو اور صاحب کے سامنے جھک کر لگا یا کرتا تھا اور مسکینی کے ساتھ صرف ایک پیسہ کے لئے التجا کرتا تھا۔ جتنوں سے وہ سوال کرتا تھا سب اسے خشمگیں لہجے میں گالیاں دیا کرتے تھے اور دھتکار دیا کرتے تھے۔ مگر جب کوئی ننھا حقیر سا سکہ اسکے سامنے لڑھکنے لگتا تھا تو وہ بھوکی بلی کی طرح اس پر جھپٹ پڑتا ——— تہذیب اور تمدن کی یہ سرزمین کتنی ناہموار تھی ——— باہر انسانیت دم توڑ رہی تھی لیکن پھر بھی جدوجہد کر رہی تھی ——— اور یہاں ——— زمردی دیواریں اپنی عظمت کے سہارے اس طرح اپنے شیدائیوں کو آغوش میں لئے ہوئے تھیں کہ باہر کی آوازیں دروازوں پر لٹکتے ہوئے پردوں سے ٹکرا کر واپس ہو جاتی تھیں ——— شاید اسی وجہ سے اگر اسلم اسے نہ جھنجھوڑتا تو وہ روز یونہی کافی پینے آ جایا کرتی اور واپس چلی جاتی اور کافی کے سوندھے پن کے علاوہ اس میں تلخی کے امتزاج کو نہ محسوس کر سکتی ———

یونہی خیالوں میں کھوئے ہوئے اس نے دریچہ کی طرف دیکھا۔ پردہ اب ہل رہا تھا۔ مگر اتنا نہیں کہ چاند کی نقرئی کرنیں اندر جھانک سکیں۔ ورنہ وہ انکے وجود کو محسوس کر سکے ——— اس نے پیالی اٹھائی اور کافی کا ایک جرعہ لیا ——— اس دن انیتا اور اسلم کتنے تھک گئے تھے۔ جب دونوں کے دونوں عوام کا ایک جلسہ منظم کر رہے تھے اور لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ جلسے کے

وقت کا اعلان کرتے کرتے انکے گلے پڑ گئے اور شام کو انیتا اور اسلم نے اپنی آوازوں کے مدہم پڑ جانیکے باوجود اپنی مختصر سی تقریروں کی وجہ سے عوام کی تحسین و آفرین کا ایک طوفان اپنی طرف امڈتے ہوئے محسوس کیا ——— ! جیسے یہ انکی منزل کے ابتدائی سنگ میل تھے، اس نے محسوس کیا ——— جلسے کے بعد ہی وہ سب وہاں سے سیدھے کافی ہاؤس آ پہنچے تاکہ اپنی تھکن کو کافی کے دو جرعوں کی نذر کر سکیں۔ لیکن اس دن احمد کا وہ زہر خند ——— ؟

اسلم صاحب میں یہ نہ سمجھ سکا کہ عوام کی تحریک کو کافی ہاؤس سے کیا تعلق ہے "

" بھئی احمد پھر تم ناصح بن بیٹھے "

" خیر، اگر آپ کوئی جواب دینا نہیں چاہتے تو بات دوسری ہے ۔ ورنہ یہ ایک اہم سوال بن کر میرے ذہن میں گونج رہا ہے "

اچھا ! ——— اتنی اہمیت ——— ؟ ——— دن بھر کی الجھنوں کے بعد اگر میں یہاں چند لمحوں کے لئے آ جاتا ہوں تو کیا ہرج ہے ؟ ——— "

مگر میں تو سمجھتا ہوں کافی ہاؤس کے باہر کی دنیا کافی ہاؤس کے اندر کی دنیا سے کسی طرح مصالحت نہیں کر سکتی ——— ! "

اسلم نے جھنجھلاہٹ میں اپنے ہونٹ دانتوں سے کاٹ لئے اور اس کی دونوں بھنویں اس طرح ایک دوسرے کی طرف بڑھیں کہ جیسے آپس میں بہت زوروں سے ٹکرا جائیں گی۔ اور چیختی ہوئی آوازوں میں ملی ہوئی شکست و ریخت کافی ہاؤس کے ہر کونہ میں پھیل جائے گی اور ان زمردی دیواروں پر ایک دھند سی طاری ہو جائے گی۔ اس نے اسلم کے چہرے پر رنگوں کے پھیلتے ہوئے دھندلکے کو محسوس کیا اور احمد کی تلخ باتوں سے الجھن سی محسوس کرنے لگی اور اس نے انتہائی نفرت انگیز لہجہ میں احمد کو جھڑک دیا۔

" مسٹر احمد یہ وقت ایسی مذموم باتیں کرنے کا نہ تھا "

" اگر ہم اپنی زندگیوں کے دو متضاد پہلوؤں کا جائزہ لیں تو کیا یہ مذموم بات ہوگی مس ناہید۔ ! "

" آپ بھی تو یہی کچھ کر رہے ہیں احمد صاحب " اس نے احمد پر ایک کاری طنز کیا۔

" میں اقبال کرتا ہوں اور مجھے اس کا احساس ہے لیکن جب مجھے یقین ہو جائے گا کہ میں نے اپنے ساتھیوں کو بھی اس کمزوری سے اچھی طرح آگاہ کر دیا ہے تو میں کافی ہاؤس سے چلا جاؤں گا "

جیسے کوئی اس کے اندر سے بول اٹھا تھا، یہ تصنع ہے تصنع " اور اس نے ان فقروں کو بالکل اہمیت نہ دی اور اسلم کے لئے جو ہمدردی اس کے دل میں تھی برقرار رہی ——— لیکن اس وقت یہ کش مکش تھی۔ کل اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ انیتا میں اسلم کے لئے اب وہ کشش نہیں رہ گئی تھی جو اس وقت تھی جب وہ دن بھر اس کے ساتھ کار پر اڑی پھرا کرتی تھی ——— اس خبر کے بعد وہ کچھ فیصلہ نہ کر پائی تھی ——— اب وہ سر میں ہلکی ہلکی سی ٹیسیں اٹھتی ہوئی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے پیالی میں کافی کی قلیل مقدار کو گھورنا شروع کر دیا اور دریچہ پر پردہ ملتا رہا اور چاند کی سیمیں کرنیں شیشے پر رقص کرتی رہیں ——— پھر اسے اس دن احمد کے جملے یاد آنے لگے لیکن وہ انھیں اہمیت دینے سے اجتناب برتنا چاہتی تھی۔ اور وہ جملے اور ان کے الفاظ جو اس جلسے کے بعد یہیں کافی ہاؤس میں احمد کی زبان پر آئے تھے اور تیز ہوتے جا رہے تھے ——— اور اس نے ان کو اپنی توجہ سے نکالنے کے لئے ایک بار پھر انیتا اور اسلم کی کشیدگی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔

اس کا احساس دکھ بھرے ساز کی طرح جھنجھنا اٹھا تھا اس کے شعور سے متعدد تیر ٹکراتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے اس کے دل کو جیسے کوئی اپنی بے رحم مٹھی میں زور زور سے دبا رہا تھا اور درد اس کو بے کل کئے دے رہا تھا۔ انیتا اور اسلم کی کشیدگی نے اس کے تصور میں کل شام کے واقعات کو زندہ کر دیا تھا۔ اس بہت سی مبہم باتیں جن کو وہ بے معنی سمجھ رہی تھی۔ مربوط ہو گئی تھیں ——— جب کل شام کو وہ برآمدہ میں کھڑی ہوئی اسلم کا انتظار

کوثر نیازی •

تم آہنِ نفس ــــ خام رکھو!

(ایک باغی مرید کو اس کے متقی پیر کی نصیحت)

کتابِ حق کی تلاوتوں کے حسین میدان کا مرد ہوں میں ـــ!
ریاضتوں میں بھی طاق ہوں میں، عبادتوں میں بھی فردِ ہوں میں
مناظروں کی یہ "سخت دنیا" مرے لئے بزمِ رنگ و بُو ہے
مری تقدّس مآب خلوت کی دھوم دنیا میں چار سُو ہے

جہالتوں کی زمینِ بنجر میں دیں کے گلشن اگا چکا ہوں
میں اپنے وعظوں کے توپ گولوں سے کفر کے محل ڈھا چکا ہوں
کرامتوں کے ہزار جھکڑ چلیں، اگرچہ یہ بات آئے
یہ میرے تعویذ فوجیوں کے "وغا" میں سو بار کام آئے

میں نفسِ ملعون کو زیر کرتا ہوں، نعمتوں کو "حرام" کر کے
بڑے مراتب سپرد ہو گئے مجھے اس آہن کو خام کر کے
درود و تسبیح کے مشاغل، یہ ہُو کی ضربیں، یہ حق کے نعرے
سُنے جو روح الامین ان کو کبھی تو اس کو بھی وجد آئے

مجھے یہ سب لوگ جانتے ہیں میں اہلِ تقویٰ میں منفرد ہوں
میں پیر بھی ہوں فقیر بھی ہوں میں صوفی صافی ہوں مجتہد ہوں
میں "دنیاداری" سے بھاگتا ہوں فقط ہوں "دینِ ہُدیٰ" کا قائل
مجھے لڑائی سے کیا غرض ہے فقط دعاؤں پہ ہوں میں مائل

یہ سب سیاست ہے کارِ شیطاں اب اسکے گھیرے میں کون آئے؟
یہ اِک اندھیرا ہے اِک اندھیرا اب اس اندھیرے میں کون آئے؟
نظامِ حق کا نفاذ "حق ہے"، مگر حکومت سے کون اُلجھے؟
ذرا تقاضائے وقت دیکھو، اب اس رعونت سے کون اُلجھے؟

ہر اک قدم پر صعوبتیں ہیں تمھیں مگر پھر بھی یہ مَرَض ہے
تمہیں ہو فکرِ نجات اپنی، تمھیں مگر زمانے سے کیا غرض ہے؟
یہ ہے صراطِ نبیِؐ اکرم، تم اپنے "نفلوں" سے کام رکھو
بڑا ہی ملعون ہے یہ سرکش، تم آہنِ نفس خام رکھو

خدا کا اپنا ہے دینِ برحق، نفاذ اس کا وہی کرے گا
جو اسکی مرضی میں دخل دیگا، لحد انگاروں سے وہ بھرے گا!

م۔ صدیقی •

انقلاب ابھی نہیں آیا!

[۲۳ر جنوری ۱۹۵۰ء کو ایک حلقۂ احباب میں "حالات حاضرہ" پر
گفتگو ہو رہی تھی۔ ہمارے ایک دوست فرمانے لگے کہ انقلاب
تو آیا ہی نہیں، کیونکہ نیچے کے لوگ اوپر اور اوپر کے لوگ نیچے نہیں ہوئے
یہاں "عوامی انقلاب" کی ضرورت ہے۔
میں نے ان سے عرض کیا کہ عوامی انقلاب کی جو تعریف آپنے
فرمائی ہے صحیح نہیں۔ اوپر کے لوگ نیچے اور نیچے کے اوپر آبھی جائیں
جب بھی اسلامی نقطۂ نظر سے ہم انقلاب کو عوامی نہیں کہہ سکتے،
تاوقتیکہ ہماری روزمرہ کی زندگی کے اخلاق کا نقشہ بالکل بدل نہ جائے
اور یہ کام موجودہ زندگی کو اس کی جڑوں سے کھود کر نئی کاشت کئے بغیر
نہیں ہو سکتا۔
اس پر وہ کہنے لگے مصیبت یہ ہے کہ ہمارے ملک کا "مولوی"
نہیں بدلتا۔ میں نے عرض کیا کہ ایک "مولوی" ہی پر کیا موقوف ہے
ہمارا لیڈر، ہمارا ایڈیٹر، ہمارا ادیب، ہمارا اکّہ بان، ہمارا موٹر ڈرائیور،
ہمارا حلوائی، ہمارا قصاب۔ ہمارا کنجڑہ، ہمارا کلرک ـــــ جوں کا توں
ہے اور ان میں سے ہر ایک انقلاب کے راستے میں روڑا بنا ہوا ہے۔
چنانچہ میں نے ان کے سامنے روزمرہ زندگی کے خد و خال گنوانے شروع
کئے اور اپنا تاثر بتایا کہ موجودہ ماحول میں بہتر اخلاق کی اگر کوئی مثال
سامنے آتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تاریکی میں کوئی جگنو
چمک گیا ہو ـــــ اسلامی نقطۂ نظر سے جو انقلاب
ہمیں مطلوب ہے وہ تو بہت ہی محنت طلب ہے۔
خیر یہ گفتگو تو اپنے خطوط پر جاری رہی، لیکن اس گفتگو کا
جو ماحصل جوہر تھا، اسے میں نے پھیلا کر قلمبند کرنے کی جو کوشش کی
ہے وہ قارئین کی خدمت میں حاضر ہے]
ملک تقسیم ہوا، خون بہے، گھر چھنے، عصمتیں لٹیں، ہجرتیں ہوئیں
آقا بدل گئے، عہدے بٹ رہے ہیں، خزانے لٹ رہے ہیں کنبے پل
رہے ہیں، جلسے ہو رہے ہیں نعرے گونجتے ہیں، آزادی کے جشن
منائے جا رہے ہیں، تقاریب پر مظاہرے ہو رہے ہیں۔
لیکن ـــــ انقلاب ابھی نہیں آیا!
مجھے معلوم ہے کہ وزیر دورے کرتے ہیں، سفیروں کے
استقبال ہوتے ہیں، گورنر جنرل کے لئے ضیافتیں منعقد ہوتی ہیں لیکن
ان حرکات سے حیاتِ نو کی تعمیر نہیں ہوتی۔
یہ دیکھئے اس بس میں آزادی کے مظاہر اور ترقی کے نمونے
ـــــ ایک ٹولی گپیں لڑا رہی ہے، زور زور سے قہقہے
بلند ہو رہے ہیں، ہر نووارد پر فقرے کسے جا رہے ہیں۔ آس پاس
گذرتی عورتوں کو تاکا جا رہا ہے یہ ان لوگوں کی تفریح ہے۔ ادھر ایک
صاحب بے تکلفی سے مسلسل تھوک رہے ہیں ان کو احساس نہیں کہ
بس کے باہر بھی انسان پائے جا سکتے ہیں ـــــ یہ مشغلہ لطیف
ہے کہ برابر جاری ہے۔ وہ دیکھئے۔ سامنے کوئی تانگہ تھا، ڈرائیور
نے تانگے والے کو گالی دی، تانگے والے نے اس سے بڑی گالی اگل دی
یہ ادھر ملاحظہ ہو، بس رکی نہیں کہ ایک ہجوم اندر گھسنے کیلئے یورش کرنے
لگا، اس کا لحاظ نہیں کہ پہلے اترنے والے اتر لیں۔ کنڈکٹر کی ڈانٹ
بھی ملاحظہ ہو، خدا کے بندے کو سلیقے سے بات کرنا نہیں آتی۔ اب اللہ
اترنے والوں پر بھی نگاہ ڈالئے، ایک سے دوسرے کو زیادہ جلدی
ہے، ہر پیچھے والا اگلے کو دھکیل رہا ہے، تاکہ ہڑبونگ کی شان پیدا
ہو کے رہے! اب سوار ہونے والوں کی تہذیب پر توجہ فرمائیے۔ شریف
سے شریف نظر آنے والا ـــــ داڑھی والا بھی اور سوٹ والا بھی
دھکم دھکا کرکے اپنے آپ کو آگے لا رہا ہے اور دوسروں کو پیچھے چھوڑ رہا
ہے اس سارے ہجوم میں صرف دو آدمی تھے جو صبر سے پیچھے کھڑے

رہ گئے۔ ان کے لئے جگہ نہیں رہی کنڈکٹر نے بس چلانے کیلئے وسل دیدی
بس چل پڑی، وہ دونوں کھڑے دیکھتے رہ گئے صرف اس وجہ سے کہ
بدتمیزی کے فن میں کوتاہ تھے!

پھر کیا یہ واقعہ نہیں کہ انقلاب ابھی نہیں آیا!

یہ بازار ہے!

یہ حلوائی کی دکان ہے جس پر مکھیاں اپنے واداجی کی فاتحہ پڑھنے
میں مصروف ہیں، پانی ملا دودھ ابل رہا ہے لوگ خرید خرید کر پی رہے
ہیں، دودھ کے پیالے انتہائی کریہہ صورت کے ہیں۔ ان کو حلوائی
کا ساتھ گرد بار بار ایک گندی صافی ملکر دھو رہا ہے۔ بناسپتی گھی کی
مٹھائیاں سجی رکھی ہیں۔ باہر "اصلی گھی کی مٹھائیاں" کا بورڈ لگا ہے۔
یہ مٹھائیوں کی دکان نہیں ٹھگی کی دکان ہے، لیکن سودا ہے کہ بکے جا رہا ہے
گاہک ہیں کہ ٹوٹے پڑتے ہیں، حلوائی ہے کہ گندی دھوتی باندھے تنا بیٹھا
ہے اس کی شکل دیکھئے، غنڈہ پن کا نور ابلا پڑتا ہے۔

ادھر نیچے کبابوں کا خوانچہ لگ رہا ہے، موٹے گوشت کی
ارزاں ترین قسم کا قیمہ کوٹا رکھا ہے۔ اس میں چٹ پٹے مسالے حل کئے
جا چکے ہیں۔ رہی سہی کسر سڑک کی گرد پوری کر رہی ہے جو موٹروں
کے پاس سے گزرنے کی وجہ سے اڑ اڑ کر برس رہی ہے، ایک خوش
پوش نوجوان کھڑا کھڑا کباب کھا رہا ہے دوسرا دیہاتی کبابی کی بغل
میں بیٹھا مزے لے رہا ہے، تینوں میں سے کسی ایک کو شرم نہیں آتی۔
یہ مجلس کباب گواہی دے رہی ہے کہ انقلاب ابھی نہیں آیا!

لیجئے اب آپکو "دواخانہ حیات بخش" کا منظر دکھائیں۔ ملاحظہ
تو فرمایئے کس شان کے بورڈ لگے ہیں، مگر بورڈ کیا دیکھئے گا بورڈوں کے
پیچھے دیکھئے۔ ڈبوں اور شیشیوں پر میل کی جو کالی کالی تہیں جمی ہوئی ہیں
ذرا ان کی عمر کا اندازہ تو کیجئے۔ ان کے اندر کی دواؤں کے متعلق کون کہہ
سکتا ہے کہ یہ کب کی خرید کردہ ہیں۔ الماریاں ملاحظہ ہوں، کوئی تختہ
فٹ بھر چوڑا ہے کوئی دس انچ۔ کوئی چار انچ، کوئی ایک طرف سے
پیچھے ہٹا ہوا ہے اور ایک طرف سے آگے نکل رہا ہے کسی کا ایک سرا
نیچے ہے دوسرا اوپر کو اٹھا ہے، جیومیٹری کی ہر شکل نگاہوں کے سامنے
ہے مگر اگر نہیں تو حسن ترتیب نہیں! اسی طرح ڈبوں، بوتلوں اور
مرتبانوں میں سے ہر ایک کا سائز، رنگ، حجم اور ڈیزائن دوسرا ہے
وہ دیکھئے بوریاں پڑی ہیں۔ یہ ادھر کھدر کی تھیلیاں لٹک رہی ہیں
چٹائیوں پر کوڑا پھیلا ہوا ہے۔ حکیم صاحب جائے نماز بچھائے گاؤ تکیہ
لگائے آج سے پچاس سال پہلے کی شان کیساتھ بیٹھے ہیں۔ آپ نابینا
ہیں، اور اگر حکیم نابینا ہو تو اسکی مہارت فن پر زیادہ بھروسہ کیا جاسکتا
ہے، ایک عورت نبض تھامے بیٹھی ہے گود کا بچہ دودھ پی رہا ہے،
حکیم صاحب سوال کر رہے ہیں اور وہ جواب دے رہی ہے۔ ادھر
ایک صاحب دواؤں کی پڑیاں باندھنے کی ڈیوٹی پر مامور ہیں۔ ان کے
ہاتھوں کو دیکھئے تو غلاظت کے شاہکاروں کا مظاہرہ ہو رہا ہے یہی
ہاتھ سیدھے ——— چمچے یا کانٹے کے واسطے کے بغیر ——— مربے کے مرتبان
میں جا اترتے ہیں، پھر ان کو دوا ساز صاحب اپنی کھدر کی شلوار سے کل دیتے
ہیں۔ پھر یہی ہاتھ اپنی انگلیاں معجون کے ڈبے میں ڈالتے ہیں۔ انگلیوں
سے چپکی ہوئی معجون چاٹ لی جاتی ہے، پھر انہیں سے بنفشہ نکال کر تولا
جاتا ہے، پھر یہی ہاتھ سفوف کی پڑیاں بنانے لگ جاتا ہے وہ دیکھئے
عرق کاسنی کی بوتل اٹھائی گئی، بوتل پر مین کا ڈھکن کس حسن ذوق کا
ثبوت دے رہا ہے، اور عرق ناپنے کے پیمانے کی صفائی پر بھی توجہ ہونی
چاہیئے ادھر بھی ایک نگاہ تو ڈالتے جایئے۔ حکیم جی کے پہلو میں ان کے
ایک نابالغ صاحبزادے کھرل لئے نہ معلوم کن جواہرات کی پسائی کر رہے
ہیں۔ بات کرتے ہیں تو تھوک اچھل اچھل کر کھرل میں جا پڑتا ہے۔

یہ ہے آپ کی اسلامی طب ——— یہ لوگوں کی جانیں
بچانے کا ادارہ ہے، یہ قوم کی صحتوں کی تعمیر کا مرکز ہے اور یہ مرکز کہہ رہا
ہے کہ انقلاب ابھی نہیں آیا!

یہ محلے کا راشن ڈپو ہے! ڈپو ہولڈر بڑا شریف آدمی ہے' یہ
نہ معلوم کہاں سے "ضرورت مندوں" کو زائد شکر سپلائی کرتا ہے،
یہ الگ بات ہے کہ زائد سپلائی کیلئے نرخ بھی معیار سے زائد رکھا گیا
ہے کیونکہ بلیک مارکیٹ کا اخلاقی آئین یہی ہے۔ یہ لوگوں کے
مراتب کا پورا پورا لحاظ کرتا ہے محلے کے رؤسا کے ملازم بعد میں آکر بھی
راشن لے سکتے ہیں لیکن غریب غربا پہلے آکر بعد میں راشن لیتے ہیں۔ کیونکہ
ان کا وقت زیادہ قیمتی نہیں ہوتا ہے۔

یہ ڈپو بھی فریاد کرتا ہے کہ انقلاب ابھی نہیں آیا !

چھوڑیئے راشن ڈپو کو ——— وہ دیکھئے ۔ آپ کی سوسائیٹی کی چند معزز ترین خواتین جا رہی ہیں ، دوپٹوں سے آزاد سر، پوڈر سے آباد چہرے ، ہاتھوں میں خوشنما پرس ، سینٹ کی تیز خوشبو، بے باک قہقہے ، شاعرانہ نقرے ، گھورتی نگاہیں ، پھٹی آنکھیں ، یہ پاکستان کی ترقی کا طوفان جا رہا ہے !

یہ سڑکوں پر اس لئے ٹہلتی ہیں تاکہ ملک کا دفاع کر سکیں ، یہ پارکوں میں اس لئے گھومتی ہیں کہ خدمت ملت کا حق ادا کر سکیں یہ " میک اپ " کا مظاہرہ اس لئے کرتی ہیں کہ قوم ترقی کر سکے ——— یہ اگر مینا بازاروں کا اہتمام نہ کریں تو " اسلامی ریاست " کیسے مضبوط ہو ؟ یہ اگر سینما نہ جائیں تو اسلامی تہذیب کیسے ترقی کرے ؟ یہ اگر رقص کی محفلیں نہ جمائیں تو آخر اسلامی ماحول کس طرح تعمیر ہو ؟ یہ اگر کیمروں کے سامنے پریڈیں نہ کریں تو اسلامی جہاد کی تیاری کیسے مکمل ہو ؟ یہ اگر مردانہ علمی اور سیاسی مجلسوں میں شریک نہ ہوں تو بیچارے مرد اکیلے کیسے مہم سر کریں ؟ یہ اگر دفتروں میں ٹائپسٹ نہ ہوں تو حکومت کا نظم و نسق کیسے چلے ؟ اگر ضیافتوں میں جانا چھوڑ دیں تو لوگوں کی قوت ہضم کیسے کام کرے ؟

اس " بے نقابی " کے ساتھ ساتھ ذرا نقاب دارانہ نسائیت کے نمونے بھی ملاحظہ ہوں ۔ اول تو برقع اطلسی ، پھر اس میں انتہا درجہ کی فیشنی اور سونے پہ سہاگہ اسکی رومانی تراش خراش ——— اور اس پر مزید ستم یہ کہ اس میں ہر طرف ایسے کٹاؤ کہ ہر باطن از خود ظاہر ہوتا رہے پہنا بالکل مجبورانہ لیکن اطمینان اتنے پر بھی نہیں ، چہرے سے نقاب بہرحال اٹھی رہیگی تاکہ میک اپ کے لئے جو محنت کی گئی ہے اور زیور پہ کچھ صرفہ اٹھا ہے ، اس کیلئے ایک دنیا گواہ رہے !

عورت گھر میں رہے یا سڑکوں پر گھومنے لگے وہ اگر اسلام سے آزاد ہے تو مردوں کا دل لبھانے سے زیادہ اونچا کوئی مقام اسے کہیں نہیں مل سکتا ——— فرق صرف اتنا ہی ہوتا ہے ، جتنا انڈسٹری میں " انفرادی ملکیت " اور " قومی ملکیت " کے درمیان ہوتا ہے ۔ " شخصی مفاد " نہ سہی " رفاہ عامہ " ہی سہی !

لیکن ہاں ! عورتوں کے معاملے میں غضِ بصر ہی مناسب ہے !

——— یہاں تنقید کی نگاہ اور ہوس کی نگاہ میں زیادہ دیر فرق نہیں رہتی بہرحال عورتوں کی ترقی کو خود یہ شکایت ہے کہ انقلاب ابھی نہیں آیا !

یہ ہے ایک معیاری مجلس !

یہ شہر بھر کے دودھ کی بالائی اور مکھن ہے ! اہل ذوق جمع ہیں ! مشاعرہ شروع ہونے والا ہے شعرا میں سے چھوٹے درجہ کے حضرات تشریف لا چکے ہیں ۔ بڑے درجہ کے ابھی نہیں آئے ، وہ وقت مقررہ سے آدھ گھنٹہ بعد ہی پہنچیں گے ، یہ بڑے لوگوں کی بڑائی کی ایک مستقل علامت ہے ۔

ذرا اس شور کا اندازہ کیجئے ، جو مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے ہال میں بپا ہے ، جا بجا سینکڑوں مشاعرے بیک وقت شروع ہیں ، کرسیاں گھسیٹی جاتی ہیں تو سیمنٹ کا فرش کرخت آوازیں نکالتا ہے اور وہ ہال میں ، کئی کئی سیکنڈ تک گونجتی رہتی ہیں ۔ آپ صرف خموشی سے مطالعہ کرتے رہئے کہ یہاں کیا کچھ ہو رہا ہے ، کوئی اٹھتا ہے کوئی بیٹھتا ہے ، کوئی کسی ٹولی کی طرف جھکا کھڑا ہے ، کوئی ادھر اُدھر دوڑ رہا ہے کوئی کسی کو فن ندا کے خاص خاص کرشموں کے ساتھ پکارتا ہے کہیں باہم سرگوشیاں ہو رہی ہیں ، یہ دراصل مشاعرہ سننے کے سلسلے میں پروگرام بن رہے ہیں ۔ کسی کامیاب کرنے اور کسی کو ناکام کرنے کیلئے سازشیں مرتب ہو رہی ہیں " پرچیوں " کی ڈاک دوڑانے کے لئے ہال کے پچھلے سرے سے اسٹیج تک ڈیوٹیاں لگائی جا رہی ہیں اور پھر ہلڑ بازی کے لئے " لیڈروں " کا چناؤ ہو رہا ہے !

یہ ہیں ایک آزاد اسلامی مملکت کے بہترین شہری ———

بہترین ——— ہاں !!

" حاضرین " تو ہوئے حاضرین ! منتظمین مشاعرہ کے کمالات بھی یادگار رہیں گے ، وہ دیکھنا اسٹیج پر " سبجکٹ کمیٹی " کا اجلاس ہو رہا ہے ، پروگرام بن رہا ہے اور ساتھ کے ساتھ حاضرین سے اٹھ کر بعض " مشیر " اپنے اپنے مشورے بہم پہنچا رہے ہیں ، یہیں عین وقت پہ غیر معروف شعرا کے کلام پر سنسر بھی ہو رہا ہے ، مشاعرہ آٹھ بجے شروع ہونا تھا لیکن سوا آٹھ ہو چکے ، وہ ایک منتظم مائیکروفون کے سامنے آ پہنچے ہیں ، شور کم ہو گیا ، وہ معذرت کر رہے ہیں کہ مشاعرہ ساڑھے آٹھ بجے

برکراچی
شروع کیا جاسکے گا ۔ کیونکہ صدرِ مشاعرہ ایک بڑی ذمہ دار ہستی ہیں ،
لہٰذا وہ وقت مقررہ سے پندرہ منٹ لیٹ آئیں گے !
اعلان ختم ہوا تو تالیاں بجیں ۔ کچھ نقرے کسے گئے اور شور
کا سمندر پھر ٹھاٹھیں مارنے لگا ——— زندہ باد ! معززین شہر
اور اصحابِ ذوق !
اب مشاعرہ شروع ہو چکا ہے ۔ آپ ساری کارروائی کو خوشی
سے دیکھتے رہیے ۔ اور لوگوں کی ذہنیت کا جائزہ لیجیے !
شاعر نے دو ہی شعر پڑھے تھے کہ لوگوں نے واویلا مچا دیا ۔ اب
کوئی نہیں سُنے گا ، شاعر واپس جا رہا ہے لیجیے دوسرا آیا ، ملاحظہ
فرمایا مطلع ؟ اتنی فحش کلامی اور اس حالت میں کہ گیلری میں خواتین جمع
ہیں ——— لیکن داد کا نہ درہے ! یہ لیجیے کتنا گھٹیا شعر پڑھا گیا
کہ جس میں زبان اور فن دونوں کا خون کیا گیا ہے ، پھر بھی مجمع تحسنت و مرحبا
کی ایک مجسم صدا بن گیا ہے ۔ محض اس لئے کہ شاعر گویا ہے اور پھر
ایک پارٹی بھی اسکی پشت پر ہے !
وہ میسرے صاحب آئے ——— گو بیک کے شور سے
استقبال کیا جا رہا ہے ، اب صدر صاحب مجمع کی منت سماجت کر رہے
ہیں ، لو کچھ سکون ہوا ! واہ کیا اچھا شعر کہا ہے ، لیکن آپ نے سنا
کہ اس کونے سے کیا مغلظات بکی گئی ہیں ؟ گالی کو ایک مصرعہ میں
ڈھال کر اُسے پڑھا گیا ہے ! یہ دیکھئے ، پتوں کی ڈاک چل رہی ہے
کوئی پارٹی اپنے چہیتے شاعر کو بلوانا چاہتی ہے ۔
چھوڑیئے ! تضیع اوقات کہاں تک کریں گے ، مشاعرہ
کی روح بہرحال چیخ رہی ہے کہ انقلاب ابھی نہیں آیا !
ادھر ایک اور نظارہ بلا رہا ہے !
تانگے والا چابک بغل میں لئے ہاتھ جوڑ رہا ہے ، اور لٹ
معافی نہیں مل رہی ۔ دو شریف آدمی ' بلا معاوضہ سواری کا
مطالبہ کر رہے ہیں ۔ پوری سختی سے پورے جبر سے ! یہ دونوں
اس ادارے سے تعلق رکھتے ہیں جس کا فرض ہی یہ ہے کہ وہ ظلم کی
روک تھام کرے ، کمزوروں کو زور والوں کی زیادتیوں سے بچائے
لیکن خود یہ لوگ سب سے بڑھ کر زیادتیاں کرنے والے اور کمزوروں کو ستانے
والے ہیں ۔ تانگے والا کہہ رہا ہے کہ میرے بچے بھوک سے مر جائیں گے
لیکن وہ ہیں کہ الٹے دھمکا رہے ہیں ، اپنے اختیارات سے آگاہ کر رہے
ہیں پیچھے ایک نے کاغذ پنسل نکالا ، تانگے کا نمبر نوٹ کیا ، دوسرے
نے لائسنس طلب کیا ، اب تانگے والا مان گیا ہے ، وہ دیکھئے ایک
کود کے اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا ، دوسرا مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا پچھلی سیٹ
پر ڈٹ گیا اور تانگہ چل دیا ، نامعلوم منزل کی طرف !
تانگے والے کا دل ہی جانتا ہے ——— کہ یہاں ایک
انقلاب کی کتنی ضرورت ہے ! ——— اور انقلاب ابھی نہیں آیا !!
یہ ہاکر جا رہا ہے اس کی آواز سنیئے !
' فرزانہ اور کرغوٹ میں سمجھوتہ ہو گیا !
یہ آئندہ الیکشن کے لیے محاذ بن رہا ہے ، وہی پرانا محاذ
پرانے سپاہی ، پرانے سپہ سالار ، وہی پرانے اختلافات ' وہی پرانے
سمجھوتے ——— آپ جانتے ہیں کہ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے قومی
زندگی کو گدلا کرنے کی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں ۔ لیکن پھر
بھی ان کو اس بات کی جرأت ہو رہی ہے کہ وہ دندنا کر میدان میں
آئیں ۔ سیاست ان کی جاگیر ہے ، ووٹر ان کے مزارعین ہیں ، ان کو
یقین ہے کہ عوام ہم سے منہ موڑنے کی قدرت ہی نہیں رکھتے ، انکو
بھروسہ ہے کہ روپیہ ہر مضبوط سے مضبوط ضمیر کو خرید سکتا ہے ، انکو
اطمینان ہے کہ ان کا اثر و رسوخ آزادی کے جذبوں کو دبا کے رکھ
سکتا ہے ، یہ برابر جوڑ توڑ کر رہے ہیں ، خفیہ مشورے ہو رہے ہیں اور
ان کے ایجنٹ چاروں طرف تگ و دو میں مصروف ہیں اب آپ
خود سمجھ سکتے ہیں کہ اگر ایسے لوگ لیڈر بن سکتے ہیں تو انقلاب ابھی
نہیں آیا ۔
آئیے سامنے کے قہوہ خانے میں چلیں ۔
یہ کوئی معمولی قہوہ خانہ نہیں بلکہ یہاں بڑے ذہین عنا
(Gentry) جمع ہوتے ہیں ، کچھ ایڈیٹر ، کچھ ادیب ، کچھ ش
کچھ سیاست کے ' فنکار ' ، کچھ بے فکرے ، اور کچھ ۔ کچھ بھی نہ
چائے یہاں کی اچھی ہوتی ہے ، ذرا کیف لیتے ہوئے
چائے پیتے جائیے ، توس کھاتے جائیے ۔ اور آنکھوں سے دیکھ

اور کانوں سے سنتے جائیے۔

وہ دیکھئے نا! وہ صاحب جو بڑھ بڑھ کے بول رہے ہیں، یہ وہی ہیں جن کے ایک مضمون کی آپ تعریف کر رہے تھے، اگلے روز مضمون تو دیکھا تھا اب مضمون نگار کو دیکھ لیجئے۔ اور ان کے کلمات کو سنیئے اور حرکات کو بھی دیکھئے ——— کیا یہ کوئی خوش آئند منظر ہے؟

——— یہ بے تکی گپ بازی، یہ مفاخرت، یہ ایکٹنگ کیا یہ سب کچھ اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ کوئی صحت ور ذہنیت کام کر رہی ہو؟

وہ اس پہلو میں وہی ایڈیٹر صاحب تشریف رکھتے ہیں جنھوں نے آج کل صحافت میں پہلوانی کے نو بہ نو داؤں دکھانے شروع کئے ہیں۔ یہ بالکل وہی تو ہیں جنھوں نے آپ کے بھیجے ہوئے "مراسلے" کو اس قطع برید سے شائع کیا تھا کہ آپ سٹپٹا کے رہ گئے تھے۔ وہ سنئے۔ اپنے ہم عصروں کے متعلق گل افشانیاں کر رہے ہیں، دیکھئے نا کس مزے سے اپنے بھائیوں کا گوشت کھایا جا رہا ہے، یہ تنابز بالالقاب، یہ غیبت طرازی یہ بہتان تراشی ——— یہ ہیں رائے عام کو تہذیب کے سانچوں میں ڈھالنے والے لوگ!

آہ! یہ قوم کے ذہنی معمار! اناللہ وانا الیہ راجعون؛

تو بھائی کیا تم نہ مانوگے کہ انقلاب ابھی نہیں آیا؟

یہ حضرت مراد بخش کا مقبرہ ہے!

یہاں ہر جمعرات کو میلہ لگتا ہے، جس میں مرد عورتیں سبھی جمع ہوتے ہیں، مردوں میں پڑھے لکھے بھی ہیں اور ان پڑھ بھی ——— اور عورتوں میں انتہائی قدامت پسند بھی ہیں اور ماڈرن بھی!

یہاں عہدے بٹتے ہیں، امتحان کی کامیابی کی ضمانت ملتی ہے، روزگار ملتے ہیں، بیماریوں سے شفا حاصل ہوتی ہے، بے اولادوں کو اولاد ملتی ہے، ستم زدگان عشق کی مرادیں بر آتی ہیں، مقدمہ بازوں کو فتح کی بشارتیں ملتی ہیں، یہاں تک کہ چوروں اور جیب کتروں کو بھی اپنے مقاصد میں "تائید غیبی" حاصل ہوتی ہے۔

قبر پر کئی کئی ریشمی چادریں پھیلی ہوئی ہیں، چاروں طرف خوشنما پتھر رکھے ہیں۔ گنبد سے رنگین فانوس لٹک رہے ہیں، قبر کے سرہانے مجاوروں کا سردار بیٹھا ہے، اس نے نیچے کی ایک سفید چادر بچھا رکھی ہے اس چادر کے وسط میں کھجوروں کا ایک ڈھیر لگا ہے اس سے ہٹ کر کچھ لڈو پڑے ہیں، ایک مٹی کی طشتری میں پاؤ بھر مکھن دھرا ہے، چادر کے ایک کونے پر روپے پیسے جمع ہیں۔ دیوار کے ساتھ ایک مرغی اور دو جوڑے پابستہ پڑے ہیں اور مجاور صاحب ھٰذا من فضل ربی ——— کا ورد کر رہے ہیں۔

مقبرے کے آس پاس کے حجروں میں زندگی کی گہما گہمی ہے، سب سے بڑے حجرے میں قوالی ہو رہی ہے، آگے کے حجرے میں بھنگ کی گھٹائی ہو رہی ہے، اُدھر کھلی جگہ میں جہاں کچھ کچی قبریں ہیں، ایک مجاور زائرین کے ساتھ مل کر چوسر کھیل رہا ہے ——— وہ اُدھر دیوار پہ موٹے حروف میں لکھا ہے "پاکستان زندہ باد"

آہ! انقلاب نہیں آیا ———

انقلاب آیا ہے، ضرور آیا ہے، لیکن صرف وہ انقلاب آیا ہے جس نے برعظیم کے جغرافئے کو بدل دیا ہے، لیکن وہ انقلاب نہیں آیا، جو انسان کو بدل دے، وہ انقلاب نہیں آیا جس کے آنے سے ذہنیتیں بدل جائیں، عادات و رسوم بدل جائیں، روایات اور قدریں بدل جائیں۔ زندگی کا ظاہر و باطن بدل جائے، ذوق اور رجحانات بدل جائیں ——— جسے صحیح معنوں میں عوامی انقلاب کہا جا سکے!

جس قوم میں بزدلوں کی اکثریت ہو، جس قوم میں جاہ پرستی موجود ہو، جس قوم میں اغراض کے لئے کھلی کھلی لڑائیاں لڑی جاتی ہوں، جس قوم میں خیانت کی مثالیں عام ہو چکی ہوں، جس قوم میں ضبط و نظم کے اچھے نمونے نہ ملیں، وہ انقلاب سے محروم ہے!

——— چاہے اس کے حکام کے لئے کتنی ہی بڑی ضیافتیں کیوں نہ منعقد کی جائیں اور چاہے اس کی عورتیں کتنے ہی مینا بازار کیوں نہ لگاتی پھریں۔

انقلاب جس دن آئیگا، اس دن اسمبلیاں بدل جائیں گی: دفتر بدل جائیں گے، بازار بدل جائیں گے، مسجدیں بدل جائیں گی! مدرسے بدل جائیں گے، کھیت بدل جائیں گے اور زمین و آسمان بدل جائیں گے!

انقلاب کے اس وقت تک کوئی معنی ہی نہیں جب تک کہ

ہمارے وزیر اور لیڈر رہی نہیں ۔ ہمارے نائی اور دھوبی تک نہ بدل جائیں ! ہمیں اپنے سیاسی رہنماؤں کو بدلنا ہے ، ہمیں اپنے ارباب صحافت کو بدلنا ہے ، ہمیں اپنے ادیبوں اور شاعروں کو بدلنا ہے ، ہمیں اپنے علماء اور صوفیا کو بدلنا ہے ۔ ہمیں اپنے کارخانہ دار اور مزدور ــ کو بدلنا ہے ، ہمیں اپنے زمیندار اور کسان کو بدلنا ہے ، ہمیں اپنے شہری اور دیہاتی کو بدلنا ہے ، ہمیں اپنے مردوں اور عورتوں کو بدلنا ہے ،

آؤ ـــــــــ اسلام کے مطلوبہ عوامی انقلاب کی تیاری کریں !

(چراغ راہ)

اعتذار

میثر کے" افسانہ نمبر کے ایک افسانے " اسی برس بعد " کے نوٹ میں ایک غلطی ہوگئی ہے قارئین تصحیح فرمالیں :-

غلط :- لم تنجب العرب مثلہ منذ جات من السنین

صحیح :- لم تنجب العرب مثلہ منذ مئات من السنین

یعنی 'جات' کی جگہ 'مئات' بنالیں ! (ادارہ)

سلورین پلز

مقویات کا سرتاج

مردوں کے لئے ایک اچھا متوازن اور آجکل کا آزمودہ جنرل ٹانک ہے جو بھوک کو بڑھاتا ہے جسم میں تازہ سرخ خون پیدا کرتا ہے اور طاقت بڑھاتا ہے " سلورین پلز پر آپ بھروسہ کر سکتے ہیں

۴۰ گولی چار روپے ۱۲ آنے

۸۰ گولی ۹ روپے
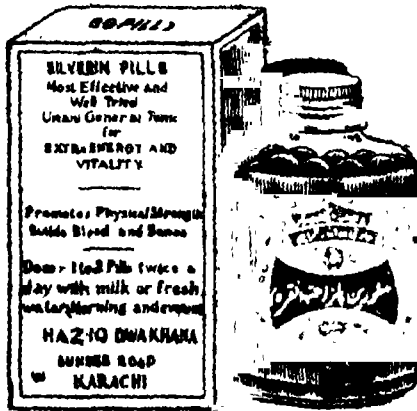
حاذق دواخانہ بندر روڈ ، کراچی

نازش پرتابگڈھی

"مردِ مجاہد"

مرد مجاہد اپنے فرض کی ادائیگی کے لئے اٹھتا ہے اس کے راستے کے روڑے ایک ایک کرکے سامنے آتے ہیں اور اسے روک دینا چاہتے ہیں اس سلسلے میں سب سے پہلے "حب دنیا" سامنے آکر کہتا ہے ؎

ہاں ، کہاں جاتا ہے آخر موت کی جھنکار میں
آ ، اِدھر آ ، میں سُناؤں نغمۂ چنگ و رباب

آکہ میں کردوں مہیّا پھول پتّی کے نقوش
آ تری خاطر چمن سے کھینچ لوں رسِ گلاب

جنگ کے پُرہول و ہیبت ناک میدانوں میں تُو
کیوں لٹاتا ہے جوانی ، کیوں مٹاتا ہے شباب؟

سیم تن ساقی ، گھٹائیں ، ہلکی ہلکی سی پھُوار
یہ دھرے ہیں جام و ساغر اور یہ رنگیں شراب

لاکے رکھدوں تیرے آگے دولتِ کونین ، آ
آ تیرے قدموں پہ رکھدوں ماہتاب و آفتاب

"حبِ دنیا" کے بعد "جبرِ حکومت" بڑھ کر کہتا ہے ؎

ہوشیار ! آگے کہاں ، آتا ہوں میں با عزّوشاں
ہیں جلو میں تازیانے ، جیل خانے ، پھانسیاں!

آڑ میں قانون کی ، برباد کردوں گا تجھے!
اور فضاؤں میں اڑادوں گا میں تیری دھجیاں!

ظلم وہ ڈھاؤں گا تجھ کو دے کے "باغی" کا لقب
تا قیامت یاد رکھے گا جسے یہ آسماں

منہ سے تیرے سانس بھی نکلی اگر اے بدنصیب
پھوڑ دوں گا تیری آنکھیں کھینچ لُونگا میں زباں

مرتبہ تُو نے حکومت کا ابھی سمجھا نہیں!
تُو نے دیکھے ہی نہیں جاہ و جلال و عزّوشاں

اور پھر سب سے آخر میں "موت" دھمکیاں دیتی ہے ؎

مجھ سے ڈر ، میں موت ہوں ہول آفریں و پُرخطر
ورنہ میداں میں تڑپتی پائیگا تُو اپنی لاش

ٹکڑے ٹکڑے کرکے رکھدے گا تری تصویر کو
میرے دستِ آہنی کا اک ذرا سا ارتعاش

میں بہانے ڈھونڈھتی ہوں جان لینے کیلئے
ایک مہلک زخم ہو یا اک ہلکی سی خراش

تُو نے دیکھی ہی نہیں اب تک مری سفاکیاں!
جاکے قبرستاں میں کر میری عظمت کی تلاش

تُو بڑھائے جارہا ہے کس طرف اپنے قدم
دیکھ آگے میں کھڑی ہوں بے خبر ہشیار باش

نیر کراچی

مردِ مجاہد اپنے راستے کے روڑوں کو دیکھ کر مسکراتا ہے، ایک وہ مسکراہٹ جس میں تحقیر و تمسخر اور بے نیازی گھلی ملی ہوتی ہے اور پھر کہتا ہے ؎

میں مجاہد، مردِ غازی، میں جوانِ سرفروش ۔۔۔ دیکھتا ہوں کون بڑھ کر روک دیتا ہے قدم
اے حکومت دور رہ، دنیائے دوں آگے نہ آ ۔۔۔ روک ہی سکتے نہیں مجھ کو تیرے جاہ و حشم
کوہ و صحرا راہ میں ہو، بحر و بر یا موت ہو ۔۔۔ غیر ممکن ہے کہ اب رُک جائے یہ اٹھا قدم
تجھ سے ہیں آنکھیں ملا کر مسکراؤں گا اجل! ۔۔۔ اے حکومت جھیل لُونگا میں ترے جور و ستم
موت کی ہستی نہیں جو موت مجھ کو دے سکے ۔۔۔ فی سبیل اللہ جب نکلا ہوں میں لیکر علم
تازیانے، جیل خانے، ذلتیں اور پھانسیاں ۔۔۔ جادۂ حق سے ہٹا سکتے نہیں میرا قدم
تیغ کی جھنکار میں پروان چڑھتا ہے شباب ۔۔۔ وہ نہیں ہیں مردِ جو میدان سے کرتے ہیں رَم

میں اٹھا ہوں یثربی پیغام دینے کے لئے ۔۔۔ بادہ خواروں کو حجازی جام دینے کے لئے
مجھ میں فاروقیؓ جلالت، فقرِ بوذرؓ مجھ میں ہے ۔۔۔ خالدِ اعظمؓ کی جرأت، شانِ حیدرؓ مجھ میں ہے
برق گامی مجھ میں ہے، محشر خرامی مجھ میں ہے ۔۔۔ عشقِ لا محدود ہے، سوزِ دوامی مجھ میں ہے
ہے ارادہ میرا محکم، عزم کامل ہے مرا ۔۔۔ جسم خاکی ہے مگر فولاد کا دل ہے مرا!
روشنی کرنے چلا ہوں دہرِ ظلمت کوش میں ۔۔۔ مسکراتے جا رہا ہوں موت کی آغوش میں
میں علم کر کے بڑھا ہوں تیغِ جوہر دار کو ۔۔۔ روک دوں گا وقت کی بڑھتی ہوئی رفتار کو
جھوم اٹھوں گا لن تقتل کی تفسیروں سے مَیں ۔۔۔ ڈال دوں گا زلزلہ سا اپنی تکبیروں سے مَیں
کفر کی دیوی مری تکبیر پر جھک جائے گی! ۔۔۔ موت کے دل کے دھڑکنے کی صدا رُک جائیگی

یہ کہا اور شیر کے مانند غرّانے لگا! ۔۔۔ اس مجاہد مردِ کو قدرے جلال آنے لگا!

اور پھر مردِ مجاہد کی تیوریاں دیکھکر آخر کار ؎

تھم گئے اٹھے قدم چلتی زبانیں رُک گئیں
موت، دنیا اور حکومت اسکے آگے جھک گئیں

منظر حسین •

انجمنِ بیکارانِ اسلام

دانشوروں کا کہنا ہے" جب تو بے کار رہ تو کار والوں کے پیچھے دوڑ!" ـــــ چنانچہ ہم پانچ بے کاروں نے کار والوں کے پیچھے دوڑنا شروع کیا اور دوڑتے دوڑتے اتفاقاً اس جگہ پہنچے، جہاں موتمر اسلامی کا پنڈال تھا، پنڈال کے ایک طرف انجمن حجامانِ اسلام کا سیلون تھا۔ جہاں اسلامی طریقہ پر مسلمانوں کی داڑھیاں مونڈی جا رہی تھیں اور دوسری طرف انجمن بیکارانِ اسلام کا دفتر تھا جہاں مسلمان بے کاروں کی بے کاری کا صفایا صرف چھ پیسے میں ہو رہا تھا۔

چھ پیسے ـــــ صرف چھ پیسے، ہمیں محسوس ہوا کہ دانشوروں نے جو کہا تھا۔ وہ سچ تھا نہ ہم کار والوں کے پیچھے دوڑتے اور نہ چھ پیسے میں بے کاری دور کرنے والا جادو گر دیکھتے۔ یہ جادو گر صدر انجمن بیکاران تھا جو ایک نہایت شاندار قسم کا سُوٹ پہنے ہوئے بے کاروں سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا اور ان سے چندہ بے کاری (چھ پیسہ) وصول کر کر کے فارم بھروا رہا تھا۔ یہ سین اتنا مسحور کن تھا کہ ہم اپنی خدمات بلا معاوضہ پیش کرنے کو تیار ہو گئے تاکہ صدارت کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے مگر صدر نے ایسے روکھے انداز میں "ضرورت نہیں" کہا کہ ہمارے چہروں پر آئی ہوئی رونق اُڑ گئی۔

"ضرورت نہیں ـــــ کیوں"؟ رشید نے بگڑ کر کہا

"کہہ چکا نا کہ والنٹروں کی ضرورت نہیں!" صدر نے اسے یوں دیکھتے ہوئے کہا جیسے وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو

"آخر کیوں نہیں ـــــ یہ ایک انجمن کا کام ہے" رشید بچوں کی طرح اڑ گیا یہ اسکی عادت تھی۔

"مسٹر میرا مغز نہ چاٹیے ـــــ چلے جائیے یہاں سے!" صدر کی نظریں اب اور گہری ہو گئی تھیں۔

"کیوں چلے جائیں"؟

"یہ دفتر انجمن بیکاران ہے!"

"ہم بھی بے کار ہیں"۔

"تو پھر یہ فارم بھر دیجئے"

"لائیے!"

اور صدر نے ایک فارم رشید کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا"اس فارم کی قیمت صرف ـــــ!"

"چھ پیسے"

"جی"

"مگر پیسے تو نہیں"

"تو واپس کیجئے فارم!"

صدر نے فارم چھین لیا جس پہ رشید کو تاؤ آگیا اور اس نے غصہ میں کہا "آپ بے کاروں کی انجمن بنا رہے ہیں یا پیسہ والوں کی"

مگر صدر نے کوئی جواب نہ دیا ـــــ اس پر نقوی نے کہا "یہ صرف پیسہ والوں کی انجمن ہے ـــــ بے کاروں کا تو لیبل لگا ہوا ہے!"

"معلوم تو کچھ ایسا ہی ہوتا ہے ـــــ اگر بے کاروں کی انجمن ہوتی تو ان کی پوزیشن کا بھی خیال رکھا جاتا" جوہر نے کہا

"انھیں یہ تک نہیں معلوم کہ بے کاروں کے پاس پیسے آئیں گے کہاں سے"؟ احمد نے کہا

"جی ہاں یہ سمجھتے ہیں کہ جیسے خود پیسے والے ہیں ویسے ہی دوسرے بھی ہونگے" میں نے کہا اور اتفاق سے میرا غرض اس غزل کا مقطع ثابت ہوئی، کیونکہ صدر نے جو اپنا منھ کیا

اجی

ں باتیں سن رہا تھا بلکہ پی رہا تھا اپنی زبانِ صدارت سے فرمایا
ے لوگ سیدھی طرح جائیں گے یا پولیس ——!

پولیس —— اچھا تو ہمارے لئے حوالات میں گھر بنانے
کر ہو رہی تھی، خیال تو بہت نیک تھا اور اس سے ہماری بیکاری
دور ہو جاتی۔ مگر اس ذرا سی بات کیلئے وہاں جانا اچھا نہیں معلوم
رہا تھا۔ حوالات بہرحال حوالات ہے اور اسے دعوت دینا —
ب گھٹیا سی چیز کے لئے ہرگز مناسب نہ تھا —— چنانچہ ہم احتجاجاً
رسیٔ صدارت سے چار گز پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ اور یہ فیصلہ
رلیا کہ اب صدر کا منہ کبھی نہ دیکھیں گے —— لیکن فوراً ہمیں اس
فیصلہ کو رد کرکے اس کا منہ دیکھنا پڑا —— ہمارے احتجاج نے
کچھ بے کاروں کو متاثر کر دیا تھا اور وہ صدر سے الجھ پڑے تھے

"جناب یہ بے کاروں کی انجمن ہے اگر آپکے دل میں بیکاروں
کا درد ہے تو پھر اُن سے ہمدردانہ برتاؤ کیجئے" ایک نے کہا

"آپ عالم اسلام کے بیکاروں کو ایک پلیٹ فارم پر اسی
طرح لائیں گے؟" دوسرے نے سوال کیا۔

"اجی پہلے اپنے گھر کو تو درست کر لیجئے پھر بڑے بول بولئے گا"
تیسرے نے کہا۔

"اور کیا —— اپنا گھر تو بنتا نہیں دوسروں کے پھٹے میں
ٹانگ اڑانے چلے ہیں" چوتھے نے کہا۔

"ہونہہ، ایسی انجمنیں تو روز بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ جب
حکومت ہی اس مسئلہ کا حل نہیں سوچ سکتی تو پرائیویٹ ادارے کیا
کر سکتے ہیں؟" پانچویں نے کہا

"ارے بھائی —" صدر نے آخر زبان ہلائی "ہم یہی تو
چاہتے ہیں کہ ایک متحدہ محاذ قائم کرکے اپنی آواز حکومت کے بہرے
کانوں تک پہنچائیں تاکہ ہماری یہ لعنت دور ہو۔"

"لیکن آپ اتحاد نہیں چاہتے!" پہلے نے کہا

"کیوں؟ کیسے معلوم ہوا؟" صدر نے پوچھا

"آپکے طرز عمل سے —— آپ ان غریبوں کو فارم
کیوں نہیں دیتے، جو اسکی قیمت ادا کرنے سے قاصر ہیں" دوسرے
نے حملہ کیا۔

"لیکن انجمن کا نظم!"

"انجمن ہے کہاں —— مجھے تو صرف آپ ہی آپ نظر آتے
ہیں" تیسرے نے چوٹ کی۔

"ایک دفتر، ایک سائن بورڈ، اور ایک فارم لیکر آپ
خود صدر انجمن بن گئے ہیں گویا آپ خود ہی انجمن ہیں اور خود ہی
صدر ہیں" چوتھے نے بھرپور وار کیا۔

"بھئی یہ آجکل کا دستور ہے، جس کا لیڈر بننے کو جی چاہے
ایک انجمن بنا کر بیٹھ جائے اور اس پر اسلام کا لیبل چپکا لے ——
بس —— احمقوں کی کمی نہیں غالب!" پانچویں نے رہی سہی
کسر پوری کر دی۔ صدر بوکھلا گیا —— اور ہمارے پاس آکر
معذرت کرتے ہوئے فارم مفت دیدیئے۔ شاید وہ ڈر گیا تھا
کہ کہیں اس قسم کے "جراثیم" دوسرے بے کاروں میں نہ پھیل جائیں

بہرحال یہ ہماری فتح تھی جو اپنے بے کار بھائیوں کے طفیل
ہمیں نصیب ہوئی تھی۔ ہم نے بڑھکر ان جوشیلے بھائیوں سے ہاتھ ملایا
اور ان کی تائید اور حمایت کا شکریہ ادا کیا اور اس کے بعد تعارف
لازمی ہو گیا۔ پہلے انھوں نے خود اپنا تعارف کرایا۔ پھر مجھے یہ خدمت
اپنے ساتھیوں کی طرف سے انجام دینی پڑی۔

"یہ رشید صاحب ہیں جو تقریباً ایک سال سے بے کار ہیں
آپ پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف کی جنت سے نکالے ہوئے انسان ہیں
نہایت صبر سے بے کاری کے دن کاٹ رہے ہیں!

"اور یہ نقوی صاحب ہیں، جو چار پانچ مہینوں سے شہر
کی خاک چھانتے ہیں مگر امید کی کرن ابھی تک نہیں دیکھی۔
آپ کسی اخبار کی ایڈیٹری کی تلاش میں ہیں!

"اور یہ جوہر صاحب ہیں جو اخبار کی ایڈیٹری سے
دھو کر بے کاروں کی صف میں آبیٹھے ہیں —— آپ کسی فرم
اکاؤنٹس کلرکی کی تاک میں ہیں"

"اور یہ احمد صاحب ہیں جو ایئر فورس سے نکل کر کیشئ
کیشیئر سے ایڈیٹر بن گئے ہیں —— مگر اپنے کو بے کاروں کی صف

شامل کئے ہوئے ہیں۔ اور اکثر میکلوڈ روڈ کے دفاتر کا چکر لگاتے رہتے ہیں"۔

"اور میں ——— میں، میں ہی ہوں —— مجھ پر بے کاری کا اکثر دورہ پڑتا ہے دس سال سے یہ مرض ہے اور کوئی خاص بات نہیں"

میں نے تجارت ختم کر کے فارم بھرنا شروع کیا اور دوسرے ساتھی بھی فارم بھرنے میں مشغول ہو گئے۔

لیکن اب ہر شخص نے فارم مفت مانگنا اور نہ ملنے کی صورت میں جھگڑنا شروع کر دیا۔ صدر انجمن رہ رہ کر بھڑک رہا تھا اور دانت پیس پیس کر ہمیں دیکھ رہا تھا۔ اسکی نظروں میں ہم ہی اصل مجرم تھے پر ہم نے اسکی پروا کئے بغیر فارم بھر کر واپس دیدیئے اور پھر دیواروں پر لگے ہوئے چارٹوں کا معائنہ کرنے لگے جن میں عالم اسلام میں بڑھتی ہوئی بے کاری کی تفصیلات دی ہوئی تھیں!

اچانک "دفتر بند ہوتا ہے" کی صدا بلند ہوئی اور لوگ آہستہ آہستہ باہر جانے لگے —— ہماری ٹولی سب سے آخر میں چلی، اور اس ٹولی میں سب سے پیچھے میں تھا اور رشید۔ جب تین ساتھی باہر نکل چکے اور ہم دونوں گیٹ کے قریب پہنچے تو صدر میز پر رکھے ہوئے فارموں کو سمیٹ کر دراز میں رکھنے کے بعد دفعتاً ہماری طرف بڑھا —— اور رشید کا ہاتھ پکڑ کر بولا "مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں!"

رشید نے میری طرف دیکھا اور میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا "کوئی حرج نہیں —— نپٹ لو!" مگر اس نے مجھے روکتے ہوئے کہا "انکی موجودگی آپ پر بار تو نہ ہوگی"۔

"جی" صدر نے سوچتے ہوئے کہا "جی نہیں، آیئے یہاں بیٹھ کر اطمینان سے گفتگو ہوگی۔ غالباً آپ مجھے پہچانتے نہیں، لیکن میں آپ کو پہچانتا ہوں!"

ہم اس میز کے گرد پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے جہاں پہلے صدر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے رشید کو مخاطب کرتے ہوئے پھر کہا "میں نے آپ کو انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں دیکھا تھا —— مگر اس وقت آپکے چہرے پر یہ نہ تھی۔ اس نے رشید کی داڑھی کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں میں کبھی کبھار وہاں جایا کرتا تھا" رشید نے اقرار کیا

"آپ بولتے بہت تھے، اور کئی مرتبہ آپ کی زبان پر سیفٹی ایکٹ کا ذکر بھی ہوا تھا ——!"

"ٹھیک ہے —— فرمایئے آپ!"

"ٹھہریئے —— آپ چائے پئیں گے؟" صدر نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر نہ صرف چائے بلکہ "کچھ اور" کا بھی آرڈر دیدیا —— ظاہر ہے کہ اس زریں موقع سے کوئی شریف آدمی نہیں چوکتا۔ کم از کم اپنے شہر کے شرفاء کا تو یہی شیوہ ہے اور ہم یقیناً شریف تھے۔ اس لئے انکار ہماری شان کے خلاف تھا۔

"تو آج کل آپ بے کار ہیں؟"

"جی ہاں —— ہم دونوں!"

"میں نام بھول رہا ہوں آپکا"

"مجھے رشید ہادی کہتے ہیں اور یہ میرے دوست اختر زبیری ہیں ——!"

"بہت خوب —— مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی!"

اور چائے کی ایک خوبصورت ٹرے آئی، جس میں ایک بڑی پلیٹ کیک پیسٹریوں سے بھری ہوئی رکھی تھی۔ صدر نے پھرتی سے پیالیاں ہمارے سامنے رکھکر گرم گرم چائے انڈیلتے ہوئے کہا "جب آپ لوگ بیکار ہیں تو ہمارا ہاتھ کیوں نہیں بٹاتے؟"

"ہم نے تو پہلے ہی درخواست کی تھی مگر آپ نے ——!"

"اوہ —— بات یہ ہے کہ —— کہ!"

"جانے بھی دیجیئے!" میں نے مداخلت کی۔

"جی نہیں بات یہ ہے کہ کھایئے!" صدر نے پیسٹری کی پلیٹ پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا، جس کی تقلید ہمیں بھی کرنی پڑی۔

"یہ انجمن بنانے کا آپ کو کب خیال آیا؟" میں نے دفعتاً

"یار انہوں نے تو میرا خیال اڑا لیا" رشید نے کہا

"خیال اڑالیا؟ ——— نہیں مسٹر رشید ——— اس کے متعلق میں تین سال سے سوچتا چلا آرہا تھا ——— لیکن موقع نہیں ملتا تھا۔ اس خیال کو عملی جامہ پہناؤں ——— غالباً آپکے ذہن میں بھی یہی کوئی تجویز تھی؟"

"جی ہاں" میں بھی ایک انجمن بنانے کی فکر میں تھا جس کے ہر رکن پہ یہ تین چیزیں لازم ہوتیں ——— اول یہ کہ دن میں گن کر مکھیاں مارنا، جو کسی صورت میں بیس سے کم اور سو سے زائد نہ ہوں دوئم یہ کہ انجمن کے دفتر میں بیٹھکر گپ مارنا جو تین گھنٹہ سے کم اور آٹھ گھنٹہ سے زائد نہ ہو اور سوئم یہ کہ ایسے لوگوں کو پھانسنا، جو کھانا کھلانے یا چائے پلانے کی استطاعت رکھتے ہوں اور کم از کم پانچ بیکاروں کا ہلکا سا بوجھ اپنی جیبوں پر گوارا کر سکیں۔"

صدر نے ایک زور کا قہقہہ مارا ——— ہم بھی مسکرا دیئے

"آپکی انجمن تو ایک مثالی انجمن ہوتی جس کی نظیر کہیں نہ ملتی" صدر نے ہنستے ہوئے کہا "لیکن اب آپ میرے ساتھ کام کریں یہ سو فارم لیجئے۔ انہیں سب کار احباب سے چھ پیسے وصول کر کے بھروا دیجئے اور مجھے واپس کر دیجئے ——— میں آپکو ۳۳ ⅓ فیصدی کمیشن دونگا"

"کمیشن؟" ہم دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

"جی ہاں ——— اس میں کوئی حیرانی کی بات نہیں ——— آجکل بڑی بڑی انجمنیں کاروباری اصولوں پر چل رہی ہیں ——— آخر میں فائدہ ہمارا ہی ہے ——— یعنی سب کارکنوں کا!"

"لیکن؟"

"کمیشن کم ہے ——— اچھا چلئے ۴۰ فیصدی سہی ——— میں جانتا ہوں آپ اسے ضرور قبول کر لیں گے" صدر نے اطمینان سے کہا اور میز کی ایک دراز کھولکر فارم نکالے اور رشید کے ہاتھ میں تھما دیئے

"بوائے ——— لے جاؤ یہ ٹرے!" اس نے دوسرا دراز کھولکر بہت سی اکنیاں، ادھنے اور پیسے نکلالے اور نکالکر انھیں گننے لگا۔ چائے کے بل کی رقم دیکر وہ پھر ہماری طرف مخاطب ہوا "تو آپ انھیں کب واپس کیجئے گا؟" ——— "ہمیں افسوس ہے کہ آپ نے ہمیں کمیشن بہت تھوڑا دیا اسلئے ———" رشید نے طنز بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور فارم میز پہ پٹخ کر اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے دروازہ کی طرف چل پڑا میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔

"ارے سنیئے تو ——— ٹھہریئے ——— میں آپکو پچاس فیصدی ...." مگر رشید دروازہ کے قریب پہنچ رہا تھا کہ دفعتاً بم پھٹ گیا۔

"بدمعاش کہیں کے ——— سالوں نے میرا پیسہ ضائع کرایا لچے شہدے ——— کمینے ———!" صدر کی گولیاں ہمارا پیچھا کر رہی تھیں اور ہم سرپٹ چلے جا رہے تھے!

(حلقۂ ادب اسلامی کراچی میں پڑھا گیا)

40 Pills
NERVINE PILLS

حاذق نروائن پلز (حب خاص)

ایک جنرل ٹانک ہے جو عصبی اور دل و دماغ کی کمزوریوں کا مجرب علاج ہے یہ گولیاں دماغی کام کرنے حضرات یعنی وکیل بیرسٹر پروفیسر اور طالبعلم صاحبان کے واسطے آبحیات کا کام دیتی ہیں اور جسم انسانی کی جملہ عصبی کمزوریوں کو بحال کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں دواخانہ ہذا کے خاص مجربات میں سے ہے۔

خوراک:- دس یوم ۲۰ گولی قیمت دو روپے

حاذق دواخانہ بندر روڈ، کراچی

شرت رحمانی •

آگ لگے ایسے جلسوں کو!

صبح سے گھر میں ایک شور مچا ہوا تھا، بھابی کسی سے سیدھے منہ بات ہی نہ کرتی تھیں۔ ایک نوکر کو ڈانٹا دوسرے کو پھٹکارا، ماما پر صلواتیں پڑیں۔ اس بیچاری نے بھابی کی مرضی کا جوڑا نہیں نکالا تھا۔ اور اس پر قیامت یہ کہ بھابی کے ڈانٹنے پر کہہ دیا کہ "بیگم صاب، آپنے پہلے تو بتایا نہیں کہ کیا کیا نکالوں، میں نے بھاری جوڑا نکال لیا، اب آپکو پسند نہیں تو جو بتائیں وہ نکال لوں" بس پھر کیا تھا۔

"زبان دراز، بدتمیز، کام چور، بڑی مغلانی بنی پھرتی ہے سوائے زبان چلانے کے جو ذرا ہاتھ چلائے جب ایک بات میں خود بتاؤں تو آپ ہی اپنے ہاتھ سے نہ کر لوں، دماغ تھکانے سے ہاتھ چلانا لاکھ درجہ بہتر ہے رہنے دو تم۔ خاک بھی تم سے نہ ہو سکے گا۔ الماری سے سارے کپڑے نکال کے باہر میز پر چن دو۔ میں خود دیکھ لوں گی!"

غرض ایک آفت مچی ہوئی تھی۔ بچوں نے جو یہ شور و غل دیکھا اور میز پہ پھیلے ہوئے رنگ برنگ چمکتے لباس پر نظریں ڈالیں وہ سمجھے امی کہیں شادی بیاہ میں جا رہی ہیں۔ ایک نے کہا "امی ہمارے کپڑے بھی تو ٹھیک کر لیجیے" دوسرا بولا "آپ تو پہلے اچھے کپڑے پہن لیتی ہیں۔ ہم ایسے ہی چلے جائیں"! لڑکی نے ضد کی "میں غرارہ پہن کے جاؤں گی ——" "کہاں جاؤ گے، کس کے ساتھ جاؤ گے، کیوں جاؤ گے، کیسے کپڑے، کون پہنائے گا، چلے ہیں بیکار کی ضدیں کرنے، کہیں قدم نکالنے کا ارادہ کرو اور بس شور مچا دیئے۔ تم کیسے جاؤ گے، کوئی کھیل تماشہ سمجھ رکھا ہے" ایک نوکر کی جو شامت آئی بے چارے نے کہہ دیا۔ "بیگم صاب، بچے ہیں، خوش ہو جائیں گے۔ لیجائیے، ہم بھی انکے سہارے چلے جائیں گے، آپکی بدولت ذرا سیر ہو جائے گی۔" قیامت پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

"لو اور سنو، بوڑھے منہ مہاسے —— یہ بھی جائیں گے، بھلا یہ بھی تو سمجھ لیا ہوتا میں کہاں جاؤنگی۔ یہ بھی کوئی کھیل ہے۔ پڑھنے لکھنے کی باتوں میں بھی تم لوگوں کا دخل ہے! چلے ہیں سیر کرنے!" اس غریب کی سمجھ میں نہ آیا پوچھ بیٹھا: "تو بیگم صاب، کہاں جا رہی ہیں آپ؟" بھابی نے نگل لینے کی قہر آلود نظریں اس پر ڈالیں۔ "اب تم رہے جاہل، تمہیں کیا بتاؤں، سمجھو خاک نہیں ہر بات میں دخل!" آخری فقرہ اس طرح ادا کیا کہ جیسے نوکر کی جہالت اور بے بسی پر ترس آگیا وہ سمجھتا بھی کیا۔ آج تک بھابی کو اس نے یا کسی نوکر نے سوائے سینما، شادی، برات یا بازار کے اور کسی ایسی جگہ جاتے نہ دیکھا تھا جس کا مطلب بھی انکی سمجھ میں نہ آسکے اور ان غریبوں کو اپنی جہالت کا مرثیہ بھی سننا پڑے۔

خدا خدا کر کے دو بجے، دن بھر بھابی بچوں کی چیخ و پکار کو ڈانٹ ڈپٹ سے، نوکروں کی حیرت کو طعنوں اور احکام کی بوچھاڑ سے دباتی اپنی کنگھی چوٹی اور ملبوس میں مصروف رہیں سچ پوچھیئے تو بھابی ہی کا دل گردہ تھا اور دل گردہ بھی کیا۔ علم و ادب کا شوق جس کا اچانک دورہ سا آج ہو گیا تھا۔ اسی جوش اور ولولہ میں بھابی گھر کے ہنگامے کو بھی فرو کرتی جا رہی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنی تیاری بھی۔ ورنہ بھابی کے قول کے مطابق بھلا اور کسی کی کیا ہمت تھی جو اس قدر مشقت برداشت کرے۔

لیجئے صاحب۔ دو بجے تک بھابی نکھ سکھ سے درست بناؤ سنگھار اور لباس کی تمام فراغتوں کے بعد لیس ہو بیٹھیں، جہاں جہاں ٹیلی فون تھے، مختلف سہیلیوں اور عزیز خواتین کو تاکید ہونے لگی

کراچی
وقت پہنچنا ہے جلسہ کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے۔ ایسا نہ ہو
بر ہو جائے اور نشستیں اچھی نہ ملیں۔ اتنے ٹیلی فون اور باتیں کرنے کے
بعد بھی روانگی کے وقت میں دو گھنٹے باقی رہ گئے۔ اس وقت تین بجے
تھے اور جلسے کا وقت پانچ بجے سہ پہر تھا۔ اب کیا کریں۔ اتنی دیر تک
بیٹھے رہنے سے لباس بھی خراب ہوگا۔ مانگ بھی تو بگڑ جائیگی۔ اب گھڑی
دیکھی ساڑھے تین بجے تھے۔ خیال آیا "میری گھڑی غلط ہے بھلا
کوئی بات بھی، دن بھر گزر گیا۔ پانچ بجنے کے قریب ہو گئے" ٹیلی فون
انکوائری سے صحیح وقت دریافت کیا۔ "ساڑھے تین بجے تھے" غلط
ٹیلی فون والے وقت کیا بتا سکتے ہیں؟ ریلوے انکوائری سے
"تین بجکر چالیس منٹ ٹھیک" سب گھڑیوں میں آج غلط وقت
ہیں۔ ابھی ایک نے بتایا ساڑھے تین۔ یہ کہتے ہیں چالیس منٹ
جتنے منہ اتنی باتیں۔ اب کہیں پہ چھو کچھ اور بتائیں گے۔ پھر ٹیلی فون
"ریڈیو پاکستان! ذرا بتائیے ٹھیک وقت کیا ہے؟ ---جی---
تین بجکر پچاس، ذرا صحیح طور پر دیکھکر ٹھیک ٹھیک بتائیے ہمیں
ایک ادبی جلسے میں صحیح وقت پر پہنچنا ہے، کیا کہا "باون منٹ!
ریسور کھٹ سے دے مارا "یک نہ شد دو شد! ذرا دیر میں
ایک ہی جگہ غلط وقت۔ خیر ہوگا۔ سب نے ٹھیک وقت بتانے کی قسم
کھائی ہے۔ اب میں نہیدہ کو ٹیلی فون کرتی ہوں۔ بس اب جانیے اور
روانہ ہو جائیں کہیں وقت کی اسی پوچھ گچھ میں دیر ہو جائے اور جلسہ
ہی ختم ہو!

بیگم نہیدہ حامد بھابی کی خاص سہیلی تھیں اور دراصل آج
بھابی میں ادبی ذوق کا بے پناہ جوش پیدا کرنے کی ضامن بھی وہی
تھیں۔ بات یہ تھی کہ اکبر الہ آبادی کی برسی کا ایک یادگار ادبی جلسہ
کراچی میں منعقد ہونے والا تھا۔ بیگم حامد نے کہیں بھابی سے کہہ دیا
کہ اس جلسے میں شرکت کرو تو چلیں اور ساتھ ہی اکبر الہ آبادی کی
تعریف کرکے بتایا کہ وہ بہت بڑے شاعر گزرے ہیں۔ تم روز سینما
اور دوسرے کھیل تماشوں میں تو جاتی ہو، کبھی ان ادبی محفلوں میں
بھی جانا چاہیئے۔

بھابی کی تعلیم انگریزی قسم کے مشن اسکول میں ہوئی تھی،
اردو ادب اور زبان سے یوں تو انہیں خاندانی لگاؤ تھا، مگر ادب کا
مفہوم وہ انگریزی زبان میں زیادہ سمجھتی تھی۔ اس لئے بیگم حامد کی
بات ان کے دل کو لگی کہ واقعی اس قسم کے جلسوں کی شرکت سے
کم سے کم اردو کی خدمت ہوگی اور ذرا بڑے جلسوں میں نام بھی
ہوگا۔ اس لئے یہ ساری تیاری اس جلسے میں شریک ہونے کی تھی
علاوہ ازیں بیگم حامد چونکہ اردو ادب سے ذوق رکھتی تھیں اور اکثر
ادبی مجالس میں شریک ہوتی رہتی تھیں۔ اس لئے بھی بھابی پر انکا
خاصا ادبی رعب سا تھا۔ اب جو یہ موقعہ ملا تو سوچا کہ ان کے ساتھ مجھے
بھی اس خدمت کی شہرت نصیب ہوگی اور شہرت کی تو خیر بھابی کو
ایسی کیا پرواہ ہوتی۔ اردو ادب کی خدمت سے بھی زیادہ اس خیال
نے انہیں اور بھی آمادہ کر دیا تھا کہ میں بیگم حامد کے دوش بدوش
ایسے جلسوں کی شرکت سے ان کی سہیلی کا رعب تو ٹھنڈا ہو جائیگا!
اور وہ بھی ان کے ہم پلہ ادبی باتیں کرنے لگیں گی۔

بھابی کا صبح سے ہنگامہ بپا کرنا، نوکروں اور بچوں کو ڈانٹنا
اور علمی، ادبی رعب جمانا، بالکل بجا تھا۔ اتنے بڑے جلسے میں کم پڑھے
یا جاہل لوگوں کا کیا کام، بھابی تو خود ادبی رعب حاصل کرنے جا رہی
تھیں۔ بیگم حامد کو بلانے کیلئے ٹیلی فون کیا۔ انہوں نے کہا "میں ابھی
تم کو ٹیلی فون کرنے والی تھیں کہ مجھے خالہ جان کے پاس ضروری کام
سے جانا ہے جلسہ میں ساتھ نہ جا سکیں گے میں وہیں سے آجاؤنگی
اور تم وہاں پہنچ جانا!"

بھابی کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ کچھ کہے سنے بغیر
ٹیلی فون بند کر دیا اور عزیز سہیلی پر صلواتوں کی بھرمار شروع کردی
بڑی بے چاری رئیس بنی پھرتی ہے وہ تو رعب جمانے کو مجھ سے
جلسے کا ذکر کیا گیا تھا، مجھے وہاں لے جانا کب چاہتی تھی۔ اب
دیکھا کہ میں اس سے آگے ہوں تو لگی باتیں بنانے۔ خالہ کے
بھی آج ہی ضروری کام ہو لیے یہ بہانہ میرے ٹالنے کو کیا ہے
چاہتی ہے میں نہ جاؤں۔ خیر میں کہاں باز آنے والی، اس سے
نہ پہنچوں تو میرا نام نہیں۔ بلاؤ ڈرائیور کو------!
معلوم ہوا ڈرائیور صاحب کو لینے دفتر گیا۔ ایک او

پہ بے طرح پڑنے لگیں۔ سارا گھر سر پر اٹھالیا: "ڈرائیور تو میرے
یے جلتا ہے۔ بھلا بے پوچھے گاڑی لے جانے والا کون ہوتا تھا۔
کے نام لیکر جانے کہاں گاڑی لے گیا ہوگا۔ اس گھر کا تو بچہ بچہ
شوق کا دشمن ہے۔ اسی لئے میں تو ان کاموں کا نام نہیں لیتی!
صاحب کو دفتر ٹیلی فون کیا گیا" وہ آپکا چہیتا ڈرائیور
لے کے کہاں مر گیا۔ فوراً گاڑی واپس کیجئے، مجھے ابھی ادبی جلسہ
بانا ہے۔ فہمیدہ کے ساتھ تو جانے کو تھی مگر اس نے عین وقت
دیا۔ ٹال رہی ہے، میں اس سے پہلے پہنچنا چاہتی ہوں۔ آپ
جا سکیں گے، آپ کو دفتر کے فائلوں سے کب فرصت! ادبی کام
آپ کو کیا سروکار۔ مجھے ابھی جانا ہے۔ ڈرائیور کو نہیں معلوم تھا
تو معلوم ہو گیا۔ جلدی بھیجئے گاڑی۔ آپ پھر آجائیے!"
لیجئے گاڑی آگئی۔ پھر ڈرائیور دس پانچ سننا پڑیں۔ گاڑی
نہ ہو گئی۔

"کہاں چلوں، بیگم صاحب"؟
یہ بھی نہیں معلوم۔ اس گھر کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ کس
ڈرائیور بنایا ہے تمھیں! اتنا بڑا جلسہ شہر میں ہو رہا ہے۔ سارے
بڑے آدمی جا رہے ہیں۔ اب انہیں یہ بتاؤں کہ کہاں جائیں
ہاں چلو جہاں اس وقت ادبی جلسہ ہے!
بھلا اس غریب کو کیا معلوم۔ کراچی میں ایک جلسہ ہو یا جلسے
ایک مقررہ مقام، تو پتہ معلوم بھی ہو! بیچارے نے اپنی لاعلمی کا اظہار
با ہزار کیا۔ بھابی نے پہلی سے مارے غصہ کے پتہ بھی نہ پوچھا تھا
کہ "جاؤں کہاں" تو اس پر اور بھی غصہ آیا۔ اس سے تو وکٹوریہ یا
ٹیکسی اچھی تھی، بے پتہ بتائے پہنچادیتی۔ حکم ہوا" چلو تو آگے، گاڑی
بڑھاؤ۔ راستہ میں کسی سے پوچھ لینا"
خیال تھا، راستے میں بھیڑ ہوگی۔ لوگ جوق در جوق چلے جا رہے
ہونگے۔ اسی طرف کار روانہ ہو کر منزل پہ پہنچ جائیگی مگر بھیڑ ہونے کے
باوجود ہر شخص اپنے اپنے راستے پر چل رہا تھا۔ دو کہیں، چار کہیں
سب کے رُخ اور مقام الگ الگ تھے۔ اب کس سے پوچھا جائے اسی
اثناء میں سوچتے سوچتے بھابی کو یاد آیا کہ "پرنسس اسٹریٹ" کا پتہ
کل فہمیدہ نے دیا تھا۔ وہیں کہیں جلسہ ہے، ڈرائیور سے کہا "پرنسس
اسٹریٹ" چلو، اتفاق سے ڈرائیور نے یہ نام ہی آج سنا تھا۔ غرض
کسی راہگیر سے چلتے چلتے گاڑی روک کر کہا" پرنسس اسٹریٹ کہاں
ہے" اس نے کہا۔ ادھر نالے کے پاس سینما کے بازو میں۔ وہ جو سینما ہے
جہاں آگ لگی تھی۔ بھابی کو سینما کے بارے میں پورے وثوق سے معلومات
تھیں۔ چنانچہ "آگ" کے نام سے فوراً سمجھ گئیں، بولیں، بس رہنے دو
کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ سمجھ گئی۔ وہاں لے چلو جہاں پچھلے
مہینے "آگ" فلم دیکھی تھی۔ ڈرائیور کو بھی اپنی معلومات سے فائدہ
اٹھانے کا موقعہ ملا اور جلد ہی چھٹکارا نصیب ہونے کی بھی امید ہوئی
سیدھا پیلیس سینما پہنچا۔ اس کے قریب اور آس پاس ہر کنارے
ہر موڑ پر پرنسس اسٹریٹ کی تلاش کی گئی۔ مگر پتہ نہ چلا۔ بھابی راہگیر
پر سخت ناراض تھیں کہ غلط پتہ بتادیا۔ اور فہمیدہ کو الگ بُرا بھلا کہہ
رہی تھیں کہ یہ سب حرکتیں اس کی ہیں خیر خدا خدا کرکے ایک بھلے مانس نے
بتایا کہ پرنسس اسٹریٹ کارپوریشن کے متصل اس سینما کے پاس ہے جس
میں عرصہ ہوا آگ لگی تھی۔
اس پر بھابی آگ بگولہ ہوگئیں کہ شریفوں سے دل لگی کرتے
شرم نہیں آتی "آگ" تو پیلیس میں چلی تھی۔ کارپوریشن کے پاس جو
سینما ہے وہاں "آگ" کبھی نہیں چلی۔ اس شخص نے بھابی کی سادگی
پر ترس کھایا اور نہایت خلوص و دیانت سے سمجھایا کہ محترمہ "آگ"
سے مراد فلم "آگ" نہیں بلکہ اس نالے کے پاس جو سینما گھر ہے وہ کسی
زمانہ میں جل گیا تھا۔ اب بھابی کی سمجھ میں آیا اور پہلے راہگیر کو دوچار
سنا کر اسکی غلط اُردو دانی کو کوستی ہوئی کارپوریشن کی طرف روانہ ہوئیں
کہ بھلا یہ بھی بولنے کا طریقہ ہے کہ جہاں آگ لگی تھی میں سمجھی پکچر "آگ"
جس سینما میں لگی تھی اور اس آخری شخص کی شرافت و قابلیت کو
سراہنے لگیں کہ یہ نہ ملتے تو پتہ ہرگز نہ ملتا۔
آخر پرنسس اسٹریٹ پہنچ گئیں اور تھوڑی سی تلاش کے بعد
جلسے کا مقام بھی مل گیا، اندر پہنچیں، اتنی بھاگ دوڑ سے یہ فائدہ
ہوا کہ وقت گزر گیا ورنہ بہت پہلے پہنچ جاتیں۔ اس وقت پانچ بجے
میں چار منٹ باقی تھے۔ یہ دیکھکر بھابی بہت خوش ہوئیں کہ فہمیدہ سے

ے آگئیں ۔ بلکہ سوائے چند مردوں کے ابھی کوئی عورت نہیں آئی تھی۔
رجاکر بھابی نے اِدھر اُدھر دیکھا ۔ اچھی نشست کا انتخاب کرنے کو
زہ لیا اور ایک اونچی کرسی جو ذرا نمایاں جگہ نظر آئی اس پر جا کر بیٹھ
یں ابھی بیٹھی ہی تھیں کہ ایک صاحب نے قریب آکر آہستہ سے کہا محترمہ
کرسی صدر کی ہے آپ دوسری کرسی پہ تشریف رکھئے ۔

بھابی کی نظر میں یہ حرکت نہایت نازیبا تھی ۔ اور وہ یہ بھی نہ سمجھیں
لہ صدر کی کرسی کیسی ۔ بڑبڑا کر بولیں ۔

" کیا مطلب ! اگر یہ کرسی صدر والوں کی ہے تو دکٹوریہ روڈ
بولٹن مارکیٹ کی کرسیاں بھی ہونگی ۔ کوئی کرسی جمشید روڈ کی ہو تو
بتا دیجئے ، ہم وہاں بیٹھ جائیں گے !

اس شخص نے بھابی کی سادگی پر ترس کھایا اور اپنا مطلب
واضح کرنے کو لجاجت سے بولا ۔ " صدر سے مراد پریسیڈنٹ ہے
جناب ۔ یہاں اس جلسے کے پریسیڈنٹ بیٹھیں گے ۔ سڑکوں اور محلوں
کے نام سے نشستیں مخصوص نہیں ہیں "

بھابی ذرا خفیف سی ہو گئیں کہ یہاں انکی اردو دانی پر حرف
آتا ہے ۔ مسکرا کر خفت کے ساتھ پیچھے کی کرسی پر چلی گئیں ۔ آتنی دیر میں
بہت سے حضرات و خواتین آ گئے ۔ صدر بھی آ گئے اپنی کرسی خالی
پا کر متمکن ہو گئے ۔

بھابی کی سہیلی بیگم فہمیدہ عابد اور دوسری کئی سہیلیاں
آ گئیں ۔ بھابی روٹھی روٹھی سی تھیں ۔ فہمیدہ بہن نے انہیں اپنے
کام کی اہمیت سمجھا کر معذرت کی اور منا لیا ۔ بھابی نے راستہ تلاش
کرنے کی سرگزشت سنائی ۔ بھابی خوش اس لئے بھی تھیں کہ وہ جلسے
کے آغاز سے بہت پہلے آ گئیں اور سب کچھ شروع سے اپنی آنکھوں
سے دیکھ اور کانوں سے سُن سکیں گی ۔

جلسے کا آغاز ہوا ایک خوش الحان قاری نے تلاوت
شروع کی ۔ بھابی نے فہمیدہ بہن سے دریافت کیا کہ جلسہ شروع ہو گیا
انھوں نے اشارے سے انکی تائید کی ۔ بھابی نے آہستہ سے کہا " مگر
بہن یہ اکبر صاحب بہت بڑے عالم تھے ۔ یہ تو عربی زبان میں کچھ
سنایا جا رہا ہے ۔ ان کی کوئی غزل .... " فہمیدہ بہن نے بھابی
کا ہاتھ جلدی سے دبا کر خاموش رہنے کو کہا ۔ بھابی گھبرا گئیں ۔ فہمیدہ
بہن نے بتایا کہ " یہ اکبر کا کلام نہیں ، کلام پاک کی تلاوت ہو رہی
ہے " ۔ بھابی سخت شرمندہ ہوئیں اور نیچی نظریں نظریں کرکے خاموش
بیٹھی یہ سوچنے لگیں کہ اچھا ہوا میں اس جلسے میں آ گئی ادبی جلسوں
کی شرکت سے ایسی کام کی باتیں تو معلوم ہوتی ہیں ۔ فہمیدہ ان
جلسوں میں جاتے جاتے یہ سب کچھ سیکھ گئی ہے اور اب مجھ پر
رعب جما رہی ہے ۔ تلاوت ختم ہوئی ۔ بھابی نے خجالت دور کرنے
کو ایک دو باتیں کیں ۔ بیگم فہمیدہ سے پوچھا " اکبر صاحب کا پورا نام
کیا تھا ۔ کہاں کے رہنے والے تھے ؟ " انہوں نے بتایا " سید اکبر حسین
رضوی ، الہ آباد کے رہنے والے " بھابی نے کہا رضوی ، رضوی
تو ہمارے ایک کلرک کا بھی نام ہے ۔ فہمیدہ نے کہا رضوی نام نہیں
ہوتا ــــــ ! "

بھابی پر پھر خجالت طاری ہونے لگی کہ اس کمبخت فہمیدہ کو
پھر رعب جمانے کا موقعہ مل گیا ۔ جلدی سے بات کاٹ کر بولیں ۔
" تو اکبر الہ آباد کے رہنے والے تھے بہن الہ آباد کے امرود تو بہت
ہی یاد آتے ہیں اب بھلا کہاں ملیں گے ۔ کئی خواتین بھابی کی اس
حسرت آمیز گفتگو پر مسکرانے اور آپس میں اشارے کرنے لگیں بھابی
سمجھیں ان سب کے منہ میں امرود کے نام سے پانی بھر آیا ہے اور ان کی
تائید کر رہی ہیں ۔ جلسے کی کارروائی جاری تھی ، کئی تقریریں ہوئیں
اکبر کے فضائل و کمالات بیان کئے گئے جو بھابی کی سمجھ میں نہ
ہی آسکے کہ وہ " اردو کے بڑے شاعر ، قوم کے اچھے مصلح اور عورتوں
کے ہمدرد ناصح تھے .... ! "

اور بھابی دل ہی دل میں اکبر کی بڑائی قائل ہونے لگیں !
اس کے بعد کچھ نظمیں پڑھی گئیں اور پھر اکبر کی ایک نظم شروع ہوئی
بھابی اس پر چونکیں ، پہلا مصرعہ کئی بار پڑھا گیا ۔

" بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں "

بھابی نے پہلے بیگم فہمیدہ کی طرف حیرت سے دیکھا کہ یہ کس کی طرف
اشارہ ہے ایسی باتیں کیوں اور کس کی کی جا رہی ہیں مگر جب فہمیدہ
بہن نے کچھ نہ کہا اور مسکرا کر خاموش سنتی رہیں تو بھابی کو غصہ آنے

ا نہوں نے سرگرمی میں کہا ' فہمیدہ ! یہ کیا بدتمیزی ہے یہ ہمیں
منے بٹھا کر صلواتیں سنائی جارہی ہیں۔ کون ہے یہ۔ اسے کس
یہ باتیں کرنے کی اجازت دی ہے ، بیہودہ کہیں کا ، لو اور سنو!
یدہ بہن اب بھی چپ چاپ مسکراتی رہیں۔ آواز بقیہ مصرعے
تی رہی ؎

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں!
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

ابی کے اب مارے غصے کے تاب نہ رہی سخت پیچ و تاب کھا کر
یں " بیہودگی کی حد ہوگئی ، فہمیدہ ایسے بدتمیز آدمی کو ادبی
سے میں ایسی باتیں کرنے کس نے بلایا ہے ؟ میں کہتی ہوں...
اور جب فہمیدہ بہن نے آہستہ سے بھابی کو خاموش
ہنے کو کہا اور سمجھانے لگیں کہ یہ اکبر الہ آبادی کی اپنی نظم ہے تو
بھابی آپے سے باہر ہو گئیں۔

" لو اور سنو ، یہ ہیں اکبر الہ آبادی ، واہ بہن واہ ، تم سنو ان
کی واہی تباہی ہمیں تو غرض نہیں پڑی ہے کہ خود بھی ان کی صلواتیں
سنیں اور اپنے مردوں مردوں پر بھی بری بھلی پڑوا تے رہیں ، یہی ایک
غیرت دار تھے بس۔ اچھا ہی ہوا زمین میں گڑ گئے ، انہی کی عقل پہ
پردہ پڑے ، ہمارے مردوں کی دور بلا میں اس بدتمیزی کو برداشت نہیں
کر سکتی تم سنو میں جاتی ہوں " ۔ اور بھابی کی آواز بلند ہونے لگی لوگ مڑ مڑ کر دیکھنے
لگے خواتین دوپٹوں میں منہ چھپا کر ہنسنے لگیں اور حاضرین مسکراتے رہے نظم پڑھی
جاتی رہی اور بھابی بڑبڑاتی " آگ لگے ایسے جلسوں کو " کہتی ہوئی روانہ ہو گئیں!
اس دن کے بعد سے آج تک بھابی ادبی دور ادبی جلسوں کے ذکر سے آگ
بگولہ ہو جاتی ہیں پہلے الہ آباد کے نام سے انکے منہ میں پانی بھر آتا تھا مگر اب اگر کسی نے
الہ آباد کا نام انکے سامنے لیا اور انھیں مردوں کی جگہ " اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا "
یاد آیا اور انھوں نے جلی کٹی سنانا اور کہنا شروع کیا۔ " نہ کوئی ادبی قومی آدمی
تھے بس سُن لیں انکی الٹی سیدھی باتیں ، ایسے جلسوں کو آگ ہی لگے !

(نقش)

حاذق ہسٹریا پلز (گولیاں)

HAZIQ HYSTERIA PILLS
FOR
HYSTERIA, INSOMNIA
EPELEPTIC FITS
AND OTHER
ALLIED DISEASES
HAZIQ

یہ مرکب گولیوں کی صورت میں خالص اور کمیاب جڑی
بوٹیوں سے جدید طبی اصول پر تیار کی گئی ہیں جو کہ ہسٹریا
جیسے موذی مرض کو ، جو ہماری نوجوان بہنوں میں آجکل
عام ہو گیا ہے سو فیصدی کامیاب ہو چکی ہے علاوہ ازیں
یہ دوا عورتوں کی دیگر شکایات اعصابی کمزوری ضعف ہضم
اختلاج قلب کے لئے بے مفید ہے اور بچوں کی مرگی
کی لاثانی دوا ہے

قیمت چالیس گولی (ایک شیشی) علاوہ محصولڈاک

حاذق دواخانہ ، بندر روڈ کراچی

شادعارفی

○

سو گریباں پھاڑ ڈالے ۔ دو گریباں سی دیئے
یہ نوازش کم نہیں ۔ لیکن تناسب سیکھئے

مسکرا کر آپ نے اتنے حسیں وعدے کئے
جن کو ہم نے جھوٹ سمجھا اور سچ کہہ کر جیئے

اپنے سر الزام کیوں لیتے ہو پھونکیں مار کر
آپ ہی بجھ جائیں گے بے نور مٹی کے دیئے

ہر روش پر بنگ بو دیجئے یہ گستاخی معاف
گلستاں پر حق کا یہ مفہوم کے دن کیلئے

کچھ نہیں ! تاریک مستقبل میں ٹوٹے آسرے
"بادلوں کے ساتھ جگنو ، چند لمحوں کے لئے"

پہلے غدار وطن کم تھے تو مخلص بے شمار
اور اب یہ ضد کہ دو مخلص تو سو بہروپیے

بندہ پرور ! ہم اگر جاسوس ہیں ، غدار ہیں
چھوڑ دیجئے سب کو ، جیلوں میں ہمیں بھر دیجئے

کیا یہ آزادی وہی ہے جس کے پہلے جشن پر
پھول نے خوشبو لٹا دی ، اوس نے موتی دیئے

شاد مجھ سے تجربے کوئی کہاں سے لائیگا !
میں نہیں کہتا یہ طرزِ فکر ہے میرے لئے

(ادب لطیف)

اثم میرزا

حادثے

چاند کی شاید آخری تاریخ ہے اندھیرا کتنا غلیظ ہو گیا ہے دُور بجلی کے کھمبے کے نیچے دھند کے مرغولے جھک رہے ہیں اور قمقموں کے اداس اور ملول روشنی چند قدموں تک ہی اپنا بھونڈا دامن پھیلا کر رہ گئی ہے۔ اندھیرے کی تہوں میں کوئی تموج نہیں کوئی حرکت نہیں۔ ستارے بھی تو صاف دکھائی نہیں دے رہے ہیں ان کے پھیکے پھیکے بے جان چہرے کیسے گم کر رہ گئے ہیں۔ ان میں سے شرابی آنکھوں کا ساخمار ختم ہو گیا ہے۔ نقشی تاروں کی سی چمک مٹ چکی ہے۔ تم نے دیکھا ہی ہو گا کہ نکھرے ہوئے آسمان پر یہ ستارے کیسے خوبصورت لگتے ہیں۔ ان کو دیکھتے ہوئے نگاہیں تھکنے کا نام نہیں لیتیں۔ ان کے مخمور اشاروں میں اپنی امنگوں کے جلوے نظر آتے ہیں —— لیکن اب —— اوپر نظر اٹھانے کو جی نہیں چاہتا۔ آنکھوں میں جلن ہونے لگتی ہے۔ دھند نے انہیں کتنا بدل دیا ہے۔ آج کی رات کتنی ویران ہے۔ تم بھی کچھ کہو نہ۔ تمھاری اس خاموشی سے سیر میں کوئی لطف نہ آئیگا۔ ابھی تو گھر سے تھوڑی دور ہی آئے ہیں۔ بہت مدت کے بعد ملے ہو۔ اپنے گھر کے حالات بتاؤ۔ کیسے گزر رہی ہے۔ —— تمہیں اپنے گھر پر میں اتنے زیادہ دیر تک نہ ٹھہرا سکا تھا کہ کہیں تم اس جان لیوا گھٹن سے اکتا کر بھاگ نہ جاؤ۔ جسے میری زندگی سسک سسک کر قبول کر رہی ہے جہاں ہر دن بھر کے تھکے ہارے انسان کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر مخصوص المیہ فلم دکھائی جاتی ہے —— ہر روز ایک ہی فلم کو بار بار دیکھ کر میرے شریانوں میں سرسریاں سی رینگنے لگتی ہیں۔ آنکھوں میں ریت کے موٹے موٹے ذرے چبھنے لگتے ہیں —— لیکن —— میرے گھر کے لئے تو شاید آج تک دوسری فلم بنی ہی نہیں ہے میں نے کئی بار کوشش کی ہے کہ کسی ڈسٹری بیوٹر سے منت وسماجت کر کے کچھ عرصہ کیلئے کسی نئی فلم کا ٹریلر ہی لے آؤں۔ لیکن مارکیٹ کا بھاؤ بہت چڑھ گیا ہے۔ اس لئے کوئی مجھے ٹریلر بھی نہیں دے سکتا، اس کے بھی اتنے دام مانگتے ہیں کہ اگر میں خود کو گروی بھی رکھ دوں پھر بھی اسے حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لئے یہی گھسی ہوئی فلم دیکھے جا رہا ہوں۔ چلئے آؤ دوست کھیس کی اچھی طرح بکل مار لو۔ ٹھنڈ بہت ہے نا۔ کہیں سردی نہ لگ جائے —— میری فکر نہ کرو۔ مجھے یہ ٹھنڈ اب کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ یہ مجھ سے بہت مانوس ہو چکی ہے۔ جب راتے چپ چاپ۔ ان گنت قدموں کے نشانات کو پرکھ رہے ہوتے ہیں۔ تو میں ٹھنڈ سے مذاق کرنے کی خاطر گھر سے باہر نکل آتا ہوں اور ٹوٹے ہوئے سلیپروں کی سڑپ سڑپ سے ان کی محویت کے تسلسل کو توڑ دیتا ہوں۔ پھر میرا ذہن آہستہ آہستہ پرواز کرنے لگتا ہے —— اور میں —— ان گلستانوں میں پہنچ جاتا ہوں جہاں دن کے ہنگاموں میں نگاہوں کے تصادم ہوتے ہیں اور رات کے سناٹوں میں چھنکتی ہوئی چوڑیاں ٹوٹتی ہیں۔ ان اونچی اونچی بلڈنگوں میں گھومتا رہتا ہوں۔ جہاں اجالے کی بادشاہی میں کوڑوں کی سڑاہٹ چیخوں کو جنم دیتی ہے اور اندھیرے کے راج میں شرابی قہقہوں کے فانوس جگمگاتے ہیں —— اور میرا ذہن تپنے لگتا ہے اور میرے ہاتھ میں ایک گرز آ جاتا ہے بھاری اور مضبوط گرز۔ اور میں آمریت کے بتوں کو توڑنا شروع کر دیتا ہوں۔ فتحمندانہ قہقہے لگاتا ہوں۔ اور ٹھنڈ مجھ سے روٹھ جاتی ہے۔ بتوں کو توڑتے ہوئے میں اسے بالکل فراموش کر دیتا ہوں —— کیا کہا —— میں کوئی نئی بات سناؤں! یہ باتیں تو تم ہر روز ہی سنتے ہو! لیکن میرے دوست، نئی بات تو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب زندگی کو قدم قدم پر گڑھوں اور نوکیلے پتھروں سے سامنا نہ کرنا پڑے جب شگاف سڑک

اٹھاتے ہوئے روح ایک نئی تازگی محسوس کرے۔ اور یہاں تو
ایک مخصوص چکر گھوم رہا ہے۔ پھر نئی بات کیسے پیدا ہو۔ حادثات
مہیب غار اپنے منہ بند کرلیں۔ تو پھر شاید میں تمہیں کوئی نئی بات
سنانے کے قابل ہو سکوں —— ہاں البتہ —— یہ طول اور اداس
روشنی اگلنے والے تمقمے —— یہ چمکتے ہوئے دھندلے مرغولے اور آسمان پر بکھری
ہوئی ستاروں کی لاشیں —— تمہیں بہت سی نئی باتیں سنائیں گی۔ استبداد
کے سنگین قلعوں کے اندر پھڑپھڑاتی بے بس روحوں کا عکس دکھائیں گی۔
طبقاتی تعصب کی سولیوں پر لٹکی ہوئی، اکڑی ہوئی انسانیت کا حال
بتائیں گی —— تم چلتے آؤ —— ابھی رات بہت باقی ہے اور شہر
کی ایک سڑک بھی تو ابھی ختم نہیں ہوئی ہے —— اس سڑک کا نام پوچھ
رہے ہو —— کوئی اچھا سا نام ہے —— پہلے کسی انگریز افسر کی
یادگار کی خاطر اسے بھی اس کا نام بخشا گیا تھا —— اور سڑک پر پاؤں
رکھتے ہی اس نام کا دبدبہ ایک تیز سنسناہٹ کی مانند جسم میں پھیل
جاتا تھا۔ کیا مجال جو اس سڑک پر گندگی کا نشان تک بھی نظر آئے

.... اور اب اس
سڑک کا نام بدل دیا گیا ہے کارپوریشن نے سے حلقۂ اسلام میں داخل
کر لیا ہے لیکن سڑکوں کا نام بدلنے سے کبھی حالات بھی بدلے ہیں
ذہنوں میں ابھی تک اونچ نیچ کے کیڑے کلبلا رہے ہیں —— کیا
اچھا ہوتا اگر سڑکوں کا نام بدلنے کی بجائے ذہنیتوں کو بدلا جاتا!
انسانیت کے مسخ شدہ چہرے کو سنوارا جاتا۔ تباہ حال مخلوق کے
جلے ہوئے تصورات کو نئی تازگی بخشی جاتی۔ اور فاقہ زدہ انسانوں کی
آرزوؤں کے ویران جزیروں کو پھر سے آباد کیا جاتا —— لیکن ——
ایسے کاموں سے نام تھوڑے روشن ہوا کرتے ہیں —— کام تو وہی کرنا
چاہیئے —— جس کی بدولت ہر طرف سے تحسین و آفرین کے کاغذی
پھولوں کی بارش شروع ہو جائے —— خواہ سسکیوں اور کراہوں
میں اضافہ ہی کیوں نہ ہو جائے —— اور —— سن رہے ہو نا دوست
اس طرف کیا دیکھ رہے ہو؟ —— وہ سامنے فٹ پاتھ پر ایک
سایہ رینگ رہا ہے —— کوئی ہوگا ہماری ہی طرح گھر کی المیہ
فلم سے بھاگا ہوا راہی —— یا —— ہو سکتا ہے تمہارا خیال درست

ہو —— اس کے یوں رک رک کر چلنے اور بار بار گردن گھما کر دیکھنے
سے تم کیسے اندازہ لگا سکتے ہو کہ وہ کوئی چور ہے —— اس نے تو دونو
ہاتھوں پر کوئی ایسی چیز اٹھا رکھی ہے جیسے وہ اسے ہر اٹھنے والی
آنکھ کو دکھانا چاہتا ہو —— ذرا تیز قدم اٹھاؤ —— تمہارا شبہ
یقیناً دور ہو جائے گا ...... بڑے میاں —— ذرا سنئے تو
میں نے کہا حضرت —— گھبرائیے نہیں —— ہم آپ کے دشمن نہیں
ہیں —— صرف یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ نے ہاتھوں پر کیا چیز
اٹھا رکھی ہے —— اف —— یہ کیا ہے —— ساتھی تم بھی دیکھ
رہے ہو نا —— کیا بڑے میاں چور ہیں —— نہیں حضرت آپ
چور نہیں ہو سکتے —— بلکہ آپ کو تو لوٹا گیا ہے —— آہ یہ آپ کے
اکلوتے بچے کی لاش ہے —— جسے آپ تاریکی کی آڑ لیکر دفنانے
جا رہے ہیں —— آپ اکیلے —— ہاں یہ بات تو سچ ہے کہ لوگ
منہ رکھنے کی خاطر نماز جنازہ میں شریک ہونے آجاتے ہیں۔ ورنہ
دلی ہمدردی تو ختم ہو چکی ہے —— لیکن ہمارے معاشرہ میں خود غرضی
اور مطلب پرستی کے مہلک جراثیم پھیلانے کی ذمہ داری کس پر عاید
ہوتی ہے؟ —— آپ مسکرا پڑتے ہیں۔ آپ کے ہونٹوں پر ابھری ہوئی
مرجھائی ہنسی میں کتنا شدید طنز ہے —— کاش —— میں جگمگاتے
ہوئے محلوں میں اس طنز کو پھیلا سکتا —— کہاں سے آئے ہیں
یہ آپ خود بھی نہیں جانتے —— یہ وقت ہی ایسا ہے کہ آپ خود
کو بھی بھلا بیٹھے ہیں آپ کے ہاتھوں پر بڑھاپے کی کچلی ہوئی تمنائیں
ہیں آنکھوں کا نور چھین لیا گیا ہے دل کا سرور لوٹ لیا گیا ہے اور آپ کے
تصورات کی خوش رنگ تتلیوں کے پر سل گئے ہیں اور وہ وقت کے
مدفن پر بے جان پڑی ہوئی ہیں —— اب آپ کے بڑھاپے کو کوئی
مخمل ہونے سے نہ بچا سکے گا۔ اب تک آپ اپنی مسکراتی ہوئی بہاروں
کو گنوا کر بھی جی رہے تھے اس امید پر کہ ننھا بڑا ہو کر چھینی ہوئی
بہاروں کو پھر سے حاصل کرے گا۔ آپ کے بڑھاپے کے ویرانوں
میں حسین گلستانوں کی بنیادیں رکھے گا —— لیکن —— آپ کے ہوائی
قلعے دھڑام سے گر گئے ہیں۔ بڑے میاں۔ یہ لاش مجھے پکڑا دیجیے
آپ تھک گئے ہوں گے۔ جی ہاں مجھے ایک انسان ہی سمجھئے۔

اور کچھ بننا نہیں چاہتا ـــــ تم بھی چلتے آؤ دوست ـــ یہ حادثہ
ن اور اداس ماحول کی وسعتوں کو زار لانے والی یہ نئی بات سن کر بھی
وش ہو ـــــ اس تباہ حال بڑے میاں کے آنسو ہی پونچھ ڈالو،
ـــ تم تو خود رو رہے ہو اور تمہارے آنسو پونچھنے والا بھی تو
نظر نہیں آتا - یہ آنسو - پتھروں کی سلوں کو چیر کر نکلے ہوئے
سوتے ہیں ـــ جو آبادیوں سے دور ـــ دشوار گزار پہاڑیوں
ڈھلوانوں پر رینگتے ہوئے وہیں کہیں گم ہو جاتے ہیں - تمہارا دل
ل رہا ہے ـــ اور بڑے میاں کی تو سب کائنات ہی پگھل رہی
ہے ـــ لاوے کی مانند ـــ اور یہ لاوا ابھی تک بغیر کسی شور کے پچکے
ہوئے گالوں پر لکیریں بنا رہا ہے ـــــ نہ جانے کچھ دیر بعد اس
وے کا رخ کس بستی کی طرف ہوگا - یہ لاوا اب زیادہ دیر
ـ خاموش نہیں رہ سکتا - کھولاؤ بڑھ جائیگا ـــ اور ایک قیامت
شور - بوڑھے کے نڈھال ذہن میں ایک نئے عزم کو جنم دے گا
ـــــ ذرا سنو ـــ بڑے میاں کیا کہہ رہے ہیں - بڑے میاں
پ چلتے آئیں - بچے کی لاش میرے ہاتھوں پہ محفوظ ہے اور قبرستان
ی تو وہ سامنے آگیا ہے - جنازہ نہ سہی - قبر کیلئے تو کسی کو ضرور
ہا ہوگا ـــــ نہیں ـــــ اس لئے کہ آپ کی جیب ویران ہے
ور اسی ویرانی نے تکیے بچے کی شرارتوں کو نگل لیا ہے یہی ویرانی آپ
ے بڑھاپے کی سنبھلتی ہوئی محرابوں میں بھونچال لے آئی ہے ـــــ
ب سمجھا ـــ کیوں ساتھی یہ حادثہ تمھیں کوئی نئی بات نہیں سنا رہا
ہے تم مجھے گھورنے لگے ہو - میں مذاق نہیں کر رہا ہوں
م اس حادثہ کی گہرائیوں میں پہنچکر ان شناک روایات کا سراغ لگانے
ی کوشش کرو جو اجاڑ شاہراؤں پہ سسکتی ہوئی انسانیت کو انہیں
ہاتھوں سے مجروح کرنا اپنا فرض اولین سمجھتی ہیں ـــــ
زندگی، ہانپتی ہوئی، کانپتی ہوئی ـــ جب خونی موڑ والے چکر
سی سرسبز پھلواری کے قریب پہنچتی ہے تو پھول انگارے کیوں
ن جاتے ہیں ـــ ابھی سوچتے رہو آج پہلی رات ہے چند راتیں
ور یہاں پر رہے تو تم بہت کچھ سیکھ جاؤ گے اور تمہارے پاس
ائی اور خلوص کا اتنا سرمایہ اکٹھا ہو جائے گا کہ اسے اپنے گاؤں

کے مزارعوں میں بانٹے بغیر تمھیں چین نہ آئے گا ـــ قبرستان کی حد
شروع ہو گئی ہے - یہاں پر اندھیرا کتنا بھیانک ہو گیا ہے ذرا سنبھال کر
پاؤں رکھنا - کہیں پاؤں کسی بیٹھی ہوئی قبر میں نہ پھنس جائے شکستہ
قبروں کی یہاں پر بہت بہتات ہے - شاید مرنے والوں میں زیادہ
تعداد غریبوں کی ہے ـــ اور یہاں سے پرے ہنگاموں اور خوشبوؤں
سے چہچہاتے اور مہکتے ہوئے ماحول میں بھی تو بے بس لوگوں کی
تمناؤں کی قبروں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں ـــ اور قبروں کے علاوہ
لاشیں بھی تو تنگ گلیوں اور سیلے مکانوں میں بڑی افراط سے سڑتی
اور گلتی رہتی ہیں - انہیں کوئی دفنانے والا بھی نہیں ہوتا ـــــ
ننگ دھڑنگ لاشیں، تنگ گلیاں اور سیلے مکان ـــ یہ ہمارے
صبر کا انعام ہے، ہمیں یہی سبق پڑھایا جاتا ہے کہ جدوجہد ایک
شیطانی جذبہ ہے - خاموشی سے ہر وار کو سہتے رہو اور اُف نہ کرو
ورنہ جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلے بھسم کر ڈالیں گے ـــــ ہمارے بچے
جب یہ سبق رٹتے ہوتے ہمارے کھوکھلی ہڈیوں سے چمٹ جاتے ہیں!
اور جب انھیں اپنے پیٹ میں سنسناتی ہوئی بھوک کا احساس ہونے
لگتا ہے تو ہماری بے نور سی آنکھوں میں آنسوؤں کا ابال آجاتا ہے
ہماری مٹھیاں کس جاتی ہیں - ہمارے سینے میں ایک ایسی چیخ
چکرانے لگتی ہے جس کی گونج سے دھرتی کی طنابیں ٹوٹ جائیں
اور اس وقت ہمارے ذہنوں میں ایک ہوّا اچھلنے لگتا ہے
کہ " جدوجہد ایک شیطانی جذبہ ہے " ـ اور ہم اپنے بلکتے ہوئے
بچوں کو تھپک کر انہیں نسیلوں کے نظر فریب کھلونوں سے بہلانا
شروع کر دیتے ہیں ـــ کتنے بزدل ہیں ہم ـــ موروثی
القاب کی طرح ـــ ہماری پیشانیوں سے چمٹی ہوئی ذلت کیا کبھی
دور نہ ہوگی ـــ ہم اپنے خون کے کھولاؤ کو ـــ کیا اسی طرح جلاتے
رہیں گے! ـــ اب تم کچھ سمجھنے لگے ہو ـــ سمندر کی
پر سکون سطح کے نیچے جنم لینے والے طوفان ـــ چاند کے شباب
کی شہ پاکر ساحل کو بھی موجوں میں بدل دیتے ہیں - اور کناروں
کا غرور ٹوٹ جاتا ہے ـــــ بڑے میاں - ننھے کی
قبر کیلئے یہ جگہ موزوں رہے گی ـــ یہ جگہ ان مرمر کی قبروں سے

رہی ہے ——— یہ اسلئے کہہ رہا ہوں کہ کہیں مرمر کی قبروں کے قریب
ائی ہوئی ننھے کی قبر جانے بو مجھے خوف کے اثر سے جلد ہی نہ بیٹھ جائے
ساتھی تم بڑے میاں سے لوہے کا لکڑا پکڑ لو اور قبر کھودنا شروع کرو
تھک جاؤ گے تو مجھے بتا دینا ——— بڑے میاں یہاں بیٹھ
جاتے ہیں ——— اس طرف کیا دیکھ رہے ہیں ——— وہ دور
قبرستان میں کسی نے بجلی لگوا دی ہے اور مرمر کی قبریں اتنی دور سے
بھی کیسے چمک رہی ہیں ——— کیوں دوست تھک تو نہیں گئے
قبر مکمل ہو گئی ہے ——— آؤ بڑے میاں بچے کی لاش کو سپرد خاک
کر دیں۔ گھبرائیں مت بڑے میاں۔ میں بچے کی لاش کو پھول کی مانند
قبر میں رکھونگا۔ رونے سے بگڑے کام نہیں بن سکتے۔ آپ کی ہچکیاں
رائگاں نہ جائیں گی۔ جد و جہد کی حسین وادیاں شروع ہو گئی ہیں
ان وادیوں میں اپنی ہچکیوں کو کھلا چھوڑ دو۔ یہ آپکے زخموں کے لئے
ضرور کوئی نہ کوئی جڑی بوٹی تلاش کر لیں گی ——— قبرستان کے سینے
میں ایک اور ننھا ابھار پیدا ہو گیا ہے مظلوم باپ زندگی کی آخری
بازی بھی ہار گیا ہے۔ بڑے میاں آؤ اب چلیں ——— زیادہ دیر
یہاں ٹھہرنا اچھا نہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ آپکی شریانوں میں مچلنے والا
جوش کہیں فراریت کی بوجھل چٹانوں تلے نہ دب جائے ———
ساتھی بڑے میاں کا ہاتھ پکڑ لو ——— کیا کہا ——— بڑے میاں
نہیں ہیں ——— کہاں چلے گئے ؟ ——— ابھی تو یہیں پر تھے۔ گھبرا
گھبرانے کی بات نہیں ——— وہ اب کہیں نہیں جا سکتے۔ وہ ہمیں
جلد مل جائیں گے ——— یہ نئی سڑک شروع ہو گئی ہے یہی
سڑک سے یہ ذرا مختلف ہے۔ بجلی کے بلب دور تک روشنی بکھیرتے
نظر آتے ہیں۔ سرمئی سڑک کا سینہ بھی دکھائی دے رہا ہے اور
آس پاس کی کوٹھیوں کے باغیچوں میں پیپے جو کھاتے کیسے عجیب لگ رہے
ہیں۔ جیسے حسن اور عشق سرگوشیاں کر رہے ہوں ——— حسن و عشق
——— تم نے قہقہہ لگایا ہے اور وہ دیکھو سائے لرزنے لگے
ہیں۔ جیسے تم نے حسن و عشق کا پول کھول دیا ہو ——— یہاں کی دنیا
اسی محور کے گرد گھوم رہی ہے انکی زندگی کا یہی مقصد رہ گیا ہے کہ
وہ حسن و عشق کے نئے نئے بت تراشتے ہیں ——— اور انکی پوجا کرتے

ہوئے یہ انسانیت کو بھول جائیں انسانیت کی باتیں ان کیلئے اب کچھ وقعت
نہیں رکھتیں یہ انہیں کی من گھڑت کہانیاں سمجھتے ہیں۔ اور اسی لئے
یہ اپنے لئے ایک نیا مذہب بنا رہے ہیں ——— پل پر پہنچ کر
رک کیوں گئے ہو اور اس سوکھے نالے میں کیا دیکھ رہے ہو چلتے آؤ
پل کے اس طرف سڑک اس سے بھی زیادہ حسین ہے وہاں تمہیں بہت
سی معنی خیز سیٹیاں سنائی دیں گی۔ لیکن تم نیچے ہی دیکھے جا رہے ہو
وہاں آخر ہے کیا ؟ ذرا میں بھی تو دیکھوں وہ ایک طرف ایک گٹھڑی
سی دکھائی دے رہی ہے ——— اسی طرف دیکھ رہے ہو نا ——— بھئی
بہت ضدی ہو نہ جانے وہ کیا ہے تمہیں اس سے کیا لینا ہے آؤ
آگے چلیں ——— نہیں ——— تمہاری مرضی ——— اچھا ٹھہرو میں بھی
تمہارے ساتھ نیچے چلتا ہوں ——— ڈھلوان پر ہولے ہولے قدم
اٹھانا کہیں پھسل نہ پڑو ——— یہ لو ——— اچھی طرح دیکھ لو ——— یہ تو
گٹھڑی ہی ——— لیکن کون جانے اس میں کیا ہے ——— ہاں اٹھا لو
آہستہ سے گرہیں کھولو ——— کہیں .... اوہ تم تو بہت
گھبرا گئے ہو ——— مجھے بھی دکھاؤ کیا ہے۔ آہ ——— یہ میں کیا
دیکھ رہا ہوں ——— کیا یہ حقیقت ہے ——— ایک نومولود بچے
کی لاش ——— اف میرا ذہن گھومنے لگا ہے ——— آؤ اب
واپس قبرستان چلیں ——— دھرتی کے سینے پر ایک اور ننھا ابھار
بنا دیا ہے ——— اور جب ——— ناانصافی کا دور ختم ہو تو
ہم اس ابھار کو گواہ بنا کر ان خوبصورت بنگلوں سے انتقام لے سکیں
میرا ہاتھ پکڑ لو ——— میری آنکھوں پر اندھیرے کے دبیز پردے
سرسرا رہے ہیں ——— حسین مرغزاروں پر دھوئیں کے غلیظ بادل
منڈلا رہے ہیں ——— دلکش پھولوں کے چہرے سیاہ پڑ گئے ہیں
نازک کونپلوں کے سینے پھٹ گئے ہیں ——— بھنوروں کے مدھر
نغمے نوحوں میں بدل گئے ہیں ——— ساتھی ! ہواؤں سے کہو کہ وہ
کہ غلیظ بادلوں کو کہیں دور بھگا کر لے جائیں۔ یہ دھرتی اب زیادہ
دیر تک سیاہیوں کو نہیں چاٹ سکتی۔ دلکش پھول بہاروں
کے گیت گانے کیلئے بے چین ہو گئے ہیں نازک کونپلیں جوانی کے
سپنے دیکھنے کے لئے بے قرار ہو گئی ہیں اور بھنوروں کے گیت فضا

میں شیرینی بکھیرنا چاہتے ہیں۔ ساتھی۔ اس ننھے کی لاش سے پوچھو کہ خوبصورت بنگلوں کی معطر فضاؤں میں کس نے زہر گھول دیا ہے جذبات کے اندھے دھارے نے انسانیت کے پل کو کیوں توڑ دیا ہے آج وہ تہذیب کتنی ننگی ہو گئی ہے جو انسان کی دماغی صلاحیتوں کو چھین کر وہاں پر گندگی کے ڈھیر لگا رہی ہے ——— ساتھی بڑے میاں اگر کہیں مل جائیں تو ان سے پوچھنا کہ انھیں کیا واقعی اپنے بچے کی موت کا غم ہے؟ اور ——— یہ ننھا ——— جو سفید ساٹن کے ٹکڑے میں لپٹا ہوا ہے کیا اس نے غم کا کوئی نقش نہ چھوڑا ہوگا وہ لوگ جو مخملیں گدوں پر انسانیت کے تقاضوں کا مذاق اڑایا کرتے ہیں۔ کیا اس غم سے بالکل عاری ہیں انہیں کوئی دکھ نہیں۔ ایک جرم کو چھپانے کی خاطر دوسرا سنگین جرم کیوں کیا گیا ہے ——— یہ ایک اور حادثہ ——— تمہارے سامنے رقصاں ہو گیا ہے انسانیت کے پھول سے رخساروں پر ایک کے بعد دوسرا طمانچہ ——— کیا وہ یونہی طمانچوں کی جلن کو برداشت کرتی رہے گی ——— تم کسی بات کا بھی جواب نہیں دے رہے ہو ——— گم سم کیوں ہو ——— بولتے کیوں نہیں؟ قبرستان نزدیک ہوتا جارہا ہے ——— پہلے تم اسکے سینے میں بڑھاپے کی کچلی ہوئی امیدوں کو دفنا کر آئے تھے اور اب آدمیت کی شاہراہ سے بھٹکی ہوئی جوانیوں کے اس سنگین جرم کو دفنانے جارہے ہو ——— اور دھرتی چپ چاپ لیٹی ہوئی خاموش نظروں سے پاؤں کی حرکات کو تک رہی ہے شاید وہ منتظر ہے کہ وہ وقت کب آئیگا جب تم اس سے اپنی امانتیں مانگنے آؤ گے اور اسے گواہ بنا کر انصاف کا تقاضا کرو گے ———

قبرستان کی حد شروع ہو گئی ہے۔ یہ بڑے میاں کے بچے کی قبر ہے اس کے قریب ہی اس بچے کو بھی دفنادو ——— لیکن ——— تم تو آگے بڑھتے جارہے ہو ——— ذرا ٹھہرو میں قبر کھودنے کیلئے لوہے کا ٹکڑا اٹھالوں۔ تم تو روشنی میں چمکتی ہوئی مرمر کی قبروں کے پاس آگئے ہو ——— کیا کہا ——— اس بچے کی قبر مرمر کی قبروں کے درمیان بنے گی ——— ایسا کیوں ——— کچھ کہو بھی ——— ہاں یہ جگہ ٹھیک رہے گی ——— تم بچے کو اٹھائے رکھو میں قبر کھودتا ہوں ——— یہ دیکھو مرمر کی قبریں کیسے گھور رہی ہیں جیسے یہ دھمکا رہی ہوں۔ شاید یہ ہمارے ارادوں سے واقف نہیں ہیں ——— قبر مکمل ہو گئی ہے لاش کو آہستہ سے اس میں رکھ دو ——— بس ٹھیک ہے ——— اب مٹی ڈال دو ———

قبرستان کے سینے میں ایک اور ننھا ابھار پیدا ہو گیا ہے ——— اب میں تمہارا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ مرمر کی قبروں کے درمیان یہ ننھا ابھار کتنی بھیانک طنز ہے۔ اور کیا معلوم یہ طنز مرمر کی رنگت بدل ڈالے اور شعبدہ بازیوں کے ستون دھماکوں سے اڑنے لگیں ——— آؤ اب چلیں ——— تم اور کہیں نہیں جانا چاہتے ——— چلو گھر چلیں ——— ہوا میں برف رچی ہوئی ہے سردی بڑھ گئی ہے اور یہ سڑک نئے نام کو اپنا کر اداس اور ویران ہوتی جارہی ہے ——— اور ذہنیتوں کو بدلنے کا پروگرام ابھی تک مرتب نہیں ہوا ہے لیکن میرے دوست ——— یہ کالی بھیانک رات ——— وقت کے تیرتے ہوئے لمحات کو جامد تو نہیں بنا سکتی ——— بلکہ ——— وقت کے تیرتے ہوئے لمحات کی رفتار تو پہلے سے تیز ہو گئی ہے ——— تھوڑی دیر اور انتظار کرو، فضاؤں میں گھلی ہوئی سیاہی دور ہو جائے گی ——— افق کے کونے جگمگانے لگیں گے ——— آں ——— کیا کہا ——— سیاہی کیسے دور ہو جائیگی ——— تم تو بالکل انجان ہو ——— لیکن ——— تم مسکرا رہے ہو ——— جیسے میری باتوں پر یقین نہ آرہا ہو ——— ہاں کہو ——— کیا کہنا چاہتے ہو ——— میں تمہاری باتیں غور سے سنونگا ——— میں سن رہا ہوں ——— تم کہتے جاؤ ہاں ٹھیک ہے یہ ——— یہ تم کہہ رہے ہو ——— تم ——— جسے میں انجان اور نہ جانے کیا کچھ سمجھ رہا تھا ——— تمہارا مشاہدہ بہت گہرا معلوم ہوتا ہے ——— آگے کہو ——— تمہاری باتیں میرے ذہن پر جمی ہوئی بزدلی کی کالک کھرچ رہی ہیں ——— میری خیالی دنیا میں ایک زلزلہ آگیا ہے ——— مجھے سہارا دو ساتھی ——— کہیں لڑکھڑا کر گر نہ پڑوں ——— واقعی ——— آج تم نے میرے سامنے تمام الجھنوں کا حل پیش کر دیا ہے میں جا بتاتا

دیکھکر پاگل سا ہوتا تھا اور جب جنون کم ہو جاتا تھا ـــــ تو بزدلی
اپچھاتیاں میری زندگی کے ہر گوشے میں رقصاں ہو جاتی تھیں
ں سوچا کرتا تھا کہ اندھیرے مٹ جائیں گے۔ پھر اجالے کا
راج ہوگا ـــــ لیکن کیسے ؟ ـــــ یہ میں نہ جانتا تھا ـــــ آج
تک تمہارے ساتھ گھوم کر میں نے جو باتیں کی ہیں۔ ان میں
بہت جوش تھا۔ تڑپ تھی ـــــ لیکن انکی کچھ وقعت نہ تھی
یہ تو ایسا ہی تھا جیسے کوئی ریت کے ٹیلے پر مینار بنا رہا ہو ـــــ تم
آج اتنی مدت کے بعد ایک نئے روپ میں میرے سامنے آئے
ہو ـــــ یہ روپ میں نے پہلے کبھی دیکھنے کی کوشش نہ کی
تھی ـــــ صبح کام کرنے جاتا تھا ـــــ اور شام کو لوٹتا تھا
گھر میں بیوی بچوں کو دیکھکر میرا خون کھولنے لگتا تھا اور پھر یہ
ویران سڑکیں میری ہمدرد بن جاتی تھیں۔ میں کڑھنے کے سوا
اور کچھ نہ کر سکتا تھا۔ زندگی کو نکھارنے کا میرے پاس کوئی
حل نہ تھا۔ تم نے سچ کہا ہے نہ توڑ دینے سے بڑے کام بن سکتے
ہیں اور نہ ہی کڑھتے رہنے سے زندگی کے مسائل حل ہوتے ہیں
اس کام کے لئے تو عمل کی ضرورت ہے ـــــ عمل بھی وہ جس میں
فریب اور مطلب پرستی کا کوئی دخل نہ ہو ـــــ آج میں سمجھ گیا
ہوں کہ خون کو کھولاتے رہنے سے اندھیارے دور نہ ہونگے تمہاری
اس بات میں کتنی صداقت ہے کہ اگر ہم خوشحالی اور امن چاہتے
ہیں تو ہمیں خیالی دنیا کو مٹا کر اصلی دنیا میں قدم رکھنا ہوگا جس طرح
ہم نے اس خطۂ پاک کو حاصل کیا ہے اسی طرح ہم امن اور خوشحالی بھی
حاصل کر سکتے ہیں ـــــ وہ تیس کروڑ تھے اور ہم دس کروڑ !
اور دنیا نے دیکھ لیا کہ جب ہم اپنے مطالبہ پر جم گئے تو تیس کروڑ
پوری قوت کے ساتھ بھی ہمیں نہ ہلا سکے اور اب ہم سات کروڑ ہیں
اور وہ چند نفوس ـــــ اور اگر ہم سچے دل سے امن
اور خوشحالی کا مطالبہ کریں تو کیا ہم شکست کھا سکتے ہیں ـــــ ؟
نہیں ـــــ کبھی نہیں ـــــ تم نے مجھے جو راستہ
بتایا ہے میں اس پر چلونگا ـــــ میں اپنی زندگی میں انقلاب
پیدا کرونگا ـــــ میں مسلمان بنوں گا ـــــ اور اپنے حلقہ کے
وہ لوگ جو اندھیاروں میں بھٹک رہے ہیں انہیں صحت مند اُجالے
کا پیغام سناؤں گا ـــــ کاش ! مجھے یہ سب کچھ پہلے معلوم ہو جاتا
اور میں اپنے بچوں کو آوارہ گرد نہ بننے دیتا ـــــ لیکن اب بھی تو کچھ
نہیں بگڑا میں انہیں سنبھالوں گا۔ اور گھر سے بھاگ کر بے مقصد
گھومنے کی بجائے میں اپنے حلقہ کے عوام و خواص کو ہراول دستہ کے
سپاہی بنانے میں وقت صرف کیا کرونگا۔ ساتھی تم کتنے اچھے ہو۔ ذرا تیزی
سے قدم اٹھاؤ میں اپنی بیوی اور بچوں کو نیند سے پہلے یہ خوشخبری سنانا چاہتا ہوں

حاذق ہیر ٹانک آئل

بالوں کو قبل از وقت سفید ہونے سے روکتا ہے۔ بالوں کو گرنے سے بچاتا ہے اور ان کو سیاہ ملیے اور چمکدار بناتا
سو فی صدی نباتی تیلوں سے کیمیاوی طریقوں سے بنایا ہوا خوشبودار اور روزمرہ کے استعمال کے لئے بہترین ہیر آئل۔
سر کی خشک جلد جو عموماً بال گرنے سے گنج، بفا (چھلکے اترنا) کا باعث ہوتی ہے، کو تروتازگی بخشتا ہے اور قدرتی بالو
کی نشوونما میں مدد کرتا ہے۔ مرد اور عورت سب کے لئے یکساں مفید ہے۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے

حاذق دواخانہ، بندر روڈ کراچی نمبر ۱

نعام الحق اخوان

مگر سیول جلتا رہا!

...... سیول جل رہا تھا۔ اس کی صنعتیں تباہ و برباد
ہو رہی تھیں۔ اس کے جوان "روسی، امریکی میڈ" توپوں کے ذریعے
بھونے جا رہے تھے، اس کی عورتوں کی عصمتیں چکنا چور ہو رہی تھیں
لیکن گریملن اور وال اسٹریٹ کے بھتنے جنگی قہقہے لگا رہے تھے ـــ وہ تو
تیسری جنگ عظیم کے لئے اپنے فوجیوں کو تیار کر رہے تھے چاند ماری
کے لئے کوریا سے موزوں سرزمین آخر اور کون ہو سکتی تھی۔ ان کے شیدائی
امن کی تحریک وہیں سے شروع کرنا چاہتے تھے، انہیں اس خطرناک
کھیل سے کون روک سکتا تھا۔

مانگ سوچ رہا تھا، ـــــ لاکھوں کورین سوچ رہے
تھے لیکن انہیں اس عذاب سے چھٹکارا پانے کی کوئی امید نظر نہ آتی تھی
وہ دن رات اپنی جانوں اور عزتوں کی خیر مناتے رہتے تھے وہ لوگ
ظالم سے تنگ آ گئے تھے۔ وہ لوگ سوچتے کہ خواہ امریکہ ہو یا روس
دو میں سے کوئی قابض ہو جائے لیکن مصیبتوں میں تو کمی آئے اسلئے
کہ سیول کئی مرتبہ امریکنوں اور کئی مرتبہ روسیوں کے قبضے میں گیا اور
جب بھی وہ فتحیاب ہوئے خوشی میں سینکڑوں گولے شہر کی دیواروں
پر داغے اور ہزاروں لڑکیوں کی عصمتیں نوچیں۔

آج پھر امریکی شکست کھا رہے تھے اور روسی شہر میں داخل
ہو رہے تھے۔ آج شہری پھر ایک نئی مصیبت کے متوقع تھے مانگ
بھی ایک نئی مصیبت کا انتظار کر رہا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ آج ضرور
اس کے دروازے پر کسی روسی لفٹیننٹ یا کپتان کی دستک ہو گی اسکا
قیاس ٹھیک تھا دروازے پر کوئی دستک دے رہا تھا، مانگ بستر
سے اٹھ کر آہستہ آہستہ دروازے کے قریب گیا اور سوراخ سے جھانکنے
لگا اس نے ایک فوجی آفیسر کو دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے پایا وہ چپکے
سے واپس آیا۔ عورتوں کو بتایا اور پھر ساری عورتوں کو کمرے میں بند کر کے
تالا لگا دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ پھر دروازہ کی طرف بڑھا۔

فوجی آفیسر زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا "دروازہ
کھولدو..... کھولدو" فوجی انگریزی چینی اور روسی کے ملے جلے تلفظ
میں چلا رہا تھا اسے کھٹکھٹاتے کافی دیر ہو گئی تھی۔ لیکن کوئی اس کی
آواز اور دروازہ کی پیہم کھڑکھڑاہٹ کو نہیں سن رہا تھا آخر اس نے
دونوں ہاتھوں سے دھکا دینا چاہا۔ لیکن اس کے تعجب کی کوئی حد
نہ رہی جب اچانک دروازہ اس کے سامنے کھل گیا۔ اس کی نظریں
اندر کی طرف اندھیرے میں دھنس گئیں۔ اس نے چاروں طرف اندھیرا
پایا آخر اسے لڑکا بھی نظر آ گیا۔

"او لڑکے شاباش ـــــ اوہ یہ اندھیرا کیوں؟" فوجی نے
لڑکھڑاتے ہوئے کہا۔ اس کے منہ سے شراب کی بو بڑی تیز آ رہی تھی
ـــــ قبل اس کے کہ لڑکا کچھ جواب دیتا۔ کپتان نے کہنا شروع
کیا "لڑکے ہمیں ایک کورین وطن پرست نے اس مکان کی طرف اشارہ
کر کے بتایا کہ اس میں کچھ خوبصورت مسلمان لڑکیاں رہتی ہیں لیکن اس نے
یہ بھی بتایا کہ وہ اپنی عزتوں کو جان سے زیادہ پیاری سمجھتی ہیں۔ اسلئے
وہ غیر مردوں کے ساتھ رات رہنا ٹھیک نہیں سمجھتیں۔
"کیا یہ بات ٹھیک ہے بولو؟" اس نے لڑکے کے
دونوں کاندھوں کو جھنجھوڑتے ہوئے دریافت کیا۔

لڑکا بغیر پس و پیش کے بول اٹھا "بالکل ٹھیک کپتان! لیکن
وہ سب کہاں ہیں ہم آج رات کے چند گھنٹے ان لوگوں کے ساتھ
گزارنا چاہتے ہیں وہ ایک روسی کپتان کو اپنے پہلو میں پا کر فخر
محسوس کرینگی۔"

لڑکے کو ان الفاظ سے غصہ آ گیا۔ لیکن اس نے مجبوراً وقت
کا لحاظ کرتے ہوئے ضبط کیا اور بولا "لیکن؟"

کپتان چونکا ——— "لیکن دیکن سے کیا مطلب ہے
را، تم کو معلوم ہے آج روسی کپتان ان لڑکیوں کو زینت بخشنے
ہے ——— تم شاید نہیں جانتے کہ وسطی ایشیا کی مسلمان
لیاں روسی فوجیوں کے ساتھ رہنا فخر محسوس کرتی ہیں ———
لڑکے کو پھر غصہ آگیا لیکن اس نے برداشت کیا
"لیکن کپتان ——— !" وہ جھوٹ بولتے ہوئے سہم
یا "بولو لیکن سے کیا مطلب ہے تمہارا؟" کپتان نے
اندھے پکڑ کر لڑکے کو اپنی طرف کھینچ لیا۔
"بات یہ ہے کپتان کہ ہمیں افسوس ہے کہ وہ لڑکیاں
آپکی کوئی خدمت نہ کر سکیں گی!"
کپتان غصہ میں آگیا ——— "بولو دیکھو اگر ان
لڑکیوں نے انکار کیا تو روسی کپتان زبردستی ان کو اپنے پہلو میں
لے لیگا۔ روسی کپتان کی آج پہلی مرتبہ توہین ہو رہی ہے ورنہ
روسی کپتان جس سرزمین میں گیا عورتوں نے عصمتیں اور مردوں
نے اپنی جانیں ان کے لئے لٹائی ہیں۔
مارشل اسٹالن نے ایک مرتبہ تقریر کرتے ہوئے کہا تھا
"میرے جوانو! تم جس سرزمین قدم رکھوگے خواہ وہ مادہ پرست
یورپ ہو یا خدا پرست ایشیا ہر جگہ تمہیں عزت ملیگی" لیکن آج
وہ ایشیا کے ایک چھوٹے سے خطے کوریا میں اپنے محبوب باپ کے
الفاظ کی توہین ہوتے دیکھ رہا ہے۔ تمھیں شاید نہیں معلوم
کہ کپتان تو کپتان ایک روسی سپاہی کے لئے بھی دنیا کی
سب عورتیں کھلی ہیں"
اور یہ کہتے ہوئے اس کا سینہ اکڑ گیا ——— وہ امریکن
تو نہیں جس سے ساری دنیا کی عورتیں نفرت کریں ——— وہ تو
روسی ہے جس نے ساری دنیا کے غریبوں کو آزاد کرانے کا بیڑہ
اٹھایا ہے۔ اس سے محبت کرنا ہر ایک کے لئے ناگزیر ہے ———
اس نے لڑکے سامنے پوری تقریر جھاڑ دی۔
روسی کپتان کے ان الفاظ نے مانگ کو غصہ سے سرخ
کر دیا اور اس کا جی چاہا کہ کپتان کے دو ٹکڑے کر دے لیکن یہ اس

کے بس میں نہ تھا ——— اس لئے کہ پورے سیول میں
سرخ فوجیں غیر کمیونسٹ کورین کو گولی کا نشانہ بنا رہی تھیں ———
——— "لیکن کپتان آپ نے پوری بات تو سنی نہیں!"
"کہو بولو کہو" کپتان خوش ہو گیا
"اصلی بات یہ ہے کہ ان لڑکیوں کو امریکی درندے سرخ
فوج کے سیول میں داخل ہونے سے پہلے ملٹری گاڑیوں میں زبردستی
بٹھا کر لے گئے"
"تو کیا بولو وہ لڑکیاں یہاں نہیں ہیں!" روسی کپتان
نے زوردار الفاظ میں پوچھا۔ اس کی آواز میں محرومی کا احساس تھا
"نہیں کپتان وہ سب لڑکیوں کو پکڑ کر لے گئے"
کپتان غصہ سے سرخ ہو گیا اس کے منہ سے کف جاری
ہو گیا "اور اس پر بھی تم کورین امریکنوں سے محبت کرتے ہو اور ان کو
اپنا محافظ سمجھتے ہو!"
"لیکن کوریا کے سب لوگ تو نہیں کپتان، سارے تو امریکیوں
کے ساتھ نہیں ہیں ———"
مانگ نے کہا اور پھر وہ سوچنے لگا "تم سامراجی کتوں
نے کورین کو مجبور کر دیا ہے کہ ایک طرف تمھارا ساتھ دیں تو دوسری
طرف امریکنوں کا ——— وہ تو چکی کے دو پاٹوں میں پس
رہے ہیں ———!"
"اسی وجہ سے تو میں نے سینکڑوں کورین کو سنگینوں
اور رائفلوں کا نشانہ بنایا" ——— روسی کپتان نے جواب دیا۔
اکیلے میں نے صرف میں نے بنایا
"اوہ! اکیلے سینکڑوں" مانگ سہم گیا
"اوہ! تم تو بڑے بہادر ہو کپتان ——— بے شک
تم بڑے بہادر ہو اور بے شک وسطی ایشیا کی لڑکیاں تم
جیسے بہادر روسیوں کے ساتھ رہنے سے فخر محسوس کرتی ہونگی"
——— "اور پھر کل دیکھنا بولو"! کپتان ذرا مسکرایا" میں ان
کورین کو جو امریکنوں کا ساتھ دے رہے ہیں میں تمھیں پھر کبھی
بتاؤ نگا کہ میں نے کتنے بوڑھے کتنے بچے اور کتنی عورتیں مارے ہیں

"تم لوگوں سے اتنی جانیں کیسے لی جاتی ہیں کپتان — ہم لوگ تو کتے کو بھی نہیں مارتے!

مانگ نے جواب دیا۔

تم لوگ تو بزدل ہو۔ اگر بزدل نہ ہوتے تو آج تم امریکن کو اپنے ملک سے نکالے ہوئے نہ ہوتے — ہم لوگوں نے اپنے ملک میں گھسنے والے جرمنوں کو بتایا کہ کسی ملک میں گھسنے کی کتنی بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے!" اور کپتان یہ کہتے ہوئے مکان سے باہر نکل آیا۔

— مانگ سوچنے لگا "بہادر کسے کہتے ہیں۔ جس طرح امریکنوں نے تمہیں ہتھیار جرمنوں کے خلاف مہیا کئے، اسی طرح ہم لوگوں کو بھی کوئی ملک مہیا کرے تو پھر دنیا کو بتا دیں کہ —

" روسی زیادہ بہادر ہوتے ہیں یا کورین!

— (جہان نو)

نسوانی امراض کے لئے حاذق دواخانہ کی مایۂ ناز ایجاد

فیمیلن — (نسائی خاص)

یہ گولیاں عورتوں کی جملہ پوشیدہ شکایتوں کو دور کرنے میں اکسیر ہیں۔ سیلان ماہواری کی بے قاعدگی اور اسی قسم کی دوسری زنانہ شکایتوں سے پیدا شدہ جملہ نقائص کو دور کرنے میں اکسیر ہیں۔ استقرار حمل کو مدد دیتی ہیں۔ گویا عورتوں کیلئے ایک جنرل ٹانک ہے
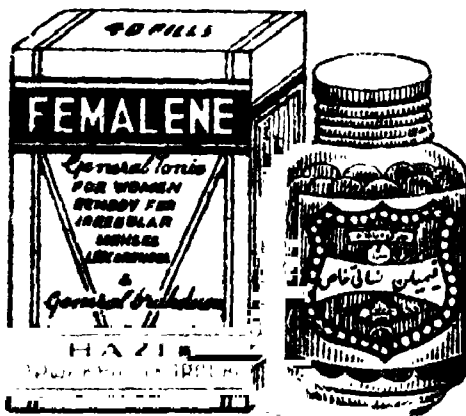
اس کا متواتر استعمال عورتوں کے نظام عصبی کو درست کرتا ہے

جن عورتوں کو اسقاط حمل کی بار بار شکایت ہوتی ہو اس کے لئے بیحد مفید ہے۔ قیمت فی شیشی دو روپے بارہ آنے

تیار کردہ —

حاذق دواخانہ بندر روڈ، کراچی نمبر ۱

محمد یعقوب طاہر

(جماعت اسلامی پاکستان کے سالانہ اجتماع کے موقع پر کراچی
جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ تاثرات قیام کراچی ہی کا نتیجہ ہیں)

اس بڑے شہر میں "تہذیب" کے گہوارے میں
جہاں قانون بھی ہے، مجلس قانون بھی ہے!
ہاں اسی شہر میں، اس مرکز آئینی میں!
جہاں آزادیوں پر وعظ بھی، شبخون بھی ہے!

چاہیئے تھا، یہاں مینار وہ ہوتا تعمیر!
جس سے گھر گھر پہ ضیاباری قرآں ہوتی!
امن اور چین سے ہر شخص کو ملتا بہرہ
حکم انساں پہ نہ خم گردن انساں ہوتی!

اٹھ رہے ہیں مگر اس شہر سے طوفاں ایسے
جن سے اسلام کا ہر نقش مٹا جاتا ہے!
آدمیت کی تباہی ہے، خدا خیر کرے
اور احساس بھی پھر اس کا اٹھا جاتا ہے!

بندگی کا جہاں ملنا تھا سبق، آج وہاں
میں نے بندوں کو خداوند بنے دیکھا ہے
احترام آدم خاکی کا جہاں ہونا تھا
میں نے واں اس کو سواری[1] میں جتے دیکھا ہے

کس کا دل گردہ ہے، روندے ہوئے انساں دیکھے
کون ہے، جس کا جگر چاک نہ ہو نالوں سے
تجھ سے ممکن ہے اگر اس پہ تو کر صبر ندیم
میں نمٹنے کو چلا ہوں ترے "جنجالوں" سے

[1] رکشا کھینچتے ہوئے!

ٖفیان آفاقی •

ایک بے پایاں خلاء

اس نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں اور غور سے اپنے گرد و پیش ین دوڑائیں مگر اسے یہ دیکھکر بے حد تعجب ہوا کہ کمرہ جوں کا توں تھا آج پہلے جس بگڑے ہوئے حلیہ میں کمرہ رہا کرتا تھا وہ بالکل ہی تبدیل نہ ہوا تھا کپڑے اسی طرح لٹک رہے تھے۔ کچھ فرش پر پڑے تھے میز اسی نے میں لگی تھی۔ اور تو اور آزادی کے روز کتابیں بھی حسب معمول یت بے ترتیبی سے تمام کمرے میں بکھری پڑی تھیں۔ اور کمرہ اچھا خاصا ڑ خانہ معلوم ہو رہا تھا۔ کرسی پر .... کوٹ اور کوٹ پر ایک جوتا بدستور تیاط سے رکھا ہوا تھا۔ آزادی سے یہ بھی نہ ہوا تھا کہ جوتے ہی کو کوٹ سے ہٹا کر نیچے رکھ دیتی۔ کوڑا کرکٹ اسی طرح پھیلا ہوا تھا۔ جوتوں کی اری میں دو ٹوپیاں۔ ایک کتاب اور آئینہ پڑا منہ چڑا رہا تھا۔ کل ے بچے نے دو کتابیں نالی میں ٹھونس دی تھیں۔ وہ آج بھی ٹھنسی ہوئی یں۔ چھت میں جالے لٹک رہے تھے اور دیوار پر حسب سابق، یونٹیوں کی فوج رینگ رہی تھی۔

اس نے گھبرا کر آنکھیں موند لیں اور پھر جو کھولیں تو اسے کانوں میں می جان کے خفا ہونے کی سامعہ نواز آواز صاف سنائی دینے لگی۔ امی جان ب عادت اسے گالیاں اور کوسنے دے رہی تھیں کہ —— دس بجنے کو آئے مگر لاٹ صاحب انٹیم کھاتے پڑے ہیں!

"لاحول ولاقوۃ! اس نے سوچا اگر ۱۵ اگست کو بھی دس بجے تک دیر تک سونے کی لاگ ڈانٹ بدستور رہی تو پھر بات ہی کیا بنی —— ایسی آزادی بھی کس کام کی کہ انسان آنکھ کھولتے ہی ٹکسالی گالیوں سے بہرہ اندوز ہو —— ؟ مجھے آزادی کے آثار بھی نظر نہیں آتے۔

ابھی وہ اسی طرح سوچ رہا تھا کہ بادل گڑگڑاتے اور ایک دھماکہ کیساتھ کمرہ کا دروازہ کھل گیا۔ —— امی جان آندھی کی طرح کمرے میں در آئیں۔ اس نے غور سے امی کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل ویسی ہی تھیں جیسے کل تھیں۔ رتی برابر بھی تو تبدیلی نہیں ہوئی تھی ان میں —— وہی چڑھی ہوئی تیوری، اور پھڑکتے ہوئے ہونٹ، ہونٹوں پر قصیدے، اور قصیدوں کیساتھ ساتھ کوسنے اور گالیاں!

اس نے دوبارہ آنکھیں پھاڑ کر غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ لباس بھی وہی ہے جو کل پہنے ہوئے تھیں۔ اور تو اور ان کے الفاظ تک میں تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ وہی مخصوص گالیاں اور مقررہ کوسنے۔ آتے ہی لحاف کھینچکر پرے پھینکا اور تڑاخ کر بولیں —— منحوس! ابھی تک منہ تھتائے پڑا ہے۔ نہ اللہ کا نام نہ رسول کا کلمہ۔ موا قیم کا نشہ ہو کہ کوڑا اس نے کا نام نہیں لینا —— الٰہی اجڑے یہ ناشادینا اور آگ لگے اس منتام میں —— اٹھیے حضور! دس بجنے کو آئے ناشتہ زہر مار کیجے ٹھنڈا ٹی ہو رہا ہے!

سبحان اللہ! آزادی کی صبح کو کیا زریں الفاظ سے یاد فرمایا ہے ابھی وہ اس مسئلے پر غور ہی کر رہا تھا کہ امی نے جھلا کر لتے کان پکڑ کر اٹھا دیا اور سر پر ایک زوردار چپت جما کر عدم تشدد کو خیرباد کہہ دیا۔

" الٰہی خیر! امی پر تو آزادی نے خاک بھی اثر نہیں کیا۔

وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی دروازے کی طرف چلیں اور وہ حیران بیٹھا انہیں تکتا رہا۔ دروازے پر پہنچکر انہوں نے مڑ کر دیکھا اور اسے اونگھتے دیکھکر پھر ایک نعرہ مار کر واپس لوٹیں۔ وہ ابھی اس حرکت پر غور بھی کرنے نہیں پایا تھا کہ وہ اس کے سر پر جا دھمکیں اور کان پکڑ کر اسے کمرے سے باہر گھسیٹ لائیں بالکل اسی طرح جس طرح آزادی سے پہلے کیا کرتی تھیں۔

کمرے سے باہر نکل کر اس نے دیکھا تو سب کچھ بدستور تھا غسلخانہ میں گیا تو نل بھی اسی طرح تھا اور اس میں سے اسی طرح پانی نہ بہہ رہا تھا اس نے لوٹے کی طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ آپ ہی آپ پانی سے

بھر جائے گا۔ مگر کچھ انتظار کے باوجود ایسا نہیں ہوا۔ پھر جب وہ کھانے کے کمرے میں پہنچا تو بھی اس نے آزادی کا کچھ نام و نشان نہ پایا۔ وہی میز، وہی میلا سا کمرہ، ناشتے پر مکھیاں بدستور بھنکتی ہوئی، ناشتے پر ایک سوکھا ہوا توس دیکھکر اس سے ضبط نہ ہو سکا، وہ چلا پڑا "میں نہیں کھاؤں گا ———— یہ کیا تُک ہے!"

اس کی آواز سن کر امی کمرے میں آ گئیں اور بیزاری سے جھلا کر بولیں۔

"اب کیا مصیبت نازل ہو گئی؟ کیا چائے ٹھنڈی ہے ——؟ چائے تو ٹھنڈی ہوتی ہی، اس میں تھوڑا سا میٹھا بھی تو پڑا ہی لگا ہے کہ بارہ بجے تک گرم رہے!"

وہ بسورنے لگا اور بولا "امی یہ کیا ناشتہ دیا ہے آپ نے؟" امی کچھ نہ سمجھ سکیں اور حیرت سے بولیں۔ "اوئی لڑکے کچھ دیوانہ تو نہیں ہوا ہے؟ جو ناشتہ روز ہوتا ہے وہ ہی آج بھی ہے۔"

"آج تو آپ کو پتہ نہیں آزادی کا دن ہے، پاکستان بن گیا ہے آج!"

"پھر — پھر ہم کیا کریں بن گیا ہے تو ——— پاکستان سے اور ناشتے سے کیا تعلق؟"

وہ جھلا کر خاموش ہو گیا۔ اب ان سے کون بحث کرے؟ اس نے بے دلی سے ناشتہ کیا۔ امی ایک کرسی پر چھالیہ اور سروتہ لے بیٹھیں اور کتر کتر کر، پان چبا چبا کر، خانگی سیاست پر تبصرہ فرمانے لگیں۔ بالکل اسی طرح جیسے روز ہوا کرتا تھا جب اس نے چائے بنائی تو یہ دیکھکر بہت متعجب ہوا کہ چائے بالکل ٹھنڈی تھی۔ کہنے لگا ——— "امی چائے تو بالکل ٹھنڈی مٹی پڑی ہے!"

اس پر امی نے ایسی غضبناک نگاہوں سے دیکھا کہ وہ سہم کر رہ گیا گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں شرم دلا رہی ہیں اسے بے حد تعجب ہوا حیرت ہوئی۔ اچنبھا ہوا، آج یوم آزادی ہے اور آج بھی چائے برف ہو گئی یہ بھی نہیں کہ آج کے دن ہی گرم رہتی۔ آخر آزادی سے فائدہ کیا ہوا؟ وہ سوچنے لگا ——— امی کا مزاج بالکل نہ بدلا۔ کمرے کو کسی نے صاف نہیں کیا۔ ناشتہ میں وہی ایک سوکھا توس اور ٹھنڈی برف چائے ملی۔ صبح اُٹھتے ہی بے نقط باتیاں سننے کو ملیں۔ مکھیاں اسی طرح چائے میں گرتی رہیں۔

وہ ناشتہ کر کے نکلا تو ننھا ٹامی اس پر بھونکنے لگا۔ اس نے بہت غور سے اسے دیکھا۔ آج بھی تو اس کمبخت کو بھونکنا سوجھ رہا ہے اگر آج کے دن کم از کم کچھ موسیقی میں بھی آواز شامل کر لیتا تو کیا غضب ہو جاتا اتنے میں کسی کمرے سے گلشن کی "میاؤں" سنائی دی اور ٹامی صاحب لپکے اس طرف ——— اس کا دل دھک سے ہو گیا توبہ ہے آج کے دن بھی!

وہ سوچتا سوچتا اوپر چھت پر جا پہنچا۔ وہاں سے چاروں طرف نظر دوڑائی تو اس کے تعجب میں اور اضافہ ہوا۔ سب مکان جوں کے توں تھے جو ٹوٹ رہے تھے وہ جھکے ہوئے تھے۔ جو نئے بنے تھے وہ اسی طرح جگمگا رہے تھے۔ مکانوں پر اسی طرح کپڑے لٹک رہے تھے۔ کہیں کہیں کوئی بچہ بھی نظر آجاتا تھا۔ مگر آزادی سے بے خبر۔ انسپکٹر صاحب کے مکان پر ان کی دو صاحبزادیاں کشتی لڑ رہی تھیں۔ اسے دیکھکر انہوں نے حسب عادت منہ چڑایا اور اندر کی طرف بھاگ گئیں۔ پھر اس نے آسمان کو دیکھا تو ہر روز کی طرح نیلا تھا۔ اور اس پر کہیں کہیں سفید سفید بادل تیرتے پھر رہے تھے۔ دور! خان بہادر کی کوٹھی کے قریب وہ اسی طرح زمین کو چھوتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ اسی وقت ایک کوا اس کے کان پر سے چلاتا ہوا گذرا اور وہ چونک پڑا ——— آج کے دن بھی کوا ——— اور کمبخت بالکل سیاہ ——— نہ سفید، نہ سرخ، نہ زعفرانی یہ کیا طلسم ہے!

اچانک ایک چھوٹا سا آلو اسکے سر سے آکر ٹکرایا۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا تو سامنے والے مکان کی چھت پہ ہمسائے کا بچہ کھڑا تھا۔ وہ ہر روز اسی طرح کھڑا ہوتا تھا۔ ہنستا تھا، مسکراتا تھا، باتیں کرتا تھا مگر اسے یہ سوچ کر کچھ اطمینان ہوا کہ پہلے وہ کچھ مارتا نہیں تھا لیکن آج اس نے ایک آلو تو مارا ابھی وہ اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ چلایا "اودبلاؤ" اور بھاگ گیا۔

ہائیں! وہ سکتے میں رہ گیا۔ یہ تو کچھ بات نہیں بنی۔ ہر روز ہی تو وہ اودبلاؤ کہکر چلاتا ہے۔ اس نے سوچا کاش یہ آج مجھے اُ

یا آوبخار اکہہ کر پکارتا یا کم از کم اونٹ ہی کہہ دیتا اور بلاتے سے چلتا بھی ہے ——— وہ چند قدم آگے بڑھ کر ملک صاحب کے قریب چلا گیا۔ یہ ملک صاحب اس کے بے حد رفیق و ہمدرد تھے جب انہوں نے اپنے والد کی وراثت کے لئے اپنے بڑے بھائی پر ..ی کیا تھا۔ تو اسے بھی گواہ بنایا تھا۔ پھر اس نے ان کی امداد بھی کیسی کی۔ ابا جان سے کہہ کر ایک بڑے وکیل کو مقدمہ کی پیروی کے لئے کرایا تھا ——— اوہ! وہ وکیل صاحب بھی تو کتنے بڑے تھے اگر اس کے ابا جان کے دوست نہ ہوتے۔ تو ہزاروں روپے سے کم بات نہ کرتے ہی دیتے ہوتے بھی بڑا لطف آیا تھا۔ وہ اس کا تصور کر کے آپ ہی آپ ہنسا۔ ملک صاحب کے بھائی کی طرف سے ایک گواہ پیش ہوا تھا جب وہ گواہی دینے کے لئے کھڑا ہوا تو بولا۔

"جناب عالی! چند دن ہوئے کہ میں صبح کی چائے پی کر بیٹھا تھا۔ میں نے نتھے کی والدہ سے فرمائش کی کہ چند پراٹھے ہی پک جائیں نتھے کی والدہ بولی کہ آج گھی ختم ہو گیا ہے اس پر خادم غصہ میں بھر گیا جناب عالی یقین کریں کہ آٹھ روز قبل ہی بندہ نے چار سیر گھی لاکر ...... !"

"غیر متعلق باتیں نہ کرو"! جج صاحب نے فرمایا

"جی تو بندہ پرور! جب میں گھی لینے نکلا ———"

"قصہ مختصر کرو!"

"بندہ پرور، تو قصہ مختصر یہ کہ دروازے پر میری ملاقات ملک صاحب کے بڑے بھائی سے ہوئی! ———"

"بیکار باتیں نہ کرو! اصل واقعہ بیان کرو!"

"جی عالی جناب! تو انھوں نے فرمایا کہ تم میری طرف سے گواہی دینا میں نے عرض کی پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا مگر اب آپ نے کہا تو بندہ حاضر ہے!"

جج صاحب کڑک کر بولے "اصل بات بتاؤ تم کیا کہنا چاہتے ہو"

"کچھ نہیں عالی جاہ!"

"ہیں! تم گواہی نہیں دوگے ———؟"

"دے چکا بندہ پرور!"

——— یکایک ملک صاحب کی گرج دار آواز سے وہ چونک پڑا ——— "میاں دیکھ کر نہیں چلتے ہو، ادھر پردہ دار مکان ہے۔" وہ شرمندہ ہو گیا ——— مگر پہلے بھی تو وہ ادھر آجاتا تھا ——— شرمندگی دور کرنے کیلئے وہ مریل سی آواز میں بولا۔ "ملک صاحب! آپ کے مقدمے کا کیا ہوا ———؟"

"ہوتا کیا"! ملک صاحب کمرہ میں جاتے ہوئے سرد مہری سے بولے "ہمارا حق تھا ہمیں مل گیا!"

وہ مایوس ہو کر نیچے اتر آیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کی امی جان جوتی ہاتھ میں لئے طامی کے پیچھے دوڑ رہی ہیں۔ یہ بھی حسب معمول تھا۔ آج تو طامی کو اتی کے پیچھے دوڑنا چاہیئے تھا۔ وہ یہ سوچتا ہوا امی کے پاس جا پہنچا اور بولا

"امی یہ کیا بات ہے ——— آج تو سب کچھ ویسا ہی ہے، جیسا کل تھا ——— جیسا ہر روز ہوتا ہے ——— یہ تو کوئی کمال کی بات نہیں ہوئی!"

امی نے جوتی زمین پر ڈال کر پیر میں پہن لی اور جل کر بولیں۔

"کمال تو نگوڑا کیا ہوتا؟ اور گیارہ بجے سو کر اٹھا کر بیٹا ——— بلکہ کل تو ایک بجے اٹھنا ——— تب کمال ہوگا ——— دن میں تارے نظر آئیں گے"

اور وہ سوچنے لگا کہ بات نہیں بنی ——— امی کچھ خاک بھی تو نہیں سمجھیں!

(یثرب)

برنمین ——— دماغی

دماغ کو روشن اور شگفتہ کرتی ہے
قوت حافظہ کو تقویت پہنچاتی ہے
مفرح اور مقوی قلب ہے
بڑھاپے میں صحت کا سہارا ہے
قیمت بیس یوم کیلئے، چار اونس دوا، چار روپے

حاذق دواخانہ۔ بندر روڈ۔ کراچی

اختر انصاری اکبرآبادی

تصویر کے دو رُخ

وہ شوخ و شنگ وہ "روحِ" شریر و برقِ نظر
چمک دمک سے مرے راستے میں آئی تھی

وسیع تیرہ فضاؤں میں صاعقے کی طرح
غم و الم کے دھندلکوں میں چھائی تھی

وہ سیم و زر کے بزیرے کی نو شگفتہ کلی
ادائے سادہ مزاجی پہ مسکرائی تھی

قدم سے رہگذرِ کہکشاں کچلتی ہوئی
وہ آسماں سے زمیں پر اُتر کے آئی تھی

سبک جواہر و زرتار پیرہن کی دمک
نگاہِ شوق میں بجلی سی جھلسلائی تھی

ہر اک ادا میں تصنّع کی شان تھی لیکن
ہر اک ادا میں قیامت کی دلربائی تھی

اسے غرور بھی پندارِ نازِ حُسن بھی تھا!
بہ ایں ہمہ مرے ذہن و نظر پہ چھائی تھی

نہ جانے اس کے شبستاں کا رنگ کیا ہوگا
وہ میرے سامنے تصویرِ پارسائی تھی

نہ جانے اس کی جوانی کا رُخ کدھر ہوگا
مرے قریب وہ معصوم بن کے آئی تھی

مرے قریب وہ آتی رہی ، وہ آتی رہی
قریب آ کے کئی بار ڈگمگائی تھی
خدا گواہ کہ میں ڈگمگا گیا ہوتا
مرا شباب مجھی کو مٹا گیا ہوتا

(۲)

وہ مرے سامنے آ تو گئی سمٹتی ہوئی — مگر لباس کے پیوند بھی چھپا نہ سکی
جبینِ سُرخ پہ قطرے عرق کے لرزاں تھے — مرے خفیف تبسّم کی تاب لا نہ سکی
تھی احتیاط دوپٹے کی سادگی سے عیاں — وہ اپنی زلفِ پریشاں مجھے دکھا نہ سکی
ملی نہ تھی تو اُٹھائی تھی بار بار نظر — نظر ملا کے جھکائی تو پھر اُٹھا نہ سکی
حیا کے رنگ میں ڈوبے ہوئے حسین رُخسار — جنہیں وہ غازۂ گلگوں سے جگمگا نہ سکی
لبوں پہ لرزشِ جنبشِ نظر تو آتی تھی — مگر یہ ضبط کا عالم کہ مسکرا نہ سکی
سنائے لاکھ فسانے شباب نے اس کے — خود ایک حرف زباں پر مگر وہ لا نہ سکی
ادائے خاص سے کیوپڈ نے تیر برسائے — مجھے تباہ کیا خود وہ تلملا نہ سکی
میرے خیال کو جنّت بنا دیا اس نے — میرے خیال کی جنّت میں خود سما نہ سکی
مجھے مذاقِ تمنّا تو دے گئی ظالم — مگر مذاقِ تمنّا کو آزما نہ سکی

قریب آ کے بھی دامن بچا گئی "سلمیٰ"
چراغ دُور سے مجھ کو دکھا گئی "سلمیٰ"

(۳)

حریمِ حُسن میں "روحی" بلا رہی ہے مجھے
میرے شباب سے کھیلو میرے قریب آؤ

میری جوان نگاہوں کی مستیاں لوٹو!
نظر نظر سے ملاؤ مرے قریب آؤ

بہک رہے ہو کہاں کارزارِ ہستی میں
شراب پی کے تو دیکھو مرے قریب آؤ

مہک رہے ہیں ابھی پھول میرے ہاروں کے
مرا اشارہ سمجھ لو مرے قریب آؤ

تمھارے نام پہ دولت نثار کردوں گی!
جواہرات لٹاؤ مرے قریب آؤ

میرے ربابِ محبت کے تار ٹوٹ نہ جائیں
بس اک ترانہ سنا دو مرے قریب آؤ

پیامِ عیش و طرب دے رہی ہو کیا ظالم!
فریبِ عیش و طرب میں نہ آؤ نگا ظالم!

(۴)

زہے نصیب "سلمٰی" نے خط میں لکھا ہے
ہوس کی رو میں اگر بہہ رہے ہو بہہ جاؤ
کمر سے تیغ سجاؤں گی مسکراؤں گی
مجاہدین چلے کارزار کی جانب
جو زندگی کیلئے مر رہے ہو مر جاؤ

تمہارے پاس مجاہد بنو تو آجاؤ
اگر شرابِ محبت پیو تو آجاؤ
تمہارے ساتھ چلونگی چلو تو آجاؤ
مری صلاح پہ آمادہ ہو تو آجاؤ
جو بعد مرگ بھی زندہ رہو تو آجاؤ

تجھی کو صرف تجھی کو بلاؤں گا سلمٰی
قریب تر آ مرے دل کے قریب آ سلمٰی

ذوقی •

کپاس کے کھیت میں

خزاں اس سال موسلادھار بارشوں کے ساتھ کچھ قبل از وقت ہی دھمکی۔ سڑکیں دلدل بنی ہوئی تھیں بارش کا پانی گھروں اور جھونپڑوں میں گھس رہا تھا اور زمین کا چہرہ زرد پتوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

مناظر اپنا فطری حسن و جمال کھو چکے تھے۔ فصل کٹ کر محفوظ ہو چکی تھی اور کھیتوں میں اگر کچھ باقی تھا تو وہ کپاس کے پتوں سے خالی پودے تھے ——— جو ہماری اس داستانِ غم میں ایک اہم حصہ ادا کرنے والے ہیں۔

پو پھٹ رہی تھی۔ موسم خراب تھا اور آسمان کالے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا بستی کا ہر متنفس ابھی سو رہا تھا بس کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آواز ضرور تک سنائی دیتی تھی سوائے اس کے اور ہر لحاظ سے بستی قبرستان کی طرح خاموش تھی!

لیکن اچانک، دو گھوڑ سوار قصبے کی جانب نمودار ہوئے وہ ایک قہوہ خانے کے سامنے آکر رکے۔ یہاں پہنچکر وہ ایک دم گھوڑوں پر سے اتر پڑے اور دروازے پر پہنچے لیکن دروازہ بند تھا صرف ایک درز میں ایک دھندلی سی روشنی دکھائی دیتی تھی جس کے ذریعے جھانک کر ان دونوں سواروں نے اندازہ کیا کہ اندر کوئی ہے جو جاگ رہا ہے۔

"کھولو دروازہ" ان میں سے ایک ——— ڈاڑھی والے روسی چابک سے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے چلایا۔ دروازہ تشویش آمیز انداز سے کھولا گیا اور روسی اور اس کا ساتھی بڑے تحکم سے داخل ہوئے۔ کمرے میں ان کا سامنا ایک معمر آدمی سے ہوا جو بہت تشویش زدہ ہو رہا تھا ——— یہ جکشی بے تھا قہوہ خانے کا ایڈمنسٹریٹر!

نو واردوں میں ایک تو کپاس کے مرکز ذخیرہ کا کارپرداز تھا جو والکوف کے نام سے موسوم تھا، اور دوسرا جس کا نام بارلی ژلیف تھا ضلع کی کالخوز آرگنائزیشن کا لیڈر تھا ——— لیکن آج وہ روسی افسر کی ترجمانی کی ڈیوٹی پر مامور تھا کہ اس کے "ارشادات" کو مقامی زبان میں واضح کرے۔ الکحل کی بدبو کے بھبکے ان کے مونہوں سے بری طرح نکل رہے تھے اور تھوڑی دیر میں کمرے کی ساری فضا اس سے متاثر ہو گئی۔

والکوف نے جس کا بشرہ بہت وحشیانہ ہو رہا تھا، بھیڑ کی کھال کی پوستین کے بند کھولتے ہوئے جکشی بے اس انداز کو گھورا کہ وہ کسی دلیر سے دلیر آدمی کو دھمکانے کیلئے کافی تھا۔ اپنا ہنٹر گھماتے ہوئے وہ چلایا "کالخوز کے صدر کو فوراً حاضر کرو" جکشی بے مطلوبہ آدمی کو لانے کے لئے جھپاکے سے نکل گیا اور اس کے جاتے ہی والکوف قہوہ خانے کے "کنج سرخ" کی طرف چلا تاکہ کتابوں، اخبارات اور رسائل کے انبار کا جائزہ لے جو وہاں جمع کئے گئے تھے۔ لیکن اس انبار کا منظر اس کے لئے دلکشا ثابت نہ ہوا۔ بخلاف اس کے چڑچڑے پن کے ساتھ اس نے اپنی نوٹ بک میں کچھ ریمارک ثبت کئے جو ظاہر ہے کہ اس کنج خاص کی نگرانی کے ذمہ داروں کے حق میں وجہ خیر نہ ہو سکتے تھے۔ اسٹالن اور لینن کی سوانح عمریوں اور کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ پر جتنی بھی قیمتی کتابیں اور پمفلٹ پڑے تھے وہ سب کے سب گرد آلود تھے اور اکثر کے جڑے ہوئے اوراق پھاڑے تک نہ گئے تھے۔ اور یہ کتنی خطرناک صورت کہ کمیونسٹ اکابر کی جو تصاویر دیواروں پر آویزاں تھیں ان پر مکھیاں بیٹھی تھیں اور مکڑیوں نے جالے تن رکھے تھے۔

کچھ دیر بعد جکشی بے مقامی کالخوز کے پریزیڈنٹ صاحب

ـــــــــــ ناصر کارواں ــــــــ کو ہمراہ لئے کمرے میں واپس آداخل ہوا۔

ناصر کارواں والکوف کی طرف توجہ کئے بغیر جواب تک "گنج سرخ" میں کھڑا تھا، پارٹی زلیف کی طرف مڑا اور اس سے پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟

ناصر کارواں اس قسم کے یاوہ فرمانے والوں کا خوگر تھا ہی، اس وجہ سے وہ کوئی زیادہ پریشانی محسوس نہیں کرتا تھا۔ بات یہ تھی کہ ضلع تاشقند کے موضع طوسل کی کالخوز کا یہ "سردار" کپاس کے منصوبے کو پورا کرنے میں ناکام ثابت ہو رہا تھا۔ کالخوز کے اوپر یہ لازم تھا کہ وہ ہر چھ ماہی پر چوبیس ہنڈرویٹ کپاس مرکز ذخیرہ کے حوالے کرے۔ لیکن وہ اب تک کل سولہ ہنڈرویٹ کی مقدار دے سکا تھا۔ اندریں صورت قریب قریب ہر روز تقسیے اور ضلع سے کمیشن آتے تھے۔ اور ان کا خطاب بالعموم یکساں ہوتا تھا۔

"تم نے منصوبے کی تکمیل کیوں نہیں کی؟"

"اس صورتِ حالات کا ذمہ دار کون ہے؟"

"بڑی بدنیتی سے یہ سبوتاژ ہو رہا ہے"

"منصوبہ لازماً پورا ہونا چاہیئے ـــــ یوں یا دوں"

پارٹی زلیف نے ناصر کارواں کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ والکوف گنج سے مڑا اور اس نے حکم دیا کہ تمام کے تمام لوگوں کو کھیتوں میں نکال کر لاؤ۔ کوئی شخص گھر پر نہ رہنے پائے۔ ہم دو گھنٹے کے اندر اندر یہاں واپس آتے ہیں اور اگر میرے حکم کی تعمیل نہ کی گئی تو سمجھ لو کہ نتائج خراب ہونگے۔

پارٹی زلیف نے والکوف کے الفاظ کی ترجمانی کی اور پھر دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کر چل دیئے۔ ناصر کارواں کی نگاہیں ان کا تعاقب کرتی رہ گئیں۔

"گھوڑے کی پیٹھ پر سے حکم تو ہر کوئی دے لیتا ہے"۔ اس نے کہا "لیکن تم لوگ خود کیوں نہیں جاتے، خود جا کر مزہ چکھو تب نہ"

جکشی بے نے ناصر کارواں کو غضبناک ہوتے دیکھکر اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور کہا۔

"بیٹا: گرم نہ ہو، اس سے کیا حاصل؟"

ناصر کارواں نے جواب دیا "اگر ہم کم از کم اپنے جذبات کا اظہار کرنے ہی کا حق رکھتے تو یقیناً میں نے اس بھلے مانس کو وہ جواب دیا ہوتا کہ یاد رکھتا۔ لیکن بدقسمتی کہ ہم آزاد نہیں ہیں ـــــ!"

چنانچہ اس نے جکشی بے کو کہا کہ لوگوں کو اکٹھا کرے۔ جکشی بے نے سب کو اطلاع کی اور جھٹاپٹ مرد عورتیں سب گھروں اور جھونپڑوں سے نکل کر کھیتوں کی طرف چل دیئے۔ ان میں سے بعض حکم کی حدود سے مستثنیٰ تھے، بعض اتنے بوڑھے تھے کہ کام کرنے سے معذور تھے اور بہت سے بچے تھے ـــــ اور بالعموم سب کے سب چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کا یہ نظارہ بڑا ہی المناک تھا۔ بھوک ہر آنکھ کے اندر سے جھانک رہی تھی، یہ تمام قلت غذا سے متاثر تھے۔ لیکن ہر حال میں ان کے لئے کام کرنا ناگزیر تھا۔ ورنہ ان کو روٹی کے آخری نوالے سے محروم ہونا پڑتا ـــــ وہ چاہے معذور ہوں بیمار ہوں یا ضعیف ہوں، روٹی اسی صورت میں پا سکتے تھے جب کہ وہ کام کریں۔

دوسرے لوگوں کے ساتھ قربان بے بھی جو کالخوز کا گاڑی بان تھا ـــــ گھر سے نکلا اور اپنی گاڑی تیار کرنے لگا۔

وہ ہر ہفتے کی جمع کردہ کپاس کو پاس کے گاؤں میں ذخیرے کے مرکز تک پہنچانے پر مامور تھا۔

یکایک یہ شخص کیا دیکھتا ہے کہ اس کی بیوی کھیتوں کو جانے کے لئے تیار ہو گئی ہے ـــــ ـــــ جس کا حال یہ تھا کہ وہ ولادت کی بالکل منتظر تھی!

قربان بے نے اس سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ تم آرام سے گھر پر رہو۔ تمہارے لئے ہی
ا سب ہے۔"

مگر اس کی بیوی کیلا جان نے کہا "نہیں میں اسے ٹھیک
یں سمجھتی، تم خود جانتے ہو کہ یہ روسی کتنا ظالم ہے، اگر وہ واپس
ے اور مجھے گھر پر دیکھ لے تو مجھے اندیشہ ہے کہ نہایت وحشیانہ
ریقے سے سزا دے گا۔"

قربان بے کو بھی یہ ڈر تھا، چنانچہ اس نے مزید کچھ نہ کہا صرف
تاکید کی کہ "کیلا جان ذرا احتیاط کرنا اور وہاں زیادہ دیر تک نہ
ٹھیرنا کیونکہ کھیتوں میں نمی بہت زیادہ ہے۔" سو وہ اپنی گاڑی
لے کر چلا گیا اور اس کی بیوی کپاس کے کھیتوں کی طرف روانہ ہوگئی
ہاں جاکر وہ دوسروں میں شامل ہوگئی۔ جھک کر چنائی کا کام کرنا
س کے لئے بہت ہی مضر ثابت ہوا۔ لیکن اس نے دوسروں کے
ساتھ برابر رہنے کے لئے اپنی پوری قوت صرف کی۔ اس کے ساتھ
س کی ساس رضوان بھی تھی اور یہ بڑی بی کام کرتے ہوئے جوان
دلہن کی نگرانی بڑی تشویش سے کررہی تھی۔ ہر لمحہ اسے ڈر تھا کہ
کچھ ہو جائے گا۔

ایک گھنٹہ گزر گیا۔ کیلا جان پودوں کی ایک کیاری کا کام
ختم کرکے دوسری کیاری پر جا لگی۔ رضوان اس کے ساتھ ساتھ لگی
ہوئی تھی۔ تاکہ اگر فوری طور پر ضرورت پڑے تو وہ اس کی مدد کر سکے
دونوں عورتیں اپنی کیاری کا پہلا نصف حصہ پورا کرچکی تھیں کہ کیلا جان
کی حالت دگرگوں ہونے لگی لیکن اپنی آخری قوت کے ذریعہ اس نے
اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی تاکہ کوئی اور یہ جان سکے کہ
صورت حالات کیا ہیں۔

اس کے اندر درد اور شرم کے درمیان کشمکش ہوتی رہی
یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو سیدھا کھڑا رکھنے قابل نہ رہی اور
مجبور ہوگئی کہ زمین پر گر پڑے۔ اسے معجزہ کہہ لیجئے کہ ادھر وہ گری
اور ادھر کپاس کے پودے اس کے اوپر پردہ پوش بن کر جھک
گئے تاکہ اسے متجسس نگاہوں سے بچا لیں۔ بڑی بی ایک دم کیلا جان
کے پہلو میں تھی۔ اس نے خود اپنا فرغل اتارا اور اسے نوجوان دلہن
کے نیچے بچھا دیا۔

"اچھی ماں! کوئی میرا حال دیکھنے نہ پائے!" کیلا جان نے
لجاجت سے کہا۔

"تم فکر نہ کرو" بڑی بی نے اسے تسلی دلاتے ہوئے
جواب دیا۔

کیلا جان کے دردوں کا دورہ لحظہ لحظہ زور پکڑ رہا تھا۔ رضوان
نے جسے اندازہ تھا کہ صورت حالات کیسی خطرناک ہے۔ چلتے کام
میں مداخلت کرتے ہوئے دو اور عورتوں کو اپنی عورتوں کے لئے
طلب کیا۔ رضوان نے ان کو کچھ ہدایات دیں اور خود کالخوز کے
کارپردازوں کی طرف دوڑی لیکن اسے کوئی نہ ملا اور نہ کوئی ڈاکٹر
دستیاب ہوا، نہ کوئی قابلہ۔ موضع طوسل کے لئے قریب ترین ڈاکٹر
چار میل کی دوری پر مل سکتا تھا، اس کے علاوہ قریب ترین شفاخانہ
زچگی ضلع کے صدر مقام پر تھا۔

بی رضوان بدحواسی کے عالم میں واپس آئی۔ جہاں غریب
کیلا جان کے گرد بہت سی عورتوں نے ہجوم کر رکھا تھا و ہمدردی
کے کلمات سے اس کی ہمت بندھا رہی تھی۔ لیکن افسوس کہ
ان میں سے کوئی بھی اسے مطلوبہ مدد پہنچانے کی اہل نہ تھی۔

رضوان کے آنے کے فوراً ہی بعد دونوں انسپکٹر بھی
چنائی کی دیکھ بھال کے لئے آ پہنچے۔ دالکوف کی نگاہ جب عورتوں
کے جھرمٹ پر پڑی تو وہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر موقع پر پہنچا۔

"یہ کیسی مجلس ہے" وہ چلایا ــــــ درآنحالیکہ اس کے
منہ سے الکوحل کی بواب بھی ابل پڑ رہی تھی۔

"جاؤ یہاں سے، یہاں مردوں کا کوئی کام نہیں" بی
رضوان نے جواب دیا۔

"معاملہ کیا ہے" کہتے ہوئے پارپی ژنیف بھی اب اس
مکالمہ میں شریک ہوگیا۔

بغیر کوئی لفظ کہے رضوان نے اسے دکھایا کہ یہاں کیا
قصہ درپیش ہے اور پارپی ژنیف نے دالکوف کو آگاہ کیا
اس بھلے مانس نے بڑے جابرانہ طریق سے کہا "اس وقت حکومت

کو بچوں کی ضرورت نہیں، اسے کپاس چاہیئے! جاؤ تم سب اپنے کام میں لگ جاؤ، یہاں زیادہ سے زیادہ ایک عورت رہ سکتی ہے۔

عورتیں ہٹ گئیں اور صرف رضوان کمیلا جان کے پاس رہ گئی۔ اور جب دونوں گھوڑ سوار پرے ہٹ گئے تو وہ جھکی اور اس نے قربان بے کی بیوی کے ماتھے پر سے پسینے کے قطروں کو صاف کیا۔ اس نے دل ہی میں کہا کہ یقیناً والکوف جیسا بڑا آدمی ایک مصیبت زدہ عورت کے لئے بہت کچھ کر سکتا ہے، لیکن وہ کوئی مدد کرے گا نہیں۔ اسے پسند ہی یہی ہے کہ ہمارے لوگ مر جائیں۔ وہ کہتا ہوگا کہ انھیں مرنے دو۔ بوڑھوں کو بھی بچوں کو بھی اور ان کو بھی جو ابھی پیدا نہیں ہوئے اور جتنا جلد یہ ہو اتنا ہی اچھا ہے۔

کمیلا جان کے دردوں کی لہر اپنے پورے زور میں تھی اس نے کپاس کے پودوں کو مٹھیوں میں بھینچ رکھا تھا اور وہ خدا سے رحم کی دعائیں کر رہی تھی۔ یکایک پورے کھیت میں خبر اڑ گئی کہ ایک بچے کی ولادت ہونے والی ہے۔ چنانچہ ناصر کاردان اور حکیم بے دونوں پہنچے کہ شاید ان سے کسی طرح کی مدد مطلوب ہو۔

دو گھنٹے کے بعد ایک بچہ اس دنیا میں داخل ہوا —— ایک خوب صورت بچہ کالے بالوں والا، کالی آنکھڑیوں والا اور دودھ جیسی اجلی جلد والا۔ عین اس لمحے کہ وہ پیدا ہوا آسمان پر بادل خوب گھر آئے اور زمین کے اوپر پانی کے جیسے پرنالے گرنے لگے —— کیا ایسے موقعوں پر قدرت مخلوق کے لئے صرف اپنی مخالفت ہی کا مظاہرہ کرتی ہے! کیوں نہ ایسا ہوا کہ ایسے وقت پر سورج چمک اٹھتا۔

اب سوال یہ تھا کہ زچہ و بچہ کو گھر کیسے پہنچایا جائے آخر دو عورتیں ایک ڈنڈا ڈولا سا بنا کر لائیں جس پر کمیلہ جان کو ڈال کر قربان بے کے گھر لے چلیں۔ بی رضوان نے اپنے سفید گلوبند میں بچے کو لپیٹا اور پریشانی کا بار گراں کندھوں پر لئے وہ ڈنڈا ڈولے کے پیچھے روانہ ہوئی۔ کمیلا جان نے اپنے کمرے میں پہنچنے سے پہلے آنکھیں نہ کھولیں۔ جب اس نے اپنے جانے پہچانے ماحول کو پا لیا تو گرا جنے لگی آہستہ آہستہ اسے آرام آگیا۔

کچھ دیر بعد قربان بے کپاس کے ذخیرے کے مرکز سے واپس لوٹا اور کھیتوں سے گزرتے ہوئے اس نے اپنی بیوی کو تلاش کیا اسے وہاں نہ پا کر وہ کھٹکا اور گاڑی تیزی سے ہنکاتا ہوا گھر کی طرف چلا لیکن جب وہ گھر پہنچا تو وہاں ایک ہجوم دیکھ کر وہ اور بھی تشویش میں پڑ گیا۔ اس کی جان میں جان اس وقت آئی جب لوگوں نے اسے بیٹے کی پیدائش کی خبر سنائی اور مبارک باد سے اس کا استقبال کیا

جب اسے سب کچھ معلوم ہو گیا تو وہ گھر میں گھسا اور اپنی بیوی کے بستر پر جا کر جھک گیا۔ اس کے چہرے پر اطمینان، خوشی اور فخر کے جذبات لہریں لے رہے تھے۔ اس نے بچے کو چھوا اسکے چہرے کو کھولا اور پیار کرنا چاہا لیکن وہ یہ دیکھ کر متفکر و دلگیر ہو گیا کہ بچے کی آنکھیں بند ہیں اور اس کے ننھے سے نتھنے ایک انوکھے طریق سے لرز رہے ہیں اس نقشۂ احوال نے قربان بے کو مشتعل کر دیا اور وہ چلایا

"میرے بچے کو کیا ہو گیا ہے؟"

بی رضوان نے جواب دیا "اسے سردی لگ گئی ہے"

قربان بے کی آنکھیں بچے کے چہرے پر جم کر رہ گئیں لیکن اب وہاں کوئی جنبش باقی نہ تھی۔ آخر یہ ہوا کیا؟

قربان بے گہری توجہ کے ساتھ ننھے سے جسم پر جھک گیا تاکہ وہ اسکے قلب کی دھڑکن کی آواز سن سکے لیکن وہاں دھڑکن رہی ہی نہ تھی! اس کا پہلوٹھا بچہ اسکے بازوؤں پر مر چکا تھا ——

کمرہ ماتمی آوازوں سے بھر گیا۔ خود قربان بے سن ہو کر رہ گیا لیکن پھر وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے دانت پیسے، مٹھیاں بھینچیں اور چلایا۔

"یہ ملعون زندگی! —— اور یہ ملعون روسی، جو ہمارا سب کچھ چھین رہے ہیں —— ہمارے بچوں تک چھین رہے ہیں!"

" چــــراغ را

ر ہوشیارپوری •

"عہد و پیماں"

اُٹھ کہ پژمردہ دلوں میں تازگی پیدا کریں
آرزوئے زندگی میں زندگی پیدا کریں

بارگاہِ ایزدی میں جھک کے باعجز و خلوص
از سرِ نو دل میں احساسِ خودی پیدا کریں

ارتباطِ باہمی کا درس دیں پھر دہر کو!
پھر جہاں سے راہ و رسم دوستی پیدا کریں

سنگ و آہن سے بھی ٹکرا کر رہے جو برقرار
عزم میں اپنے کچھ ایسی پختگی پیدا کریں

بزمِ ساقی میں بڑھائیں اور شورِ ہاؤ ہو
زندگی کی الجھنوں میں دلکشی پیدا کریں

پھر جہاں کو اک حیاتِ تازہ کا پیغام دیں
پھر انہی تاریکیوں سے روشنی پیدا کریں

دونوں عالم جھک تو سکتے ہیں ہمارے سامنے
ہم حقیقت میں جو عزمِ دائمی پیدا کریں

صفحۂ دل سے مٹا کر خوفِ باطل کے نقوش
جرأتِ بیباک و جہدِ دائمی پیدا کریں

فضل من اللہ

کال کوٹھڑی

"اب کیا کیا جائے ؟"
کال کوٹھڑی کے ایک کونے سے تشویشناک لہجہ میں ایک آواز آئی ——
"کرنا کیا ہے —— حرامزادی کا قصہ ختم کردو"
رعب دار آواز نے گرج کر کہا۔

"تڑ، تڑ، تڑ!" —— ہاتھ پستول کی لبلبی تک پہنچے اور گولی چل گئی فضا چند لمحوں کے لئے مرتعش ہوگئی۔ کال کوٹھڑی کا سکوت بھی چند لمحوں کے لئے ٹوٹ گیا۔ اور حرامزادی کا قصہ ختم ہوگیا، ادھر گولی اس کے سر پر لگی ادھر وہ زمین پر آرہی۔ پھر کال کوٹھڑی میں سکوت چھا گیا، اور ایک طویل غیر مختتم سکوت!

ہوسکتا ہے، کال کوٹھڑی کا نام سن کر نام نہاد حادثہ بلیک ہول والی کوٹھڑی آپ کے سامنے آجائے —— یا آپ ایک چار فٹ مربع اونچی دیواروں والی کوٹھڑی اپنی آنکھوں کے سامنے موجود پائیں جس میں نہ کوئی کھڑکی ہو نہ کوئی روشندان، جس نے کبھی روشنی کی جھلک تک نہ دیکھی ہو جس کا فرش حشرات الارض سے اور کالی چھت مکڑی کے جالوں سے پُر ہو، اور جس میں زرد رُو، فاقہ مست، مدقوق، اور ہڈیوں کے پنجر رہتے ہوں —— تبھی تو وہ کال کوٹھڑی ہوسکتی ہے مگر ہڈیوں کے پنجر بھی پستول چلاتے ہیں؟ اور مدقوق چہروں میں حرامزادیاں بھی آیا کرتی ہیں؟ پھر "کال کوٹھڑی" کا مطلب؟ ——
جی نہیں میں اس قسم کی کال کوٹھڑی کا ذکر نہیں کرتا —— میرے پیش نظر تو ایک کشادہ کمرہ ہے جس کا فرش پختہ —— دیواریں سفید —— جس میں آفتاب اور ماہتاب دونوں کی کرنیں بے تکلف داخل ہوسکتی ہیں —— جس کے باسی صحت مند اور توانا ہیں —— جہاں مغربی دیوار کے طاقچے پر "مکمل ضابطۂ حیات" سبز غلاف میں لپٹا ہوا موجود ہے، جسے ہر روز صبح بوسے دیئے جاتے ہیں —— تو پھر یہ کال کوٹھڑی تو نہ ہوئی —— اگر ہے تو کیوں؟ کس چیز کا یہاں کال ہے؟ کس چیز نے اسے تاریک کر رکھا ہے؟ اور اگر میں آپ کے کان میں ساری حقیقت کہہ دوں تو آپ بھی —— یعنی ہر کوئی میری رائے سے متفق ہوجائے گا —— اور یہ کشادہ، روشن اور توانا باسیوں کا کمرہ ایک کال کوٹھڑی ہی نظر آئیگا —— اور اس کے باسی گدھ —— بلکہ گدھوں سے بھی بدتر —— کیونکہ گدھ تو مردار کی بوٹیاں دن کے وقت سب کے سامنے نوچتے ہیں مگر یہ اشرف المخلوقات ہونے کے مدعی رات کی تاریکی میں زندہ عورت کی بوٹیاں نوچ لیتے ہیں، —— عورت کی عصمت کے آبگینے کو ظلماً توڑ کر پاؤں تلے روند کر غلاظت کے ڈھیر میں پھینک دیتے ہیں صرف اتنی سی بات پر مطمئن ہوکر کہ —— سرکار کا قانون سورج غروب ہونے کے بعد سو جاتا ہے۔
—— صرف اس لئے کہ خطیبان ملت قوم پرستی کی مے کے جام چڑھا کر انہیں منبروں پر کھڑے ہوکر "عاشق رسول" اور "مجاہد ملت" کا خطاب دیتے ہیں —— اور وہ اپنے ضمیر کو اس طرح جھوٹی تسلی دیتے ہیں کہ فلاں جگہ ان کی قوم کی بیٹیوں سے بھی یہی سلوک ہو رہا ہے لہٰذا انتقام لینے میں کیا حرج ہے —— مگر طاق پر پڑا ہوا ضابطۂ خاموش ہی رہتا ہے اور کوئی نہیں جو آج پڑھ کر کہہ سکے کہ یہ تو خاموش ہے مگر میں ہوں اس کی زبان —— اور یہ ظالم گدھ بے خوف ہوکر ظلم کرتے ہیں اور مظلوم کو پاگل ہوتے دیکھ کر جب ایک مگر مچھ آنسو بہانے لگتا ہے تو دوسرا کہتا ہے "کرنا کیا ہے —— حرامزادی کو ختم کردو" —— اور یہ مشورہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ میں پایۂ تکمیل تک پہنچتا ہے —— فضا مرتعش ہوتی ہے —— مگر پھر ایک چھا جاتا ہے —— تیرگی بڑھتی ہے —— سکوت اور بھی وحشتناک ہوجا

...... عورت جسے ابھی ابھی گولی سے اڑایا گیا نہ تو میری ہم قوم ہے نہ رشتہ دار لیکن ہے مظلوم اور مجھے ظلم کے خلاف آواز اٹھانے میں کوئی باک نہیں! یہ تو میرا قابل فخر ورثہ ہے ــــــ اس کا تو مجھے حکم دیا گیا ہے ــــــ ظلم کو طاقت سے روکنا میرا پہلا فرض ہے ــــ پھر زبان سے مخالفت پھر دل کی نفرت ــــــ مگر پہلا پہلا، اور تیسرا تیسرا درجہ ہی ہے ــــــ فرسٹ اور تھرڈ کا فرق تو ایک بچہ بھی جانتا ہے ــــــ ہاں تو یہ عورت جو ابھی قتل کی گئی ہے مظلوم ہے ــــــ پہلے تو گدھوں نے مل کر اس کی بوٹیاں نوچیں اور جب وہ بالکل پاگل ہی ہوگئی تو اسے قتل کر دیا گیا ــــــ صرف اس بنا پر کہ سرکار کا قانون غروب آفتاب کے بعد بستر استراحت پر تشریف لے جاتا ہے اور فقیہان شہر مئے قومیت میں مست ہیں ــــ ایک طرف سے مشورہ دیا گیا ــــــ دوسری طرف سے فوراً تعمیل ہوگئی ــــــ اور گولی چل گئی ــــــ وہی گولی جس نے جلیانوالہ باغ میں چل کر سارے ملک میں ایک ہل چل ڈال دی تھی ــــــ وہی گولی جس نے باڑلی کیمپ میں چل کر پناہ گیروں کو یہ احساس دلایا، کہ کل تک جن کے لئے وہ زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے، اب وہ انہیں مردہ کہنے کو تیار ہوگئے ہیں ــــــ وہی گولی جو راولپنڈی میں پولیس کے وقار کے قیام کے لئے چلی ــــــ جی ہاں وہی گولی ــــــ مگر اس کال کوٹھڑی میں کوئی ہلچل نہ مچی۔ فقط ایک ہلکی سی چیخ مرنے والی کے منہ سے نکلی جس نے فضا میں ایک کپکپی سی پیدا کر دی ــــــ اور بس! پھر ایک طویل اور غیر مختتم سکوت اس کال کوٹھڑی پر محیط ہوگیا، اور تیرگی بڑھتی ہی گئی۔

.... تو وہ عورت جو ابھی ابھی ٹھنڈی کر دی گئی۔ مقامی بلدیہ کے ہیلتھ آفیسر کے چپراسی لچھمن کی بیٹی تھی ــــ یہ عورت اس وقت ایک سال کی بچی تھی جب لچھمن بلدیہ کے دفتر میں بطور چپراسی بھرتی ہوا اور جب اس کی منی پانچ سال کی ہوئی تو اس نے اسے سکول بھیج دیا ــــــ اور اس کی کانتی سکول میں تعلیم حاصل کرنے لگی۔ ــــــ یہ لچھمن کی کفایت شعاری کا نتیجہ تھا، ورنہ مسلمان چپراسیوں کے لڑکے تک نہیں پڑھ سکتے لڑکی کی تعلیم تو بہت دور کی بات ہے! مسلمان چپراسی اپنے لڑکوں کو یا تو صاحب لوگوں کے ہاں نوکر کرا دیتے ہیں یا پھر انہیں پھاوڑی دیکر اپنا رزق آپ پیدا کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ مگر لچھمن نے اپنی کانتی کو نہ صرف میٹرک پاس کرایا بلکہ جے۔ اے۔ وی بھی کرا لیا اور جب اس کی ملازمت کی مدت بیس سال ہوئی اور اس کی گھنی مختصر مونچھوں میں ایک بھی کالا بال نہ رہا تو اس کی لڑکی ڈی۔ اے۔ وی ہائی اسکول میں استانی مقرر تھی۔ بڈھا لچھمن بیٹی کو دیکھ کر پھول جاتا تھا اور اس کا سر کسی بالادست کے سامنے جھک جاتا، شکر کے جذبات کے ساتھ وہ کہتا ــــــ "ہے بھگوان! تو ہی غریبوں کا والی ہے" ــــــ اور بھگوان نے اس کی سُن بھی تو لی تھی۔ اس کی کانتی اب معقول تنخواہ لانے کے علاوہ اب قوم کی بچیوں کو زیور علم سے آراستہ کر رہی تھی۔

کانتی کو ملازم ہوئے بمشکل دو سال ہوئے تھے کہ وہ اخبارات پڑھ پڑھ کر آنے والے واقعات کی دھندلی سی تصویر دیکھکر کانپنے لگی۔ اس نے یوں محسوس کیا کہ لیڈروں کے بیانات، تقریریں اور اخباروں کا ایک ایک لفظ ایسے گولے تیار کر رہا ہے جو ــــ پھٹنے شروع ہونگے، تو اپنی قوم کے افراد کو دوسری قوم کے افراد کے لئے پاگل بنا دیں گے ــــــ اور وہ محسوس کرنے لگی گویا یہ گولے پھٹنے شروع ہوگئے ہیں اور تمام لوگ دیوانے ہوگئے ہیں ــــــ ان پڑھ، تعلیم یافتہ، پولیس کے افسر جج، وزیر سب دیوانے ہوگئے ہیں، مگر مخالف قوم کے لئے، اپنی قوم کے لئے وہ بالکل فرزانے ہیں ــــــ اور پھر دیوانگی میں جو حرکتیں وہ کرتے ہیں وہ ان کو دیکھ نہ سکی، اور اس نے اپنی آنکھوں کو ڈھانپ لیا، ــــــ اور پھر وہ وقت آ ہی گیا، جب یہ گولے فی الحقیقت پھٹنے لگے، کانتی کی دیکھی ہوئی دھندلی سی تصویر اب بالکل صاف نظر آنے لگی ــــ اور ــ دھرم کی رکھشا کے لئے وہ لوگ بھی ان خلاف قانون جلوسوں کے قائد بن گئے جن کے ذمہ ــ خود امن کا قیام تھا ــــ چند گولے تیزی سے پھٹے ــــــ پہل کر دی گئی ــــــ دروازوں کے اندر اور دروازوں کے باہر کانتی کے بھائی بند جنون کا انتظار کرنے لگے ــــ کانتی جہاں رہتی تھی وہ اس کے فرقہ کی اکثریت کا علاقہ تھا۔ چنانچہ جنون یہاں بھی باز نہ آیا دو مسلمانوں کو قتل بھی کر دیا گیا ــــــ اور رات کو دھرم کے دو سیوک جوان دو مظلوموں کے قاتل تھے، آرام کرنے لگے ــــــ ان کی ہر طرح

شمیر کراچی

کی خدمت معززین علاقہ نے اپنے ذمے لی۔ یہاں تک کہ ...... کانتی کو
بھی مشورہ دیا گیا کہ وہ ان دھرم سیوکوں کی سیوا کرے، مگر وہ ٹال گئی
نیلی نیلی پگڑی والے نوجوانوں کے پاس ایک دوشیزہ کا جانا خطرے
سے خالی نہ تھا۔

رات کافی بھیگ چکی تھی، کانتی آرام سے سو رہی تھی ——
بموں کے دھماکے اور چیخوں کی آوازوں نے اسے بیدار کر دیا —— اس
نے باپ کو جگایا

" بابا یہ گولیاں کہاں چل رہی ہیں ؟ " اس نے باپ سے ڈرتے
ہوئے پوچھا۔

" سو بھی جا —— بجلی کہیں کی —— مسلوں کو بھونا جا رہا ہے "

باپ نے مسرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

" کیوں ۔ ان کا کیا قصور ہے ؟ "

" وہ مسلے جو ہوتے " ——

اور وہ اس جواب سے مطمئن نہ ہو سکی۔ دن چڑھا تو سب کچھ
پتہ چل گیا —— وہ اس بات پر خوش ہونے کی بجائے کڑھ رہی تھی
کہ انسانوں کو —— بے گناہ انسانوں کو —— کیوں تباہ کیا
جا رہا ہے اور جب وہ اسکول گئی تو اس نے استانیوں کو خوش پایا ——
—— اسکیم کامیاب رہی —— ڈی ایس پی نے کھلم کھلا ان لوگوں کی
امداد کی —— ہاں اگر افسوس تھا تو یہ کہ دن کیوں چڑھ آیا اور محلے
آبادیاں کیوں نہ کھنڈر بنا دی گئیں۔

یکایک ہوا کا رخ بدل گیا، کانتی کی قوم اب شہر چھوڑ کر ہندوستان
جانے لگی۔ ناقابل تسخیر قلعے دشمن کے ہاتھ جانے لگے —— کاروبار
معطل ہو گیا —— وہ اکثر گھر پر ہی رہتی۔ مگر جب باہر نکلتی تو چند
نظریں اس کو گھورتی ہوئی نظر آتیں —— اور وہ ان نظروں سے
کچھ خوفزدہ ہو کر نقاب کی ضرورت محسوس کرتی —— سارا علاقہ
خالی ہو رہا تھا اور اب یہ للچائی ہوئی نظروں والے آدمی اس کے مکان
کے چکر کاٹنے لگے —— وہ ڈر گئی —— باپ سے بات کی
اور طے یہ ہوا کہ کیمپ میں قیام کیا جائے —— اور وہ کیمپ میں چلی
گئی —— مگر مصیبت نہ ٹلی —— بھوکی آنکھیں یہاں بھی

موجود تھیں۔ نیلی نیلی پگڑیوں کے نیچے بھوکی آنکھیں اس کی طرف ایک
خاص مقصد کے تحت دیکھتیں اور وہ پریشان ہو جاتی۔

" اور یہ چھوٹی چھوٹی آنکھیں اب اسے پریشان کرنے لگیں، وہ کچھ،
سرگوشیاں بھی سننے لگی —— باپ سے تذکرہ ہوا —— اس نے
اسے اپنے دفتر چلے جانے کا مشورہ دیا —— اور وہ مان گئی ——
—— ادھر وہ کیمپ سے نکلی ادھر بیرونی مردم خور گدھوں کو بھی خبر ہو گئی،
اور وہ ہیلتھ آفیسر کے کمرے کے گرد سرِ شام ہی منڈلانے لگیں، اور ابھی
دس بھی نہ بجے تھے کہ سائیں سائیں کرتی ہوئی گدھیں آ گئیں —— پچھن کا
کام ایک چھرے نے تمام کر دیا۔ اس کا ہاتھ زخمی ہو گیا اور کانتی کو گدھیں لے
اڑیں۔ اور وہ اس کال کوٹھڑی تک پہنچ گئی —— گدھیں اس کی
بوٹیاں نوچتیں —— وہ ظلم کی چکی میں پستی رہی اور جب وہ پاگل
ہو گئی تو تشویشناک آواز نے حکم مانگا۔ گرو گھنٹال نے قتل کا مشورہ
دیا اور اس کا کام تمام ہو گیا۔

ڈیوٹ پر پڑا ہوا دیا اب اس کمرے کو روشن کرنے سے انکار کر رہا ہے
سورج کی کرنیں اب اس کال کوٹھڑی سے نفرت کرتی ہیں اس میں دو سال
سے گناہ کی تاریکی پھیل رہی ہے —— کانتی ختم ہو گئی ہوسناک نفوس نے
—— " کو یہاں پر آ دبوچا۔

اب پبلک بھی اس تیرگی سے نفرت کر رہی ہے —— بداخلا
کسی قوم کے لئے فالِ نیک نہیں بن سکتی —— غنڈہ گردی کے خاتمے
لئے قانون بن رہا ہے —— کال کوٹھڑی کی تاریکی اب سر پر پاؤں
رکھ کر بھاگنے والی ہے —— مگر یہ قانون بھی رات کو کہیں سو تو
جائیگا ؟ —— خدشہ یہی ہے —— قانون کی آنکھوں میں تو
کی ریت دن کے وقت بھی پڑ سکتی ہے —— اس کال کوٹھڑی کا کا
تاریکی —— اس وقت ختم ہوگا۔ جب زندگیاں بڑھ کر اس
حکم طلب کرینگی —— اب یہ مظلوم بھی مطالبہ کر رہا ہے کہ ا
نکلے اور بڑھ کر کہہ دے —— " میں ہوں اس خاموش کتاب کی زبان "۔

—— کال کوٹھڑی روشن ہو سکتی ہے ——
—— کتنی تاریک ہے یہ کال کوٹھڑی —— جلتا ہوا چراغ ا
ضابطہ حیات رکھنے کے باوجود بھی ! ——

زیڑب

سید محمد جعفری •

"مسز روز ویلٹ"

کراچی میں آئیں مسز روز ویلٹ
رکھے اپنے بالوں پہ ہلکی سی فیلٹ!

خوشامد درآمد کراتی ہوئی
مرے حاکموں کو نچاتی ہوئی

گداؤں نے رو رو کے ان سے کہا
"کریما بہ بخشائے بر حالِ ما!"

وہ بولیں کہ اے مفلسانِ ازل!
تمھاری ہر اک بات ہے بے محل

ثبوتِ وفا ہو جو کوئی تو لاؤ!
نہیں چلتی پانی میں مصری کی ناؤ!

اگر بیچ دو میرے ہاتھ اپنی روح!
تو ہو یو۔ ایس۔ اے کی میسر صبوح

دلاؤں گی انسانیت کے حقوق—!
چٹاؤں گی دنیائے نو کا لعوق—!

دلا دوں گی ایران سے تم کو تیل
اگر ہو ہر اک اشتراکی کو جیل

سنا ہے یہاں عورتیں ہیں غلام
مسلماں نے بخشا ہے حبسِ دوام

کرو ان کو آزاد اور بے لگام!
کہ دنیا میں تہذیب ہے اس کا نام

عبث کوئی ڈالر لٹاتا نہیں—!
"گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں"!

نہیں جانتے چین کے چیانگ کو
نبھایا بہت ہم نے اس سوانگ کو

وہ دل کو بڑھا کر گئیں انڈیا
کہ ہے معتقد ان کا سب ایشیا

"عجب شان سے وہ سواری چلی!
کہے تو کہ بادِ بہاری چلی!"

یہاں ہم بغل جھانکتے رہ گئے
یونہی ڈھول سی بھپا نکتے رہ گئے

یہ ننانوے کا عجب پھیر ہے
مسلماں نہیں خاک کا ڈھیر ہے!

(نقش)

قوت، طاقت اور مردانگی چوبیس ۲۴ گھنٹے میں تو نہیں

مگر ہاں

تیس ۳۰ دن میں ضرور حاصل ہو سکتی ہے

کیا آپ تھکاوٹ، پژمردگی، نقاہت اور کمزوری محسوس کرتے ہیں، کیا آپ کی قوت حافظہ کمزور ہے، کیا آپ ہر وقت خوفزدہ اور غمگین رہتے ہیں۔ کیا آپ کا جسم دبلا ہے اور آپ سستی اور کمزوری محسوس کرتے ہیں۔ کیا آپ احساس کمتری کے شکار ہیں ——؟ اگر ایسا ہے تو یقین جانیے کہ آپ کے وہ غدود جو قوت مردانہ کے مخزن ہیں، کمزور ہو گئے ہیں اور جب تک آپ ان غدود کو طاقتور بنا کر ان کی حفاظت نہیں کرینگے آپ کبھی بھی قوت و طاقت اور مردانگی کی صفات سے متصف نہیں ہو سکتے —— خوش قسمتی سے

امام طب حکیم سید نذیر احمد صاحب دھلوی

اپنے ۲۵ سالہ تجربہ کے بعد ایک ایسا نسخہ مکمل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو کہ مردانہ غدود کی جملہ کمزوریوں کو دور کر کے انہیں طاقتور بنانے کا تیر بہدف مگر سادہ اور سہل علاج ہے طب یونانی کی اس جدید اور مایہ ناز ایجاد کا نام

"حاذقی کورس"

ہے، جو تین مختلف ادویہ پر مشتمل ہے اور تیس دن کا مکمل کورس ہے جس کا ابتدائی استعمال آپ کے جسم میں طاقت قوت اور تندرستی کا احساس پیدا کر دے گا اور پورے تیس روز کے بعد آپ ایک مکمل نوجوان، تندرست و توانا اور طاقتور مرد بن جائیں گے۔

"حاذقی کورس"

کا استعمال فوراً ہی آپ کے غدود کو طاقتور بنا کر اپنا شروع کر دیگا۔ آپ کے بدن میں تازہ سرخ خون پیدا کر کے اس میں جوانی کا جوش پیدا کر دے گا اور جوں جوں آپ کے غدود طاقتور ہوتے جائیں گے۔ آپ اپنے اندر زندگی کی ایک نئی لہر محسوس کرینگے اور آپ زندگی کے ہر شعبے میں حقیقی زندگی سے لطف اندوز ہو سکیں گے یعنی "لطف شباب"!

حاذقی کورس مکمل برائے تیس یوم - بارہ روپے } **حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی نمبر (۱)**

Asmar
The TONIC FRUIT DRINK
REFRESHING
INVIGORATING
Excellent
with
SODA WATER
OR HOT OR
COLD WATER
اثمار
پھلوں کا
فرحت بخش اور مقوی
شربت۔ سوڈا واٹر یا ٹھنڈے
پانی میں استعمال کیجئے
REFRESHING & INVIGORATING
FRUIT FLAVOUR UNANI SYRUP
HAZIQ DAWAKHANA
ALWAYS DRINK
Asmar
حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی
HAZIQ DAWAKHANA KARACHI
KAMIL

1952 Regd. No. S.

Monthly **"MUSHIR"** *Karachi*

کراچی
مشیر
ماہنامہ
جون
سنہ ۱۹۵۲ء
قیمت فی پرچہ
پاکستان ۰-۶-۰
بھارت ۰-۸-۰
ماہنامہ "مشیر" بندر روڈ، کراچی نمبر (۱)

چالیس سال کے بعد عورت اپنے جسم میں ایک قدرتی اور فطری تبدیلی محسوس کرتی ہے جس کی وجہ سے دوران سر بے خوابی، دھڑکن، جسم میں موٹاپا اور بدن میں سستی پیدا ہوجاتی ہے۔ اس کو اپنی جوانی ڈھلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے یہ سب عصبی کمزوری کی نشانیاں ہیں جو بڑھتی ہوئی عمر کا فطری تقاضا ہیں۔ اور اس کا بہترین علاج **حاذق نروائن پلز** (**حب خاص**) کا متواتر اور مسلسل استعمال ہے۔

سونا، فولاد، مشک، عنبر اور مروارید جیسے قیمتی اجزا کا یہ بے نظیر مرکب، جدید طبی اصولوں کے مطابق تیار کیا گیا ہے اور صحیح عصبی خوراک اور عصبی ٹانک ہے۔ حکما نے اسے سراہا ہے اور اپنے نسخوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اس کے متواتر استعمال سے آپ چالیس سال کے بعد بھی جوان نظر آئیں گی اور جسم میں جوانی کا سا پھرتیلا پن محسوس کریں گی۔

80 گولی کے پیکٹ کی قیمت ۷/ روپیہ (علاوہ محصول ڈاک) ہے جو 40 یوم کی خوراک ہے اور سال بھر تک آپ کی طاقت اور قوت کو بحال رکھنے کے لئے کافی ہے۔

نمونے کے لئے 20 گولی اور 40 گولی کا پیکنگ بھی مل سکتا ہے جس کی قیمت ۲/ روپیہ اور 3/12 بالترتیب ہے۔

آپکے شہر کے بڑے بڑے دوا فروشوں سے مل سکتی ہیں۔ یا براہ راست

حاذق دواخانہ۔ بندر روڈ۔ کراچی سے طلب کیجئے

مستند اور قابل اعتماد
یونانی مجربات کا ٹریڈ مارک

نوٹ: مفصل فہرست ادویہ حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی نمبر 1 سے مفت طلب کیجئے!

تمہارے لئے زمین کی پیٹھ بہتر ہے!

جب تمہارے حاکم پرہیزگار، تمہارے دولتمند سخی، تمہارے کام باہمی مشورے سے ہوں گے تو اس وقت تمہارے لئے زمین کی پیٹھ اس کے پیٹ سے بہتر ہوگی یعنی مرنے سے جینا اچھا ہوگا +

تمہارے لئے زمین کا پیٹ بہتر ہے!

جس وقت تمہارے حکّام بدترین، تمہارے مالدار کنجوس اور تمہارے کام تمہاری عورتوں کے سُپرد ہونگے تو اس وقت تمہارے لئے زمین کا پیٹ اس کی پیٹھ سے اچھا ہوگا۔ یعنی زمین پر چلنے پھرنے سے قبر میں جانا بہتر ہوگا + (رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم۔ مشکوٰۃ)

پاکیزہ ادب اور صحیح اسلامی مشورے لئے ہوئے

ماہنامہ **مشیر** کراچی

فہرست مضامین — جون سنہ ۱۹۵۲ء

بدل اشتراک :-

پاکستان ——— سالانہ ——— تین روپے

" فی پرچہ ——— چھ آنے

بھارت ——— سالانہ ——— ساڑھے چار روپے

" فی پرچہ ——— آٹھ آنے

جلد ——— ۳

شمارہ ——— ۶

مرتبہ ——— عبدالغفور بیگ

پرنٹر پبلشر عبدالغفور بیگ نے مشہور آفسٹ لیتھو پریس میں چھپوا کر دفتر رسالہ مشیر بندر روڈ کراچی نمبر ۱ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سیکورٹی بل

قیام پاکستان کی گذشتہ پنج سالہ تواریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ہمارا حکمران طبقہ نئے ناموں اور نئے روپوں میں حفاظتی قوانین کا ایک بیالا متناہی سلسلہ ملک پر مسلط کئے ہوئے ہے جس کی کوئی انتہا نظر نہیں آتی۔ اور دن بدن بجائے نرمی یا کمی ہونے کے ان قوانین کی مستوں میں اضافہ ہو رہا ہے اور انکے اختیارات وسیع ہوتے جارہے ہیں۔ شہریت کے حقوق محدود اور ملک ایک مستقل قید خانہ بنتا جارہا ہے۔ ایک ایکٹ کی مدت عمر ختم ہوتی ہے تو اسے نئے فرمان کے ذریعہ حیات نو بخش دی جاتی ہے۔ اگر کوئی ملکی عدالت کسی فنی خامی کی وجہ سے ایک قانون کو ناجائز قرار دیتی ہے تو اس خامی کو دور کرکے پیر اسے "ٹھیک ٹھاک" کر دیا جاتا ہے۔ قیام پاکستان سے لے کر آجتک ان قوانین کا منحوس سایہ ملک پر مسلسل پڑا ہوا ہے۔

گزشتہ ماہ ملک کی سب سے بڑی عدالت نے پبلک سیفٹی آرڈیننس کے عدم جواز کا فتوے صادر کرکے اسے منسوخ قرار دے دیا تو ہماری حکومت نے پارلیمنٹ سے اس کی جگہ ایک نیا سیکورٹی بل منظور کرلیا ہے۔ اس بل کے خلاف پارلیمنٹ کے اندر اور باہر عوام اور خواص نے پریس اور اسٹیج سے جس قدر احتجاج کیا ہے اور کسی بل کے متعلق نہیں کیا۔ پاکستانی اخبارات کی دونوں انجمنیں (P. N. E. C) اور (C. P. E) اس کی تنسیخ پر متفق ہیں۔ اس کے باوجود بھی ہمارے حکمران طبقے نے اسے ملک پر مسلط کرکے ہی چھوڑا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ موجودہ برسر اقتدار پارٹی ہماری پارلیمنٹ اکثریت رکھتی ہے۔ مگر محض عددی اکثریت کے بل بوتے پر ملک پر لاقانونیت مسلط کر دینا کبھی بھی مستحسن قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔ ہر قسم کی معقولیت سے الگ ہو کر محض عددی اکثریت کے زور پر اس قسم کے قوانین پاس کروا کر حکومت کرنے کے نتائج کسی تشریح کے محتاج نہیں۔ دنیا کی ہر حکومت ملک کے عوام یا ان کی اکثریت کی نمائندہ ہوتی ہے۔ اس لئے اول تو وہ قوانین ہی ایسے وضع کرتی ہے جو اس ملک کے بسنے والے لوگوں کے مخصوص قومی مزاج اور نظریہ آئینی و انصاف سے مطابقت رکھتے ہوں۔ اور اگر کبھی وہ کوئی ایسا قانون بنا بھی دیتی ہے جس پر ملک کے عوام ناپسندیدگی کا اظہار کریں تو وہ اسے منسوخ کرنے میں بھی تامل نہیں کرتی۔ مگر ہمارے حکمرانوں کا دین سیاست ہی کچھ نرالے ڈھب کا ہے۔ سارا ملک اسی قانون کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ اسے جبر و تشدد کا مظہر کہتا ہے۔ شہری آزادیوں پر حملہ قرار دیتا ہے۔ مگر ہمارے لیڈر کہتے ہیں کہ عوام نادان ہیں۔ ملک کی سلامتی اور امن و سکون خطرے میں ہے اور یہ قانون انہیں کی حفاظت کے لئے گھڑا گیا ہے جو لوگ اسکے خلاف احتجاج کرتے ہیں وہ انتشار اور تخریب پسند ہیں۔ حالانکہ اگر اس قانون کے خلاف احتجاج کرنے والے سب کے سب انتشار پسند ہی ہیں تو پاکستان کا خدا ہی حافظ ہے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ ان کالے قانونوں کی پشت پناہی کرنے والے خود وہ لوگ ہیں جو کل تک ان ہی قوانین کے خلاف گلے پھاڑ پھاڑ کر چلایا کرتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ چونکہ ملک میں ہنگامی حالات موجود ہیں، اس لئے ان قوانین کی ضرورت ہے۔ یہ دلیل خود اس بات کی دلیل ہے کہ اگر ملک میں ہنگامی حالات نہ ہوں تو ان قوانین کی ضرورت نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ "ہنگامی حالات" سے مراد کیا ہے۔ کیا امریکہ انگلینڈ اور دوسرے یوروپین ممالک کے حالات سے ہمارے ملک کے حالات زیادہ ہنگامی ہیں۔ کیا یہ ممالک گوناگوں داخلی اور خارجی مسائل سے دوچار نہیں ہیں۔ کیا دنیا کا کوئی چھوٹا یا بڑا ملک ایسا ہے جس کو ایسی الجھنیں اور مسائل درپیش نہ ہوں جو آج ہمارے ملک کو درپیش ہیں۔ بلکہ بعض ممالک تو جنگ کے خطرہ تک کو ہنگامی حالات نہیں سمجھ رہے ہیں اور کسی قسم کے سیکورٹی بل کے نفاذ کو ضروری نہیں سمجھ رہے۔ اگر یہ حالات ہنگامی حالات ہو سکتے ہیں تو پھر دنیا کے بہت سے ممالک کو اپنے پورے کے پورے

آئین کو معطل کردینا چاہیئے اور ان کی جگہ سیکورٹی ایکٹ نافذ کردینے چاہئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہنگامی حالات کا ہوا محض اس لئے کھڑا کیا گیا ہے کہ اس قسم کے جابرانہ اور متشددانہ قوانین کے ذریعے غیر محدود اختیارات حاصل کرلئے جائیں۔ اور پھر انکے ذریعہ ہر قسم کی سیاسی مخالفت کو دبادیا جائے۔ رائے عامہ کو کاملاً نظرانداز کرکے سیکورٹی ایکٹ جس غرض وغایت کے تحت نافذ کیا گیا ہے اس کا مقصد ملک اور مملکت کا تحفظ نہیں ہے بلکہ برسراقتدار جماعت کے چند مخصوص افراد کے مفادات کا تحفظ ہے جن کا تعلق قومی وعوامی مفادات سے قطعاً نہیں ہے بلکہ یہ تو برسراقتدار حضرات کو ہمیشہ برسراقتدار رکھنے کے لئے ایک سراسر غیر جمہوری ذریعہ ہے۔ ہم کسی جماعت یا فرد کی اس خواہش کو کہ وہ تازیست مملکت کی تقدیر کا مالک بنا رہے قابل اعتراض نہیں سمجھتے بیکن شرط یہ ہے کہ اسے رائے عامہ کی تائید حاصل ہو اور حصول مقصد کے لئے آمرانہ اور غیر جمہوری طریقے استعمال نہ کئے جائیں ———— مگر برسراقتدار پارٹی کی روش سے پاکستان کے عوام محسوس کررہے ہیں کہ مسلم لیگ اور اسکے چند خاندان سیکورٹی ایکٹوں کے بل بوتے پر اقتدار کی گدی پر سوار رہنا چاہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ شہری آزادی کے ہوتے ہوئے ان کی آرزوئیں بارآور نہیں ہوسکتیں کیونکہ رائے عامہ ان کے خلاف ہے۔ وہ تمام وعدے جو انھوں نے اس ملک کے عوام کے ساتھ کئے تھے بالائے طاق رکھے جاچکے ہیں ساٹ کروڑ انسانوں کی مادی تہذیبی اور اخلاقی نشوونما اور ترقی کی راہیں مسدود ہوچکی ہیں۔ مسلم لیگی حکومت کے پھوہڑپن اور پیہم غلط روی پر عوامی تنقید واعتراضات کی بوچھاڑ تیز تر ہورہی ہے۔ ایسی صورت میں اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ جمہوری تنقید کا گلا گھونٹ دیا جائے اور عوام کی سیاسی آزادی کو سلب کرکے انہیں بے دست وپا بنادیا جائے۔

انگریزی عہد میں شہری آزادی اور رائے عامہ پر کچھ کم پابندیاں نہ تھیں۔ حالانکہ وہ ایک غیر حکومت تھی لیکن مسلم لیگی حکومت نے جو کہ ملکی حکومت ہے، ان جکڑبندیوں میں اضافہ کردیا۔ مرکزی اور صوبائی حکومتیں سیفٹی قوانین نافذ کرتی رہیں جن سے خود حکومت کا ایک اہم ترین شعبہ عدالت وانصاف اپنے اختیارات سے بڑی حد تک محروم ہوگیا۔ ملک کے اخبارات اس مسلم لیگی طرز کی جمہوریت" کے تحت بالکل بے دست وپا ہوگئے۔ مسلم لیگی حکومت کے یہ کارنامے اس کی مقبولیت میں کوئی اضافہ نہ کرسکے۔ بلکہ عوام کی نظروں میں اس کی حالت اور پتلی ہوتی چلی گئی۔ اب بگڑی ہوئی صورت حال سنبھالنے کے لئے سیکورٹی ایکٹ نافذ کیا گیا ہے جس سے عوام اخبارات اور عدالت اپنے بنیادی حقوق اور اختیارات سے اور بھی زیادہ محروم ہوگئے ہیں۔ شہری حقوق ختم ہوچکے ہیں۔ اخبارات جن کے ذریعہ سے رائے عامہ کی تربیت ہوتی ہے، پولیس کے تحت آگئے ہیں اور عدالت اگر کسی شہری کے سیاسی حقوق کا تحفظ کرنا چاہے تو نہیں کرسکتی۔

اب پاکستان کے ہر سنجیدہ اور ذمہ دار شہری کے لئے یہ سوچنے کا مقام ہے کہ برسراقتدار مسلم لیگی حضرات ملک کو کس طرف لے جارہے ہیں اور اس کا انجام کیا ہوگا۔ وقت آگیا ہے کہ تمام اخبارات اور ملک کی وہ تمام سیاسی جماعتیں اور افراد جو سیکورٹی ایکٹ کو ہماری قومی آزادی اور خودداری کی اہانت سمجھتے ہیں ان کالے قوانین کے خلاف مشترکہ ومتحدہ محاذ قائم کریں اور آئین وقانون کی حدود کے اندر رہ کر انکے خلاف پرامن جدوجہد کریں تاکہ ساٹ کروڑ عوام کو ان کے جائز شہری حقوق واپس دلائے جاسکیں۔

بوالوفا حجازی ●

"سیکوزٹی بل"!

وقت کے تاجدار کی بدلی ہوئی ہیں چتونیں! —

سینۂ کائنات میں جاگ اٹھی ہیں دھڑکنیں

معرکۂ حیات میں ، گرم ستیز ہوگئیں

"عقل و خرد" کی سازشیں عشق و جنوں کی جرأتیں

وادیٔ عشق میں ہوا ، نعرۂ شوق پھر بلند

تلملا گئی ہوس ، لینے لگی ہے کروٹیں

سہمے ہوئے قلوب میں ، مچل رہے ہیں ولولے

چہرۂ اہرمن پہ بھی ، ہیں سلوٹیں ہی سلوٹیں

ضربتِ لا اِلٰہ سے باطل ہوا ہے بیخ پا

غوغۂ دار و گیر ہے ، دار و رسن میں جُنبشیں

(جہانِ نو)

آلم مظفر نگری ●

پیامِ رمضان

اے مسلماں! اے امانت دار عرفانِ خودی
تیری مضرابِ نظر سے نغمہ زن سازِ حیات
تیرا ہر اک اشکِ رنگیں ضامنِ تمکینِ عشق!
نالۂ شبگیر ہے تیرا کہ پیغامِ سحر بدوش
آج کیوں تو بزمِ ہستی میں نوا پیرا نہیں

ذمہ دارِ نظمِ دو عالم ہے تیری زندگی!
ہے تجھی پر منحصر کشفِ رموزِ کائنات
قطرۂ خونِ جگر کی تابشیں تزئینِ عشق!
طورِ سینا تیرے اک سجدے سے ہے جلوہ بدوش
قلب میں جوشِ فغاں لب پر کوئی نالا نہیں

خونِ دل کو زندگی دے گرمیٔ تدبیر سے
تا بچے تسکینِ مہمل شکوۂ تقدیر سے

لیکے آیا ہوں میں پھر وہ ربطِ ہستی نواز!
کوہساروں کو دیا جس نے سکونِ برمحل
مطلقاً پیغامِ لاہوتی ہے اک میرا ورود
مست ہے تسبیح میں باغِ دو عالم کی فضا
مسجدوں سے وہ اٹھی اللہ اکبر کی صدا

جس کے سوز و ساز میں ہے گرمیٔ محفل کا راز
اور طوفانوں کو بخشا اضطرابِ مستقل!
گونجتی ہے فرش سے تا عرش آوازِ ورود
ذکرِ الا اللہ سے معمور ہے موجِ ہوا!
حاملینِ عرش نے بھی جھوم کر سجدہ کیا

دیکھ بے پردہ ہے رازِ پردۂ لوح و قلم
کھول آنکھیں اور سمجھ لے فرقِ انوار و ظلم

زندگانی مردِ مومن کی ہے سعیٔ متصل!
ہو نہ کافر جوہرِ شمشیرِ آہن کو نہ دیکھ!
شورشِ محشر ہے خوابیدہ تری ہر آہ میں
یہ اذانیں، یہ نمازیں، یہ سجودِ صبح و شام
ان سے بیزاری یقیناً ہے شکستِ مبتذل!

اس کی پیہم کوششوں سے دورِ گردوں بھی خجل
ارتقائے شعبدہ بازیٔ پرفن کو نہ دیکھ
ڈھونڈ لے حربوں کو اپنے ضربِ الا اللہ میں
اپنے دامن میں لئے ہیں فتحِ عالم کا نظام
ہاں بغیر ان کے نہیں ممکن کوئی حسنِ عمل!

جاگ راتوں کو دلِ خوابیدہ کو بیدار کر
ظلمتوں کو دہر کی سجدوں سے پُر انوار کر!

الجمعیۃ

—— ❖ ——

محمد حمید اللہ صدیقی

پہلی قسط

اُردو ادب میں اِسلامی رجحانات (اسلامی ادب)

قوموں کے عروج و زوال، رفعت و انحطاط، ترقی و تنزل میں جہاں اور بہت سے داعیات و محرکات کارفرما ہوتے ہیں وہاں ادب کا بھی ایک بڑا حصہ ہوتا ہے۔ بلکہ درحقیقت کسی قوم کے کسی دور کے ادب کے ایک غائر مطالعہ سے اس بات کا بہت بڑی حد تک اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ قوم اس وقت ترقی یا تنزل کے کن مدارج پر تھی۔ ادب اگرچہ قوم کے ایک بہت ہی محدود طبقہ کے غور و فکر کا نتیجہ ہوتا ہے لیکن درحقیقت پوری قوم کا آئینہ دار ہوتا ہے اور یہی نہیں بلکہ مستقبل کے متعلق قوی اشارات کا حامل ہوتا ہے اور اس کی بدولت عقل سلیم بڑے تیقن کے ساتھ مستقبل قریب کے خاکے مرتب کر سکتی ہے۔ اور پھر ادب اگر ایک طرف قوم کے خیالات، جذبات اور احساسات کی عکاسی کرتا ہے تو دوسری طرف اس کو ڈھالنے اور موڑنے کی بے پناہ صلاحیتیں رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی متمدن دنیا میں جب بھی ایسے تغیرات ہوئے جنھوں نے تاریخ کے صفحات پر گہرے نقوش چھوڑے، ادب نے ہمیشہ جمہور کو متحرک کرنے میں ایک نمایاں خدمت انجام دی۔ اور اب تو ادب ہی وہ بہترین ذریعہ ہے جس سے کسی انقلاب کی زمین تیار کی جاتی ہے۔

یوں تو اردو زبان کی پیدائش ایک ایسے زمانہ میں ہوئی جو ہندوستان میں مغل حکومت کا عہدِ زریں قرار دیا جاتا ہے لیکن بدقسمتی سے اسکو پھلنے پھولنے اور پروان چڑھنے کا موقعہ اس وقت ملا جبکہ پوری قوم اخلاقی، سیاسی اقتصادی غرض یہ کہ ہر لحاظ سے انتہائی سرعت کے ساتھ انحطاط کی منازل طے کر رہی تھی۔ مسلمانوں کی حکومت کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا اور ملک کے مختلف حصوں میں جو چھوٹی چھوٹی نوابیاں یا راجواڑے قائم تھے وہ بھی تنزل و انحطاط کی انتہائی گہرائیوں میں گر چکے تھے۔ مرکز اپنی مرکزیت کھو کر متزلزل تھا۔ سہل پسندی، عیش کوشی اور مدہوشی امرائے سلطنت کے ساتھ ساتھ عوام کا بھی چلن بن چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے زمانے میں ادب کی تخلیق کن خطوط پر ممکن تھی۔ اہل زبان و قلم کا حال اس سے کچھ مختلف نہ تھا ایک طرف اگر غزلیات ان کی سہل پسندی اور عیش کوشی کا لازمی نتیجہ بن کر ظاہر ہوئیں تو دوسری طرف ان امراء اور نوابین کی شان میں لایعنی قصائد لکھے گئے جن کے اندر اخلاقی رفعت اور بلندی کا کوئی شائبہ بھی باقی نہ رہ گیا تھا۔ بلکہ اسکے برعکس ایک ذی ہوش انسان کی نظروں میں ان کی حیثیت کاٹھ کے تپلوں اور بے شعور مسخروں اور بھانڈوں سے زائد نہ تھی۔ درحقیقت یہاں اس چیز سے کوئی غرض نہیں ہے کہ ان غزلیات و قصائد میں زورِ کلام معاملہ بندی استعارات اور تشبیہیں کس انداز۔۔۔ کی ہیں اور ان سے اردو کو بحیثیت ایک زبان کے کیا فائدے پہنچے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس دور کے اردو ادب نے قوم کو وہ کونسا پیغام دیا جو انھیں اس پستی و انحطاط سے نکال کر رفعت و بلندی کی طرف پرپرواز تولنے کی دعوت دیتا ہو....

کیونکہ ادیب بہرکیف ایک ایسی صلاحیت رکھتا ہے جو اسے اس ماحول و معاشرے میں سانس لینے کے باوجود عام سطح سے بلند کر دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ بقول مجنوں گورکھپوری ادیب "واقعات کی دنیا میں گردن تک ڈوبے رہنے کے باوجود اپنا ہاتھ ستاروں کی طرف بڑھائے چلا جاتا ہے" اسی تصور کے ماتحت اس زمانے کی غزلوں، قصیدوں، قصوں، کہانیوں مرثیوں اور مثنویوں کے دفتر کھنگالنے کے باوجود اس قسم کی کوئی چیز نہیں ملتی۔ ہاں اس کے برعکس یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اس زمانے کے شعراء اور افسانہ گو خباثت و مفاسد میں ڈوبے ہوئے امراء و عوام کو انداکمے حاکم، اللہ کے سائے، چاند اور تاروں کے بادشاہ اور ہفت اقلیم کے شہنشاہ ہونیکے دھوکے میں مبتلا کر رہے تھے اور پھر ایسے اصنام خیالی کو تخیل کی افیون دے رہے تھے جنکے سیاہ بال کمرے نیچے لہرا رہے تھے جن کے چہرے آفتاب وہ ماہتاب کو شرمندہ کر رہے تھے اور جنکے دہن و کمر معمہ بن کر رہ گئے تھے۔

یہ تھا وہ فکری افلاس جس میں اس زمانے کے ادیب مبتلا تھے پھر بھلا ان مفلسوں کا یہ گروہ جس کے پاس خود ہی صحت بخش غذا کا کوئی تخیل نہ تھا، قوم و ملت کو کس طرح سربلندی اور تنومندی کے سامان فراہم کرتا کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ تنزل کی یہ دوڑ کس مقام پر جا کر ختم ہوتی۔ اگر غدر کے ہنگامے صور اسرافیل بنکر تجدید حیات نہ کرتے۔ غدر نے ایک نشاۃ ثانیہ کا کام کیا۔ ایک نئے دور نے جنم لیا اور اردو ادب نے بھی ایک نیا موڑ اختیار کیا۔ غدر کے بعد سے آج تک کے تقریباً سو سالہ ادب کا جائزہ لیتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگرچہ اس عرصہ میں بھی پرانے پیر زادوں کے کچھ سجادہ نشین نسلاً بعد نسل اپنے شیوخ کی روایات کو تبرکاً قائم کئے رہے لیکن ملک و قوم کے آئے دن کے بدلتے ہوئے حالات اس امر کے متقاضی تھے کہ ادب کو بھی بہرحال کسی نہ کسی سوچے سمجھے مقصد کے ماتحت ہونا پڑے گا۔ اس کا احساس سب سے پہلے سرسید اور انکے رفقا کو ہوا جنھوں نے اردو ادب کو پہلی مرتبہ اصلاحی اور تعمیری مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ اس تجربے نے رفتہ رفتہ اس بات کو واضح کر دیا کہ ادب محض تفریح کے لئے نہیں ہے بلکہ اس سے بڑے بڑے تغیرات پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ یہ عقیدہ اور زیادہ راسخ اور مضبوط ہوتا گیا اور آج اردو ادب اس مقام پر پہنچ گیا ہے۔ جہاں اس کا ایک اور محض ایک مقصد رہ گیا ہے اور وہ مقصد ادب برائے تحریک اور برائے انقلاب ہے۔ خواہ یہ تحریک اشتراکی تحریک ہو۔ خواہ یہ تحریک اسلامی تحریک ہو۔ اب اس پوری ایک صدی کے ادب میں جہاں اور بہت سے رجحانات ملتے ہیں وہاں تین ایسے قوی رجحانات ہیں جو بہرحال بقیہ تمام رجحانات پر حاوی ہیں۔ انھیں کی بنا پر اس پوری صدی کے ادب کو تین واضح حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلا حصہ تو اس قوم پرستانہ ادب پر مشتمل ہے جو سرسید اور انکے رفقا کی کاوشوں کا نتیجہ ہے اور اس زمانہ کے بعد بھی کافی عرصہ تک اس کا سلسلہ جاری رہا۔ دوسرا حصہ ان رجحانات کا مرہون منت ہے جنھیں ترقی پسند رجحانات کہا جاتا ہے اور جس کی بدولت اس حصہ ادب کو ترقی پسند ادب اور اس کے مصنفین کو ترقی پسند مصنفین کہا جاتا ہے اس کا تیسرا اور آخری حصہ ان رجحانات کی بدولت ہے جنھیں اسلام پسند یا اسلامی رجحانات کہا جاتا ہے اور اس ادب کو "اسلامی ادب" اور اسکے مصنفین کو اسلام پسند ادیب کہا جاتا ہے۔ ان مختلف رجحانات میں اول الذکر کے نقوش اب تقریباً مٹ چکے ہیں۔ ترقی پسند رجحانات پچھلے دس پندرہ سال کی پیداوار ہیں۔ ابتدا میں اس ادب کا دائرہ بہت وسیع تھا لیکن اب رفتہ رفتہ ایک مخصوص انداز فکر تک محدود ہو کر رہ گیا ہے اسلامی رجحانات کم و بیش ہر زمانے میں رہے ہیں اور مشکل سے ہے کہ اس کو کبھی اسلامی ادب کا نام نہ دیا گیا ہو۔ اس نام دینے کی وجہ یہ ہوئی ہے کہ تقسیم ہند کے چند سال قبل یہ رجحانات بھی متحد و منظم ہو کر منظر عام پر آئے۔ غرض یہ کہ اب یہی دو قوی رجحانات اردو ادب میں پائے جاتے ہیں اور چونکہ یہ دونوں ہر لحاظ سے تقریباً ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس لئے ان کی کشمکش دن بدن ترقی کرتی جا رہی ہے۔

اس جگہ اگرچہ بحث صرف اسلامی رجحانات سے ہے لیکن ان کے تجزیے سے قبل ترقی پسند ادب پر بھی ایک سرسری نظر بیجا نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ بہرحال کم از کم اس وقت اسلامی ادب کا حریف ہے اور پھر اس سے زیادہ قدیم ہونے کی بدولت کافی ہمہ گیر ہے۔

ترقی پسند ادب کو نیا ادب بھی کہا جاتا ہے۔ حالانکہ ترقی پسند ادب پچھلے دس پندرہ سال کی پیداوار ہے اور اس کے برعکس نیا ادب سرسید ہی کے زمانہ میں جنم لے چکا تھا۔ بہرحال اس اصول کے ماتحت کہ ہر نئی چیز ایک زمانے بعد پرانی ہو جاتی ہے۔ یہ بات مان ہی لینی چاہیئے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ترقی پسند ادب کیا ہے؟ اس کے اہم موضوع کیا ہیں؟ اور اس کی بنائے فکر کیا ہے؟ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ دیکھنا زیادہ بہتر ہوگا کہ خود ترقی پسند ادیب اس ادب کے متعلق کیا کہتے ہیں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اپنی کتاب ادب اور انقلاب میں نئے ادب کے مقاصد کی توضیح ان الفاظ میں کی ہے۔ یہ وہ اعلان ہے جو ناگپور کے سالانہ اجلاس منعقدہ اپریل ۱۹۳۶ء میں پڑھ کر سنایا گیا۔

"احساس ہر قسم کے آرٹ کی جان ہے تو پھر غریبوں اور مظلوموں کا حال زار ہمیں بے حس کیونکر رکھ سکتا ہے؟ اگر زندگی کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہو کہ سماج کے چولے سے بیکاری اور افلاس کے داغ دھوئے جائیں تو شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ ادب کا اشارہ کس جانب ہو۔ وہ کیا کہے کن سے کہے۔ اور کس طریقے سے کہے چنانچہ ہندوستان

ں سے ہماری یہ توقع واجب اور جائز ہے کہ وہ ثابت کر دکھائیں گے
ب کی بنیادیں زندگی میں پیوست ہیں اور زندگی مسلسل تغیر و تبدل
انی ہے۔ زندہ اور صادق ادب وہی ہے جو سماج بدلنا چاہتا ہے
عروج کی راہ دکھاتا ہے اور جملہ نوع انسان کی خدمت کی آرزو
ہے .... ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ملک کا ادب زندگی سے
...کو وابستہ کرے گا اور زندگی کے ارتقا کا علمبردار ہوگا۔"

یہ ہیں وہ پاکیزہ مقاصد جنکا نیا ادب علمبردار ہے۔ لیکن اب یہ
نا چاہیئے کہ نئے ادب نے ان پاکیزہ مقاصد کو کس حد تک پورا کیا اور
انداز میں پورا کرنے کے لئے سرگرم ہے۔ نئے ادب[1] کے مطالعہ کے
سب سے پہلی چیز جو کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس ادب میں محض دو ہی
کے مصنفین کا لٹریچر ہے۔ ایک تو وہ ہیں جو کارل مارکس کے فلسفے
معتقد ہیں۔ اور اگر معتقد نہیں تو متاثر ضرور ہیں اور دوسرے وہ
ائڈ کے فلسفہ نفسیاتی تجزیہ پر ایمان لا چکے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر انداز
موضوع اور عنوان سب عقیدۂ اشتراکیت کے پابند ہیں۔ اس بات کا
ثبوت یہ ہے کہ ترقی پسند مصنفین کے زیر سرپرستی جتنے بھی ادبی رسائل
ہیں۔ ان میں تمامتر ان ہی عقائد کے لوگوں کو جگہ دی جاتی ہے حالاں کہ
کے ہمدردوں میں ایسے شعراء اور ادیب موجود ہیں جن کے دلوں میں
دردوں کا درد بھی ہے جو افلاس سے متنفر ہیں اور موجودہ سماج کو بالکل
دینا چاہتے ہیں لیکن ترقی پسندوں میں ان کا نام شامل نہیں ہے مثلاً
بال، چکبست، حسرت، سرشار، ابوالکلام آزاد، پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، جان
ش اور اس طرح کے کتنے ادیب ہیں جو نئے دور کی پیداوار ہیں۔ اور
ہی خیالات کے علمبردار ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ان مصائب و
مسائل کا حل محض مارکس کے فلسفہ میں نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ
ترقی پسند ادب کو بیشتر اشتراکی ادب بھی کہتے ہیں اور ان کا یہ کہنا کچھ
غلط نہیں معلوم ہوتا۔

ترقی پسند اشتراکی ادب کے اس مختصر تعارف و توضیح کے بعد ایک
نظر انکے اہم موضوعات پر بھی ڈالنی ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے
یہاں ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے زندگی کا اصول نظر آتا ہے۔
اختر حسین رائے پوری کہتے ہیں ہمارا خیال ہے کہ ادب کے مسائل
کو زندگی کے مسائل سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی مکمل اکائی ہے
اسے ادب، فلسفہ، سیاست وغیرہ کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ بلا
شبہ اس سے زیادہ جاندار تصور ادب کا اور کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن جس طرح
متقدمین نے اس تصور کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا تھا اسی طرح نئے ادب کے
علمبرداروں نے بھی تصویر کے محض ایک ہی رخ پر اکتفا کر لیا اور پھر زندگی
کے بے شمار مسائل میں سے صرف چند ایسے مسائل پیش کرنے کی زحمت
کی جنکا انکے مقاصد سے براہ راست تعلق ہے اور پھر جس انداز میں پیش
کیا وہ انتہائی گھناؤنا اور مکروہ ہے۔ زندگی ایک مکمل اکائی کی حیثیت
ضرور رکھتی ہے۔ لیکن اس کی ترکیب میں بہت سے دوسرے عناصر بھی
شامل ہیں۔ مثلاً جس جاندار چیز کو انسان کہا جاتا ہے وہ اپنی جسمانی وحدت
کے ساتھ دل، دماغ اور جسم کا مجموعہ ہے جو آگے چل کر پھر کئی مختلف اعضا
میں منقسم ہوتا ہے۔ ان تینوں حصوں کے کام مختلف ہیں اور کسی ایک چیز
کا کام دوسرے سے نہیں لیا جا سکتا..... زندگی درحقیقت ان سب کے
باہمی ربط اور توازن کے بدولت قائم رہتی ہے۔ اسی طرح ادب کے بھی
مختلف لازمی اجزا ہیں۔ جنکا اگر مناسب امتزاج قائم نہ رکھا جائے تو اس کا
حال اسی انسان جیسا ہوگا جس کا دماغ اور دل تو صحیح ہو مگر جسم مفلوج ہو
یا جسم و دل صحیح ہو مگر دماغ خراب ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسے انسان پر رحم تو کیا
جا سکتا ہے مگر اس کو کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ یہی وہ توازن ہے
جسکو نئے ادب نے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا ہے اور جس کی بدولت نیا ادب
ایک ایسا جسم ہو کر رہ گیا ہے جس کے اندر روح نہ ہو۔

لطف کی بات یہ ہے کہ ادب اور زندگی کے مسائل کو ایک دوسرے
سے منسلک کرنیکے بعد ترقی پسند ادیب تخیلیت (Idealism)
کو مد فضول سمجھتے ہیں اور محض حقیقت نگاری ہی کو ادب کے لئے جائز اور
درست سمجھتے ہیں۔ زندگی سے تخیلیت (Idealism) کا تعلق
تو خیر ایک طویل بحث ہے۔ لیکن خالص حقیقت نگاری کے یہ دعویدار بھی
قوم کے محض ایک طبقے کے چند مصائب کی حقیقت ہی کو بیان کرنے کے
بعد خاموش ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ قوم کی اجتماعی زندگی میں جہاں

---

[1] نئے ادب سے یہاں مراد ترقی پسند ادب ہے (اپنے محدود Sense میں)

مزدوروں کی مظلومیت، کسانوں کی مفلسی۔ مہاجنوں اور سرمایہ داروں
کی زیادتی شامل ہے۔ وہاں دوسری بے شمار اخلاقی، معاشرتی اور سماجی
حقیقتیں بھی موجود ہیں لیکن نئے ادب میں دبی زبان سے بھی اس کا ذکر کہیں
نہیں ملتا ممکن ہے کہ ان حقیقتوں میں بہت سی چیزیں مکروہ اور شرمناک
بھی ہوں۔ بہت سے عقائد فاسد ہوں بے بنیاد بھی ہوں لیکن بہر کیف ان
کا موجودگی اس کی متقاضی ہے کہ اس کا بھی ذکر ضرور ہو۔

عورت بھی ترقی پسند ادب کا ایک بہت ہی اہم موضوع ہے
اگرچہ اس کے بہت سے مسائل اجتماعی زندگی اہم مسائل ہیں لیکن ترقی
پسند ادیب کی نظر ان پر مطلق نہیں پڑتی۔ وہ فرائڈ کے فلسفہ نفسیاتی تجزیے
سے فیض یاب ہو کر جنسی بھوک کا تذکرہ تو بہت مزے لے لیکر کرتے ہیں
لیکن زمانہ قدیم سے عورت کے مقام کو جس قدر پست بنا دیا گیا ہے اور زمانہ
حال میں عورت کے مقصد کو جس قدر شرمناک بنا دیا گیا ہے اسکی اصلاح
کے لئے کچھ بھی نہیں سوچ سکتے۔

پھر جس طرح اشتراکیت کی بنا اور اس کا دارومدار روٹی اور صرف
روٹی پر ہے اسیطرح نئے ادب کا بنیادی تصور بھی یہی ہے۔ یہاں اس
پر بحث کی گنجائش تو نہیں ہے کہ یہ تصور کس حد تک درست یا غلط ہے
لیکن اس تصور پر نئے ادب کے مشہور نقاد کا قول بے جا نہ ہوگا۔

"اقتصادیات کل زندگی نہیں ہے بلکہ اس کا صرف ایک عنصر ہے
جو لاکھ اہم سہی۔ مگر کسی دوسرے عنصر پر غالب نہیں ہو سکتا۔ یہ سچ ہے کہ بغیر
روٹی کے کوئی زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہ سکتا لیکن پھر وہ صدیوں پرانی
مثل بھی ابھی تک بدستور سچ ہے کہ انسان صرف روٹی سے زندہ نہیں رہ
سکتا۔ (مجنوں گورکھپوری)

ایک خاص چیز جو بہت ہی نمایاں نظر آتی ہے اور خصوصاً افسانہ
نگاروں میں وہ فرائڈ کے فلسفہ نفسیاتی تجزیہ کا اثر ہے۔ نفسیاتی تجزیہ بذات
خود کوئی بری چیز نہیں ہے لیکن اگر یہی ادب کی غرض اور مقصد بن جائے تو
پھر اس کی حیثیت ایک متعدی مرض کی ہو جاتی ہے جو ادیب کے مریض جسم
کے ذریعہ پوری قوم میں پھیلنا شروع کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نئے ادب کے
بیشتر افسانہ نگاروں کے کردار جذباتی تعیش کے ایسے مریض ہوتے ہیں کہ انکی
زندگی ایک پوشیدہ راز و معمہ بن کر رہ جاتی ہے۔

اس کے علاوہ نئے ادب کا بیشتر سرمایہ کچھ اجنبی معلوم ہوتا ہے اس
کی بڑی وجہ مغرب کی اندھی نقالی ہے۔ مغرب سے متاثر ہونا ایک اور چیز ہے
مگر ان کے ہر رطب و یابس کو نگل لینا ایک دوسری چیز ہے اور اسی وجہ سے
نئے ادب میں یہ کیفیت پیدا ہو گئی ہے کہ خیال، مضمون، کردار، یہاں تک کہ
زبان بھی دوسرے کی معلوم ہوتی ہے اور یہ قول بڑی حد تک درست معلوم
ہوتا ہے کہ ترقی پسند ادیب "پراوسٹ اور لارنس کے بار بار چبائے ہوئے
لقمے نگلتے ہیں، ہضم نہیں کر سکتے۔ باہر نکال دیتے ہیں۔ اور ایسی صورت میں
دیکھ دیکھ کر کراہت آتی ہے اور جب کہا جاتا ہے کہ آپ نقالی کرتے ہیں تو برا
مانتے ہیں......... پراوسٹ، لارنس، چیخوف، ڈسٹوفسکی یا زولا کو
سر چڑھانے سے ادب پیدا نہیں ہوتا۔ کچھ اپنی پونجی ہونی چاہیئے۔
("کشن پرشاد کول")

نشاۃ جدیدہ (Renaisance) کے بعد مغرب
میں پرانی اخلاقی قدروں کو کھرچ کھرچ کر نکالنے کی ایک مکمل کوشش شروع ہوئی
نیا ادب بھی اسی پر کمر بستہ نظر آتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ موتری، پیشاب، چائے
کی پیالی۔ بلاؤز۔ خوشیا۔ پھاہا۔ لحاف۔ جال، دھواں، کالی شلوار یا
اور اسی قسم کے دوسرے افسانوں اور ناولوں سے ادب کا کونسا مقصد
پورا ہوتا ہے یا زندگی کی کس حقیقت کی رونمائی ہوتی ہے۔ اس سلسلہ
عریاں نگاروں کے میر کارواں منٹو کا نظریہ سننے کے قابل ہے
"سمجھ لیجئے کہ مجھ میں جو (Pervection) (غیر فطری
حرکات) ہیں مجھ میں جو برائیاں ہیں وہ اس عہد کی برائیاں ہیں۔"

عجیب و غریب نظریہ ہے۔ اولاً تو یہ زبردستی سمجھ لینے کی کوئی
نہیں ہے۔ اس قسم کی برائیاں کم و بیش ہر عہد میں ہوا کرتی ہیں اور ادیب
فرض ہے کہ وہ ان کی نشان دہی و اصلاح کرے۔ لیکن ان کی عکاسی
انداز میں کرنا کہ لوگ متنفر ہونے کے بجائے ان میں لطف محسوس کریں
انسانیت کے درد رکھنے والے ادیب کا کام نہیں ہو سکتا ہے بلکہ انسانیت
کے دشمن کا کام ہو سکتا ہے۔ معاشرے میں اگر سڑتے ہوئے پھوڑے
موجود ہیں تو بھی یہ کیا ضروری ہے کہ وحشیوں کے طریقہ پر انھیں ہر طرف
کر دیا جائے۔ اس میں سے پیپ اور مواد اور بیچ بجاتے ہوئے کیڑے
کر تکلیف کو اور بڑھایا جائے اور پھر اس پر رکھنے کے لئے کوئی،

رہم نہ مہیا کیا جائے۔ درد کے مداوے ہی کی وہ کمی ہے جس سے ترقی پسند ادب بھی تک مطلق عہدہ برآ نہ ہو سکا اور ظاہر ہے کہ یہ بہت بڑی کمی ہے، پرانے ادب میں اگر عریاں نگاری ملتی ہے تو بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ زمانہ جاہلیت اور انحطاط کا تھا۔ مگر اب اس عروج اور روشنی کے زمانہ میں اس کا کیا جواب ہے اور پھر اس کا چٹخارہ لینا کیا مذاق سلیم کے خلاف ہے؟

اس تجزئے کے بعد بھی ایک بڑا اہم سوال بالکل تشنہ رہ جاتا ہے کہ آخر یہ ادب کس شعور کی پیداوار ہے۔ اس سلسلہ میں بھی چائے کی پیالی پھسلن اور حرامجادی کے مصنف ... عسکری کی زبان سے سنیئے۔

"میں اس دور کے مداحوں اور حامیوں میں سے ایک ہوں اسلئے شاید مجھے کچھ گستاخی کی اجازت بھی ہو گی .... موجودہ ادبی تحریک کم ازکم اپنے ابتدائی زمانہ میں اثبات نہیں بلکہ انکار کے دھارے پر آگے بڑھی ہے " .... پھر تخلیق کے اصول اور خالق کا حال بھی سنیے "تخلیق کا اصول یہ ہے کہ پہلے موضوع کو پوری شدت کے ساتھ ایک چمکتے ہوئے نقطے کی طرح محسوس کیا جائے لیکن اس کے پہلے رُوحانی کاوش کی ضرورت ہے جس سے بڑے بڑوں کو پسینے آجاتے ہیں۔ میں ٹھیرا سہل انگار اور تن آسان پھر میرے نفس مضمون نے مجھے اور ڈھیل دے دی مگر اب تو میں نے محسوس کیا ہے کہ خالص نفسیاتی اور تخلیقی افسانہ اپنی منطقی حدوں تک پہنچ کر جاسوسی ناول بن جاتا ہے جس میں دلچسپی کے عناصر نہیں ہوتے......... ان تمام نظموں، افسانوں، ناولوں اور ڈراموں میں سے جو آج تک میں نے پڑھے ہیں صرف ایک جیسے حسن کو میں نے اپنی روح کی گہرائیوں میں محسوس کیا ہے اور وہ چیخوف کا افسانہ "اسکول مسٹرس" ہے یہ خالص موسیقی ہے اور میں اس کوشش میں رہا ہوں کہ یہی نغمگی اپنے افسانوں میں پیدا کرسکوں لیکن کہیں پھٹی ڈگڈگی سے "نغمۂ سیارگاں" نکلا ہے کم از کم اس اعتراف شکست کی تو داد دینی ہی پڑے گی۔ آگے چل کر کتنے پتے کی بات کہتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ حسن معنوی ہو یا حسن صوری سب روح کے سانچے میں ڈھلتا ہے کسی لکھنے والے میں سب سے بڑی چیز دیکھنے کی یہی ہوتی ہے کہ وہ کتنی گہرائی سے بول رہا ہے۔ لیکن نہ تو میرے دماغ کو باریکیوں اور لطافت کی سمجھ ہے اور نہ میری روح میں گہرائی ہے اور نہ نوٹ۔ ادب کے موجودہ جنسی ہیجان کا جواز موجود ہی لیکن بڑی حد تک یہ طوفان لوگوں نے خود اپنی پھونکوں سے بنایا ہے اور اس طوفان سے نہ درخت اور مکان نہیں اکھاڑے ہیں۔ بلکہ مرغی کے پر۔ اس طوفان نے فائدہ بھی پہنچایا ہوگا۔ مگر اس شوں شوں پھوں پھوں میں بہت سے نغمہ ہائے زیر لبی دب کر رہ گئے .... گندی سے گندی بات اچھے سے اچھا ادب بن سکتی ہے۔ مگر جنسیت سے مغلوب ہو کر بڑا ادب پیدا نہیں کیا جا سکتا"۔

ذرا اور آگے چل کر چائے کی پیالی کے متعلق ارشاد ہوتا ہے "چائے کی پیالی ضرور فحش نگاری کی حدود میں آجاتا ہے اس کے بعض حصے پڑھتے ہوئے مجھے شرم آنے لگتی ہے۔ اگر اس افسانے کی مجموعی کیفیت کا کوئی نام ہو سکتا ہے تو ——— رومانی فیل یا ——— اسے پڑھ کر مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے چار آنے والے تھیٹر کا سخر اٹانڈ پر پانس بیٹ بیٹ کر اشتہار دینے کے لئے اپنے پاس کھڑی ہوئی عورت کے کپڑے اتارنا شروع کردے۔ ایک کے بعد دوسرا اور دونوں میں کوئی شرم محسوس نہ کرے بلکہ مسکراتے رہیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ قمیص کے نیچے سے کپڑے کی دو گیندیں نکلیں جو کہ عورت سے بھی زیادہ فحش چیز ہے"۔

اس فحش نگاری کی ضرورت کیونکر محسوس ہوئی۔ یہ بھی سن لیجئے ان ساری کمزوریوں کی جڑ یہ ہے کہ نہ تو میری روح میں شدت ہے۔ نہ میرے جذبات میں گہرائی۔ اور نہ مجھے ان پر اعتماد۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ میں لوگوں کو صرف سادہ پانی سے مطمئن کرسکوں گا۔ اس لئے میں نے اس میں تھوڑی سی شراب بھی ملائی ہے .... یہ بھی میں جانتا ہوں کہ روح عصر کے اظہار کے لئے سرسامی اور وحشیانہ الفاظ کی ضرورت ہے لیکن پھر بھی میں اس مقولے کی سچائی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ "دیوتا گہرائی چاہتے ہیں روحانی آشوب نہیں" اور خصوصاً ادب کے دیوتا جو لوگ محسوس کرتے ہیں وہ لفظوں کے شور کی مدد نہیں مانگتے۔

ذرا اس نئے ادب کے غالب عنصر کے پس منظر کا جو تقریباً مغربی ہے تجزیہ بھی عسکری صاحب ہی کی زبان سے سنیئے۔

"اور ان دو جذبوں (تنہائی اور تغیر) کے پیچھے اور بھی بہت سی چیزیں آئی ہیں۔ ناقابل بیان افسردگی، بے حد وحساب دیوانگی، ناقابل علاج مایوسی، بے نام خوف، مبہم تمنائیں، کبھی سیر نہ ہونے والی آرزوئیں ——— اور عصبی خلل، یہی وہ مدارج ہیں جو مغربی ادب نے رومانیت سے

ادت کے بعد طے کئے ہیں۔ جو تحریک انتہائی حقیقت پسندی کے ساتھ
روع ہوئی تھی وہ انتہائی دیوانگی پر ختم ہوتی ہے۔ کم و بیش یہی رجحان اردو
نئی ادبی تحریک کا ہے ...... دراصل ہمارے نظام زندگی نے
ہمارے اندر ایک زنانہ پن اور انفعالیت پیدا کر دی ہے اور ہمارے
جود کی مرکزیت بالکل غارت ہو چکی ہے۔ اسی نسائیت نے ادب میں
تاثیریت کو پروان چڑھایا ہے۔ ہم زندگی کو ایک وحدت کی طرح سوچنے
سمجھنے کی تاب نہیں رکھتے۔ ہمیں پینک میں جھونکتے رکھنے کے لئے
صرف ایک تاثر چاہیئے۔ ہم تاثر کی مدافعت نہیں کرتے۔ نہ جانچ پڑتال
ہر وہ تاثر جو ہوا میں اڑتا ہوا ہماری طرف آجائے ہم اسے اپنے اوپر مسلط ہو جانے
دیتے ہیں .... جو کچھ میں نے پیش کیا ہے اس میں خلوص
تو ہے مگر زندگی کے بنیادی مسائل سے بے تعلق ہونے کی وجہ سے
انسانیت کے لئے زیادہ اہم اور ضروری نہیں ہے اور نہ ایسا نیا ہے
جو رومانی کیفیتیں میں نے پیش کی ہیں وہ مغربی ادب میں روزمرہ کی چیزیں ہیں
اگر اردو کے ادیب اسی روش پر چلتے رہے تو شاید ہم کبھی بھی کوئی نئی چیز
نہیں پیش کر سکیں گے۔ ہاں مغربی ادب کا مشرقی ایڈیشن ضرور تیار
کر دینگے۔

یہ نیا ادب ہے جس کے مقاصد کی وضاحت اختر حسین رائے
پوری نے کتنے شاندار الفاظ میں کی تھی اور یہ اسی نئے ادب پر ایک نئے
ادیب کے ارشادات ہیں۔ درحقیقت ترقی پسند ادب کے پیش کردہ تخیلات
کا یہ انداز بذات خود اسی معاشرے کی گندگی بن کر رہ جاتا ہے اور یہ ادیب
معاشرے کے ان گندے گلے اور سڑے بیمار جسموں کو ننگا کرنے میں
کچھ ایسا لطف لیتے ہیں اور مزے لے لے کر اس کے پیپ اور لہو میں
لوٹتے ہیں جو اپنی کراہٹوں کے ساتھ ساتھ ان کے اندر مریضانہ تعیش کی
نشاندہی کرتا ہے تقریباً یہی حال شاعری میں بھی ہے۔ بلکہ بسا اوقات اس سے بھی بدتر

(باقی)

مُفرّح فولادی

قوت اور طاقت کیلئے بیش بہا تحفہ

نیا اور تازہ خون پیدا کرتا ہے وزن بڑھاتا اور ہڈیوں کو مضبوط
کرتا ہے۔ قوت و طاقت بخشتا ہے کھانا ہضم کرکے بھوک بڑھاتا ہے
خوراک: کھانے کا ایک چمچہ روزانہ تین چار مرتبہ کھانے کے بعد
استعمال کریں۔ بچوں کے لئے نصف خوراک۔
قیمت فی شیشی دو روپے آٹھ آنے

تیار کردہ
حاذق دواخانہ بندر روڈ، کراچی نمبر (۱)
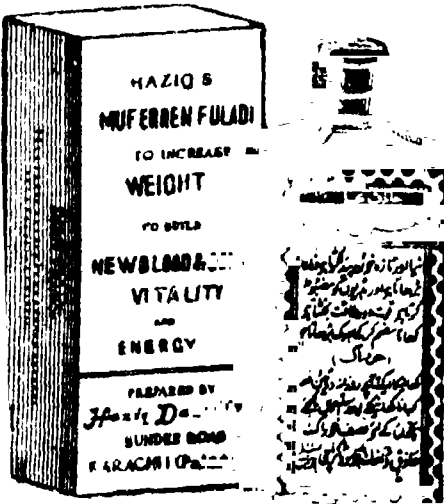
سعید عقاب •

تعمیر پسندوں کے نام!

(۱)

یہ کیسا انقلاب ہے یہ کیسا اختیار ہے
نظامِ کائنات میں عجیب انتشار ہے
فلک پہ بزمِ کہکشاں بھی آج سوگوار ہے
کہ ایک بھائی دوسرے کی آستیں کا مار ہے

(۲)

بہیمیت کے راستے پہ رہزنوں کا کارواں
ستم کی ڈولیوں کو دوش پر لیے ہے یوں رواں
لرز رہے ہیں ہر قدم پہ یہ زمین و آسماں!
بشر بنا ہے بھیڑیا، درندگی ہے حکمراں
وطن کی وسعتوں پہ خیمہ زن ابھی غبار ہے
خزاں بہار میں ہے اور لٹی ہوئی بہار ہے

(۳)

زمین سُرخ ہو گئی لہو بہا عوام کا!
انھیں دیا گیا ہے آج مرتبہ غلام کا
سزا کا معاوضہ ملا ہے ان کے کام کا
تو کیوں نہ انکے دل میں جذبہ جاگے انتقام کا
جفا کے دیوتاؤں کے خلاف یہ پکار ہے
جبینِ ارض پہ وجود ان کا داغدار ہے

(۴)

چراغِ راہِ زندگی کو آ رہی ہیں ہچکیاں
سوار ہیں گھٹا کے دوش پر سیاہ آندھیاں
نتائجِ نفاق ہیں یہ خوں کی بہتی ندیاں!
لہو کا انعکاس ہے جو چھا رہی ہیں سرخیاں
زمین خونِ بیکساں سے آج لالہ زار ہے
غرضکہ دہر میں عجیب دورِ انتشار ہے

(۵)

بکھیر دو فضا میں بڑھ کے امن کے لطیف گیت
جو شر پسند ہیں انھیں بتاؤ زندگی کی ریت
گلے لگاؤ غمزدوں کو اصل میں یہی ہے جیت
اٹھو کہ وقت ہے یہی کہیں یہ رُت نہ جائے بیت
اک انقلابِ نو کا پھر جہاں کو انتظار ہے
سکون اور سلامتی کا جس پہ انحصار ہے

(معیار)

بیکل یزدانی

اک گزارش مؤدبانہ ہے!

کس کے منہ میں زبان ہے جو کہے — آپ کا دور جابرانہ ہے!

آپ کو فکر ہے غریبوں کی — آپ کا جبر مشفقانہ ہے!

آپ حاکم ہیں! آپ مالک ہیں — آپ کا قول منصفانہ ہے!

یاد آتے ہیں، آپ کے وعدے — کیا حقیقت تھی کیا فسانہ ہے!

بے حیائی کو ہو رہا ہے فروغ — خدمتِ دین! کا بہانہ ہے!

قوم کی بیٹیاں! برہنہ ہیں! — یہ ترقی کا شاخسانہ ہے!

دخترِ ایشیا! مبارک باد — جو ادا ہے فرنگیانہ ہے!

کفر کو ہے فروغ "دیں" کو زوال — کیوں نہ ہو! آپ کا زمانہ ہے!

اہلِ حق سے ہے آپ کو پرخاش — اہلِ باطل سے دوستانہ ہے!

جو توجہ ہے! بے نیازانہ — جو عنایت ہے غاصبانہ ہے!

آپ تو ماہرِ سیاست ہیں! — آپ کی چال شاطرانہ ہے!

لب پہ اسلامیت کے دعوے ہیں — اور انداز کافرانہ ہے!

جو قدم ہے برائے بیت ہے اب — جو نظر ہے وہ طائرانہ ہے!

ہاں مگر ایک بات کہنی ہے
اک گزارش مؤدبانہ ہے

قوم کا رخ بدل چکا سرکار! — قوم ہر چند بے ٹھکانہ ہے!

خوابِ غفلت کا دور ختم ہوا — عزم بیدار کا زمانہ ہے!

دیکھتا ہوں جبینِ فاقہ کشاں — جو شکن ہے وہ باغیانہ ہے!

میرے افکار درسِ بیداری — میری تنقید مخلصانہ ہے!

نظمِ بیکل کو نظم کیوں کہیے
اہلِ غیرت کو تازیانہ ہے!

محمود فاروقی

احساسات و مشاہدات

حدِ فاصل — جو دو ملکوں کو جدا کرتی ہے

یہ لکیر دو ملکوں کی سرحد کا تعین کرنے والی ایسی لکیر نہیں تھی جو صرف زمینی حدود کا تعین کرتی ہے اسکو محکمۂ پیمائش کے افسروں نے اپنی جریبوں کے ذریعہ نہیں کھینچا تھا ——— بلکہ یہ چمکتی ہوئی روشن لکیر لکیر بھی جو دو زندگیوں کے درمیان حد قائم کرتی ہے اور جسے دو ملکوں کے رہنے والے باشندوں نے اپنی جذبات اپنے اعتقادات اور اپنے ارادوں سے کھینچا تھا۔

میں دو ہمسایہ ملکوں کی سرحد پر کھڑا ہوا تھا۔ میرے پیچھے وہ ملک تھا جہاں میں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ گزارا تھا اور میرے سامنے وہ ملک تھا جہاں مجھے ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا تھا ——— رات اگرچہ تاریک تھی لیکن پھر بھی مجھے ان دونوں ملکوں کے درمیان ایک حدِ فاصل روشن لکیر کی طرح کھنچی ہوئی نظر آرہی تھی۔ یہ لکیر دو ملکوں کی سرحدوں کا تعین کرنے والی ایسی لکیر نہیں تھی جو صرف زمینی حدود کا تعین کرتی ہے۔ بلکہ چمکتی ہوئی روشن لکیر وہ لکیر بھی جو دو مختلف و متضاد زندگیوں کے درمیان حد قائم کرنے اور انکے باہمی فرق کو واضح کرنے کے لئے کھینچی گئی تھی۔ اسے محکمۂ پیمائش کے افسروں نے اپنی جریبوں کے ذریعہ نہیں کھینچا تھا بلکہ اسے دو ملکوں کے رہنے والے باشندوں نے اپنے جذبات، اعتقادات اور اپنے ارادوں کے ذریعہ کھینچا تھا۔ میں مسرتوں اور اندیشوں کے درمیان اس چمکتی ہوئی لکیر کو دیکھنے میں محو تھا کہ میرے ایک ہم سفر نے اشارہ سے بتایا دیکھو پاکستان کی سرحد اس پتھر سے شروع ہوتی ہے۔ ایک سفید پتھر موہوم سے نقطے کی طرح نظر آیا لیکن اندھیرے کے باوجود میں نے واضح طور پر لکھے ہوئے حروف کو پڑھ لیا ——— "قرار دادِ مقاصد" اور میرا دل خوشی کے مارے جھوم اٹھا میں ایک ایسی سرزمین سے آرہا تھا جہاں کے رہنے والے باشندے اپنی دستوری زبان میں یہ اعلان کر چکے تھے کہ وہ اس ملک کے مالک و مختار ہیں اور ان ہی کی مرضی اور پسند کے مطابق اس ملک کی زندگی کا نقشہ بنایا جائے گا۔ اس تصور کو بسنے کے لئے میں ——— ان لوگوں کے ساتھ مل کر خون پسینہ ایک کرتا رہا۔ جو اپنے ملک کے عوام کو انسانی سامراج سے چھٹکارا دلا کر خدا کی رحمتوں والے نظام سے آشنا کرنا چاہتے تھے اور اس جد و جہد کے تقاضوں نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں سرحد کے اس پار سے اس پار چلا جاؤں اور میں ہزار دقتوں و مشکلوں کے باوجود چل پڑا۔ میری پیٹھ پر پچھلے تجربوں کا ایک بوجھ لدا ہوا تھا۔ اور میرے سامنے تاریکی میں لپٹی ہوئی ایک نئی سرزمین مجھے اپنی حدود میں سمو لینے کے لئے بے چین نظر آرہی تھی۔ وہ سرزمین جہاں کے رہنے والے باشندوں نے پوری دنیا کے سامنے یہ ذمہ دارانہ دستوری اعلان کر دیا تھا کہ وہ اللہ کے مطیع و فرمانبردار رہنا چاہتے ہیں اور زندگی کا ایک ایسا نقشہ بنانا چاہتے ہیں جس سے انسان اپنے جیسے انسانوں کا غلام نہیں رہ سکتا۔ میں نے سرحدی پتھر پر اس اعلان کو چمکتے ہوئے دیکھا ——— "قرار دادِ مقاصد" اور پھر ایک بار وہ روشن لکیر حدِ نظر تک پھیل گئی اور میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ آگے قدم بڑھائے۔

ٹھیر جاؤ۔ ایک آواز سنائی دی اپنے سامان کی تلاشی دو۔

ہم نے خاموشی کے ساتھ اپنا سامان کھول کر رکھ دیا۔ تلاشی کا یہ مرحلہ ختم ہو گیا۔ میرا کچھ سامان تھا۔ میں اس کی ڈلیوری لینے کیلئے لگیج آفس گیا۔ جو کلرک وہاں متعین تھا اس نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا اور کہا میں رجسٹر بند کر چکا ہوں۔ کل صبح سے پہلے آپ کو ڈلیوری نہیں مل سکتی۔ گاڑی چھوٹنے میں

نصف گھنٹہ رہ گیا تھا اور تتی رات کو اپنے اہل وعیال سمیت اس خطرناک
سرحدی اسٹیشن پر ٹھیرنا میرے لئے ناممکن تھا میں نے اس سے کہا آپ کی
ڈیوٹی شاید اسی لئے تو لگائی گئی ہے کہ آپ مسافروں کے سامان کی اسی
وقت ڈلیوری دیں۔ جواب میں اس نے کہا جی آپ کس خیال میں ہیں سیدھی
بات یہ ہے کہ جاتے جاتے اپنے ہاتھ کا کچھ میل یہاں چھوڑتے جائیے۔ ورنہ
پھر کل تک ہمارے مہمان رہئیے۔ مجھے ان کا مہمان رہنا منظور نہیں تھا اس
لئے میں نے اپنے ہاتھوں کو مل کر بڑی مشکل سے تھوڑا اسامیل نکالا اور اس
کے حوالہ کر دیا۔ اس نے پانچ روپے کے نوٹ کو اپنے پاکٹ میں رکھتے ہوئے
کہا چلئے صاحب چھٹی ہوئی۔ بہت جلد معاملہ طے ہوگیا۔ میں نے سامان
کی رسید لیتے ہوئے جواب دیا چھٹی تو ہوگئی۔ لیکن بابو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ ابھی یہ معاملہ پوری طرح طے نہیں ہوا ہے۔ طے تو اسی وقت ہوگا جب ہم اس
دنیا سے رخصت ہونگے اور پوچھنے والا آپ سے پوچھے گا کہ بغیر کسی حق کے آپ نے
یہ "کالا ٹیکس" کیوں وصول کیا ـــــــ بابو تھوڑی دیر خاموش رہا اور
پھر بولا ٹھیک کہتے ہو جی۔ مرنے کے بعد وہ پوچھے گا ضرور لیکن کیا کیا جائے
یہ پیٹ کسی طرح نہیں مانتا۔ ٹھیک کہتا تھا بے چارہ۔ اس کا پیٹ اس کا
کہا مان بھی کیسے سکتا تھا جب کہ اس نے اس کے تمام ہم وطنوں نے پہلے کر دیا
تھا کہ وہ پیٹ بھرنے والے کا کہا نہیں مانیں گے بلکہ اپنے پیٹ اور اپنے نفس
ہی کے کہنے پر عمل کریں گے۔

سرحد کے اس پار تو ایسا نہیں ہوگا ـــــــ میں نے سوچا اور
میری نظریں ..... سرحد پر چمکتی ہوئی اس روشن حد فاصل پر سے پھسلتی ہوئی
سفید پتھر پر جم گئیں جس پر رہ رہ کر "قرارداد مقاصد" والے حروف چمک رہے تھے
اور چمک چمک کر کہہ رہے تھے ہاں سرحد کے اس پار ایسا نہیں ہونا چاہیئے
ایسا نہیں ہوگا۔

میں نے ایک آخری نظر پیچھے چھوڑی ہوئی سرزمین پر ڈالی اور قدم
آگے بڑھا دیئے۔ کچھ دیر بعد ہم پاک سرزمین کے پہلے اسٹیشن درشنا پر تھے
گاڑی رکی اور پھر ایک مرتبہ تلاشی کا سلسلہ شروع ہوا۔ سامان کھولے گئے
دیکھے گئے۔ اور پھر سے باندھ لئے گئے۔ میں نے تو اپنے دل کے دروازے بھی
کھول دیئے تھے کہ تلاشی لینے والے اچھی طرح تلاش کر لیں کہ کہیں کفر والحاد
کا کوئی ذرہ میرے دل کی تہوں میں چھپا ہوا تو نہیں آ رہا ہے اور اگر کوئی ذرہ بھی
گیا ہو تو وہ اسے نکال پھینکیں تاکہ میں پاک سرزمین میں پاک دل کے ساتھ داخل ہو
جاؤں۔ لیکن انھوں نے میرے دل کی تلاشی نہیں لی۔ شاید وہ بہت زیادہ
مصروف تھے۔ یا ان کو مجھ پر کافی اعتماد سا ہوگیا تھا کہ میں ایسی کوئی ناجائز چیز
اپنے دل میں چھپا کر نہیں لے جا رہا ہوں۔ تلاشی کے بعد دوسرا مرحلہ سامان
کو دوبارہ بگیج کرانے کا تھا۔ چنانچہ میں بگیج آفس گیا۔ میرا سامان اتارا جا چکا تھا
اور وزن کرنے والی مشین پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ سامان اتارنے
کی آپ نے زحمت کیوں کی۔ میرے پاس رسید موجود ہے اور اس پر وزن درج
ہے۔ جواب ملا کہ وہ رسید معتبر نہیں۔ دوبارہ وزن ہوگا۔ کچھ دیر میں وزن کر دیا
گیا۔ میں نے چٹاگانگ تک بگیج کرنے کی درخواست کی۔ بگیج آفیسر نے کچھ دیر
انتظار کرنے کے لئے کہا اور باہر چلا گیا۔ میں اس کا انتظار کرتے کرتے تھک
گیا۔ اب گاڑی کے چلنے میں بس پندرہ منٹ ہی کی دیر تھی اور میرے بیوی بچے
ڈبہ میں بیٹھے ہوئے انتظار کر رہے تھے۔ میں گھبرا کر دفتر سے باہر آیا اور بمشکل
بگیج افسر کو ڈھونڈ کر نکالا۔ اس نے درشتی کے ساتھ بنگالی لہجہ میں کہا جناب
اب آپ کا سامان بگیج نہیں ہوگا۔ آپ کو دوسری گاڑی سے جانا پڑے گا اور
پھر اس نے مجھے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا اور ان نظروں کے پیچھے کوئی
مفہوم چھپا ہوا تھا۔ آہ! وہی مفہوم جسے میں بھارت کی آخری سرحد پر ایسی
ہی نظروں کے پیچھے دیکھ کر آیا تھا ـــــــ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے
اپنے اطراف واکناف پر نظریں ڈالیں۔ کیا میں حد فاصل کے اس پار نہیں
آگیا ہوں؟ کیا میں ابھی بھارت ہی میں ہوں؟ گھبرا کر میں نے اپنی پشت
پر دیکھا۔ دور سرحد کے قریب ایک روشن لکیر پھیلی ہوئی تھی اور ایک موہوم
پتھر پر "قرار داد مقاصد" کے حروف رہ رہ کر چمک رہے تھے ـــــــ لیکن
سرحد کے اندر ہی پاک سرزمین کی آغوش میں چاروں طرف تاریکی ہی
تھی اور سفید کپڑے پہنے ہوئے بگیج آفیسر معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھ رہا
اتنے میں گاڑی نے سیٹی دی۔ اور میں نے دوڑ کر اپنے بیوی بچوں کو اسٹیشن
پر اتار لیا۔ تینوں بچے نیند میں مدہوش تھے ـــــــ اور میری بیوی
فارم پر حیران کھڑی ہوئی گزرتی ہوئی گاڑی کو پریشانی کے ساتھ دیکھ رہی
صبح ہونے میں ایک دو گھنٹہ کی دیر تھی۔ پلیٹ فارم پر کارواں سے چھوٹا
مختصر سا مہاجر خاندان پڑا ہوا تھا اور سوچ رہا تھا کہ شاید اب ہم بھارت
پاکستان میں داخل نہیں ہوئے ہیں جبھی تو ایسا ہو رہا ہے۔

یگیج آفیسر کچھ دیر بعد میرے پاس آیا اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس
لہا. آپ سمجھے نہیں اور آپ کو پریشان ہونا پڑا۔ دو گھنٹے بعد دوسری گاڑی
ے گی۔ آپ اس سے چلے جائیے۔ سامان میں ابھی ٹکٹ کئے دیتا ہوں مگر
..... مگر...... جملہ اس نے پورا نہیں کیا۔ تب اس کی للچائی ہوئی نظروں
رسلتے ہوئے ہاتھوں نے جملہ پورا کر دیا اور میرے کان میں سرحد کے اس
رسے آتی ہوئی ایک آواز سنائی دی "ہاتھوں کا میل چھوڑ جائیے صاحب"
کالا ٹیکس،، میں بڑبڑایا اور اپنے ہاتھ ملنے شروع کر دیئے اور تھوڑا سا میل
ال کر یگیج آفیسر کے جیب میں ڈال دیا۔ وہ جب میرے سامان کی رسید بنا چکا تو
ں نے اس سے وہی بات کہی جو سرحد کے اس پار کہہ آیا تھا۔ جواب میں اس
نے وہی جملہ کہا جو میں سرحد کے اس پار سن آیا تھا۔ "اس پیٹ کا برا ہو جیسا
بسی طرح نہیں مانتا" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "لیجئے صاحب چھٹی ہوئی۔ اب نماز
ا وقت ہو رہا ہے میں نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔" وہ آفیسر نماز پڑھنے کے لئے
بار رہا تھا اور میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ کیا اس کی نماز قبول ہو جائیگی؟

جب ہم چٹاگانگ پہنچے تو معلوم ہوا کہ ہمارا یگیج کیا ہوا سامان ابھی
ک نہیں آیا۔ دوسرے دن بھی یہی اطلاع ملی۔ تیسرے دن خدا کے فضل سے
سامان مل گیا۔

اسٹیشن سے سامان لا کر میں تو تھکن کے مارے لیٹ گیا اور میری
بیوی صندوقوں کا جائزہ لینے لگیں۔ جب اس نے دوسرا صندوق کھولا تو اس
کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ میں نے اٹھ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ صندوق
میں سے کئی ایک کپڑوں کے جوڑے غائب تھے۔ اور اس میں بجائے کپڑوں
کے ایک عدد قرار داد مقاصد رکھی ہوئی تھی یعنی ماننے ایک عدد قرار داد مقاصد
لوہے کی بنی ہوئی ایک وزنی قرار داد مقاصد، لوہے کا ایک وزنی ٹکڑا جو وزن
پورا کرنے کے لئے رکھ دیا گیا تھا۔ پاکستان میں داخل ہونے تک سامان میرے
ساتھ ہی آیا تھا اسی لئے یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ یہ لوہے کا ٹکڑا سرحد
کے اس پار سے درآمد کیا گیا ہے۔ یقیناً پاکستان کے دریائی اسٹیشن جا نپور
ہی میں رکھا گیا تھا۔ جہاں میرا سامان اسٹیمر پر سوار نہیں ہو سکا تھا۔

وہ وزنی لوہے کی قرار داد مقاصد اب بھی میرے ساتھ ہے جب
ہم چٹاگانگ سے کراچی آ رہے تھے تو میری بیوی نے پوچھا تھا اس منحوس
ٹکڑے کو کیوں لئے چلتے ہو۔ میں نے اسے جواب دیا تھا۔ یہ بڑی مشکل سے
ہاتھ لگا ہے اور ہے بڑے کام کی چیز۔ اس آہنی قرار داد مقاصد سے ہم کو اس
قیادت کا سر توڑنا ہے جو اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی ہے ــــ
پاکستان اسلامی سلطنت تو ہے لیکن یہ کم بخت پیٹ نہیں مانتا۔ یہ ظالم
نفس قابو میں نہیں آتا۔ ہماری قیادت تو سرحدوں کے اندر بیٹھی ہوئی کہہ
رہی ہے اور دو سرحدوں کے قریب ایک ملک سے دوسرے ملک میں داخل
ہونے والے مسافر مچلتی ہوئی اس حد فاصل کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں
جو دو ملکوں کی زمینوں کو ہی نہیں بلکہ دو زندگیوں کے درمیان
امتیاز پیدا کرتی ہے۔

"بشکریہ تسنیم"

حاذق ہسٹریا پلز (گولیاں)

یہ مرکب گولیوں کی صورت میں خالص اور کمیاب جڑی بوٹیوں سے جدید طبی
اصول پر تیار کی گئی ہیں جو ہسٹریا جیسے موذی مرض کو جو ہماری نوجوان بہنوں میں آجکل
عام ہو گیا ہے سو فیصدی کامیاب ہو چکی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ دوا عورتوں کی دیگر
شکایات، اعصابی کمزوری، ضعف ہضم اختلاج قلب کے لئے بیحد مفید ہے
اور بچوں کی مرگی کے لئے لاثانی دوا ہے

قیمت چالیس گولی (ایک شیشی) پانچ روپے علاوہ محصولڈاک

حاذق دواخانہ بندر روڈ، کراچی نمبر (۱)

نعیم صدیقی

قرارداد مقاصد کی اذان کے بعد

مسجد میں خرابات

بڑی لڑائی ہوئی۔ بڑا فساد ہوا، بڑا ہنگامہ ہوا، بڑا خون بہا، بڑی عصمتیں لٹیں۔ بڑی دولت چھنی، بڑی جانیں گئیں، بڑے گھر اجڑے، بڑے کتب خانے جلے، بڑی عمارتیں ڈھائی گئیں ——— جھگڑا یہ تھا کہ غیر کہتے تھے "زمین ایک رہے گی۔ اس کا انتظام ایک رہے گا۔ مذہب الگ الگ ہونگے اور دنیا ایک ہوگی" مگر مسلمان بڑی نرالی مخلوق ہے یہ کہتا تھا اس کا مذہب ہی سب کچھ ہے۔ اس کا مذہب ہی اسکی دنیا ہے اس لئے وہ زمین بٹوائے گا اور اس کو مسجد میں بدل دیگا۔ مسجد اس کے دین کا بھی سرچشمہ ہوگی۔ اور اس کی دنیا کا بھی مرکز ہوگی۔ اس پر سالوں ضدم ضدا ہوئی۔ آخر لوگ لڑنے مرنے کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور کچھ لوگ لیڈری کرنے کے لئے آگے لگ گئے کہ لو ہم تمہیں مسجد بنوائے دیتے ہیں۔ لوگوں نے زندہ باد کے نعرے لگائے اور پشاور سے راس کماری تک ایک ہی آواز گونج گئی ——— لے کے رہیں گے پاکستان! ——— زمین بٹ گئی، پکی ایکڑیں کھنچ گئیں پاکستان بنگیا اور لیڈر اس آزاد خطے میں تخت سنبھا کر آرام سے بیٹھ گئے۔ کچھ نے سیاسی کاروبار شروع کر دیا۔ کچھ اقتدار کی چوسر کھیلنے میں لگ گئے کچھ رقص و سرود میں لگ گئے۔ کیونکہ

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

آواز آئی مذہب اپنا اپنا رہے گا۔ اور سیاست ہندو مسلمان سب کی اکٹھی دین گھر کا معاملہ ہے اور باہر کی ساری دنیا بے دین ہے۔ لوگ چونکے، شور مچا، اور شور مطالبہ بن گیا کہ سب کچھ تو مسجد کے لئے ہوا تھا اب تمہیں مسجد بنانی پڑے گی ——— سیدھی طرح سے اذان پکارو صفیں سیدھی کرو۔ ورنہ نکلو یہاں سے معمار اور بھی ہیں اور امام اور مؤذن اور متولی بھی نئے مل سکتے ہیں۔ لیڈر سمجھ گئے کہ یہ فتنہ ملاؤں کا اٹھایا ہوا ہے انھوں نے عوام سے کہا کہ یہاں بڑے غدار موجود ہیں۔ بڑے تخریب پسند لوگ پھیلے ہوئے ہیں۔ ذرا بچ کے رہو۔ ان کی باتوں میں نہ آؤ اور ذرا سوچو کہ مہاجرین کی بحالی کا مسئلہ ہے کشمیر کو حاصل کرنے کے لئے قضیہ درپیش ہے۔ بہ دشمنوں سے سابقہ ہے، پاکستان نیا نیا بنا ہے۔ یہ تم کن جانگلوؤں کے بھرے میں آگئے ہو۔ آخر مسجد اور نماز اور اذان کا قصہ تم کہاں سے لے بیٹھے۔

مگر لوگ بھی بالکل پاگل ہو گئے تھے۔ ان کی ایک ہی رٹ تھی وہ لیڈروں کے گلے سے اذان اگلوانے پر تل گئے تھے۔ لیڈروں نے کہا اچھا یوں تو یوں ہی سہی۔ ہم بھی وہ کرینگے کہ تم یاد رکھو گے۔ چنانچہ انھوں نے ادھر ادھر ڈرتے ڈرتے دیکھا۔ امریکہ، برطانیہ اور ہندوستان وغیرہ سے آنکھ بچا کر دھیمے دھیمے سروں میں اذان کہہ ڈالی۔ فضا میں ایک لہر دوڑ گئی۔ لوگ خوشی سے اچھل پڑے کہ پوری زندگی کو عبادت اور نماز میں ڈھال دینے کے لئے موجودہ دنیا میں پہلی مسجد بن گئی۔ وہ اذان سن کر لپکے کہ تکبیر اولیٰ جانے نہ پائے مگر وہاں جا کر دیکھا تو اور ہی رنگ ہے، مسجد میں آرکسٹرا بج رہا ہے اور جوڑے ناچ رہے ہیں اور شرابیں پی جا رہی ہیں اور مینا بازار سجا ہوا ہے اور عورتوں کے نقاب اتارے جا رہے ہیں۔ آواز آئی کہ حضرت یہ اسلامی نظام ہی کا نماز کا انتظام ہو رہا ہے۔ کام بڑا کٹھن ہے۔ اس لئے تبدیلی حالات آہستہ ہی ہوگی۔ ہم نے یہ ساری کاروائی تلاوت قرآن کریم سے شروع کی اس لئے کوئی فکر و اندیشے کی بات نہیں۔

لوگوں نے اس پر شور مچایا تو محراب کے نیچے سے اور ممبر پیچھے سے ایک خوفناک دیو نکل آیا۔ یہ سیفٹی ایکٹ تھا۔ اس نے مار دھاڑ شروع کر دی۔ کسی کی زبان کٹ گئی۔ کسی کے ہاتھ پاؤں جکڑ دیئے گئے ممبر پر ضمیر کی پھانسی دی گئی۔ لوگ ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

پھر اچانک کاغذات کا ایک پلندہ سامنے لایا گیا جس کے کچھ اوراق برطانیہ سے اور کچھ امریکہ سے اور کچھ ہندوستان سے منگائے گئے تھے منبر پر کھڑے ہو کر بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر اعلان کیا گیا کہ یہ اس مسجد کا قرآن سیاست ہے۔ اس پر بہت شور مچا اور ملاؤں نے آسمان ہنگامہ برپا کیا کہ قرآن سیاست کو اعلانچی نے چپکے سے جیب میں رکھ کر کہا کہ اچھا ذرا دیر اور ٹھہرو ہم اس پر نظر ثانی کرتے ہیں اور ہر طاقچے پر ایکٹ سنہ ۳۵ء رکھا ہوا تھا اور اس سے بار بار برکت حاصل کی جاتی تھی۔ لوگوں نے چاہا کہ اسے اٹھا کر باہر پھینک دیں اور مسجد کو اس سے پاک کر دیں لیکن لیڈروں نے بڑی لجاجت سے کہا کہ ہائیں ہائیں اسے نہ چھیڑنا۔ یہ تو ہمارا سابق آقاؤں کا چھوڑا ہوا ترکہ ہے۔ اسے برباد کر دیں تو ہمارے پاس کیا رہے گا۔ یہ ایک "مقدس امانت" ہے اسے جوں کا توں رہنے دو۔

اور پھر مسجد مقدس ہی میں ایک ڈرامہ شروع ہوا جس کا نام انتخاب تھا۔ پہلے وسطی حصے میں اور پھر دوسرے حصے میں جو شمالی دیوار سے ملحق تھا۔ پہلا مظاہرہ بھی خاصا کامیاب رہا۔ مگر دوسرے میں تو معاملہ اوج کمال کو پہنچ گیا۔ ڈرامہ میں یہ تعلیم دی گئی کہ اپنے پرانے محترم لیڈروں کو کس طرح دوبارہ اپنی مرضی کے خلاف منتخب کرنا چاہیئے اور امانت بھی انہی کے ہاتھ میں سونپنی چاہیئے۔ اس ڈرامہ میں بہت سے سرکاری افسروں، علماء دین، اخبار نویسوں اور ادیبوں نے اداکاری کے جوہر دکھائے

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک انگریز سیدھا مسجد میں گھسا جا رہا ہے

لوگ ادھر متوجہ ہو گئے۔ تعارف کرایا گیا ——— کہ

"یہ عالم دین اور مفتی شرع متین"

اس نرالی مسجد کے قواعد و ضوابط بنانے کیلئے

بڑے صرف کثیر پر لایا گیا ہے!

اور وہ ایک کونے میں کرسی بچھا کر بیٹھ گیا اور پردہ اس کے آگے لٹکا دیا گیا۔ اور باہر ہنگامے جوں کے جوں جاری رہے۔

خطبے میں نام شاہ برطانیہ کا لیا جاتا تھا ——— اور سامنے ان کی تصویر آویزاں تھی۔ لوگ اس پر چڑھتے تھے۔ مگر خطیبوں کا خیال یہ تھا ——— کہ

"یہ ظل اللہ ہیں۔ ان کی مورت سامنے رکھیئے اور ان کا نام لئے بغیر خطبہ، خطبہ ہو ہی نہیں سکتا۔

لیکن پھر بھی بار بار لوگ ٹوکتے ہی رہے ان کو جواب دیا گیا ——— کہ

"ہم مسجد بنا رہے ہیں، ہم نے اذان کہی ہے، ہم نے قرارداد مقاصد پاس کی ہے اب اور کیا چاہتے ہو کسی کو ہمارے منہ آنے کا حق نہیں۔ یاد رکھو کہ اس مسجد کا امام غیر مسلم بھی ہو سکتا ہے۔"

یک نہ شد دو شد۔ امریکہ سے حضرت ڈالر پوائنٹ فور پروانہ راہداری لئے لیفٹ رائٹ کرتے مسجد شریف میں آگھسے۔ تمام لیڈر حضرات کرسیوں سے اٹھ کر استقبال کے لئے بڑھے۔ باری باری ہر ا جھک کر آداب بجا لایا۔ ہاتھوں کو بوسہ دیا اور منبر پر لا بٹھایا، لوگوں نے پوچھا یہ کیا تو بتایا گیا ——— کہ

مسجد کی تعمیر، مرمت اور آرائش اور نظم و نسق کے لئے روپے کی بڑی ضرورت ہے۔ اللہ نے خزانہ غیب سے انتظام کر دیا ہے اور حضرت ڈالر تھیلیاں بھر کے لائے ہیں۔ تو اور کیا چاہیئے۔ زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوگا کہ وہ انتظام میں تھوڑی سی مداخلت کریں گے اس سے کیا ہوتا ہے۔ مسجد تو بہر حال مسجد ہی رہے گی!"

لوگ بہت تلملائے مگر فرمایا گیا ———

"ہم نے جب قرارداد مقاصد کی اذان کہہ دی ہے تو اب کسی کو اعتراض کا کیا حق ہے۔ ہم جو چاہیں کریں تم نے خود ہی تو ہم کو امام اور موذن چنا تھا۔ اب جو کچھ ہم کریں اس پر آمنا و صدقنا کہتے جاؤ۔ چیں بیں کرنا شرافت نہیں ہے۔"

آرکسٹرا پھر بجنے لگا۔ ناچ پھر شروع ہو گیا۔ شراب اڑنے لگی۔ جیبیں پھر کاٹی جانے لگیں۔ جو سر پھر کھیلے جانے لگی اور نقار خانے میں عوام کے احتجاج کی بار بار دہرائی ہوئی آواز مایوسی کی دھیمی ہوتے ہوتے بالکل ہی گم ہو گئی

کچھ لوگوں نے خیال کیا کہ یہاں پر کوشش ہو رہی ہے اور اسی ہنگامے میں اپنی اپنی نمازیں پڑھنے لگے۔ کچھ نے کہا آہستہ آہستہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ کچھ نے خیال کیا کہ اس زمانے میں "مسجد" "سجدہ" اور "نماز نماز" پکارنا ہی رجعت پسندی ہے۔

لیکن کچھ مٹھی بھر دیوانے ایسے بھی تھے جو اپنا کام کرتے چلے جا رہے تھے۔

مسجد زندہ باد ———

ائمہ عظام زندہ باد ———

موذنین زندہ باد ———

متولیان کرام زندہ باد ———

(تسنیم)

معدہ کی خرابیوں کو نظر انداز نہ کیجئے

کہیں معدہ کی خرابیاں آپکو نظر انداز نہ کر دیں

ہضمی ——— ایک بہترین سفوف معدہ ھے

جو فعل ہضم کو نظری طور پر کام کرنے میں مدد دیتا ہے اور معدہ کو ہر خرابی سے محفوظ رکھتا ہے
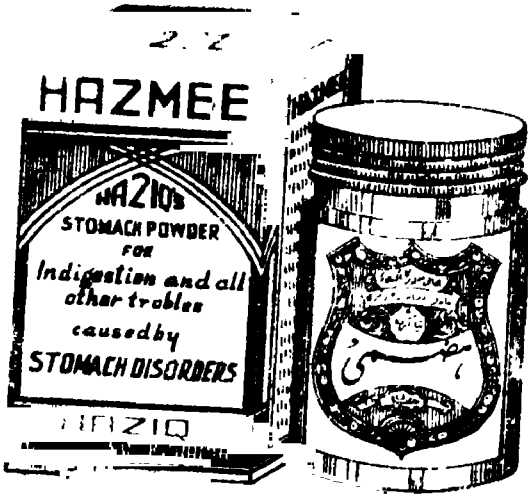
حفظ ماتقدم علاج سے بہتر ہے

اسلئے ہضمی استعمال کیجئے

تاکہ آپکا معدہ ہر خرابی سے محفوظ

رہے۔ قیمت فی شیشی

ایک روپیہ چار آنے

تیار کردہ :- حاذق دواخانہ، بندر روڈ، کراچی نمبر (۱)

از حفیظ جالندھری

"آزادیٔ کشمیر سے ہرگز نہ منہ موڑیں گے ہم!"

(ہ)م کو قسم اللہ کی۔ ہم کو قسم ایمان کی
(ہ)م کو محمد صلعم کی قسم۔ ہم کو قسم قرآن کی
آزادیٔ کشمیر سے ہرگز نہ منہ موڑیں گے ہم!
پھر قبضۂ شمشیر سے دشمن کا سر توڑیں گے ہم!

(ا)ن بے گناہوں کی قسم جن کے گلے کاٹے گئے
(ا)ن بے پناہوں کی قسم جن کے لہو چاٹے گئے
جو آگ میں جھونکے گئے ان شیر خواروں کی قسم
جو خاک پر روندے گئے ان ماہ پاروں کی قسم
(م)ظلوم ماؤں کی قسم۔ بیوہ عروسوں کی قسم
مجروح مستورات کے ننگے جلوسوں کی قسم
(ب)ے کار زندوں نے جنہیں ان خاندانوں کی قسم
جو آج تک ہیں دربدر ان کاروانوں کی قسم
زندہ جنہیں تو پا گیا توڑے گئے جن پر ستم
(ل)ٹتی ہے جن کی آبرو ان ماؤں بہنوں کی قسم
(ا)ن کی قسم جو بیٹیاں ہیں پنجۂ اغیار میں
(ب)کتی ہیں جن کی عصمتیں ہر کوچہ و بازار میں

ناموسِ غیرت کی قسم حد ہو چکی ہے صبر کی
ہیں صید صید زادیاں اب تک نہ نابالجبر کی
غازی شہیدوں کی قسم شاہد ہے جن کا آسماں
راہوں میں بے گور و کفن رُلتی ہیں جن کی ہڈیاں
افرادِ ملت کی قسم جو خانماں برباد ہیں
ہم فرض کو بھولے نہیں ہم کو اجبا یاد ہیں
ہم شمر سے خائف نہیں ہم کو قسم شبیر کی
کب تک رہے گی کربلا یہ سرزمیں کشمیر کی!
کشمیر کی خاطر اگر سر چاہیئے سر دیں گے ہم
جو فیصلہ ہوتا نہیں وہ فیصلہ کر دیں گے ہم
سر سے کفن باندھے ہوئے میدان میں جائیں گے ہم
افرنگیوں کے پیچ میں اب نہیں آئیں گے ہم
ہم کو قسم اللہ کی۔ ہم کو قسم ایمان کی
ہم کو محمد صلعم کی قسم۔ ہم کو قسم قرآن کی
آزادیٔ کشمیر سے ہرگز نہ منہ موڑیں گے ہم!
پھر قبضۂ شمشیر سے دشمن کا سر توڑیں گے ہم!

(احسان)

اسعد گیلانی ●

حادثہ

مسز نسیم کھنٹ سے وہ بس کے سامنے والے دروازے سے داخل ہوئی۔ اور ہزار ایک شک اور لچک کے ساتھ بس کے پچھلے حصے میں ایک طائرانہ لیکن جستجو بھری نظر ڈال کر جسم کو بے شمار بل دیتے ہوئے سامنے کی زنانہ سیٹ پر اس طرح بیٹھ گئی کہ اس کا نصف چہرہ اور ایک وزدیدہ آنکھ مردوں کا بار بار جائزہ لے سکے

دھپ سے وہ دروازے سے داخل ہوا اور مسافروں کی کھڑی ہوئی قطار کو چیرتا پھاڑتا اور دیکھتا ایک گھبراہٹ اور تجسس کے انداز میں زنانہ سیٹ عقب میں ایک مردانہ سیٹ کی طرف بڑھا اور اپنی عرق آلود پیشانی پر چھوٹ کو پیچھے کی طرف ہٹاتے ہوئے دو مسافروں کی سیٹ پر اپنے لئے ایک نہایت نامعلوم جگہ پر مقام حاصل کرتے ہوئے عین قبلہ مقصود کی طرف نظریں جما کر بیٹھ گیا۔

سیاہی مائل سانولا رنگ، لمبے لمبے بے گندھے خشک اور پشت کو گھیرے ہوئے بے ترتیب بال۔ تیلی سی بدنما سرخ پھولوں کی نیلی چھینٹ کا چست فراک بھینس کی دم کی طرح سیاہ نخلوں تک عریاں بانہیں، گردن، بازوؤں اور چہرے پر لت دھائے ہوئے پوڈر کے سفید سفید دھبے اور غبار۔ گھٹنوں تک سیاہ عریاں ٹانگیں جو ہاتھی کی ٹانگوں کی طرح بے بال دیے آب تھیں اور پاؤں میں باٹا کی سفید سینڈل جیسے ہاتھی کی سونڈ نے مرغابی پکڑ رکھی تھی۔ کلائی پر ایک زردسی بیل کی آنکھ کی طرح گول گھڑی بندھی ہوئی۔ آنکھوں پر سفید فریم والی نیلی عینک۔ پلاسٹک کا ایک پرانا سا زنانہ بیگ مرے ہوئے بچے کی طرح بغل میں دبا ہوا تھا۔ یہ مس مرد افگن تھی۔ اس کی نگاہ کے تیر بار بار نگاہ کے سامنے لگے ہوئے بڑے شیشے سے منحرف ہو ہو کر پیچھے مردوں کے ہجوم پر بوچھاڑ کر رہے تھے۔ اور ہر لحظہ گردن کے ذرا سے جھکاؤ، چہرے کے ذرا سے خماؤ اور آنکھوں کے ذرا سے گھماؤ سے ان کا رخ براہ راست پیچھے کی طرف پھر جاتا تھا

اس تیر اندازی سے بس کا ہر فرد بے خبر تھا سوائے اس کے جو دھپ سے بس کے پچھلے دروازہ سے داخل ہوا تھا اور جو براہ راست اس ساری نشانہ بازی کا ہدف تھا اور سوائے اس کے جو یہ سارا ماجرا ہوش ظلم دیکھ رہا تھا

سانولا اڑا ہوا رنگ، بے ترتیب پیشانی تک بکھرے ہوئے بال جو صبح بنائے گئے تھے۔ لیکن اب شام تک پریشان ہو گئے تھے۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں، کلرکانہ حلیہ اور انداز نیلی دھاریوں والی سفید قمیص، کہنیوں تک چڑھی ہوئی میلی آستین سفید بے کریز پتلون، جو دونوں سے نیچے نیچے بکھر نیچے کو کر رہی جا رہی تھی۔ پتلون کی دائیں جیب سے ذرا سا نکلا ہوا، الگچا رومال گریبان میں درمیانی بٹن کے ساتھ معلق پن۔ منڈی ہوئی ڈاڑھی کی سیاہی چہرے پر نمایاں۔ بے تاب اور مضطرب لیکن پھیکی اور تھکی ہوئی آنکھیں بار بار زنانہ سیٹ پر ایک سستے بھدے اور وقتی سے رومان کی راہ دیکھتی ہوئی احمقانہ سی حرکات، کبھی بالوں کو پیشانی سے پیچھے سمیٹتے ہوئے کبھی گریبان میں پن ٹٹولتے ہوئے کبھی آگے کی طرف بے معنی جھک اور کبھی کھانس کر اور کبھی اپنی سیٹ کے مسافروں سے تھوڑی جگہ دینے کی درخواست کرتے ہوئے بار بار رومان کو جگانے اور اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ یہ مسٹر زن شکار تھا۔

ٹن ٹن گھنٹی بجی اور بس چل دی۔ ایک ہلکا سا جھکولا آیا جس نے بس میں کھڑی ہوئی مسافروں کی قطار کو ہلا دیا۔ سب مسافر اپنے جھول سے گئے۔ گھر گھر کھٹاک اور بس چل دی۔ یہ جھکولا ایک موقعہ بن کر زن شکار کے پاس آیا اور وہ ایک مخصوص اضطراب سے اچانک آگے جھک گیا۔ اس کا ہاتھ گویا بالکل اضطراری طور پر زنانہ سیٹ کی پشت پر جا لگا اور اس کی انگلیاں بھی بالکل اضطراری طور پر پشت سے چھو گئیں۔ ایک تھکے ماندے کلرک کے سستے سے رومان کے لئے یہ معرکہ ایک بہت بڑا معرکہ تھا جو زن شکار نے سر کر لیا۔

مضطرب لیکن مسکراتی ہوئی آنکھوں سے پیچھے کی طرف دیکھا جہاں
ن شکار کی آنکھیں اس کتے کی سی للچائی ہوئی بھوکی آنکھوں سے اس
ف دیکھ رہی تھیں جس کے سامنے ہڈی رکھی ہو لیکن وہ اس پر مُنہ
مار سکتا ہو۔

بس ایک موڑ مڑی۔ ایک مسافر کے دامن نے جھول کر زن
شکار کے چہرے کو ڈھانک لیا۔ ایک بے پناہ جھنجھلاہٹ اور تلملاہٹ
سے اس نے دامن کو جھٹک کر سامنے سے ہٹانے کی کوشش کی۔
جیسے اس کی روح کا تار ٹوٹ گیا تھا یا جیسے ڈوبنے والے کے ہاتھ سے
ایک تنکا بھی چھوٹ گیا تھا۔ یا جیسے پیاسے کے منہ سے اچانک پیالہ
ہٹا دیا گیا تھا۔ دامن ہٹا اور سلسلۂ تارِ نگاہ پھر جڑ گیا۔

مردافگن نے بے وقت ایک انگڑائی لی اور بالوں کے پیچھے سے
جھٹک کر ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے اپنے بازوؤں کے حلقے میں سے
جھک کر پیچھے کی طرف دیکھنے کا ایک نہایت نادر موقعہ نکال ہی لیا
اس کے جواب میں زن شکار کی کیفیت بے پناہ اضطرابی ہو گئی اس نے
بالوں کو پیشانی سے پیچھے ہٹایا۔ آنکھوں کو مزید رومینٹک اور نشہ آور
بنایا۔ بے چینی سے دل پر ہاتھ رکھا۔ پھر کھانس کر جیب سے ایک مسلا ہوا سا
سگریٹ نکالا۔ اور ساتھ والے مسافر سے بیڑی کا سلگتا ہوا ٹکڑہ لے کر
سگریٹ سلگایا۔ ایک لمبا کش لے کر دھوئیں کو کمال فن سے ایک لمبے
غبار کی شکل میں مردافگن کے چہرے کی طرف اڑا دیا۔ اور پھر ذرا آگے جھک
کر آنکھوں کو ذرا زیادہ نیم باز کر کے اپنے دل کی ساری کیفیت کو تلز نگاہ کے
ذریعے اگل دینا چاہا۔

مردافگن کے لبوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ آئی جیسے
بے خیالی میں کوئی لطیفہ یاد آگیا ہو۔ آنکھوں میں ہلکی مفلس سی شوخی آئی
اس لئے کلائی گھما کر ٹائم دیکھا۔ مرزہ بچے کی طرح چپکے ہوئے پلاسٹک
بیگ میں سے ایک ننھا سا ملگجا رومال نکال کر جو کسی پھٹے ہوئے فراک
سے بنایا گیا تھا۔ پیشانی کا نامعلوم پسینہ صاف کیا۔ سرحدی پٹھانوں
کے تمباکو کی سی ایک چھوٹی سی ڈبیہ کھول کر اس کے ڈھکنے میں لگے ہوئے
چھوٹے گول شیشے میں اپنے چہرے کا جائزہ لیا۔ اسی ڈبیہ میں سے پاؤڈر
کا ایک پف نکال کر گردن اور گال پر لگایا اور پھر ان سفید دھبوں کو ویسے

ہی چھوڑ کر دعوت نظارہ دیتی ہوئی نظروں سے زن شکار کی طرف دیکھا۔

زن شکار ایک شدید کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس کے بیٹھنے
کی سیٹ پر اس کی گنجائش نہ تھی۔ لیکن کھڑے ہو کر رومانس کرنا اس کے
نزدیک بدذوقی بلکہ وقار کے خلاف تھا۔ اس لئے وہ اپنی ٹانگوں پر پورا
وزن دیئے ہوئے یونہی سیٹ کے کسی غیر محسوس گوشے پر ٹکا ہوا تھا۔
اکڑوں حالت میں بس کے جھکولوں کے ساتھ اپنا وزن اٹھاتے اٹھاتے
اس کی پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی اور تکان اسکے چہرے پر نمایاں تھی
اپنی اس تکان اور بے مقامی کا اظہار بھی وہ نہ کرنا چاہتا تھا اس لئے
اس نے ایک زوردار کش لے کر دھواں پھیلا دیا اور اس دھوئیں کے
پردے میں کسمسا کر اپنی سیٹ پر کچھ بوجھ ڈال ہی دیا۔

پارسی کالونی کے ایک اسٹاپ پر تین خواتین اور آگئیں۔ ایک
برقعہ پوش خاتون تھی اور دو پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن کی ممبر نظر
آتی تھیں۔ برقعے والی خاتون کی گود میں ایک ننھا سا بچہ تھا جو چسنی منہ میں
لئے چوس رہا تھا اور پورے سکون سے ماحول کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خاتون بھی
لمبی زنانہ سیٹ کے ایک سرے پر خاموشی سے آکر بیٹھ گئی۔ بچے کو گود میں
لٹایا اور اطمینان سے بچے کے ساتھ کھیلنے لگی۔ اس نے بچے کے بالوں کو
درست کیا چسنی کو مناسب طریقے سے اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ کرتے کو
درست کر کے اسکے گھٹنوں تک پھیلایا اور پھر اسکے ہونٹوں اور گالوں پر
انگلی رکھ رکھ کر اسے ہنساتی رہی۔

نئی آنے والی بے پردہ خواتین تن کر سیٹ کے درمیان بیٹھ گئیں
اور مردافگن سیٹ کے دوسرے کونے میں دروازے کے پاس سے
سرک گئی اور اس سرکاؤ میں اس نے پوری طرح اپنا نصف رُخ پیچھے کی
طرف کر دیا اور اس کے اس انداز سے محسوس ہوا کہ اچانک اس کا التفات
بے پایاں پیچھے بیٹھے ہوئے زن شکار پر کچھ زیادہ ہی ہو گیا تھا اور اس
زیادتی کی ایک نمایاں وجہ سامنے تھی۔

نئی آنے والی بے پردہ خواتین زن شکار کے ستارۂ حسن کے
مقابلے میں آفتاب و ماہتاب بن کر آئیں۔ رنگ و روغن ناز و انداز، رکھ رکھاؤ
چال ڈھال، وضع قطع، لباس، پوشاک اور میک اپ ہر چیز میں۔ اگرچہ
زن شکار کے مقابلے میں زیادہ بازاری پن تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ

سلیقہ اور نفاست بھی زیادہ تھی۔ اچانک محسوس ہوا، دو جاپانی گڑیاں کے سامنے دیہاتی لڑکیوں کے ہاتھ کی بنی ہوئی میلی دھجیوں کی ایک گڑیا گئی۔ آنے والی دونوں خواتین کے غرضے اگرچہ بس کے ہر مسافر سے مخاطب تھے لیکن ان کے چہروں کا رُخ پیچھے کی طرف نہ تھا۔ البتہ کبھی کبھی شانوں پر گرتا ہوا دوپٹہ اٹھانے کے لئے نظریں پیچھے کا جائزہ لے ہی جاتی تھیں۔ دونوں مہذب خواتین کسی فلم پر تبصرہ میں مصروف تھیں انکے آتے ہی ایک مکروہ سی خوشبو زنانہ سیٹ سے اڑ اڑ کر بس کے مسافروں کو نواز رہی تھی۔

شکر ہے کہ اگلے بس اسٹاپ پر دونوں اتر گئیں جیسے ان سے ہی تعلق سے منہ موڑتے نازو انداز کے ساتھ وہ بس سے اتر کر چل دیں اور بس کے بہت سے مسافروں کی نظریں دور تک ان کے تعاقب میں چلی گئیں۔ یہانتک کہ وہ سڑک کے اس موڑ پر مڑ گئیں۔ جہاں آگے گل رعنا کلب کی عمارت کھڑی تھی۔

زنانہ سیٹ سے آنے والی مکروہ بو بھی ختم ہوگئی اور ستارہ حسن پھر چمک اٹھا۔ اگرچہ دونئی آنے والی خواتین کے آنیکے بعد سے زن شکار کے جذبات اور اظہار وارفتگی میں یکجہتی کے بجائے انتشار آگیا تھا اور اس کے لئے ممکن نہ رہا تھا کہ وہ نقد دل کے ٹکڑے کرکرکے ان کی بارگاہوں میں پیش کرے اور اس دوران میں اسے بہت سے تکلیف دہ پارٹ ادا کرنا پڑے۔ اسے ہر نظر کو یہی جواب دینا تھا کہ وہ صرف اسی پر نثار ہو رہا ہے۔ لیکن ان دونوں خواتین کے جاتے ہی اس کی وہ پریشان ادائی پھر مجتمع ہوکر مردافگن کیلئے مخصوص ہوگئی۔ اب زنانہ سیٹ کے ایک سرے پر وہ برقعہ پوش خاتون تھی۔ اور دوسرے پر مردافگن۔ برقعہ کو اپنی پہنچ سے دور پا کر اب وہ پوری طرح مردافگن کی طرف متوجہ ہوگیا تھا

اور اتنے میں بدذوق کنڈکٹر ٹکٹ ٹکٹ کی صدا لگاتا اور ہر مسافر کے سامنے انگلی نچاتا ہوا زن شکار کے سامنے آگیا۔ زن شکار کا انجماد پھر نقطہ عروج پر پہنچ گیا۔ اس جھنجھلا کر کنڈکٹر کو آہستہ سے ایک طرف دھکیلا۔

"بھائی میں تو ٹکٹ لے چکا ہوں" زن شکار نے ٹکٹ دکھاتے ہوئے کہا۔ اس کے پاس کنڈکٹر کو سامنے سے ہٹانے کے لئے اسکے سوا اور کوئی موضوع نہ تھا۔ کنڈکٹر ہٹ گیا اور دو طرفہ مخبوط الحواسیاں پھر بڑھ گئیں۔

اب ایک موڑ مڑنے کے بعد بس جہانگیر کالونی کی طرف چل پڑی تھی۔ انڈیا ہاؤس سے آگے نکل کر بس کی رفتار ہلکی ہوگئی سٹاپ قریب آ رہا تھا۔ مردافگن نے اپنا پلاسٹک کا پرانا بیگ مردہ بچے کی طرح بغل میں دبایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک طائرانہ اور فاتحانہ نظر ڈالی اور کلوپیٹرا کے قدموں سے زن شکار اور بھری بس پر ایک نظر ڈالی اور کھٹ سے دروازے کے پاس جاکر کھڑی ہوئی بس آہستہ آہستہ چل رہی تھی بس اسٹاپ ابھی کچھ دور تھا مردافگن نے ایک شان بے نیازی سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ لیکن دروازے کا گستاخ ہینڈل گھمانے کے باوجود بھی کھل نہ سکا اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا اور دوسرا جاتا رہا۔ اسے گویا محسوس ہوا تھا کہ ساری بس اس کی طرف دیکھ رہی تھی ہر نگاہ اس کے ہاتھ کی جنبش پر تھی۔ اور ہر زبان اس سے کہہ رہی تھی "میم صاحبہ آپ سے بس کا دروازہ بھی نہیں کھل سکتا۔ ارے میم صاحبہ تم کیسی میم ہو" یہ سارا بحران اس کے دل و دماغ میں تھا۔ اس پر تو صرف زن شکار ہی رخصت کے انداز میں نگاہ واپسیں گاڑے ہوئے تھا۔

ڈرائیور نے خاتون مسافر کی ناکام کوشش دیکھ کر ہاتھ بڑھایا اور دروازہ کھول دیا اور مردافگن ایک کر پائیدان پر کھڑی ہوگئی۔ بس آہستہ آہستہ سٹاپ کی طرف بڑھ رہی تھی سامنے بائیں ہاتھ پر لوہے کے ایک چھوٹے سے کھمبے پر تختی لگی تھی جس پر بس سٹاپ لکھا تھا اور بس اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

مردافگن نے بس پر پھر ایک پرنتار نظر ڈالی۔ اس کا رخ بس میں بیٹھے ہوئے اپنے ان بے شمار نامعلوم پرستاروں کی طرف تھا۔ اس کے لبوں پر ایک مفلس سی مسکراہٹ تھی۔ اس کا ایک اترنے کے لئے پائیدان سے اٹھ کر نیچے کی طرف بڑھ رہا اور پھر اچانک ایک شوخ چلبلاہٹ کے ساتھ اچھل کر دو کھٹ سے سڑک پر آرہی۔ بس ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ بائیں طرف کی نشستوں پر بیٹھے ہوئے مسافر کھڑکیوں سے سر باہر نکالے بعض مسکرا رہے اور بعض متاسف نظر آرہے تھے۔ زن شکار کے چہرے پر بھی ا

تاسف آمیز مسکراہٹ تھی۔

اس کی کلو میٹر اچلتی ہوئی بس میں سے مخالف سمت رخ کرکے کودنے کی وجہ سے گرد آلود فٹ پاتھ پر ٹانگیں اور بازو پھیلائے اس طرح بکھری ہوئی پڑی تھی جیسے کسی برساتی مینڈک کی پیٹھ سے موٹر کا پہیہ گزر گیا ہو۔

افاداتِ مسیح الملک

مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے

مکمل دستور العلاج

سر سے پاؤں تک کثیر الوقوع بیماریوں کا بیان معہ تشخیص اور علاج حکایات کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔

قابل قدر اور مفید کتاب ہے

قیمت فی جلد تین روپے آٹھ آنے

حاذق دواخانہ، بندر روڈ، کراچی نمبر ۱

امیر مرزا

رسّی سُلگتی رہی

حمیدن نے لکڑی کے تختے پر مڑھے ہوئے پیتل کے پترے پر اپنی ہتھیلی سے رگڑا اور آگے جھک کر اپنا عکس دیکھنے لگی، یہی سوچتے ہوئے اسے اپنی جوانی کی سندرتا یاد آگئی تھی اور وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس سندرتا کے نقوش وقت کے ہاتھوں کتنے بگڑ چکے ہیں۔ جوان وہ اب بھی تھی، لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بہت عمر رسیدہ اور برسوں کی روگی ہے اور اس کے مسخ شدہ چہرے کے نقوش بالغوں کو بھی ڈرا دیتے ہیں ——

اب اس کی وہ جوانی نہ رہی تھی جو آج سے تین سال پہلے تھی اپنی کچنار کے پھول جیسی جوانی پر اسے بہت گھمنڈ تھا۔ جب کبھی نواب صاحب ایک خاص لگاؤ سے اسکی طرف دیکھتے تو اسکا انگ انگ تھرکنے لگتا تھا۔ اسکی جوانی میں بلّاجت کے کئی بھنور پڑ جاتے تھے اور اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ گیس بھرے ہوئے غبارے کی مانند جھومتی ہوئی، مسکراتی ہوئی حسین فضاؤں کی لامحدود وسعتوں کو چھولے اور پھر تھکاوٹ سے نڈھال ہو کر کسی ریشم کی طرح نرم آغوش میں دھپ سے گر پڑے۔ اس کی نیندوں میں ایک عجیب سا نشہ پھیلا رہتا تھا۔ جیسے نواب صاحب کا مرشد چرس پی کر جلال میں آجایا کرتا تھا۔ یا جیسے خود نواب صاحب کبھی کبھی بہکے ہوئے لہجہ میں رنگین شعر گنگنایا کرتے تھے اور جاگتے میں وہ ایسے خواب دیکھتی تھی جو اسے خفیفت سے بہت دور لیجا کر سات سمندروں کی ملکہ بنا دیا کرتے تھے، نواب صاحب کی مسکراتی ہوئی آنکھوں کے پیغام اب وہ اچھی طرح سمجھنے لگی تھی۔ اور نواب صاحب کی مسکراہٹ میں مدھر جذبات کے کنول کھلتے دیکھ کر اس کا جی بیگم بننے کیلئے بے چین ہو جاتا تھا۔ آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر جب وہ اپنے نکھرے ہوئے شباب کا جائزہ لیتی اور مسہری کے سرہانے کی طرف لٹکی ہوئی تصویر میں بیگم کے بیڈول چہرے کو دیکھتی تو اس کے کانوں میں ایک نرم آواز رینگنے لگتی "حمیدن! تو بیگم بننے کیلئے پیدا ہوئی ہے اور یہ بیگم تو تیری باندیوں کی جگہ بھی نہیں لے سکتی، ابھی موقعہ ہے نواب صاحب صرف تمھاری رضامندی کے خواہشمند ہیں پھر سب معاملہ ٹھیک ہو جائیگا"۔ الفاظ اس کے ذہن میں اچھلنے لگتے اور وہ خوش آئند خیال میں مگن ہو کر اپنے ماحول کو بھول جاتی۔ اپنی اصلیت کو بھول جاتی اور بغلوں میں زور سے ہاتھ دبا کر خوشی کی ایک انوکھی لہر کو اپنی رگوں میں پھیلا دیتی تھی لیکن یہ خواب زیادہ دیر تک قائم نہ رہتا تھا۔ بیگم کے غصہ کا خیال کر کے ایک زبردست دھماکے کے ساتھ اس کا تسلسل ٹوٹ جاتا تھا اور اسے محسوس ہوتا جیسے اسکی زندگی کے رس میں کسی نے زہر گھول دیا ہے اور وہ گھل گھل کر مر رہی ہے۔ بیگم کا دبدبہ حویلی کے ہر کونے پر چھایا ہوا تھا۔ نواب صاحب اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرنے کی جرآت نہ کر سکتے تھے نوکروں میں اتنی ہمت نہ تھی کہ بیگم کی اجازت کے بغیر نواب صاحب کے کسی کام کو سرانجام دیں۔ نواب صاحب اب نام کے نواب رہ گئے تھے۔ جوانی کی عیاشیوں نے بزرگوں کی جائداد کا صفایا کر دیا تھا۔ اور اب بیگم کے اباّ نے اپنی زمین کے ایک قطعہ کی آمدنی بیٹی کے لئے وقف کر دی تھی۔ شہر کے مکانوں کا کرایہ بھی بیگم ہی وصول کرتی تھی اور بڑی مشکل سے اپنی وضعداری کے ستون کو سنبھالا دیئے ہوئے تھے اور ایسی حالت میں حمیدن کا بیگم بننے کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکتا تھا پھر بھی نواب صاحب کی ادھیڑ عمر میں اس کے لئے بے پایاں کشش تھی۔

جب کبھی ان سے آنکھیں چار ہوتی تھیں تو دبی دبی مسکراہٹوں کا تبادلہ ہونے لگتا تھا اور حمیدن کی زندگی میں امیدوں کے حسین رنگ لہرانے لگتے تھے اور ان رنگوں کو دیکھکر حسو کے دل میں بھی ٹیس سی اٹھنے لگتی تھی۔ حسو اس گھر کا پرانا ملازم تھا۔ بچپن اس نے اسی حویلی کی ڈیوڑھی میں کھیلتے ہوئے گزارا تھا اور جوانی کا شدید احساس اسے اس وقت ہوا تھا جب حمیدن نے نخرے اٹھاتے وقت اسے ایسے انداز سے دیکھا تھا۔ جیسے اسے کوئی بہت چٹخارے دار بات سنا رہا ہو اور اس بات کا مفہوم سمجھنے کی خاطر وہ بہت دیر تک حمیدن کی لچکیلی کمر کو دیکھتا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی رگوں میں تناؤ پیدا ہوتا گیا تھا۔ اس کا سانس تیز ہونے لگا تھا اور دل کو جیسے کوئی جلدی سے ربڑ کی مانند کھینچ کر چھوڑ رہا ہو۔

حمیدن کی ماں نواب کے ہاں بہت مدت سے ملازم تھی اور اب بڑھاپے کی وجہ سے اس کے اعضاء کی پھرتی زائل ہو گئی تھی اور کام کرتے وقت اس کا سانس پھول جاتا تھا اور کھانسی کی ٹھن ٹھن کے الجھاؤ میں پھنس کر وہ کئی دفعہ اپنی کانپتی ہوئی ٹانگوں کو نہ سنبھال سکی تھی۔ لیکن وہ نوکری کرنا نہ چاہتی تھی۔ یہی اس کی زندگی کا سہارا تھا اور اس کے بغیر اسے زندہ رہنے کی کوئی سبیل نظر نہ آتی تھی جب بیگم کی ڈانٹ ڈپٹ بڑھ گئی تو اس نے بیگم سے اپنی جگہ حمیدن کو کام پہ لگانے کی سفارش کر دی، بیگم پہلے تو گہری سوچ میں پڑ گئی۔ اس کی جلد نے کئی رنگ بدلے اور پھر ایک کپکپاہٹ کیساتھ اس نے انکار کر دیا، نواب صاحب کی رنگ رلیوں نے ابھی تھوڑا عرصہ ہوا دم توڑا تھا اور وہ اب بیگم کے اشاروں پر ناچتے ہوئے سدھر سے گئے تھے۔ اس لئے جوان لڑکی کو ملازم رکھنے کے وہ خلاف تھی۔ لیکن حمیدن کی ماں کی منتیں بڑھتی جا رہی تھیں اور اسکی بے نور سی آنکھوں میں آنسوؤں کے چشمے ابلنے لگے تھے اور اس کے پھیلے ہوئے بوڑھے ہاتھ رحم کی بھیک مانگتے ہوئے بری طرح لرزنے لگے تھے۔ ان دنوں بیگم کی امی آئی ہوئی تھی اس کو بڑھیا کی فریاد نے بہت متاثر کیا اور بیگم اپنی امی کی سفارش کے سامنے سر تسلیم خم کر کے رہ گئی۔ حویلی سے کوئی آدھے میل کے فاصلے پر حمیدن کا مکان تھا۔ دن بھر وہ حویلی میں کام کرتی تھی اور شام کو ماں کے پاس چلی جاتی تھی۔ حسو حمیدن کی ماں کے سامنے پل کر جوان ہوا تھا۔ حسو اسکی بہت عزت کرتا تھا اور وہ بھی اسے بہت پیار کرتی تھی اور اب حسو چاہنے لگا تھا کہ حمیدن بھی اس کے ساتھ نئے پیار کی بنیادیں استوار کرنی شروع کر دے لیکن حمیدن کے زعم میں بیگم بننے کے خیالات اودھم مچاتے رہتے تھے۔ اور حسو کے اشاروں کو سمجھتے ہوتے بھی وہ انجان بنی جا رہی تھی۔ حمیدن کو دیکھکر حسو کے سینے میں ایک بے چین گدگداہٹ پھیل جاتی تھی اور اس کی نشیلی اداؤں کے حملوں کی تاب نہ لا کر وہ سوچنے لگتا تھا کہ حمیدن کے بغیر وہ اپنی جوانی کو مسرور نہیں بنا سکتا۔ جینے کی تمناؤں کو جوان بنانے کی خاطر حمیدن کی اجلی مسکراہٹوں کا سہارا اشد ضروری ہے۔ اور اگر حمیدن کو حاصل نہ کر سکا تو آرزوؤں کی لاشوں کو دیکھکر اس کے دل کی حرکت بند ہو جائے گی اب وہ وقت نکال کر حمیدن کی ماں کے پاس بھی جانے لگا تھا اور اس کے پاؤں دباتے ہوئے جب وہ لمبی آہ بھر کر اپنی یتیمی کا قصہ چھیڑ دیتا تو حمیدن کی ماں اسے دلاسا دینے لگتی اور اس کے لہجہ میں ایسی شفقت جھانکنے لگتی، جیسے وہ حسو کی دلدہی کے لئے بڑھاپے کی سب پونجی خرچ کر دینے کو تیار ہو۔ حسو کا چہرہ خوشی سے تمتمانے لگتا تھا اور اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنا سینہ چیر کر آرزوؤں کی خوش تتلیوں کو اسکے سامنے رقصاں کر دے لیکن نہ جانے کیوں اس وقت اس کے ہونٹ سل جاتے تھے اور وہ کوشش کے باوجود بھی اپنے مطلب کا اظہار نہ کر سکتا تھا لیکن اسے یقین ہو گیا تھا کہ قدرت نے حمیدن کو اسی کے لئے بنایا ہے اور یہ یقین اس کے خوابوں اور خیالوں کو جگمگاتا رہتا تھا اور جب کبھی اس کے پیار بھری ... نظروں سے دیکھنے پر حمیدن زبان نکال کر تیوری چڑھا لیتی تھی۔ تو اسے اس بیزاری کا مطلق احساس نہ ہوتا تھا۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا

مدن کی ہر ادا میں اس کے لئے پیام محبت جھلک رہا ہے لیکن حمیدن
کے خوابوں میں بیگم بننے کی آرزوؤں کے کنول کھل رہے تھے اس کے
سینے میں دھڑکنوں کی ایسی راگنیاں اس لئے گونجتی تھیں کہ وہ بیگم
کی مانند اونچی مسند پہ بیٹھکر حکم صادر کرتی رہے اور نواب صاحب
اسکے اردگرد دیوانہ وار گھومتے رہیں .... یہ دائرہ پھیلتا رہا
سپنوں کے جادوگروں کی شعبدہ بازیاں نئے نئے روپ بدلتی رہیں
ذہنی خلاؤں میں ان جانی لذتوں کے دیئے جھلملاتے رہے اور پھر
ایک دن ان خلاؤں میں شعلوں کی سرخ لمبی زبانوں کا رقص جاری
ہوگیا۔ آزادی کی قریب آتی ہوئی صبح کے انتظار میں بے چین ہوکر
انسان درندے بن گئے۔ انسانیت کی گھٹی ہوئی چیخوں پر زہریلے
سانپوں کی پھنکار حاوی ہوگئی۔ برسوں کی غلامی سے بگڑی ہوئی
ذہنیتیں اور زیادہ بگڑ گئیں اور انھیں کوئی تمیز نہ رہی کہ ان کا
چھرا کسی کے سینے میں پیوست ہو رہا ہے چیختی ہوئی ماؤں اور سسکتی
ہوئی بہنوں کے نوحوں کو آرکسٹرا کے سُریلے نغمے سمجھا جانے لگا اور
کنواریوں کی پاکیزگی کو شراب میں ڈبویا جانے لگا ــــــ اس
آگ اور خون کے طوفان سے نواب صاحب کی حویلی بھی نہ بچ
سکی۔ حمیدن اپنی ماں کیساتھ بڑی مصیبتوں سے کیمپ میں پہنچ گئی
تھی اسے نواب صاحب، بیگم، حسو اور دوسرے نوکروں کا حال
معلوم نہ تھا۔ اس کے خوابوں کی دنیا اجڑ گئی تھی اس کے سنہری
تخیلات میں بیکراں سناٹے پھیل چکے تھے۔ اس کے اردگرد موت
سہمی ہوئی بکھری ہوئی تھیں اور اپنی موت کے خیال سے اسکا دل
نیچے ڈوبتا جارہا تھا اب اس کا جی چاہنے لگا تھا کہ کہیں سے حسو
ہی آجائے اور اسکی خوف زدہ جوانی کو سہارا مل جائے لیکن نہ جانے
حسو کہاں پڑا تڑپ رہا تھا؟ اور نواب صاحب اور بیگم کس حال
میں تھے؟ کیمپ میں تباہ حال مخلوق کی تعداد بڑھتی جارہی تھی اور
چیخوں اور کراہوں میں ہر لمحہ اضافہ ہوتا جارہا تھا حمیدن نے بہت
ڈھونڈا لیکن اسے کوئی بھی سہارا نہ مل سکا اسکی ماں پر جیسے فالج گر پڑا
تھا، وہ جہاں پر بیٹھتی وہیں بیٹھی رہتی۔ اس کے سینے میں بھی دہشت زدہ
اور متلاطم رہا تھا، لیکن حلق کے نیچے ہی وہ تڑپ تڑپ کر ختم ہورہی
تھیں .... اسپیشل ٹرین پہ سوار ہوکر حمیدن کو کچھ ہوش نہ رہا تھا
کہ وہ کہاں جارہی ہے اس کے کانوں میں موت کی گھنٹیاں سنسنا رہی
تھیں اور ذہن میں کچلی ہوئی بہاروں کی سسکیاں بکھری ہوئی تھیں
سرحد پار کرکے جب اسے نئے نعرے سنائی دیئے اور ڈبہ میں بیٹھے
ہوئے خوف زدہ انسانوں کی سرگوشیوں میں خوشی کی لہریں پھیلنے لگیں
تو حمیدن کو بھی احساس ہونے لگا۔ جیسے گاڑی کے کھڑے ہوتے
ہی نواب صاحب یا حسو اسے خوش آمدید کہہ کر اس کے خوف و ہراس
کو دور کردیگا۔ اور پھر وہ چہچہاتی ہوئی رونقوں میں مدغم ہوجائیگی،
لیکن گاڑی کے رکنے پر پلیٹ فارم پہ نہ تو اسے نواب صاحب دکھائی
دیئے نہ ہی حسو نظر آیا۔

تباہ حال مخلوق کے جم غفیر کو دیکھکر اس کے دل کو دھکا سا
لگا اور اسے محسوس ہونے لگا کہ ابھی اس کی منزل دور ہے وہ جہاں
پر پہنچنا چاہتی ہے وہ مقام ابھی نہیں آیا جب سب مسافر اتر گئے
تو اس کو بھی ماں کے ساتھ ڈبہ خالی کرنا پڑا۔ منزل پہ پہنچ کر بھی وہ کہیں
اور جگہ جانا چاہتی تھی۔ جہاں پر نواب صاحب ہوں، حسو ہو، زندگی
کی سنورتا ہو۔ لیکن گاڑی اب آگے نہیں جاسکتی تھی اس کا سفر ختم
ہوچکا تھا۔ کیمپ تک پہنچتے ہوئے حمیدن کو ہر لمحہ پاس سے گزرتے
ہوئے لوگوں کی گھورتی ہوئی آنکھوں میں نئے سہاروں کے ہیولے
تیرتے نظر آتے تھے اور اس کا جی چاہتا تھا کہ کوئی آگے بڑھکر اس کا
ہاتھ تھام لے اور اس کی زندگی کے اردگرد پھیلی ہوئی موت کی
ویرانیوں کو دور کردے۔ لیکن کیمپ تک اس کے احساسات
اور جذبات یونہی ابھرتے اور مٹتے رہے اور کسی نے بھی آگے
بڑھ کر اس کا ہاتھ تھامنے کا ارادہ نہ کیا کیمپ کے ماحول میں چند دن
قیام کے بعد ایک نیا خیال اس کے ذہن میں رینگنے لگا تھا کہ اگرچہ
اس سے زندگی کی آسائشیں چھن گئی ہیں۔ لیکن اب وہ درندوں
کے حملوں سے تو محفوظ ہے اور آہستہ آہستہ یہ روتے ہوئے دن
ہنستے ہوئے دنوں میں بدل جائیں گے۔

اس کے ساتھ کے ٹینٹ میں ایک بوڑھی عورت عا
اور اس کا جوان بیٹا صفدر رہتے تھے۔ چند دنوں میں ہی وہ ا

اتھ گھل مل گئے وہ بھی بہت دکھی تھی ۔ اور ایک دوسرے کے دکھ کو بٹانے
خاطر اکٹھے بیٹھ کر مستقبل کی حسین ساعتوں کا ذکر کرتے رہتے تھے صفدر کی
تھک کوششوں سے اسے شہر میں مکان مل گیا اور حمیدن کی ماں کو بھی
ب صفدر نے اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی
یدن کو محسوس ہوا جیسے ٹوٹتی ہوئی کڑیوں کو سنبھال ل
یا ہے ۔ نئے مکان میں پہنچ کر ان کے چہروں پر کھنڈا ہوا کرب تبسم بنکر
چمکنے لگا ۔ صفدر کے نرم اور میٹھے لہجے نے حمیدن کے ذہن میں رنگینی ہوئی
واب صاحب اور حسد کی پرچھائیوں کو اپنے سائے سے ڈھانپ دیا
تھا اور آہستہ آہستہ وہ صفدر کو دیکھ کر اپنی جوانی میں وہ ایک انوکھا
کھار محسوس کرنے لگی تھی اور اسے یوں معلوم ہونے لگا تھا کہ اس کے
بدن کا پہلا لمس صفدر کے لئے ہی وقف ہے ۔ صفدر بھی ایک خاص
رنگ و ستے اس کی طرف دیکھتا تھا اس کی آنکھوں میں ماضی کی متبسم بہاروں
کو زندہ کرنے کی خواہش مچلا کرتی تھی اور ایک دن حمیدن نے اپنے کانوں
سے سن لیا کہ عنقریب ہی صفدر اس کے حسین سپنوں کا البیلا راجہ بنکر
اس کے انگ انگ میں کیف و سرور بھر دے گا ۔ صفدر کی ماں اس کی
ماں سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی ۔ کس کو معلوم تھا کہ ہم یوں
نئی منزل پر اکٹھے ہو جائیں گے ۔ میں اب چاہتی ہوں کہ ہمارا یہ ملاپ
ایک یادگار بن جائے اس لئے صفدر کو تم اپنا بیٹا بنا لو ۔ اور حمیدن
کی ماں خوش ہو کر بولی تھی ۔ کئی دنوں سے اندازہ کر رہی تھی کہ اس کے
متعلق تم سے کچھ کہوں لیکن ایک جھجک زبان روکے ہوئے تھی اللہ کا
ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے میرا بوجھ ہلکا کر دیا ہے ۔

اس خوشخبری کے بعد حمیدن صفدر سے شرمانے لگی تھی اسے
دیکھ کر ذرا سا گھونگھٹ نکال لینے میں اسے راحت محسوس ہوتی
تھی صفدر نے گلی کے کونے پر بازار میں پان سگریٹ کی دوکان لاٹ
کر لی تھی اور گھر کا فالتو سامان بیچ کر دوکان کے لئے نیا سامان خرید لیا
تھا ۔ فساد سے پہلے شنکر پنواڑی کی دکان مشہور تھی اور اب صفدر
کی ہنس مکھ طبیعت اور اچھے برتاؤ نے دکان کو اور زیادہ مشہور کر دیا
تھا رات کو وہ دس بجے کے بعد گھر واپس آتا تھا اور دن میں بھی ایک
دو چکر لگا لیتا تھا جب تک وہ گھر سے باہر رہتا تھا حمیدن کی نگاہیں
بار بار دروازے کی طرف اٹھتی تھیں ۔ وہ چاہتی تھی کہ صفدر ہر وقت
اس کے سامنے بیٹھا رہے اور وہ اسے دیکھ کر اونچی فضاؤں میں پرواز
کرتی رہے ۔ رات کو جب صفدر دکان بند کر کے گھر واپس آتا تو حمیدن
جاگ رہی ہوتی ۔ صفدر کو دیکھے بغیر اسے نیند نہ آتی تھی کوئی نہ کوئی
بہانہ کر کے وہ دکھا دے کا گھونگھٹ نکالے اس کے گرد چکر لگا لیتی تھی
اور صفدر اس کی ان حرکات کو اپنی محبت کی کامیابی سمجھتا تھا شادی
کے دن نزدیک آ رہے تھے ۔ اور گھر میں مسکراہٹیں جوان ہونے
لگی تھیں ۔ بوڑھیوں کی خوشی کا بھی کوئی ٹھکانہ نہ تھا اور ابھی مسرتوں کے
ننھے کامرانی کی بلندیوں کو چھونے ہی والے تھے کہ ایک بھیانک جھٹکے
سے وہ لرز اٹھے اور ان کو زلزلاتی ہوئی چیخوں نے نگل لیا صفدر
شام کو بجلی جلائے دکان پر بیٹھا ہوا تھا اور محلہ کے چند نوجوان سامنے
بنچ پر بیٹھے ہوئے تھے ۔ یکدم ان میں کسی بات پر تکرار ہو گئی ۔ جھگڑا
بڑھتا گیا ۔ دو پارٹیاں بن گئیں ۔ لوگ اکٹھے ہو گئے تماشہ دیکھنے
والے زیادہ تھے اور معاملہ کو رفع دفع کرانے والے کم تھے صفدر
دکان سے اتر کر دونوں پارٹیوں کے جوش کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش
کرنے لگا ۔ لیکن اس کی نصیحت زیادہ کارگر ثابت نہ ہوئی ۔ اور
جھگڑے نے لڑائی کی صورت اختیار کر لی ۔ لوگ دکانوں کے
تختوں پر کھڑے ہو گئے ۔ گھونسوں کے علاوہ صفدر کی دوکان پر رکھی
ہوئی سوڈا واٹر کی بوتلوں کا آزادانہ استعمال ہونے لگا ۔ صفدر
بھیڑ میں سے نکل ہی رہا تھا کہ ایک بوتل اس کے سر پر زور سے
آ کر لگی اور وہ چکرا کر گر پڑا ۔ سر پھٹ گیا تھا اور خون کی چادر سڑک
پر پھیل گئی تھی کسی نے چلا کر کہا "صفدر مارا گیا !" اور لڑنے والوں
کے ہاتھ جہاں پر تھے وہیں پر رک گئے ۔ صفدر دونوں پارٹیوں
کے لئے ایک جیسا عزیز تھا اور اس حادثہ نے ان کے جوش کو ٹھنڈا
کر دیا تھا ۔

اسی وقت صفدر کو ہسپتال پہنچا دیا گیا اور جب اس کے
گھر یہ خبر پہنچی تو صفدر کی ماں کو جیسے سکتہ ہو گیا جہاں پر بیٹھی تھی
وہیں پر بیٹھی رہی اور حمیدن کی ماں نے چھاتی کو پیٹنا شروع کر دیا
اور حمیدن پر غشی طاری ہو گئی چند لمحے پہلے جس گھر میں خوشیوں

کی پھواریں رقصاں تھیں۔ اب وہاں غموں کے دھارے بکھر گئے تھے۔ صفدر کی ماں کو جب ذرا ہوش آیا تو وہ حمیدن کی ماں کے ساتھ روتی چلاتی، سر پیٹتی ہسپتال کی طرف چلی گئی۔ حمیدن گھر میں اکیلی رہ گئی تھی۔ بہت دیر بعد اسکی غشی دور ہوئی۔ سینے میں چکراتی ہوئی کراہیں ذہن کی طرف بڑھنے لگیں "یہ کیا ہو گیا ہے" "ایسا کیوں ہوا ہے"۔ اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ اتنی جلدی اس کی پھیلی زندگی میں بھیانک الم ناکیاں پھیل گئی تھیں۔ اس کے سنہری سپنوں میں انگارے ناچ اٹھے تھے۔ صفدر کی زندگی کی وہ گڑگڑا کر دعائیں مانگنے لگی تھی اسکی سلامتی کی خاطر اپنی زندگی کی قربانی دینے کو تیار تھی لیکن اس کے دکھوں میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ بوڑھیوں کے تڑپتے ہوئے آنسو صفدر کو موت کی آغوش سے الگ نہ کر سکے وہ آخری سفر پر روانہ ہو گیا اور سب روتے رہے پیٹتے رہے سر پیٹتے رہے۔

اب ان کی زندگیوں میں پھر بھیانک سناٹے رقصاں ہو گئے تھے سب کا سہارا ٹوٹے ہوئے ستارے کی مانند آسمان کے سینے پر روشن خراش پیدا کرتا تاریک خلاؤں میں گم ہو گیا تھا اور اب روشنی کے بغیر زندگی کی پیچ پیچ پگڈنڈی پر قدم اٹھانا ان کے لئے دوبھر ہو گیا تھا۔ صفدر کی موت کا غم ان کی روح کی غذا بن گیا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے ہر وقت اسکی باتیں رہتی تھیں اور حمیدن کو محسوس ہوتا تھا کہ صفدر کی موت کے بعد اسکی دوشیزگی کا تمام رس بھی نچڑ چکا ہے اس کے البیلے جذبات برف کی موٹی سل تلے دب گئے ہیں اور اس کے نشیلے ارمان جھلس کر کسی ویرانے میں کراہ رہے ہیں دکان بند پڑی تھی اور گھر میں جو کچھ تھا وہ کفن دفن پر خرچ ہو چکا تھا۔ بھوک تیز ہونے لگی تھی، گھر کی ویرانیاں قہقہے لگا رہی تھیں۔ حمیدن کی ماں نے فیصلہ کیا کہ باقی ماندہ دن گزارنے کے لئے وہ دکان کو خود چلائے گی اور حمیدن کچھ سوچ کر بول پڑی ۔ "نہیں ماں۔ اس بڑھاپے میں میں تمہیں کوئی کام نہ کرنے دوں گی۔ تمہیں مزید دکھوں سے بچانے کی خاطر اب مجھے ہی صفدر بننا پڑے گا۔ میں صفدر کی یادگار کو قائم رکھوں گی ---- اور

دونوں بڑھیوں کے منع کرنے پر بھی اس نے دکان کا تالا کھول لیا تھا۔ اب اس کے سینے میں کسی کو دیکھ کر گدگدی نہ ہوتی تھی۔ اس کا جی نہ چاہتا تھا کہ کسی کے بازوؤں کے حلقے میں وہ اپنی جوانی کا جھولا جھولتی رہے۔ صفدر کی موت نے پیار کے گہرے نقش کو اس کے دل و دماغ پر ثبت کر دیا تھا۔ اور اب وہ نہ چاہتی تھی کہ یہ نقش کسی طرح مٹ سکے۔ نواب صاحب اور حسب سے بچھڑنے کے بعد وہ جلد ہی سنبھل گئی تھی۔ اور صفدر سے بچھڑنے کے بعد اسے اپنے آپ کو سنبھالنا ناممکن دکھائی دے رہا تھا۔

"صفدر کے نام پر کچھ دیدو بیٹی" ! ---- اس کے خیالات ایک جھٹکے کے ساتھ منتشر ہو گئے۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ دکان کے آگے ایک فقیر کھڑا تھا۔ اس نے ایک آنہ فقیر کی ہتھیلی پر رکھدیا اور فقیر دعا دینے لگا۔ "ہمیشہ سکھی رہو بیٹی" حمیدن چلا اٹھی۔ "مجھے اپنے لئے کچھ نہیں چاہیئے بابا۔ صفدر کی روح کے لئے دعا مانگو۔ خدا اسے سکھی رکھے"۔ اور پھر اسکی نظریں تختہ کے ساتھ لٹکی ہوئی موم بتی پر جم کر رہ گئیں جو آہستہ آہستہ اس کی جوانی کی مانند سلگ رہی تھی......!

(این۔ ڈبلیو۔ آئی میکرین)

برنین ~~~~~~ دماغ

دماغ کو روشن اور شگفتہ کرتی ہے

قوت حافظہ کو تقویت پہنچاتی ہے

مفرح اور مقوی قلب ہے

بڑھاپے میں صحت کا سہارا ہے

قیمت۔ بیس یوم کے لئے چار اونس دوا، چار روپے

تیار کردہ

حاذق دواخانہ، بندر روڈ، کراچی نمبر

صدیقی

عصمتِ نظر!

جلوؤں کے ایک نرغے میں آئے ہوئے ہیں ہم
پر عصمتِ نظر کو بچائے ہوئے ہیں ہم

کوئی ہماری آ کے اُڑائے ہی ہنسی کیوں
اب کیا بتائیں کس کے رُلائے ہوئے ہیں ہم

اک شاعری ہے تیری محبت کا ادّعا
کن کن بتوں کو دل میں بٹھائے ہوئے ہیں ہم

کھوئے ہوئے سے آپ نظر آ رہے ہیں آج
جی چاہتا ہے کہہ دیں کہ پائے ہوئے ہیں ہم

ہم نے تو دار پر سے پکارا ہے تیرا نام!
کہتے ہیں لوگ تجھکو بھلائے ہوئے ہیں ہم

بس تم کو چاہنے کی خطا ہم سے ہو گئی —
سارے جہاں کے آج پرائے ہوئے ہیں ہم

اے چرخ! احترام ہو اس مشتِ خاک کا
معلوم بھی ہے کس کے مٹائے ہوئے ہیں ہم

ہم کو نہ چھیڑیے کہ ہزاروں قیامتیں!
دل میں تھپک تھپک کے سلائے ہوئے ہیں ہم

حق بات کہنے آئے ہیں قیصر کے سامنے
اپنی صلیب آپ اٹھائے ہوئے ہیں ہم

چوروں کے اک ہجوم میں سینے پہ رکھ کے ہاتھ
تیری امانتوں کو چھپائے ہوئے ہیں ہم

اس عشق کو قبول نہیں ترکِ روزگار
دونوں جہاں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں ہم

حق کے لئے یقین ہے بُت کے لئے عمل
دونوں طرف ہی بات بنائے ہوئے ہیں ہم

ہے اس طرف سے ایک اشارے کا انتظار
پہلو میں ایک حشر دبائے ہوئے ہیں ہم

باطل کے اقتدار میں تقویٰ کی آرزو؟
ہے کیا حسیں فریب جو کھائے ہوئے ہیں ہم

غیروں کی دشمنی کا گلہ ہم نے کب کیا؟
اپنوں کی شفقتوں کے ستائے ہوئے ہیں ہم

یہ اپنا ضبط تھا کہ تمہیں بھی خبر نہیں
اک چوٹ ہو کہ سینے پہ کھائے ہوئے ہیں ہم

اے آندھیو! سنبھل کے چلو اس دیار میں
امید کے چراغ جلائے ہوئے ہیں ہم

جس کو نہ دیں کسی کے تقدس کے مول بھی
دامن پہ ایسے داغ سجائے ہوئے ہیں ہم

ہم بزمِ کفر و دیں میں بھی نکلے ہیں سرفروش
بزمِ سخن میں آ کے بھی چھائے ہوئے ہیں ہم

(چراغِ راہ)

شوکت تھانوی •

سات سو چھیاسی

میرے باسی افسانے پڑھنے والے میرے تازہ افسانے کا اکثر تقاضا کرتے رہتے ہیں تاکہ اس افسانے کو بھی باسی بنا کر اپنے تقاضے کو تازہ رکھیں۔ اور میں ہمیشہ ان سے اس طرح کترا تا رہتا ہوں گو یا میں ان کا مقروض ہوں اور واقعی مجھ کو بالکل اسی طرح منہ چھپانا پڑتا ہے جیسے میں سچ مچ مقروض ہوں اور یہ سب تقاضا کرنے والے کابلی پٹھان ہیں۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ قرض اور مقروض اور تقاضے کا تصور میرے ذہن میں اس قدر راسخ ہو چکا ہے کہ ان تقاضا کرنے والوں سے میں بہانے حیلے اور عذر بھی بالکل اس طرح کرتا ہوں جس طرح مقروض شرفاء تقاضا کرنے والے پٹھانوں سے عذر اور عذر لنگ کرتے ہیں کہ ان صاحبان میں سے کوئی صاحب نازل ہوئے اور مجھ کو دروازے کے باہر عین اس وقت گرفتار کیا جب میں ترکاری والے سے مٹر کی پھلیوں کی گرانی پر تبادلہ خیال کر رہا تھا تو ظاہر ہے کہ ان کو کمرہ کھول کر بٹھانا پڑتا ہے۔ سگریٹ کی ڈبیہ کھول کر جو ملے پر سے دیا سلائی کی ڈبیہ لانا پڑتی ہے۔ گرمی ہو تو پانی کے لئے پوچھنا پڑتا ہے جس کا مطلب ہوتا ہے کہ سے کم لیمونڈ اور زیادہ سے زیادہ نہ جانے کیا۔ اور جاڑے کا موسم ہو تو چائے کے لئے پوچھنا ایک افسانہ نگار کی وہ بد اخلاقی ہے کہ اس کے ادیب اور انشا پرداز ہونے پر شبہ ہو سکتا ہے۔ بہرحال ان تمام ابتدائی مدارج کے بعد وہ نوبت آتی ہے جس سے کہ میرے نزدیک موت کا آنا زیادہ بہتر ہے یعنی وہ حضرت فرماتے ہیں کہ "ہاں صاحب کوئی تازہ افسانہ؟" اور اب ادھر سے وہ تمام معذرتیں پیش ہوتی ہیں جو صرف ایک مقروض اس خوفناک پٹھان کے سامنے پیش کر سکتا ہے جس سے اس نے قرض لیا ہو کہ صاحب کیا فسانہ اور کیا فسانہ نگاری۔ حال یہ ہے کہ سارا گھر اسپتال بنا ہوا ہے۔ بیگم صاحبہ کو آپ جانتے ہی ہیں۔ قلب کی پرانی مریض ہیں۔ آج کل تو خیر مالٹوں کے رس کے بدولت دل ذرا ٹھیرا رہتا ہے۔ مگر حال یہ ہے کہ گھڑی میں ماشہ گھڑی میں رتی۔ بڑی بچی کے عقل ڈاڑھ نکل رہی ہے جس نے والدین کی عقل ٹھکانے نہیں چھوڑی ہے سارا منہ سوج کر رہ گیا ہے اور درد کی وجہ سے ایک چیخ زمین پہ تو ایک چیخ آسمان۔ کل ڈاکٹر شگاف دیگا تو عقل برآمد ہوگی۔ ڈاڑھ کی صورت میں منجھلا بچہ پتنگ اڑانے میں کوٹھے سے گر کر بچ گیا ہے اور مارے ڈالتا ہے ہم لوگوں کو۔ ان بیماروں کو دیکھنے کے لئے دور دور قریب کے ایسے ایسے عزیز جوق در جوق چلے آرہے ہیں کہ کل رات تو میں خود مجبوراً اپنے لکھنے کی میز پر سویا۔ ان حالات کون افسانہ لکھ سکتا ہے۔ اس ساری رام کہانی کے جواب میں ادھر سے ایک دلربا تبسم اور پھر ایک نہایت غیر متعلق سی بات قصہ یہ تھا قبلہ چار مہینے کی غیر حاضری کے بعد اب کی ارادہ ہے کہ رسالے کا خاص نمبر نکال دیا جائے اور آپ جانتے ہیں کہ اگر آپ ہی کا افسانہ اس میں نہ ہو تو پھر وہ خاص نمبر کیا ہوا۔ آپ کے لئے یہ معمولی سی بات ہے بس قلم لے کر بیٹھ جایئے اور گھسیٹ دیجئے ایک چھوٹا سا افسانہ!

یہ وہ موقع ہوتا ہے کہ افسانہ نگار بڑے سے بڑا جرم بھی کر سکتا ہے اور اگر ضبط سے کام لے تو دماغ پر کوئی مستقل ناخوشگوار اثر پڑ سکتا ہے مجھے اکثر خیال آتا ہے یہ جو چاروں طرف ملک میں جابجا پاگل خانے ہیں ان میں زیادہ تر وہی لوگ ہوں گے جو ضبط کرتے کرتے آخر خود ضبط ہو کر رہ گئے ہیں اور بعض اوقات جب میں جیل روڈ کی طرف سے گزرتا ہوں تو پاگل خانے کی چہار دیواری پر بڑی مانوس سی نگاہیں ڈالتا ہوں کہ شاید میرے تازہ افسانے مجھے یہاں تک لے آئیں۔

آپ حیران ہونگے کہ آخر یہ ایسی کونسی بات ہے جس کا میں نے خواہ مخواہ بتنگڑ بنا رکھا ہے۔ صاف سی بات ہے کہ کوئی تازہ افسانے کا تقاضا کر رہا ہے تو کہہ دیجئے کہ نہیں ہے یا اگر ہے تو دیدیجئے مگر آپ کو معلوم نہیں کہ میں کتنا با اخلاق انسان واقع ہوں اور ان فرمائشوں تقاضوں کو رد کرنا میرے لئے کس حد تک ناممکن ہے۔ ظاہر ہے ا

نگاری کے علاوہ میرا ایک اور کام بھی ہے کہ میں بال بچوں کے لئے قلم کی چکی چلا کر کچھ حاصل کروں۔ ان کا پیٹ بھروں اور تن ڈھکوں اور یہ تقاضا کرنے والے زیادہ تر وہ ہوتے ہیں جن کا رسالہ یا اخبار فی الحال ابتدائی مشکلات میں مبتلا ہوتا ہے اور جو صرف ادب کی خدمت کے شوق میں گھر پھونک تماشا دیکھنے میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ان کی تمام گفتگو کا حاصل صرف یہ ہوتا ہے کہ اگر معاوضہ پیش کرنے کی کبھی حیثیت ہوئی تو سب سے پہلے آپ کی خدمت کی جائے گی۔ مگر فی الحال آپ ادب کی خدمت کیجئے۔ اس لئے کہ

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے

بمشکل تمام افسانہ کے ان قرق امینوں کو ایک تازہ غزل دیکر اس طرح ٹالا جاتا ہے جیسے تقاضہ کرنے والے پٹھان کو اصل کے بجائے سود دیکر رخصت کیا جاتا ہے کہ ع

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

رہ گئے وہ تازہ افسانہ مانگنے والے جو افسانہ نگار کو بھی سڑک کا نل نہیں بلکہ اپنی ضروریات میں مبتلا ایک انسان سمجھتے ہیں اور اس کی محنت کا معاوضہ دینے میں بخل سے کام نہیں لیتے ان کے لئے تو دیدۂ دل فرش راہ رہا کرتا ہے۔ اور جی چاہتا ہے کہ اس معاوضے کا پورا حق ادا کر دیا جائے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ وہ بات نہیں ہوا کرتی جس کے لئے انسان کا دل چاہے خصوصاً مجھے اپنا اندازہ ہے کہ اس قسم کے موقعوں پر میرے حالات عموماً کچھ ناسازگار ہو ہی جاتے ہیں۔ وجہ کیا ہے یہ خود میری سمجھ میں نہیں آتا بہت کچھ غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ شاید میں نے کبھی کسی درویش منش ایڈیٹر کی درخواست نامنظور کر دی ہے اور اسی کے دل سے یہ بد دعا نکل گئی ہے کہ جا بچہ تو بھی کبھی سکون سے افسانے نہ لکھ سکے گا۔

اس بد دعا کا اثر یوں سمجھئے کہ کل ہی ایک رسالے کے ایک نہایت باحوصلہ مالک افسانہ مانگنے تشریف لائے۔ اور افسانہ مانگنے سے پہلے ہی چیک بک نکال کر چیک کاٹ دیا کہ "یہ حاضر ہے، مگر افسانہ ہم کو جلد ہی چاہیے۔ بس آپکے خاص رنگ کا شاہکار ہو" جی چاہا کہ اس شریف اور واقعی نجیب الطرفین انسان کو اٹھا کر کلیجہ سے لگا لیں۔ مگر انکی حرارت نے خود اپنے کلیجے کو بہت دور کر رکھا تھا۔ دوسرے اندیشہ تھا کہ کہیں یہ حضرت اس خلوص اور عقیدت سے یہ نہ سمجھ لیں کہ ہو کے دھانوں میں پڑا ہے۔ لہٰذا جذبات کو بمشکل دبا کر نہایت بے اعتنائی سے چیک میز پر گویا ڈال دیا اور ان سے وعدہ کر لیا کہ پرسوں تک افسانہ منگا لیجئے۔

آپ کو معلوم ہے کہ چیک کیش کرانے اور کیش کرا لینے کے بعد کے واقعات میں کم سے کم ایک دن تو لگ ہی جاتا ہے اور جب تک چیک کیش نہ ہو دماغ میں افسانہ کے پلاٹ کے لئے جگہ نہیں نکلتی۔ ضروریات فکر سے دماغ کا ہر خانہ لبریز ہوتا ہے چنانچہ ایک دن تو بینک اور بازار کے چکر میں نکل گیا دوسرے دن کی ابتدا کچھ منحوس ہوئی۔ گھر کی نہایت پرانی ملازمہ نے آکر جگایا۔ اور ان کی صورت دیکھتے ہی کلیجہ دھک سے ہو گیا کہ خدا ہی خیر کرے ان کی زیارت کے بعد دن بھر جو کچھ ہو سکتا ہے اس کا بارہا تجربہ کر چکے ہیں ایک مرتبہ ان محترمہ کی صورت دیکھی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسی دن والد صاحب کا انتقال ہوا۔ اور زندگی بھر کے لئے یتیم بن گئے کچھ دنوں کے بعد ان محترمہ نے پھر جگایا اور یقین جانئے کہ اسی دن دفتر کے ایک اعلیٰ افسر سے وہ تو تو میں میں ہوئی ہے کہ اگر وہ افسر واقعی شریف نہ ہوتا تو ملازمت بھی گئی تھی ہاتھ سے مگر دو سال کے لئے ترقی بند ہو گئی۔ تیسری مرتبہ کا تجربہ ہے کہ صبح اٹھ کر ان کا دیدار ہو گیا تھا۔ راستہ میں بائیسکل کا پہیہ ایسا نکلا ہے کہ اسپتال میں اس وقت ہوش آیا جب ایک نرس دوسری نرس کو سمجھا رہی تھی کہ یہ سرکس کا آدمی ہے۔ ایک پہیئے کی بائیسکل پر کرتب دکھا رہا تھا۔ لاری سے ٹکرا گیا مختصر یہ کہ آج ان محترمہ نے پھر جگایا کہ اٹھئے سرکار بلاوا آیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آغا جانی کی ساس کا انتقال ہو گیا ہے۔ یہ خبر بجائے خود کچھ کم نہ تھی۔ ایک زندہ آدمی کے لئے اس سے بڑا حادثہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کو کسی جنازے میں شرکت کرنے کی دھمکی صبح ہی صبح دی گئی ہو۔ مگر ان محترمہ کو دیکھ کر دل کو کچھ یقین سا ہو گیا کہ شاید خود اپنے انتقال کے لئے بھی آج ہی کا دن مقرر ہے اب ذرا اس دن کی روئداد کو سن لیجئے۔ آغا جانی کی ساس کی میت میں شرکت کی۔ قبرستان میں ایک ٹوٹی ہوئی قبر کے اندر اوندھے منہ گرے اور چشمہ قبر کے اندر ہی رہ گیا۔ خدا غریق رحمت کرے بہت دنوں کا ساتھ تھا یہ چشمہ بھی قبرستان سے واپسی پر تانگہ وہ ملا جس کا گھوڑا سو والے گھوڑے کا بھانجا تھا اور اپنے ماموں جان کی وضع کا سختی سے پابند۔ آدھ گھنٹے

نہ جب اس تمام نہا دھو کر سے نے دو گھنٹے میں طے کیا اور گھر پہنچے تو معلوم ہوا بیگم صاحبہ پر قلب کا ایک دورہ پڑ چکا ہے اور دوسرے کا شدید انتظار ہے ا بیچاری کے قلب کی حالت واقعی یہ ہے کہ آغا جانی کی سانس کیا معنے کسی ا سانس بھی داعی اجل کو لبیک کہیں۔ ان کے دل کی حالت دگرگوں ہو جاتی دالبتہ شکر ہے کہ خود اپنی سانس کے انتقال کے وقت ذرا افاقہ رہا تھا بہر حال اب دوڑنا پڑا مالٹوں کے لئے اور کچھ دوسری مفرح قلب معجونوں اور مربوں کے لئے۔ رات گئے تک مالٹوں کے رس نکالے گئے۔ بید مشک کے شربت بنائے اور جب خدا خدا کر کے دوبارہ سو گئیں تو میز پر آئے۔ کاغذ نکالا۔ قلم میں روشنائی ٹیبل لیمپ میں غسل خانے کا بلب نکال کر لگایا۔ اور اس کا پلگ لگا ہی رہے تھے کہ "بھک" سے ایک آواز آئی ؎

ایک شعلہ سا گرا شیشے سے پیمانے میں
وہ کرن پھوٹی اندھیرا ہوا میخانے میں

فیوز اڑ گیا۔ اب بتایئے کیا جائے۔ یہ بھی تو پتہ نہیں کہ دیا سلائی کی ڈبیہ کہاں رکھی ہے۔ فیوز جوڑنے کا تار کہاں ہے اختلاجی بیوی کو جگانا اور قیامت کو بیدار کرنا ایک ہی بات ہے۔ خود ہی دبے پاؤں ٹٹولتے ہوئے باورچی خانے میں پہنچے۔ اندھیرے میں ٹٹول ہی رہے تھے کہ ایک چیخ فضا میں گونجی "ادئی کون" "لاحول ولا قوۃ" یہ وہی مبارک دمسعود ملازمہ تھیں جلدی سے کہا بوا میں ہوں۔ دیا سلائی کی ڈبیہ ڈھونڈ رہا ہوں" اور ان محترمہ نے جرح شروع کر دی

"لو اور سنو دیا سلائی کی ڈبیہ جیسے میرے پلنگ ہی پر تو رکھی ہے"

مگر خیریت یہ ہوئی کہ خود ہی ایک ہاتھ بڑھا کر اندھیرے میں دیا سلائی کی ڈبیہ بجا دی۔ میں بدستور صفائی پیش کر رہا تھا "فیوز اڑ گیا ہے نا۔ اندھیرے میں دیا سلائی کی ڈبیہ ڈھونڈھنا بھی تو مشکل ہے۔ بغیر دیا سلائی کے لاؤ مجھے دو۔ اور ان محترمہ نے ہاتھ بڑھا کر اندھیرے ہی میں دیا سلائی کی ڈبیہ میری ناک کو سنگھا دی۔ دیا سلائی کی تیلیاں جلا جلا کر فیوز کا تار ڈھونڈا اور ایک اخبار جلا کر اس کی روشنی میں فیوز جوڑ رہا ہی تھا کہ گھڑی نے ساڑھے بارہ بجے کا ادھا بجا دیا۔ پھر بھی میز پر آنا پڑا۔ اس لئے کہ وہ صبح آنے والے تھے افسانہ لینے جن کے دیئے ہوئے چک میں سے اب صرف چند آنے باقی رہ گئے تھے۔ مگر میز پر ٹیبل لیمپ لگانے میں پھر فیوز اڑ جانے کا اندیشہ تھا لہذا

طے یہ کیا کہ میز کو گھسیٹ کر چھت سے لٹکے ہوئے بلب کے نیچے لیجائیں اور لکھنا شروع کر دیں۔ میز کو گھسیٹا ہی تھا کہ آواز آئی "کون" "بھئی استغفر اللہ" یہ بیوی صاحبہ کی آواز تھی۔ جو بمشکل سوئی تھیں۔ جلدی سے جواب دیا "میں ہوں۔ میز گھسیٹ رہا ہوں" جواب ملا "دوڑیئے جلدی" اور اب جو جا کر تکتے جاتے ہیں تو وہ پسینے میں شرابور پھٹی پھٹی آنکھیں لئے نہایت وحشت سے گھور رہی ہیں۔ اور گھبرا گھبرا کر کہہ رہی ہیں "پانی، اختلاج ہائے مرا دل" اس قسم کے موقعوں پر میرے جیسا آدمی خود اختلاج میں مبتلا ہو جاتا ہے اور گھبرا گھبرا کر عجیب و غریب حرکتیں کرتا ہے۔ مثلاً پانی کے بجائے سرمہ دانی اٹھائی میز سے اس کو رکھا تو جلدی سے لپ اسٹک لیکر دوڑے اور بمشکل سمجھ میں آیا کہ یہ بھی غلط ہے آخری چیز عموماً صحیح ہوا کرتی ہے۔ تھرمس سے پانی انڈیلا اور اپنے سہارے ان کو بٹھلا کر پانی پلایا۔ جلدی سے مانشا نوح کر اس کی ایک آدھ قاش دی۔ اور جب ذرا دل ٹھہرا تو معلوم ہوا کہ وہ سمجھی تھیں کہ چور ہے اور وہ ٹرنک گھسیٹ رہا ہے جس میں ان کی چھوٹی بہن کے جہیز کے جوڑے رکھے ہیں۔ ان سے نہایت خندہ پیشانی سے باتیں کیں۔ ان کا دل بہلایا اور ان کو سونے کی ترغیب دی بمشکل وہ سوئی ہوں گی کہ گھڑی نے ٹن ٹن دو بجائے۔ گویا ڈیڑھ گھنٹے تک یہ تیمارداری کی گئی اور اب پھر میز پر آئے۔ اس لئے کہ صبح وہ افسانہ لینے والے ضرور آئیں گے۔ ڈبیہ سے نکال کر گلوری کھائی۔ سر پر ہاتھ پھیر کر گویا یکسوئی حاصل کرنے کی کوشش کی اور ایک کاغذ پر لکھا ۷۸۶۔ میں ہمیشہ بسم اللہ کے اعداد برکت کے لئے لکھ دیا کرتا ہوں۔ عنوان کی جگہ چھوڑی اور افسانہ شروع کر دیا۔

نسیم اپنے باپ کا بیٹا تھا۔

اور ایک دم قلم رک گیا۔ یہ کیا واہیات بات ہوئی۔ یہ سب کلیم شمیم اپنے اپنے باپوں کے بیٹے ہوتے ہیں۔ اور اس میں ندرت کیا ہے۔ اگر اس کو اس طرح لکھا جاتا کہ شمیم اپنے بیٹے نسیم کا باپ تھا تو یہ گویا ایک اپج اور ایک شوخ قسم کا انداز بیان ہو جاتا۔ لہذا یہ کاغذ الگ کر دیا اور دوسرے کاغذ پر پھر ۷۸۶ لکھ کر عنوان کی جگہ چھوڑی اور افسانہ شروع کر دیا۔

شمیم اپنے بیٹے نسیم کا باپ تھا۔

اور ایک دم رات کے سناٹے میں آواز گونجی۔ ابا ــــ آ۔

یسم نہیں بلکہ میں اپنے بیٹے کا باپ ضرور تھا جو مجھ کو پکار رہا تھا اور اندیشہ تھا کہ بیگم صاحبہ کا اختلاج پھر نہ جاگ اٹھے ۔ دوڑا ہوا گیا اور بستر پر دیکھا صاحبزادے سہمے ہوئے بیٹھے زار و قطار رو رہے ہیں ۔ ان کو لٹا کر تھپکا لوری کے طور پر ڈاکٹر اقبال کا شکوہ سنایا اور جب وہ سو گئے تو پھر چوروں کی طرح میز پر آئے ۔ مگر اب کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ شمیم اپنے بیٹے نسیم کا باپ فرض کر لیجئے کہ تھا تو ہم سے کیا ہوگا ۔ ہماری بلا سے اس کاغذ کو بھی ایک طرف کھسکا دیا اور ایک تیسرے کاغذ پر ۸۶ کے بعد عنوان کیلئے جگہ چھوڑ کر کچھ لکھا ۔ لکھ کر غور کیا ۔ کاغذ بدلا ۔ پھر لکھا ۔ پھر غور کیا ۔ پھر کاغذ بدلا ۔ اور اب جو بڑی بچی نے آکر شانے پر ہاتھ رکھا تو آنکھیں کھول کر دن چڑھا ہوا دیکھا بے شمار ۸۶ ، لکھے ہوئے کاغذات میز پر بکھرے ہوئے تھے اور ہر کاغذ پر نصف سطر تھی کسی میں نسیم اپنے باپ کا بیٹا تھا کسی میں شمیم لاولد تھا اور دو افسانہ لینے والے بس آتے ہی والے تھے ۔ لاحول پڑھ کر میز پر سے اٹھے اور آئینہ میں اپنا منہ دیکھا تو افسانہ کا عنوان نظر آیا ۔ دوڑ کر میز والے کمرے میں آئے ۔ دروازہ بند کیا ۔ میز پر آکر کاغذ اٹھایا ۸۶ ، لکھا اور عنوان لکھ دیا میرا تازہ افسانہ ۔ اس عنوان کے تحت وہ سب کچھ عرض کر گئے جو بیتی تھی اب خدا جانے یہ افسانہ بنا یا نہیں ۔

(نیرنگ)

جب کبھی آپ بیمار ہوں

جب کبھی اپنی صحت کی خاطر آپ کو کسی دواخانہ کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے تو اس وقت قدرتی طور پر آپکے دل میں یہ سوال پیدا ہوتے ہیں ۔
الف : کیا وہ دواخانہ جس سے آپ دوائی لینا یا منگانا چاہتے ہیں اپنے مرکبات میں قیمتی اور اصلی ادویہ صحیح اوزان کے مطابق ڈال رہا ہے ۔ ب : کیا تجربہ کار اور صحیح طبیب آپکے لئے صحیح دوا تجویز کر رہے ہیں ——— خدا کا شکر ہے کہ اس کے فضل و کرم سے حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی نمبرا اس دھوکہ بازی اور اشتہار بازی کے زمانہ میں بھی اس دوگونہ معیار پر پورا اتر رہا ہے

عالی جناب حکیم سید منظر احمد صاحب دہلوی کی سرپرستی حاذق دواخانہ کی اس صداقت کی بہترین دلیل ہے
حکیم صاحب موصوف کسی تعارف کے محتاج نہیں ہندوستانی پبلک عموماً اور طب یونانی سے دلچسپی رکھنے والے خصوصاً مدت دراز سے حکیم صاحب کو اچھی طرح جانتے ہیں ۔ آپ ۳۷ سالہ تجربہ رکھتے ہیں ۔ آپ کی زندگی کے آٹھ قیمتی سال مسلسل طور پر مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کے طبیب پیشی کی حیثیت سے ان کے ساتھ سفر و حضر میں کٹے ۔ آپ ہندوستانی دواخانہ کے مسلسل چھ سال تک ہر شعبہ کے نگراں رہے ۔ کتاب حاذق اور مطب کلاں آپکی وہ مایۂ ناز اور مقبول عام تالیفات ہیں جو محتاج تعارف نہیں آپ طبیہ کالج دہلی کی اعلیٰ کلاسوں کے پروفیسر رہے ہیں ۔ اور آپ کی خدمات کے اعتراف میں یونانی طبیہ کالج کے جشن سلور جوبلی کے اہم موقعہ پر مارچ ۱۹۴۷ء میں منتظمان کالج نے آپکو ماہر طب کی اعزازی ڈگری سے سرفراز فرمایا ؎

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ان حقائق کے پیش نظر چونکہ حکیم صاحب موصوف بنفس نفیس حاذق دواخانہ کے جملہ امور کے نگراں ہیں اور مطب کے علاوہ اپنا تمام وقت اور اپنی توجہ دواخانہ کی اصلاح اور درستی میں صرف کرتے ہیں ۔ اس لئے ان کی نگرانی میں تیار کرائے ہوئے اس دواخانہ کے مجربات اور مرکبات آپ کی صحت کے بہترین ضامن ہیں ۔

مینیجر حاذق دواخانہ ، بندر روڈ ، کراچی نمبرا

سیم عثمانی ٭

چھینٹے

یادش بخیر ——— یہ ہمارے اختر صاحب بھی عجیب ہیں
یں اور یقین جانیئے کہ ان کا شجرہ ڈارون کی تھیوری تک نہیں بلکہ
ا حضرت آدم تک پہنچتا ہے ——— اب یہ اور بات ہے
، کام کے آدمی ہونگے اور ہمارے اختر بھیا بقول خود یوں ہی کچھ
ے ۔ جب کبھی ان کے اس نکمے پن پر ذرا سنجیدگی سے غور کیا جاتا ہے
اے کیوں چچا مرحوم کا وہ مشہور شعر حافظہ کی سطح پر نا چ اٹھتا ہے
اس روز بھی جب اختر بھیا نے مجھے اپنا ایک تازہ رومانی افسانہ سنایا
ختیاری طور پر میں تاسف سروں میں وہی شعر گنگنا اٹھا سے

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

یئے کیا سمجھے؟ ——— مگر ——— این ——— آپ تو مسکرا رہے
، شاید کچھ سمجھ گئے ہیں آپ ۔ اچھا صاحب آپکے اس "کچھ" سمجھنے کا شکریہ
——— ہاں تو پھر ——— ذرا قریب کھسک آیئے ———
ں ہونہہ ——— ذرا اور ——— ارے آپ تو تکلف کر
ہے ہیں بندہ پرور ——— دیکھئے نا ——— ہیں آپ سے کچھ
ز کی باتیں کرنی ہیں ۔ پھر اس بھری بزم میں کوئی اور بھی سن پائیگا تو آپ
ا مخواہ ہمیں بے ادبی کا الزام دیں گے ۔ جو کسی صورت میں گوارا نہیں کیا
جاسکتا ۔ کیونکہ آپ جانیئے کہ سب کچھ لٹا کر ایک ادب کی ٹھیکہ داری ہی تو
اپنے نام رجسٹرڈ ہے آجکل ——— خواہ بزعم خود ہی کیوں نہ ہو ۔
خیر چھوڑیئے ان تذکروں کو اور ایک بار پھر وہی شعر گنگنا دیجئے

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ اس عشق کی بدولت اگر اختر صاحب بھی
نکمے ہو کر رہ گئے تو اس میں ان کا قصور ہی کیا ۔ کیونکہ امنگوں کی راتیں مرادوں

کے دن ، جیسے رنگین دور میں اور کچھ نہیں تو نظر بازی سے بھی تائب ہوجانا
کم از کم ان کی نظر میں جوانی کی توہین نہیں تو اور کیا ہے ——— پھر اس
پہ کریلا اور نیم چڑھا" کے مصداق خیر سے آپ ایک افسانہ نگار بھی ہیں ۔
پھر ادب میں مقصدیت کے خیر سے قائل ہی نہیں ۔ گویا آپ کی تمام ذہنی
کاوشیں ، یوں ہی بے مقصد ہوا کرتی ہیں ۔ جیسے کسی دیوانے کی بڑ ۔ جو سمجھنے
کی ہو نہ سمجھانے کی ——— چنانچہ اس روز بھی آپ افسانہ نگاری کی
دھن میں کسی رومانی پلاٹ کے لئے سر جھکائے بیٹھے تھے کہ انکی شریک
حیات پوچھ بیٹھی ۔

"خیر تو ہے یہ آج لگاتار کیا سوچا جا رہا ہے سرتاج"

"کچھ نہیں ۔ ایک ماہنامہ کے لئے آج ہی افسانہ لکھنا ہے
مگر لکھا نہیں جاتا" ——— اختر نے جواب دیا ۔

"کیوں؟" رضیہ نے متعجب ہوتے ہوئے پوچھا

"اس لئے کہ کوئی موزوں پلاٹ ہی نہیں مل رہا ہے آج"

اختر سر کھجاتے ہوئے لاپرواہی سے بولا ۔

"بس ! اتنی سی بات تھی ——— لیجئے ہم بتاتے ہیں آپ کو
ایک پلاٹ" ——— رضیہ مسکراتے ہوئے بولی ۔

"اچھا بتایئے !" اختر نے اپنی شکست کا اعتراف کیا ۔ "مگر مذاق
تو نہیں اڑایئے گا" رضیہ ٹھٹکی ۔

"ارے ! اس میں مذاق کا کیا تک ——— آپ بتایئے تو"
اختر نے ایک سنجیدہ سا جواب دیا ۔ اور رضیہ اپنی جگہ سے اٹھ کر سامنے
والی کرسی پر بیٹھ گئی ۔ اس کے چہرہ سے ایک شرمگیں مسکراہٹ ٹپک
رہی تھی ۔ وہ بولنا چاہتی تھی ۔ مگر شرم و حیا مانع تھی ——— ادھر اختر
پلاٹ سننے کا منتظر قلم دانتوں میں دبائے اس کے چہرہ کو تک رہا تھا
جب پلاٹ بتانے کا تقاضا حد سے زیادہ بڑھا تو رضیہ مسکراتے ہوئے

"آخر اتنی جلدی کیا ہے۔ صبر کیجئے بتا رہی ہوں"

"نہیں اب صبر نہیں ہوتا ہے بیگم"! اختر نے بھونڈے الفاظ میں اپنی بے صبری کا اظہار کیا۔

"اچھا تو پھر سنیئے" "ایک تھی لڑکی" رضیہ نے شرماتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"اوہ! لال پری لال بالے والی ——— اختر نے مذاق کے انداز میں گزشتہ رات دیکھے ہوئے پکچر کی طرف اشارہ کیا

"دیکھئے! آپ پھر اتر آئے نا مذاق پر۔ اچھا جائیے ہم نہیں بتاتے" رضیہ بگڑتے ہوئے بولی۔

"ارے تم ناراض ہو گئی ہو بیگم! ابھی! قسم لے لو جو اب ہم مذاق کریں" اختر رضیہ کو گدگداتے ہوئے بولا۔

"اوئی اللہ ——— ہٹو بھئی۔ نہ جانے کیا کہہ رہی تھی ———" رضیہ نے بات کا تسلسل قائم کرنے کے لئے دماغ پر زور ڈالا۔

"وہی ایک تھی لڑکی" اختر نے یاد دلایا

"ہاں تو وہ صوم و صلوٰۃ کی پابند اور خیر و شر میں تمیز کرنے والی ایک سیدھی سادھی لڑکی تھی اور شاید یہ بھی جانتی تھی کہ شادی اور بیاہ کے معاملہ میں شوہر و بیوی کا ہم خیال ہونا بہت ضروری ہے۔ مگر بدقسمتی سے ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہو گئی۔ جہاں رسم و رواج اور دولت کی قربان گاہ پر آئے دن ہزاروں لڑکیاں بھینٹ چڑھا کرتی ہیں۔ چنانچہ وہ بے زبان بھی بھینٹ چڑھا دی گئی اور ایک ایسے شخص سے منسوب کی گئی جس کا معیار خیر و شر خود اسکے معیار سے بالکل جدا تھا ———" رضیہ یہ کہتے کہتے ایکدم اداس ہو گئی اور دیر تک یوں ہی چپ چاپ کچھ سوچتی رہی۔

"پھر کیا ہوا" ——— اختر نے بیتاب ہونے پر سے پوچھا

"جی ——— وہ ایکدم چونکتے ہوئے بولی۔ اب وہ لڑکی پھولوں کی سیج پر زندہ لاش بنی ہوئی پڑی ہے۔ لیکن اسکے والدین مسرور ہیں کہ ان کی لاڈلی ایک دولتمند کی بیوی اور ملک کے ایک نامور افسانہ نگار کی شریک حیات ہے" ——— "مگر وہ خود" اختر نے کچھ مشکوک ہوتے ہوئے پوچھا۔ "وہ بیچاری تو اب بھی روئے جا رہی ہے"۔ رضیہ نے کچھ جھجکتے ہوئے جواب دیا ——— "کاش کوئی اسے اتنا ہی بتا سکتا کہ بیوقوف تو عورت ہے اور پھر عورت کو مرد کے لئے صرف جینا ہی نہیں بلکہ مرنا بھی پڑتا ہے" یہ کہہ کر رضیہ ایکدم خاموش ہو گئی اور کچھ دیر بعد خود ہی مسکراتے ہوئے بولی

"کیسا رہے گا یہ پلاٹ"؟

"بہت اچھا" اختر نے اپنے تاثرات چھپاتے ہوئے جواب دیا۔ "تو پھر کیا سوچ ہے۔ لکھ ڈالئے ایک افسانہ" وہ یہ کہہ کر جا چکی تھی۔ مگر اختر کو یہ محسوس ہوا جیسے یہ رضیہ ہی کی آپ بیتی ہو۔ اور پھر کبھی کبھی کے بھولے بسرے واقعات ایک ایک کر کے یاد آتے رہے اور دماغ نے ان چھوٹے چھوٹے واقعات کو ایک جگہ جمع کر کے اچھی خاصی غلط فہمی کا ایک خاکہ سا تیار کر ڈالا چنانچہ وہ یقین کر بیٹھا کہ رضیہ کو مجھ سے نہیں، بلکہ کسی دوسرے سے محبت ہے۔ اس یقین کے بعد وہ آہستہ آہستہ رضیہ سے کھنچتا رہا۔ اور رضیہ اس کے ہر اجتناب پر تڑپ کر رہ گئی۔ اس نے بارہا دیکھا کہ اس کی نمناک نگاہوں میں شکووں کے طوفان امنڈ رہے تھے ——— لیکن اسے کیا ——— اس کے لئے تو جیسے اب رضیہ کی ہر دلداری میں ایک تصنع ہر محبت میں ایک بناوٹ تھی۔ جب کبھی اس سے مخاطب ہوتی تو اسے صاف اپنی شکست کی آواز سنائی دیتی اور وہ ایک مجروح شکار کی طرح تڑپ کر رہ جاتا ——— وقت اسی طرح گزرتا رہا۔ مگر اب اس کے پاس ذہنی اذیت اور روحانی کوفت کے سوا رکھا ہی کیا تھا۔ ایک دن صبح سے شام تک ادھر ادھر کی خاک چھاننے کے بعد اختر جب رات کے وقت گھر پہنچا تو رضیہ کچھ لکھنے میں مصروف تھی۔ اختر کو دیکھتے ہی وہ اس طرح سٹ پٹائی جیسے کوئی مجرم آج پہلی بار جرم کرتے پکڑ لیا گیا ہو۔ اختر نے یہ سب کچھ دیکھا۔ سب کچھ سمجھا ——— لیکن پھر بھی کچھ نہ کہہ سکا۔ اور حسب معمول وہ رات بھی کبھی اس کروٹ، کبھی اس کروٹ جاگتے ہی گزار دی۔ صبح ہوتے ہی وہ دبے پاؤں اٹھا اور اسکے لکھے ہوئے تمام کاغذات لئے ہوئے برابر والے کمرہ میں چلا گیا جسم لرز رہا تھا۔ نگاہوں کے سامنے کچھ چنگاریاں سی اڑتی ہوئی نظر آئیں اور دماغ میں ایک ہیجان سا بپا ہو کر رہ گیا۔ بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے کاغذات کھولے ——— خیال تھا کہ ان میں کوئی جاں نواز مکتوب ہوگا کسی محبوب کے نام ——— مگر وہاں صرف ایک افسانوی

شش چھینٹے کے عنوان سے زیب قرطاس نظر آئی۔ اختر دیر تک ساکت
سامت کھڑا سوچتا رہا ——— کاغذات پلٹتا رہا۔ پھر آخر پڑھنا شروع
یا ——— لکھا تھا ———

"اور اس شمسہ غریب کی عمر ہی کیا تھی کہ والدین کا سایہ سر سے
اٹھ گیا۔ خاندان بھر میں لے دے کر ایک نانی کا دم تھا باقی اللہ اللہ اور
خیر صلا ——— اور وہ غریب بھی ساٹ اوپر ستر برس کی بڑھیا۔ نہ منہ
میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ ہیں ہیں کرتی آگے بڑھیں۔ دعائیں دے کر
شمسہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔ چٹ چٹ بلائیں لیں اور اپنی بچی کی نشانی سمجھ کر
شہزادیوں کی طرح پالنے لگیں۔ نماز روزہ کی تاکید۔ دین اسلام کی باتیں
بتائیں اور پھر سولھویں برس ہاتھ پیلے کئے۔ دم توڑتی ہوئی نانی نے سدا
سہاگن رہو کی دعائیں دیں۔ اور ان کی شمسہ چھم چھم کرتی ہوئی دوسرے
گھر سدھار گئی ——— ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ———
سسرال آتے ہی سب کو اپنی مٹھی لے لیا۔ گھر کا ہر فرد اس کا کلمہ پڑھتا
اور اس کا شوہر زبیر سب کچھ دیکھتا۔ سنتا اور پھولا نہ سماتا ——— اس
میں شک نہیں کہ زبیر شمسہ سے محبت کرتا تھا۔ مگر وہ زندگی کے جس موڑ
تک اسے لانا چاہتا تھا شمسہ اسکے تصور سے بھی کانپ اٹھتی اور شمسہ کی
یہ قدامت پرستی اکثر زبیر کو غمگین کر دیتی۔ چنانچہ جب کبھی اس کے ساتھی
اپنی بیویوں کے ساتھ پارک یا سینما میں نظر آجائے تو احساس کمتری
ایک بوجھ سا بن کر اسکے دماغ پر چھا جاتا اور وہ پہروں سوچتا۔ کاش!
شمسہ بھی ایسی ہی فیشن پرست ہوتی۔ مگر شمسہ غریب پرانی تہذیب میں
پلی ہوئی ایک سیدھی سادھی لڑکی تھی جس کو ہزار بہلانے، پھسلانے، ڈرانے
اور دھمکانے پر بھی زبیر اپنی مرضی کے مطابق ترقی پسند نہ بنا سکا۔ چنانچہ
ایک روز اس نے کہہ ہی دیا "شمسہ! تم کچھ اور نہ بن سکیں تو کاش ایک افسانہ
نگار ہی بن جاتیں"۔ یہ مطالبہ شاید اپنی جگہ کچھ معقول تھا۔ شمسہ نے بھی
اس کی معقولیت کو سمجھا اور پھر حسب فرمائش دوسرے ہی دن قلم بھی
سنبھال لیا۔ عرصہ تک وہ ایک خاموش کوشش میں لگی رہی۔ اور جب
کچھ قابل ہوئی تو افسوس ان افسانوی کوششوں پر وہ اپنا وقار کھو بیٹھی
——— زبیر بدگمان ہو گیا کہ اس کی شمسہ کو کسی دوسرے سے محبت
ہے۔ وہ تڑپ اٹھی اور کچھ کہنے کے لئے لب ہلانے ہی چاہے تھے، کہ
دھتکار دی گئی۔ کاش وہ کہہ سکتی۔ زبیر تم نے سینکڑوں نظموں میں سلمیٰ
کے پریم راگ گائے لیکن میں بدگمان نہ ہو سکی۔ متعدد کہانیوں میں عذرا
کے حسن کو سراہا اور دنیا اسے افسانہ ہی سمجھتی رہی لیکن تم میری پہلی ہی افسانوی
کوشش کو افسانہ نہیں بلکہ حقیقت سمجھ بیٹھے۔ اف کتنی عجیب ہے تمھاری
فطرت! لیکن معاف کرنا۔ میں جانتی ہوں۔ مجھے خبر ہے کہ میرے ہونے
بھی تمھارے دل میں سینکڑوں لڑکیوں کی تمنائیں مچلتی ہیں ———
یقین نہ ہو تو پڑوس کی فاخرہ سے پوچھو جواب بھی ماسٹر والے گھر میں چلمن سے لگی
تمہاری راہ دیکھ رہی ہے ——— اور لو! دیکھو! وہ حسنیٰ بھی
تمہاری یاد میں تڑپ رہی ہے جس کو شادی کے سبز باغ دکھا کر تم نے پورے
دو سال لوٹا۔ اور جب وہ غریب تمہاری دی ہوئی امانت کے بوجھ کو نہ اٹھا
سکی تو تم بھی کنارہ کش ہو گئے اور سوسائٹی نے بھی اسے بدکار سمجھ کر دھتکار دیا
آج بھی وہ تمہاری دکھائی ہوئی راہوں پر چل کر اپنی مجروح نسوانیت کو اونے
پونے بیچ رہی ہے جسم کے سینکڑوں خریدار ہیں۔ مگر اسکی سسکتی ہوئی روح
کو چمکارنے والا ایک بھی نہیں ——— اب وہ اپنا وقار کھو بیٹھی ہے
لیکن تم جیسے کل پارسا تھے آج بھی ایسے ہی پارسا ہو اور اس معزز سوسائٹی
کے ایک معزز رکن بھی لیکن حسنیٰ سے پوچھو تم کتنے پانی میں ہو اور کیسے پارسا
——— یاد ہو گا ایک دن تم نے کہا تھا۔ پروین ایک یتیم لڑکی ہے اس
کی مدد کرنا تو ایک انسانی فریضہ ہے بیگم! ——— میں خاموش ہو گئی
اور تم میرے زیورات بیچ بیچ کر اس کی مدد کرتے رہے کیونکہ وہ غریب
تھی نا ——— اور پھر اس پر نوجوان اور خوبصورت بھی ——— مانا
کہ دنیا کو دھوکہ دیا جا سکتا ہے۔ مگر خود کو فریب دینا اتنا آسان نہیں ہے سرتاج
کبھی سوچا ہے کہ یہ ہمدردیاں، یہ حسن نوازیاں انسانیت کا تقاضہ ہیں یا
شیطانیت کا مطالبہ۔ مگر تمہیں یہ سب کچھ سوچنے کی فرصت ہی کہاں
تمہیں تو بے سمجھے بوجھے ہی پروین، ناہید، روحی اور نہ جانے ایسی
کتنی لاوارث لڑکیوں کی مدد کرنی ہے۔ ایک خوب صورت معاوضہ اور
حسین سے بدلے کی خاطر ——— حالانکہ اجمل بھی غریب ہے۔ ارشد
بھی لاوارث ہے، شمشاد بھی یتیم ہے مگر ان میں سے کوئی بھی تمہاری ہمدردی
کا مستحق نہیں ——— کیوں ——— آخر کیوں ———
کبھی سوچا ہے تم نے ———!

اور وہ دن بھی تو بھلائے نہیں بھولتا جب تم نے کہا تھا شمسہ!
بری ترقی کا سوال ہے اگر تم نے اب بھی حجاب سے کام لیا تو میں تمام عمر اسی تنخواہ
پڑا رہوں گا۔ ہمارا انسپکٹر نوجوان ہے ــــــــ وہ عورتوں کی سفارش
ی نہیں ٹھکرا سکتا۔ میری خاطر میری سفارش کیلئے تم بھی اس کے پاس چلی
نہ ــــــــ تم یہ سب کچھ کہتے رہے لیکن میں روتی رہی ــــــــ
تی رہی اور سوچتی رہی کہ ہمارے اسی دیش میں عورت کے ناموس اور
ت کیلئے سینکڑوں لڑائیاں لڑی گئیں۔ ہزار ہا قربانیاں دی گئیں لیکن
ج وہی مرد اپنی عورت کی عزت اور ناموس محض دنیاوی ترقی کی قربانگاہ پر
بلینٹ چڑھانا چاہتا ہے۔ اف کتنا زبردست انقلاب، کتنا ذہنی تغیر
و چکا ہے اس مرد کی فطرت میں ــــــــ اور کیوں نہ ہو ــــ آج
س کا زاویۂ نگاہ، اس کا مقصد زندگی۔ اس کی حیات کا منشا سب کچھ ہی
بدل چکا ہے وہ صرف اپنے لئے جیتا ہے، اپنے لئے مرتا ہے اور وقتی خوشی
کی خاطر، عزت، وقار اور مذہب کی بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے
تیار ہے۔ اُف آج کے مرد کی خود فریبی ــــــــ لیکن یہ خود فریبی۔ خدا فریبی

نہیں بن سکتی ہے سرتاج! ہاں ہو سکتا ہے کہ تمہاری تا دبلات کے سامنے
سوسائٹی کی زبان بند ہو جائے۔ قانون کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے مگر۔
تمہارے دل میں چھپی ہوئی صداقت شاید تمہیں اس پر بھی معاف نہ کر سکے
ــــــــ اس صداقت کا واسطہ اپنی شمسہ کو بچا لو۔ اپنے فرائض
سمجھو اور اگر رنگین فرصتیں اجازت دیں تو ایک نظر یہ بھی دیکھ لو کہ میں کس مقام
پر کھڑی ہوئی تمہیں آواز دے رہی ہوں۔ کاش تم میری یہ آواز سن سکو
میرے قریب آسکو۔ آہ کاش ــــــــ کیا میری اس صاف بیانی پر
مجھے معاف نہ کرو گے سرتاج ــــــــ ؟ اختر نے رضیہ کا لکھا
ہوا افسانہ شروع سے آخر تک پڑھا۔ اور پھر دل میں چھپا ہوا چور لرز اٹھا
انھیں سب کچھ معلوم ہے۔ انھیں سب کچھ معلوم ہے
پھر اب کیا ہوگا ــــــــ میں مجرم ہوں ــــــــ اوہ! خدایا! ــــــــ
آخر دیر تک یوں ہی کھڑا سوچتا رہا۔ دوسرے ہی لمحہ شرم و ندامت سے
اس کی گردن جھکی جا رہی تھی۔ جیسے اعتراف جرم کے بعد آج پہلی بار وہ اپنی
غلطیوں پر تائب ہونا چاہتا ہو۔

حاذق نروائن پلز

ایک جنرل ٹانک ہے جو عصبی اور دل و دماغ کی کمزوریوں کا
مجرب علاج ہے۔ یہ گولیاں دماغی کام کرنیوالے حضرات یعنی وکیل
بیرسٹر، پروفیسر اور طالب علم صاحبان کے واسطے آبحیات کا کام دیتی ہیں اور جسم
انسانی کی جملہ عصبی کمزوریوں کو بحال کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں، دواخانہ ہذا
کے خاص مجربات میں سے ہیں۔

خوراک ۱ ایوم ۲۰ گولی۔ قیمت دو روپے

(حب خاص)

حاذق دواخانہ، بندر روڈ، کراچی نمبر (۱)

جگن ناتھ آزاد •

بھارت کے مسلماں

"بھارت کے مسلماں" کے عنوان سے جناب جگن ناتھ آزاد کی ایک نظم اخبار الجمعیۃ میں شائع ہوئی جسے رسالہ معارف اعظم گڈھ نے فروری ۵۲ء کے پرچے میں دوبارہ شائع کیا۔ پاکستان میں اس نظم کو معاصر دعوۃ الحق (کراچی) نے جناب اسد ملتانی کی جوابی نظم "ہمدرد مسلماں" کے ساتھ شائع کیا۔ جناب جگن ناتھ صاحب آزاد نے یہ نظم جس اخلاص اور شریفانہ جذبات سے لکھی ہے وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ تعصب اور تنگ نظری کے اس دور میں بھی انسانیت کی شمع گل نہیں ہوگئی ہے۔ جناب آزاد صاحب کی نظم کے مخاطب "بھارت کے مسلماں" ہیں لیکن اسلام کی عالمگیر اخوت میں وطنی و ملکی تبدیلیاں حائل نہیں ہو سکتیں اسلئے جناب اسد ملتانی نے مسلمانان ہند کی نمائندگی کرتے ہوئے ان کی طرف سے جگن ناتھ صاحب کا منظوم شکریہ ادا کیا ہے کیونکہ یہ دونوں نظمیں اس لائق ہیں کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی نگاہوں سے گزریں۔ اس لئے ہم دونوں نظموں کو دعوۃ الحق سے نقل کرکے قارئین مشیر کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ (مدیر)

اس دور میں تو کیوں ہے پریشان و ہراساں — کیا بات ہے کیوں ہے متزلزل ترا ایماں
دانش کدۂ دہر کی اے شمع فروزاں — اے مطلعِ تہذیب کے خورشیدِ درخشاں
حیرت ہے گھٹاؤں سے ترا نور ہو ترساں
بھارت کے مسلماں

تو دردِ محبت کا طلب گار ازل سے! — تو مہر و مروّت کا پرستار ازل سے
تو محرمِ ہر لذّتِ اسرار ازل سے — ورثہ ترا رعنائیٔ افکار ازل سے
رعنائیٔ افکار کو کر پھر سے غزل خواں
بھارت کے مسلماں

ہرگز نہ بھلا میر کا غالب کا ترانہ — بن جائے کہیں تیری حقیقت نہ فسانہ
قزاقِ فنا کو تو ہے درکار بہانہ — تاراج نہ ہو قاسم و سید کا خزانہ
اے قاسم و سید کے خزانے کے نگہباں
بھارت کے مسلماں

حافظ کے ترنم کو بسا قلب و نظر میں رومی کے تفکر کو سجا قلب و نظر میں
سعدی کے تکلم کو بٹھا قلب و نظر میں دے نغمۂ خیام کی جا قلب و نظر میں
یہ لحن ہو پھر ہند کی دنیا میں پُرافشاں
بھارت کے مسلماں

طوفان میں تُو ڈھونڈ رہا ہے جو کنارا امواج کا کر دیدۂ باطن سے نظارا
ممکن ہے کہ ہر موج نظر کو ہو گوارا ممکن ہے کہ ہر موج بنے تیرا سہارا
ممکن ہے کہ ساحل ہو پسِ پردۂ طوفاں
بھارت کے مسلماں

مانند صبا خیز و وزیدن دگر آموز اندر دلِ غنچہ خزیدن دگر آموز
در انجمنِ شوق طپیدن دگر آموز نومید مشو نالہ کشیدن دگر آموز
اے تو کہ لئے دل میں ہے فریاد نیستاں
بھارت کے مسلماں

ظاہر کی محبت سے مروت سے گزر جا باطن کی عداوت سے کدورت سے گزر جا
بے کار و دل افگار قیادت سے گزر جا اس دور کی بوسیدہ سیاست سے گزر جا
اور عزم سے پھر تھام ذرا دامنِ ایماں
بھارت کے مسلماں

اسلام کی تعلیم سے بیگانہ ہوا تُو نامحرمِ ہر جرأت رندانہ ہوا تُو
آبادیٔ ہر بزم تھا ویرانہ ہوا تُو تُو ایک حقیقت تھا اب افسانہ ہوا تُو
ممکن ہو تو پھر ڈھونڈ گنوائے ہوئے ساماں
بھارت کے مسلماں

اجمیر کی درگاہِ معلّے تری جاگیر محبوبِ الٰہی کی زمیں پہ تری تنویر
ذرات میں کلیر کے فروزاں تری تصویر ہانسی کی فضاؤں میں ترے کیف کی تاثیر
سرہند کی مٹی ہے ترے دم سے فروزاں
بھارت کے مسلماں

ہر ذرّہ وطن ہے تری ضو سے منوّر — پنجاب کی مستی اثرِ جذبِ قلندر
گنگوہ کی تقدیس ہے قدوس سراسر — پٹنہ کی زمیں نکہتِ خواجہ سے معطّر!

مدراس کی مٹی میں نہاں تاجِ شہیداں

بھارت کے مسلماں

بسطامی و بصری و معرّی و غزالی — جس علم کی جس فقر کی دنیا کے تھے والی
حیرت ہے کہ تُو اب ہے اسی دنیا میں سوالی — ہے گوشۂ پستی میں تری ہمتِ عالی

افسوس صد افسوس تری تنگیٔ داماں

بھارت کے مسلماں

مذہب جسے کہتے ہیں وہ کچھ اور ہے پیارے — نفرت سے پرے اس کا ہر اک طور ہے پیارے
مذہب پہ تعصب تو بڑا جور ہے پیارے — عقل و خرد و علم کا یہ دَور ہے پیارے

اس دَور میں مذہب کی صداقت ہو نمایاں

بھارت کے مسلماں

اسلام تو مہر اور محبت کا بیاں ہے — اخلاص کی روداد ، مروّت کا بیاں ہے
ہر شعبۂ ہستی میں صداقت کا بیاں ہے — اک زندہ و پائندہ حقیقت کا بیاں ہے

کیوں دل میں ترے ہو نہ حقیقت یہ فروزاں

بھارت کے مسلماں

اسلام کی تعلیم فراموش ہوئی کیوں — انسان کی تعظیم فراموش ہوئی کیوں
افراد کی تنظیم فراموش ہوئی کیوں — اخلاص کی اقلیم فراموش ہوئی کیوں

حیرت میں ہوں مَیں دیکھ کے یہ عالمِ نسیاں

بھارت کے مسلماں

ماحول کی ہو تازہ ہوا تجھکو گوارا ! — درکار ہے تہذیب کو پھر تیرا سہارا
کر آج نئے رنگ سے دنیا کا نظارا — چمکے گا پھر اک بار ترے بخت کا تارا

ہو جائے گی تاریکیٔ ماحول گریزاں!

بھارت کے مسلماں

اسد ملتانی

ہمدردِ مسلماں

تیرا ہیں بلکن ناتھ ، ہوں شرمندۂ احساں سوجھا ہے تجھے خوب مرے درد کا درماں
روشن ترے دل پر ہوا میرا غم پنہاں ! صاف اس سے خلوص اور محبت ہے نمایاں
اے پیکرِ غمخواری و دلسوزیٔ انساں !
ہمدردِ مسلماں

ہر نکتہ ترا نشترِ فصّاد سے بھی تیز ہر حرف ترا فکر و نظر کیلئے مہمیز
ہر نغمہ ترا ولولہ انگیز و جنوں خیز ہر شعر ترا جذبۂ اخلاص سے لبریز
ہے آتشِ تبریز ترے دل میں فروزاں
ہمدردِ مسلماں

تو خوش رہے اے حضرتِ محرومؔ کے فرزند اخلاص و محبت سے ہے معمور تری پند
سُنکر تری باتیں مری ہمّت ہوئی دوچند تُونے دلِ مجبور کے سب کھول دیئے بند
دل سے ترا ممنون ہوں اور بندۂ احساں
ہمدردِ مسلماں

جس دَور میں نازاں ہوں تعصّب پہ زن و مرد جس دَور میں ہر راہ سے نفرت کی اٹھے گرد
جس دَور میں دل مہر و محبت سے ہوئے سرد اس دَور میں موجود ہوں تجھ ایسے بھی ہمدرد
ہُوں دیر میں یہ رنگِ حرم دیکھ کے حیراں
ہمدردِ مسلماں

اے منشی تلوک چند صاحب محرومؔ

کیا خوب طبیعت کی بلندی میں بڑھا تو اقبال کے پاکیزہ دبستاں میں پڑھا تو
سائے میں بزرگوں کے پلا اور بڑھا تو اسلام کے ماحول میں پروان چڑھا تو
ملتان تری گرمئ گفتار پہ نازاں :

ہمدردِ مسلماں

اسلام کی تعریف بہرحال بجا ہے گر میں نہیں مصداق تو میری ہی خطا ہے
اس وقت مرا دل جو گرفتار بلا ہے ایسا نظر آتا ہے کہ غفلت کی سزا ہے
اوروں سے نہیں اپنی سزا سے ہوں ہراساں

ہمدردِ مسلماں

میں تھا اثرِ گردشِ ایام سے غافل بدلے ہوئے رنگِ سحر و شام سے غافل
ماضی میں رہا مست اور انجام سے غافل ہر بات سے بے فکر ہر اک کام سے غافل
آخر یہی غفلت تھی کیا جس نے پشیماں

ہمدردِ مسلماں

افسردگیٔ شوق پہ ہے مجھ کو ندامت کوئی نہ رہی زندگیٔ دل کی علامت
واقع ہوئی جب موت تو دیکھی یہ قیامت اب آئی مرے سامنے اعمال کی شامت
خود شامتِ اعمال بنی آتشِ سوزاں !

ہمدردِ مسلماں

•

میں علم کی دولت کا خریدار نہیں ہوں گنجینۂ قاسم کا طلبگار نہیں ہوں !
سید کے خزانے کا سزاوار نہیں ہوں اسلاف کی میراث کا حقدار نہیں ہوں
ہوتا تو نہ رہتا کبھی یوں بے سروساماں

ہمدردِ مسلماں

ہیں کلیر و اجمیر کی باتیں تو پرانی بھولا میں قلندر کی مجدد کی کہانی
گم کر گئی واعظ کی مجھے سحر بیانی میں نے تو اس اقبال کی بھی بات نہ مانی
ہے جس کا اثر تیری طبیعت میں نمایاں
ہمدردِ مسلماں

گو آج کا ماحول مجھے راس نہیں ہے کچھ اس کا مداوا بھی مرے پاس نہیں ہے
پھر بھی کسی اندیشہ کا احساس نہیں ہے مستقبلِ روشن سے مجھے یاس نہیں ہے
امید کی ہے شمع مرے دل میں فروزاں
ہمدردِ مسلماں

اب بھی کسی قاتل کسی رہزن کا نہیں خوف بربادی و تخریبِ نشیمن کا نہیں خوف
افسوں گری شیخ و برہمن کا نہیں خوف اب بھی کسی انداز کے دشمن کا نہیں خوف
سچ یہ ہے کہ ہوں اپنے ہی سائے سے گریزاں
ہمدردِ مسلماں

کیوں مجھ کو شکایت ہو کسی اور سے جھوٹی خود اپنی ہی تقصیر سے قسمت مری پھوٹی
اللہ کی رسّی تو نہ ٹوٹے گی نہ ٹوٹی افسوس یہی ہے کہ مرے ہاتھ سے چھوٹی
شیرازہ ملت ہوا اس طرح پریشاں :
ہمدردِ مسلماں

میں بحر ہوں جنبش مجھے طوفاں سے ملیگی بیتاب طبیعت غمِ پنہاں سے ملے گی !
توفیقِ عمل قوتِ ایماں سے ملے گی ! ایمان کی دولت مجھے قرآں سے ملے گی
رُخ تُو نے مرا پھیر دیا جانبِ قرآں
ہمدردِ مسلماں

(دعوۃ الحق)

آنسہ محمودہ کاظمی

چور کون؟

اندھیرا بڑھ رہا تھا اور لحظہ بہ لحظہ سردی بھی ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی .... بادل کے ہلکے پھلکے ٹکڑے فضا میں سست خرامیاں کر رہے تھے جن تاروں نے بھی شاید اس شدت کی سردی سے بچنے ہی کے لئے بھوری بھوری شالیں اوڑھ رکھی تھیں۔ سڑکیں بھی سنسان ہو چکی تھیں۔ .... اور اتنی سردی میں باہر نکلتا بھی کون؟ حالانکہ رات اتنی نہیں گئی تھی لیکن سردی کی شدت کی وجہ سے پھیری والوں کی بے ہنگم آوازوں سے بھی پناہ ملی ہوئی تھی ... ...

لیکن وہ ایسے وقت میں بھی سڑک کے چکر کاٹ رہا تھا اس کے جسم پر کوئی گرم کپڑا نہ تھا۔ صرف ایک پھٹا سا پاجامہ اور ایک قمیص جو اتنی گندی ہو رہی تھی کہ اس کے صحیح رنگ کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اس کا سر ٹوپی اور پیر جوتوں سے بے نیاز تھے اس کے پیر سردی سے نیلے ہو گئے تھے لیکن وہ چل رہا تھا۔

"میٹھے نمکین بسکٹ" دن بھر کی مشق کے مطابق اس نے بغیر کچھ سوچے سمجھے ایک آواز لگا دی .... اور پھر وہ خود ہی شرمندہ ہو گیا۔ بھلا اتنی رات میں بسکٹ کون لے گا۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور وہ کانپ اٹھا۔ ویسے ہی وہ بھوک سے نڈھال ہو رہا تھا۔ اور یہ سردی تو اور بھی کھائے جا رہی تھی .... لیکن آج گھر جانے کی اس کی ہمت نہ ہوتی تھی .... اس نے ایک پیسے کا بھی سودا نہ بیچا تھا اور شام کے وقت بھوک سے بے تاب ہو کر اس نے دو ایک بسکٹ بھی کھا لئے تھے اسے خوف تھا کہ اس کا چچا اسے ضرور مارے گا ..... اسی چھڑی سے جس سے وہ بارہا مار چکا تھا اور وہ تصور ہی میں کانپ اٹھا۔ نہیں نہیں وہ ہرگز نہ جائے گا خواہ کتنی ہی سردی کیوں نہ برداشت کرنی پڑے۔ پھر اس کی جائے رہائش ہی کون سی گرم تھی .... میدان میں تو اس کے چچا کی جھونپڑی تھی اور ہوا چلتے وقت تو ایسا لگتا ہے کہ اب اڑی اور اب اڑی۔ وہ اپنے چچا اور اس کے بچوں کے ساتھ اس جھونپڑی میں رہتا تھا۔ خود اس کے ماں باپ کدھر گئے اسے کچھ خبر نہ تھی۔ وہ تو اپنے چچا ہی کے پاس تھا۔ ان دنوں جبکہ ہم آزادی کی خوشی میں خون کی ہولی کھیلی جانے لگی اور اس کا چچا اسے لیکر یہاں بھاگ آیا۔

سردی اس کی قوت برداشت سے باہر ہو چکی تھی اور اب اس سے چلا بھی نہ جاتا تھا۔ آخر میں وہ ایک پانی کی ٹنکی کے نیچے دو تھمبوں کے درمیان گھس کر بیٹھا رہا اور نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔ اب وہ سردی بھوک اور ہر شئے سے بے نیاز ہو چکا تھا اور دنیائے خواب سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک آراستہ کمرے میں ایک گرم بستر پر پایا۔ اس نے دیکھا نزدیک ہی ایک میز پر (Dinner Dishes) لگی ہوئی ہیں .... جن میں اس کی سب ہی دل پسند اشیائے خوردنی موجود تھیں انڈے، گوشت، پلاؤ، پراٹھے، غرضیکہ ہر چیز .... اس نے جلدی سے میز کی طرف ہاتھ بڑھایا "جلدی اٹھو" اس کی آنکھ کھل گئی۔ صبح ہو چکی تھی اور آفتاب کی ہلکی ہلکی سنہری کرنیں زمین پر ضیا پاشی کر رہی تھیں وہ کتنی دیر سویا، صبح ہو گئی۔ وہ سوچ رہا تھا۔

"ارے یہ لڑکے ہی شاطر چور ہوتے ہیں"

وہ چونک پڑا۔ ایک خوش پوش جنٹلمین اور دو کانسٹبل اس کے نزدیک کھڑے ہوئے تھے۔

"لیکن جب یہ چوری نہیں کر سکا تھا تو گھر چلا جانا چاہیئے تھا۔ یہاں سونے کی کیا ضرورت تھی۔" ایک کانسٹبل نے استفسار کیا۔

"سوچا ہوگا تھوڑی دیر بعد چل کر کام پورا کیا جائے گا" دوسرے کانسٹبل نے جواب دیا۔

"اور یہاں چھپنے کے بعد نیند نے آگھیرا ہوگا" جنٹلمین نے کہا

"بولو بھئی تم یہاں کیا کر رہے تھے؟" ایک کانسٹبل اس کی طرف متوجہ ہوا لیکن اس کا دھیان ان کی باتوں کی طرف نہیں تھا۔ وہ رات

ہا آرہا تھا کہ ان لوگوں نے اسے کیوں جگا دیا؟ کم از کم وہ عالم خواب میں وہ سب کھا لیتا۔ یا اگر سب نہ کھاتا تو چکھ ہی لیتا۔

لو! اور دیکھو اب منہ سے بول ہی نہیں رہا ہے ایک کانسٹیبل نے دوسرے سے کہا۔

ارے بول یہاں کیا کر رہا تھا۔ کانسٹیبل نے اسے دھکا دیکر کہا

"جی ...... جی؟" وہ کانسٹیبل کو اپنے سے اتنے نزدیک دیکھ کر گھبرا گیا۔

بتاؤ کہ تم رات اس کوارٹر کا دروازہ کھلا پاکر گھسے تھے یا نہیں؟ پھر ایک بکس کا تالا توڑا تھا کہ نہیں؟"

نہیں...... نہیں تو" اس نے جلدی سے جواب دیا

"دیکھو لو دیدہ دلیری اسکی" ایک کانسٹیبل نے دوسرے سے کہا سچ سچ بتاؤ ورنہ لے جاکر حوالات میں بند کردوں گا۔ کانسٹیبل نے اسے دھمکی دی۔

"میں تو بسکٹ بیچ رہا تھا" اب اسے بسکٹ کے ڈبے کا خیال آیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ ایک کانسٹیبل لئے ہوئے تھا۔

"بیچتے تو تھے لیکن اس جگہ رات گزارنا چہ معنی دارد؟" کانسٹیبل نے کہا۔

سردی سے بچنے کے لئے یہاں بیٹھ گیا تھا۔ اس نے گلوگیر آواز سے جواب دیا۔

خیر اب چھوڑیئے۔ صبح ہی صبح اچھا نہیں لگتا بک بک کرتے ہوئے اس میں تو کوئی شک کی گنجائش ہی نہیں کہ انہی حضرت کا کام ہے تالا توڑنا یہ کہیئے میں جاگ اٹھا اور سامان ہی نہیں لے اڑے یہ ......"

ان صاحب نے اکتا کر کہا اور وہ سب چل پڑے۔

"ارے صاحب میرا بکس تو دے جایئے۔ ایک دم وہ چونک کر چیخ اٹھا۔

"چل ہٹ، حوالات سے بری کردیا اسی لئے، چور کہیں کا"

وہ تیز تیز قدم اٹھاتے نظروں سے غائب ہو گئے اور وہ رو پڑا۔

"جام نو"

سِلوَرِین پِلز

مردوں کے لئے ایک اچھا متوازن اور آج کل آزمودہ جنرل ٹانک ہے۔ جو بھوک کو بڑھاتا ہے جسم میں تازہ سرخ خون پیدا کرتا ہے اور طاقت بڑھاتا ہے۔ سلورین پلز پر آپ بھروسہ کرسکتے ہیں۔

۴۰ گولی ——— چار روپے بارہ آنے

۸۰ گولی ——— نو روپے

یاد کرو ———

مقویات کا سرتاج

حاذق دواخانہ، بندر روڈ، کراچی نمبر (۱)

ماہر القادری

علمائے کرام سے

(احتفال علماء منعقدہ ۱۵ فروری ۱۹۵۲ء کے پہلے اجلاس میں یہ نظم خود شاعر کی زبان سے سنی گئی۔ پاکستان، ہند، مصر، شام، عراق، الجزائر، افغانستان، برما، انڈونیشیا، اور آزاد کشمیر کے علمائے کے علاوہ جناب خواجہ ناظم الدین صاحب وزیر اعظم پاکستان اور حضرت مفتی اعظم سید امین الحسینی اور دوسرے عمائد و اکابر بھی جلسہ میں تشریف فرما تھے)

عالمانِ دینِ حق! اھلاً و سہلاً مرحبا
آپ کی تشریف فرمائی کا دل سے شکریہ

تھیں نگاہیں منتظر اس ربطِ باہم کیلئے
دل بچھے جاتے ہیں سب کے خیر مقدم کیلئے

اہلِ حق کی یہ توجہ غم شناسوں کی طرف
یعنی موجیں خود چلی آئی ہیں پیاسوں کی طرف

ایک مرکز پر ہیں اربابِ نظر، اہلِ علوم
پھر کراچی کے افق پہ ہے ستاروں کا ہجوم

یہ عمامے یہ عبائیں یہ جلالت یہ وقار
علم و فضل و مرتبت ہیں تیوروں سے آشکار

شعر کے خاکے میں دل کا خون بھرنا ہے مجھے
معذرت کرتے ہوئے کچھ عرض کرنا ہے مجھے

یہ حقیقت آپ کو اچھی طرح معلوم ہے
آج دینِ حق جہاں میں ہر جگہ مظلوم ہے

دین سے بیزار دولت مند بھی نادار بھی
نفس کی خواہش کے بندے شیخ بھی میخوار بھی

قوم کی وہ بیٹیاں جن کو کہ بننا تھا بتولؓ
مدرسوں میں سیکھتی ہیں ناچ گانے کے اصول

جھلملاتے جا رہے ہیں شرم و غیرت کے چراغ
روز چکنا چور ہو جاتے ہیں عصمت کے ایاغ

مال و زر جاہ و تعیش منزلِ مقصود ہے
آدمی کا اس جہاں میں آدمی معبود ہے

جس کسی کو دیکھئے تن پروری کی فکر ہے
عشرتوں کے پیچھے ہیں سر خوشی کا ذکر ہے

زندگی نان و شکم کے ماسوا کچھ بھی نہیں ! دل میں سب کا خوف ہے، خوفِ خدا کچھ بھی نہیں
ہر طرف باطل کے پھندے ، ہر جگہ بازی گری روس کا فتنہ بھی ہے اور لعنتِ افرنگ بھی
ملک ہیں آزاد لیکن دل پہ غیروں کا ہے راج دوسروں کے گھر سے آتے ہیں ابھی تک تخت و تاج
اپنی منزل سے ہیں اب تک ناشناس و بے خبر مطمئن ہیں آج تک ہم کفر کے دستور پر

ہائے وہ اسلام جو مسجد میں گھر کر رہ گیا
خانقاہوں کی بھی تنہائی کے صدمے سہہ گیا

جب یہ حالت ہو تو پھر جشن مسرت کیا منائیں آؤ ہم اک دوسرے کو اپنے داغِ دل دکھائیں
صرف جلسے منعقد کرنا کوئی مشکل نہیں یعنی رسمی اجتماعوں کا کوئی حاصل نہیں
جمع ہو جانا بہت اچھا مگر مقصد کے ساتھ جوش و ہمت عزم و جرأت جذبۂ بیدار کے ساتھ
تم کہ تم ہو وارثِ علم محمد مصطفےٰ ہے تمہاری زندگی خذ ما صفا دع ما کدر
اپنے فرض منصبی کو بھی سمجھنا چاہیئے ! تم کو ہر باطل کی قوت سے الجھنا چاہیئے
خامہ و قرطاس کی منزل سے اور آگے بڑھو قصر و ایواں کی بلندی پر کمندیں ڈال دو
احمدِ حنبلؒ کی حق گوئی کی بن جاؤ مثال کانپ کانپ اٹھے امیروں بادشاہوں کا جلال
مذہب اسلام ہے پورا نظام زندگی حق نے فرمایا ہے اتممت علیکم نعمتی
جو غلط کاری پہ آمادہ ہو اسکو ٹوک دو روک دو طاغوت کے طوفاں کو بڑھکر روک دو

ہر مسلماں دینِ فطرت کا علمبردار ہو
علم اور تقویٰ کے ہاتھوں میں زمام کار ہو

(فاران)

تصوروار

سنہ ۱۹۵۱-۵۲ء کا خُفیہ بجٹ

اس سال کا "کھلا بجٹ" آپ کی نظروں سے گزرا ہوگا۔ اور اس پر آپ نے تبصرے بھی پڑھے ہونگے۔ لیکن "خفیہ بجٹ" شاید آپ نے ابھی تک نہیں دیکھا۔ اس شمارہ میں جناب تصوروار صاحب آپ کی خدمت میں ۱۹۵۱ء۔۱۹۵۲ء کا خفیہ بجٹ (وزیر خزانہ کی تقریر سمیت) پیش کر رہے ہیں۔ ہمارے وزیر خزانہ کی طویل تقریر کو ہمارے رپورٹر نے نہایت مختصر کر دیا ہے۔ تاہم تقریر کا جوہر پورا آگیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ اسے دلچسپی سے پڑھیں گے کیونکہ یہ بڑے معرکہ کی چیز ہے۔

وزیر خزانہ نے تالیوں کی گونج کے درمیان سال رواں کا بچت دار بجٹ پیش کیا۔ مصارف کے تمام تقاضوں کو بخوبی پورا کرنے کے بعد نی بڑی بچت دکھائی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہماری فنانس منسٹری کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ پھر جس فاضلانہ اور دل موہ لینے والی تقریر کے جلوس میں یہ بجٹ مارچ کرتا ہوا آیا ہے۔ وہ تقریر تو تاریخ کے صفحات میں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے!

بجٹ کا خلاصہ

مجموعی آمدنی	(Revenue)	= ۲۳۰۹۴۹۵۱۵۰۰۰
مجموعی مصارف	(Expenditure)	= ۱۱۰۳۶۵۳۶۷۱۱
متوقع بجٹ		= ۲۱۹۹۱۲۹۷۸۲۸۹

(بجٹ کی تفصیل آخر میں درج ہے)

وزیر خزانہ نے زیر گھونسہ مارتے ہوئے بے فخر کے ساتھ اپنے سیکرٹری کی بنائی ہوئی تقریر کا ریکارڈ سناتے ہوئے فرمایا کہ قوم کو میری حسابی شعبدہ بازی اور مالیاتی جادوگری کی قدر کرنی چاہیئے اور حزب اختلاف کو ہکا بکا ہو کر بیٹھ رہنا چاہیئے۔ کہ میں نے بالکل صفر سے آغاز کار کرنے کے باوجود ہر سال بڑی بڑی آمدنیوں، بڑے بڑے اخراجات اور بڑی بڑی بچتوں کے بجٹ پیش کئے ہیں۔ اگر آپ میرے سابقہ کارناموں کو بھول گئے ہوں تو کم سے کم میرے تازہ بجٹ کو دیکھئے جس نے گزشتہ سارے بجٹوں کا ریکارڈ توڑ دیا ہے۔ آخر کوئی مائی کا لال ہے جو دو کھرب تیس ارب چورانوے کروڑ پچانوے لاکھ پندرہ ہزار کا تخمینہ ایک نو خیز ریاست کے ذرائع و وسائل کی بنیادوں پر قائم کر کے اور پھر ساری ضروریات کو باحسن وجوہ پورا کر کے دو کھرب انیس ارب اکانوے کروڑ انتیس لاکھ اٹھتر ہزار دو سو نواسی روپے کی ہیبتناک بچت دکھا سکے (تالیاں)۔

آمدنی کی بڑی بڑی مدات میں سے سلامیاں، ایڈریس استقبال، نعرہ ہائے زندہ باد، پھولوں کے ہار، تصاویر کی اشاعت، خوشامدیوں کی قصیدہ خوانیاں، غیر ملکی پیغامات غیر ملکی روابط وغیرہ وہ مدات ہیں جن سے خاص طور سے شہرت اور کبر کی بڑی آمدنی ہوتی ہے۔ ان میں سے اکثر مدات ایسی ہیں کہ حکومت کی گزشتہ چند سال کی سرمایہ کاری اور معقول منصوبہ بندی کی وجہ سے ان سے پچھلے سال کے مقابلے میں

ڈیڑھ دو گنی آمدنی متوقع ہے۔ دسویں نمبر پر جو مد درج ہے، وہ مذہبی اکابر کے فتوؤں اور بیانات کی ہے اس مد سے بھی آمدنی برابر بڑھ رہی ہے۔ حالانکہ ہمارے خلاف ایک غدار عنصر نے مذہبی فضا کو خراب کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی پارٹیوں نذرانوں اور نقد آمدنیوں کی مد میں بھی اضافہ ہوا ہے مگر نسبتاً کم۔

اس سال چند اور تعمیری اسکیمیں حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہیں۔ اور ان کی وجہ سے سال آئندہ کی آمدنی میں غیر معمولی اضافے کی توقع ہے (تالیاں)

مدّات صرف میں سے بڑی اہمیت اپنے خاص سلوگنوں کی توسیع و اشاعت کی ہے۔ ہمارے عوام بہت غریب اور بھوکے ہیں۔ لہٰذا ان کو زندہ رکھنے اور ترقی یافتہ قوموں کیساتھ مسابقت کی دوڑ میں جیت تر بنانے کے لئے سلوگنوں کی "دماغی وٹامن" بمقدار کثیر بہم پہنچانا ضروری ہے۔ حضرات! سیاسی سلوگنوں ہی سے مردہ قومیں زندگی پاتی ہیں۔ یہی قوت ہے جو ملکوں کے دفاع اور اس کے اتحاد کو مضبوط کرتی ہے اس لئے حکومت نے ان پر دل کھول کر خرچ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ (وزیر خزانہ زندہ باد کے نعروں کی گونج)

تقاریر کی مد بڑی اہم ہے، تقاریر سے قوموں کے سارے تعمیری کام سرانجام پاتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ اگر عوام میں تعلیم کی کمی ہو تو تعلیم کی اہمیت پہ تقاریر کرنا ایک حکومت کا اولین فرض ہے اسی طرح صحت کے انتظامات کی کمی صنعت کے استقلال اور مہاجرین کی بحالی وغیرہ جیسے مسائل کے لئے۔ اور غلے کی نایابی مکانوں کی قلت اور رشوت و خیانت کے فروغ سے پیدا شدہ صورت حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ تقاریر کرنے پر ہی ملک کی ترقی کا دار و مدار ہے ہمارے ہاں دق کی وبا پھیل رہی ہے۔ پٹواریوں اور مدرسوں کی طرف سے ہڑتالیں ہو رہی ہیں اور مزدوروں میں بے چینی ہے۔ ان مسائل کے حل کیلئے ترقی یافتہ اقوام نے تقاریر کی اہمیت کو تجربوں سے اتنا ثابت کر دیا ہے کہ ہم ہر حال اس مد پہ خرچ جتنا زیادہ بڑھاتے جائیں گے اتنا ہی زیادہ جلد ایک زندہ قوم بنتے جائیں گے (تالیاں)

اسی لئے تو غالب کو بھی کہنا پڑا کہ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا\
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

بات اتنی ہی نہیں۔ ہم اپنی مملکت کو اسلام کے جن بنیادی اصول پر استوار کرنا چاہتے ہیں ان میں سے ایک اہم اصول تقریر کا ہے۔ تھوڑی دیر آپ ملاؤں کے اسلام سے قطع نظر کر لیں۔ اس حقیقی ترقی پسند اسلام سامنے رکھیں جس کا اب اگر ہمیں نام و نشان ملتا ہے تو صرف برطانیہ و امریکہ میں ملتا ہے تو آپ کو ماننا پڑیگا کہ اس عالمگیر دین کی ساری بنیاد انسان کے حیوان ناطق ہونے کے تصور پر ہے پس ایک اسلامی مملکت کے کارکنوں کے ضروری ہے کہ وہ بولیں، ہر موقع پر بولیں، غلط سلط بولیں، جا و بیجا بولیں، یہاں تک کہ بولتے بولتے اور تقریر کرتے کرتے شہید ہو جائیں۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ جو کچھ کرتے ہوں اس کے خلاف بولیں اور جو کچھ بولتے ہوں اس کے خلاف عمل کریں لیکن فی نفسہ بولنا اور اور مختلف بولیاں بولنا اور وقت وقت کے راگ کے اصول پر بولنا ان کا خالص اسلامی فریضہ ہے۔

تقاریر بہت بڑی دفاعی طاقت بھی ہیں۔ بلکہ دفاعی... سرگرمیوں کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ تقاریر سے دشمنوں کے دل دہل جاتے ہیں۔ تقاریر سے قوم کا نظم مضبوط ہوتا ہے۔ تقریر سے جنگی تربیت ہو جاتی ہے تاریخ گواہ ہے کہ تقاریر کے بل پر جغرافئے بدل گئے۔ تاریخ کے دھارے کا رخ بدل گیا لہٰذا ہم تقاریر پر سب سے زیادہ خرچ کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں (تالیاں اور تقاریر زندہ باد کے نعرے)

اپ[illegible] ریلیوں کے جواب میں تقاریر پر قوت اور محنت او[illegible] دماغ کا گراں بہا خرچ [illegible] حکومت اس لئے کرتی ہے کہ اس سے آمدنی بہ[illegible] ہے ایک ایک تعریفی کلمہ عزائم میں بلند[illegible] اور رفتار کار میں [illegible] گرمی پیدا کرتا ہے کلیجہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے

۔نقطوں حکومت مضبوط ہو جاتی ہے۔

افتتاح کاری کی مذہبی ہمارے بجٹ کی بڑی بھاری مد ہے
طاقت اور پبلک کو "پیری مریدی" کے اصول پر ایک کرنے
، اور مجرّب ذریعہ ہے یعنی ایک کام بغیر اس کے چل ہی
سکتا ۔کہ کوئی "حضور والا" جائیں اور جا کر اس کام کو
ست مبارک سے برکت دیں۔ جب تک وہ بٹن دبا کر
فیتہ کاٹ کر ایک "عملی کن" نہ کہیں ایک ہنگامہ وجود
بنا پڑا رہے گا۔ ظاہر ہے کہ اس سے سلطان سے اسکی
کی وفاداری بڑھتی ہے۔ اور بنابریں افتتاح کاری قوت
ضافہ کرتی ہے چنانچہ ہم افتتاح کاری کے سلسلے کو سال
ں بڑھا رہے ہیں۔ مثلاً پہلے صرف سرکاری اسکیموں کا افتتاح
تھا۔ لیکن پھر پرائیویٹ کارخانوں کا بھی ہونے لگا۔ اسکے
مائشوں، فلم اسٹیڈیو، رقص گاہوں اور مینا بازاروں کی
ح کاری بھی عام کر دی گئی اور اس سال یہ طے کر لیا گیا ہے
رکٹنگ سیلونوں اور حماموں ہی کا نہیں بلکہ بیت الخلاؤں
، افتتاح کیا جایا کرے تاکہ قومی ترقی کی رفتار تیز ہو جائے

الیاں)

"بیان بازی" اور "پریس کانفرنس بازی" میں بھی آپ
ں اضافہ محسوس کریں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا
ناد ہے کہ اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْر پس بیان بازی ایک
لامی سلطنت کا اولین اصول ہے۔ اس سے عوام پر جادو ہوتا
ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرح سے لاکھوں جنّات
ر دیو مسخر ہو کر تعمیری کام کرتے ہیں اور کوئی بھی گڑبڑ مچانے کا
وقع نہیں پاتا۔

غدّاروں کا استیصال کرنے کے لئے بہت گہری چالیں
چلنے کی اسکیمیں بنائی گئی ہیں۔ خصوصاً "گلا گھونٹو اسکیم" پر پورا
زور صرف کیا جا رہا ہے۔ اس پاکیزہ مقصد کے لئے سیاسی گالیوں
کی ایجاد کے لئے قوم کے ذہین ترین ماہرین [illegible]ت حاصل کر لی
گئی ہیں۔ علاوہ بریں جھوٹ بولنے والے تجربہ کار کاریگروں کو

بھی گراں قدر مشاہرہ پر بھرتی کیا جا رہا ہے اندازہ یہ ہے کہ سال
آئندہ میں کم سے کم دو کروڑ مرتبہ جھوٹ اور سیاسی گالیوں کا
استعمال کرنا ناگزیر ہوگا۔ یہ ہماری ذہنی پولیس فورس ہے اسکی
اہمیت کے پیش نظر اس پر ستر کروڑ روپیہ صرف کیا جا رہا ہے

آخر میں پورے فخر و مباہات کے ساتھ میں چند تعمیری
اسکیموں کا ذکر کرنے لگا ہوں۔ ان کو ذرا کان کھول کر سنئیے۔

اوّل نمبر پر "بے پردگی" پروجیکٹ ہے اور یہ اوّل نمبر پہ
اس لئے ہے کہ خواتین کے بے پردہ چہروں کے ذریعے قومی کارکنوں
میں جذباتی اکساہٹ پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنی بساط سے زیادہ
کام کر دکھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر نے عورتوں کی
بے پردگی کو ترقی کا ذریعہ مانا ہے اس کے ساتھ ساتھ "فنون لطیفہ"
پروجیکٹ بھی زیر عمل لایا جا رہا ہے کیونکہ اسلامی نظام زندگی
کی بنیاد موسیقی، مصوری اور رقص و سرود پر ہی رکھی جا سکتی
ہے ——!

"پھوٹ ڈالو" پروجیکٹ پر خرچ کرنا اس لئے ضروری
ہے کہ حکومت کی مضبوطی کا یہ ایک زریں اصول ہے دراصل
فطرت کا سارا نظام کائنات "پھوٹ ڈالو" کے اصول پر بنا ہے
یعنی پہلے سکون تھا اور پھر پھوٹ پڑی اور مادے کا ایک طوفان
ابل پڑا۔ پھر اس طوفان میں خود پھوٹ پڑی تو اجرام فلکی بنے
اور پھر اسی طرح پھر سارا ارتقا "پھوٹ" ہی کے اصول پر ہوا
ہے۔ ازدیاد نسل بھی تو دراصل پھوٹ ہی کے اصول پر ہوتی
ہے کہ ایک سے دو اور دو سے چار ہوتے ہوتے زندگی ساری
زمین پر چھا گئی پس ترقی کے لئے پھوٹ ضروری ہے۔

اندرونی سازباز اور باہمی رسہ کشی کے لئے اکابر ملت
نے گیارہ سو منصوبے سال آئندہ کے لئے پیش نظر رکھ لئے
ہیں۔ تجربہ بتاتا ہے کہ اس طریقے سے ہر کارکن ...... دوسرے
سے ڈرتا ہے اور اس سے چوکنا رہتا ہے اور ایک دوسرے
سے آگے بڑھنے کی کوشش کی جاتی ہے اس طرح مملکت
روز افزوں ترقی کرتی ہے۔

آخری اہم منصوبہ ایک لادین (Secular) اسلامی
ربنانے کا منصوبہ ہے ۔ دراصل اس عنوان میں جو نکتۂ تصوف
ہے وہ یہ ہے کہ ہم نقال اور مقلد بننے کے لئے تیار نہیں
بلکہ اپنی ممتاز حیثیت بنانے کے لئے اپنا نیا راستہ دنیا کے
منے کھولنا چاہتے ہیں ۔ خالص اسلامی دستور بھی ایک
ہشے ہے اور خالص کافرانہ یا لادین دستور بھی ایک فرسودہ
رہے ہم چاہتے ہیں کہ دونوں طرف سے اچھی اچھی

قدریں لیکر ان میں عمل تقلیم کر کے ساری دنیا کو پیچھے چھوڑ دیا
جائے بالیقین اس نئی حرکت کے نتیجے میں تاریخ کا ایک نیا باب
کھل جائیگا ۔ یہ چیز ہمارے ایک ایک فرد کے سینے میں زندگی کی
آگ روشن کر دیگی ——— ایوان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس بجٹ
کو پاس کر لینے کے سوا اس کیلئے کوئی چارہ نہیں کوئی اختلاف کرے
تو یہ بھی یہ پاس ہوگا اور نہ کرے تو بھی ہوگا پس بہتر ہے کہ نہ بحث کیجئے
نہ ووٹنگ ۔ وقت بھی بچے اور محنت بھی !

——— (منظور ۔ منظور ۔ کی آوازیں)

بجٹ کی تفاصیل

آمدنی :-

مدات ——— آمدنی کی قدر و قیمت روپوں میں

۱ ۔ سلامیاں :-

(الف) فوج ، بحریہ اور ہوائی محکمہ کی طرف سے = ۱۰۰۰ مرتبہ ——— ۲۰۰۰۰۰۰
(ب) قومی رضا کاروں کی طرف سے = ۱۰۰۰ مرتبہ ——— ۱۰۰۰۰۰۰
(ج) خواتین ملت کی طرف سے = ۵۰ مرتبہ ——— ۷۵۰۰۰۰

۲ ۔ ایڈریس :-

(الف) پبلک کی طرف سے = ۲۰۰ موقعوں پر ——— ۲۰۰۰۰۰
(ب) میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کی طرف سے = ۵۰۰ مرتبہ ——— ۲۵۰۰۰۰
(ج) دوسرے سرکاری ادارت ،، ،، = ۲۰۰ مرتبہ ——— ۴۰۰۰۰
(د) مذہبی اداروں کی طرف سے = ۲۰۰ مرتبہ ——— ۲۰۰۰۰

۳ ۔ استقبال :-

۵۰۰ مرتبہ = ۵۰۰۰۰۰۰

۴ ۔ نعرہ ہائے زندہ باد :-

دو ارب مرتبہ = ۲۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰

۵ ۔ پھولوں کے ہار :-

۵ ہزار موقعوں پر = ۵۰۰۰۰۰

۶ ۔ تصاویر کی اشاعت :-

دو کروڑ مرتبہ ——— ۲۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰

۷۔ خوشامدیوں کی قصیدہ خوانی :۔

۲۰ کروڑ مرتبہ　=　۱۰۰۰۰۰۰۰۰۰

۸۔ تقاریب پر آنیوالے غیر ملکی پیغامات :۔

۵ مرتبہ　=　۵۰۰۰

۹۔ غیر ملکی سفارتوں، وفود اور سفروں سے مفاد اور شہرت کی آمدنی :۔　=　۳۷۰۰۰۰۰۰۰

۱۰۔ مذہبی اکابر کے حمایتی فتوے اور بیانات :۔

۵۰۰ مرتبہ　=　۵۰۰۰۰۰۰

۱۱۔ پارٹیاں :۔

(ا) ٹی پارٹیاں = ۶۰۰۰ مرتبہ		۱۲۰۰۰۰۰۰
(ب) کھانے کی دعوتیں = ۴۰۰۰ مرتبہ		۱۶۰۰۰۰۰۰

۱۲۔ نذر لینے :۔

(ا) براہ راست	۱۰۰ مرتبہ	۱۰۰۰۰۰
(ب) نصف بہتر کی معرفت	۱۰۰ مرتبہ	۴۰۰۰۰۰

۱۳۔ نقد :۔

(ا) مجموعی تنخواہیں	۹۰۰۰۰۰۰۰
(ب) سفر کے بھتے اور دیگر الاؤنس	۳۹۰۰۰۰۰۰

میزان آمد (Revenue) ۳۰۹۴۹۵۱۵۰۰

اخراجات !

مدات صرف	تفصیل	قدر و قیمت روپوں
۱۔ موٹے موٹے مقررہ سلوگن :۔		
	مجموعی تعداد تکرار = ۱۰۰۰۰	۱۰۰۰۰۰۰
۲۔ تقاریر :۔		
پارلیمنٹ جلسہ ہائے عام علمی مجالس	مجموعی تعداد = ۵۰۰۰۰۰۰	۱۰۰۰۰۰۰۰۰۰
۳۔ ایڈریسوں کی جوابی تقاریر :۔		
	مجموعی تعداد = ۲۹۰۰	۸۷۰۰۰۰
۴۔ افتتاح کاری کی مشقت :۔		
سرکاری اسکیمیں[۱]	= ۱۵۰ مرتبہ	

۱۔ بعض [illegible] کو مطلع کرنے کے لئے ایک ایک ایکڑ کا کنواں کنواں مرتبہ افتتاح کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

چھوٹے چھوٹے سرکاری ادارات = ۵۰۰ مرتبہ
کارخانوں کا افتتاح = ۱۰۰۰ مرتبہ
نمائش، فلم، اسٹوڈیو اور
رقص گاہوں کا افتتاح = ۵۰۰۰ مرتبہ
مینا بازاروں کا افتتاح = ۳۷۵ مرتبہ
پرائیویٹ دکانوں، ہیر کٹنگ
سیلونوں، حماموں اور بیت الخلاؤں
کا افتتاح۔ = ۲۰۰ مرتبہ
۵۲۰۷۵۰۰

۵۔ بیان بازی :-

۵۰۰۰۰ مرتبہ ۱۵۰۰۰۰۰۰

۶۔ پریس کانفرنس بازی :-

۱۰۰ مرتبہ ۸۰۰۰۰

۷۔ غداروں کا استیصال :-

اختلاف کرنیوالوں کے خلاف
چالیں چلنے کی مختلف اسکیمیں ۴۲۰ عدد ۱۲۶۰۰۰

گلا گھونٹ (سیفٹی توانین) اسکیم ۵۰۰۰۰۰۰

جھوٹ اور سیاسی گالیوں
کا استعمال ۲۰۰۰۰۰۰ مرتبہ ۷۰۰۰۰۰۰۰

۸۔ چند تعمیری مصارف :-

بے پردگی پروجیکٹ ۵۰۰۰۰۰۰
فنون لطیفہ پروجیکٹ ۱۰۰۰۰۰۰
پھوٹ ڈالو پروجیکٹ ۱۰۰۰۰۰۰
اندرونی سازباز اور رسہ کشی
کے مختلف منصوبے تعدادی ۱۱۰۰ ۱۲۵۰۰۰۰
ایک لادین (Secular) اسلامی دستور
بنانے کا دس سالہ منصوبہ ۴۹۰۰۳۲۱۱

میزان کل :- ۱۱۰۳۶۵۳۶۷۱۱

(بشکریہ کوثر)

میٹھا زہر

"یوں نہیں کمبخت، تمہیں نرسنگ سیکھتے ہوئے برسوں گزر گئے اور ابھی تک یہ نہیں جانا کہ دوا کس طرح دی جاتی ہے" ایک ادھیڑ عمر کی نرس نے دوسری کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"یہ دوا تھوڑی ہے یہ تو زہر ہے" دوسری نے کہا

"ہاں ہاں خاموش رہو، یہ زہر ایسا نہیں ہے جو اس کی زندگی کو ختم کر دے!"

"لیکن کڑوا ہے نا، یہ کیسے پئے گا"

"اگر تمہیں کام کرنا ہے تو سیدھی طرح کرو اور حیل و حجت چھوڑ دو۔ ورنہ بستر باندھو" اس نے پھر ڈانٹا۔

نرس خاموش ہو گئی، نوکری کا معاملہ تھا، پیٹ بری بلا ہے اس نے چپکے سے بچے کو جھولے میں ڈال دیا۔

وہ ہلکے ہلکے جھولے کو ہلا رہی تھی۔

کتنا خوبصورت اور پیارا بچہ ہے لیکن معلوم نہیں اسے زہر دینے کے احکام کیوں جاری کئے گئے ہیں۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی اور بچہ معصوم آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا اس نے چاہا کہ بچے کو اٹھا کر وہ کہیں دور بھاگ جائے تاکہ کوئی اسے زہر نہ دے سکے۔ اس احساس کے ساتھ ہی اسے ایک خوف سا محسوس ہونے لگا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اسے اپنے دل کی آواز سے بھی خوف محسوس ہونے لگا۔ ہسپتال میں نرسیں اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھیں۔

ہسپتال کے نوٹس بورڈ پر ایک نیا آرڈر چپکایا گیا تھا، نرسوں کا پھر امتحان ہوگا۔ ایک نئے کورس کا امتحان لیا جانے والا تھا برسوں کے تجربے کے باوجود امتحان میں کامیابی اور ناکامی کے ملے جلے احساس نے انھیں پریشان کر دیا۔

ایک نئی دوا ایجاد ہو چکی تھی۔ بچوں کی پرورش میں اس دوا کی روزآنہ ایک بوند خوراک کی ہدایت تھی اور اس کے استعمال کے لئے ایک نئے کورس اور نئے امتحان سے گزرنا ہوگا۔

"اس دوا کو تو ہم ہمیشہ زہر سمجھتی رہی ہیں" ایک نرس نے کہا

"زہر تو ہے ہی، انسانی دماغ پر اس کے اثرات بہت مضر ہیں۔ میں نے خود انسائیکلو پیڈیا میڈیکا میں دیکھا ہے" ایک تیز فہم نرس نے کہا۔

"یہ کوئی ضروری ہے سائنٹفک ذرائع سے ایک زہر کے اثر کو مفید مطلب بھی بنایا جا سکتا ہے" ایک نرس نے سینے کو اوپر کھینچتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں تمہارا زہر تو حیات افروز ہے، کئی بیمار تو صرف تمہیں دیکھکر تندرست ہو جاتے ہیں" دوسری نرس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اونھ ہونھ میں نے تو کئی ایک کو دم توڑتے دیکھا ہے" ایک قہقہہ۔ تیسری نے فوراً بات کاٹتے ہوئے کہا۔

نرسوں کا تمام عملہ جمع تھا۔ آج انہیں اس نئی دوا کے عملی تجربات دکھائے جانے والے تھے۔ وہ متعدد قطاروں میں کھڑی تھیں کسی ماہر لیڈی ڈاکٹر کی آمد کا انتظار تھا۔

لوگ ادھر سے ادھر گھوم رہے تھے۔ ایک اسٹیج مخصوص ہو چکا تھا۔ دونوں طرف زچہ مائیں اپنے بچوں کو گودوں میں لئے کھڑی تھیں۔ لیڈی ڈاکٹر ان بچوں کو دوا دینے والی تھی اور نرسیں ٹریننگ لینے والی تھیں۔ لیڈی ڈاکٹر آئی اور آتے ہی اس نے تمام نرسوں کو دیکھا۔ کئی اس کے معیار پر پوری نہ اتر سکیں اور کئی ایک کو اس نے بے حد پسند کیا اور اپنے ساتھ لیکر

بڑے دروازے میں آگے بڑھ گئی۔ لیڈی ڈاکٹر نرسوں کے نرغے میں چلی جا رہی تھی۔ دروازے کے اندر وسیع میدان میں دکانیں لگی ہوئی تھیں، سامان چنے ہوئے تھے۔ ڈانس پر جگہ جگہ جوا ہو رہا تھا۔ فضا میں قہقہے اڑ رہے تھے۔ حسین دوشیزائیں پھر رہی تھیں ان کے میک اپ پر بجلی کی روشنی رنگین کرنیں انھیں اور بھی حسین بنا رہی تھیں۔ نوجوان عورتوں اور مردوں کے ریلے ایک دوسرے سے کندھے بھڑاتے چلے جا رہے تھے۔ قہقہے، مسکراہٹیں، اور لطیف اشارے اس بزم کی جان تھے۔ یہ انوکھا ہسپتال تھا۔

لیڈی ڈاکٹر نرسوں کو ساتھ لئے چلی جا رہی تھی اس نے تمام نرسوں کو ایک ایک اسٹال پر پھرایا۔ تمام بازی اور صنفی عیاشی کے تمام نظاروں کو دکھایا۔ وہ سب حیران تھیں انھوں نے اس سے پہلے کبھی ایسا ہسپتال نہ دیکھا تھا وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہی تھیں۔ لیکن لیڈی ڈاکٹر کے ڈر سے خاموش تھیں۔

اب وہ گھوم پھر کر صدر اسٹاف کے واپس ہوئی۔ دروازے کے قریب ایک وسیع سینما ہال میں وہ داخل ہوگئیں۔ سینما کے تاریک ہال میں کچھ لوگ ناچ رہے تھے۔ شراب کی بو سے ہال کی تمام فضا میں سڑاند کا غلبہ تھا۔ نرسوں کے قدم رکے جھجکے لیکن لیڈی ڈاکٹر کی تیز نظروں نے انہیں بھانپ لیا۔

اس نے کہنا شروع کیا نرسز!

ہمارا فن ہمیں ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ ہم کسی جگہ پر کراہت محسوس کریں۔ تمہارا امتحان پورا ہو چکا۔ اب اس حال میں تمہیں اس نئی دوا کے اثرات اور اس کی ضرورت سے آگاہ کیا جائیگا۔ مثال کے طور پر ابھی تم کو ایک ایسی نمائش دکھائی گئی ہے جو سر سے پاؤں تک مسلمانوں کی سرپرستی میں ہے۔

تم نے وہاں جوا ہوتے دیکھا

سب نے کہا ہاں!

تم نے وہاں نوجوان لڑکیوں اور نوجوان مردوں کے لطیف اشارے اور میک اپ کی عریاں نمائش دیکھی؟

سب نے کہا ہاں!

تم نے وہاں شراب و سرود کی محفلیں دیکھیں۔

ہاں۔ سب نے کہا

میں تم سے پوچھتی ہوں۔

اگر اہل نمائش میں سے کسی کو پوچھا جاتا ہے؟ تم نے شراب پی یا تم نے جوا کھیلا یا تم نے اپنے حسن کی نمائش کی۔ تو وہ کیا جواب دیگا۔

کیا جواب دیگا وہ تو پتھر اٹھا کر ہمارا سر توڑنے آئیگا ڈاکٹر سب نے جواب دیا۔

بےشک تم ٹھیک کہتی ہو ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں اس نمائش سے ہسپتال کا کام لے رہی ہوں۔ میری دن رات کی ریسرچ کا یہ نتیجہ ہے کہ یہ قوم جس کام کو برا کہتی ہے وہ کرنے میں پس و پیش نہیں کرتی۔ یہ شراب کو برا کہتی ہے لیکن اس شراب کے پینے میں تکلف نہیں برتتی۔ اسکی دوشیزائیں ناچنے کی فکر کرنے لگی ہیں۔ اس کے نوجوان کی صنفی حس تیز ہو رہی ہے۔ لیکن اس کام کے لئے مجھے اکیلے دوڑ دھوپ کرنا پڑتا ہے۔ ہزاروں روپے خرچ کر کے مینا بازار قائم کرنے پڑتے ہیں۔ اب یہ کام مجھ اکیلی کے بس کا نہیں، اب تم کو میرا ساتھ دینا ہوگا۔ تم آنے والی نسل کی قوت ذائقہ بدل ڈالو اور یہ دوا صرف اسی لئے تیار کی گئی ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ تم میری امداد کرو۔ اگر تم نے میرا ساتھ دیا تو تمہاری نرسنگ کی ڈگری کو ڈاکٹری کی اعلیٰ ڈگری کے مساوی قرار دیدیا جائیگا۔

چلو اور صدر دروازے کے باہر تمام بچوں کے حلق میں ایک ایک بوند ٹپکا دو۔ لیڈی ڈاکٹر آگے آگے جا رہی تھی اور نرسیں پیچھے۔ بچوں کے حلق میں دوا کی ایک ایک بوند ڈالتی ہوئی بڑھ رہی تھیں۔

دوا دی جا چکی تھی۔ بچوں کی ہمہمہ سے فضا میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔

لیڈی ڈاکٹر نے فخریہ انداز میں گردن ٹیڑھی کر کے دیکھا

مستقبل کے بیس برس اس کے سامنے ناچ رہے تھے وہ کوچے میں مینا بازار کی چھم چھم سے اس کا دماغ خیالی طور پر مسرور ہو رہا تھا، ماؤں کی چھاتیوں میں دودھ کی بجائے شراب کی سرخی اس کی آنکھوں میں تیر رہی تھی۔ اسے اپنی کامیاب کوشش پر فخر تھا۔ قوم کے وجود میں میٹھے زہر کے اثرات کا تصور اس کے نزدیک انتہائی حسین تھا۔

نسوانی امراض کے لئے حاذق دواخانہ کی مایہ ناز ایجاد

فیملن ـــــــ نسائی خاص

یہ گولیاں عورتوں کی پوشیدہ شکایتوں کو دور کرنے میں اکسیر ہیں۔ سیلان ماہواری کی بیقاعدگی اور اسی قسم کی دوسری زنانہ شکایتوں سے پیدا شدہ جملہ نقائص کو دور کرنے میں اکسیر ہیں۔ استقرار حمل کو مدد دیتی ہیں۔ گویا عورتوں کے لئے ایک جنرل ٹانک ہے جس کا متواتر استعمال عورتوں کے نظام عصبی کو درست کرتا ہے۔ جن عورتوں کو اسقاط حمل کی بار بار شکایت ہوتی ہے انکے لئے بیحد مفید ہے۔

قیمت:۔ فی شیشی دو روپے بارہ آنے

تیار کردہ حاذق دواخانہ، بندر روڈ، کراچی نمبر۱

سعید علوی ●

رُوفاں
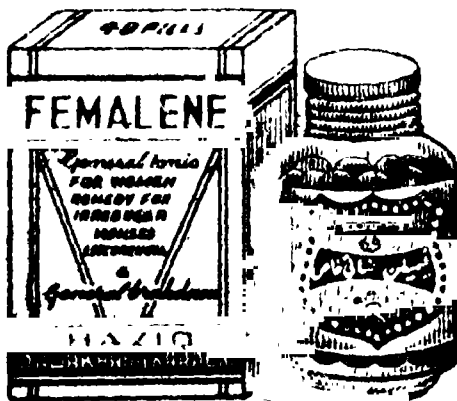
میں نے کنوری صبحوں میں اس پھیلے ہوئے نیلگوں آسماں پر سورج بابا کو خراماں خراماں نئی نویلی دلہن کی طرح نکلتے ہوئے دیکھا ہے اور سانولی شاموں میں رنگا رنگ کی گلکاریوں سے معمور شفق کی گہرائیوں میں منہ چھپاتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ میں نے آکاش پر بھیگی ہوئی راتوں میں کتنی بار حسین سے چاند کو کالی گھٹاؤں سے جھانکتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور جھلملاتے ہوئے ستاروں کا رقص بھی دیکھا ہے۔ میں نے "الصرف" جیسی جھیلوں پر چاند کو تیرتے ہوئے جیسے دلآویز نظارے ہی نہیں دیکھے بلکہ میں نے روپہلی راتوں میں اونچے نیچے ٹیلوں کی جوت سے جھانکتے ہوئے سرسوں کے پھولوں کا رقص بھی دیکھا ہے ——— لیکن میرے ذہن میں کوئی بھی ایسی تشبیہ نہ آسکی کہ ان میں سے کسی کو بھی اپنی بھابی کے ساتھ جوڑ سکوں

چند سال پہلے کی باتیں ہیں جب میں اونیٹل ولیج سے سینئر کیمبرج کیلئے لوٹ رہا تھا اور ابھی میں گھر میں پہنچ کر اپنے پیروں سے موزے بھی نہ اتار پایا تھا کہ ننھی نیلوفر کو جو فطری جلد باز واقع ہوئی ہے کہتے سنا خورشید بھیا مبارک ——— خورشید بھیا مبارک۔ یہ سن کر میرے لبوں پر ہلکا تبسم سا کھل گیا لیکن میں کسی غلط فہمی میں غوطاں ہوتے بنا ہی امی سے پوچھ بیٹھا۔ اماں جی یہ نیلی کا ہے کی مبارک بادی دے رہی ہے۔ ابھی میں کامیاب بھی تو نہیں ہوا نا ——— اتنے میں بابا جان بھی آگئے اور انھوں نے مجھے اپنے گلے سے لگاتے ہوئے کہا چلو اچھا ہوا تم بھی آگئے ——— اور جب وہ یہاں سے سرکے تو میرا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا اور میں نے اپنی پوری جھنجلاہٹ سے کہا ——— اماں جی یہ تم سب کیا پہیلیاں بجھا رہے ہو میری تو خاک سمجھ میں نہیں آتا ——— لیکن وہ یاسمن آپا سے کچھ اشارہ کر کے چلی گئیں۔ تب یاسمن آپا نے مجھے گھبرا دیکھ کر ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور پھر کہا ارے بھئی بات کچھ بھی نہیں ——— ذرا دیکھو سامنے "کیا دیکھوں" اوں وہ سامنے والا دو منزلہ بنگلہ ہے نا دیکھتے ہو" ——— ارے وہیں تو سب کچھ ہے ——— "تو یہ" ہاں بھئی وہیں تمہاری ہونے والی بھا... بی سچ یہ سن کر میرا منہ کھل گیا۔ لیکن آخر کب ——— آج شام ہی میں تو دیکھنے چلنا ہے۔ اتنے میں محمود بھائی بھی آفس سے آگئے اور میں ان کے ساتھ باتوں میں لگ گیا ———!

شام کو جب میں نے اور یاسمن آپا نے اپنی بھابی کو دیکھا تو میرا جسم خوشی سے ناچ سا رہا تھا میں نے یاسمن آپا سے کہا آپا ابھی محمود بھیا کو مبارکبادی تو دے آؤں۔ اور میں دوڑتا ہوا وہاں پہنچا جہاں وہ برآمدے میں بیٹھے وائلن سے ہلکا سا ساز چھیڑ رہے تھے ——— میں نے کہا بھیا۔ اب اس وائلن کو کیا بجاتے ہو ——— اس سے نکلے ہوئے ساز تو زندگی میں ایک خلا، خلا سا پیدا کر جاتے ہیں ——— اب تو اس خلا کو پُر کرنے کے لئے ایسا نغمہ چھیڑنے والا ہے جو زندگی کی ساری رگوں کو مسرت بخش نغموں سے بھر دے گا، ہر طرف خوشی اور مسرت کی لہریں دوڑا دے گا "اچھا جی آج بڑی شاعری سوجھی ہے آپ کو" ——— کیوں نہیں بھیا وہ باتیں ہی نکلے جو شاعروں کے تخیل سے کہیں بالاتر ہوں اگر اسے دیکھ کر کوئی شاعری نہ کر پائے تو پھر وہ انسان ہی کیا ہے بدروح کاغذ کا پتلا تو ہے اس پر وہ مسکرا پڑے اور کہا لیکن آخر کس بارے میں آپ پھبتیاں اڑا رہے ہیں ——— پھبتی! محمود بھیا سچ کہتا ہوں۔ جب سے میں نے بھابی کو دیکھا ہے وہ پھبتیاں اڑانا اور پہیلیاں بوجھنا تو جیسے بھول ہی بیٹھا ہوں ——— شریر کہیں کا ——— اتنا کہہ کر انھوں نے اپنی ہلکی سی مسکراہٹ کو ہونٹوں میں جذب کر لیا۔

۱۵ ہزار کی بھاری بھرکم رقم خرچ کر کے جب ہم بھابی کو بیاہ لائے تو وہ بھابی جن کے ساتھ جوڑنے کے لئے کوئی تشبیہ میرے ذہن میں نہ آ تی تھی ان میں اتنی ہی خوبی نہیں تھی کہ وہ اچھی ہی تھیں۔ بلکہ ان میں بڑا وصف تو یہ تھا کہ وہ ہر میدان میں اپنی شان آپ نظر آتیں ——— اتنا

ب وہ لذیذ میٹھے اور قسم قسم کے سالن پکائے گی تو پہچاننا مشکل ہو جائیگا
س کو کیا سمجھ کر کھایا جائے ——— یہ بات سب محسوس کر رہے تھے
یک دفعہ تو بڑا لطف دیگی۔ دسترخوان پر جب کشاں کشاں ایک ایک چیز
ی تو میں نے ان میں سے بہت سی چیزوں کو نہ جان کر بڑی تکلف
ے روفاں بھابی سے کہا ——— بھابی پاشاہ میرا خیال ہے کہ
انا کھانے سے پیشتر اگر ان کے بارے میں معلومات حاصل کرلیں تو
انے میں بڑا لطف آتا ہے اور پھر خود ہی مسکرانے ——— کہنے لگا۔ بات
رصل یہ ہے بھابی کے یہ سالن نما میٹھے سمجھنے میں دقت سی محسوس کرا رہا
ے اور اس پر سب بڑی زور سے کھلکھلا پڑے تھے ——— اور تو اور
ب وہ مختلف قسم کے پھینی، چاکلیٹی اور قوس قزحی سرسراتے لباس پہنتیں
بھی بادلوں کی بیٹی معلوم پڑتیں کبھی کسی جہاز کی کپتان دکھائی دیتیں۔ یا
پھر کبھی ایک امریکن لیڈی کبھی افغانی تو کبھی ہندوستانی اور اس پر ایک مرتبہ
یں نے کہہ ہی ڈالا " روفاں بھابی اس طرح گوناگوں... لباس میں تو آپ
بعض وقت اقبال، ٹیگور اور ورڈس ورتھ (Wordsworth)
ی شاعری میں ملا کرتی ہیں!

ہمارے گھر کا ماحول سارے کا سارا تکلف پسند نہ تھا، اس لئے
بھابی بھی ہم سب میں بہت جلد گھل مل گئیں اور توجہ کیا تھا۔ روز ایک آدھ
پروگرام کہیں جانے کا بن ہی جاتا ——— میں کہتا بھئی آج مینڈرز میں
جا کر لنچ اڑانا چاہیے ——— لیکن وہ یاسمن آپا جنھیں مجھ سے جنم بھر کا
بیر تھا ناک سکیڑ کر کہتیں انھیں کیا ہے سوجھی تو کہیں کارنوال جا کر جاپانی،
چینی لڑکیوں کا ڈانس دیکھنے کی سوجھتی ہے۔ یا پھر اپنے پیٹ کی۔ ہوں ہم
جانور تھوڑا ہی ہیں جو ہمیشہ سارا سارا دن پیٹ کے لئے یہاں سے وہاں
چھتے پھرا کرتے ہیں ——— تو پھر کیا تم ہی بتاؤ نا " بس آج کیپلن
چلیں گے Hollywood کی " اچھی فلم دکھائی جا رہی ہے مجھ سے
آپ کو کیا اچھی سوجھی۔ اس پر محمود بھیا کے ازلی خشک ہونٹ حرکت میں آتے
ہیں۔ کیوں نہ کلب گھر جا کر رقص دیکھا جائے اور عموماً ہم تینوں کی بیلے ٹک
رائے کا فیصلہ بھابی جان اپنی پوری سنجیدگی پر، ڈوب کر یوں کرتیں۔ اگر آج
کہیں جھیل پر جا کر گزاریں تو کیسا رہے گا ——— اور اس پر ہم
تینوں کے سر نیندی بیلوں کی طرح ہلنے لگ جاتے اور پھر چند گھنٹوں کے
بعد ہی جھیل مرا کی فضا شور وغل کے ہنگاموں سے معمور ہو جاتی ———
اور جب طبیعت وہاں سرسبز گھاس پر چلتے ہوئے ٹڈوں خوبصورت
سارسوں، اور گھاس کے میں چرتی ہوئی بھیڑوں کو دیکھ سیر
ہو چکتی تو بھابی لا ہے دسترخوان پر کھانا چن دیتیں ——— اور پھر
چیری اور املیٹ سے لیکر فلاقند تک ہم خوب جی بھر کر کھاتے ———
ادھر ہم نے کھانا کھایا اور ادھر بلوط کے درختوں تلے ہمارا بستر جم گیا
جہاں ہم اپنی کمروں کو سیدھی کرتے ہوئے بھابی کے دئیے ہوئے
مزیدار سنگوڑے، کھانے لگتے، جو ہمارے سارے اینگلو انڈین کھانوں سے
لذیذ ہوتے ———

پھر دو دن بھی نہ گزرنے پاتے کہ دوسرا کہیں جانے کا پروگرام بنایا
——— آج کدھر چلنے کے ارادے ہیں بھابی آپکے ——— بھئی
آج شالیمار رستہ جا کر پنہاریوں سے ملیا سن آئیں گے ——— اور
بس دن انہی ہنگاموں میں گزرتے رہے اور میں بھول ہی گیا کہ وقت
بہت تیزی سے درنی پلنتار باچھیوں کے یہ دن کیسے تیز گزرتے ہوئے
بادلوں کی طرح گزر گئے اور مجھے خیال نہ رہا کہ ان تمام دل فریبیوں کو چھوڑ کر
وہاں جانا ہے جہاں جا کر ایک سال کا طویل عرصہ گزارنا تھا کہنے کو تو وہ بھی کالج
کا دلچسپ ماحول تھا، لیکن وہاں چیری، فلاقند اور سنگوڑے کب بار بار کھانے
کو ملتے تھے ——— اور جب میں نے اپنی روانگی کا ٹرنک کال کیا
تو بھیا اور روفاں بھابی کچھ اداس سی ہو گئیں ——— اور تو میں کیا کرتا
ایک ہفتہ ٹھیر گیا۔ پھر خواستہ ناخواستہ مجھے گھر چھوڑنا ہی پڑا ———

اب پھر وہی کالج تھا، وہی کالج کے نئے پرانے دوست احباب
مختلف اقسام کے فنکشنس جہاں زندگی خود جھوم اٹھتی تھی۔ پھر بھی میرے
پچھلے تصورات معدوم نہ کر سکے اور یہیں دو سال کے لمبے سفر کو ایک طویل
اکتاہٹ کے ساتھ کاٹتا رہا۔ لیکن آخر آخر دنوں میں جب ہمارے کالج کا
قافلہ ایک لمبے Tour کے لئے نکلا تھا جس سے یکبارگی میں اپنے سارے
گھر کا ماحول بھلا بیٹھا ——— لیکن ایک دن جب ہم میسور کی
شاداب وادیوں میں گھوم رہے تھے۔ اور جب ہمارا قافلہ گھومتا گھماتا ایک آبشار
کے پاس نکل آیا تو وہاں چند گھنٹے کھانے اور سستانے کے لئے ٹھیر گیا تھا
اور جب ہم وہاں کھانے سے فارغ ہو کر ہری ہری گھاس پر سستانے

کے لئے اپنے ہاتھوں کا سہارا لے کر لیٹ رہے ۔ اس وقت سامنے کھیتوں
سے ایک عورت سر پر ٹوکرا لئے چل آئی اور آکر ہمیں اپنی زبان میں منجل لینے کو
کہا، تب میں نے اس سے ایک آنہ کے منجل خرید کر لیٹتے ہوئے کھانے
لگا کہ یکایک ہی میرا ذہن پلٹا کھا گیا۔ ماضی کے مٹے مٹے نقوش میرے ذہن
کی لوح پر ابھرنے لگے اور میں نے اپنی زندگی کے پارینہ اوراق کو ۲ سال پیچھے
الٹ دیا۔ جہاں ہمارا مختصر سا خاندان جھیل معرا کے قریب بلوط کے نیچے
ستاتے ہوئے بھائی کے دسے ہوئے سنگوڑے کھا رہا تھا۔ یہ سوچکر
پچھلی زندگی ایک نئے انداز سے ابھر آئی اور میں نے مسرس اپنی کلاس فیلو
کو کیمرہ دیتے ہوئے کہا مسرس مجھے اس ماحول کا ایک فوٹو تو لے دینا تاکہ جب
گھر لوٹوں تو اس واقعہ کی یاد تازہ رہے ——— میں نے بیسیوں تصاویر
بھائی کو دکھانے کے لئے لیں جیسے وسیع و عریض کھیتوں میں کپاس
چنتے ہوئے ایک سادہ دیہاتی گانے، گانے والی عورتوں کے فوٹو بھی لیے
اور انگور کے باغوں میں ٹوکریاں لئے "بندھیا" گانے والی لڑکیوں کی تصاویر
کھینچیں ——— یہ وہ ہمارا رنگیں مزاج قافلہ تھا جو امتحان کے ختم پر
ایک لامبے (Tour) کے لئے نکلا تھا اور جو فرش ہو کر گھر لوٹنا چاہتا
تھا۔ ہمارے اس کارواں کو چلے پورے ایک ماہ نو دن ہو رہے تھے۔ چنانچہ
ایک شام جب ہم جامن توڑ توڑ کر کھا رہے تھے مسرس نے مجھ سے کہا خورشید
اب ہمیں گھر لوٹ جانا چاہیے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ میں نے اس کے اس
خیال کی تائید کی اور جب بات بڑھی تو ۱۰۰ لڑکوں میں سے ۳۰ لڑکے ایسے
نکل آئے جو گھر جانے پر راضی نہ تھے ——— آخر جمعرات کی ٹرین سے
ہماری اس ٹولی نے اپنے اپنے گھروں کی راہ لی ———!!

اس دن آسمان پر راستہ تمام بادلوں کے ہیولے ناچ رہے تھے
اور ہلکی سی پھوار گر رہی تھی۔ ٹرین میں اندھا فقیر اپنی بڑی اچھی لے میں گا رہا
تھا "پیا دیس ہے جانا۔ ہا ہا ہا" میں اس رنگین ماحول میں ڈوب کر اپنے
گھر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میرے ان تصورات پر سب سے زیادہ ننھی
نیلوفر تھی اور تھیں تو بھابی۔ میں سوچ رہا تھا جانے نیلوفر کتنی بڑی ہو گئی
ہو گی۔ بھابی نے میرے جانے کے بعد سے دو سال کے طویل عرصہ میں کتنے
پروگرام بنائے ہونگے ابھی طویل طویل سوچوں میں ایک طویل مسافت
کے بعد اسٹیشن آ گیا۔ دو سال کے لامبے عرصے کے بعد اتر رہا تھا اس
لئے وطن کی ہر چیز میں ایک جاذبیت رقصاں نظر آتی تھی۔ اسٹیشن پر توقع کے
خلاف بھیا، بھابی، آپا نظر نہیں آتے تھے۔ ادھر ادھر پلٹ کر دیکھا تو رشید و
اور رمزو مسکراتے چلے آ رہے تھے ——— ادب چھوٹے سرکار نے
کہوں رشید و بھیا وغیرہ نہ آئے کیا، میں نے جلدی میں پوچھا "ہاں صرف بڑے
سرکار آئے ہیں وہ باہر موٹر پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں ——— اور
جب مدت بعد میں بے خودی کے عالم میں بھیا سے گلے مل رہا تھا تو مجھے ایسا
معلوم ہوا کہ میرے برسوں کے منتشر دماغ کو سکون سا مل گیا ہے ———
اور جب ہم موٹر میں سوار ہوئے تو میں نے بھیا کے چہرے کو بڑے غور سے دیکھا
یہ دیکھ کر کہ بھیا کے چہرے پر خوب صورت گھنی ڈاڑھی نکل آئی ہے، اچھل پڑا۔
بھیا نے کہا "ارے تمہیں کیا ہوا سیٹ میں کانٹا تو نہیں"، اور میں نے کہا
نہیں نہیں بھیا کچھ ایسا ہی معلوم ہوا تھا۔ بھیا اپنے گھنگھریالے بالوں میں
سیدھی مانگ اور گھنی داڑھی میں ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے گھنیرے اندھیروں
سے چاند ابھر آیا ہے۔ لیکن دوسرے لمحے میں سوچ میں ڈوب گیا۔ آخر یہ بھیا
کو ڈاڑھی رکھنے کی کیا سوجھی تھی، خواہ مخواہ فضول سے بن بیٹھے۔ اور پھر فی زمانہ
آجکل تہذیب میں ایسے انسان تو خالص رجعتی نظر آتے ہیں اور یہ سوچتے ہوئے
مجھے اپنے کالج دہ دوست یاد آ گیا جو اپنا خاص نظریہ رکھنے والی کتابیں
کو لڑکوں سے لیکر پروفیسر صاحبان تک تقسیم کرتا اور جب کوئی پروفیسر اس سے کہتا
بھئی رفیق اب میں یہ کتابیں کیا پڑھوں، میری عمر ہی جبکہ کتابیں پڑھنے میں
گزر چکی ہے۔ اس پر وہ ایک زنانٹے کا جواب چھوڑتا "یہ زندگی کچھ اور بھی چاہتی ہے
سر، آپ نے تو صرف کتابیں پڑھنے میں عمر گنوائی ہے لیکن آج دنیا نے اتنی
ترقی کر لی کہ وہ زمین سے لیکر چاند تک آسانی سے پہنچ کر وہاں کا حال بتلا سکتا ہے
ہوا سے لیکر پانی کے ایک ایک اجزا کو علیحدہ کر سکتا ہے۔ دیکھئے تو ایک انسان
نے ان چیزوں کو معلوم کر لیا جو اس کے پیدا کرنے والے کی مظہر ہیں لیکن معلوم
ہی نہ کر سکا تو اس کے متعلق جس نے خوب صورت چاند میں ٹھنڈی روشنی
دی۔ جس سورج کی تمازت بھری شعاعوں سے کائنات میں حرارت بخشی جس نے
ستاروں کا خوبصورت جال بچھایا۔ اور کائنات کو دلآویز رنگینی سے بھر دیا اس
لئے ایک انسان کا اولین فریضہ ہے کہ اس کے متعلق بھی معلوم کرے
اس پر پروفیسر صاحب لاجواب ہو جاتے۔ اور جب وہ ہمارے پاس آتا
میں اسے ٹالنے کی خاطر کہتا "دوست رفیق مانا کہ تم بہت عقلمند ہو اور ایک

ے آئیڈیلسٹ (Idealist) بھی۔ لیکن تمہارے عقلمند ہونے
تو مقصد نہیں ہو سکتا کہ زمین کی زرخیزی گھاس کی طرح منہ پر بھی نکل آئے
ں ہماری پارٹی ایک گونجیلا قہقہہ لگاتی جس پر وہ خاموشی سے چلا جاتا ۔
ں بھیا کو دیکھ یہی سوچ رہا تھا کہ لوگ انھیں بھی اس طرح نہ بناتے ہوں
بھے خاصے انسان ہو کر فضول سی حماقت کر بیٹھے : یہ سوچکر مجھے بڑی تکلیف۔
ں اور اتنے میں گھر آگیا۔ بھابی اور یاسمن آپا چلمن کی اوٹ سے جھانکتے
سر پھسر کر رہی تھیں، انھیں دیکھ کر میں نے انتہائی خوشی میں کہا۔ لو بھابی گڈ ایونگ
علیکم السلام خورشید بھیا۔ یہاں بھی بھیا کی طرح جیرانی تھی۔ امریکن جاکیٹ اور
لنگ کئے ہوئے بلا زروں کی بجائے لابنے لابنے غرارے اور سروں پر اوڑھنیاں
یہ کیا تماشا ہے ۔ کچھ بھی تو نہ سمجھ سکا لیکن دوسرے لمحے میرے
دماغ میں یہ بات سما گئی کہ یہ تو بھابی کا خاصہ ہی رہا ہے کہ وہ ہر سانچے
میں ڈھل جاتی ہیں کبھی ہندوستانی طرز اختیار کر لی تو کبھی مغربی اس لئے
مجھ پر زیادہ اثر نہ ہوا۔ لیکن جوں جوں دن گزرتے رہے، اور ہر روز جب عروس
صبح رات کے جھروکوں سے جھانک جھانک کر ایک نئے انداز سے نکلتی رہی تو
میرے یقین میں کچھ بھی گنجائش نہ رہی کہ ہمارے گھر کا ماحول تو بدل گیا ہے
کھانے پینے چلنے پھرنے کے رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے تھے وہ بھابی جس نے
ہمارے گھر میں قدم رکھکر ایک نئی زندگی بخشی تھی اب گھر میں دقیانوسیت
پھیلا رہی تھیں۔ کبھی بھائی کا یہ حال تھا کہ ایک بجے تک کلب گھر سے واپس
نہ آتے۔ اب رات کے ایک بجے تک اپنے ماہنامہ کے لئے بیٹھے لکھتے رہتے
اور بھابی کاپیاں دیکھنے میں ان کی مدد کرتیں۔ انھوں نے اپنی ملازمت ترک
کرکے صحافت کا آزاد پیشہ اختیار کر رکھا تھا۔ ان کے بدلتے ہوئے رنگ ڈھنگ
نے ہمارے گھر کی ساری خوش گپیاں چھین لی تھیں۔ اب نہ وہ گونجیلے قہقہے
ہی تھے اور نہ مصرا اور شالیمار باغ کی تفریحیاں ہی۔ یہ دیکھ کر میرے رنگین
تصوراتی سپنے، میرے وہ ارمانوں کے محلات جنھیں میں نے دو سال کے
عرصہ میں تعمیر کیا تھا یکدم سے نیچے آ رہے تھے وہ تمام امنگیں جو ایک ایک
کرکے میرے دل میں پرورش پاتی رہیں وہ معدوم ہو چلی تھیں حسرتوں کے
انبار ڈھیر۔ یہ سوچنے میں ختم ہوتے گئے کہ اس دو سال کے عرصہ میں ہمارا گھر
کہاں سے کیا ہو گیا۔ گھر کے اس بدلتے ہوئے حالات میں نہ مجھے دوستوں کیساتھ
حسینوں کی تفریح ہی اچھی لگتی تھی اور نہ کارنوال میں چینی لڑکیوں کا کوئی
ڈانس ہی بھاتا اور ایک روز جب میں بھیگا بھیگا بیٹھا کتاب پڑھتا تھا
اماں جی نے کہا کیوں بیٹا تم بہت خاموش نظر آتے ہو۔ کھانا کل گیا تھا
اور اس پر میں نے اپنی کتاب پرے پٹخ کر جھلاتے ہوئے کہا۔ کیا کھانا کھیا میں
اماں جی کچھ سمجھ میں نہیں آتا، ہمارے گھر کا نقشہ کیوں بدل گیا ہے۔ آخر یہ بھابی
بھیا اور آپا کو ہو کیا گیا ہے۔ جب سے گھر آیا ہوں نہ آجتک کہیں جانے
کا پروگرام ہی بنا اور نہ ہی وہ پہلی سی حالت رہی۔ ان لوگوں کی آخر اتنی جلد
ان کی شگفتگی کیسے سنجیدگیوں میں تحلیل ہو گئی، دیوانے کہیں کے ہر
چیز سے دقیانوسیت ٹپکتی ہے۔ دنیا ترقی کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے یا پیچھے
ـــــ اور تو پھر کیا تھا اماں جی کو بھی کسی نے شاعری سکھلا دی تھی۔
ـــــ بڑے ہی شاعرانہ رنگ میں کہا بیٹا یہ انسان کی سراسر بھول ہے
اگر ہمیں ماضی سونا دنیا رہے۔ اگر ماضی میں ہیرے چھپے ہیں۔ اگر ماضی میں
انسانیت کی بھلائی، اس کی نجات اور آرام پوشیدہ ہے تو اسے حال کی
ترقی پسندی، اس کی خوب صورت تہذیب سے تو یہ پہلی جس کی راہوں میں
ہزاروں کانٹے ہیں جس پر چل کر انسان اپنی منزل کو پہنچتے پہنچتے تک لہولہان
ہو جاتا ہے ـــــ آج انسان ان کانٹوں کو پھول سمجھ کر جس تیزی
سے گزر رہا ہے اور جو اپنے کو بہت بڑا ترقی پسند سمجھنے لگا ہے یہ انسانیت
کی بہت خطرناک غلطی ہے۔ کل کی لگنے والی ٹھوکر اسے کچھ اس طرح لگے گی
کہ انسان کا سنبھلنا دشوار ہو جائے گا۔ اس لئے انسان کو چاہیے کہ ابھی تو
سوچ سمجھ کر اس کی راہوں پر چلے جو دنیا جہان کا رہبر اعظم ہے اور اسی رہبر
اعظم کی راہوں پر چل کر کسی کے گھر کا نقشہ بدل جائے تو تم کو دقیانوسیت
ٹپکتی معلوم ہوتی ہے۔ یہ تمھاری بھول ہے بیٹا، بے راہ زندگی اختیار کرکے
مقصد امانت میں خیانت کرنا کل کس قدر نت نئی پریشانیوں کا باعث بن
جائے گی۔ یہ سن کر تو میں اور بھی پریشان سا ہو گیا۔ میں نے اماں جی سے
کہا آپ لوگوں سے تو بڑی شکل آ پڑی ہے، کچھ ایسے ڈھنگ سے، ایسے
نئے نئے انداز سے باتیں تبلائی جاتی ہیں کہ انسان کو خاموش رہنے بنا چیز
نہیں۔ یہ سب کے سب ہی بہکے ہوئے ہیں اور میں انھیں الفاظ سے دل
کو تسلی دے لیتا ـــــ یہ باتیں اپیل کرنے کے لئے تو کافی
مدار کھتیں لیکن میں ان سے گریز کرتا رہا گھر کا ماحول مجھے بور ہونے لگا
اور میں سارا سارا دن گھر سے غائب رہنے لگا ـــــ

آخر ایک دن جب بدلیاں گھر آئی تھیں میں گھر کے پچھواڑے باغیچہ میں بیٹھا ٹالسٹائی کا ایک دلچسپ رنگین ناول پڑھنے میں اتنا غرق تھا کہ مجھے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ بھابی چائے لئے کھڑی ہیں اور جب میں نے ورق پلٹنے کے لئے نظریں اونچی کیں تو دیکھا کہ بھابی مسکراتے ہوئے چائے لئے کھڑی تھیں ——— میں نے چونک کر کہا۔ معاف کرنا بھابی، لیکن یہ چائے آج آپ لائی ہیں، کیوں نوکر نہیں تھا کیا ——— اس پر بھابی بڑی بڑی سنجیدگی سے بولیں تو کیا خود کے ہاتھ سے چائے لانا کسر شان ہے میں جھینپ گیا اور سوچنے لگا واقعی کتنی عجیب ہو چلی ہے یہ بھابی بھی۔ بہت دنوں بعد اکیلے بھابی سے ملنے کا موقع ملا تھا۔ اس لئے ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ اس پر باتوں ہی باتوں میں بھابی نے کہا کیا ٹالسٹائی کو پڑھ رہے تھے۔ اس پر میں نے ان کے اس طرح اچانک پوچھنے پر کہا کیوں آپ کو ٹالسٹائی پسند نہیں کیا۔ انہوں نے مسکرا کر کہا زندگی سے واقف ہونا چاہتے ہو اگر زندگی سے بوجھل زنجیریں پھینکنا چاہتے ہو تو وہ کتابیں پڑھو جو انسان کی صحیح رہبر ہوں ——— تو کیا آپ کا مقصد ٹالسٹائی .... نہیں نہیں۔ اس پر بھابی نے بات کاٹ کر کہا۔ میرا یہ مقصد نہیں کہ ٹالسٹائی ادب کسی قدر کا حامل نہیں، اس کی اپنی خاص انفرادیت ہے۔ میں تو عام بات کہہ رہی تھی کہ جب ایک ادیب پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ گھر میں بیٹھ کر قوموں کی لیڈرنگ کرتا ہے" تب اسے چاہیئے کہ وہ انسان کے اندر سے وہ تمام زہریلے مادے ختم کر دے جو انسان کو گھن کی طرح کھا لیتے ہیں اور زندگی ہمیشہ کیلئے داغدار بن جاتی ہے۔ اسے چاہیئے کہ وہ انسان کی زندگی کے تمام تاریک پہلوؤں کو چھانٹ کر اسے ایک ایسی صاف راہ پر لے آئے جس سے زندگی کا ہر شعبہ نور کی جھلکیوں سے چمک اٹھے ——— ایک ادیب کا یہ فرض ہے کہ انسانیت کو برائیوں سے بچانے کے لئے یہ بتلائے کہ اگر وہ کسی تاریک مقام پر بیٹھ کر گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے تو وہاں بھی جھانک کر ایک ایسی ہستی ہے جو نہ صرف اس مقام کو ہی دیکھ سکتی ہے بلکہ اس کے تمام اندرونی رازوں کو بھی جانتی ہے۔ اس لئے میں تمہیں ایسے ادیبوں کی کتابیں پڑھنے کے لئے کہتی ہوں ——— میں نے ایک زوردار تالی پیٹی ہیئر ہیئر اور کہا واقعی بھابی آپ تو اتنی زیادہ ہوشیار ہو چکی ہیں کہ انسان کو بڑے ہی فلسفیانہ رنگ میں ایسی باتیں بتلا جاتی ہیں کہ جس پر سنجیدگی سے غور کرنا پڑتا ہے۔ اور پھر دونوں بھابی سے میں نے وہی بات پوچھی۔ گو بھابی ان گوناگوں واقعات نے میرے دماغ پر ایسے نقوش مرتسم کئے ہیں کہ میں سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ میرے لئے کونسا راستہ بہتر ہو سکتا ہے لیکن مجھے یہ بتلایئے کہ آخر آپ پر یہ اثرات کیسے مرتب ہو گئے۔ کیا اس لڑکی کے متعلق سوچا بھی جا سکتا ہے کہ وہ لڑکی جو ہمیشہ مغربی طرز کی دلدادہ رہی ہو جس نے اپنی بیشتر زندگی کو ہنستے گذارا ہو جو ہمیشہ قیمتی رنگ برنگے لباس پہنتی رہی ہو اور جسے بال بناتے غازہ اور لپ اسٹک لگاتے سنورتے میں گھنٹوں گزرتے ہوں ——— مجھے تو بڑا تعجب ہے کہ وہ اتنی جلد بدل جائے کہ ایک خالص ہندوستانی لڑکی بن کے رہ جائے۔ اور گھر کی چار دیواری میں ایک اچھی لڑکی اور ایک اچھی ماں بن کر گزارنے لگے ———

اس پر وہ کچھ جھینپ سی گئیں جیسے اپنی پچھلی بے راہ رو زندگی پر کچھ شرمندہ ہو رہی ہوں ——— پھر بھابی نے بتلایا یہ تو ایک طویل واقعہ ہے جو وقت چاہتا ہے لیکن جب سے تمہارے بھیا نے وہ کتابیں پڑھیں جو انسان کو اس کی زندگی کی حقیقتوں سے واقف کرا کے زندگی کو تمام بے راہ روی سے بچا کر ایک حدود میں لے چلتی ہیں اور جب وہ کتابیں مجھے بھی دیں۔ جوں جوں ہم اسے پڑھتے گئے ایسے معلوم ہوتا گیا جیسے ہماری زندگی گندی نالی کی طرح بہ رہی ہے۔ ہمارا شعور جاگ اٹھا کہ اس کی طرح کی بے راہ روی سے زندگی کے حسین چہرے پر سیاہ لکیریں پھیرنا زندگی کی کتنی بڑی توہین ہے اور اسی وقت سے ہماری زندگی اس موڑ پر چلتی رہی ہے ——— بھابی کی یہ تمام باتیں سننے کے بعد میری سماعت میں گرہ کی حیثیت لے کر رہ گئیں ——— اور میں نے پہلی مرتبہ یہ سوچا واقعی بھابی کتنا ٹھیک کہتی ہیں یہ اسطرح کی بے راہ روی سے زندگی کے حسین چہرے پر سیاہ لکیریں پھیرنا زندگی کی کتنی بڑی توہین ہے میں نے بڑے تاثر سے کہا کیا بھابی بالشاہ آپ مجھے وہ کتابیں دے سکتی ہیں اور بھابی مجھے وہ کتابیں دے گئیں یہ وہ باتیں تھیں جو پچھلے چند سال میں ہوتی رہیں۔ لیکن اس کے بعد جب میں نے بھابی کی دی ہوئی یکے بعد دیگرے ایک ایک کر کے ساری کتابیں چاٹ ڈالیں تو میرے بھی خیالات کی اتھاہ گہرائیوں سے یہ بات ابھر آئی سچ یہی ہے "بے مقصد زندگی کسی انسان کی پہلی موت ہی تو ہوتی ہے" اور پھر کہا تھا

ہمارا قافلہ ایک ہی مقصد کے لئے زندگی کی سچی راہوں پر رواں دواں تھا ——— اور آج میں جب بھی بھابی کے متعلق سوچا کرتا ہوں تو مجھے بڑا تعجب سا ہوا جاتا ہے کہ جس بھابی نے بھیا کے جاہل دوڑ ہی ایک بہترین ساتھی کی حیثیت سے ساتھ دیا۔ اسی طرح حق کی ان راہوں پر بھی ایک فرض شناس شریک حیات کی طرح بھیا کا ساتھ دیتی رہی ہیں ——— اسی لئے اب میں بعض بعض وقت خدا سے دعا کرنے لگ جاتا ہوں ——— اللہ میاں تو کسی انسان کو ایسا ہی ساتھی دے جو زندگی کے ہر موڑ میں اس کی ہمت بندھا سکے۔ جو اس کے ہر عزم سے متفق رہے ——— جو عصمت و شرافت، شرم و حیا کی مالک بھی ہو ——— اور جو ہوس فضاؤں میں بھرے ہوئے طوفان کی طرح اس کے ساتھ چل پڑنے کی ہمت بھی رکھتی ہو ———!!

ادارہ ادب اسلامی ناقہ بیکنٹ آباد دکن کے اجتماع میں پڑھا گیا

قوت طاقت اور مردانگی چوبیس گھنٹے میں تو نہیں مگر ہاں تیس دن میں ضرور حاصل ہو سکتی ہے

کیا آپ تھکاوٹ، چڑ مردگی نقاہت، اور کمزوری محسوس کرتے ہیں۔ کیا آپ کی قوت حافظہ کمزور ہے۔ کیا آپ ہر وقت خوف زدہ اور غمگین رہتے ہیں ——— ؟

کیا آپ کا جسم دبلا ہے اور آپ سستی اور کمزوری محسوس کرتے ہیں۔ کیا آپ احساس کمتری کے شکار ہیں۔ اگر ایسا ہے تو یقین جانیئے کہ آپ کے وہ غدود جو قوت مردانہ کے مخزن ہیں کمزور ہو گئے ہیں اور جب تک آپ ان غدود کو طاقت ور بنا کر ان کی حفاظت نہیں کریں گے۔ آپ کبھی بھی قوت و طاقت و مردانگی کی صفات سے متصف نہیں ہو سکتے ——— خوش قسمتی ہے

امام طب حکیم سید نذیر احمد صاحب دہلوی

اپنے ۵۰ سالہ تجربہ کے بعد ایک ایسا نسخہ مکمل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو کہ مردانہ غدود کی جملہ کمزوریوں کو دور کر کے انھیں طاقت بنانے کا بہترین سادہ اور سہل علاج ہے۔ طب یونانی کی اس جدید اور مایہ ناز ایجاد کا نام

حاذق کورس

ہے جو تین مختلف ادویہ پر مشتمل ہے اور تیس دن کا مکمل کورس ہے جس کا ابتدائی استعمال آپ کے جسم میں طاقت قوت اور تندرستی کا احساس پیدا کر دے اور پورے تیس روز کے بعد آپ ایک مکمل نوجوان، تندرست و توانا اور طاقت ور مرد بن جائیں گے۔

حاذق کورس

کا استعمال فوراً آپ کے غدود کو طاقت ور بنا کر اپنا اثر شروع کر دے گا آپ کے بدن میں تازہ سرخ خون پیدا کر کے اس میں جوانی کا جوش پیدا کر دے گا اور جوں جوں آپ کے غدود طاقت ور ہوتے جائیں گے آپ اپنے اندر زندگی کی ایک نئی لہر محسوس کریں گے اور آپ زندگی کے ہر شعبے میں حقیقی زندگی سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔ یعنی "لطف شباب!"

حاذق کورس مکمل برائے تیس یوم - بارہ روپے

حاذق دواخانہ، بندر روڈ، کراچی نمبر (۱)

Asmar
The TONIC FRUIT DRINK
REFRESHING
INVIGORATING
Excellent
with
SODA WATER
OR HOT OR
COLD WATER
IDEAL FRUIT TONIC
Asmar
REFRESHING & INVIGORATING
DELICIOUS
(NON-ALCOHOLIC)
FRUIT FLAVOUR UNANI SYRUP
DILUTE TO TASTE WITH SODA
WATER OR COLD OR HOT WATER
HAZIQ DAWAKHANA
BUNDER ROAD KARACHI
ALWAYS DRINK
Asmar
اثمار
پھلوں کا
بخش اور مقوی
شربت۔ سوڈا واٹر یا ٹھنڈے
پانی میں استعمال کیجئے
حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی
HAZIQ DAWAKHANA KARACHI
KAMIL

Monthly "MUSHIR" Karachi.

...د معیاری ہی کے سبب حاذق دواخانہ کی تیار کردہ ... نانی ادویہ مشہور اور مقبول عام ہیں

ہضمی امراض معدہ اور ان سے اچانک پیدا ہونے والی تمام تکالیف کے لئے بہترین یونانی مرکب ہے قیمت فی شیشی 1/4

مُصفّی جدید خون صاف کرنے کی مشہور یونانی دوا۔ خارش خشک پھوڑے پھنسیوں دائمی جلدی امراض کے لئے مفید ہے قیمت فی شیشی 1/2

مُفرّح فولادی تازہ خون پیدا کرتا ہے وزن بڑھاتا ہے ہڈیوں اور پٹھوں کو قوت اور طاقت بخشتا ہے قیمت فی شیشی 2/8

سلورین پلز جنسی طاقت کو بڑھانے اور بحال رکھنے کے لئے مستند ... قیمتی اجزاء سے مرکب گولیاں قیمت 40 گولی 4/12

فیملن عورتوں کی پوشیدہ امراض لیکوریا۔ ماہوار کی خرابی اور بے قاعدگی کو دور کرکے نیا خون اور طاقت پیدا کرنے کے لئے اکسیری گولیاں۔ قیمت 40 گولی 2/12
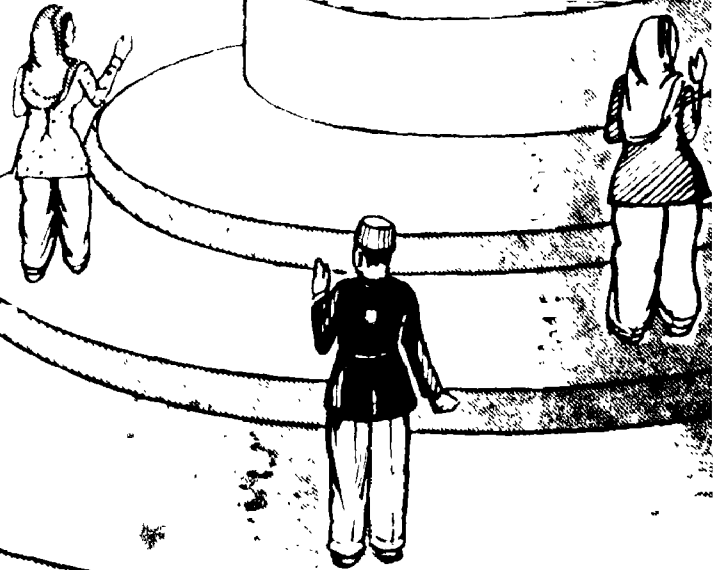
منیجر
حاذق دواخانہ
بندر روڈ - کراچی نمبر 1

مشیر
قیمت :-
پاکستان
دفتر ماہنامہ مُشیر بندر روڈ، کراچی نمبر (۱)

Young in Spirit
and Appearance at 40
ڈرائیونگ موڈ
چالیس سال
اور مسلسل استعمال ہے۔
آپ کے شہر کے بڑے بڑے دوا فروشوں سے مل سکتی ہیں۔ یا براہ راست
حاذق دواخانہ۔ بندر روڈ۔ کراچی سے طلب کیجئے
مستند اور قابل اعتما
یونانی مجربات کا ٹریڈ مارک

ادارہ "مشیر" قارئین مشیر و جمیع مسلمانان پاک و ہند
کی خدمت میں دلی

عید مبارک

پیش کرتا ہے!

پاکیزہ ادب اور صحیح اسلامی مشورے لئے ہوئے

فہرست مضامین، جولائی سنہ ۱۹۵۲ء

بدل اشتراک :-

پاکستان ـــ سالانہ ـــ تین روپے

〃 ـــ فی پرچہ ـــ چھ آنے

بھارت ـــ سالانہ ـــ ساڑھے چار روپے

〃 ـــ فی پرچہ ـــ آٹھ آنے

جلد ~~~~~~ ۳

شمارہ ~~~~~~ ۷

مرتبہ :- عبد الغفور بیگ

طابع و ناشر:- عبد الغفور بیگ مطبع: مشہور پریس، دفتر:- بندر روڈ کراچی نمبر ۱

منیر کراچی

جولائی ۱۹۵۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نئے اسلام کے نئے مفتی

حال ہی میں پاکستان میں ایک بڑی ہی خطرناک تحریک شروع ہوئی جسکا مقصد "ملا ازم کی مخالفت" کے پردہ میں احکام اسلامی اور شعائر اسلامی کی تضحیک اور مخالفت کرنا اور علمائے اسلام و مسلمانوں کے اعتقادات و احساسات کے خلاف سخت اور نہایت ہی ناگوار لہجہ میں تنقید کرنا ہے۔ اس تحریک کے علمبردار زیادہ تر وہ پڑھے لکھے لوگ ہیں جو علم دین سے اکثر بے بہرہ ہیں مگر مغربی تہذیب و تمدن کے بڑے دلدادہ ہیں (بلکہ اگر انہیں دین مغرب کے کٹر "ملا" کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا) اس گروہ کے دو نئے مفتی جو اس تحریک کی علمبرداری میں پیش پیش ہیں اور نمایاں حصہ لے رہے ہیں ہمارے ہمعصر انگریزی روزناموں "ڈان" اور "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کے ایڈیٹر صاحبان ہیں۔ کچھ عرصہ سے ان ہر دو حضرات کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ان معاصروں نے اسلام، تاریخ اسلام، اور احکام اسلام کی من مانی توضیحات کرنا علمائے اسلام کا تمسخر اڑانا، اور ہر اس چیز کو جس سے نفی اسلام ہو اسلامی قرار دینا اپنا مذہبی فرض قرار دے لیا ہے۔ یہ "سکندر بخت" قسم کے نام کے مسلمان اپنی عملی زندگیوں کے لحاظ سے تو اسلام سے قطعاً عاری ہیں اور اتنی اخلاقی جرأت نہیں رکھتے کہ کھلم کھلا اسلامی اصولوں کو چیلنج کر سکیں مگر در پردہ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ وہ تمام غیر اسلامی اعمال و افعال جن کے وہ اپنی زندگیوں میں عادی ہیں انہیں اسلامی قرار دیدیا جائے اس لئے کبھی تو شراب کے جواز میں فتوے صادر ہوتے ہیں۔ کبھی جوئے کو تفریحی کھیل قرار دیا جاتا ہے کبھی روزے کے احترام کو مہمل کہہ کر ماہ رمضان کے تقدس ہی کو بے معنی قرار دیدیا جاتا ہے۔ چند ماہ گزرے ہیں کہ معاصر "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کے ایڈیٹر نے فتویٰ صادر فرمایا تھا کہ اسلام اور قرآن میں شراب کی ممانعت نہیں ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی شراب کی خرید و فروخت پر کوئی پابندی نہ تھی۔ ان کی اس تحریر پر مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی تو انہوں نے ملّا اور ملائیت کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا۔

اب احترام رمضان کے سلسلے میں معاصر "ڈان" کے ایڈیٹر نے ۸ رجون ۱۹۵۲ء کے سنڈے ایڈیشن میں ایک افتتاحیہ "خطرناک رجحانات" کے عنوان سے سپرد قلم کیا ہے جس میں انہوں نے نہ صرف روزے کے فرض ہونے کا مضحکہ اڑایا ہے بلکہ علماء کے خلاف بھی زہر اگلا ہے، اور حکومت پاکستان کو بھی تنبیہہ کی ہے کہ وہ ماہ رمضان کا احترام کرانے والوں کو قرار واقعی سزائیں دے۔ قصہ یہ تھا کہ پشاور، راولپنڈی اور کچھ دوسرے شہروں میں کچھ لوگوں نے ماہ رمضان کا احترام نہ کرنیوالے لوگوں پر اخلاقی دباؤ ڈالکر انہیں ماہ رمضان کا احترام کرنے کی تلقین کی۔ یہ حقیقت کچھ ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ روزے ہر تندرست اور بالغ مسلمان پر فرض ہیں اور ہر مسلمان کے لئے رمضان المبارک کی حرمت اور سعادت مسلّم ہے اور ہر مسلمان سے توقع کی جاتی ہے کہ اگر کوئی شرعی عذر نہ ہو تو وہ روزے رکھے گا۔ اگر کوئی مسلمان کسی شرعی عذر یا اپنی عملی کمزوری کی وجہ سے روزے نہ رکھے تو کم از کم اسے احترام رمضان کے طور پر علانیہ کھانے پینے سے ضرور احتراز کرنا چاہیئے۔ اگر کوئی مسلمان یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتا، بلکہ ایک تو روزہ نہیں رکھتا اور پھر الٹا اس ماہ میں علانیہ کھانے پینے کا مظاہرہ کرتا ہے تو یقیناً وہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اسے ماہ رمضان کے احترام کا کوئی لحاظ نہیں ہے اور اس طرح وہ عامۃ المسلمین جن کا اعتقادی احساس اس مبارک مہینہ میں بہت قوی ہوتا ہے، کے مذہبی احساسات کو مشتعل کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ وہ صرف ایک اسلامی معاشرہ کے ڈسپلن ہی کو نہیں توڑتا بلکہ اس ڈسپلن کے برقرار رکھنے والوں کو مشتعل بھی کرتا ہے اس صورت میں اگر چند لوگوں نے ایسے لوگوں کو رمضان کا احترام کرنے کی تلقین کی تو یہ کوئی ایسا امر نہ تھا جس پر اس قدر

بیچ پا ہو جائے۔ واقعہ ہو تو پشاور یا راولپنڈی میں اور درد اٹھے کراچی میں ڈان کے ایڈیٹر صاحب کو۔ وہ لکھتے ہیں کہ ———

"ہم جانتے ہیں کہ اس مہینے کا احترام ممکن حد تک ہونا چاہیئے اور اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے مگر وہ لوگ جو اس احترام کے پردے میں قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں وہ اسلام کے عقلی اور روادارانہ اصولوں سے قطعی ناواقف ہیں جب تک ملک کے قانون داں ایسے قوانین نافذ نہ کریں جن کی رُو سے ماہ رمضان میں روزہ نہ رکھنا جرم قرار پائے ——— اور ایسے قانون نافذ کرتے وقت انکو (یعنی ملک کے قانون دانوں کو) اچھی طرح غور کرنا ہوگا ——— اگر کوئی شہری روزہ نہیں رکھتا تو وہ کوئی جرم نہیں کرتا خدا نے خود روزہ نہ رکھنے کی سہولتیں دے رکھی ہیں جو آدمی ان سہولتوں کے ماتحت روزہ نہیں رکھتا وہ خدا کی نگاہ میں کوئی گناہ نہیں کرتا خدا کے یا انسان کے بنائے ہوئے قوانین خواہ کچھ بھی ہوں مگر افراد کو ان کے نفاذ کا کوئی حق نہیں ہے آخر یہ لوگ کون ہیں جو اپنے آپ "خدائی خدمتگار" بن بیٹھنے کے دعویدار ہیں۔ آخر ان اصلی یا نام نہاد علماء کو بھی کیا حق حاصل ہے کہ وہ خدا کے بندوں پر خدا کے قوانین کو ٹھونستے پھریں علماء کا کام تو صرف وعظ و نصیحت تک محدود رہنا چاہیئے!"

مندرجہ بالا تحریر پڑھکر ہر معقول آدمی یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ ہمارے یہ فاضل معاصر آخر کس کی وکالت کر رہے ہیں آیا اسلام کی، یا روزہ نہ رکھکر کھلے بندوں کھانے پینے والے اور ماہ رمضان کا احترام نہ کرنے والوں کی یا اپنے دل کے چور کی! اور "احترام رمضان" اور "ممکن حد" سے انکی کیا مراد ہے اور "اسلام کے عقلی اور روادارانہ اصول" جن سے عوام اور علماء ناواقف ہیں ہمارے فاضل معاصر کی "عقل" میں کیا ہیں؟ اگر "احترام رمضان" سے ہمارے معاصر کی مراد یہ ہے کہ ایک شخص خواہ باعذر شرعی یا بلا عذر شرعی روزہ نہ رکھے تو اسے کھلے بندوں کھانے پینے کی چھٹی ہے اور "ممکن حد" سے ان کی مراد یہ ہے کہ اگر روزہ نہ رکھکر ایک آدمی گھر کے اندر بیٹھکر اچھی طرح پیٹ بھر کر کھا سکتا ہو پھر بھی اسے سر بازار کھانے پینے کی کھلی چھٹی ہے تو یہ "عقلی رواداری" ہمارے معاصر کی اپنی "عقل" کی ہو تو ہو کم از کم اسلام کی نہیں ہے آخر "احترام رمضان" کو جس سے انہیں اختلاف نہیں ہے کیا معنی پہناتے ہیں۔

باقی رہا یہ سوال کہ ماہ رمضان میں روزہ نہ رکھنے والوں کیلئے ہمارے قانون داں اچھی طرح غور کرنے کے بعد کیا قانون بناتے ہیں یا کوئی قانون بناتے بھی ہیں یا نہیں تو اس سلسلے میں ڈان کے فاضل ایڈیٹر کی خدمت میں مودبانہ گزارش ہے کہ معاشرہ میں سبھی گناہ ایسے نہیں ہوتے جن کی اصلاح کرنے کیلئے قانون کی پشت پناہی کی ضرورت ہو، انسانی معاشرہ میں بہت برائیاں ایسی بھی ہو جاتی ہیں جنکو درست کرنے کیلئے عوام کی طرف سے صرف اخلاقی دباؤ ہی کافی ہوتا ہے۔ صرف شرم دلاکر ہی گناہ کرنے والے کو راہ راست پر لایا جاسکتا ہے اگر فاضل مدیر کا حافظہ کمزور نہیں تو انہیں یاد ہوگا کہ آج سے تقریباً دو سال پیشتر جب انہوں نے ڈان ٹرسٹ کے انگریزی روزنامہ "ڈان" کو "ہیرلڈ" میں تبدیل کرنیکی نازیبا حرکت فرمائی تھی تو اس وقت اس ملی اخبار کو غصب کرنے کے گناہ سے روکنے کیلئے لوگوں نے قانون کا دروازہ نہیں کھٹکھٹا تھا بلکہ محض اخلاقی دباؤ ڈالکر فاضل معاصر کو شرم دلائی تھی کہ للہ اس قومی غداری سے باز آؤ اور قائد اعظم کے نام کو بٹہ نہ لگاؤ جسکا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ دو دین اشاعت کے بعد ہی حضور نے ہتھیار ڈالتے ہوئے فرمایا تھا کہ ——— "ام تم کو تمہارا ڈان واپس ڈیتا ہے" ——— اسوقت کوئی قانون کارگر نہیں ہو سکتا تھا اور اتنی جلدی ہی نہیں ہو سکتا تھا جتنی جلدی اخلاقی دباؤ کارگر ہوا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے بعض عذر شرعی ہونے پر روزہ نہ رکھنے کی سہولتیں دے رکھی ہیں کیونکہ اسلام کا نظام حیات عین فطرت انسانی کے مطابق ہے جس میں کوئی تنگی مجبوری یا جبر نہیں ہے مگر کسی نظام میں سہولت دینے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ سہولت پانے والا اس سہولت سے فائدہ اٹھا کر عام نظام یا اسکے ڈسپلن میں رخنہ اندازیاں یا انتشار پیدا کرتا پھرے اگر بعض مجبوریوں کی وجہ سے اس مبارک ماہ میں روزے نہ رکھنے کی اجازت ہے تو اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس رعایت سے فائدہ اٹھا کر آدمی سر بازار کھاتا پیتا پھرے اگر ایسا

مردہ احترام رمضان جس کے ہمارے فاضل معاصر بھی قائل ہیں کس چیز کا نام ہے؟ تیسری چیز جو ہماری سمجھ میں نہیں آئی وہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں جو بھی نرم یا سخت ہوا وہ پشاور یا راولپنڈی میں ہوا اور ان واقعات کے واجب یا غیر واجب ہونیکے متعلق بہتر طور پر سوچنے سمجھنے کے لئے اول تو ان شہروں کے حکام اعلیٰ کافی تھے جو موقع پر موجود تھے اگر کسی نے غیر قانونی اقدام کئے تھے تو وہ خود نبٹ سکتے تھے یا پھر وہاں کی صوبائی حکومت ان واقعات کے متعلق صحیح رائے قائم کر سکتی تھی یہ ہزار بارہ سو میل دور بیٹھے ہوئے ڈان کے فاضل مدیر کو وہاں روزہ نہ رکھنے والوں کی ہمدردی کا درد کیوں اٹھا، کہیں یہ چور کی ڈاڑھی میں تنکا والی بات تو نہیں کہ کہیں کوئی سر پھرا کراچی میں والے ان فاضل مدیر کو سر راہ سگار پیتے ہوئے نہ ٹوک دے کہ حضرت سب سے بڑی اسلامی سلطنت کے سب سے بڑے اسلامی اخبار کے ایڈیٹر ہو کر آپ سر محفل سگار پی رہے ہیں یا کسی کلب میں جام چڑھاتے وقت کوئی دیوانہ یہ نہ پکار اٹھے کہ حضرت یہ تو ماہ رمضان ہے اسکا تو کچھ احترام کریجئے اگر ایسا ہے تو معاصر عزیز کو مطمئن رہنا چاہیئے یہاں کراچی میں ایسے سر پھروں کا گزر نہیں ہے وہ سرحد کا علاقہ ہے جہاں اس قسم کے مذہبی جنون رکھنے والے سرحدی لوگ رہتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ پاکستان کی فوجی قوت بھی انہی مذہبی جنون رکھنے والے لوگوں کی مرہون منت ہے اور کراچی! یہ تو کاسموپولیٹن (Cosmopolitan) قسم کا شہر ہے۔ یہاں تو فاضل مدیر کی طرح کے عقل والے لوگ بستے ہیں جن کی عقلی تلواریں انکے قلم اور ڈھالیں ان کے اخبار کے کاغذ ہیں ان کاغذی لوگوں سے کیا ڈرنا!

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈان کے فاضل ایڈیٹر دراصل پشاور یا راولپنڈی کے رہنے والے چند روزہ خوروں کی حمایت نہیں کر رہے بلکہ اس نئی تحریک کے علمبردار گروہ کے افراد کی حمایت کر رہے ہیں جو نام کے مسلمان تو ضرور ہیں مگر اپنی عملی زندگی میں اسلام کے احکام کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے۔ اسلامی تعلیم و تربیت کے لحاظ سے نیم پختہ یا بالکل خام ہیں مگر ان کے خیالات پر مغربی تعلیم و تہذیب کا گہرا اثر ہے وہ نہیں چاہتے کہ اسلامی احکام کی پابندی کے رجحانات پاکستان کے مسلمانوں میں زور پکڑ جائیں تاکہ انکی اپنی زندگیاں ان مذہبی رجحانات کا ہدف بن جائیں یہی وجہ ہے جب کبھی بھی عوام اسلامی احکامات کے علانیہ خلاف ورزی پر احتجاج کرتے ہیں تو یہ لوگ چراغ پا ہو کر ملائیت کے طعنے دیتے ہیں اور علماء سے اسلام کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیتے ہیں۔

معاصر ڈان کے فاضل ایڈیٹر نے تو ایک دفعہ اپنا مافی الضمیر یہ کہہ کر ظاہر کر دیا تھا کہ انہیں اس اسلام کی ہرگز ضرورت نہیں جو ایک مسلمان کے غیر اسلامی افعال پر تنقید کی اجازت دیتا ہے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ گزشتہ سال جب ہفت روزہ "جہان نو" کراچی کو سیفٹی ایکٹ کے ذریعے چھ ماہ کے لئے بند کرنا مقصود تھا تو محترم اسعد گیلانی مدیر "جہانِ نو" کو ایک مشاورتی کمیٹی کے سامنے پیش ہونے کے لئے طلب کیا گیا تھا اس مشاورتی کمیٹی کے اراکین میں علاوہ سابق وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین اور ان کے سیکرٹری کے مقامی روزناموں کے تین ایڈیٹر بھی تھے جن میں ایک روزنامہ ڈان کے فاضل ایڈیٹر بھی تھے۔ زیر بحث "جہانِ نو" میں شائع شدہ ایک طنزیہ مضمون تھا جس میں ایک لیڈر کی غیر اسلامی زندگی پر طنزیہ لہجہ میں تنقید کی گئی تھی خواجہ صاحب مشاورتی کمیٹی کے صدر تھے انہوں نے مدیر "جہانِ نو" سے سوال کیا کہ "کیا اسلام اپنے اولی الامر کی پرائیویٹ زندگیوں پر تنقید کی اجازت دیتا ہے، کیا یہ اسلامی اخلاق کے منافی نہیں ہے؟" مدیر "جہانِ نو" نے جواب دیا کہ اول تو طنزیہ مضامین میں کسی خاص شخص کا نام نہیں ہوتا بلکہ محض ایک کیریکٹر پیش کر کے اس کے کردار پر تنقید ہوتی ہے اسے کسی خاص شخصیت پر چسپاں کر دینا صحافت اور ادب کے آداب کے منافی ہے دوسرے اسلام اپنے لیڈروں کے غیر اسلامی افعال و اعمال پر صرف طنزیہ تنقید ہی کی اجازت نہیں دیتا بلکہ کڑی سے کڑی نکتہ چینی کی بھی اجازت دیتا ہے اور اس سلسلے میں حضرت عمرؓ اور ان کے کرتہ والا واقعہ تو تاریخ اسلام میں بڑی اہمیت کیساتھ پیش کیا گیا ہے! اس پر خواجہ صاحب اور دوسرے دو ایڈیٹر صاحبان تو خاموش رہے مگر ڈان کے فاضل ایڈیٹر اپنی آرام کرسی سے بڑے طمطراق کیساتھ پھدک کر اٹھے اور بڑے جوش میں کہا کہ "ہمیں ایسے اسلام کی ضرورت نہیں ہے"

درحقیقت یہی ہے کہ ہمارے ان جیسے مغرب پرست مسلمانوں کو جن کی اپنی عملی زندگیاں اسلام سے قطعاً عاری ہیں۔ آج سے تیرہ سو برس پہلے
سلام کی ضرورت نہیں ہے جسکے افراد اسقدر بیباک اور نڈر ہوں کہ بھری محفل میں حاکم وقت تک کو اس کے غیر اسلامی افعال پر ٹوکنے کی جرأت
رکھتے ہوں یہی وجہ ہے کہ یہ گروہ نہیں چاہتا کہ پاکستان میں صحیح قسم کا قرآنی نظام قائم ہو تاکہ ان کی اپنی زندگیاں اور قیادتیں جو سراسر غیر قرآنی
ہیں مخدوش نہ ہو جائیں۔

بات دور چلی گئی ذکر احترام رمضان کا تھا۔ ہم مدیر ڈان سے جو ابھی ابھی ماسکو سے ہو کر آئے ہیں اور وہاں کے نظام زندگی کی
رطب اللسانی میں انہوں نے اپنے اخبار کے صفحات سیاہ کئے ہیں، ایک سوال کرتے ہیں کہ کیا انہوں نے ماسکو کے اشتراکی نظام
زندگی میں کوئی ایسا اشتراکی بھی دیکھا ہے جو کھلے بندوں اشتراکی اصولوں کی خلاف ورزی کرتا ہو اور پھر بھی وہاں کھلے بندوں چلتا پھرتا ہو؟ پھر
وہاں کے اخبار نویس اسکی حمایت میں مقالے پر مقالے سپرد قلم کرتے ہوں اور پھر وہ اخبار اور انکے ایڈیٹر زندہ چلتے پھرتے ہوں؟ اگر اشتراکی نظام
میں ایسا نہیں ہے اور یقیناً ایسا نہیں ہے تو پھر اسلامی نظام ہی ایک ایسا ہیٹا اور گھٹیا سا نظام ہے جسکے پیرو اس کے نظام میں اسکے اصول
کو علانیہ توڑتے پھریں اور انہیں کوئی پوچھنے والا نہ ہو بلکہ اُلٹا ان کی حمایت میں اس نظام کے علمبردار اخبار نویس مقالے پر مقالے لکھیں اور
انہیں کوئی تف تک کہنے والا نہ ہو! کیا پاکستان کی اسلامی حکومت کا فرض نہیں ہے کہ ایسے اخباروں کے پریسوں کو ضبط کرے اور ان کے
ایڈیٹروں کو اسلامی شعائر کی توہین اور توہین کرنیوالوں کی اعانت کے جرم میں قرار واقعی سزائیں دے؟ کیا اگر پاکستان کے عوام حکومت
پاکستان سے ایسا مطالبہ کریں تو وہ حق بجانب نہ ہونگے؟ اگر یہی کچھ اشتراکی نظام میں ہوتا تو اسکا کیا نتیجہ ہوتا؟ ہمیں امید ہے کہ ڈان
کے فاضل ایڈیٹر ان سوالات کے منطقی نتائج پر ضرور ٹھنڈے دل سے غور کرینگے۔

اسی مقالہ افتتاحیہ میں فاضل مدیر حکومت سے دریافت کرتے ہیں کہ ——

"زبردستی ماہ رمضان کا احترام کرلینے والے ان خود ساختہ مذہبی فوجداروں کے متعلق حکومت کا کیا رویہ ہے؟ حکومت
ان واقعات پر متذبذب کیوں ہے؟ کیا وہ مطمئن ہے اور اس معاملہ میں کوئی مداخلت نہ کریگی؟ کیا حکومت اس قسم کے
"مذہبی جنون" سے خائف ہے اور ماہ رمضان کا احترام نہ کرنے والے مسلمان شہریوں کی حفاظت نہیں کرسکتی اور انکو ناحق
تنگ کرنے والوں اور ستانے والوں کو سزائیں نہیں دے سکتی؟"

ہمارے خیال میں حکومت سے ایسے سوالات کرنا پاکستان کی اسلامی حکومت کے دارالسلطنت کے سب سے بڑے اسلامی اخبار کے
عالم اور فاضل ایڈیٹر کے شان شایاں نہ تھا۔ ان فاضل مدیر کو تو حکومت سے کچھ اس طرح پوچھنا تھا کہ ——— "حکومت پاکستان نے بھاولپور
ریاست کی حکومت کی طرح بر وقت ایسے قوانین کیوں نافذ نہ کئے جن کے ڈر سے کسی مسلمان کو ماہ رمضان کی بے حرمتی کی جرأت ہی
نہ ہوتی تاکہ اگر کوئی کسی شرعی عذر کی وجہ سے روزہ نہ بھی رکھ سکتا تو وہ احترام ماہ رمضان کو ملحوظ رکھکر گھر میں چھپکر کھا پی لیتا مگر سر بازار
مغرورانہ انداز میں ماہ رمضان کی بے حرمتی کرنے کی جرأت نہ کرسکتا تاکہ روزہ رکھنے والے مسلمانوں کو نہ اشتعال پیدا ہوتا اور نہ ایسے
جھگڑے اور فتنے کھڑے ہوتے ———" لیکن۔ بسا آرزو کہ خاک شدہ

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

جب کبھی اس ذہنیت کے لوگ اپنے ضمیر کے صریحاً خلاف محض اپنے علم کے زور پر اسلام کے خلاف قلم اٹھاتے ہیں تو ان کے دلائل
اسقدر بودے، سطحی اور مضحکہ خیز ہوتے ہیں کہ ایک معمولی سمجھ بوجھ کا پڑھا لکھا آدمی بھی ان کو پڑھ کر ہنس پڑتا ہے کہ آخر یہ اپنے سوا سب
دنیا کو کیوں بیوقوف سمجھتے ہیں آخر یہ عوام کو دھوکا دیتے ہیں یا اپنے آپ کو! اسی مقالہ میں آگے چل کر یہی فاضل مدیر رقمطراز ہیں کہ

"ہر کوئی جانتا ہے کہ یہاں کراچی میں بھی بہت سے مزدور اور پیشہ ور لوگ محض اس لئے کمزور ہو رہے ہیں کہ انہوں نے اس ڈر سے کہ کہیں انہیں ماہ رمضان کے احترام کے سلسلے میں شرمندہ نہ کیا جائے انہیں تنگ نہ کیا جائے اور انکی بے عزتی نہ کی جائے برملا کھانا پینا چھوڑ دیا ہے اور نرشمنٹ (nourishment) سے محروم ہو رہے ہیں۔ حالانکہ خدا نے انہیں روزے معاف کر رکھے ہیں!"

دیکھا آپنے طرز استدلال جھگڑا "احترام رمضان" کا ہے جسکا مطلب یہ ہے کہ سر بازار نہ کھایا پیا جائے اگر کوئی کسی شرعی عذر سے روزہ نہ سکے تو وہ گھر کے اندر بیٹھکر دو نہیں بلکہ تیس دفعہ بھی کھانا کھا کر تندرست و توانا ہو سکتا ہے اور نرشمنٹ حاصل کر سکتا ہے مگر فاضل مدیر کا فرمانا ہے ماہ رمضان میں جب تک کھلے بندوں نہ کھایا جائے، مزدور لوگ کمزور ہو جاتے ہیں۔ اور نرشمنٹ حاصل نہیں کر سکتے، کتنا زبردست قومی نقصان ہے یہ! دراصل آپ سمجھے نہیں، فاضل مدیر ابھی ابھی روس کا دورہ فرما کر تشریف لائے ہیں اور انہیں "مزدور دوستی" کا عارضہ وہیں سے لاحق ہوا ہے اب چاہیے ذکر احترام رمضان کا ہو مگر سیاسی مفاد کے پیش نظر "مزدور" سے ضرور ہمدردی کرنی چاہیئے اور دلیل ٹھونس دینی چاہیئے راس آئے یا نہ آئے! مزدور سے ہمدردی بڑی اچھی چیز ہے مگر سیاسی مقاصد حاصل کرنے کیلئے "مزدور دوستی" کا ڈھونگ رچانا اور مزدور کے جذبات سے ناجائز فائدہ اٹھانا بڑی گھناؤنی چیز ہے اور بڑی ہی اخلاقی گراوٹ ہے! یہ مزدوروں کے غم میں گھل گھل کر مرنے والے سیاستداں جب اپنے ہوادار بنگلوں اور کلبوں میں بیٹھکر دن میں چار چار دفعہ مرغن کھانے نوش فرماتے ہیں تو انہیں مزدوروں کے کمزور ہونے کا خیال تک نہیں آتا مگر جس وقت احترام رمضان کا ذکر آجائے تو انہیں "مزدور ہمدردی" کے دورے پڑنے لگ جاتے ہیں۔ حالانکہ احترام رمضان کا اس کے سوا اور کچھ مطلب نہیں کہ صرف اس ماہ میں سر بازار خورد و نوش سے پرہیز کیا جائے گھر میں بیٹھکر جس کا جی چاہے خواہ کتنی بار کھائے پیئے۔ دراصل معاصر عزیز کو نام نہاد "مزدور دوستی" سے کوئی سروکار نہیں مطلب صرف روزہ رکھنے والوں کو "ملا" اور احترام رمضان "مذہبی جنون" کہکر انکا تمسخر اڑانا ہے۔

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ اسلام کا نظام حیات چونکہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے اس میں بڑی فراخی اور رواداری ہے فراخدلی اور رواداری کی بڑی ہی غلط تشریح ہو گی اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ نظام اپنے پیروکاروں اور اسکے چلانے والوں کو کھلی چھٹی دیدیتا ہے وہ جس طرح بھی چاہیں خود ہی اس کے بنائے ہوئے اصولوں اور احکام کی خلاف ورزی کریں اور انہیں کوئی پوچھنے والا نہ ہو کہ ان کے منہ میں دانت ہیں دنیا کا کوئی گھٹیا سے گھٹیا نظام بھی یہ گوارا نہیں کر سکتا بلکہ وہ نظام، نظام ہی نہیں رہتا اگر اس کے علمبردار علانیہ اس کے اصول و احکام کی خلاف ورزی کرتے پھریں۔ بات یہ نہیں ہے کہ ہمارے یہ روشن خیال مغرب پرست دانا ان موٹی موٹی باتوں کو نہیں سمجھتے اصل بات یہ ہے کہ یہ حضرات اسلامی نظام کو بحیثیت نظام کے قبول کرنے کیلئے تیار ہی نہیں ہیں یہ تو ایسا نظام چاہتے ہیں جس میں شراب بھی حلال ہو، ریسوں میں جا کر علانیہ جوا کھیلنے کی بھی ممانعت نہ ہو، گیم آف اسکل کے نام سے نمائشوں میں جوئے کے اسٹال لگانے پر بھی اعتراض نہ ہو ناچ گھروں اور ڈانسوں پر بھی کوئی پابندی نہ ہو، عورتوں کو نچا کر آزادئ نسواں کے نعرے لگائیں تو کوئی انگلی اٹھانے والا نہ ہو گویا انہیں ان کی عیش پرستی کی کھلے بندوں اجازت ہو اور یہ سب کچھ اسلام کے نام پر کرتے رہیں اور کوئی ان پر نکتہ چینی نہ کرے۔

آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے:-

"ابھی چند روز کی بات ہے کہ کراچی کے ایک بس ڈرائیور نے عین دوپہر کے وقت کراچی اور ماری پور کے درمیان چار پانچ ٹرپ لگانے کے بعد بس کے سٹیرنگ وہیل پر ہی دم توڑ دیا۔ <u>البتہ وہ ماہ رمضان کا روزہ رکھے ہوئے تھا</u> —— <u>ایسے حادثات عام ہیں</u>۔ گو بعض صورتوں میں اموات واقع نہ ہوئی ہوں۔ مگر بیشمار واقعات تو ایسے ہیں کہ بیماری یا مجبوری کی وجہ

سے معذور ہوں اور خدا نے بھی انکی مجبوریوں کی وجہ سے انہیں روزے معاف کر رکھے ہوں مگر انسان انہیں خوف و دہشت میں مبتلا کئے ہوتے ہے !"

دیکھ لیجئے بحث صرف احترام رمضان کی ہے روزے رکھنے یا نہ رکھنے کی نہیں ہے متنازعہ فی صرف یہ امر ہے کہ اگر کوئی شخص ہی بیماری یا معذوری کی وجہ سے روزہ نہ بھی رکھ سکے مگر احترام رمضان کے لئے سر بازار نہ کھائے پیئے، گھر میں بیٹھکر جو چاہے کھائے، ملے بندوں کھانے پینے پر ضد نہ کرے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی شخص واقعی کسی بیماری کی وجہ سے معذور ہو یا کوئی اور مجبوری ہو تو لوگوں نے زبردستی اس سے روزہ رکھوایا ہو یا انہیں مجبور کیا ہو کہ وہ گھر میں بیٹھکر بھی نہ کھائیں۔ ایسی ایک مثال بھی ہمارے یہ معاصر پیش نہیں کر سکتے عاصر عزیز کا فرمانا یہ ہے کہ لوگوں کو سر بازار کھانے پینے سے نہ روکنا چاہیئے۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ ملّا ہے اور علماء کا ایجنٹ ہے اس لئے قابل گردن زدنی ہے اور ایسا کرنا قانون کو ہاتھ میں لینا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک سرے سے ایسا کوئی قانون ہے ہی نہیں! اگر کوئی شخص روزہ رکھے ہوئے سخت کام کی زیادتی کی وجہ سے شہید ہو گیا تو اس میں بھی معاصر عزیز کو ماہ رمضان کے احترام کرنے والوں کا قصور نظر آرہا ہے حالانکہ قصوروار اس سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھنے والے مالک کا ہے جس نے اپنے روزہ دار ملازم کو وہ سہولتیں مہیا نہیں کیں جو ہر مالک کو اپنے روزہ دار ملازمین کے لئے اس ماہ میں مہیا کرنی چاہئیں۔ مثال کے طور پر سخت کام کرنیوالے ملازمین کے اوقات کار میں کمی کردینی چاہیئے بجائے ۸ گھنٹہ کے چار چار گھنٹے کی دو شفٹوں (اے ٹو شفٹس) میں کام تقسیم کردینا چاہیئے اگر ایک ماہ منافع میں کچھ فیصدی کمی ہو جائے تو سرمایہ دار غریب نہیں بن جاتا مگر ہمارے معاصر سرمایہ دار کی مذمت کرنے کی بجائے احترام رمضان ہی کی مذمت کر رہے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ اگر اسلام کے احکام کی بجا آوری سچے دل سے مقصود ہو تو ہزاروں رستے نکل سکتے ہیں مگر یہاں تو سرے سے اسلامی احکام کو بدنام کرنا مقصود ہے کہ وہ اتنے سخت ہیں کہ انکی بجا آوری میں انسان ہلاک ہو جاتے ہیں اس لئے ان کی بجا آوری کے لئے زیادہ زور نہیں دینا چاہیئے۔

آگے چل کر معاصر عزیز اپنے مافی الضمیر کو پوری طرح آشکار کرتے ہیں لکھتے ہیں:-

" اللہ اور رسولؐ کے احکام کی اطاعت ایک مسلمان کے لئے مقدم ہے اور یہ احکام کافی ہیں مگر اسلام کے خود ساختہ متولّی یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے آمرانہ احکام اور فرمان اللہ اور رسول کے احکام سے بھی زیادہ قوی ہیں قطع نظر اس کے کہ یہ لوگ اپنی نجی زندگیوں میں اسلامی احکام کی بجا آوری میں کہاں تک صحیح طور پر پورے اترتے ہیں۔ اسلامی نعرہ بازی کے پردے میں لوگوں کی آمرانہ جتھا بندی قابل مذمت ہے اگر یہ روش جاری رہی اور بلند جاری تب تو اسکی سختی سے مخالفت کرنی ہوگی۔ اگر قرار داد مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کیلئے اس کے ان خود ساختہ ترجمانوں کا یہی رویہ رہا تو ہمیں ڈر ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب ملک کے سنجیدہ طبقہ کی نظروں میں قرار داد مقاصد کی افادیت ہی مشتبہ ہو جائیگی۔ اور ہو سکتا ہے کہ قرار داد مقاصد کی مخالفت میں ایک تحریک اٹھ کھڑی ہو اور فروغ پا جائے !"

دیکھا آپنے کس طرح احترام رمضان کو آڑ بنا کر قرار داد مقاصد ہی کی مخالفت میں تحریک شروع کردینے کی دھمکی دی جا رہی ہے حالانکہ یہ تحریک شروع کردی گئی ہے جس کے علمبردار اسی قسم کے لوگ ہیں ایسے مضامین گزشتہ تین چار ماہ سے اس تحریک کے مقدمات کے طور پر شائع کئے جا رہے ہیں ــــ معاصر عزیز کو معلوم ہے کہ "قرار داد مقاصد" کے منظور کرانے میں ان کے ہم خیال گروہ کا کوئی حصہ نہیں بلکہ یہی لوگ ہیں جنہوں نے اس تاریخی "قرار داد مقاصد" کی سخت ترین مخالفت کی تھی اگر وہ منظور ہوئی تو وہ رائے عامہ کے دباؤ کی وجہ سے۔ ان لوگوں کا عوام پر کونسا احسان ہے یہ لوگ پہلے بھی مخالف تھے اور اب جبکہ دستور کی تیاری پر زور دیا جا رہا ہے تو یہ لوگ کھل کر اور منظم ہو کر سامنے آگئے

ہیں۔ زبان سے تو اسلام اسلام پکارتے ہیں مگر دل منافق ہیں۔

ان سے جائز طور پر پوچھا جاسکتا ہے کہ گزشتہ پانچ سال میں انہوں نے اسلام کیلئے کیا کیا ہے؟ کیونکہ یہی لوگ ہیں جو ابھی تک حکومت پر، سیاست پر، تجارت پر اور صحافت پر چھائے ہوئے ہیں۔ ملک کے تمام وسائل، دماغ، دولت، حکومت، پریس، سٹیج سبھی کچھ انکے ہاتھوں میں ہے انہوں نے اسلامی طرز زندگی کا کونسا نیا عملی نمونہ عوام کے سامنے پیش کیا ہے؟ ان پانچ سالوں میں انہوں نے کونسا اسلامی نظام تعلیم ملک میں رائج کیا ہے؟ اپنی روشن دماغی سے کونسا اسلامی دستور تیار کرکے ملک کے سامنے پیش کیا ہے؟ انہوں نے کونسے اسلامی افکار و خیال لوگوں کے سامنے پیش کئے ہیں؟ اسلام کی کوئی ٹھوس خدمت کرنے اور مسلمانوں کی تعمیر کرنے میں کس چیز نے ان کو روکا ہے اگر یہ چاہتے تو اپنی عقل و دانش اور ان وسائل سے جو ان کو حاصل ہیں اسلام اور مسلمانوں کے لئے بہت کچھ کرسکتے تھے مگر انہوں نے تو اپنے سیاسی اور مادی مفاد حاصل کرنے کیلئے صرف اسلام کے نام کو استعمال کیا ہے اور اب جب وہ یہ سب کچھ حاصل کرچکے ہیں تو وہ اپنا سارا زور، ملّا، ملائیت اور مذہبی جنون کو بدنام کرنے کیلئے لگا رہے ہیں حالانکہ دیکھا جائے تو غریب ملّا کے ہاتھ میں کیا ہے!

پہلے تو یہ لوگ اسلام اسلام پکارتے رہے۔ "پاکستان کیا ہے لا الہ الا اللہ" "پاکستان میں اسلامی نظام قائم ہوگا" کے نعرے لگاتے رہے اور اب جبکہ پاکستان قائم ہوگیا ہے تو مغربی افکار پر یہاں مغربی تہذیب و تمدن قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ مغرب پرست ذرا بھی دیانتدار ہوتے اور شروع ہی سے لوگوں سے کہہ دیتے کہ ہم یہاں مغربی تہذیب و تمدن کی بنیادوں پر سیکولر نظام زندگی قائم کرینگے اور پھر ایسا کرنے کی اخلاقی جرأت اور ہمت بھی رکھتے تو کوئی گلہ نہ تھا مگر مشکل یہ ہے کہ نہ تو یہ لوگ چاہتے ہیں کہ یہاں اسلامی نظام زندگی قائم ہو اور نہ ہی عوام کو صاف صاف الفاظ میں یہ کہنے کی اخلاقی جرأت رکھتے ہیں کہ ہم ایسا کرنا نہیں چاہتے۔ اس نوجوان روشن خیال مغرب پرست طبقہ کی یہی ریاکاری ہے جس کی وجہ سے آج سارے ملک میں ایک ذہنی انتشار، بے اعتمادی اور بے نظمی سی پھیلی ہوئی ہے۔

اندریں حالات محض "ملّا" اور "ملائیت" کو مطعون کرتے رہنا عقلمندی اور معقولیت کا ثبوت نہیں ہے۔ "ملّا" نے اگر اور کچھ بھی نہ کیا ہو تو کم از کم یہ تو ضرور کیا اسلام کے متعلق مسلمانوں میں ایک خوش اعتقادی کو قائم رکھا اور انہیں نام کا مسلمان تو رہنے دیا۔ ورنہ شاید وہ یا تو عیسائی ہوگئے ہوتے یا ہندو! اور آج یہ اسی خوش اعتقادی کا نتیجہ ہے کہ باوجود عوام کے اعمال کچھ بھی ہوں انہیں اسلام سے ایک شعوری محبت تو ہے اور یہ اسی خوش اعتقادی کا نتیجہ ہی تو تھا کہ ان لوگوں نے اسلام کا نعرہ بلند کرکے عامۃ المسلمین کو پاکستان بنانے کے لئے اکٹھا کرلیا۔

جدید اسلام کے ان نئے مفتیوں سے ہم مؤدبانہ گزارش کرینگے کہ اسلام کے متعلق وہ اپنے اس شرانگیز اور عیارانہ پروپیگنڈے سے باز آئیں ــــ اب عوام کافی بیدار ہوچکے ہیں۔ گزشتہ پانچ سالہ تجربہ آپ کو کافی ننگا کرچکا ہے، پاکستان میں کسی غیر اسلامی نظام زندگی قائم کرنے کی ناپاک کوشش کبھی بھی کامیاب نہیں ہوسکتی اسلامی نظام پاکستان کے لئے مقدر ہوچکا ہے وہ انشاء اللہ تعالیٰ قائم ہوکر رہے گا!

ع :- پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا!　　پاکستان زندہ باد

عبدالغفور بیگ

۱۵ر جون، ۱۹۵۲ء

حمیداللہ صدیقی

اُردو ادب میں اسلامی رجحانات (اسلامی ادب)

۲

اس نئے ادب کے بعد اب یہ دیکھنا ہے کہ اسلام پسند ادب لامی ادب کیا چیز ہے۔ اردو ادب میں یہ ایک بالکل نیا نام ہے اور اس للاق ان مفکرین اور ادیبوں پر ہوتا ہے جنھوں نے اسلام کے پیش کردہ یمات پر اپنے موضوع کی بنا رکھی ہے۔ یوں تو اردو ادب میں اسلامی انات ابتدا ہی سے پائے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ بہر حال اس زبان دب اپنانے والے عام طور سے مسلمان ہی تھے جن میں اسلامی عقائد بُرے بھلے کسی شکل میں ضرور رہے۔ یہی وجہ ہے کہ امیر خسرو، ولی دکنی اور خواجہ ردرد جیسے قدیم شعرا میں بھی تصوف کا خاصہ رنگ جھلکتا ہے اور یہ تصوف بر حال اسلام ہی سے متعلق تھا قطع نظر اس کی شکل و صورت مسخ ہو چکی یا صحیح معنوں میں موجود تھی۔ یہ اور بات ہے کہ یہ رجحانات ہمیشہ نفرادی شکل میں ظاہر ہوتے رہے کیونکہ اسلام اس وقت بحیثیت ایک ریک کے موجود نہ تھا اور نتیجۃً ادب بھی کسی تحریک کی زبان نہ بن سکا یہی وجہ ہے کہ یہ میلانات کبھی تصوف کے رنگ میں ظاہر ہوئے کبھی حالی کی مسدس شبلی کی سوانح، اکبر کی تنقیدوں، نذیر احمد اور شرر کے ناولوں کے ذریعہ منظر عام پر آئے۔ اس کے علاوہ کسی نے خدا کی حمد کے نغمے گائے کسی نے نعت رسول کو تسکین قلب کا سامان بنایا اور کوئی کربلا کے دردناک واقعات پر اشکباری کرتا رہا اور چونکہ یہ تمام تر سرمایہ مختلف زبانوں میں مختلف شعرا اور مصنفین کے درمیان منتشر تھا اور ان سب کے پاس بحیثیت کل کوئی واحد مقصد نہ تھا اسلئے اس کا کوئی گہرا اثر مرتب نہ ہو سکا اسکی بڑی وجہ یہ بھی کہ رجحانات بذات خود اتنے قوی نہ تھے کہ ایک ہی شاعر یا ادیب کے دوسرے مختلف رجحانات پر قابو حاصل کر لیتے اور چھا جاتے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سب آپس میں اس طرح گڈمڈ ہو گئے کہ بادی النظر میں ان کی تعریف مشکل ہو گئی دوسرا بڑا سبب یہ تھا کہ یہ میلانات خاص طور پر اسلام کی بگڑتی ہوئی حالت اور انحطاط کا ردعمل نہ تھے بلکہ قومی مصائب کا نتیجہ تھے۔ لازمی طور پر ان کے دلوں کا درد صرف اسلام کا درد نہ تھا بلکہ اپنے ہم وطنوں کا درد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غدر کے بعد جب کہ زبان و ادب کو متعین مقصد کیلئے استعمال کیا جانے لگا تو صرف ایک مقصد یعنی مسلمانوں کو پستی سے نکال کر ہمسایہ قوم کے برابر کرنے اور نئی حکومت کی نظر میں اس کا وقار قائم کرنے کی یگانگت نظر آتی ہے ایسی صورت میں اسلامی میلانات کا قوم پر کیا اثر ممکن تھا۔

حالی نے مسدس میں اسلام کی گزشتہ عظمت اور مسلمانوں کی ابتر حالت کا نقشہ خوب کھینچا ہے مگر وہ یہ نہ بتا سکے کہ اس عظمت کو پھر زندہ کرنے کے لئے صحیح پروگرام کیا ہونا چاہیے اور غالباً اس کا کوئی واضح خاکہ خود ان کے ذہن میں نہ تھا۔ سر سید کی تحریک سامنے تھی۔ انھوں نے بھی اسی کو مقصد بنایا اور اس میں شبہ نہیں کہ اس کے حاصل کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہے اکبر کی بے لاگ تنقیدوں سے یہ رنگ صاف جھلکتا ہے لیکن وہ مغربی تہذیب و معاشرت کے بڑھتے ہوئے اثر سے زیادہ متوحش ہیں اور اسے قوم کے لئے مضر سمجھتے ہیں۔ مگر ان کا تاثر طنز و ظرافت کے رنگ میں رنگا ہوا گریہ بنکر رہ گیا۔ شبلی کی سوانح کی افادیت بحیثیت سوانح کے ضرور ہے اور اس فن میں ان کا ایک ممتاز مقام رہے گا لیکن سوانح بہر حال سوانح ہیں اور یہ ہنگامی حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ نذیر احمد کے اخلاقی ناول اور عبدالحلیم شرر کے ہلال و صلیب کے معرکوں کی داستان بھی اسی اصلاحی پروگرام کی مختلف کڑیاں تھیں جس کی بنا سر سید نے رکھی تھی۔ اسی وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس دور کے تقریباً جملہ مصنفین کے سامنے اسلام کا کوئی جامع تصور نہ تھا اور اگر تھا تو انھوں نے اسے قوم کے سامنے بحیثیت ایک حل کے پیش کرنے کے قابل نہ سمجھا۔ اس کے کیا مصالح تھے یہ وہی لوگ بہتر سمجھتے رہے ہونگے۔ اور پھر ان کا پیغام کوئی فکری پیغام نہ تھا جو ماحول

پر چھا جاتا۔ اسلام پسندی کا سب سے گہرا رنگ جوہر میں ملتا ہے جو میدان ادب سے زیادہ میدان سیاست وعمل کا سرگرم سپاہی ہے۔ لیکن اس کی طبیعت بس فطرتاً توازن کی بڑی کمی تھی۔ وہی عدم توازن جوان کی سیاست میں ہے انکے ادب میں بھی ہے۔

اقبال کی اردو ادب میں وہ پہلی شخصیت ہے جس نے گوناگوں رجحانات اور اسلامی رجحانات۔ مسلم قوم پرستانہ شاعری اور اسلامی شاعری میں ایک ایسا خط امتیاز کھینچا کہ ہر دور کی تفریق میں کوئی دقت نہیں رہ جاتی ہے۔ یہ وہ پہلی آواز تھی جس نے بانگ درا کا کام کیا اور شاعری کو اسلامی افکار و تخیلات کا مرکز بنایا۔ اب جو کاروان ادب اسلامی تخیلات و افکار کو لے کر بڑھ رہا ہے وہ بہت بڑی حد تک اسی چراغ راہ سے روشنی حاصل کر رہا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اقبال نے کسی محفل میں قرآن کو حضرت امام حسینؑ کے بعد سب سے زیادہ مظلوم گردانا تھا۔ اگر آج اقبال ہوتے تو انھیں اندازہ ہوتا کہ اسکے بعد خود ان کا کلام کس حد تک مظلوم بن چکا ہے! اقبال کو دیکھ کر قوم پرست کا یہ دعویٰ ہے کہ اقبال اسکا ہے۔ کمیونسٹ کہتا ہے اقبال ہمارا ہے اور حد یہ ہے کہ فاشسٹ بھی کہتا ہے کہ اقبال ہمارا ہے لیکن درحقیقت یہ تمام دعوے یا تو کوتاہ نظری پر مبنی ہیں یا ناواقفیت پر۔ اور اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ بعض اوقات اقبال کے اندر بھی نظریات و میلانات کی کش مکش بیک وقت نظر آتی ہے لیکن کسی بھی شاعر کے کلام کے چند اشعار چھانٹ کر یہ تصور کر لینا کہ وہی اس کی جملہ شاعری کا لب لباب ہے درحقیقت ایک صریح زیادتی ہوگی۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس کے پیغام کی روح رواں کیا ہے اور وہ کون سی بنیاد یا اصول ہے جس پر اس نے ساری عمارت کھڑی کی ہے اس کی خودی، کا راز کیا ہے؟ زندگی کی حقیقت کو اس نے کس انداز پر سمجھا ہے؟ دنیا اس کی نگاہ میں کیا حیثیت رکھتی ہے؟ اس کا انسان مطلوب کن اوصاف اور خصائص کا حامل ہے؟ اور اس کے لئے دین و مذہب کیا اہمیت رکھتے ہیں؟

اس خیال کے ماتحت اگر اقبال کی ورق گردانی کی جائے تو یہ بات واضح طور پر کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اس کا حاصل کلام تقریباً وہی تعلیمات ہیں جن کی صدا آج سے چودہ سو سال قبل عرب کے ریگستانوں میں گونجی تھی۔ وہ بار بار اسی دریا میں شناوری کی ضرورت محسوس کرتا ہے جس نے کبھی ایک عالم کو سیراب کیا تھا۔ وہ اپنے پیغام کی بنیاد خودی پر رکھتا ہے لیکن اس کا سر نہاں 'لاالہ الا اللہ' ہی میں پاتا ہے۔ اور جماعت کی آستینوں میں بت دیکھ کر اسی 'اذان' کی ضرورت محسوس کرتا ہے وہ مغربی فلسفہ سے متاثر ضرور ہے مگر اس کے دل میں مجذوب فرنگی کو مقام کبریائی سمجھانے کی حسرت پیدا ہوتی ہے۔

وہ زندگی کو اگر جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں سمجھتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اسے 'برتر از سود و زیاں' قرار دیتا ہے تو اس کا ایک واضح مقصد بھی متعین کرتا ہے۔ اس مقصد کے تعین میں وہ مغرب کے تمام مروجہ فلسفوں کو ٹھکرا دیتا ہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی یہ ماننے کے لئے .... تیار نہیں ہوتا کہ یہ دنیا کوئی رزمگاہ ہے۔ جہاں مسرتوں کا صرف وہی مستحق ہے جس کی لاٹھی زبردست ہو یا پھر یہ کوئی بزمگاہ ہے جہاں کھاؤ، کھیلو اور خوش رہو، ہی زندگی کا بہتر مقصد ہو سکتا ہے یا یہ کوئی چراگاہ ہے جہاں دو وقت کی روٹی حاصل کر لینا ہی معراج کمال ہے ان تمام نظریات کے بالکل برعکس وہ اس دنیا کو ایک امتحان گاہ قرار دیتا ہے۔ اس کو 'متاع الغرور' اور 'لہو و لعب' کے الہامی ارشادات کی روشنی میں 'زیاں خانہ' کا نام دیتا ہے اور انسان کی زندگی کو ایک امتحان سمجھتا ہے اور ظاہر ہے کہ امتحان کے بعد نتائج کا منطبق ہونا لازمی ہے۔

دنیا اور اس کی زندگی کو اس انداز میں پیش کرنے کے بعد یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ اس میں وہ کس قسم کا انسان چاہتا ہے یہ انسان نطشے کا فوق البشر نہیں ہے بلکہ یہ خیر البشر ہے۔ اس کا نام مومن ہے۔ اس مرد تعارف اقبال کن الفاظ میں کرتا ہے۔ یہ خود اسی کی زبان سے سنیئے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

ت کا سرودِ ازلی اس کے شب و روز
ک میں یکتا صفت سورۂ رحمٰن

یہ مردِ مومن خدائے لم یزل کا دستِ قدرت اور زبانِ ہر
ں کا آخری پیغام ہے، اس کی نسبت براہیمی ہے۔ "ممکنات
کانی میں، اس کی فطرت امین ہے اور یہ وہ ارمغان ہے جس کو
ت جہانِ آب و گل سے عالمِ جاوید کی خاطر لے گئی تھی، اس کی منزل
خ نیلی فام سے پرے ہے اور ستارے اسکی گردِ راہ ہیں۔

اب وہ انسان جس کے اجزائے ترکیبی یہ ہوں اور جسکی حقیقت
ہو اگر کسی معاشرے میں موزوں ہو سکتا ہے تو وہ یقیناً اسلامی معاشرہ
ں ہو سکتا ہے اور ظاہر کہ اقبال اپنے انسان مطلوب، کو کسی غلط معاشرے
ں موزوں کرنے کے خواہاں نہیں ہو سکتے۔ یہ اور مشکل ہے کہ یہ انسان
طلوب غلط معاشرے میں پڑ کر اس کو صحیح بنانے کا عزم کرکے اور جدو
ہد کرتا رہے

اس مردِ مومن کا وطن جغرافیائی حدود کا پابند نہیں ہو سکتا
ں کا سرِ داماں گردِ وطن سے پاک ہے اور یہ وہ یوسف ہے جس کا
نعان ہر مصر ہے۔

ان تمام نظریات کے پیشِ نظر اس بات کا واضح طور پر اندازہ
ہو جاتا ہے کہ اقبال درحقیقت کیا تھے۔ البتہ اگر یہی نظریہ حیات
یک کمیونسٹ۔ فاشسٹ یا قوم پرست میں سے کسی کا بھی ہو سکتا
ذ یہ بات تسلیم کی جا سکتی ہے کہ اقبال بھی ان ہی میں سے ہیں لیکن ایسی
صورت میں ظاہر ہے کہ وہ اسی مسلکِ زندگی کو بھی قبول کرلیگا جو اس
ردِ مومن کے لئے لازم ہے یعنی وہ

دیں مسلکِ زندگی کی تقویم
دیں سِرِّ محمدؐ و براہیمؑ

یوں تو دنیا میں اکثریت انھیں لوگوں کی ہوتی ہے جو اپنے
زمانے کے میلانات کے تابع ہوتے ہیں۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی پیدا
ہو جاتے ہیں جو ان میلانات کی اتباع کے بجائے ان پر قابو حاصل
کر لینے اور ان کا رُخ موڑ دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اقبال کا شمار بھی
انھیں نادرالوجود انسانوں میں ہے جنھوں نے تنِ تنہا اپنے زمانے کے
تمام غلط اور مضر میلانات سے جنگ کی اور ان کی آواز پر اپنی آواز
کو بھاری بنایا۔ یہ کام کسی منظم جماعت کے لئے تو ایسا مشکل نہیں ہوتا
لیکن ایک فرد کے لئے جس کی متاعِ حیات اشعار کی چند کتابیں
ہوں ذرا مشکل ہوتا ہے۔ اردو شعر و ادب کے اندر شعوری اور ارادی
طور پر اسلام کے پیش کردہ اصول و ضوابط پہلی مرتبہ پیش ہوئے۔ یہ پہلی
کوشش اگر ایک طرف لوگوں کو بھولے ہوئے اسلام کی یاد دہانی میں
کامیاب ہوئی تو دوسری طرف اس نے شعر و شاعری میں ایک نئے
دور کا آغاز کیا۔ ایک نئی فصل کے بیج ڈالے۔ ایک نیا کاروانِ حیات
تیار کیا۔ یہ بانگِ درا، ضربِ کلیم اور بالِ جبریل آخرش رنگ لا کر رہی
اور اسلامی شعور نے ایک مرتبہ پھر جھرجھری لی۔

یہ زمانہ سیاسی لحاظ سے انتہائی انتشار و کش مکش کا زمانہ تھا
ملک میں ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک آزادی کی موج لہریں مار رہی
تھی۔ سامراج دم توڑ رہا تھا۔ ایک ہولناک جنگ کی کامرانیوں کے باوجود
تشنگی غبار چھا گیا تھا۔ مدتوں کا فرسودہ متحدہ قومیت کا نظریہ مٹ
چکا تھا۔ ہندوستان نمایاں طور پر دو قوموں اور دو نظریات پر منقسم ہو چکا
تھا۔ ملک کی دو بڑی سیاسی جماعتیں دو اقوام کے نمائندوں کی حیثیت سے
ایکدوسرے سے نبرد آزما تھیں اور فریقین میں دن بدن قومیت کا جذبہ
شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ ایسے حالات میں خوش قسمتی سے ایک ایسی
تحریک وجود میں آچکی تھی جس کا واحد مقصد مسلمانوں میں اسلام کا صحیح تصور
پیدا کرنا اور انھیں اسلام کو برپا کرنے کی جد و جہد پر آمادہ کرنا تھا۔ یہ افقِ ہند
پر ایک نئے سورج کا طلوع تھا جس کے طفیل میں ایک نئی جماعت ایک
نئی تحریک ایک نیا فکر اور ایک نئے ادب نے جنم لیا۔ اسی نئے ادب کو "اسلامی
ادب" بھی کہتے ہیں۔

اسلام کو برپا کرنے کی یہ تحریک اولاً ایک فکری تحریک تھی جس کا پہلا
اور بنیادی کام اسلام پسند عناصر کو چھانٹ کر ایک رشتہ میں منسلک کرنا
تھا اور ساتھ ہی ساتھ انکے دل و دماغ کو ایک ایسی فکری غذا بہم پہنچانی
تھی جو ان کی نشو و نما اس انداز پر کر سکے کہ اسلام کا عروج ہی ان کا مقصد

زندگی بن جائے تبلیغی قسم کے رسائل تو بہتیرے نکالے گئے اور اس انداز کی کتابوں کا بھی خاصہ ذخیرہ موجود تھا لیکن تجربے نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ سائنس و فلسفہ کی ہمہ روز ترقی کے ساتھ انسانی عقل و فکر بھی اس قدر ترقی یافتہ ہو گیا تھا کہ صوفیا کے محیر العقول واقعات و کرامات قصوں اور کہانیوں کے انداز میں یا پھر سیدھا سادھا ٹھوس اور ٹھس تبلیغی انداز موجودہ تعلیم یافتہ اذہان کو مطمئن کرنے کے لئے بالکل ناکافی ہے۔ اس کے برعکس ادب کی زبان میں کہی چیز دلائل کے ساتھ دل و دماغ کو فوراً متاثر کر دیتی ہے۔ اس لئے ارادی و غیر شعوری طور پر اس تحریک نے بھی اردو ادب کو اپنی زبان بنایا یہی وجہ ہے کہ اسلامی رجحانات کا اگرچہ اردو ادب میں ایک صدی سے مظاہرہ ہوتا رہا تھا لیکن ادب کے اس حصہ کو کوئی نیا نام دینے کی کبھی ضرورت نہ پیش آئی تھی لیکن اب چونکہ یہ ایک منظم تحریک کے ماتحت آگیا۔ اس لئے اس کو ادب کے مختلف اقسام سے میز کرنا ضروری تھا

اب یہ سوال سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے کہ اسلامی ادب ہے کیا؟ اس کا مرکزی تصور کیا ہے؟ اس سلسلہ میں پہلے اسلامی ادب کے ایک علمبردار[1] کی زبان سے سنیے۔

"اسلامی شعر و ادب وہ ہے جس میں زندگی کے وہ اصول سموئے گئے ہوں جن کو اسلام نے انسانیت کے لئے موجب فلاح گردانا ہے اور جس میں ان تمام نظریات کی تردید کی گئی ہو جن کو اسلام نے انسانیت کے لئے موجب خسران شمار کیا ہو اسلامی شعر و ادب وہ ہے جس میں انسانی سیرت و کردار کے ان نمونوں کو ابھارا گیا ہو جن کو قرآن نے "انسان مطلوب" کا نقشہ کھینچتے ہوئے واضح کیا ہے اور ان نمونوں کو پستی میں گرایا گیا ہو جن کو قرآن نے "انسان نا مطلوب" کا نقشہ کھینچتے ہوئے واضح کیا ہے۔ اسلامی شعر و ادب وہ ہے جو اخلاق کی غیر اسلامی قدروں سے ہٹا کر انسانیت کو اسلامی قدروں کی طرف دعوت دے۔ پھر اسلامی شعر و ادب وہ ہے جس کے پیچھے کام کرنے والی فکر نے ان حدود فکر کو قبول کیا ہو جن کو اسلام نے عائد کیا ہے اور اسالیب کلام کو ان اخلاقی ضابطوں کا پابند بنا لیا ہو جن کو اسلام نے واجب ٹھہرایا ہے۔ اور ہاں پھر اسلامی شعر و ادب وہ ہے جو عام انسانی جذبات و حسیات کو اصل فطری رنگ میں اس انداز سے سامنے لائے کہ وہ ایک صالح زندگی کی تعمیر میں مدد دینے والے ہوں مزید یہ کہ اسلامی شعر و ادب وہ ہے جو انسانی زندگی کے داخلی و خارجی مظاہر کو قرآن کے معیار پر پرکھ کر دیکھے اور ان میں معروف و منکر کی چھانٹ کرے اور جس کے خلق کرنے والے اپنے ذہنوں کے دیدبان بن کر یہ محاسبہ کرتے ہیں کہ جو الہام ان پر اس بن کر برستا ہے اس میں سے کیا بارگاہ حق سے آرہا ہے اور کیا کچھ شیطان کا نازل کردہ ہے! ہم نے اسلامی شعر و ادب کا جو اساسی کلمہ (Slogan) مرتب کیا ہے وہ یہ ہے

"ایک خدا ——— ایک انسان ——— ایک نظام"

اس کلمہ کی مزید توضیح میں نعیم صدیقی یہ کہتے ہیں:—

"ایک خدا کہنے سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہم زندگی کے تمام مسائل پر اس شعور کے ساتھ نگاہ ڈالتے ہیں کہ اس کائنات کا اور خود انسانی زندگی کا ایک خدا ہے اور وہ ایک ہے۔ ایک خدا اس معنٰی میں کہ وہ خالق و مالک ہی نہیں بلکہ حاکم و قانون ساز بھی ہے وہ مسجد ہی کا خدا نہیں ہے بلکہ کھیت، کارخانے، منڈی اور ایوان حکومت کا بھی خدا ہے اور اس کے ضابطے جیسے نماز روزے کے لئے ہیں ویسے ہی سیاست و معیشت کے لئے بھی ہیں! پھر وہ کسی ایک زمانے ایک ملک یا ایک قوم کا خدا نہیں ہے بلکہ سارے زمانوں، سارے ملک اور ساری قوموں کا تنہا وہی ایک خدا ہے اور اس کی خدائی اور حاکمیت اور قانون سازی سب کے لئے ایک جیسی ہے۔

---

[1] نعیم صدیقی

ایک انسان کہنے سے ہمارا یہ مطلب ہو کہ ہم زندگی کے تمام مسائل اس حقیقت کو مان کر اپنے سامنے رکھتے ہیں کہ انسانیت ایک خانوادہ ہے اور جغرافی اور نسلی تقسیمیں ان اصولوں کو تقسیم نہیں کر سکتیں جن سے انسانیت کی فلاح اور انسانیت کا بگاڑ وابستہ ہے ایک انسان اس معنٰی میں کہ ہر دور ہر ملک میں انسان کی اخلاقی اور تمدنی زندگی کے زوال و ارتقا کے بنیادی اصول ایک ہیں۔ وسائل بدلتے ہیں۔ مسائل نہیں بدلتے مسائل کا قالب نہیں بدل سکتا ہے ان کی حقیقت نہیں بدل سکتی۔ ایک انسان اس معنٰی میں کہ انسان کی زندگی کے لئے ہر زمانے اور ہر ملک میں فطرت کے قوانین اور تمدن کے اچھے اور برے اصولوں کے نتائج ایک ہی ہیں ایک انسان اس معنٰی میں کہ تمام ادوار و اقوام کے لئے خدا کی طرف سے اخلاق کی جو بنیادی قدریں مقرر کی گئی ہیں وہ لازماً ایک ہی ہیں۔

"ایک نظام سے کہنے سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ ہم اپنے فکر و کلام کا آغاز اس سچائی کے ادراک سے کرتے ہیں کہ بنا نوع انسان کی ساری پیچیدگیوں کی مرکزی گرہ گونا گوں من گھڑت نظاموں کا اختیار کرنا ہے جو بہر حال محدود فکر و نظر کے ساتھ ایسے لوگوں کے بنائے ہوئے ہوتے ہیں جو انھیں اپنے مفاد کے سانچے میں ڈھلنے بغیر کچھ اور کر ہی نہیں سکتے۔ لہٰذا انسانی فلاح کا دارومدار خدا کے اس واحد ضابطہ و نظام کی اطاعت پر ہے جسے انبیائے پیش کیا۔ یہ نظام اپنے اصولوں کے لحاظ سے ہر دور اور ہر قوم کے لئے ہر قسم کے حالات میں بہترین ذریعہ فلاح و ارتقا ہے۔ ایک نظام اس معنٰی میں کہ اسلامی نظام کے سوا اور کوئی ایسا نظام نہیں ہے جس پر تمام اقوام کے جمع ہونے کا بعید سے بعید عقلی امکان بھی موجود ہو کیونکہ ہر نظام کسی قوم کسی طبقے اور کسی ملک کے مخصوص مفاد کے سانچے میں ڈھلتا ہے۔"

• یہ تصور ادب کے لئے نیا ہو تو ہو۔ مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ انسانیت کے لئے نیا نہیں ہے۔ ہاں یہ ایک دوسری شکل ہے کہ انسانیت نے اسے بھلا دیا ہو ورنہ ایک زمانے نے اس کو عملی جامے میں بھی دیکھا اور اسی کی بدولت تاریخ نے اس زمانہ کو روشن ترین زمانہ قرار دیا اگر روشن ترین زمانہ اس لحاظ سے نہیں کہ اس وقت علم اور سائنس و حکمت زیادہ ترقی یافتہ تھے بلکہ اس لحاظ سے اس زمانہ میں باوجود اپنی تاریکیوں اور جہالت کے انسان میں انسانیت کے وہ اعلیٰ ترین کردار و اوصاف پیدا ہو گئے تھے جن کی نظیر پیش کرنے سے ہمارا اپنا دور بھی شرمندہ ہے اب جہاں تک مجرد تصور کا تعلق ہے اس کی جامعیت سے شاید ہی کسی کو انکار ہو سکے اور جب انسانیت کے لئے ایک تصور کو جامع مانا جا سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ادب کے لئے بھی اس کو جامع نہ مانا جا سکے کیونکہ ادب کا بہر حال زندگی سے بڑا ہی گہرا ربط ہوتا ہے اور یہ بات محض تخیل کی بنا پر نہیں بلکہ مشاہدے اور تجربے کی بنا پر کہی جا سکتی ہے جو ادب محض تفنن طبع کے طور پر پیش کیا گیا ہو اس سے وقتی طور پر تفریح تو حاصل کی جا سکتی ہے۔ مگر زندگی کے مسائل نہیں حل کئے جا سکتے

اب اس تصور کے ایک ایک جزو کو لیجئے۔ پہلا اور بنیادی تصور ایک خدا کا تصور ہے۔ یہ تصور انسان کی ابتدا سے لیکر آج تک اسی طرح قائم ہے اور وہ لوگ جنھوں نے اس تصور سے انکار کیا ہے انھوں نے ہر زمانے میں ایک کے بجائے بے شمار خدا تراش لئے جو مختلف اشکال میں ان کی زندگی کے ہر گوشہ پر محیط ہو کر رہ گئے۔ صرف اشکال کا فرق ہے ظاہری ہیئت میں تبدیلی ہو گئی ہے۔ بنیادی حقیقت اسی طرح قائم ہے۔ پرانے لوگ جاہل اور کم فہم تھے۔ انھوں نے مٹی کے بت بنائے موجودات و محسوسات کی ہر قوی چیز کے متعلق یہی گمان قائم کیا کہ آج کا انسان روشن خیال اور متمدن ہے۔ اس نے بتوں کے آگے سر تسلیم خم نہ کیا۔ مگر خود اپنے خواہشات، جذبات، ضروریات و مسائل غرضکہ نہ جانے کتنی چیزوں کے سامنے جھک پڑا۔ بات وہیں کی وہیں رہی اب یہ ایک خدا کا تصور اس قدر قدیم ہونے کے باوجود پھر بالکل نیا بن گیا ہے اس لئے کہ یہ خدا کل کی کل زندگی پر نہ محیط ہو سکا بلکہ اس کے

بند ایک گوشے میں محدود ہو کر رہ گیا لیکن محض مسجد و کلیسا میں رہتا ہے
ر کبھی اس کی ضرورت محض نیاز و برکت میں محسوس ہوتی ہے ۔اسلامی ادب
سور کی اسی مہمل شکل کو مٹانا چاہتا ہے اور اس کی جگہ ایک نیا اور وسیع
صور پیش کرتا ہے جو کہ انسانی زندگی کے ان تمام خانوں کو توڑ کر ایک
ڈالے اور اس کے ہر ہر گوشے اور ہر ہر پہلو پر اس کو مسلط کر دے ۔اس کی
بادت ہو یا ریاضت، تجارت ہو یا صنعت، معیشت ہو یا معاشرت
رض یہ کہ زندگی کا کوئی پہلو بھی اس کے وجود اور محض وجود ہی نہیں ۔بلکہ اس
ں قدرت اور حاکمیت کے اعتراف سے خالی نہ رہے ۔کم از کم ایسا انسان
دکو ان لوگوں سے جو زندگی میں ادنیٰ سے ادنیٰ اقتدار کو تسلیم کر لیتے ہیں زیادہ
بلند و باوقار محسوس کرے گا ۔

دوسرا تصور ایک انسان کا ہے یہ وہی تصور ہے جس کے فقدان
نے انسان کو انسان کا سب سے بدترین اور ہولناک دشمن بنا دیا ہے ۔امن
سکون کی موت اور خوفناک جنگوں کی تجدید کی اصل وجہ یہی ہے کہ انسان
بحیثیت ایک انسان کے نہیں سوچتا وہ بحیثیت ایک روسی ۔ایک
مریکن ، ایک انگریز ایک چینی ، ایک ہندوستانی اور ایک پاکستانی کے
سوچتا ہے اور اپنے ہی مفاد کے تحفظ اور توسیع کو پیش نظر رکھتا ہے ۔یہی
وجہ ہے کہ جب بحیثیت ایک امریکن کے دنیا کے بعید ترین گوشہ میں بھی
س کا مفاد ذرا متزلزل ہوتا ہے تو وہ توپوں کے دہانے کھول دیتا ہے
ورہموں کی بارش سے زمین کو کرۂ نار بنا دیتا ہے ۔اور پھر مفاد ہی نہیں
بلکہ اس نے اپنی اپنی پسند کے مطابق مختلف اصول بنا رکھے ہیں اور جب
ان اصولوں پر کہیں سے بھی ضرب پڑتی ہے یا کسی بھی پہلو سے ماند پڑتے
ور ٹوٹتے نظر آتے ہیں تو ان کو مضبوط بنانے کے لئے وہ ان میں اصلاحیں
م کرتا ہے اور قوت کا سہارا زیادہ لیتا ہے ۔اور یہی قوت آخر کسی قوت
سے ٹکرا جاتی ہے ۔اور پھر یہ وہی تصور ہے جس نے لفظوں سے اوجھل
ہو کر سفید و سیاہ و زرد کی تفریق پیدا کر دی ہے اور انسان کو نسل و ذات
کی گھناؤنی بندشوں میں جکڑ دیا ہے جس سے سماج اور معاشرہ ایک متعفن
ناسور بن کر رہ گیا ۔انسان کبھی خالص آریائی خون پر غرایا کبھی سورج کی اولاد
ہونے پر ناچا اور کبھی برہما کے سر سے پیدا ہونے پر اکڑا اور اس اکڑ اور غراہٹ
کا ماحصل کیا ہوا ۔انسانیت سسکنے اور دم توڑنے لگی ۔یہ تصور اگرچہ
آج کا نیا تصور نہیں ہے لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ انسان
اس سے ہمیشہ آنکھیں چراتا رہا اور آج تہذیب و تمدن کے سنہرے دور
میں بھی یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا ۔اسلامی ادب انسانیت کو جھنجھوڑ کر
ایک مرتبہ پھر بیدار کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ اس بھولے ہوئے سبق کو تازہ کر سکے
در اصل ابتدا سے لیکر آج تک انسان کے بنیادی مسائل تقریباً یکساں رہے
ہیں ۔اس کی احتیاج و ضروریات وہی ہیں ۔ان کی تسکین کا انداز ضرور
بدل چکا ہے ۔ان کی تکمیل کے وسائل میں بے شک بے پناہ تغیر ہو چکا ہے
لیکن ابن آدم کی بھوک اب بھی وہی ہے اور تن ڈھانکنے کا مسئلہ اسی طرح
ہے ۔کل اس کے لئے درخت کے پتے ۔جانوروں کی کھالیں اور موٹے
جھوٹے کپڑے کافی تھے ۔آج اسکو دیبا و حریر کی ضرورت ہے اور اطلس
و کمخواب کی تمنا ہے ۔یہ تمنا اور یہ ضرورت اپنی جگہ پر درست ہے ۔لیکن
اسلامی ادب یہ بتلاتا ہے کہ یہی تمنا اور یہی ضرورت اگر دوسروں کی تمناؤں
کا خون کر کے پوری کی جائے تو یہ انسان کی انسانیت نہیں ہے بہیمیت
اور بربریت ہے اور اگر انسان واقعتاً اس دنیا کے اندر امن و سکون کا متلاشی
ہے تو اسے اپنی ضروریات کی تکمیل کے ساتھ دوسروں کے حقوق کو پیش نظر
رکھنا پڑے گا ورنہ ایک کا کھانا ہمیشہ دوسرے کیلئے زہر ہوگا ۔ایک
کی مسرت دوسرے کیلئے غم کا سبب بنے گی ایک کا سکون دوسرے
کا انتشار ہوگا اور پھر نتیجتاً ایک کا خون دوسرے کی پیاس اور ایک کی
زندگی دوسرے کی موت ہوگی ۔

ایک نظام کا تصور درحقیقت ایک جز ہے اس وسیع تصور کا جس
میں ایک خدا اور ایک انسان کا اعتراف لازم ہے بلکہ یہ ایک خدا اور ایک
انسان کے تصور کا لازمی نتیجہ ہے ۔اس جز کو ایک کل کی حیثیت نہیں دی جا سکتی
اس لئے کہ یہ جز کچھ اس طرح اپنے کل کے ساتھ منسلک ہے کہ اس کا منقطع
کرنا اس کا گلا گھونٹنے کے مترادف ہوگا ۔تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ
جب بھی انسان اس جزئی تصور کو لے کر آگے بڑھا پہلے ہی قدم سے
ٹھوکریں کھانے لگا اور منزل تک پہنچنے کے پہلے ہی جان دے بیٹھا ۔
جمعیت اقوام League of Nations اور اقوام
متحدہ — United Nations کی مثالیں سامنے
ہیں ۔دنیا کے بہترین دماغ باہم مل کر امن و آشتی کے لئے سرگرداں ہیں

لیکن انکے پاس ان اجزا کا جو اس جزسے مل کر کل کی شکل اختیار کرتے ہیں کوئی تصور بھی نہیں ہے۔ نتیجتہ ان نت نئے تجربات کے باوجود مسائل و مصائب کی گتھی حل ہونے کے بجائے اور زیادہ الجھتی چلی جارہی ہے انسانیت کے مسائل سیاست کی بازیگری سے حل نہیں کئے جاسکتے دلوں میں جنگ کے نقشے بنا کر زبان سے صلح و آشتی کا دعویٰ تو کیا جا جاسکتا ہے۔ لیکن ان کا نفاذ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مفادات آپس میں متصادم ہیں۔ کیونکہ ہر ملک و ہر قوم کا نظام اسی ملک اور قوم کے مفاد کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے اور بسا اوقات تو اس ملک اور قوم کے ایک مخصوص طبقے کے مفاد کو مد نظر رکھ کر مرتب کیا جاتا ہے، پھر وہ عالمگیر ضرریات کو کس طرح پورا کرسکتا ہے۔ اسلامی ادب یہ بتاتا ہے کہ درحقیقت انسانی سوسائٹی میں ایسا توازن کس طرح برقرار رکھا جاسکتا ہے کہ کبھی آپس میں ٹکراؤ کی نوبت ہی نہ آئے اور اس کے لئے وہ لازم قرار دیتا ہے کہ خدا کی مکمل حاکمیت کا اعتراف ہی انسان کو ایک مرکز پر جمع کرسکتا ہے اور اس کے شارح کا بتایا ہوا نظام ہی ایک ایسا نظام ہے جس پر تمام اقوام یکساں طور پر جمع ہوسکتی ہیں۔ ایسی صورت اس طرح پیدا ہوگی کہ ایک طرف انکے دلوں میں خوف ہوگا تو دوسرے انسانیت کی محبت و وقعت ہوگی۔ جغرافیائی حدود اور رنگ و نسل کی تفریق انھیں متعصب نہ بنائے گی۔ انکے مفاد کی تکمیل ہمیشہ دوسروں کے حقوق کے ساتھ لازم و ملزوم ہوگی۔ اور اس طرح انسانیت زیادہ سکون اور اطمینان کا سانس لے سکے گی۔

(باقی)

مفرّح فولادی

نیا اور تازہ سرخ خون پیدا کرتا ہے، وزن بڑھاتا اور ہڈیوں کو مضبوط کرتا ہے۔ قوت و طاقت بخشتا ہے۔ کھانا ہضم کرکے بھوک بڑھاتا ہے

خوراک :- کھانے کا ایک چمچہ روزانہ تین چار مرتبہ کھانے کے بعد استعمال کریں۔ بچوں کیلئے نصف خوراک

قیمت فی شیشی دو روپے آٹھ آنے

برنین ــــــ دماغی

- دماغ کو روشن اور شگفتہ کرتی ہے
- قوت حافظہ کو تقویت پہنچاتی ہے
- مفرح اور مقوی قلب ہے
- بڑھاپے میں صحت کا سہارا ہے

قیمت :- بیس یوم کے لئے چار اونس دوا، چار روپے

تیار کردہ :- حاذق دواخانہ بندر روڈ، کراچی نمبر ۱

ہم صدیقی •

محض تفنّن

پنچ بنائے پاکستان!

اسلام کی بنائیں پانچ ہیں اور یہ پورا نظام انہی پانچ ارکان پر
ا ہوتا ہے۔ اسلام ہی پر منحصر نہیں، ہر مذہب کا حال یہی ہے،
لاً سکھ دھرم بھی پانچ ککوں کے بل پر کھڑا ہوتا ہے۔ پانچ ککوں
ے مراد ہوتے ہیں پانچ "ک" یعنی ایک کاٹ کیس کا، دوسرا
ن کرپان کا، چوتھا کاٹ کاچھے کا، پانچواں کاٹ کنگھے کا۔ عیسائیو
نخواہ مخواہ تحریف کرکے پانچ کو تین کر دیا ورنہ اس تین پانچ کرنے
ے اگر وہ باز آجاتیں تو ارکان وہاں بھی پانچ ہیں۔ خدا، روح القدس
سیٰ، صلیب اور پادری۔ ٹھیک اسی اصول پر شیعہ اصحاب نے
ل پنج تن پاک کی محبت کو سامانِ نجات قرار دیا اور کسی طرح
چار یاروں کا احترام کرنے پر تیار نہیں ہیں، کیونکہ 'چار' کا عدد
ن کام کا نہیں۔ مذہب تو مذہب انسان کے حسی علم کے دروازے
ی پانچ ہیں۔ ہمارے اوقات نماز بھی پانچ ہیں اور پھر دیکھئے کہ
یکا یہ محاورہ اسی کا ثبوت دیتا ہے کہ بس "پانچ منٹ" میں یہ
تا ہوں اور پانچ منٹ میں آتا ہوں یعنی ہر کام کے ارکان بھی
سی طرح سے پانچ ہوتے ہیں اسی لئے تو ماہرین نے گھڑی کے
ل پر پانچ منٹ کے ٹکڑے بنائے ہیں۔

یہی اصول تھا جس کی وجہ سے بالکل فطری طاقتوں کے
ر تر پاکستان پانچ صوبوں سے بنا اور اسے کشمیر سے بھی اسی کی
ہ سے محروم ہونا پڑا کہ کہیں وہ چھ صوبوں کا ملک نہ بن جائے
یہاں ہم جغرافیہ نہیں بیان کر رہے ہیں۔ یہاں ہم بڑے اہم
دلوں پر بحث کر رہے ہیں۔ پاکستان کا وجود اصولاً جن ارکان
قائم ہے اور جن کے ذریعے مضبوط ہو سکتا ہے وہ بھی پانچ
یں ——!

فلسفیانہ پن کی ثقالت سے بچنے کے لئے ہم ان پانچ ارکان
کو پانچ کرداروں میں ڈھال دیتے ہیں اور ان کرداروں کے فرضی
نام بھی رکھ لیتے ہیں یعنی گاما، مہاجا، ساجا، چھیدا اور تاجا۔

نوٹ :- یہ لاہوری نام اس لئے انتخاب کئے گئے ہیں
کہ پنجاب پاکستان کا سینہ اور لاہور اسکا دھڑکتا ہوا دل ہے اس
لئے لاہور کے لوگ ہی پورے پاکستان کی نمائندگی کے لئے موزوں
ہو سکتے ہیں۔

گاما اس روز سے جس روز سے پاکستان کی تقسیم ہوئی
ہے برابر اس بات کے لئے بے چین ہے کہ پاکستان کے اپنے فلم اسٹوڈیو
اور آرٹ کے مراکز زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہونے چاہئیں۔
اس ترقی پسند جوان کے خیال میں پاکستان کو مسجدوں کی اتنی
ضرورت نہیں ہے جتنی ناچ گھروں اور گانوں کے مدرسوں اور
آرٹ سوسائٹیوں کی ہے —— کیونکہ مسجدوں میں سوائے
اس کے اور ہوتا کیا ہے کہ کوئی ملا پانچوں وقت محلے کے بوڑھوں
ان پڑھوں اور بیکاروں کو اٹھک بیٹھک کرادے اور ہفتے میں
ایک دن منبر پر کچھ کرتب دکھا دے اور اس کے عوض میں
ہر گھر سے ایک روٹی، مہینے کا وظیفہ اور جنازے کی جنس وصول
کرلے، پس گاما کہتا ہے کہ جس روز ہماری اپنی فلمیں بننے لگیں
گی، ہمارے ہاں گانے، بجانے اور ناچنے کا شور ہوگا اسی روز
اصلی پاکستان بنے گا۔

مہاجا پاکستان بننے کے بعد سے دن رات اس مقصد کے
پیچھے پڑا ہوا ہے کہ کسی طرح عورتوں کا پردہ اتروا دیا جائے۔ وہ
سڑکوں پر پھریں، پارکوں میں ٹہلیں، کلبوں میں ناچیں، دعوتوں میں

سکرائیں جلسوں میں ابھریں، وزیروں کو سلامیاں دیں، ریڈیو
پر گائیں، سیرگاہوں میں کبڈی کھیلیں، دفتروں میں نوکری کریں،
آزادی کی تقریب منائی جائے تو وہ بھنگڑا دکھائیں، کوئی غیر ملکی
آئے تو اس کے استقبال کے لئے پریڈیں کریں۔ اعلیٰ مقاصد
کے لئے چندہ کرنے کو مینا بازار لگائیں اور ڈرامے کھیلیں ——
زندگی میں ایک گرما گرمی پیدا کردیں۔ ملت مضبوط ہوسکتی ہے
توصرف اس طریق سے ہوسکتی ہے اور قوم قوم بن سکتی ہے تو اسکا
راستہ یہی ہے۔

ساجا کچھ اور ہی سوچتا ہے۔ وہ پاکستان کے بقاء استحکام
اور اسکی ترقی کی تیز رفتاری اور امن وامان کا بنیادی تقاضا
یہ مانتا ہے کہ وزیروں کے خلاف کوئی آواز بلند نہ ہو۔ حقوق
تربیت ختم کردیئے جائیں، کوئی اخبار نہ نکلے، کوئی جلسہ اور
تقریر نہ ہو۔ کسی ادیب کو لکھنے کا حق نہ دیا جائے اور کوئی
لکھے بغیر نہ رہے تو اس کے ہاتھ قلم کردیئے جائیں۔ ایک قانون
بنا کر یا سیفٹی آرڈی ننسوں اور سیفٹی ایکٹوں میں ایک ہی دفعہ کا
اضافہ کرکے ساری اپوزیشن پارٹیوں کو خلاف قانون قرار دیدیا
جائے —— تاکہ صرف "واحد نمائندہ" جماعت باقی رہ جائے
انتخابات قطعی طور پر بند کردیئے جائیں۔ اگر جمہوریت کی شرط ہی
پوری کرنی ہو تو پانچ سال بعد شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ انتخاب
کا ایک فلم دکھادیا جائے۔ اس کام کے لئے حکومت کے محکمہ
تعلقات عامہ کے تحت چند ٹورنگ سینما قائم کردینے کافی ہونگے
اسی طرح اسمبلیوں —— پارلیمنٹ اور دستوریہ میں تجاویز اور
بلوں پر بحث کرنے کو ازروئے قواعد ناجائز ٹھیرا دیا جائے
تجویز محض قرأت ہی سے پاس ہوجائے۔

اس طرح کوئی گڑبڑ نہ رہے گی، کوئی ہنگامہ اختلاف
نہ ہوگا، پبلک کے سامنے کوئی کائیں کائیں نہ کریگا۔ اخبار
پڑھنے پر لوگوں کا وقت ضائع نہیں ہوگا۔ جلسوں کے ذریعہ
کسی طرح کا ذہنی انتشار برپا نہیں ہوگا، لوگ آرام سے اپنا اپنا
کام کرینگے اور رموز مملکت کو خسرواں خود سمجھتا رہے گا،
باتونی پن کے بجائے عمل بڑھ جائیگا۔ اختلاف ختم ہوکر وحدت
بپا ہوجائیگی سست رفتاری تیز رفتاری میں بدل جائیگی اور
پاکستان بہت جلد مضبوط ہوگا۔

چھیدے کے سامنے ایک اور ہی مسئلہ ہے وہ یہ کہتا ہے
کہ پاکستان کو امریکہ سے زیادہ سے زیادہ مالی امداد حاصل کرنی چاہئے
مالی امداد ہی نہیں، وہاں سے ماہرین بھی لینے چاہئیں اور مشینیں
اور دوسری ضروریات بھی حاصل کرنی چاہئیں۔ ڈالر کا خوان یغما
لٹ رہا ہے اور اس کو لٹتے دیکھکر خاموش بیٹھے رہنا بے وقوفی
ہے۔ ہمارے امریکی سفیروں اور وزارت خارجہ کو چاہیئے کہ وہ
اچھے سے اچھے لفظوں میں بڑوں کی خوشامد کرے، آخر مطلب
کے لئے آدمی گدھے کو باپ کہدیتا ہے، خوشامد ہی نہ کریں بلکہ
امریکی بلاک میں شامل ہوجائیں۔ اور پاکستان میں جنگ کے لئے
اڈے بنانے کا معاہدہ بھی کرڈالیں محض "آزادی" کے لفظ کو
لیکر چاٹتے رہنے سے تو ترقی نہیں ہوتی۔ اڑوس پڑوس کے ممالک
اس معاملے میں بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ حالانکہ آزادی ان کو
بھی عزیز ہے۔ چھیدے کی خواہش اب کچھ پوری کی جانے لگی ہے
اور اب وہ خوش ہے کہ آخر کار مملکت کو وہی کرنا پڑا۔ جو
اس نے سوچا تھا۔ وہ اب اپنے آپ کو بڑا سیاست داں سمجھتا ہے
مگر ابھی وہ پوری طرح مطمئن نہیں ہوا کیونکہ دل کھول کر بھیک
نہیں مانگی گئی اور امن اچھی طرح نہیں پھیلایا گیا۔

ناجا سب سے الگ سوچتا ہے۔ اسکی خواہش یہ ہے کہ
اس سرزمین میں سرخ جھنڈا لہرانا چاہیئے۔ پھر یہاں ایک خونی
ہنگامہ ہونا چاہیئے، لوگ اچانک ایک صبح کو گھروں سے
کھڑے ہوں، کدالیں اور برچھیاں اور درانتیاں اور ہتھوڑے
اور ہل ان کے ہاتھوں میں ہوں اور وہ پاگل ہوجائیں۔ جو
ان کے سامنے آئے وہ اس پر حملہ آور ہوجائیں، عمارتوں کو
لگادیں، باغوں کو اجاڑ دیں، دکانوں اور بنکوں اور گھروں
کو لوٹ لیں، خون کی ندیاں بہیں —— اور اتنے میں
درۂ خیبر سے اور کشمیر کے راستے تبت کی سرحد سے امن کے

کا لشکر داخل ہو اور وہ اپنی تلواروں سے یہاں کی دنیا بدل ڈالے مزدور کارخانوں کے اور کسان زمینوں کے اور کلرک دفتروں کے اور چپراسی بنکوں کے اور کلینیز آراکشوں اور کاروں کے اور تنظیم، کاروبار دوں کے مالک بن جائیں ۔ یہ واقعہ جسے تاج کی نگاہ میں کسی نہ کسی دن ہوکے رہنا ہے اگر بروقت نہ ہوا تو پاکستان کیا ہو جائیگا اس کے بغیر پاکستان پاکستان ہی نہیں !

پاکستان کے یہ "پانچ ارکان" کوئی معمولی لوگ نہیں یہ پروفیسر بھی ہیں ٹھیکیدار بھی ہیں، وکیل بھی ہیں، ڈاکٹر بھی ہیں مولوی بھی، ادیب اور شاعر بھی ہیں، سیاسی، لیڈر اور کارکن بھی ہیں اور پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے ان کے دم قدم سے ہے۔ یہ آپس میں حد درجہ کا اختلاف بھی رکھتے ہیں اور پھر ان میں حد درجہ کا اتحاد بھی ہے ۔ ان کے کردار اپنی مستقل نوعیتیں رکھتے ہیں لیکن ان کے پیکر ہزار در ہزار ہیں اور یہ ہر صوبے، شہر، گاؤں اور گلی کوچے میں، گاڑی کے ہر ڈبے میں اور بسوں اور تانگوں میں، ہوٹلوں اور قہوہ خانوں اور کافی ہاؤسوں میں دکھائی دیتے ہیں پاکستان انہی کے بل پہ قائم ہے بلکہ پاکستان انہی کا نام ہے !
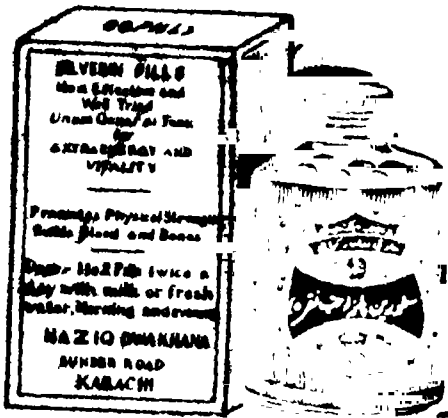
کچھ بے وقوف لوگ ایسے بھی ہیں جو ان کے منہ آتے ہیں اور انکا زور توڑنے کے لئے خواہ مخواہ ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، یہ اپنی قدامت پرستی اور رجعت پسندی کی وجہ سے یوں سوچتے ہیں۔ پاکستان سے رشوت اور خیانت دور ہو جائے، غریبوں کے حقوق ادا ہونے لگیں تعلیم اور صحت کے انتظامات ہمہ گیر ہو جائیں انصاف کی ترازو ٹھیک ٹھیک ہو اور انصاف مفت ملنے لگے، غیر ملکی اثرات کا خاتمہ ہو جائے - آزادی ہو تو بیرونی زنجیروں سے اس کے ہاتھ پاؤں جکڑے نہ رہیں، نمائشی مظاہرات کے بجائے تعمیر اخلاق پر توجہ دی جائے، مغرب کی گندگیوں سے پرہیز کیا جائے، عورت کو عائشہ اور فاطمہ کے نمونے پر اٹھایا جائے ——— اور ہر طرف اسلامی نظام زندگی لہریں لینے لگے !

لیکن ان کی کون سنتا ہے، پاکستان کو پانچ ارکان چاہئیں اس چھٹے رکن کی کوئی گنجائش ہی نہیں اس لئے گاما، ماجا، ساجا چھیدا اور تاجا سبھی ان کی طفلانہ تجویزوں اور حرکتوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور وہ خوب سمجھتے ہیں کہ یہ خود ختم ہو جائیں گے ۔

(چراغ راہ)

سلورین پلز ——— مقویات کا سرتاج

۴۰ گولی ——— چار روپے بارہ آنے

۸۰ گولی ——— نو روپے

تیار کردہ : حاذق دواخانہ ، بندر روڈ، کراچی

اعظم ادیب •

تعارف

میرے اس روپ کو تُو دیدۂ حیرت سے نہ دیکھ
مَیں کسی اجنبی دنیا سے نہیں آیا ہوں

تیرے اس شہر اسی دیس کا باشندہ ہوں میں		فاش ہے مجھ پہ تری بزم کا ہر رازِ درون
اسی تہذیب نے پروان چڑھایا مجھ کو		شعلہ زن تیرے خیالات میں ہے جسکا فسوں
وہی کالج تھا مری فکر و نظر کی دلہن !		جسکے جلووں سے ہے روشن تری چشمِ مےگوں
لذتِ کام و دہن ، لذتِ تزئینِ لباس		میرے کردار کا حاصل تھی، مرے دل کا سکوں

میری دنیا تھی فقط لہو و لعب کی دنیا
زندگی میری تگاپوئے مقاماتِ جنوں

یک بیک پردے اٹھے جھک گئیں میری آنکھیں		آہ وہ میرے مقاصد، وہ مقاماتِ ذلیل

اُڑ گیا پاس سے گاتا ہوا اک مرغِ اسیر
نفع حاضر کی تگ و تاز ہلاکت کی دلیل

ہوسِ خام سے ہجرت نہیں دنیا سے گریز		روغنِ زرد بر آئینۂ شفاف مریز!

ہندر ناتھ ●

یہاں سے وہاں تک

فاروقی کی عمر ہو گئی تیس برس کے قریب پہلے میں اس کے ضمنی ،متعلق عرض کر دوں ، پھر حال کا تذکرہ کرونگا ۔ یوں دیکھنے میں لفظ بصورتی اس پر چسپاں کرنا پڑے گا ۔ درمیانہ قد ، گندمی رنگ جسم گٹھا ا ، فراخ ماتھا ، ذہین آنکھیں —— اس نے بچپن ایسے ماحول ں گزارا جہاں باپ ہی گھر کا واحد مالک ہوتا ہے ۔ اس کا باپ پاکباز م کا انسان ، نماز روزے کا پابند ، سخت پرہیزگار اور گھر میں ڈکٹیٹرانہ ز عمل کا عادی تھا ۔ گو گھر میں سب کچھ تھا ، یعنی ماں ، بہن ، بھائی اور ، وقت کا کھانا ، لیکن باپ کی حکومت اور اس کی سخت گیر پالیسی کا ثر تھا کہ ہر شخص کچھ بجھا بجھا سا رہتا ۔ باپ کے آنے پر ہر فرد خاموش سا ہو جاتا پ کے حکم کے زیر اثر گھر کا ہر فرد دس بجے سے پہلے بستر میں دبک کر لیٹ جاتا ، نیند نہ آنے پر بھی سونے کی کوشش کرتا ، رات کو گھر میں ایسا سناٹا ا جاتا تھا جیسے یہ گھر نہیں کوئی قبرستان ہے جہاں ہر شخص زندہ ہوتے وئے بھی مردوں کی طرح زندگی بسر کر رہا تھا ، گھر میں شامت اعمال ے اگر کوئی جوان لڑکی وارد ہو جائے تو ہر لڑکے کو یہ حکم تھا کہ وہ آنکھیں ی کر کے چلے ، لڑکیوں کو یہ حکم تھا کہ اونچی آواز میں بات نہ کریں اور کھلکھلا کر نسیں کوئی قہقہہ بلند نہ کریں ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھر کا ہر شخص آہنی ادی زندگی بسر کر رہا تھا سوائے اس کے باپ کے ۔

یہ عجیب سی بات تھی کہ فاروقی کو نہ باپ سے محبت تھی نہ ماں سے ، رحالیکہ اسے دونوں سے محبت ہونا چاہیئے ، وہ شروع میں اس بات کا ؤزیہ نہ کر سکا کہ اسے اپنے والدین سے کیوں محبت نہ تھی اگر وہ اپنی ماں سے بت نہ کرتا تھا تو کم از کم ماں کو اپنے بیٹے سے محبت ہونا چاہیئے ۔ لیکن ں بھی فاروقی سے کچھ کھنچی کھنچی سی رہتی اور وہ محبت ، پیار ، شفقت ، بچے کو اپنی ماں سے ورثے میں ملتی ہے ، فاروقی اس سے محروم ہا اور باپ سے تو اسے آہستہ آہستہ نفرت سی ہوتی گئی ۔ نفرت کی وجہ کوئی فطرتاً عمل نہ تھا ، بلکہ باپ کے طرز عمل کا نتیجہ تھا ، فاروقی کا باپ مذہبی رسومات کا سختی سے پابند تھا وہ سمجھتا تھا کہ نجات اسی میں ہے کہ ہر مسلمان مذہب کے بتائے ہوئے راستے پر ایمانداری سے عمل کرے ، اور وہ چاہتا تھا کہ گھر کا ہر فرد اسکی تقلید کرے ۔

اس لئے فاروقی کے ذہن میں اسلام کے لئے ایک نامعلوم سی محبت ہو گئی ، بغیر سوچے سمجھے ، لیکن مذہب سے محبت کرتے ہوئے وہ اپنے باپ سے محبت نہ کر سکا اور اسکی خاص وجہ یہ تھی کہ اس کے باپ کا سلوک اسکی ماں سے اچھا نہ تھا ۔ یوں تو وہ ہر مہینے عین وقت پر اسکی ماں کو تنخواہ دیدیتا تھا ، اسے واقعی اپنی بیوی سمجھتا ، پردے میں رہنے کی تلقین کرتا کسی غیر مرد سے بات کرنے کی اجازت نہ دیتا ، دو وقت کھانا گھر کھاتا ، کسی بڑے تہوار پر بیوی کو نئے کپڑے لا کر دیتا اور بیوی سے مکمل طور پر کام لیتا ، شاید محبت یوں نہیں ہوتی ، خارجی طور پر شاید اس کی ماں خوش رہتی ، لیکن داخلی طور پر اس نے کبھی اپنی ماں کے چہرے پر خوشی اور انبساط کے جذبات کو نہ دیکھا شاید یہی وجہ تھی کہ ماں کھل کر اپنے بچوں سے پیار نہ کر سکی اور وہ گھر کے کام کاج میں اتنی مشغول رہتی کہ اسے بچوں کا دھیان ہی نہ رہتا ۔

بچپن کی باتیں فاروقی کے ذہن میں یوں نقش ہو گئی تھیں جیسے دیوار میں میخ گاڑ دی جاتی ہے ۔ اسے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دن اس کی ماں نے اس کے باپ کو کھانا دیا ، اس دن ترکاری میں کچھ نمک زیادہ نکلا ۔ اس کے باپ کو اتنا غصہ آیا کہ اس نے رکابی اٹھا کر اسکی ماں کے سر پر کھینچ ماری ۔ بچاری کے سر پر رکابی اتنے زور سے لگی ، کہ ماتھے سے خون بہنے لگا ۔ لیکن باپ یہ زخم دیکھکر موم نہ ہوا ۔ وہ غصہ میں چلاتا ہوا دوسرے کمرے میں نکل گیا اور ماں باورچی خانے میں روتی رہی چلاتی رہی اور سسکیاں لیتی رہی ، فاروقی ماں کی سسکیاں

سن رہا تھا۔ اسکا جی چاہتا تھا کہ وہ اپنی ماں کی گود میں جاکر اپنا سر رکھدے اور اسے کہے "ماں رو مت، واقعی ہمارا باپ وحشی ہے" لیکن فاروقی نہ باپ سے کہہ سکا نہ ماں سے۔ بلکہ اس کے ذہن میں باپ کے خلاف نفرت کا لاوا جمع ہونے لگا اور اسی ماحول میں اس نے دسویں پاس کی۔ اب اس کی عمر سترہ برس کی تھی۔ اب وہ کام کرسکتا تھا گھر کی چار دیواری میں رہنے کے لئے اسکا جی نہ چاہتا تھا اس گھٹے ہوئے ماحول سے اسے نفرت سی ہوگئی۔ ہر قدم پر پابندی، سوچ پر پابندی، محبت پر پابندی، دوستوں پر پابندیاں، ہنسی پر پابندی یہ سلسلہ کب تک رہیگا۔ اس نے سوچا۔

خوش قسمتی سے دوسری عالمگیر جنگ چھڑ گئی اور وہ فوج میں بھرتی ہوگیا۔ اسے ایران بھیجدیا گیا۔ یہ عجیب سی بات ہے کہ اس نے فوج میں چار سال کام کیا۔ وہ فوجی زندگی سے بالکل نہیں اکتایا، اسے اس زندگی سے بالکل نفرت نہ ہوئی۔ یہ ڈسپلن جو اس کی روزمرہ کی زندگی پر لاگو کیا گیا تھا اور جس کا وہ بچپن سے عادی تھا اسے کچھ پسند آگیا۔ صبح اٹھ کر پریڈ کرنا، صاف کپڑے پہننا، ہر روز اپنے بوٹ پر پالش کرنا، وقت پر کھانا وقت پر سونا، ان تمام باتوں نے اس کی صحت پر اچھا اثر ڈالا۔ اس کی زندگی پہلے سے بہتر ہوگئی۔ اس نے کچھ کپڑے بنوالئے تھے اور ان چار برس میں مزے سے شہ اب پی تھی، ادھر اُدھر گھوم لیا تھا۔ ایران سے ہوکر فلسطین جا پہنچا تھا اور اس چھوٹی سی عمر میں زندگی کے کچھ تجربات حاصل کرلئے تھے۔

جب لڑائی ختم ہوئی تھی تو وہ مجازے صحیح سلامت لوٹا نہ اس کی ٹانگ ٹوٹی نہ آنکھ میں گولی لگی، اور نہ ہی کوئی بازو زخمی ہوا، یہ واقعی معجزے کی بات تھی۔ اس نے اس عرصہ میں سوچ لیا تھا کہ وہ گھر واپس نہ جائیگا۔ اسے اپنے گھر کی گھٹی گھٹی فضا راس نہ آئیگی اور جب وہ بمبئی کے ساحل پر اُترا تو اسے یہ شہر پسند آیا، شہر کی کھلی کھلی فضا، پھیلا ہوا سمندر اور ناریل کے لانبے لانبے درخت، غروب آفتاب کے وقت یہ سہانا منظر، عالیشان عمارتیں، چلت پھرت اسے دعوت دے رہی تھیں کہ وہ اس شہر میں ٹھہرے۔ اس کے ذہن میں خیالات کا ایک تلاطم آگیا، بڑے حسین اور خوبصورت خیالات اس کے ذہن میں تھرکنے لگے۔ وہ ایک چھوٹی سی نوکری کریگا۔ اور ایک چھوٹی مگر حسین اور خوبصورت لڑکی سے شادی کریگا، ایک چھوٹا سا گھر بنائیگا ایک چھوٹا سا آنگن، دو چھوٹے چھوٹے کمرے، ایک باورچی خانہ ایک غسل خانہ اور باہر ایک چھوٹا سا باغیچہ، جس میں اس کے بچے کھیلا کریں گے اور ہاں اس کے گھر میں ایک ریڈیو ہوگا، کچھ تصویریں، کچھ کتابیں، بس اور کچھ نہیں، اسے زندگی میں اور کچھ نہیں چاہیئے بس اپنے بچوں کی دلفریب مسکراہٹ، اپنی بیوی کی جانی پہچانی ہنسی اور دلنواز آواز بس اور کچھ نہیں۔ نہ مل خریدنے کی خواہش تھی نہ کار لینے کی تمنا، نہ پرائم منسٹر بننے کی لگن نہ پارٹی لیڈر بننے کی آرزو، اسے صرف ایک عام معمولی سی زندگی گزارنے کی تمنا تھی بس اور کچھ نہیں! وہ اپنی بیوی کو خوش رکھے گا، نہایت محبت اور پیار سے پیش آئے گا۔ وہ اپنے باپ کی طرح بیوی کو کبھی نہ ماریگا، وہ اپنی بیوی سے کہے گا "کہ تم اپنے بچوں سے اتنی محبت کرو کہ وہ اپنے باپ کو بھول جائیں اور باپ کے ذہن سے یہ بات نکل جائے کہ ماں کبھی نہیں ہوتی، کبھی پتھر کی طرح سخت نہیں ہوتی، اسکی نگاہوں میں ملائمت ہوتی ہے، نرمی ہوتی ہے بچوں کے لئے مرمٹتی ہے" اور اس کے ذہن میں کبھی کبھی یہ خیال آتا کہ وہ ایک بیوہ عورت سے شادی کریگا۔ اور اسکی گود میں سر رکھکر اپنی ماں کی محبت کو یاد کریگا۔ اسے اپنا گھر بنانے کا بہت شوق تھا۔

فاروقی چونکہ ملٹری میں کام کرچکا تھا اس لئے وہ بڑی پابندی سے عین وقت پر اٹھتا اور نوکری کی تلاش میں مختلف لوگوں سے ملتا، اس کی ڈائری میں لوگوں کے پتے لکھے ہوئے تھے اور ہر روز چند لوگوں سے ملتا تھا۔ وہ ان سے نوکری مانگتا تھا، اور دھوپ میں وہ نوکری تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اور مشہور فلم اسٹار کا پرائیویٹ سیکرٹری بن گیا۔ یہ انہی دنوں جب میری ملاقات فاروقی سے ہوئی۔ بات کرنیکا ڈھنگ اسے صاف اور ستھرے کپڑے پہننے کا اسے شوق تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ مجھے پسند آیا، اس نے مجھے گھر پر بلایا، کھانا کھلایا، اسکا گھر دیکھکر بہت خوش ہوا، ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی

سادہ کمرہ جس میں ایک پلنگ تھا۔ دائیں طرف دو چھوٹی الماریاں
ہیں جس میں کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ سامنے کی دیوار پر ایک خوبصورت
یکٹرس کی تصویر تھی، بائیں طرف ایک میز تھی جس پر کچھ رسالے تھے
نہیں سلیقے سے رکھا ہوا تھا بات کرنے بعد مجھے احساس ہوا کہ فاروقی
و ادب سے کافی دلچسپی تھی۔ فاروقی ہر اچھی نظم کی کھل کر داد دیتا
فسانہ کہانی پڑھ کر وہ اکثر لکھنے والے کو نمبر دیا کرتا تھا اس نے یہ سالہ
سال کر بتایا کہ اسے میری ایک کہانی بے حد پسند آئی ہے اور اس
نے دس میں سات نمبر دیئے ہیں۔ میں خود ایک افسانہ نگار ہوں
اس لئے مجھے اسکی ادبی دلچسپیاں بے حد پسند آئیں۔ کیونکہ اس
گنوار شہر میں کبھی کبھار ہی ایسے آدمی ملتے ہیں جنہیں کتابیں پڑھنے
کا شوق ہو، اسی دن فاروقی نے اپنے ماضی کا ذکر کیا اور تمام باتیں
جن کا میں ذکر پہلے کر چکا ہوں۔

ایک دو ملاقاتوں کے بعد وہ اجنبیت باقی رہی۔ دراصل
مجھے وہ شخص بہت پسند آتا ہے جو کتابیں پڑھے جو نفاست پسند ہو
جو باتیں سلیقے سے کرتا اور جو ایک بہتر زندگی بنانے کا خواہشمند ہو اس
دن فاروقی نے کہا۔ "میں نے گھر لے لیا ہے، نوکری کرتا ہوں
دو دن ایک خوبصورت لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں، پھر شاید
میری زندگی کا حسین خواب مکمل ہو جائے!"

اور مجھے اس کے حسین خواب سے ایک نامعلوم سی ہمدردی ہوئی
کتنی چھوٹی سی تمنا تھی۔ اس کی یہ خواہش پوری ہونی چاہیئے میں نے
سوچا۔ کھانا کھانے کے بعد میں وہاں سے چلا آیا۔ کچھ اور ادھر ادھر
کی باتیں ہوئیں۔ اس نے دوبارہ ملنے کے لئے کہا۔ میں نے اپنے
گھر کا پتہ دیا اس نے پتہ نوٹ بک میں لکھ لیا۔

تین چار مہینے گزر گئے تھے کہ فاروقی سے ملاقات نہ ہوئی
تھی۔ ایک دن اچانک وہ میرے کمرے میں وارد ہوا، صاف
اور ستھرے کپڑوں میں ملبوس، قمیص کی دائیں جانب گلاب کی
کلی لگائے ہوئے ذرا مسکراتا ہوا وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں گھر
میں اکیلا تھا۔

"کچھ عرض کروں"

"بڑے شوق سے"

"مجھے عشق ہو گیا ہے"

"بڑی اچھی بات ہے، کس سے عشق ہوا"

"صاف ظاہر ہے کسی لڑکی سے ہوا ہو گا۔ لیکن بات یوں
ہے کہ مجھے دو لڑکیوں سے دلچسپی سی ہو گئی ہے۔ یہ تو آپ جانتے
ہیں کہ میں بدصورت لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا لیکن اب
سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا کروں؟"

"پہلے بات تو بتاؤ"

"بات بالکل سیدھی سادھی ہے۔ جس لڑکی پر میں مرتا ہوں وہ
واقعی خوبصورت ہے لیکن وہ مجھے نہیں چاہتی، گو وہ میرے ساتھ
گھومتی ہے، چائے پیتی ہے سینما جاتی ہے، لیکن اس کی بول چال
اس کے سلوک سے یہ ظاہر ہوتا ہے جیسے وہ مجھ پر بڑا احسان کر رہی ہے
اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ خوبصورت ہے اور بے حد خوبصورت
کبھی کبھی تو میری دیوانگی اور جوش جنوں کا یہ عالم ہوتا ہے کہ میں
بے بس ہو جاتا ہوں اور جذبات سے مغلوب ہو کر یہ جی چاہتا ہے
کہ میں اسکے قدموں پر سر رکھ دوں اور اپنے قیمتی آنسوؤں سے اس کے
خوبصورت پاؤں کو تر کر دوں تاکہ اسے میری محبت کا اندازہ ہو جائے
لیکن اسکا احسان برتری مجھے اچھا نہیں لگتا"

"اور دوسری لڑکی"

"اس کی بات الگ ہے۔ وہ مجھے چاہتی ہے۔ وہ میرے ساتھ
سیر کرنے کو جاتی ہے۔ ہاں کہہ دوں وہاں میرا انتظار کرتی رہیگی
کبھی کبھار وہ میرے گھر آتی ہے میرا کمرہ صاف کرتی ہے، کتابوں
کو قرینے سے رکھدے گی، میرے بستر کو درست کر دیگی، میری طرف
دیکھتی رہے گی۔ اس میں ایک عجیب قسم کی عاجزی ہے ایک احساس
کمتری ہے جیسے وہ مجھے دیوتا سمجھ رہی ہے اور خود کو ایک حقیر چیز
سمجھتی ہے اور جب میں اسکے ساتھ چلتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا
ہے جیسے میں اس پر احسان کر رہا ہوں، میں دراصل اس سے
محبت نہیں کر سکتا۔ مجھے اس لڑکی سے صرف ہمدردی ہے۔
لیکن اس لڑکی کی محبت پاک اور صاف ہے۔ اگر میں اس لڑکی سے

شادی کرلوں تو وہ ایک وفادار بیوی ضرور ثابت ہوگی۔ لیکن
جس خواب کو میں دیکھنا چاہتا ہوں وہ نہ دیکھ سکوں گا۔ میرے
ذہن میں لڑکی کا تصور عجیب سا ہے۔ جیسے لڑکی میں سب خوبیاں
ہی خوبیاں ہوں، خوبصورت اتنی ہو کہ جیسے اجنتا کا کوئی حسین مجسمہ
میرے سامنے کھڑا ہو جائے، وہ کوئی ایسی بات نہ کرے جو
میرے ذہن کو کھٹکے، وہ اتنی اونچی نہ ہنسے کہ میری جمالیاتی حس کو
ٹھیس پہنچے۔ جب وہ بستر سے صبح اٹھے تو میں اسکی خوابناک آنکھوں
کی طرف دیکھتا رہوں۔ جب وہ نیند سے پور ہو کر آنکھیں ایک
لمحہ کے لئے بند کردے تو میں نیند سے چور آنکھوں پر گلاب کی
پتیاں رکھدوں اور گلاب کی پتیوں کو یکبارگی چوم لوں۔ جب وہ
انگڑائی لے تو فضا میں بجلی کوند جائے، لیکن اس بجلی کو صرف میں
محسوس کرسکوں، صرف میں دیکھ سکوں جب وہ مجھ سے نگاہ
ملائے تو میں تڑپ کر رہ جاؤں .... یہ باتیں سنکر آپ
مجھے ضرور بے وقوف سمجھتے ہونگے۔ لیکن کیا عرض کروں کچھ اس
قسم کا جال بن لیا ہے میں نے عورت کے ارد گرد!

"جی نہیں! میں آپ کو بالکل بے وقوف نہیں سمجھتا بلکہ
میں آپکے رومانی تصور کو بے حد پسند کرتا ہوں اور یہ رومانی
تصور لڑکی کے ارد گرد اپنا ہالہ بنے ہوئے ہے اگر اس لڑکی کو
چھوڑ کر آپ کا تصور باقی دنیا کا بھی احاطہ کرلے تو آپ کی یہ کوشش
واقعی قابل قدر ہوگی۔

"میں آپکا مطلب نہیں سمجھا۔"

میرا مطلب یہ ہے کہ آپ دوسری لڑکی سے شادی
کرلیں تو بہتر ہوگا۔ اس لڑکی سے جو آپ سے محبت کرتی ہے اور
آپ اس سے صرف ہمدردی کرتے ہیں۔ ہمدردی محبت کی پہلی
سیڑھی ہے۔ یہ مانا کہ دوسری لڑکی بدصورت ہے۔ دبلی ہے
پتلی ہے اس میں وہ کشش نہیں کہ جب وہ انگڑائی لے تو فضا
میں قوس و قزح کھنچ جائے۔ کہیں ازدواجی زندگی گزارنے کیلئے
بجلی، قوس و قزح، تڑپ اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے رنگوں
کی ضرورت نہیں۔ بلکہ دل سے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش
اور ہمدردی اور رفاقت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے حسن اور شباب
نے کس کا ساتھ دیا ہے جو آپکا ساتھ دیگا۔"

"لیکن مجھے اس لڑکی سے محبت نہیں ہے۔"

"جس سے تم محبت کرتے ہو، وہ تم سے محبت نہیں کرتی
اور جسے تم نہیں چاہتے وہ تم سے محبت کرتی ہے یعنی پہلی لڑکی سے
تمہاری شادی ہو جائے تو ساری عمر اسکا احسان تمہارے کندھوں
پر رہے گا۔"

"میں کسی کا احسان اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہوں، میں نے
اپنی زندگی خود بنائی ہے اور میرا ضمیر اجازت نہیں دیتا کہ میں محض
اُس کی ہمدردی کا نشانہ بن کر اسکا خاوند بن جاؤں۔ ہاں اگر واقعی
اس لڑکی کو مجھ سے محبت ہو جائے تو پھر ---!"

"پھر ٹھیک ہے!"

"میں سوچونگا، میں ضرور بتاؤں گا آپ کو کہ میری اس محبت
کا کیا حشر ہوا" اور یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

کافی عرصہ گزر گیا اور فاروقی نہ آیا۔ میں نے سوچا کہ فاروقی
نے شادی کرلی ہوگی، لیکن کس کے ساتھ۔ اسکا فیصلہ میں نہ کرسکا
اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو میں اس بدصورت لڑکی سے شادی کرتا
تاکہ ساری عمر میری وہ احسانمند رہتی اور اگر آپ ہوتے تو کیا
کرتے؟ خیر جب آپ کی زندگی میں ایسا موقعہ آئے تو خود ہی فیصلہ
کر لیجئے گا، ابھی نہیں ----- میں یہ جاننے کے لئے بیتاب تھا
کہ اسکی محبت کا کیا حشر ہوا کہ ایک دن جب موسلا دھار بارش
ہو رہی تھی، فاروقی میرے کمرے میں داخل ہوا، برساتی اتار
وہ میرے سامنے بیٹھ گیا وہ آج کچھ غمگین اور اداس تھا۔ لیکن
کپڑے بدستور صاف اور ستھرے تھے۔ قمیص کی داہنی طرف کالر
کی ایک کلی اداس نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"بہت برا ہوا" اس نے منہ لٹکاتے ہوئے کہا

"کیا کسی نے خودکشی کرلی یعنی اس دبلی پتلی لڑکی۔"

"نہیں تو"

"تو کیا خوبصورت لڑکی نے شادی کرنے سے بالکل

دیا !"

"اوں ہوں"

"تو پھر کیا ہوا"

"مجھے نوکری سے جواب مل گیا" اس نے میری طرف
ب انگیز نگاہوں سے دیکھا۔

"یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اس نظام میں تو ایسا ہی ہوگا
یہ بتاؤ تمہارے عشق کا کیا ہوا ؟"

"پہلی لڑکی نے مجھے چھوڑ دیا ہے اب وہ ایک دوسرے
کے سے عشق کرنے لگی ہے !

"اور دوسری لڑکی ؟

وہ بیمار ہے دمہ اور کھانسی سے۔ میں کافی عرصہ سے
کا علاج کرا رہا ہوں لیکن وہ ابھی تک تندرست نہیں ہو سکی
راب تو مجھے نوکری سے جواب مل گیا ہے اب میں کچھ نہیں
سکتا !

"کیوں" ؟

شاید آپ نہیں جانتے کتنی مشکلوں اور دقتوں سے میں نے
ری حاصل کی تھی اور میں کتنی محنت، ایثار اور دیانت داری سے
م کرتا تھا، میں چاہتا تھا کہ میں اس فرم میں ہمیشہ کیلئے کام کرتا
ہوں، اسی طرح میری تنخواہ بڑھ جائیگی اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا
اب اس دبلی پتلی لڑکی سے شادی کر لونگا۔ لیکن اس دوران
ں وہ بیمار ہو گئی اور ساتھ ہی مجھے نوکری سے برطرف کر دیا گیا۔"

"نوکری سے تمہیں جواب کیوں ملا ؟"

"اس میں شک نہیں کہ میرا مالک مجھ سے بے حد خوش تھا
نی محنت سے میں کام کرتا تھا شاید ہی اور کوئی کلرک اس فرم
ں کام کرتا ہو، میں وقت پر آتا اور وقت پر جاتا تھا، ہر چیز کو چمکا کر
یز پر رکھتا تھا، خطوں کا جواب عین وقت پر دیتا تھا اور مالک کی
خوشنودی حاصل کرنے کے لئے میں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی فائلوں
کا صاف ستھرا رکھنا میز، قلم، دوات کا اپنی جگہ پر ہونا، کمرہ اُجلا
اُجلا سا دکھائی دیتے رہنا، باہر سے آنے والوں کے ساتھ میٹھی
آواز میں بولنا، مالک کے سامنے جھک کر اور تمیز سے بات کرنا،
ہر طریقے سے آداب بجا لانا آقا اور نوکر کے رشتے کو برقرار رکھنا کہ
دونوں کا فاصلہ اتنا قریب نہ ہو جائے کہ نوکر مالک دکھائی دے
اور مالک محض نوکر۔ اور یہ دیکھئے فونٹین پن جو مالک نے میرے
کام سے خوش ہو کر دیا تھا، لیکن اس کے باوجود مجھے نکال دیا گیا"

"اس کی کوئی وجہ" ؟

"جی ہاں، بتاتا ہوں، انکا ایک رشتہ دار تھا جو یہ نہ چاہتا
تھا کہ میں اس فرم میں کام کروں۔ انہوں نے میرے مالک کے کان
بھرے اور میرے خلاف شکایتیں کیں اور ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ یا تو
مجھے رکھو یا فاروقی کو۔ اس کے بعد میرے آقا نے مجھے نکال دیا میں
نے وجہ پوچھنے کی کوشش کی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ مجھے اس
بات کا رنج نہیں کہ مجھے کیوں نکالا گیا، اگر کوئی مجھ سے بھول ہوئی
ہوتی، کام میں ناکارہ ثابت ہوتا، میں کوئی بدتمیزی کرتا، ان کے
روپے کھا جاتا، حساب میں کوئی بد دیانتی کرتا تو کچھ وجہ بھی تھی، میں نے
کتنی محنت سے یہ نوکری حاصل کی تھی اور اس حیثیت کو برقرار رکھنے کے
لئے اپنی تمام ذہانت کو کام میں لایا تھا، میں نے اپنے متعلق کیا کچھ سوچا
تھا۔ وہ گھر، وہ باغ، میری ہونے والی بیوی، میرے بچے میری
ہر چیز تباہ ہو گئی "۔

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا، باہر موسلادھار بارش ہو رہی
تھی ہوا میں ایک نمی تھی۔

"دیانت داری سے اس دنیا میں کام نہیں چلتا، انسان
کو مکمل چار سو بیس ہونا چاہیئے" ! میں نے فاروقی کی طرف
دیکھتے ہوئے کہا

"اگر ضمیر اس بات کی اجازت نہ دے تو"

"اگر تم ایک خوبصورت گھر اور ایک عمدہ بیوی کو پانا
چاہتے ہو تو ضمیر کو ضرور کچلو" !

وہ میری طرف حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"میں ایسا نہ کر سکوں گا، میں صرف اپنی جائز محنت کا صلہ
چاہتا ہوں اور اسی جائز محنت سے اپنا محل تعمیر کرنا چاہتا ہوں"

میں یہ بات سنکر مسکرا دیا لیکن فاروقی سے کچھ نہ کہا، یہ کہکر وہ اٹھا، برساتی پہنی اور موسلا دھار بارش میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

اور پھر وقت گزرتا گیا، برسات گئی، خزاں آئی، بہار آئی اور چلی گئی، آسمان اسی طرح نیلا اور شفاف رہا، ناریل کے درخت اسی طرح جھومتے رہے اور ان جانی سڑکوں پر ہزاروں انسانوں کا قافلہ بھوک اور بیکاری کو لئے چلتا رہا اور سسکتا رہا۔

ایک دن میں دیر سے بستر سے اٹھا اور شیو کرنے ہی والا تھا کہ فاروقی کمرے میں داخل ہوا نہایت صاف اور ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھے، آنکھوں میں چمک تھی اور لبوں پر مسکراہٹ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کئی دنوں سے آسودہ زندگی بسر کر رہا ہو اسے خوش دیکھکر میں بھی خوش ہو گیا۔

"نوکری مل گئی" میں نے پوچھا

"صرف نوکری ہی نہیں ملی، بلکہ اور بہت کچھ مل گیا ہے اور اب ایسا دکھائی دیتا ہے جیسے میرا خواب پورا ہو جائے گا، میرا گھر، میری بیوی، میرے بچے، میرا باغیچہ، صرف ایک رکاوٹ ہے!"

"راستے میں ابھی تک کچھ کانٹے ہیں؟"

"جی ہاں! اسی کے متعلق آپ کی رائے چاہتا ہوں۔ بھکاری سے امیر اور امیر سے بھکاری ہونا معمولی سی بات ہے لیکن ایک بات ٹھیک ہے آپکی، کہ دیانت داری سے انسان کچھ نہیں کر سکتا۔ بہرحال آجکل میری مالکن ایک عورت ہے۔"

"خوبصورت اور جوان؟"

"ہوں"

"شادی شدہ"

"جی نہیں"

"بیوہ؟"

"سمجھ لیجئے گا۔ پہلے ایک شادی کی تھی۔ خاوند مرا نہیں۔ بلکہ خاوند نے خود چھوڑ دیا۔ پھر میری مالکن بمبئی چلی آئی۔ ایک عالیشان کوٹھی میں رہنے کیلئے اور ایک بہتر زندگی گزارنے کیلئے وہ ایکٹرس بنگئی، پہلے سب کچھ نہیں تھا اب سب کچھ ہے وہ کہتی ہے کہ مجھے کسی مرد سے محبت نہیں، مردوں سے محبت کرکے دیکھ لی، سبھی عیش کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے خاوند نے اس لئے چھوڑ دیا تھا کہ میری مالکن فضول خرچ تھی، دراصل وہ فضول خرچ نہ تھی، بلکہ اس کے خاوند کو ایک لڑکی سے محبت ہو گئی تھی کیونکہ دوسری لڑکی مالدار تھی اور میری مالکن ایک غریب گھرانے سے آئی تھی۔ یہ دوسری لڑکی جہیز میں بہت کچھ دے سکتی تھی۔ خاوند اور بیوی کی لڑائی ہوئی اور میری مالکن خاوند کو چھوڑ کر ادھر چلی آئی، میری مالکن نے کہا "تم مالدار لڑکی سے عشق کرو، میں مالدار آدمی سے عشق کرتی ہوں اور پھر اس فلم انڈسٹری میں چلی آئی" میرے پاس بہت کچھ تھا وہ جسم جو ابھی تک جوان تھا، وہ آنکھیں جن میں شباب کی حدت تھی وہ بال جن میں سورج کا سونا تھا، وہ باتیں جو آنِ واحد میں مرد کو الو بنا سکتی تھیں، میں نے سب کچھ کیا، میں مسکرائی، مرد میرے پیچھے بھاگے۔ میں نے انگڑائی لی، انہوں نے مسکرا کر کہا میں تم پر مرتا ہوں، میں اپنی بیوی چھوڑنے کے لئے تیار ہوں، میں ان کی مسکراہٹ کا مطلب جانتی تھی۔ میں ان کے مرنے کا مطلب جانتی تھی لیکن سب کچھ جانتے ہوئے بھی میں نے سب کچھ ان کے سپرد کر دیا۔ اس کے عوض مجھے ایک بنگلہ ملا، ایک کار ملی اور بنک بیلنس بن گیا شہرت ملی، میرے آرٹ اور فن کے دلدادہ پیدا ہو گئے نقاد میری ایکٹنگ کی تعریف کرنے لگے اور نوجوان میرے آٹوگراف لینے کے لئے میرے گھر کے چکر کاٹنے لگے خطوں کا انبار لگ گیا۔ اس کے باوجود میں کسی سے محبت نہ کر سکی، کیونکہ کوئی مجھ سے محبت نہ کرتا تھا۔"

"عورت تجربہ کار ہے!" میں نے فاروقی سے کہا

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں!"

"لیکن تمہاری ملاقات کیسے ہوئی!"

"یونہی! میری عادت سے تو آپ اچھی طرح واقف ہیں میں لوگوں سے اکثر ملتا رہتا ہوں، ایک آدمی سے دوسرے آدمی

پہنچنا میرا فرض سا ہو گیا ہے۔ اسی آوارہ گردی میں میری ملاقات
اس عورت سے ہو گئی میں نے کہا۔ میں کام چاہتا ہوں۔ اس نے
کہا تم آ سکتے ہو اور پھر میں ان کے ہاں نوکر ہو گیا۔

"تو اب جھگڑا کس بات پر ہے" میں نے چڑ کر کہا

"بتاتا ہوں! معاملہ ایک ہی نازک نقطے پر آ کر رک گیا
ہے میری ایمانداری سے آپ اچھی طرح واقف ہیں پہلی ملاقات میں
وہ میری گرویدہ ہو گئیں۔ میں نے پہلے ان کے گھر کو سنبھالا۔ سامان
ترتیب سے رکھا، نوکر منہ پھٹ تھا اسے نکالا اور اس کی جگہ ایک باحیا،
باادب نوکرانی رکھی۔ کھڑکیوں کے پردے میلے تھے انہیں بدلا،
صوفہ سیٹ پرانا تھا اس پر نیا کپڑا چڑھایا، کمرے میں کچھ جالے تھے
انہیں صاف کرایا، ڈرائنگ روم میں کپڑے سلیقے سے رکھے
فرش پر قالین بچھائے، تپائیوں پر گلدان سلیقے سے رکھے اور
گلدانوں میں کلا بتے پھول، دیواروں کو روغن کرایا اور ایلورا اور
اجنٹا کی تصویروں سے کمرے کو سجایا، انہوں نے جتنے روپے
دیئے تھے ان میں ایک پائی بھی نہ کھائی یہ دیکھ کر وہ خوش ہو گئیں"

"بڑی اچھی بات ہے انہوں نے آپ کی تنخواہ بڑھا دی
ہو گی"!

"جی نہیں"

"کچھ الگ جیب خرچ دیا ہو گا"

"نہیں تو"

"تو پھر کیا کیا انہوں نے"!

"وہ میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگیں" یہ کہہ کر فاروقی
جھینپ سا گیا۔

"یعنی کیا مطلب آپ کا" میں نے گھبرا کر پوچھا

"جب عورت مسکراتی ہے تو کیا مطلب ہوتا ہے" یعنی
وہ مسکرائیں۔ ایک انگڑائی لی، اور پھر پانچ ہزار کے نوٹوں کا بنڈل
میرے ہاتھ میں دے دیا۔"

——"کیا کروں انہیں"؟ میں نے مالکن سے پوچھا

——"خرچ کرو"!

——"کہاں"؟

——"جہاں آپ کا جی چاہے"

"اس ایکٹرس کا نام کیا ہے"؟ میں نے پوچھا

"نام نہیں بتاؤں گا اس کا نام ایکٹرس الف رکھ لیجئے گا!

جب ایکٹرس نے یہ الفاظ کہے تو میں اس کا سارا مطلب سمجھ
گیا۔ وہ کرسی سے اٹھی اور کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو گئی اور اس نے
اپنے بلاؤز کے بٹن کھول دیئے اور میں کمرے سے باہر نکل آیا، پانچ
دن سے یہ نوٹ میری جیب میں ہیں پانچ ہزار کے نوٹ ایک معمولی
انسان کے پاس پانچ ہزار کے نوٹ، اور میرے جی میں جو آئے
کر سکتا ہوں، اچھے اچھے کپڑے خرید سکتا ہوں، ایک نیا مکان
پگڑی پر لے سکتا ہوں، گراموفون، ریڈیو اور دیگر چیزیں خرید
سکتا ہوں، ان پانچ ہزار روپوں میں ہر وہ حرکت کر سکتا ہوں جس
کے لئے میں اتنی محنت کرتا رہا ہوں، روپیہ کتنی محنت سے ملتا ہے
اور جب کبھی ملنے لگتا ہے تو یونہی مل جاتا ہے۔ میں ان کا مطلب
سمجھ گیا ہوں، وہ مجھ سے محبت کرتی ہے، اس میں شک نہیں لیکن
اس کے گھر اور لوگ آتے ہیں یعنی اس کے چاہنے والے، ایک ڈائرکٹر
آتا ہے جس نے اسے سب سے پہلے فلم میں کام دیا تھا اور وہ آج اسی
لئے ایکٹرس سے عشق کرتا ہے کہ وہ اس ایکٹرس کو پہلی بار سکرین
پر لایا تھا اور میری مالکن اس کی شکر گزار ہے ایک اور پروڈیوسر
آتے ہیں جو کافی عمر رسیدہ ہیں۔ بال بچے والے ہیں لیکن حسن اور آرٹ
کے شیدائی ہیں، وہ میری مالکن کی دلفریب اداؤں پر فدا ہیں اور
اپنی بیوی اور اپنے بچوں کو چھوڑنے کیلئے تیار ہیں اگر میری مالکن
ان سے شادی کر لے، لیکن میری مالکن کسی سے شادی نہیں کرتی
سب سے وعدہ کرتی ہے اور وعدے اس لئے کرتی ہے کہ ان سب کو
اسے اپنے شکنجے میں رکھنا ہے کون جانے کس وقت کونسا مہرہ
کام آ جائے۔ کسی سے بگاڑنے سے کیا فائدہ —— اور میری مالکن
میری طرف رجوع ہوتی ہے، میری طرف آنے کی صرف دو وجوہ
ہو سکتی ہیں۔ ایک تو میرا کام جس تن دہی اور اشتیاق سے میں
کام کرتا ہوں شاید اس سے پہلے کسی اور نے نہ کیا ہو گا، اور دوسرے

بات یہ ہو سکتی ہے کہ شاید میں انہیں بھا گیا ہوں ۔ میں اتنا خوبصورت
تو نہیں لیکن بدصورت بھی نہیں ، بلکہ پورے وثوق سے کہہ سکتا
ہوں کہ جتنے مرد میری مالکن کے گھر آتے ہیں ان سے زیادہ خوبصورت
ہوں ، ان سے زیادہ دیانت دار ہوں ، ان سے زیادہ مالکن کا
وفادار ہوں !

" تو تم شادی کیوں نہیں کر لیتے ! "

" شادی تو میں کر لوں ، لیکن مالکن کو میری بات ماننا ہوگی "

" وہ مان لے گی اگر تم اس سے شادی کرنے پر تیار ہو جاؤ "

" مجھے اعتبار نہیں اور اعتبار اس لئے نہیں کہ تم میری
مالکن کو نہیں جانتے وہ خود کماتی ہے اسے مردوں سے نفرت ہے
وہ مجھے اپنے گھر رکھے گی ، مجھے ہر چیز دے گی ، شاید مجھے کار خرید کر
لے دے ، مجھے دس بارہ سوٹ سلوا دے ، مجھے دو نوکر رکھ دے
میرے لئے بنک میں روپیہ جمع کروا دے ، میرے لئے ہر روز اچھے
اچھے کھانے بنوا لے ، اور مجھے سجا کر شہر کے کسی مشہور سینما میں لیجائے
یہ باتیں وہ کر سکتی ہے ۔ کیونکہ وہ اچھے خاصے روپے کماتی ہے ۔
اور میرے لئے یہ عیش و طرب کچھ کم نہیں ، میری نگاہوں میں شراب
کی بوتل ہے ، عورت کا جسم ہے ایک اچھے مکان ، نوکر چاکر ، کپڑے
گراموفون ، ریڈیو ، کار ۔ سب کی چاہت ہے لیکن اسکی قیمت مجھے
دینا ہوگی ---- جانتے ہو میں مالکن کے کمرے کی زیبائی بن کر
رہ جاؤنگا ، اس کے ہار سنگار کے میز کی ایک حقیر چیز ۔ آجکل جیسے مرد
اپنی نشاط گاہوں میں عورت کو سجاتا ہے ، اور حسین تتلی اور پری
بنا کر اپنی بغل میں دبا کر اسے دنیا کی سیر کراتا ہے ، اسی طرح شاید
میری مالکن مجھے نہلا کر ، سجا کر ، نئے کپڑے پہنا کر ، کار کی اگلی سیٹ
پر بٹھا کر اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہے ، لیکن میرا ذہن اس بات کو
مانتا نہیں ! "

آپ بہت بڑے چغد ہیں ، آپ پچھلے دو برس سے فاقے
کر رہے ہیں اور زندگی میں پہلا موقعہ ملا ہے کہ آپ عیش کر سکیں
لیکن آپ اب بھی بھاگ رہے ہیں ۔ سچ بات تو یہ ہے کہ آپکا دماغ
درست نہیں ، اور اس زندگی میں کیا رکھا ہے ، ساری عمر مر جاؤگے
فاقے کرکے ، ایک روپیہ بنک بیلنس نہ بنا سکو گے ، نوکری کے لئے
ایڑیاں رگڑتے رہو گے ، مالدار دوستوں کے آگے ایک ایک روپے
کے لئے ہاتھ پھیلاؤ گے اور پھر بھی تمہیں کوئی کچھ نہ دیگا ، مکان کا
کرایہ نہ دے سکو گے اور زندگی کامیاب نہ کر سکو گے اور آخر کار
ایک کتے کی موت تمہیں نصیب ہوگی اور کچھ نہیں ، آج موقعہ ملا ہے
اسے استعمال کر دو اور بھول جاؤ ایمان اور آدرش کو !

" سوچونگا ، آپکی باتوں پر غور کرونگا ، اچھا اجازت دیجئیگا ؟

اس دن کے بعد کافی عرصہ وہ نظر نہ آیا ، اور میں یہ سوچتا
ہی رہا کہ فاروقی کی کیا حالت ہوگی ۔ پھر خیال آتا کہ وہ ضرور عیش کر رہا
ہوگا ، غالباً اس نے کار خرید لی ہوگی ، ایک عالیشان کوٹھی میں
رہتا ہوگا کم بخت ہر روز شراب پیتا ہوگا اور اس ایکٹرس کے
ساتھ گھومتا ہوگا ، میں نے اپنے آپ کو کوسا کہ میں نے کیوں
اسے شادی کرنے کیلئے کہا ، اچھا خاصا فاقے کر رہا تھا مر رہا
تھا ، مرنے دیتا خیر اب جلن کس بات کی ۔ ایک دن میں دادر
پل پر سے گزر رہا تھا کہ اچانک فاروقی مل گیا ، مجھے دیکھ کر وہ
کھڑا ہو گیا ۔

" فاروقی "

وہ ہنسنے لگا

" شادی ہو گئی "

" نہیں تو "

" یہ جواب سنکر مجھے کچھ تسکین ہوئی ۔ " تم نے شادی کیوں
نہ کی ! "

میں تیار تھا لیکن وہ تیار نہ ہوئیں ۔ میں نے مالکن سے کہا
میں شادی کے لئے تیار ہوں اگر آپ میری چار شرطیں منظور
کر لیں ۔ وہ چار شرطیں یہ تھیں :-

۱ ۔ شادی کرنیکے بعد آپ فلم میں بالکل کام نہ کر سکیں گی
۲ ۔ آپکا کوئی پرانا عاشق اس گھر میں نہ آسکے گا ۔
۳ ۔ اس مکان کو چھوڑنا پڑیگا اور میرے کمرے میں رہنا
۴ ۔ جو کچھ میں کماؤنگا اسی میں گزارا کرنا پڑیگا اور ایک

ہندوستانی بیوی کی طرح آپ کو میری خدمت کرنا ہوگی۔

یہ چار شرطیں سنکر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگئیں۔ جب ان کی ہنسی بند ہوئی تو وہ اٹھیں اور کھڑکی کے قریب کھڑی ہوکر ایک لمحہ کے لئے کچھ سوچا۔ اس بار انہوں نے اپنے بلاوز کے بٹن نہیں کھولے، بارسنگھار میز کے قریب گئیں، دروازہ کھولا، ایک بٹوا نکالا۔ اور سو سو کے دو نوٹ مجھے دیئے۔

"یہ آپکے اس مہینے کی تنخواہ پیشگی —— کل سے آپ یہاں مت آئیے گا۔" مالکن نے خود دروازہ کھولا، باہر کی طرف اشارہ کیا۔ میں دروازے سے باہر نکلا اور مالکن نے زور سے دروازہ بند کیا۔

اور میں اب آپکے سامنے ہوں، دیکھئے یہ گلاب کی کلی جسے میں ہر روز اپنی قمیص میں لگاتا ہوں، میں خوش ہوں، مجھے کوئی رنج نہیں، گو نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہوں اور میرے بوٹ کے تلے گھس گئے ہیں، آج کل فاقے بھی کرتا ہوں۔ لیکن کوئی بات نہیں میرا ضمیر تو زندہ ہے، وہ تو مرا نہیں، میں نے اپنے آپکو بیچا نہیں، بس اسی بات کی خوشی ہے مجھے

یہ کہہ کر وہ آگے چل دیا اور دادر پل کی بھیڑ میں غائب ہوگیا۔

میں نے سوچا "یہاں سے وہاں تک پہنچنے کیلئے فاصلہ تو زیادہ نہیں، لیکن یہ درمیانی فاصلہ کیسے اور کیونکر طے کیا جائے شاید اسی پر انسانی زندگی کے عروج اور ارتقا کا دارومدار ہے!!

(ز ادب لطیف)

معدہ کی خرابیوں کو نظر انداز نہ کیجیے........

.........کہیں معدہ کی خرابیاں آپکو نظر انداز نہ کر دیں

ھاضمی —— ایک بہترین سفوف معدہ ہے!

جو فعل ہضم کو فطری طور پر کام کرنے میں مدد دیتا ہے اور معدہ کو ہر خرابی سے محفوظ رکھتا ہے حفظ ماتقدم علاج سے بہتر ہے اس لئے ہضمی استعمال کیجئے تاکہ آپکا معدہ ہر خرابی سے محفوظ رہے

قیمت فی شیشی :-

ایکروپیہ چار آنے

حاذق دواخانہ، بندر روڈ، کراچی نمبر ا سے طلب فرمائیے

چی

یزدانی •

مُدّعائے سخن

تڑپ کے روحِ ابوجہل کہہ اٹھے شاباش ۔۔۔ جو ہو سکے دلِ ایماں پہ ایک تازہ خراش

قدم قدم پہ مسلماں کے راستے روکو ۔۔۔ قدم قدم پہ انہیں بڑھ کے دو شکستِ فاش

کچل بھی ڈالو غریبوں کے حوصلے بڑھ کر! ۔۔۔ مٹا بھی دو دلِ حرماں نصیب کو شاباش

ہمیں اب اور کسی چیز کی نہیں خواہش ۔۔۔ ہمیں تو مل چکی اپنے خلوص کی پاداش

کرم کی آڑ میں جاری رہے یہ مشقِ ستم ۔۔۔ مگر یہ راز پسِ پردہ ہو رہے گا فاش

تمہیں خبر نہیں آسودگانِ منزلِ عیش ۔۔۔ نظر جمائے ہے بزمِ شہود کا نقاش

تمہارا طرزِ حکومت ہے بارِ ملت پر ۔۔۔ خدا علیم کہ تم سے نہیں ہمیں پرخاش

جو ذرے ذرے کو اسلام آشنا کر دے ۔۔۔ مرے وطن کو ہے اس مردِ باخدا کی تلاش

ہمیں خدا پہ بھروسہ! تمہیں "گراہم" پر! ۔۔۔ جدا جدا ہے عقیدہ! جدا جدا ہے تلاش

تمہیں "محمد عربی" کے خادموں سے عناد ۔۔۔ ہمیں اسیرِ طلسمِ فرنگ سے پرخاش

وطن کو فکر ہے اک شیر دل مسلماں کی ۔۔۔ تمہاری محفلِ عشرت کو گل رخوں کی تلاش

محبتوں کے خزانے ہیں اہلِ زر کے لئے ۔۔۔ مجاہدانِ تہی دست سے مگر پرخاش

خدا گواہ کہ دس سیر کا بکے (آٹا) ۔۔۔ ہماری طرح جو زنجیر پا ہو فکرِ معاش

جو ناگوار نہ ہو اور ایک بات کہوں ۔۔۔ وطن کے شانے پہ ہیں آپ ایک زندہ لاش

خدا گواہ جز این نیست مدعائے سخن

زبے نیازِ حقیقی تو بے نیاز مباش

شوکت تھانوی ●

آخری ارمان

کچھ ارمان پورے ہوئے کچھ حرمان بن گئے۔ مگر اب ایک تازہ ارمان پیدا ہوا ہے اللہ جانے یہ پورا ہوگا یا حرمانوں کی فہرست میں شامل ہو جائے گا اور قبر میں ساتھ جائے گا۔ وہ ارمان ہے مکان کے متعلق۔ مکان سے مطلب ذاتی مکان نہیں ہے۔ ذاتی مکان کے سلسلہ کا ارمان تو مدت ہوئی حرمان بن چکا ہے اور میرا قاعدہ یہ ہے کہ جو ارمان ایک مرتبہ حرمان بن جاتا ہے میں پھر اسے حرمان کے شرف سے محروم کرنے اور ارمان بنانے کی کبھی کوشش نہیں کرتا۔ یہ ارمان تو صرف کرایہ کے مکان سے تعلق رکھتا ہے۔ کرایہ کے مکان میں خدا کے فضل سے میں اب بھی رہتا ہوں اور جس مکان کی تمنا ہے اس کا بھی کرایہ ماہ بماہ نہایت پابندی سے ادا کرنے کا نیک ارادہ رکھتا ہوں۔ میرا موجودہ مکان نہایت صاف شفاف، ہوادار اور ہر اعتبار سے نہایت آرام دہ بھی ہے۔ پھر بھی یہ مکان میرے لئے جہنم بنا ہوا ہے اور عین اسکے مقابلہ میں تکلیف دہ ہے۔ تکلیف دہ مکان کو اپنے لئے جنت الفردوس سمجھنے کو تیار ہوں۔ ایک مرتبہ یہ بات پھر واضح کردینا چاہتا ہوں کہ مجھ کو مکان سے بخدا کوئی شکایت نہیں۔ البتہ مالک مکان جو اس مکان کے سلسلہ میں میرے "نصف بہتر" بھی ہیں میرے لئے ناقابل برداشت بنے ہوئے ہیں "نصف بہتر" سے میرا مطلب یہ ہے کہ مکان کے اس نصف حصہ میں وہ خود رہتے ہیں۔ جو ہر اعتبار سے بہتر ہے اس مکان کو اگر آپ ایک گائے فرض کرلیں تو منھ میرے حصے میں آیا ہے اور تھن مالک کے حصے میں، یعنی اس گائے کے سینگ خود کھا کر اس کو چارہ میں کھلاتا ہوں اور دودھ مالک مکان دوہتے ہیں۔ تازہ ہوا کھانے کے لئے تمام دریچے ان کے حصے میں آئے اور مکان کی تمام نالیاں میرے حصے سے ہو کر گذری ہیں۔ مکان کے سامنے باغیچہ ان کا ہے اور مکان کی پشت پر جو گندہ نالہ بہتا ہے وہ میری قلمرو میں ہے۔ پانی کا نل انکے حصے میں ہے اور ایک ماتحت ٹوٹی میرے حصے میں بھی لگی ہوئی۔ اگر کبھی مالک مکان غسل نہ فرما رہے ہوں، ان کا باغیچہ سینچا نہ جا رہا ہو، انکے ملازم کپڑے نہ دھو رہے ہوں ان کے باورچی برتن نہ مانجھ رہے ہوں تو بیوہ کی آنکھ کے آنسو کی طرح ایک نحیف و نزار سی دھار اس ٹوٹی سے بھی نمودار ہو جائے اور دوڑیں گھر کے سب لوگ لوٹے اور گھڑے، صراحیاں اور گگرے لے کر اس معجزے سے فائدہ اٹھانے کے لئے یہ سب کچھ سر آنکھوں پر منظور تھا بشرطیکہ صرف اتنا ہی ہوتا یا اس سے بھی کچھ زیادہ شکایتیں ہوتیں مگر اسی قسم کی۔ مگر میری مصیبت کی نوعیت کچھ اور ہی ہے اور اس مصیبت کی تشریح کے لئے مجھ کو ذرا تفصیل میں جانا پڑے گا۔

اگر سچ پوچھئے تو مصیبت میں نے خود خریدی ہے یا یہ سمجھ لیجئے کہ یہ مصیبت میں نے خود کرایہ پر لی ہے۔ ابتدا اس کی یوں ہوئی کہ مکان کی تلاش میں جب میں اس مکان تک پہنچا اور مالک مکان سے نیاز حاصل کیا تو ان کو مولوی مدن کی قسم کا بزرگ پایا، سفید نورانی ڈاڑھی مگر نور عنقا، نہایت خشک قسم کا خوفناک چہرہ۔ تیوریوں پر خواہ مخواہ بل پڑے ہوئے چونکہ صبح صبح ان بزرگ کی زیارت ہوئی تھی۔ لہٰذا دن بھر کھانا میسر نہ ہوا۔ البتہ مکان میسر آگیا اور وہ بھی اس طرح کہ جو کرایہ مانگا پیش کردیا چھ مہینے کا پیشگی مانگا وہ حاضر کردیا۔ مکان کے سلسلہ میں اپنی تمام حق تلفیوں کو مراعات اور استحقاق تسلیم کیا اور ٹریجیڈی یہ ہوئی کہ مارے سعادتمندی کے ان بزرگ محترم سے یہ بھی کہدیا کہ آپ اس خاکسار کو اپنا کرایہ دار نہیں بلکہ فرزند سمجھیئے گا اور مجھ کو بھی ناز رہے گا کہ میں آپ ایسے بزرگ کے زیر سایہ آگیا ہوں۔

وہ دن اور آج کا دن یہ حضرت واقعی بزرگ بنے ہوئے ہیں، شفقت سے مجبور ہیں اس لئے کہ خون کا کوئی رشتہ نہیں۔ شقاوت میں البتہ کوئی کمی نہیں اس لئے کہ یہ حق میں نے خود ان کو دیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ بحیثیت مجموعی ان کی حیثیت کچھ جیلر کی سی ہے اور یہ خاکسار ایک قیدی کی زندگی

رہا ہے۔ جب جی چاہتا ہے اس قید کو قید محض بنا دیتے ہیں جب جی
اہے قید با مشقت بنا دیتے ہیں۔ ہر نفس پر ایک احتساب، ہر قدم
ے روک ٹوک۔ رات سینما چلے گئے تو صبح بیٹی ہوگئی " سینما گئے تھے
شریفانہ اطوار نہیں ہیں۔ یہی پرچھائیاں دیکھ دیکھ بڑے بڑے شریف
ے تباہ ہوئے ہیں۔ ابھی سینما دیکھتے ہو۔ پھر فلم کے گیت گنگناؤ گے
ں کے بعد غسل خانہ میں گاؤ گے۔ خدا نخواستہ اگر اسی طرح گانے کا شوق
لیا تو زندگی طبلہ اور ہارمونیم بن کر رہ جائے گی اور اگر یہ بھی نہ ہوا تو فلمی
کاروں کی ادائیں اپنے میں جذب کرو گے۔ ان کے فیشن اختیار کرو گے
ن کی طرح بال بڑھاؤ گے۔ ان کی طرح سیٹی بجاؤ گے۔ ان کی طرح لباس
پہنو گے اور یہ سب کچھ نہ بھی سہی تو یہ کونسا شریفانہ طریقہ ہے کہ رات کو
یک بجے گھر آرہے ہیں۔

لیجئے سینما بند۔ طے کیا کہ کتب بینی تو بری چیز نہیں ہے اس پر تو
اعتراض نہ ہوگا۔ ایک خوش مذاق انسان کتابیں پڑھ کر بھی سینما دیکھ سکتا ہے
کتاب ہاتھ میں لئے بستر پر لیٹے ہیں سرہانے ٹیبل لیمپ جل رہا ہے گھڑی
ٹک ٹک کر رہی ہے۔ رات کا سناٹا ہے کہ یکایک ان کی آواز دیوار پھاند کر
بلکہ دیوار توڑ کر آئی۔ میاں ایک بج رہا ہے۔ اب تو بتی بند کر دو۔ بھلا غضب
خدا کا اس مرتبہ بجلی کا بل سولہ روپیہ کا آیا تھا۔ رات رات بھر جلے گی بتی تو
ظاہر ہے کہ اتنا ہی بل ہوگا۔ لیجئے کتب بینی کا شوق بھی پورا ہو گیا۔
ارادہ کیا کہ ریڈیو سنا کریں گے۔ مگر ریڈیو لگانے کے دوسرے ہی دن
خاص طور پر پیشی میں طلب کیا گیا اور دو گھنٹہ تک ریڈیو کی مضرت
رسانیوں پر وہ دھواں دھار تقریر ہوئی کہ بجائے ریڈیو کے دماغ بجنے
لگا۔ اس تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ برخوردار یہ ریڈیو اور گراموفون قسم کی چیزیں
وہ ہیں جو تدریجی زہر کی طرح انسان کو رفتہ رفتہ ختم کر دیتی ہیں فی الحال تو تم
صرف ریڈیو سنتے ہو مگر تم کو نہیں معلوم کہ یہی شوق اگر ترقی کر گیا تو ریڈیو
سنایا بھی کرو گے، ریڈیو اسٹیشن جانے لگو گے وہاں سے گاؤ گے اور دنیا
تمہارا گانا سنے گی اور فرض کر لو کہ نہ بھی گائے جیسا کہ تمہاری آواز سے ظاہر
ہے تو بھی یہ کیا بعید ہے کہ کچھ بولنے لگو مطلب یہ کہ ریڈیو اسٹیشن کی چاٹ
اگر پڑ گئی تو گانا نہ سہی رونا تو جانتے ہی ہو۔ دوسری بات یہ کہ میں نے اپنے
بچوں کو پال کے آموں کی طرح پروان چڑھایا ہے۔ میرے بچوں کو یہ گانے
بجانے کا شوق کبھی پیدا نہیں ہوا اور پیدا اس لئے نہیں ہوا کہ میں نے انکے
کان میں گانے کی آواز نہ پہنچنے دی۔ البتہ اب تمہاری وجہ سے میری بڑی
بچی نے بھی غزل گنگنا رہی تھی جو کل ریڈیو میں سنی تھی خیر اس سے تو میں نے
کہہ دیا ہے کہ بندوق صاف کر کے رکھو تاکہ اب کبھی جب تم گنگناؤ تو میں
ایک کارتوس تم پر بھی قربان کر دوں۔ مگر اب تم سے کہتا ہوں کہ یہ ڈھنگ
شریف ہمسایوں کے نہیں ہوتے۔ تم تو بجاؤ گے۔ یہ نامعقول ریڈیو اور
راستہ چلتے اس کی آواز سن کر یہ سمجھیں گے کہ اس مکان میں کوئی صاحبزادی
موسیقی کا شوق پورا کر رہی ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ اس گھر میں یہ نہ ہو سکے گا اور
اگر آپ کو اس کا ایسا ہی شوق ہے تو کوئی اور مکان تلاش کر لیجئے۔

لیجئے ریڈیو بھی ختم۔ سوال یہ ہے کہ آخر آدمی کرے کیا۔ یہ پہاڑ سی
زندگی، یہ غریب الوطنی کی تنہا زندگی کیسے گزرے۔ گھر سے باہر رہیں تو
آوارہ گرد۔ گھر میں رہیں تو ریڈیو نہ بجائیں۔ کتب بینی نہ کریں اور تو اور اگر
کبھی کوئی دوست ملنے آگیا تو اس کے متعلق تحقیقات شروع ہوگئی کہ یہ
کون ہے کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے کیا مشاغل ہیں۔ کتنی مرتبہ سزا
پا چکا ہے۔ اس شخص کے سر کون کون سے جرائم تھوپے جا سکتے ہیں اور
جب اس تحقیقات کے باوجود وہ بے چارہ بے قصور نکلا تو بھی شک و شبہ
کی توسیع کی ایک نکتہ نے کافی گنجائشیں مہیا کر رکھی ہیں کہنے لگے۔ بھئی
یہ کل جو صاحب تشریف لائے تھے تمہارے پاس کچھ غلط قسم کے آدمی
نظر آئے مجھے، ایک تو ان حضرت نے دروازہ اتنی زور سے بجایا کہ میں دروازہ
ہی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ تم کو شاید معلوم نہیں کہ میں نے یہ مکان کس
ارمانوں کے ساتھ بنایا ہے اور اس مکان کے در و دیوار سے مجھ کو کیسا
قلبی تعلق ہے وہ حضرت دروازہ بجا رہے تھے اور میرا دل دھڑک رہا تھا
اب نکلے اس غریب دروازہ کے قبضے اور اب گرا یہ چرچرا کر۔ پھر یہ کہ ان حضرت
کا حلیہ جو دیکھا میں نے تو لچوں باشوں کی سی صورت تھی۔ یہ ہیں کون
نہایت ادب سے عرض کیا۔ قبلہ یہ تو نہایت بزرگ خاندان
چشم و چراغ ہیں۔ حضرت نور اللہ مشرقی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے سے تعلق
رکھتے ہیں۔

کہنے لگے۔ دیکھئے نا وہی مثل صادق آتی ہے کہ دلی کے کوے
بھلا یہ اولیاء کے نام لیوا اور یہ سوٹ یہ ٹائی۔ یہ کالر مجھے تو کچھ بے دین

نظر آئے یہ حضرت۔ اور صاحب صاف بات یہ ہے کہ میرا گھر ٹھہرا جوان
جہان لڑکیوں کا گھر۔ آپ کو شریف دیکھ کر میں نے کرایہ دار بنا لیا ہے تو اس
کے معنی یہ نہیں کہ آپ کے یہاں ہر قسم کے لوگ بھی آنے لگیں۔ مجھے تو مستقل
یہ اندیشہ رہا کہ یہ شخص ضرور جرائم پیشہ ہے اور اب آتی ہوگی پولس اس کی
تلاش میں۔

ابھی ہم ان حضرت کو مطمئن کرنے کی کوشش کر ہی رہے تھے
کہ میز پر بکھرے ہوئے تاش دیکھ کر ایک دم بوکھلا گئے۔ یہ کیا تاش۔ تو یہ کہئے
کہ حضرت نور اللہ مشرقی رحمۃ اللہ علیہ کے یہ نام لیوا آپ ہے تاش کھیلتے تھے
تھے۔ گویا اب میرا مکان جوا خانہ بھی بن گیا۔ گویا اب پولیس کے چھاپے
پڑیں گے یعنی اب یہ بھی ہوگا کہ میں اس بڑھاپے میں کھنچا کھنچا پھروں گا
صاحب بخشئے مجھے۔ پھر پایا میں نے۔ میں مکان کے اس حصے کو اصطبل
بنا سکتا ہوں، مرغی خانہ بنا سکتا ہوں۔ مال گودام بنا سکتا ہوں۔ مگر یہ
نہیں ہوسکتا کہ آپ کے طفیل میں اس سفید کو ... سیاہی لگاؤں

عرض کیا قبلہ آپ ناحق بگڑ رہے ہیں شغل ... دو چار
بازیاں رمی کی کھیلی تھیں۔

بات کاٹ کر بولے۔ وہ میں سمجھ گیا۔ دو چار بازیاں ہی بازی بازی
بارش یا باہم بازی بن جاتی ہے۔ صاحب صاف بات یہ ہے کہ آپ کوئی
اور ٹھکانہ ڈھونڈ لیں میں دست بستہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

وہ حضرت تو یہ کہہ کر تشریف لے گئے۔ مگر واقعی ہم اس فکر میں ہیں
کہ اس طرح زندگی کیسے بسر ہو سکتی ہے کرایہ پر مکان ضرور لیا ہے۔ مگر
یہاں تو معلوم ہوتا ہے کہ کرایہ پر جیل کی ... کال کوٹھری لے لی ہے
مکان کے لئے ہر طرف مارے مارے پھرتے ہیں اور ہر شخص یہی کہتا ہے کہ مکان
تو خدا کے فضل سے آپ کے پاس موجود ہے۔ کاش خدا کا فضل ان ہی
احباب پر ہو جو یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم کو مکان کی ضرورت نہیں ہے بلکہ
تفریحاً مکان بدلنا چاہتے ہیں۔ ... ان غمگساروں کو کیسے سمجھائیں کہ
جس کو تم ہمارا مکان سمجھ رہے ہو خدا دشمن کو بھی ایسا مکان نہ دے
خانہ بدوشوں پر رشک آتا ہے فٹ پاتھ پر پڑے ہوئے خانماں بربادوں
کو حسرت سے دیکھتے ہیں اور اگر یہی رنگ رہا تو اس مکان کے نئے کرایہ دار
ہم کو بھی فٹ پاتھ پر رشک سے دیکھیں گے۔

(بشکریہ آرزو)

"اِفاداتِ مسیح الملک"

مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب مرحوم کا

مکمل دستور العلاج

سر سے پاؤں تک کثیر الوقوع بیماریوں کا بیان معہ تشخیص اور علاج حکایات کی
صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ قابل قدر اور مفید کتاب ہے۔ !

فی جلد تین روپیہ آٹھ آنے ـــــ حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی سے خریدیں!

دو انقلاب

(یہ دلچسپ تقابل ملاحظہ فرمائیے ۔ اور ترقی زدہ ادیبوں کی "امن کی اپیلوں" پر دستخط کرانے کی سرگرمی بھی مدنظر رکھئے ۔ اسرار الحق مجاز صدق دل سے اشتراکیت کے علمبردار ہیں اور نعیم صاحب کا اوڑھنا بچھونا "اسلام" ہے)

اشتراکی انقلاب!

اسرار الحق مجاز •

آرہے ہیں جنگ کے بادل وہ منڈلاتے ہوئے
کوہ و صحرا میں زمیں سے خون ابلے گا ابھی
بڑھ رہے ہیں دیکھ وہ مزدور دراتے ہوئے
سرکشی کی تند آندھی دم بدم چڑھتی ہوئی
ختم ہو جائے گا یہ سرمایہ داری کا نظام
گر پڑینگے خوف سے ایوانِ عشرت کے ستوں
خون کی بو لیکر جنگل سے ہوائیں آئیں گی!
جھونپڑوں میں خوں، محل میں خوں شبستانوں میں خوں
پرسکوں صحرا میں خوں، بیتاب دریاؤں میں خوں
خون کے دریا نظر آئیں گے ہر میدان میں!
ریگ صحرا پر نظر آئیں گے لاکھوں لالہ زار
خون سے رنگیں فضائے بوستاں ہو جائے گی
کوہساروں کی طرف سے سرخ آندھی آئے گی
حشر در آغوش ہو جائے گی دنیا کی فضا
سرخ ہونگے خون کے چھینٹوں سے بام و در تمام
اس طرح لے گا زمانہ جنگ کا خونیں سبق
اور اس رنگ شفق میں باہزاراں آب و تاب

آگ دامن میں چھپائے خون برساتے ہوئے
رنگ کے بدلے گلوں سے خون ٹپکے گا ابھی!
اک جنوں انگیز لے میں جانے کیا گاتے ہوئے
ہر طرف یلغار کرتی ہر طرف بڑھتی ہوئی!!
رنگ لانے کو ہے مزدوروں کا جوشِ انتقام
خون بن جائے گی شیشوں میں شرابِ لالہ گوں
خون ہی خوں ہو گا نگاہیں جس طرف بھی جائیں گی
دشت میں خوں، وادیوں میں خوں، بیابانوں میں خوں

. . . .

ڈوب جائیں گی چٹانیں خون کے طوفان میں
خون کی رنگینیوں میں ڈوب جائیگی بہار!
نرگس مخمور چشم خوں فشاں ہو جائے گی —!
جا بجا آبادیوں میں آگ سی لگ جائے گی —!
دوڑتا ہوگا ہر اک جانب فرشتہ موت کا
غرق ہوں گے آتشیں ملبوس میں منظر تمام!
آسماں پر خاک ہوگی فرش پر رنگِ شفق!
جگمگائے گا وطن کا حریت کا آفتاب

(ساز نو)

اسلامی انقلاب!

نعیم صدیقی

(۱)

جس روز قیادت بدلے گی
جب چور اچکے گھبرا کر
درباروں سے اٹھ جائیں گے
اسلام کا جھنڈا لہراتے
جب سچے خادم آئیں گے
بدکاروباری لوگ نہ ہوں
اخلاق سے عاری لوگ نہ ہوں
اغیار سے جو مسحور نہ ہوں
مرعوب نہ ہوں مجبور نہ ہوں
وہ جس دن آگے آئیں گے
وہ جس دن آکر چھائیں گے
اس دن ہی بندھن ٹوٹیں گے
اس دن ہی قیدی چھوٹیں گے
اس دن آزادی آئے گی
اور اپنے تحفے لائے گی!
تاریخ بہاؤ بدلے گی
رخ اپنا ناؤ بدلے گی
اس روز اجالے جاگیں گے
اس روز اندھیرے بھاگیں گے
جس روز قیادت بدلے گی

(۲)

وہ وقت نہ جبتک آپہنچے
اسلام کا کھلنا ناممکن
مقصود کا ملنا ناممکن
یاں رشوت ڈاکے ڈالے گی
یاں سانپ خیانت پالے گی
یاں شہوت نغمے گائے گی
عریانی ناچ دکھائے گی
مزدور آزاری بھی ہوگی
یاں مردم خواری بھی ہوگی
طبقے باہم ٹکرائیں گے
خونیں فتنے پھیلائیں گے
تبدیلی کا امکان نہیں!
امید کا کچھ سامان نہیں
وہ وقت نہ جبتک آپہنچے

(۳)

وہ وقت زیادہ دور نہیں
اک ہل چل ہے ایمانوں میں
اک بے چینی ہے جانوں میں
جذبات میں اک کھولاؤ ہے
تحریک نہیں آلاؤ ہے
آیات نئی آثار نئے!
احوال نئے افکار نئے
تبدیلی کا پیغام لئے
اتریں گے فرشتے گردوں سے
وہ وقت زیادہ دور نہیں

(۴)

جس روز قیادت بدلے گی
اس دن ہی بندھن ٹوٹیں گے
اس دن ہی قیدی چھوٹیں گے
جس روز قیادت بدلے گی

(چراغ راہ)

ماہرالقادری •

پیام

(جمعیۃ علماء پاکستان (سندھ) نے حضرت سید امین الحسینی مفتی اعظم فلسطین اور دوسرے عرب زعماء اور اسلامی ممالک کے مندوبین کو عصرانہ دیا تھا، یہ نظم اسی اجتماع میں خود شاعر کی زبان سے سنی گئی!)

اسلام کی تاریخ ورق لوٹ رہی ہے　　ہیں ایک ہی مرکز پہ عرب اور عجم بھی

آنسو ہیں جو یکرنگ تو آہیں بھی ہم آہنگ　　کشمیر کا ہے درد فلسطین کا غم بھی

تقریر میں یہ جوش، یہ الفاظ کی گرمی　　جب اتنا ہوا ہے تو پھر اٹھ جائیں قدم بھی

دنیا کی قیادت کی سزاوار ہے وہ قوم　　جو اُمّتِ وسطیٰ بھی ہے اور خیرِ اُمم بھی

تقدیرِ الٰہی ہیں مسلماں کے ارادے　　شاہد ہیں مہ و مہر بھی اور لوح و قلم بھی

وہ دل نہیں شایستۂ توحید کہ جس میں　　افکار کے بُت بھی ہوں خیالوں کے صنم بھی

عزّت کے نشاں شوکت و اقبال کے سائے
گزرے تھے اسی راہ گزر سے کبھی ہم بھی!

"فاران"

اشم میرزا

پچھتاوے

عصر کی نماز کے بعد حاجی قادر بخش واپس مکان پر آگیا، بوڑھی نوکرانی فقیراں کو اس کے اتنے جلدی آنے کی کوئی امید نہ تھی اسے یقین تھا کہ اگر جلدی بھی آیا تو نو بجے سے پہلے نہ آئیگا چھٹی کے دن حاجی قادر بخش جمعہ کی نماز پڑھنے کی خاطر گھر سے نکلتا تھا اور پھر دوستوں کے پروگرام اس کے دل سے گھر کے خیال کو مٹا دیا کرتے تھے۔ جمعہ کے دن شام کو کھانا بھی وہ کسی دوست کے ہاں کھا لیا کرتا تھا اور فقیراں کو اس شام جھڑکیوں سے نجات مل جاتی تھی، کتنی مدت ہوگئی تھی اسے اس گھر میں کام کرتے ہوئے، اور کوئی دن بھی ایسا نہ گزرا تھا۔ جبکہ اسے قادر بخش کی سخت کلامی سے واسطہ نہ پڑا ہو۔ اس کے علاوہ دوسرے نوکروں کو بھی اس کی جھڑکیاں سہنے کی عادت ہوگئی تھی اور یہی وجہ تھی کہ جب وہ اکٹھے ہوتے تھے تو یہاں سے بھاگنے کی کوئی اسکیم بنانے کے بجائے ہنس کر کہا کرتے تھے "بڈھا پاگل ہوگیا ہے اسے بکنے دو۔ ہمارا کیا بگڑ جاتا ہے"۔

قادر بخش اپنے کمرہ میں آکر پلنگ پر لیٹ گیا۔ پگڑی اس کے سر کے نیچے دب گئی تھی اور اسے پاؤں سے پمپ شو اتارنے کا بھی خیال نہ رہا تھا۔ فقیراں نے ڈرتے ہوئے اندر جھانکا۔ اور پھر وہ جلدی سے باورچی خانہ میں آکر آلو چھیلنے لگی۔ قادر بخش کی بیوی اپنی سہیلی کو ملنے گئی تھی اور اس کا بیٹا اور بیٹی دونوں میٹنی شو دیکھنے چلے گئے تھے آج کسی کو بھی گھر پر کھانا نہ کھانا تھا۔ فقیراں اور دو نوکر گھر پر تھے اور فقیراں نے اسی لئے ابھی آگ بھی نہ جلائی تھی۔ قادر بخش کو دیکھکر اس پر گھبراہٹ سوار ہوگئی تھی ——— لیکن قادر بخش کو اس وقت بھوک کا ذرا بھی احساس نہ تھا۔ اس کا ذہن تو اس وقت ایک نئی سوچ میں تپ رہا تھا۔ اس کی زندگی کو ایک شدید جھٹکا لگا تھا اور اس کے اثرات ابھی تک اس کی روح کو لرزا رہے تھے وہ شہر کا ایک مشہور تاجر تھا، ہر جگہ اس کی عزت تھی اور کاروباری ہیرا پھیری کے باوجود بھی وہ اپنی نمازوں کی بدولت ایماندار سمجھا جاتا تھا۔ یہ تو اس کے خاص دوست ہی جانتے تھے کہ عوام کا خون چوسنے کی خاطر کتنی دلیری سے وہ بلیک مارکیٹ کے اسٹیج پر اپنا پارٹ ادا کیا کرتا ہے لیکن غریب عوام تو اسے مسجد سے نکلتے دیکھکر دعائیں مانگا کرتے تھے کہ اے باری تعالیٰ سب لوگوں کو اس جیسا بنا دے! وہ کھو کھلے خول کے خوش رنگ نقش و نگار کو دیکھکر ہی خوش ہو جایا کرتے تھے، انہیں اندر کی طرف لپی ہوئی کالک کا حال معلوم نہ تھا اور جب سے قادر بخش حج کر آیا تھا۔ اس وقت سے اس کی عزت اور بڑھ گئی تھی۔ وہ خوش تھا کہ اس کی عیاریوں پر ایک اور دبیز پردہ پڑ گیا ہے۔ لیکن آج جمعہ کی نماز کے بعد اس کے نظریوں میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ اور وہ ایک تلخ ندامت کے ساتھ انہیں جلتے ہوئے دیکھ رہا تھا اب اس میں اتنی ہمت نہ رہی تھی کہ وہ اپنے آپ کو مزید دھوکا دینے کی خاطر اس آگ کو بجھانے کی کوشش کرے اور نظریوں کے جھلسے ہوئے چہروں کو پھر سے سنوار دے اگر وہ اپنے محلہ کی مسجد کے بجائے شہر کے دوسرے سرے پر بڑی مسجد میں نماز جمعہ پڑھنے نہ جاتا تو شاید آج اتنی شدت سے اپنی گمراہیوں کو محسوس نہ کرتا اور ماضی کے پچھتاوے حال کے تازیانے نہ بنتے۔ اپنے ایک نئے دوست کے اصرار پر وہ بڑی مسجد میں اس کے ساتھ چلا گیا تھا۔ محلہ کی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھتے وقت اسے کبھی خیال نہ گزرا تھا کہ ذخیرہ اندوزی اور سود کا کاروبار اسے اسلام سے بہت دور لے جا رہے ہیں اور ماتھے پر چمکتے ہوئے سجدوں کے نشان کے باوجود وہ جہنم کی آگ

میں اپنی جگہ محفوظ کر رہا ہے ۔ محلہ میں زیادہ تعداد اس جیسے تاجروں کی تھی ، اس لئے امام مسجد نے کبھی جرأت نہ کی تھی کہ وہ ان تاجروں کا نمک کھا کر ان کے کاروبار کے خلاف زہر اگلے وہ تو عموماً نماز ادا کرنے کے طریقوں اور بزرگوں کی کرامات کے قصوں کو ہی دہراتا رہتا تھا اور نمازی سمجھتے تھے کہ بس یہی اسلام ہے اور زندگی کے دوسرے مسائل میں ، اسلام کا کوئی دخل نہیں ۔ لیکن آج بڑی مسجد میں قادر بخش کے سامنے ایک نیا فارمولا پیش کیا گیا تھا ۔ اور فارمولا ابھی تک اس کے ذہن میں گونج رہا تھا ۔ " اے لوگو ! جو ایمان لائے ہو ، پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ ! " یہ فارمولا اس کے لئے نیا بھی تھا اور عجیب بھی ! " پورے کے پورے " کا مطلب اس پر واضح ہو گیا تھا ۔ اس کے سینے میں نیزے کی تیزانی کی مانند کوئی چیز چبھ رہی تھی اور اس کی روح ایک اذیت ناک بوجھ تلے دبی جا رہی تھی ۔ اس کے سامنے اب یہ حقیقت روشن ہو گئی تھی کہ وہ انسان جس کا نام ابراہیم احمد یا خدیجہ تسنیم ہو اور جو بات کرتے وقت امریکیوں جیسا لب و لہجہ اختیار کرے ، لباس پہنتے وقت فرانس کی عریانی کو پیش نظر رکھے سوچتے وقت اشتراکی فلسفہ اس کے ذہن میں گھس جائے اور کاروبار کرتے وقت یہودیوں اور بنیوں کی پیروی کرے وہ اسلام سے بہت دور ہے ، وہ چاہے کتنے ہی بلند بانگ دعووں سے اپنے مسلمان ہونے کا دعوےٰ کرے لیکن وہ اس وقت تک سچا انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا جب تک وہ پورے کا پورا اسلام میں داخل نہ ہو جائے چھت پر ٹکٹکی باندھے وہ اپنے ماضی کا جائزہ لینے لگا ، اخوت ، رحمدلی بشرافت اور انسان دوستی کی کوئی کرن اسے ماضی کے اندھے غار میں نظر نہ آ رہی تھی ۔ وہاں تو فریب ، مطلب پرستی ، خود غرضی اور انسان دشمنی کے جالے تنے ہوئے تھے اور ایک سڑاندسی اٹھ رہی تھی ۔ جس نے اردگرد کے ماحول کو بھی متعفن بنا دیا تھا ...... اور اس کے دوسرے اعضا اس کی زندگی کے فریب ، مطلب پرستی ، خود غرضی اور انسان دشمنی کی شہادتیں دے رہے ہیں اس کی آنکھوں میں جیسے کسی نے مرچیں ڈال دی ہوں ۔ زبان کو دانتوں میں دبا کر لمبی " سی " کی آواز کے ساتھ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اس کی روح پر پڑا ہوا بوجھ اور بڑھ گیا .... وہ ایسے سانس لینے لگا جیسے کوئی پیٹ کر ادھموا ہو جائے ...... اس کے شعور میں ان سنگین واقعات کا ایک تانتا بندھ گیا جنہیں اس نے اپنے زہد و تقویٰ کے دامن میں پرورش کیا تھا اور جن کی بدولت وہ آج سے پہلے بہت مسرور تھا ۔ آنکھوں کے تاریک کونوں میں شعلوں کی لمبی لمبی زبانیں ناچنے لگیں اور پھر کرم چند کا چہرہ ابھر آیا ...... اسکا بہت عزیز دوست جس کو اس کی پرہیزگاری نے بہت متاثر کیا ہوا تھا ۔ اور جو آزادی سے پہلے خونی قہقہوں کو ، زخمی سسکیوں کو بے دردی سے لگتے دیکھکر بہت پریشان ہو گیا تھا ، وہی کرم چند اب اس کے سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا ۔

" قادر بخش جی ! کیا یہی اسلام کی تعلیم ہے کہ کسی بے بس انسان کو اپنی شرافت کے دکھاوے میں جکڑ کر اس کی زندگی اور دولت کو لوٹ لو !
میں نے تم پر بھروسہ کیا تھا اور اپنی دولت لیکر تمہارے پاس امن کی تلاش میں آگیا تھا اور تم نے ثابت کر دیا کہ مسلمان کسی مظلوم کو پناہ نہیں دے سکتا ۔ میں نے اپنی سب دولت تمہارے سپرد کر دی تھی اور تم نے ثابت کر دیا کہ امانت دبا کر حقدار کا گلا گھونٹ دینا ہی انسانیت ہے .....
قادر بخش جی ! کچھ تو جواب دو ؟ میری بیوی اور بچے جنہیں میں نے بہت پہلے اپنے بھائی کے پاس سرحد کے اس طرف بھیج دیا تھا اب تک میرا انتظار کرتے ہونگے وہ بھلا کیسے یقین کر سکتے ہیں کہ تم جیسا دیندار انسان ان کی خوشیاں چھین سکتا ہے "

قادر بخش نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور دہشت زدہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا ۔ جیسے اسے یقین ہو گیا ہو کہ اسکے پرانے مکان کی تاریک کوٹھری میں دفن کی ہوئی کرم چند کی لاش

ایک انتقامی جذبے کے ساتھ دروازے کے سبز پردے میں پیچھے
کھڑی ہے۔" پروردگار۔ میری توبہ" وہ بڑبڑانے لگا
"کرم چند جی مجھے معاف کردو۔ میں بہت بڑا گنہگار ہوں اس
میں اسلام کا کوئی دوش نہیں۔ اس کے پیش کردہ اصول تو
دنیا سے ظلم اور باطل کو مٹانے کے لئے نازل ہوئے ہیں وہ تو
مظلوم کی خاطر جان کی بازی لگا دینے کی تلقین کرتے ہیں، سرکش
باغیوں کی رحم کی درخواست کو بھی رد کرنیکا حکم نہیں دیتے!
وہ بس میرا قصور تھا، میں ہی انسانیت کی مسند سے نیچے گر پڑا
تھا۔ یہ بھول گیا تھا کہ میں ان جیسے انسانوں کا پیرو کار ہوں
جنہوں نے فتح مکہ کے بعد خطرناک دشمنوں کو بھی معاف کر دیا
تھا۔ مجھے معاف کرو کرم چند جی، اور اس نے کپکپاتی انگلیوں
سے منہ ڈھانپ لیا۔ انگلیوں کے سوراخوں میں سے دروازے
کی طرف دیکھتے ہوئے اسے یوں دکھائی دینے لگا۔ جیسے محلے کے
نوجوان لوٹے ہوئے مال کی گٹھڑیاں اٹھائے اس کے پاس آرہے
ہیں اور وہ سینکڑوں کا مال کوڑیوں میں خرید کر اپنا گودام
بھر رہا ہے اور انہیں ابھار رہا ہے کہ وہ بچے کھچے مکانوں اور
دکانوں میں کوئی چیز باقی نہ رہنے دیں۔ سب کچھ لوٹ کر اسکے
پاس لے آئیں، انہیں عیاشی کرنے کیلئے روپیہ ملے گا....
.... اس نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔ پپوٹے بوجھل
ہوگئے تھے اور نتھنوں سے آگ نکل رہی تھی اس نے کروٹ
بدلی۔ اور اب اس کی بند آنکھوں میں تباہ حال قافلے رینگنے
لگے تھے۔ قافلے کیمپوں میں بکھر رہے تھے اور وہ امدادی پروگرام
کے تحت چندہ اکٹھا کر رہا تھا، کیمپوں میں غلاظت پھیل رہی تھی
اور اس کی تجوری چندہ کی رقم سے بھرتی جا رہی تھی، شہر میں
اس کی سخاوت کے چرچے ہونے لگے اس نے کئی دیگیں سلونے
چاولوں کی کیمپوں میں بھیجی تھیں۔ لیکن اس کی تجوری اسی طرح
بھری ہوئی تھی اور بھوکے ننگے لوگ رخساروں کی ابھری ہوئی
ہڈیاں اور پچکے ہوئے پیٹ دکھا کر التجائیں کر رہے تھے ---
حضور ---- تجوری میں بند دولت آپکے کسی کام نہ آئے گی
وہ آپ کی زندگی کا ایک لمحہ بھی نہیں بڑھا سکتی۔ ہمارا حق ہمیں
دیدو ہمارے ننھے معصوم بچے حالات کے خونی موڑوں سے بچ کر
نکل آنے کے باوجود بھی بلک رہے ہیں۔ ہماری باحیا کنواری
لڑکیاں حادثات کے وحشی چکر سے بھاگ بھی شرم سے سر نہیں
اٹھا سکیں۔ بھوکے بچوں کی بلبلاہٹ پر ہی کچھ ترس کھاؤ، پھٹے
پرانے کپڑوں میں سہمی ہوئی باحیا کنواریوں کا ہی کچھ خیال کرو
اور قادر بخش اس چوٹ کو برداشت نہ کرتے ہوئے اٹھ کر
بیٹھ گیا۔ اب وہ گھٹنوں میں سر دبائے سسکیاں بھر رہا تھا "مجھے
کیا ہو گیا تھا، میں اتنا سنگدل کیوں بن گیا تھا میں یہ کیوں
بھول گیا تھا کہ مکہ کے مہاجرین کو مکہ کے انصار نے اپنے سگے
بھائیوں سے زیادہ عزت بخشی تھی۔ اور انسان دوستی اور بھائی چارہ
کی ایسی مثال قائم کی تھی کہ تاریخ کے اوراق اس سے پہلے کبھی ایسی
مثال سے روشناس نہ ہوئے تھے ---- لیکن ---- میں تو
مظلوم انسانوں کے زخمی جسموں پر سے پھٹے پرانے کپڑے بھی نوچ
لینا چاہتا تھا، ان کی اشک آلود آنکھوں میں ابھرے ہوئے
مستقبل کے خوشرنگ عکس کو بھی مٹا دینا چاہتا تھا۔ میرے سامنے
بھوک سے بلکتے ہوئے معصوم بچے ماں باپ کے دلوں میں گہرے زخم
پیدا کرکے موت کا لقمہ بنتے رہے باحیا کنواریاں کھلے اور تنگ
بازاروں میں بھٹک بھٹک کر عصمتیں لٹاتی رہیں اور میں دیکھتا
رہا، اور خوش ہوتا رہا، کیونکہ میری دولت میں اضافہ ہو رہا تھا
میں نے شہر سے باہر عالی شان مکان خرید لیا تھا اور میرا کاروبار
خوب چل رہا تھا۔ کاش! میں ایک ریاکار تاجر کے بجائے ایک
غریب اور صحیح مسلمان ہوتا اور خود بھوکا رہ کر اپنے حصہ کی روٹی
فاقہ زدہ انسانوں کو پیش کر سکتا!" گہرا سانس بھر کر اس نے
سر اٹھایا اور اسے محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے کان کے نزدیک
موٹر کا ہارن زور سے بجا کر قہقہے لگا رہا ہے اور پھر قہقہے [illegible]
بن گئے۔ اور ان کا مفہوم اس کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے
کی مانند رینگنے لگا ---- "قادر بخش جی! پیشانی پر چمکتا
سجدوں کا نشان تو کاروبار میں تمہارا بہت مددگار ثابت ہوتا

حاجی صاحب! آپ جانتے ہی ہونگے۔ مکہ کے بازار میں ایک اجنبی نے جب تمہاری بیٹی کے ننگے سر اور نیم عریاں سینے کی طرف اشارہ کرکے پوچھا تھا کہ یہ کہاں کے باشندے ہیں اور میں نے جب سب سے بڑی اسلامی مملکت کا نام لیا تھا تو اس اجنبی کی آنکھیں عزت سے جھک گئی تھیں قادر صاحب! آپ کو شاید اس بات کا احساس نہ ہوا ہو۔ لیکن میں تو برابر اس بات کو نوٹ کر رہا تھا کہ صبح کے وقت جب سب لوگ "لبیک" پکارتے تھے تو آپ کے منہ سے "بلیک" کی آواز نکلتی تھی!" سر کو زور سے جھٹک کر وہ دیوانوں کی مانند کمرہ کی چیزوں کو گھورنے لگا۔ اس کی نظریں گروپ فوٹو پر پہنچ کر رک گئیں اور وہیں پر جم کر رہ گئیں۔ اس کی بیوی مسکرا رہی تھی اس کے بیٹے اور بیٹی کے چہرے بھی کھلے ہوئے تھے اور وہ خود بھی بہت مسرور نظر آ رہا تھا نئے مکان میں آنے کے بعد یہ گروپ فوٹو اتروایا گیا تھا۔ اس وقت اس نے کار بھی خرید لی تھی اور بیٹا اور بیٹی ایک ساتھ کالج میں پڑھنے لگے تھے .... فوٹو کی طرف دیکھتے اسے یہ محسوس ہوا جیسے اس کی بیٹی فوٹو سے نکل کر اس کے قریب آ گئی ہے اور اس کے گلے میں باہیں ڈال کر کہہ رہی ہے ——

"اباجان! آج میں رات کو واپس نہ آ سکوں گی۔ کالج کے ڈرامے میں مجھے ہیروئن کا پارٹ ادا کرنا ہے اور اب میں اپنی سہیلی ڈورس کے گھر اس کے استاد سے رقص سیکھنے جا رہی ہوں" اور اس کا بیٹا بھی اچھل کر اس کے پاس آ گیا —— "اباجان! وہ ناظمہ ہے نا۔ وہی نیلی آنکھوں والی لڑکی جسے آپ نے ایک دن میرے ساتھ سینما ہال میں دیکھا تھا۔ آج اس نے پکنک کا پروگرام بنایا ہے۔ اس کی دو خالہ زاد بہنیں بھی ہونگی اور میرے دوست خالد اور اکبر بھی جائیں گے، بہت حسین پروگرام ہے!" —— اور قادر بخش کا سر چکرا گیا سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا ——

"یہ میرے گھر میں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ میں اپنی جنسی آوارگیوں کی حوصلہ افزائی کر رہا ہوں۔ جنہوں نے یونان اور روم کی تہذیب کو گمنامی کی ہولناک گھاٹیوں میں پھینک دیا تھا جن کی بدولت آج بھی یورپ کی تہذیب ہلاکتوں کا لقمہ بن رہی ہے حرامی بچوں کی پیدائش میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے طلاق کی وارداتوں کا اندازہ لگانا مشکل ہو گیا ہے .... میں ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھنے لگا تھا، میں بھٹک گیا تھا، مولا کریم! میری توبہ!" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا، اس کی گردن کا متکبرانہ اکڑاؤ ختم ہو چکا تھا، اس کی چال اپنی ظالمانہ سختی کو بھول گئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ پاؤں اٹھاتا کمرہ میں ٹہلنے لگا۔ اس کی ذہنی تپش میں ذرا بھی فرق نہ پڑا تھا اور دل خوف خدا سے کانپ رہا تھا۔ الماری کے آئینے کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔ آنکھیں پھاڑ کر اس نے آئینے میں دیکھا۔ اسے اپنا چہرہ نظر نہ آتا تھا، وہ کوئی اور ہی چہرہ تھا۔ بہت دن پہلے اس نے محلے سے باہر نکلتے وقت دیکھا تھا۔ اور آج بھی اسے بڑی مبہم سی دکھائی دیا تھا وہی سفید داڑھی اور مسکراتی ہوئی گندمی رنگ کی جھریاں اور آئینہ میں ابھرا ہوا چہرہ التجا کرنے لگا۔ "حاجی صاحب میں آپ سے کچھ مانگنے یا آپ کو کسی قسم کا لالچ دیکر آپکے ضمیر کا خون کرنے نہیں آیا ہوں۔ میں تو صرف یہ عرض کرنے آیا ہوں کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ بھوکے، ننگے عوام خوشحال ہو جائیں لٹے پٹے مہاجر اپنی کھوئی ہوئی مسرتیں پھر حاصل کر لیں اور ظلم اور باطل کی قوتوں کا جادو ٹوٹ جائے تو آپ اپنا ووٹ اس انسان کو دیں — جو ایمان دار صالح ہو۔ جس کا دل خوف خدا سے معمور ہو جو چمکیلی کاروں میں بیٹھ کر اونچے ہوٹلوں میں دعوتیں اڑانے کی بجائے بیمار اور تنگدست لوگوں کی جھونپڑیوں میں جا کر ان کے دکھوں کو دور کرنے کی جد و جہد کرے جو اس لئے پیٹ بھر کر کھانا نہ کھائے کہ کہیں اس کی مملکت میں کوئی بھوکا نہ رہ گیا ہو"! —— اور پھر وہ چہرہ غائب ہو گیا اور اس کا اپنا چہرہ ابھر آیا، ماتھے پر تیوری، آنکھوں میں حقارت اور آواز میں تکبر۔ "ہوں! بڑا آیا مسلمان بن کر، میں نے تم جیسے ایجنٹوں کی بہت کہانیاں سنی ہیں۔ یوں کیوں نہیں کہتے

تمہیں اسمبلی میں بھیج دیا جائے۔ مولانا تم مسجد دل ہی میں اچھے لگتے ہو۔ اسمبلی کے خواب دیکھنا چھوڑ دو کہیں بدہضمی نہ ہو جائے!"
اسے یوں محسوس ہوا جیسے چھت اس پر گر پڑی ہے اور وہ ملبے میں دبا رک رک کر سانس لے رہا ہے " اف! میں پاگل ہو جاؤں گا۔ آج میں جان گیا ہوں کہ اس انسان کے الفاظ میں کتنی صداقت تھی۔ عوام کو ابھی تک وہی انگریزی قوانین دبوچے ہوئے ہیں۔ اسلام کے اصولوں کو اپنی خواہشات کے سانچے میں ڈھالکر اغراض پوری کی جا رہی ہیں، غریب کی عزت کس طرح لٹ رہی ہے، ظالم کا ہاتھ بدستور کوڑے برسا رہا ہے۔ آہ! اگر میں اپنے ووٹ کو اسلام کے لئے وقف کر دیتا، تو آج زبان پر پہرے نہ بیٹھے ہوتے، لسانی تعصب کی آڑ میں ملک اغیار کے ہاتھ بیچ دینے کی سازش نہ کی جاتی، حق کی آواز کو مذہب کی بڑ سمجھ کر اس کا مذاق نہ اڑایا جاتا!"

نیچے کسی نے گھنٹی کا بٹن دبایا اور تیز سنسناہٹ کمرہ میں پھیل گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد نوکر نے پردہ سرکا کر اندر جھانکا اور ڈرتے ہوئے بولا۔ "حضور!— آں کیا بات ہے؟"

قادر بخش چونک پڑا اور نوکر کی طرف شفقت بھرے لہجے میں بولا "کہو بیٹا! کیا بات ہے؟" اور نوکر اس کے لہجے کی نرمی اور پیار کو محسوس کر کے حیران رہ گیا۔ نظریں جھکا کے اس نے کہا۔ "وہ آپ کے دوست سیٹھ رحمت الٰہی صاحب آئے ہیں۔" اور ایک دم قادر بخش کی پیشانی پر نفرت کی شکنیں پڑ گئیں اور آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ "اچھا سیٹھ صاحب آئے ہیں!" وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "جاؤ بیٹا! ان سے جا کر کہہ دو۔ حاجی قادر بخش مر چکا ہے اور اب ایک نئے قادر بخش نے جنم لیا ہے —— جس کے دل میں خدا کا خوف اور انسان کی محبت ہے اور جو اب لوگوں کو اپنے زہد و تقویٰ کے جال میں پھانس کر کبھی لوٹنے کی ہمت نہ کریگا۔ ہاں۔ ایسے ہی کہنا" اور جب نوکر نے پردہ گرا دیا تو قادر بخش کو محسوس ہوا کہ اس کی روح نے اذیت ناک بوجھ کو پھینک دیا ہے۔ اس کی ذہنی تپش مٹ گئی ہے اور کمرہ کی ہر چیز اسے نئی زندگی پانے پر مبارکباد پیش کر رہی ہے۔

(حلقہ ادب اسلامی لاہور میں پڑھا گیا)

(بشکریہ کوثر)

حاذق نروائن پلز (حب خاص)

ایک جنرل ٹانک ہے جو عصبی اور دل و دماغ کی کمزوریوں کا مجرب علاج ہے یہ گولیاں دماغی کام کرنیوالے حضرات یعنی وکیل، بیرسٹر، پروفیسر اور طالبعلم صاحب کے واسطے آبحیات کا کام دیتی ہیں اور جسم انسانی کی جملہ عصبی کمزوریوں کو بحال کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں! دوا خانہ ھذا کے خاص مجربات میں سے ہیں۔ خوراک ۱۰ یوم ۲۰ گولی ۲ روپے۔

حاذق دواخانہ، بندر روڈ، کراچی نمبر ۱

احمد ندیم قاسمی

بحضورِ اکرم صلعم

امتیازات مٹانے کے لئے آپ آئے — ظلم کی آگ بجھانے کے لئے آپ آئے
آدمیت سے تھا محروم گلستانِ حیات — اور یہ پھول کھلانے کے لئے آپ آئے
قیصریت تھی اِدھر اور اُدھر اصنام گری — ان فصیلوں کو گرانے کے لئے آپ آئے

•

آپ آئے تھے کہ آتشکدہ عالم میں — امن ہو، حُسن ہو، تہذیب ہو، رعنائی ہو
آپ آئے تھے کہ انسان کا دل یوں کوندے — جس طرح چاندنی چشمے میں اُتر آئی ہو!
اجنبیت ہو کچھ اس رنگ سے بالیدہ و نرم — کہ ہر انسان ہر انسان کا شیدائی ہو

•

آج انسان کی پہچان ہوئی ہے دشوار — آج تقدیس کا معیار زر اندوزی ہے
آج تہذیب کے پردے میں ہے انسان کشی — امن کے نام پہ تدبیرِ جہاں سوزی ہے
جنگ ہوتی ہے تو یاروں کے چمن کھلتے ہیں! — خوں کی چھینٹوں پہ گمانِ چمن افروزی ہے

•

آج تعلیمِ مساوات ہے وہ جُرمِ عظیم — جس کی پاداش میں کٹتی ہیں زبانیں کتنی
آج موجوں پہ بھی قانون کی زد پڑتی ہے — خوفِ تعزیر سے رُکتی ہیں اڑانیں کتنی
ایک لقمے کے لئے آج کروڑوں بھوکے — ہاتھ اٹھاتے ہیں تو تنتی ہیں کمانیں کتنی

•

آپ کے سامنے کرتا ہوں یہ اعلان کہ میں — حق پرستی سے جو باز آؤں تو فنکار نہیں
آپ کے دامنِ رحمت کا سہارا ہے مجھے — میں حکومت کی عنایت کا طلبگار نہیں
میرے جمہور کی دولت ہیں یہ دشت و کہسار — میرے جمہور کا گھر سایۂ دیوار نہیں

•

قافلے نکلے ہیں، قصدِ چمن آرائی ہے — یہ وہ انسان ہیں جو دل سوختہ و لب دوختہ ہیں
آپ ہی قدر کریں، آپ ہی انصاف کریں — فقط احساس کی بیداریاں اندوختہ ہیں
اُن کے ہونٹوں سے برستے ہیں مساوات کے گیت — اور محلوں میں شہنشاہ برافروختہ ہیں

نذر فاطمہ بی اے •

دوگونہ عذاب

شمشاد نے اپنا گرم چہرہ کھڑکی کے ٹھنڈے شیشے کیساتھ لگادیا، اس کی ماں کی سسکیاں بند دروازے میں سے بھی سنائی دے رہی تھیں۔ اس کا باپ گرج رہا تھا۔

"یہ کبھی نہیں ہوگا۔ خان بہادر کا لڑکا ایک گوجری سے بیاہ کریگا؟ اگر اس بیوقوف نے اس عورت کا پیچھا نہ چھوڑا تو میں اسے گھر سے نکال دونگا۔ خود کمائے اور جس سے چاہے بیاہ کرے!"

شمشاد کانپ گیا، اس نے پچھلے دنوں ملازمت ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن سب بے سود۔ کالج کے طالب علم کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ آخر ہار کر اس نے سب معاملہ اپنے ماں باپ سے کہہ دیا۔ ماں باپ سے بجائے ہمدردی کے اس کو جھڑکیاں مل رہی تھیں۔ اور تو اور اس کی چھوٹی بہن جمیلہ جو ہر موقعہ پہ اسکی طرفداری کیا کرتی تھی جو ہر معاملے میں اسے سچا سمجھتی تھی وہ بھی آج اس سے ناراض تھی۔ وہ صوفے میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔

"سنو جمیلہ، میری بہن تم نے اسے دیکھا نہیں وہ ستاروں سے بڑھکر حسین اور حوروں سے زیادہ پاکیزہ ہے!"

"لیکن ہے تو گجری!" جمیلہ نے روتے ہوئے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور کمرے سے نکل گئی ——— "گجری! گجری!! کسی کو کیا معلوم کہ وہ گجری کیا تھی!"

چند ماہ قبل تک شمشاد بھی ایک بے فکرا نوجوان تھا لیکن موسم بہار کی دلفریب شام نے اسکی زندگی کو بدل ڈالا۔ وہ شکار کھیل کر دریا کے کنارے چلا آرہا تھا کہ راستے میں اس نے ایک دودھ بیچنے والی دوشیزہ کو اپنا کلسہ سر پر اٹھائے جاتے دیکھ لیا۔ اس کی بھرپور جوانی میں ایک جادو تھا، شمشاد نے اسے دیکھا اور پھر کسی اور کو دیکھنے کی نہ اس میں طاقت رہی نہ خواہش! جب وہ چلتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دریا کی لہروں نے ناچنا اور درختوں کی ڈالیوں نے جھومنا اسی کی چال سے سیکھا ہوگا۔ اس کی چمکیلی سیاہ آنکھوں میں دن کی روشنی اور رات کی تاریکی ایک دوسری سے لپٹی ہوئی تھیں۔

شمشاد نے ہوا میں بندوق چلائی، زینو نے مڑکر دیکھا، پھر مسکرا دی، حسن اور جوانی میں اتنا ہی تعارف کافی تھا۔

اس کے بعد وہ دونوں روز آنہ ملتے اور دریا کے کنارے گھنے درختوں کے تلے بیٹھ کر محبت کے گیت گاتے۔ خوشی کے دن گھنٹوں کی طرح اڑتے چلے گئے۔ ایک دن زینو نے بہت پریشان ہوکر شمشاد کو بتایا کہ اسکی شادی کی بات چیت شروع ہو چکی ہے۔

"بابو جی" اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ "میں آپکی ہو چکی ہوں۔ اگر آپ مجھے اپنے ساتھ نہیں لیجائیں گے تو میں اسی دریا میں ڈوب جاؤنگی، پر کسی اور کے ساتھ نہیں جانے کی!" شمشاد نے جوش میں آکر اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا لئے۔

"زینو! میں تمہارا اور صرف تمہارا ہوں۔ میں بہت جلد تمہیں یہاں سے لیجاؤنگا" شمشاد جانتا تھا کہ اس کے ماں باپ رضامند نہیں ہونگے اسی لئے اس نے ملازمت کی تلاش شروع کردی۔ لیکن ہر جگہ خاک چھاننے کے باوجود اسے کہیں ملازمت نہ ملی۔ کالج کے طالب علم کی بھلا کسے ضرورت تھی؟ آج اس نے سب معاملہ اپنے گھر والوں

کہہ دیا تھا اور سب ناراض تھے اسکی چاہنے والی بہن جمیلہ بھی!
وہ دروازے کے پیچھے کھڑی رو رہی تھی۔

"جمیلہ" اس نے آواز دی "اندر تو آؤ!" جمیلہ اندر نہ آئی وہ اپنی سہیلی صفیہ کو اپنی بھاوج بنانا چاہتی تھی — صفیہ — جو اپنے کالج کی سب سے لائق لڑکی تھی — صفیہ! موٹر چلاتی تھی، ٹینس کھیلتی تھی اور انعام جیتتی تھی۔ لیکن جمیلہ نے زینو کو نہیں دیکھا تھا!

آج آخری رات تھی، آخری رات، کل کو زینو کسی اور کی ہو چکے گی۔ شمشاد تڑپ گیا۔ اس کے کانوں میں زینو کے الفاظ گونجے "اگر آپ نہ آئے تو میں اسی دریا میں ڈوب جاؤنگی!"

شمشاد کے دماغ میں آگ سی لگ گئی۔ "نہیں نہیں زینو تم کبھی نہیں ڈوبوگی!" وہ پاگل پن کی سی حالت میں میز کی طرف بڑھا۔ ایک کاغذ پر چند فقرے لکھکر ایک لفافے میں ڈالے اور پھر تیزی سے باہر نکل گیا........

جمیلہ کو نیند نہیں آتی تھی اس نے سوچا کہ کچھ پڑھ لوں۔ قلم میں سیاہی ڈالنے کے لئے وہ شمشاد کی میز کے پاس گئی۔ وہاں ایک لفافہ دیکھا جو سب گھر والوں کے نام تھا اس نے کھول کر پڑھا اور چیخ مار کر بیہوش ہو گئی۔ اسی وقت سب لوگ جمع ہو گئے۔ جمیلہ کے ہاتھ سے خط لیکر پڑھا تو اس میں لکھا تھا۔

"اے دنیا والو!

تم دو دلوں کا ملاپ نہیں دیکھتے تو نہ سہی۔ اگر میں اور زینو اکٹھے جی نہیں سکتے تو اکٹھے مرنے سے ہمیں کوئی نہیں روک سکتا۔ کل ہماری لاشیں دریا کے کنارے پڑی ہونگی۔ دنیا کہے گی یہ پانی میں ڈوب گئے ہیں لیکن وہ غلط کہے گی۔ ہم پانی میں نہیں اپنی تمناؤں کے خون میں غرق ہو جائیں گے۔ وہ خون جو سماج نے اور ہمارے ماں باپ نے بہایا ہے"۔

عورتیں تو رو ہی رہی تھیں۔ خان بہادر کے بھی ہوش اڑ گئے ان کا خیال نہیں تھا۔ کہ شمشاد معاملہ اتنی دور پہنچا دیگا وہ سمجھے تھے لاڈلا سا لڑکا ہے۔ ڈانٹ ڈپٹ سے راہ پر آجائیگا گاؤں کا رستہ تو انہیں معلوم ہی تھا۔ اسی وقت موٹر لیکر روانہ ہو گئے اور شمشاد اور زینو کو دریا پر پہنچنے سے پہلے ہی جا لیا شمشاد نے باپ کو دیکھکر بھاگنا چاہا۔ لیکن خان بہادر نے موٹر سے اتر کر بیٹے کو گلے سے لگا لیا اور کہا "بیٹا تم ہی ہمارے گھر کا چراغ ہو۔ تمہارے بغیر ہماری زندگی بے معنی ہو جائیگی۔ تم گھر چلو جہاں تم کہوگے وہیں تمہاری شادی کر دی جائیگی"
اگلے دن شمشاد کا نکاح زینو سے ہو گیا۔

اب زینو ایک بہت بڑے گھرانے کی بہو تھی۔ وہ کوٹھی میں رہتی تھی۔ رنگا رنگ کے لباس پہنتی تھی۔ درجنوں نوکر اسکی خدمت پر مامور تھے لیکن اس کے باوجود وہ خوش نہ تھی شروع شروع میں تو اس نے خود کو دھوکہ دینے کی کوشش کی لیکن جو کانٹا ہر وقت چبھتا رہے اسکی طرف دھیان کرنا ہی پڑتا ہے.......

اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی اور ہی دنیا میں آ گئی ہو۔ جہاں کے طریقے اس کو کسی نے سکھائے ہی نہ تھے۔ وہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی اور بات بات پر بیوقوف بنتی۔ وہ ہر وقت گھبرائی سی رہتی کہ نہ جانے میں اب کیا غلطی کر رہی ہوں اور میرا کتنا مذاق اڑایا جائیگا

جمیلہ کی سہیلیاں اس سے ملنے آتیں جب وہ آپس میں باتیں کرتیں تو زینو کی سمجھ میں ایک لفظ بھی نہ آتا، اگر کوئی لڑکی اسکی طرف دیکھکر مسکراتی تو یہ سمجھتی کہ شاید میری ہی باتیں کرکے ہنس رہی ہیں۔

ایک دن اس نے کھڑکی میں سے خانساماں اور ... کو باتیں کرتے سنا۔ ایک ہی فقرہ اس کی سمجھ میں آیا —
"وہ گجری بھی چلے گی؟"
زینو کے دل پر تیر سا لگا۔ اس دن سے وہ سب نوکر

سے شرمانے لگی۔ وہ کواڑوں کے پیچھے چھپ چھپ کر چلتی، اور ہر ایک سے دور رہنے کی کوشش کرتی۔

ایک دن وہ شمشاد کے سامنے بہت روئی "بابو جی یہاں کسی کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں کسی اور ہی دنیا میں آگئی ہوں!"

"ہم ہر وقت تو انگریزی نہیں بولتے!"

"بابو جی۔ جب آپ انگریزی نہیں بولتے تو بھی میری سمجھ میں پوری بات نہیں آتی۔"

"بات یہ ہے زینو" شمشاد نے اسکے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "تم لکھی پڑھی نہیں ہو اس لئے تمہاری سمجھ میں کسی کی بات نہیں آتی۔ لیکن گھبراؤ نہیں۔ میں کل سے تمہیں پڑھانا شروع کر دونگا۔ اگلے دن شمشاد نے اسے ایک پرائمر لادی، انگریزی اور اردو ایک ساتھ پڑھانا شروع کرا دیا۔

شمشاد کی سالگرہ پر بہت سے مہمان جمع تھے۔ کچھ بچپن کی شرارتوں کا ذکر چل رہا تھا۔

قیصر کہنے لگا جب میں چھوٹا سا تھا تو مجھے موٹر چلانے کا بہت شوق تھا۔ ایک دفعہ میں اکیلا ہی موٹر میں گھس گیا اور یکے بعد دیگرے اس کے سب بٹن اور پرزے گھما ڈالے دفعتاً موٹر چلنے لگی۔ اب تو میں نے گھبرا کر چیخنا شروع کر دیا۔ میری آواز سنکر ابا آئے اور انہوں نے مجھے موٹر میں سے نکالا۔

جمیلہ کہنے لگی جب میں چھوٹی سی تھی تو ایک مرتبہ پارٹی کے موقعہ پر میں اپنی امی کی سب سے قیمتی ساڑھی بغیر پوچھے لے گئی اور ایک لڑکی کے کمرے میں جاکر خوب بن ٹھن کر پارٹی کے کمرے میں پہنچی۔ وہاں جاکر میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی بھلا مجھے کیا معلوم تھا کہ استانی جی نے امی جان کو بھی بلا رکھا تھا ——؟

سب لوگ ہنس رہے تھے۔ زینو چپ چاپ بیٹھی تھی۔ ایک صاحب کہنے لگے۔ "مسز شمشاد نہیں بولتیں، دیکھئے آپ بھی کوئی بات سنائیے"۔ دوسرے مہمان بھی کہنے لگے۔ "ہاں۔ ہاں آج مسز شمشاد سے بھی کوئی بات سنیں گے بس اپنے بچپن کی کوئی شرارت آپ بھی سنا دیجئے!

زینو پہلے تو شرماتی رہی پھر کہنے لگی۔ "ہمارے پڑوس میں ایک بڑھیا اُپلے بیچا کرتی تھی۔ میں ایک دن اس سے دو پیسے کے اپلے لینے گئی۔ میرا اسکا جھگڑا ہوگیا۔ میں مانگتی تھی پیسے کے دس اوپر آٹھ وہ دیتی تھی دس اوپر پانچ۔ آخر مجھے ایک سہمی ہوئی شکل بنا کر کہا۔ اری، ماں! تیری کوٹھری میں سانپ! بڑھیا تھی ڈرپوک گھبرا کر نہ جانے کدھر کو نکل گئی اور میں نے پیسے بھی بچائے اور ٹوکری اُپلوں سے بھر کر اپنے گھر بھاگ آئی۔ زینو کی بات پر کوئی نہ ہنسا۔ شہر کی نفیس خواتین نے تو اپلوں کا نام سنتے ہی رومال ناک پر رکھ لئے تھے اور مرد سب کے سب شمشاد کی طرف کنکھیوں سے دیکھکر مسکرانے لگے۔ شمشاد کا چہرہ شرم اور غصہ سے تمتما اٹھا۔ مہمانوں کے جاتے ہی وہ زینو پر برس پڑا۔

"جس عورت کو بات کرنے کی تمیز نہ ہو۔ کپڑے پہننے کا قرینہ نہ ہو، دنیا والوں سے عزت کرانے کا سلیقہ نہ ہو اسے انسان کی بجائے جانور کہنا چاہیئے"۔ زینو رونے لگی۔ شمشاد نے اس دن سے اسے مہمانوں کے سامنے آنے سے منع کر دیا اور اپنے ساتھ باہر لیکر جانا بھی چھوڑ دیا۔

کسی دوست کی شادی میں شمشاد بھی گیا۔ وہ اکیلا بیٹھا تھا۔ اکیلا اس لئے کہ وہ بیوی کو ساتھ نہیں لایا تھا اور آجکل کی مخلوط سوسائٹی میں یہ بات بہت معیوب سمجھی جاتی ہے۔ جب وہ کسی کنواری لڑکی کے پاس بیٹھنے کی کوشش کرتا تو وہ لڑکی آہستہ آہستہ سرکنے لگتی اور پھر بھاگ کر دوسری لڑکیوں میں جا کھڑی ہوتی۔ جب وہ کسی شادی شدہ عورت کے قریب بیٹھنے لگتا تو اس عورت کا شوہر آہستہ آہستہ سرکنے لگتا اور تھوڑی دیر میں اپنی بیوی کو دوسری طرف لیجاتا۔ شمشاد پھر اکیلا رہ جاتا۔

اس نے چاروں طرف دیکھا۔ صفیہ پارٹی پر کیوں نہیں آئی؟ آج اسے رہ رہ کر وہ یاد آرہی تھی، صفیہ۔ کالج کی سب سے لائق لڑکی، جو موٹر چلاتی تھی ٹینس کھیلتی تھی۔ اسے وہ دن یاد آیا جب صفیہ کو ایک ڈرامہ میں اچھا پارٹ کرنے کے صلے میں ایک کتاب ملی تھی۔ اس نے سب سے پہلے اپنا انعام شمشاد کو دکھایا تھا۔ اس نے ایک آہ بھری " صفیہ کو مجھ سے کتنی محبت تھی۔ میں نے کیوں اسکا دل توڑا!

زینو کی محبت ایک تند سیلاب کی طرح آئی تھی، جس میں سب کچھ غرق ہوگیا اب وہ طوفان اتر چکا تھا۔ ڈوبی ہوئی چیزیں پھر نظر آنے لگی تھیں۔ صفیہ پارٹی پر کیوں نہیں ....؟

پھر شمشاد کو وہ دن یاد آیا۔ جب زینو کیساتھ اس کا بیاہ ہوا تھا۔ سامنے بیٹھکر تو صفیہ نے اسے بہت پیار کیا دعا دی۔ لیکن جلد ہی وہ اٹھ کر اپنی موٹر میں جا بیٹھی تھی۔ اس کا بیگ کمرے میں رہ گیا تھا شمشاد کو بھی اس کے پیچھے جانا پڑا صفیہ دور ——— نہ جانے کیوں دیکھ رہی تھی۔ اسکی آنکھوں میں آنسوؤں کے دبے ہوئے سیلاب چمک رہے تھے اس نے شمشاد کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ پھر تیزی سے موٹر چلا کر کوٹھی سے باہر نکل گئی۔ شمشاد کو رات بھر اسکی آنکھیں یاد آتی رہیں۔ اسکی حسین آنکھوں میں حسرت کے آنسو دیکھکر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی ٹوٹا ہوا راج محل بارش میں بھیگ رہا ہو۔ شمشاد نے پھر آہ بھری۔" میں نے اسے کیوں چھوڑ دیا!

وہ بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو اپنے میزبان سے اجازت لیکر واپس گھر لوٹا۔ اپنے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ زینو دونوں کہنیاں میز پر رکھے ہل ہل کر گرامر یاد کر رہی ہے۔ شمشاد کو دیکھکر بولی " جاؤ کریں میں نے:

" کیا جاؤ کر لیا تم نے؟ شمشاد نے تلخی سے کہا۔ عموماً اسے زینو کی غلط زبان پر ہنسی آتی تھی۔ لیکن آج نہ جانے کیوں اسے اتنا غصہ آرہا تھا۔ اسے ایسا لگتا تھا کہ اس کی سب مصیبتوں کی وجہ یہی دیہاتی لڑکی تھی۔

" کیا جاؤ کر لیا" شمشاد نے پھر پوچھا۔ زینو سبق سنانے لگی " کیٹ، پھیٹ، کیٹ!

" پھیٹ نہیں فیٹ کہو، جاہل گنوار لڑکی" شمشاد نے میز پر زور سے مکا مارتے ہوئے کہا۔

زینو کانپ گئی۔ سچا الزام جھوٹے الزام کی نسبت زیادہ تکلیف دیتا ہے سچے الزام کی چوٹ دل پر یوں آکر لگتی ہے جیسے ننگے بدن پر چابک! ایک ماہرو حسینہ کو کالی چڑیل کہیے وہ ہنس کر منہ چڑا دے گی۔ لیکن کسی گنوار عورت کو گنوار کہیے۔

زینو کانپ گئی۔ اس کے ہونٹ لرزنے لگے۔ اس کی چمکیلی سیاہ آنکھیں (جن میں دن کی روشنی اور رات کی تاریکی ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی تھی) آنسوؤں سے لبریز ہوگئی .... اس کی حسین آنکھوں میں غم کے آنسو ——— ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی اجڑا ہوا راج محل بارش میں بھیگ رہا ہو .... دفعتاً شمشاد کو ایک خیال آیا۔ خیال کیا ایک تھپیڑ تھا جو اس کے دماغ پر جا کر لگا۔ وہ تڑپ کر کمرے میں سے باہر نکل گیا۔

" نہیں ——— نہیں" اس نے اپنے آپ سے کہا کوئی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی .... تم نے دو عورتوں کے دل توڑے ہیں۔ دو بے گناہ عورتوں کے دل! جنکا فقط اتنا قصور تھا کہ انھوں نے تم سے محبت کی ——— !

وہ بہت دیر تک بیٹھا سوچتا رہا آخر اس نے سر اٹھایا اور کہا " یہ میرا فرض ہے"

وہ دفتر میں ملازم ہو چکا تھا۔ اس نے شہر کے ایک غریب محلے میں ایک مکان لیا اور زینو کو وہاں لے گیا

" لو زینو" اس نے کہا " یہ تمہارا اپنا مکان ہے یہاں تم اپنی مرضی اور خوشی سے زندگی بسر کرو۔ میں تمہیں اونچی سوسائیٹی میں رکھکر پریشان نہیں کرنا چاہتا!

زینو بہت خوش ہوئی اور اپنا گھر اسی طرح چلانے لگی جس طرح وہ اپنے باپ کا گھر چلاتی تھی۔ شروع میں اسے کچھ تنہائی محسوس ہوئی۔ کیونکہ شہری عورتوں سے وہ ملنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن دنیا میں ہر شخص کو کوئی نہ کوئی رفیق مل ہی جاتا ہے۔ زینو نے بھی اپنے محلے کی مہترانی کے ساتھ بہناپا کر لیا۔ اب وہ بہت خوش ہے۔ تاباں اپنا کام ختم کر کے زینو کے گھر ہی آجاتی ہے اور پھر وہ دونوں گھنٹوں بیٹھی باتیں کرتی رہتی ہیں ــــ شمشاد جب دفتر سے فارغ ہو کر نکلتا ہے تو نہ جانے کیوں ـــــ اس کا گھر جانے کو جی نہیں چاہتا ـــــ وہ ایک کھوئی ہوئی روح کی طرح ادھر اُدھر سڑکوں پر بھٹکتا ہے .... وہ دوسرے مردوں سے بھی نہیں ملنا چاہتا ـــــ وہ ہر ایک سے بھاگتا ہے!

یہی وجہ ہے کہ اگر آپ کسی دن شام کے وقت جناح باغ میں جائیں اور اتفاق سے اس بنچ کا رخ کریں جس پر آپ سے پہلے شمشاد بیٹھا تھا تو آپکو شمشاد نہیں صرف اس کے کوٹ کا آخری حصہ تیزی سے درختوں کے پیچھے چھپتا ہوا دکھائی دیگا!

(حمایت اسلام)

قوت، طاقت اور مردانگی چوبیس گھنٹے میں تو نہیں مگر ہاں تیس دن میں ضرور حاصل ہو سکتی ہے

کیا آپ تھکاوٹ، پژمردگی، نقاہت اور کمزوری محسوس کرتے ہیں کیا آپکی قوت حافظہ کمزور ہے کیا آپ ہر وقت خوفزدہ اور غمگین رہتے ہیں کیا آپکا جسم دبلا ہے اور آپ سستی اور کمزوری محسوس کرتے ہیں کیا آپ احساس کمتری کے شکار ہیں ــــ؟ ــــ اگر ایسا ہے تو یقین جانئے کہ آپکے وہ غدود جو قوت مردانہ کے مخزن ہیں کمزور ہو گئے ہیں اور جب تک آپ ان غدود کو طاقتور بنا کر انکی حفاظت نہیں کرینگے۔ آپ کبھی بھی قوت و طاقت و مردانگی کی صفات سے متصف نہیں ہو سکتے! خوش قسمتی سے امام طب حکیم سید نذیر احمد صاحب دہلوی اپنے ۳۵ سالہ تجربہ کے بعد ایک ایسا نسخہ مکمل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو کہ مردانہ غدود کی جملہ کمزوریوں کو دور کر کے انھیں طاقتور بنانے کا تیر بہدف مگر سادہ اور سہل علاج ہے، طب یونانی کی اس جدید اور مایہ ناز نو ایجاد کا نام ـــــ

حاذق کورس

ہے۔ جو تین مختلف ادویہ پر مشتمل ہے۔ اور تیس دن کا مکمل کورس ہے جس کا ابتدائی استعمال آپکے جسم میں طاقت قوت اور تندرستی کا اساس پیدا کر دیگا اور پورے تیس روز کے بعد آپ ایک مکمل نوجوان، تندرست و توانا اور طاقتور مرد بن جائینگے

"حاذق کورس"

کا استعمال فوراً آپکے غدود کو طاقتور بنا کر اپنا اثر شروع کر دیگا۔ آپکے بدن میں تازہ سرخ خون پیدا کر کے اس میں جوانی کا جوش پیدا کر دیگا۔ اور جوں جوں آپکے غدود طاقتور ہوتے جائینگے آپ اپنے اندر زندگی کی ایک نئی لہر محسوس کرینگے اور آپ زندگی کے ہر شعبے میں حقیقی زندگی سے لطف اندوز ہو سکیں گے یعنی "لطف شباب"! ـــــ حاذق کورس مکمل برائے تیس یوم :- ۱۲ روپے

ملنے کا پتہ ـــــ حاذق دواخانہ، بندر روڈ، کراچی نمبر ۱

ضیا محمد ضیاء

اشتراکی شاعر

(انجمن ترقی پسند مصنفین کے منشور کے بعد)

دیتا ہوں داد طنز حقیقت پرست کی
پھبتی کسی ہے مجھ پہ قدامت پرست کی

ہرچند تجھ سے فکر و نظر میں بلند ہوں
لیکن تری نگاہ میں رجعت پسند ہوں

میں بھی تھا سامراج کا دشمن تری طرح
پھونکا تھا جس نے میرا نشیمن تری طرح

آزادیٔ وطن میں ترا ہمنوا رہا !
آزاد اس چمن میں مثالِ صبا رہا !

ہر روز ڈالتا ہوں نحلوں میں تھرتھری
اور توڑتا ہوں سازِ نوا ہائے قیصری

کھلتا ہے ہر سحر درِ زنداں مرے لئے
موجود ہیں سلاسل و جولاں مرے لئے

میں نے تجوریوں کی حمایت کبھی نہ کی
میں نے مہاجنوں سے محبت کبھی نہ کی

تسلیم میں نے کب کیا شاہوں کا اقتدار
لی ہے غلط نظام سے ٹکر ہزار بار !

انسان کی خدائی کا قائل نہیں رہا
بندوں کی کبریائی کا قائل نہیں رہا

میرے اصولِ دین میں شاہی حرام ہے
کہتے ہیں جس کو سروری خدمت کا نام ہے

باطل ہے، کہہ رہا ہوں نظامِ شہنشہی
انسانیت شکار ہے دامِ شہنشہی !

دیتا ہوں اہلِ دہر کو پیغامِ انقلاب
توڑا ہے میرے جوشِ عمل نے طلسمِ خواب

جھنجھوڑتا ہوں خوابِ گراں سے عوام کو
بتلا رہا ہوں عظمتِ انساں تمام کو

دیتا ہوں حریت کے خیالات کو رواج
تعمیر کر رہا ہوں ابھی پر نیا سماج

ظلم و ستم کو ظلم و ستم کہہ رہا ہوں میں
رنج و الم کو رنج و الم کہہ رہا ہوں میں

کہتا ہوں میں غلط ہے معیشت کا یہ نظام
عصرِ جدید کی یہ سیاست ہے بے لگام

دنیا کا ترک میں نے سکھایا نہیں کبھی
رہبانیت کو ٹھیک بتایا نہیں کبھی

کہتا ہوں میں جمود اجل کا پیام ہے
کہتے ہیں جس کو زندگی حرکت کا نام ہے

یہ زندگی ہے صورتِ میدانِ کارزار
نامرد ہے کریگا جو میدان سے فرار

پیہم عمل ہے، سعیٔ مسلسل ہے زندگی
انسان کی کوششوں سے مکمل ہے زندگی

دل سے یہ چاہتا ہوں پریشاں ہوں غریب
آرام بندگانِ خدا کو ہے نصیب

میں دیکھتا ہوں سینۂ افلاس کا دھواں
میری نظر میں شامِ غریباں کا ہے سماں

بے کیف ہو رہی ہے کسانوں کی زندگی
بیمار و مضمحل ہے جوانوں کی زندگی

مزدور کی نوا پہ دھڑکتا ہے میرا دل
دہقاں کی بے بسی پہ پھڑکتا ہے میرا دل

انسان سارے ایک ہیں میری نگاہ میں / کرتا نہیں ہوں فرق گدا اور شاہ میں
تو ان کو کر رہا ہے گروہوں میں منقسم / ٹپکا رہا ہے زہر کی بوندیں ترا قلم
آپس میں بھائیوں کو لڑاتا نہیں ہوں میں / روٹی پہ آدمی کو کٹاتا نہیں ہوں میں
تجھ سے مرا تصوّرِ انساں ہے مختلف / ہاں میرے انقلاب کے ساماں ہیں مختلف
میرا قلم خدا کی امانت ہے میرے پاس / یعنی یہ اک ذریعۂ خدمت ہے میرے پاس
جدت پسند ہے کہ قدامت پرست ہے / بس نشۂ محبتِ انساں میں مست ہے
ہے رشتہ ہائے قوم و وطن سے کٹا ہوا / دامن ہے اسکا لوث ریا سے بچا ہوا!
تیرے ادب میں کچھ نہیں وحشت کے ماسوا / انساں سے کر رہے ہو کیا نفرت کے ماسوا
پھرتے ہو دل میں بغض و عداوت لئے ہوئے / سینے میں شعلہ ہائے بغاوت لئے ہوئے
رہتے نہیں ہو اپنے چمن کی فضاؤں میں / کرتے ہو رقص لال پھریرے کی چھاؤں میں
گاتے ہو صبح و شام بغاوت کا راگ تم / کھل کر لگاؤ امن کے خرمن میں آگ تم
پھر منہ سے امن امن کا نعرہ لگاتے ہو / کیا بے خبر عوام کو احمق بناتے ہو!
لیتے ہو نام ہر کہیں مزدور راج کا: / کرتے ہو کیا بچاؤ سٹالن کے تاج کا
اڑتے ہو یوں تو سرحدِ ادراک سے پرے! / جنت کوئی بنائی ہے افلاک سے پرے
اوروں کو بھی اسی کا تصور دلاتے ہو! / خواب و خیال کی نئی دنیا بساتے ہو

تم مست پھر رہے ہو مئے لا لئے ہوئے / میں ہاتھ میں ہوں ساغرِ الّا لئے ہوئے
پاکیزہ و بلند ہیں میرے تصورات / روشن ہیں میرے سینے میں حق کی تجلیات
میں جانتا ہوں تنگیٔ عرصہ حیات کا / مالک کوئی اور ہی اس کائنات کا
سکہ رواں اسی کا ہے نزدیک و دور میں / جانا ہے اک روز اسی کے حضور میں

مجھ کو بھی طرزِ کہنۂ گیتی بدلنا ہے / فطرت نے جو بنائی ہے اس رہ پہ چلنا ہے
میر و غریب کا یہ تفاوت مٹاؤں گا / آپس میں ان کی حد اخوت ملاؤں گا۔
جاگیرداریوں کو پنپنے نہ دوں گا میں! / مزدور و کشتکار کا حق مانگ لونگا میں
بھوکا کوئی بھی دیس میں رہنے نہ پائیگا / آنسو کسی غریب کا بہنے نہ پائے گا!
گردوں تلک نہ جائیگا نالہ یتیم کا / عالم نہ ہوگا بیوہ پہ امید و بیم کا!

پھر دیکھتا ہے چشمِ حقارت سے تو مجھے
آتی ہے اب بھی مجھ سے قدامت کی بو تجھے

(چراغ راہ)

نازش پرتاب گڈھی •

بانگِ درا

جفا سے، جور سے کرب و بلا سے کھیلنے والا
ابھی موجود ہے تیری ادا سے کھیلنے والا

قفس میں بھی جگہ ملتی نہیں جسکو تڑپنے کی!
یہی تھا وسعتِ ارض و سما سے کھیلنے والا

اُسی کا گوشۂ دل آئینہ دارِ تجلی ہے
سمجھتا ہی نہیں یہ نقشِ پا سے کھیلنے والا

لبوں پر ہو دعا، سجدے میں سر ہو، سر پہ خنجر ہو
کوئی موجود بھی ہے اس ادا سے کھیلنے والا

اسیری اور بے بال و پری کا غم نہیں رکھتا
قفس کی گود میں موجِ ضیا سے کھیلنے والا

مسلماں کو حصولِ اشتراکیت نہیں بچتے
کہ دیکھے ابتدا کیا انتہا سے کھیلنے والا

بنا لیتا ہے اب وہم و روایت کے خدا لاکھوں
یہی روتا ازل تا تو بلیٰ سے کھیلنے والا

سفر میں اس کو نازش کیا ہو فکرِ دوریٔ منزل
جو صبح و شام ہے بانگِ درا سے کھیلنے والا

محسن بھوپالی •

عہد!

اب بھی اظہارِ حقیقت پہ سزا لازم ہے
اب بھی حلقومِ صداقت پہ چھری چلتی ہے
اپنے افکار کو پابند نہیں کر سکتا
مجکو منظور ہے گر میری زباں جلتی ہے

بھکاری

جو فلک بوس عمارات میں آرام کیساتھ
کل تلک بیٹھے تھے عشرت کے پجاری بنکر
مفلسوں اور غریبوں کے سیہ خانوں تک
آج آ ہی گئے ووٹوں کے بھکاری بنکر

مشیر الحق •

دھوکہ

اس دن بہت مشکلوں سے میں اسے کھیل دیکھنے کے لئے تیار کرسکا تھا۔ ——— وہ ایک عجیب شخصیت کا مالک تھا۔ شہر کے سب سے پر رونق ہوٹل میں رہنے کے بعد اس کی حد سے بڑھی ہوئی خاموشی اور ایک جگہ رہتے ہوئے لوگوں سے بیگانہ پن ہر ایک کے لئے موجب حیرت تھا' لیکن یہ بات ہماری سوسائٹی میں بہت ہی معیوب خیال کی جاتی ہے کہ کسی تعارف کے بغیر ملاقات کی جائے اس لئے لوگ اس کے کمرہ کے سامنے سے سوچتے ہوئے گزر جاتے تھے ——— کہ یہ کون ہے؟

مینیجر بھی صرف اتنا ہی جانتا تھا کہ وہ ایک الگ تھلگ رہنے والا دولتمند شخص ہے۔ جو بلا حیل و حجت ہر ماہ کی دوسری تاریخ کو تمام مطالبات بے باق کردیتا ہے۔ ——— —

میرا اس کا تعارف بھی عجیب طرح سے ہوا تھا۔ ایک اتوار کی رات کو جب ہوٹل کا "تفریحی پروگرام" اپنے شباب پر تھا اور ہر شخص بڑے ہال میں بیٹھا ہوا تفریح سے لطف اٹھا رہا تھا اس وقت میں سر کے درد کی وجہ سے اپنے کمرہ کے سامنے بالکونی میں لیٹا ہوا تھا ——— آرکسٹرا زور سے بج رہا تھا۔ میں آنکھوں سے نہ دیکھنے کے باوجود کان سے سن ہی سن کر محظوظ ہو رہا تھا۔ عین اس وقت وہ میرے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ اور بولا ———

"آپ "تفریح" میں حصہ نہیں لے رہے ہیں؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

میں چونک پڑا ——— یہ بالکل نئی بات تھی کہ وہ مجھ سے گفتگو کرے ——— میں کرسی کی طرف اشارہ کرکے اپنی جگہ بیٹھتے ہوئے بولا:-

"تشریف رکھئے ——— آج میرے سر میں درد ہو رہا ہے اس لئے "تفریح" میں شریک نہیں ہوسکا۔

وہ کچھ دیر تک خاموش بیٹھا ہوا خلا میں تکتا رہا پھر بولا ———

"شرکت نہ کرنے پر آپکو افسوس ہو رہا ہوگا"

"جی ہاں! میں نے کہا ہفتہ میں یہی ایک رات ایسی ہوتی ہے جب ہم پورے طور سے لطف و تفریح میں حصہ لیتے ہیں"

وہ چپ بیٹھا رہا ——— میں بھی خاموشی سے اس کے متعلق سوچتا رہا پھر میں نے اس سے ایک دم سوال کردیا ———

"آخر آپ کیوں نہیں شرکت کیا کرتے؟"

"میں ——— ؟" وہ چونک پڑا ——— "بس یونہی، میری شرکت نہ کرنے کی بالکل وہی وجہ ہوسکتی ہے جو آپ کی شرکت کی ہوسکتی ہے" ——— "مگر یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی ———"

"معاف کیجئے گا۔ کوئی خاص وجہ نہیں ہے ——— بس یوں سمجھئے کہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔

وہ عجیب اکھڑی اکھڑی سی گفتگو کر رہا تھا ——— پھر وہ خاموش ہوگیا اور تھوڑی دیر بعد اٹھ کر چلا گیا۔

اس کے بعد اتنا ہوگیا کہ علیک سلیک ہونے لگی اور دھیرے دھیرے مجھ میں اور اس میں دوستی ہوگئی ——— لیکن ابھی تک اس کی شخصیت پر پردہ پڑا ہوا تھا۔

عین انھیں دنوں ایک "تھیٹر" شہر میں آیا۔ اس کی بہت شہرت تھی۔ میں اسے ہر روز اسے دیکھنے پر اصرار کرتا لیکن وہ ہمیشہ ٹال جاتا تھا آخر کار میرے بہت اصرار پر اس دن وہ راضی ہوگیا ———

ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ پردہ کے پیچھے بینڈ بج رہا تھا۔ میں بیٹھا ہوا ہال کی سبز و سرخ بتیوں کو دیکھ رہا تھا۔ اور وہ سامنے پردہ کو بہت ہی غور سے دیکھتا رہا اس کی آنکھیں ہال کے کونے کونے میں ناچتی پھرتی تھیں لیکن ہر پھر کر دہ پردہ ہی پر آکر ٹک جاتیں اور وہ پھر اسے غور سے دیکھنے لگتا۔

تھوڑی دیر بعد آخری گھنٹی بجی۔ اور سامنے لگا ہوا پلاسٹک کا خوبصورت پردہ دو حصوں میں تقسیم ہو کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ۔

ناچ شروع ہو چکا تھا اور وہ دونوں غور سے دیکھ رہے تھے کہ اسٹیج پہ لگے ہوئے کھجور کے درخت کے پیچھے سے ہیروئن عربی دوشیزہ کا لباس پہنے دف بجاتی سامنے آئی ــــــــ اور ایسا معلوم ہوا گویا اسے بچھو نے ڈنک ما را ہو۔ وہ کرسی سے اچھل کر کھڑا ہوا اور عجیب گھبرائے ہوئے لہجہ میں بولا ۔

"باہر چلو ــــــــ میں یہاں نہیں رک سکتا ۔"

"کیا ہوا؟ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ کھڑا ہو گیا ــــــــ"

"میں کھیل نہیں دیکھ سکتا ــــــــ میں ہوٹل جا رہا ہوں "

"آخر کیا بات ہوئی ، یہ سین تو پورا ہونے دو ــــــــ"

"بیٹھ جائیے ــــــــ بیٹھ جائیے" پیچھے بیٹھے ہوئے لوگوں نے کہنا شروع کیا ۔

"میں جاتا ہوں ــــــــ" یہ کہہ کر وہ جانے لگا تو مجھے بھی اس کے ساتھ جانے کے سوا کوئی صورت نظر نہ آئی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ باہر نکل آیا ــــــــ

باہر بارش ہو رہی تھی ، کوئی سواری موجود نہ تھی اور ہوٹل یہاں سے دور تھا ۔ میں نے تھیٹر ریسٹورنٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔

"آئیے چائے پی کر ہی وقت گزاریں ــــــــ"

"مگر یہاں نہیں ــــــــ یہاں میرا دم گھٹ رہا ہے ــــــــ سامنے والے ریسٹوران میں چلئے "

لیکن بارش میں وہاں تک پہنچتے پہنچتے ہم دونوں بھیگ جائیں گے "

"غالباً پگھلیں گے نہیں ــــــــ" وہ مسکراتے ہوئے بولا

"آئیے "

اور ہم دونوں بھیگتے ہوئے سامنے والے ریسٹوران میں داخل ہو گئے ۔

گرم گرم کافی کی چسکی لگاتے ہوئے میں نے پوچھا

"آپ کھیل دیکھتے دیکھتے گھبرا کیوں گئے ــــــــ؟"

"وہ مجھے پہچان لیتی ــــــــ"

"کون ؟" میں نے تعجب سے کہا ۔

"طلعت !"

"کون طلعت ؟" میں نے اور زیادہ تعجب سے پوچھا ۔

"ایں ــــــــ ؟ کیسی طلعت اس نے گھبراہٹ کہا اور ایسا معلوم ہوا جیسے وہ سوتے سوتے جاگا ہو ۔

"وہی طلعت ! ناچ کی ہیروئن عربی دوشیزہ ــــــــ

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ــــــــ "آپ جانتے ہیں ؟"

ہاں ــــــــ اس نے ایسے لہجہ میں کہا جیسے کوئی گہرے کنوئیں سے بولے ــــــــ

"کون ہے وہ ؟" میں نے پوچھا

"یہ نہ پوچھو ــــــــ !" اس نے ملتجیانہ لہجے میں اور سر میز پر ٹکا دیا ۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے ــــــــ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے دباتے ہوئے بولا

"میرے دوست مجھ پر اعتبار کرکے تمہیں افسوس نہ ہوگا

" اس نے میز پر سے سر اٹھایا اور بولا ــــــــ

"وہ طلعت تھی ، میری بہن !"

"بہن ــــــــ !"

"ہاں بہن ، میری چھوٹی بہن ــــــــ !! جب میں ختم کرکے گھر آیا تو میری دوسری بہنوں کی شادی ہو چکی تھی ۔ صرف یہی اس وقت کنواری تھی ــــــــ اس وقت ایف ، اے میں پڑھ لیکن ابھی اس پر کالج کے اثرات پورے طور پر نہیں چھائے تھے ــــــــ یہ آج سے تین سال پہلے کی بات ہے ۔ میرا گھرانا بہت ہی تعلیم یافتہ ترقی پسند تھا ، میرے والد ایک اعلیٰ سرکاری عہدہ دار تھے اور والدہ ایک کالج کی تعلیم یافتہ ــــــــ

ماں باپ کی ترقی پسندی ، کالج کی تعلیم ، شباب کا وقت یہ سب طلعت کے خود ہی بہک جانے کے لئے کافی تھے کہ میں بالکل بنا ہوا پہنچا جس نے آگ پر پیٹرول کا کام کیا ــــــــ ہر روز تفریح کو

پروگرام بنتے، پکنک ہوتی، سیر سپاٹے ہوتے، اور سینما کا پروگرام تو تقریباً ہر رات رہتا ——— طلعت میرے ساتھ رہنے کی وجہ سے دھیرے دھیرے ان تمام بندھنوں کو بھی پھاند گئی جو ماں باپ کی ترقی پسندی کے باوجود ان کے مشرقی پن نے باندھے تھے ——— اب وہ آزادی کر کلب جاتی، اگر کبھی مجھے موقع نہ ہوتا تو اکیلے سینما چلی جاتی۔ والدہ اس پر کبھی کبھی ناک بھوں چڑھاتیں لیکن میری شہ پاکر وہ بے باکی سے جواب دے دیتی کہ میں بچہ نہیں ہوں۔ ——— !

اور دن رات اسی طرح گزرتے رہے ——— ایک رات ہم دونوں "ہال" میں بیٹھے ہوئے ایک فلم دیکھ رہے تھے کہ وہیں ایک صاحب سے تعارف ہوا۔

میں نے طلعت سے بھی ان کو ملایا ——— ہندوستانی فلموں پر گفتگو ہونے لگی ——— تھوڑی دیر میں ایسا معلوم ہونے لگا کہ ہم تینوں بہت ہی پرانے دوست ہیں۔ طلعت ان سے بہت متاثر تھی۔ وہ کہنے لگی کہ ان کی گفتگو میں جادو ہے ——— انٹرول میں ہم لوگوں نے مل جل کر آئس کریم اور فروٹ کریم کھائی ——— غرضیکہ تین گھنٹے کی مہلت میں ہم تینوں گہرے دوست بن چکے تھے ———

اس دن میں اپنے موٹر پر کھیل دیکھنے نہیں آیا تھا۔ موٹر "پاپا" کے ایک صاحب کے یہاں گئے تھے ——— ہم لوگ جب کھیل دیکھ کر ہال سے باہر آئے تو سواری نہیں ملی۔ بھیڑ بہت زیادہ تھی۔ ہم دونوں کسی سواری کے انتظار میں ایک طرف کھڑے تھے کہ اس نے کہا

"میرے پاس اپنا موٹر ہے ——— آیئے آپ لوگوں کو گھر تک پہنچا دوں"

شکریہ! میں نے کہا ——— آپ تکلیف نہ کریں ہم لوگ پہنچ جائیں گے۔ مجھے اس میں آرام ملے گا ——— بھیڑ بہت زیادہ ہے سواری ملنے کی امید نہیں ——— تکلف نہ کیجئے، آیئے۔

بھائی جان اس میں حرج ہی کیا ہے؟ طلعت نے کہا آخر کب تک ہم لوگ یہاں کھڑے رہیں گے ——— انھیں کے موٹر سے چلے چلیں۔

یہی تو میں کہہ رہا ہوں ——— اس نے کہا

اور ہم دونوں اس کے موٹر میں سوار ہو گئے ——— میں اور طلعت پیچھے تھے۔ وہ اپنے ڈرائیور کی بغل میں بیٹھا ہوا تھا۔ ہم باتیں کرنے میں اتنے مشغول تھے کہ نہ تو ہمیں وقت کا احساس ہوا اور نہ مسافت کا اندازہ ——— اکہ موٹر چلتے چلتے یک بیک رک گیا ———

کیا ہوا ——— میں نے چونک کر پوچھا ———

ڈرائیور جلدی سے نیچے اترا۔ انجن کھول کر دیکھا بھالا ——— اور اسٹارٹ کرنے کی کوشش میں ناکام ہو کر بولا۔ ———

انجن اسٹارٹ نہیں ہو رہا ہے ——— آپ کو تکلیف کرنی پڑے گی ———

اس نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا ——— تکلیف تو ضرور ہو گی لیکن چارہ کار ہی کیا ہے ——— ؟ آیئے موٹر کو ڈھکیلیں ——— کبھی گاڑی ناؤ پر اور کبھی ناؤ گاڑی پر ——— ؟

جی ہاں کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی رات ——— !

میں نے ہنستے ہوئے کہا اور موٹر سے اترتے ہوئے طلعت سے بولا ——— تم بھی آؤ ———

طلعت نے موٹر سے اترنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا کہ وہ بولا۔

نہیں نہیں آپ بیٹھی رہیئے، ہم دونوں کافی ہیں۔

طلعت پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی اور ہم دونوں پیچھے ڈھکیلنے لگے کچھ دور تک ہم نے سے ڈھکیلا۔ موٹر رینگ رینگ کر چلنے لگی۔ وہ آگے انجن کی طرف بڑھ کر زور لگانے لگا۔ پیچھے میں پوری طاقت سے موٹر کو ڈھکیل رہا تھا کہ یک بیک موٹر گھرّاہٹ کے ساتھ تیزی سے نکل گیا اور میں توازن برقرار نہ رکھ سکنے کی وجہ سے منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ ——— زمین سے اٹھ کر جو میں نے دیکھا تو دور سے موٹر کی سرخ بتی چمک رہی تھی ———

میری آواز بند ہو چکی تھی ایک ثانیہ میں مجھے ہوش آگیا۔ لیکن اب میرے اختیار میں کیا تھا۔ طلعت مجھ سے بہت دور نہ جانے کہاں پہنچ چکی تھی ——— وہ کون تھا یہ مجھے معلوم نہیں ہوا اس کے موٹر کا نمبر کیا تھا یہ میں نے دیکھا نہیں ——— مجھے کیا کرنا چاہیے - یہ

ی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ پھر میرے قدم آگے ہی بڑھتے چلے گئے ——
ب میری وجہ سے ہوا تھا۔ میں اپنے کو طلعت کا مجرم سمجھ رہا تھا۔ میں نے
ے ایک نئی راہ پر لگایا۔ میں اس کا رہبر تھا بن راہوں سے وہ بیگانہ تھی
، پر میں نے اسے چلایا تھا —— یہ احساس مجھے مارے
، رہا تھا لیکن میں کر بھی کیا سکتا تھا —— پھر میں گھر
ن گیا —— کہیں بھی نہیں گیا —— میں نے
نے کو سزا دی۔ موت میرے اختیار میں نہ تھی۔ زندگی میرے
قابو میں تھی —— میں نے اپنی زندگی کو سزا دی ——
میں نے کلب چھوڑ دیا۔ میں سینما سے دور ہو گیا۔ میں نے تھیٹر نہ دیکھنے
کی قسم کھالی میں ہر کھیل تماشے سے الگ ہو گیا۔ لیکن آج تم نے میرے
عہد کو توڑ ڈالا —— تم مجھے زبردستی کھینچ کر ہال میں لے گئے
—— اور وہاں وہی طلعت اس رنگ میں تھی۔ طلعت میری
بہن اور ایک ڈانسر ——! "اس کا سر میز پر جھک گیا۔

(بشکریہ معیار)

جب کبھی آپ بیمار ہوں

جب کبھی اپنی صحت کی خاطر آپ کو کسی دواخانہ کیطرف رجوع کرنا ہوتا ہے تو اس وقت قدرتی طور پر آپکے دل میں یہ سوال پیدا ہوتے ہیں (الف) کیا وہ دواخانہ جس سے آپ دوا لینا یا منگانا چاہتے ہیں اپنے مرکبات میں قیمتی اور اصلی ادویہ صحیح وزن کے مطابق ڈال رہا ہے (ب) کیا تجربہ کار اور صحیح طبیب آپکے لئے صحیح دوا تجویز کر رہے ہیں خدا کا شکر ہے کہ اس کے فضل و کرم سے حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی نمبر ۱ اس دھوکہ باز اور اشتہاری زمانہ میں بھی اس دوگونہ معیار پر پورا اتر رہا ہے

غالباً جناب حکیم سید نذر احمد صاحب دہلوی کی سرپرستی حاذق دواخانہ کی اس صداقت کی بہترین دلیل ہے

حکیم صاحب موصوف کسی تعارف کے محتاج نہیں ہندوستانی پبلک عموماً اور طب یونانی سے دلچسپی رکھنے والے خصوصاً مدت دراز سے حکیم صاحب کو اچھی طرح جانتے ہیں آپ ۳۷ سالہ تجربہ رکھتے ہیں۔ آپ کی زندگی کے آٹھ قیمتی سال مسلسل طور پر مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے طبیب پیشی کی حیثیت سے انکے ساتھ سفر و حضر میں کٹے۔ آپ ہندوستانی دواخانہ کے مسلسل چھ سال تک ہر شعبہ کے نگراں رہے۔ کتاب حاذق اور مطب کلاں آپ کی وہ مایہ ناز اور مقبول عام تالیفات ہیں جو محتاج تعارف نہیں۔ آپ طبیہ کالج دہلی کے اعلیٰ کلاسوں کے پروفیسر رہے ہیں اور آپ کی خدمات کے اعتراف میں یونانی طبیہ کالج کے جشن سلور جوبلی کے اہم موقعہ پر مارچ سنہ ۱۹۴۷ء میں منتظمان کالج نے آپ کو ماہر طب کی اعزازی ڈگری سے سرفراز فرمایا

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ان حقائق کے پیش نظر چونکہ حکیم صاحب موصوف بنفس نفیس حاذق دواخانہ کے جملہ امور کے نگراں ہیں اور مطب کے علاوہ اپنا تمام وقت اور توجہ دواخانہ کی اصلاح اور درستی میں صرف کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی نگرانی میں تیار کرائے ہوئے اس دواخانہ کے مجربات اور مرکبات آپ کی صحت کے بہترین ضامن ہیں۔

مینیجر، حاذق دواخانہ، بندر روڈ کراچی نمبر ۱

ابن فرید

سُرمئی لکیریں

وہ چُپکے سے بستر سے اٹھا اور اندھیرے ہی میں ٹٹولتا ہوا کھونٹی تک گیا اور کوٹ کی جیب سے بوتل نما شراب کی شیشی نکال کر دو چار گھونٹ جلدی جلدی حلق کے نیچے اتار لئے اور فوراً ہی عجلت کے ساتھ اپنے بستر پر دھم سے لیٹ رہا۔ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا اور دل انتہائی تیز رفتاری سے دھڑک رہا تھا۔ جیسے اس نے کوئی بہت بڑا جرم کیا ہو اور اس کو اس جرم کا پورے طور سے احساس بھی ہو اس کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے ابھر آئے تھے اور بدن بری طرح تپنے لگا تھا۔ اس نے اپنے کو جھنجھوڑ ڈالا۔ اور اس خوف کو دور کر دینا چاہا۔ لیکن نہ معلوم کیوں جب تک اس پر نشہ طاری رہتا یہی کیفیت رہتی اور جس دن وہ اس طرح گھر پر پیتا یہی سب کچھ ہوتا نہ وہ اس پر قابو پا سکتا تھا اور نہ علانیہ پی سکتا تھا۔ کیونکہ اب بھی اس کے اندر ایک قسم کا خوف جاگزیں تھا جو اکثر اس کو بہت سے افعال چھپ ہی کرنے پر مجبور کر دیتا اور وہ چھپ کر کرتا۔ کیونکہ وہ اب بھی خود کو بہت سی بندشوں میں جکڑا ہوا تصور کرتا۔ گو اسکے نقل و حمل اور اس کی مصروفیات سے کسی کو سروکار نہ تھا۔ اس کو کسی نے بھی تیز نظروں سے نہیں دیکھا تھا اور نہ کبھی نکتہ چینی کی تھی۔ لیکن پھر بھی اس کو ایک طرح کی پشیمانی سی ہوتی اور اس پشیمانی کو چھپانے کے لئے وہ بہت سی چالیں چلتا۔

وہ جب کبھی دن میں پیتا تو گھر نہ آتا بلکہ جب تک نشہ طاری رہتا آزادانہ گھوما کرتا اور جب وہ اپنی حالت پر قابو پا لیتا یا نشہ اتر جاتا تو دبے قدموں آتا اور اپنے کمرے کو اندر سے بند کر لیتا۔ ورنہ پھر وہ کرن کے یہاں چلا جاتا اور اسکی بیزار کن باتوں کو انتہائی صبر کے ساتھ سنتا۔ نہ معلوم کیوں اسکو کرن کی باتوں سے گھن سی آنے لگی تھی۔ وہ عموماً ایسی باتیں سوچنا شروع کر دیتا جن کی موٹی تہوں کو توڑ کر کرن کی باتیں اس کے دماغ تک نہ اتر پاتیں بس ایک بھنبھناہٹ سی اُسکے کانوں سے ٹکرایا کرتی۔ اور وہ اس بھنبھناہٹ کو برداشت کر لیتا۔ اسے کرن کی باتوں سے کوئی خاص عناد بھی نہ تھا بلکہ اس سے پہلے وہ اس کے مباحثوں میں وہ انتہائی دلچسپی لیتا تھا۔ لیکن جب سے کرن نے اس کو رجعت پرستی سے ابھارنے کی کوشش کی اور اکثر ایسے مسائل بے نقاب کرنا شروع کر دیئے جو اس کی فہم و فراست سے بالاتر تھے تو وہ اس سے مرعوب ہونے لگا اور جب اس نے اس کو توہم سے حقیقت میں لانے کی کوشش کی اور اس کے خدا پر نکتہ چینی کی اور اس کے وجود پر شک کا اظہار کیا تو نہ معلوم کیوں اس کے منہ سے بے ساختہ یہ جملہ نکل گیا۔

"تو کیا تم اپنے باپ کے باپ ہونے پر بھی شک کرو گے؟"

کرن نے اس کے اس احمقانہ سوال پر ایک پُر زور مہیب قہقہہ لگایا

"اماں یار ——— تم بھی عجب "عجیق" آدمی ہو ——— یہ تو نسل پرستوں کی توہماتی باتیں ہیں۔ آج کل ایسے مسائل کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔"

اسے ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے اس کے منہ میں مردہ مکھی ٹھونس دی ہے۔ وہ اپنے اندر تنے تنے ہی کی حالت میں اس کے پاس سے اٹھ کر بھاگا اور شام تک ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے شہر بھر کی گلیاں ناپتا رہا۔ لمحہ بہ لمحہ اس کو کرن کی باتیں دماغ اور پھر آنتوں میں ٹکراتی ہوئی محسوس ہوتیں اور ایسا محسوس ہوتا کہ جو کچھ پیٹ میں ہے وہ سب سامنے آ رہے گا وہ قدم قدم پر سکنجبین کا گلاس پر گلاس چڑھاتا رہا اور اس نے وہ پورے دس روپے سکنجبین کی نذر کر دیئے جو اس نے اپنے بڑے بھائی سے لاکھوں بہانوں سے لئے تھے اور اس کا بڑا بھائی جس نے ہمیشہ اس کا خیال رکھا اور اپنی ضروریات کو ذبح کر کے اس کی آسائشوں کو پورا کیا۔ ان دس روپوں کو صرف کرتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے کچھ فکرمند سا ہو گیا تھا۔ لیکن اس کو ان روپیوں کی اتنی پرواہ نہیں تھی جتنا کہ کرن کے ان حملوں سے دور بھاگنے کی پرواہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ روپے تو وہ چند چکنی چپڑی باتیں بنا کر ہمیشہ لے سکتا تھا اور اس کا بھائی کبھی انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ وہ اس سے مرعوب تھا بلکہ اس لئے کہ وہ اس سے انتہائی محبت کرتا تھا

اس نے بلا کسی وجہ کے تعلیم ختم کر دی۔ اس کے بڑے بھائی نے
ہیں کہا۔ وہ مستقل چھ سال سے بیکار رہا۔ اس کے بڑے بھائی نے
ت تلاش معاش کے لئے مجبور نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ آوارہ گردی کرتا رہا۔
کے بڑے بھائی نے کبھی خشمگیں نظروں سے نہیں دیکھا اور اب اس
جو عادتیں اختیار کر لی تھیں اگر وہ اس کے بڑے بھائی کو معلوم ہو جائیں
ا ید اب بھی وہ لعنت ملامت نہ کرے۔ مگر اس احساس کے ساتھ بھی وہ
روز پستیوں میں گرتا چلا جا رہا تھا۔ بالفرض وہ کبھی یہ سوچ بھی لیتا کہ
کیوں اتنا سہل پسند ہے اور کیوں اس عیش پسندی کی طرف بڑھتا
جا رہا ہے تو فوراً رینا کے فقروں کی بازگشت اس کو سہارا دیتی اور وہ
نے لڑکھڑاتے ہوئے کردار کو اس طرح معاف کر دیتا جیسے کوئی یتیم خانے
تولی اپنی رحم دلی کی تشہیر کیلئے یتیم بچوں کی اکثر ایسی شرارتوں کو دوسروں
سامنے نظر انداز کر دیتا ہے جن کو وہ ان کی غیر موجودگی میں کبھی معاف
کرتا۔

رینا کی اور اس کی ملاقات بھی بالکل عجیب طرح ہوئی تھی کسی نے
دونوں کا تعارف نہیں کرایا تھا بلکہ وہ ایک زمانہ میں مستقل ایک ہفتہ
اسی رستوراں میں جاتا رہا جس میں رینا بھی مستقل آ رہی تھی۔ مگر یہ خیال
غلط ہوگا کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے سے محبت ہو گئی تھی
کیونکہ رینا کے قول کے مطابق اس بحرانی دور میں یہ چیز مفقود ہے بلکہ وہ
دونوں تو صرف محسوس کرتے رہے کہ وہ ایک ہی وقت پر رستوراں میں ایک
دوسرے کو دیکھتے ہیں اور کبھی نزدیک اور کبھی دور بیٹھتے ہیں۔ پھر ایک دن
دونوں کی میزیں ایکدوسرے سے بالکل قریب ہو گئیں اور ایکدوسرے
کی کرسیوں کی پشت تقریباً مل گئیں۔ اس نے گھوم کر رینا کی طرف دیکھا۔ اور پھر
رینا نے اس کو دیکھا اور جب دونوں نے خیال کیا کہ ان کا یہ فعل غیر مہذب
ہے تو اس نے رینا سے جھجکتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔
"میں آپ کو تقریباً ہر شام یہیں دیکھتا ہوں اور ہونٹوں پر رسمی
مسکراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔
"اور میں بھی یہی کہنا چاہتی ہوں" رینا نے مسکراتے ہوئے
جواب دیا۔

بہتر ہوگا کہ ہم ایک دوسرے سے مانوس ہو جائیں۔ مجھ کو جعفر کہتے
ہیں۔ اس نے نشست سے کچھ ابھرتے ہوئے کہا۔
"مجھ کو رینا ہی کہیے۔ کیا کروں پورا نام بتلا کر۔ آجکل کے ہنگامی دور
میں طویل ناموں سے پکار کر بلا وجہ وقت ضائع کرنے سے کوئی فائدہ
نہیں۔ اتنے وقت میں ہم کچھ اور تعمیری کام کر سکتے ہیں۔
اب ان دونوں نے ہاتھ ملایا اور ایک ہی میز پر بیٹھ گئے اور ایک
پیالی چائے پینے کے بعد خوش گپیاں کرتے رہے پھر اسی طرح وہ دونوں
ہر شام کو رستوراں میں ملتے رہے اور رینا اس کو قوم بلکہ بنی نوع انسان
کی تعمیر کے لئے اکساتی رہی وہ اس کے بلند مقاصد سے انتہائی متاثر
ہوا اور لبیک کہنے کے لئے تیار ہو گیا۔ کیونکہ اس کے پاس علاوہ بیکاری
کے کوئی اور شغل تو تھا نہیں۔ شاید اس میں وقت گزاری کا بہترین ذریعہ
نکل آئے۔ یا پھر وہ گمنامی کے پردوں کو ریزہ ریزہ کر کے اور افق سیاست
پر درخشندہ ستارہ بن کر چمک اٹھے۔ اس امید اور توقع کے سہارے
اس نے خود کو رینا کے خیالات میں ڈھالنا شروع کر دیا اور رینا نے اپنی ساری
سعی و کاوش اس کو سیاست میں نکھارنے میں صرف کر دی۔

جب رینا نے شہر کے سب سے قیمتی ہوٹل میں ملک کی سب سے
غریب جماعت کی مجلس منعقد کی اور شام کے وقت برقی قمقموں کی
جھلملاتی ہوئی روشنی میں زرق برق پوشاکیں لہرانے لگیں اور شہر کے سارے
امرا جو غربا کی فلاح و بہبودی کے لئے عزم کر چکے تھے چار کی میزوں کے
گرد جن پر انواع و اقسام کی خورد و نوش کی چیزیں چنی ہوئی تھیں بیٹھ گئے
تو رینا نے ڈائس پر کھڑے ہو کر کہا۔
"میں آج کی صدارت کے لئے کامریڈ جعفر کا نام تجویز کرتی ہوں"
"میں تائید کرتا ہوں" ایک پرتکلف بلیزر کے سوٹ میں ملبوس
وجیہ نوجوان نے کہا
جب اس کی صدارت کی کوئی مخالفت نہ کی گئی اور وہ متفقہ
طور پر صدر چن لیا گیا تو فضا تالیوں سے گونج اٹھی اور اس نے انتہائی
شان اور تمکنت سے خود کو صدارت کی کرسی پر جما دیا۔ اس کو پہلی مرتبہ
یقین ہوا کہ جس کو وہ خوش فہمی تصور کرتا تھا وہ اب حقیقت تھی اور وہ

باہر قدم رکھے گا تو ایک آزمودہ کار سیاست دان ہوگا اور لوگ اس کے گلے میں وزنی ہار ڈالیں گے اور رینا اس کو فرط مسرت سے ریستوراں میں لے جائے گی۔ اور پیازی رنگ کے گلاس میں سرخ سرخ سی سیال شے بکھرے گی اور وہ اس کے بلبلوں میں اپنے عکس کو غور سے دیکھے گا اور سوچیگا کہ کیا اس آگ کی سرخی بھی ایسی ہی ہے جس میں اسکے جذبات اور اس کی زندگی کی طرح کوئی آنچ نہیں ہے کوئی تپش نہیں ہے اور وہ شراب کے تصور کے ابھرتے ہی جیل کے وسط میں لگی ہوئی گھنی نیم کی پتیاں نوچ کر منہ میں بھر لیتا اور چبا ڈالتا۔ مگر اس کی تلخی کچھ ایسی ہوتی کہ وہ فوراً پتیاں تھوک دیتا اور اسکے تصورات متنفر ہو جاتے اور وہ اپنے کام پر لگ جاتا۔

اس نے قید کا ایک ایک دن گن گن کر کاٹا اور جب وہ رہا کیا گیا تو جیل کے باہر اس کے کامریڈوں کا ایک ہجوم تھا اور رینا کے چہرے پر خوشی اس طرح ناچ رہی تھی۔ جیسے کوئی بچی اپنے باپ کو عرصہ تک سے واپسی پر جہاز کے عرشہ پر دیکھ لے اور خوشی کے مارے ناچ اٹھے۔ رینا بالکل اسی طرح مسرت آگیں فضاؤں میں تیر رہی تھی اور ہجوم سے بھنبھناہٹ کی اٹھتی ہوئی صدائیں اس کو یہ سوچنے کا موقعہ نہیں دے رہی تھیں کہ وہ اسی دنیا میں یہ سوچنے کا موقع نہیں دے رہی تھیں کہ وہ اسی دنیا میں ہے، بلکہ جیسے وہ مستقبل کے اس زمانہ میں پہنچ گئی ہے جس کے لئے اسنے جعفر کو مرد میدان بنایا تھا۔ جعفر اس کے پاس آکر ٹھہر گیا اور اس نے تقریر کی گونج میں اسے ہار پہنا دیا لیکن وہ برابر اسکو گھورتا رہا جیسے اس کی آنکھوں کی پتلیاں بے جان ہو گئی ہیں۔ ایک جگہ پر جم گئی ہیں ٹھہر گئی ہیں وہ دیکھ رہا تھا رینا کی بیج اور لطیف جلد میں سرمئی سی ہلکی ہلکی لکیریں ابھر رہی ہیں اور خود بھی تو اب اتنا شگفتہ صورت نہیں رہ گیا تھا اس کے بال کندھوں تک بڑھ کر لٹک آئے تھے اور ڈاڑھی اور مونچھوں کو بھی اس نے بدستور الوداع کہہ رکھا تھا۔ اس کی دیسی کپڑے کی ٹوپی ان بالوں پر جم کر اسکو کافی سنجیدہ اور معمر بنا رہی تھی۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" رینا کی مسرت پر سنجیدگی عود کر آئی تھی

"رینا میں دیکھ رہا ہوں کہ ہم حقیقت سے کتنے دور ہیں"

اور میں دیکھ رہی ہوں کہ جیل کی سختیوں نے دوبارہ تم کو رجعت پرست بنا دیا ہے" اس نے اپنی پتلیوں کو جلدی جلدی حرکت دی تاکہ یہ جمود جو طاری ہو گیا تھا اسے منتشر کر سکے! اسے ایسے مسائل سے کیا تعلق یہ تو اس کے توقعات کے رنگین محل کو زمین بوس کر دیتے اور اس نے جس مقصد کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی ہے وہ نامکمل رہ جائے گا اس نے فوراً اپنے متزلزل دماغ کو وہی سہارا دیا جو رینا نے "بحرانی دور" کے نام سے اس کو عطا کیا تھا۔ اور وہ سب شہر کے ایک بڑے ہوٹل کی طرف چل دیئے تاکہ ملک کی سب سے "غریب" جماعت کی فلاح و بہبود کے لئے شاندار جشن منعقد کریں جعفر سب کے درمیان میں بیٹھ گیا اور رینا اس کے سامنے والی میز پر۔ ایک بار پھر رینا کی ابھرتی ہوئی سرمئی لکیریں اس کی نظروں میں کھٹکنے لگیں

"بشکریہ معیار"

سہ روزہ "الانصاف" الہ آباد

● بھارت کے مخصوص حالات، سیاست اور اخلاق و تہذیب کا جائزہ

● بین الاقوامی سیاست اور اس کے پس منظر نظامہائے باطل کی پردہ دری

● ممالک اسلامیہ اور مسلمانان ہند کے مسائل کا بے لاگ تعمیری جائزہ

● دنیا کے مصائب کے حل کے لئے "اسلام" کے نظام کی پیش کش

چھ برس سے ان مقاصد کیلئے مصروف عمل ہے —— چندہ سالانہ بارہ روپے فی پرچہ دو آنے

پتہ:۔ سہ روزہ "الانصاف" ۱۳۵ شاہ گنج، الہ آباد نمبر ۳

سید علی اکبر شاہ •

"جامع لیگ آف پاکستان"

یوں تو ہر ملک میں بہت سی پارٹیاں ابھریں۔ لیکن بعض وقت سے پہلے بے موت مر گئیں۔ بعض کا نصب العین صحیح نہ ہونے کی وجہ سے تحریک کرتے کرتے گمنامی میں گم ہو گئیں۔ ایسی پارٹی معرض وجود میں نہ آئی جو کہ ہمیشہ قائم رہے اور عوام کا صحیح تعاون اس کے ساتھ رہے۔ عوام بھی ہر نئی چیز کے پیچھے لپکتے ہیں لیکن جب اچھی طرح واقف ہو گئے تو ٹھکرانے میں بھی دیر نہیں کرتے۔ آج ہم نے ایک ایسی جماعت بنائی ہے۔ جس کو ہر ایک پارٹی کا تعاون حاصل ہے۔ یوں تو مسلم لیگ باقی سیاسی جماعتوں سے ایک کامیاب جماعت تھی۔ لیکن مخلص لیڈروں کی کمی کی وجہ سے بعض کا اعتماد کھو بیٹھی۔ اسلام لیگ کو تو پہلے ہی سے خاص لوگ پریڈ کرنا ہی سمجھتے تھے۔ عوامی لیگ جو کہ اب سارے پاکستان میں عام ہونے کا بگل بجا رہی ہے یہ مسلم لیگ کے پیٹ فارم سے اترے ہوئے چند ایک شخصوں کی جماعت ہے جماعت اسلامی جس کو مغربی تہذیب یافتہ پسند ہی نہیں۔ ان سب جماعتوں کو پاکستان میں تقریر کرتے اور نصب العین ظاہر کرتے وقت گزر گیا۔ لیکن کسی خاص وجہ سے یہ سب جماعتیں ایک جگہ متفق نہ ہو سکیں۔ اسی واسطے محرک نے ایک نئی جماعت کی بنیاد ڈالی۔ جو کہ ان سب جماعتوں سے متفق ہے۔ ان سب رسمے ہوئے لیڈروں کو متحد ایک ہی نقطہ پر لا رہی ہے آپ حیران ہونگے وہ کونسی ایسی جماعت ہوگی۔ جس کی حکومت ہوگی اور عوام اور مذکورہ صدر پارٹیوں کی تائید بھی ہوگی۔ لیکن میں اپنے نکتہ نگاہ سے ایک جماعت کی تشکیل کر چکا ہوں، اسلامستان بنانے والے پہلے پاکستان میں ہماری نئی دریافت [illegible]

"جامع لیگ آف پاکستان" کو مضبوط بنائیں۔

جامع لیگ آف پاکستان بے معنی جماعت اور بے مطلب نام ہی نہیں۔ بلکہ محرک نے بہت ہی سوچ بچار سے یہ نام تجویز کیا ہے

ج - جماعت اسلامی
ا - اسلام لیگ
م - مسلم لیگ
ع - عوامی لیگ

ان چار مشہور سیاسی جماعتوں کے پہلے چاروں حروف کے ملانے سے "جامع" ہو جاتا ہے ہماری اس جماعت میں سب جماعتوں کے چیدہ چیدہ حضرات ہونگے اور سب کے تعاون سے حکومت چلیگی۔ کسی کو مزید شور کرنے کی گنجائش ہی نہ ہوگی۔

ع:۔ جماعت اسلامی سے چنے ہوئے حضرات دستور اور قانون کو اسلامی سانچے میں ڈھالینگے۔

ا:۔ اسلام لیگ کے رضاکار جلسوں اور سرکاری وزرا کی کوٹھیوں پر بیلچہ کاندھوں پر رکھے ہوئے ڈیوٹی دینگے پولیس اور باقی تمام کام رضاکارانہ اسلام لیگی رضاکار کریں گے۔ کافی بچت حکومت کو ہوگی۔

م:۔ مسلم لیگی نواب لندن امریکہ، فرانس و دیگر ممالک میں سفارتی خدمات انجام دینگے۔

ع:۔ عوامی لیگ کے وکلا ملکی نظام میں عدالت ہائے فوجداری و دیوانی میں فیصلہ دینگے۔ جامع لیگ پاکستان کی ایک بڑی سیاسی جماعت ہوگی۔ ہماری یہ تحریک کامیاب ہونے پر کسی کو حکومت پر شک و شبہ

سید طاہر علی شاکرؔ

غزل

یہ کمالِ بے خودی تھا یا کمالِ ہوش تھا
میں اسے دیکھا کیا ہر چند وہ روپوش تھا

پوچھتے ہم کس سے آخر رازِ سوزِ عشق کا
شمع بھی خاموش تھی پروانہ بھی خاموش تھا

میں نے یہ دیکھا جہانِ بیخودی عشق میں
جس کو جتنا ہوش تھا اتنا ہی وہ بیہوش تھا

ساقیِ میخانہ تجھ کو وہ زمانہ یاد ہے
میں اکیلا تیرے میخانے کا جب مینوش تھا

مرتے دم اک بیخودی شاکرؔ پہ طاری تھی مگر
نام تیرا لے رہا تھا اس کو اتنا ہوش تھا

ساغرؔ ہوشیارپوری

"تیر و نشتر"

کہیں مخمل کہیں خوشبو کہیں عشرت کہیں نغمے،
شبستانوں کا ہر ذرہ ترا ممنون ہے ساقی
پیا جاتا ہے جامِ احمریں جو تیری محفل میں
ہزاروں مفلسوں کی حسرتوں کا خون ہے ساقی

بہت ہی گر گیا ہے دہر میں کردارِ انسانی
ہزاروں عصمتوں کا پاک دامن چاک ہوتا ہے
جہانِ نو کی اس وحشت پسندی بربریت پہ
زمیں روتی ہو سارا آسماں غمناک ہوتا ہے

ہویدا ہو رہے ہیں ہر طرف آثار ظلمت کے
خدا جانے کوئی تازہ مصیبت آنے والی ہے
مجھے اکثر خیال ہوتا ہے تنہائی کے لمحوں میں
کہ شاید بزمِ ہستی میں قیامت آنے والی ہے

شید احمد

ایک اچھی عورت

میں بالکل سوالیہ نشان بنکر رہ گیا اور وہ غضبناک ہوکر کہتی
ہی تھی ، ہم یہ ذلت برداشت نہیں کرسکتیں ، یہ سنگاپور کی عورتوں
توہین ہے ، یہ جھوٹ ہے ۔ فریب ہے ، یہ سرمایہ دارانہ چال ہے
یاشی کا پھندہ ہے ، یہ دھوکا ہے ۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور
ں نے کہا۔

"مس نیلی تیو ۔ ماجرا کیا ہے مجھے بھی کچھ بتاؤ گی یا یونہی بکے
ؤ گی ۔"

"میں بکتی ہوں یا تم مرد بکتے ہو ۔ دیکھو یہ کیا لکھا ہے اس نے
گاپور کا انگریزی پرچہ سنڈے اسٹینڈرڈ میری طرف پھینکتے ہو
ہا۔

"کیا ہے" ؟ میں نے کہا

"خود پڑھ لو" اس نے چمکدار آنکھیں نکالتے ہوئے کہا

چینی معزز خاندان اب بھی اندرون چین سے شادی کرکے
ناپسند کرتے ہیں (یہ سرخی تھی) ۔ (اس کے نیچے ایک معزز
خص تان سن مینگ کا بیان تھا ۔ یہ شخص ابھی حال ہی چین سے
یک دوشیزہ سے شادی کرکے اسے ساتھ لایا تھا)

"ہم اندرون چین سے شادی کرکے لانے کو اب بھی
زیادہ پسند کرتے ہیں ۔ اگرچہ وہاں کی عورتیں زیادہ پڑھی لکھی
نہیں ہوتیں لیکن وہ بہترین بیوی ، بہترین ماں اور بہترین خانگی
شیر ہوتی ہیں اس کے خلاف سنگاپور کی لڑکیاں سوائے فیشن
برتنے کے اور کچھ نہیں جانتیں اور ان میں ایک اچھی بیوی یا اچھی ماں
بننے کی صلاحیت بالکل نہیں پائی جاتی !

مجھے اپنی بیوی کو لانے میں اڑھائی ہزار ڈالر کا خرچ
اٹھانا پڑا ہے جو صرف وہاں سے لانے کا سفرخرچ ہے اس کے خلاف
میں اس رقم سے یہاں شادی کرسکتا تھا لیکن میں اس ڈھائی ہزار
کے فاضل خرچ کو اپنے خانگی سکون کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں سمجھتا"

"اس میں توہین کی کونسی بات ہے" میں نے مس نیلی تیو
کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ توہین نہیں تو اور کیا ہے ، کیا سنگاپور میں خوبصورت
لکھی پڑھی لڑکیوں کی کمی ہے ۔" مس نیلی تیو نے فخر سے گردن
اونچی کرتے ہوئے کہا۔

"تو کیا تم سمجھتی ہو کہ عورت کیلئے خوبصورت اور لکھی پڑھی
ہونا ہی کافی ہے" میں نے کہا

"تو اور کیا چاہئے تم مردوں کو ، میں تو دیکھتی ہوں کہ
جہاں کوئی سجی بنی ہوئی خوبصورت لڑکی سڑک پر سے گذری
کہ تم مردوں کی گردنیں جھٹ اس کی طرف مڑ گئیں اور جب تک
وہ سامنے رہی تمہاری آنکھیں اس کی چٹیا سے لیکر اس کی جوتی
تک نیچے اوپر پھرتی رہتی ہیں آخر یہ کونسی بات ہے پھر !" مس
نیلی تیو نے کہا۔

"مس نیلی تیو تمہارا مزاج بہت گرم ہے اگر تم غور سے
سنو تو میں تم کو حقیقت حال سے آگاہ کرسکتا ہوں اور اگر تم ٹھنڈے
دل سے اس بیان کو پڑھو تو اس شخص نے اخبار میں بیان دیکر
تم جیسی نوخیز لڑکیوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے کیونکہ تمہیں
ابھی اس منزل کی طرف قدم بڑھانا ہے جس منزل کی وہ نشاندہی
کر رہا ہے" !

"ہاں بڑے آئے احسان کرنے والے" ! مس نیلی تیو نے
کہا۔

"تو پھر میرا خیال ہے تم غور نہیں کروگی" ۔ میں نے بیزاری کا

...لہا کہتے ہوتے کہا

"...لیں ہوگئے ہو کہتے، احسان کس چیز کا، میاں باسطیہ ...رف پیسے کا کھیل ہے، اس چینے کے پاس سرمایہ تھا تو یہ ڈھائی ...رار فضول سفر خرچ کر کے چین سے دلہن لے آیا، اگر تمہیں شادی ...رنا ہو تو کیا کرو ؟"

میں پوچھتی ہوں !

"...مس نیلی تیو، ابھی تو میں کہہ رہا ہوں کہ اس چینے شریف ...دمی نے ہم تم دونوں پر احسان کیا ہے۔"

"اچھا تو اب آپ بھی ممنون ہونے لگے" مس تیو نے کہا

"میں تو پہلے ہی سے اس چیز کو سختی سے محسوس کرتا تھا ...یکن اس شخص نے اخبار میں میرے احساسات کی ترجمانی کی ہے ...س لئے میں اس کا بہت شکر گزار ہوں"

"وہ کون سے احساسات ہیں۔ ذرا میں بھی تو سنوں!" ...س تیو نے محبت بھرے انداز میں میرے گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"میں موتیوں کو راکھ میں پھینک دینے کا قائل نہیں ...ہوں۔ اگر تم وعدہ کرو کہ تم ان پر پوری سنجیدگی سے غور کرو گی ...و میں ضرور تمہیں سمجھانے کی کوشش کرونگا مس تیو!" میں نے کہا

وہ کچھ کھوسی گئی اور ایک آدھ منٹ تک خاموش رہنے کے بعد اس نے پھر کہا "ہاں میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں پوری سنجیدگی سے ان باتوں پر غور کروں گی!"

"اور یہ وعدہ بھی کرو کہ اگر میرے خیالات تمہیں اپیل کریں تو تم ان پر عمل بھی کرو گی۔"

"ضرور۔ ضرور" اس کی پیشانی پر پسینہ آگیا اور اسکی آنکھوں میں ایک وقار اور خود اعتمادی جھلکنے لگی۔

"تو سنو" میں نے کہا۔

"مس نیلی تیو۔ عورت اور مرد زندگی کے اتھاہ سمندر میں تیرنے والے دو بازو ہیں تم بتاؤ اگر ان میں حضارمیں ان دونوں میں سے کوئی ایک آوارہ ہو جائے وہ اپنا مقصد بھول جائے اپنی حرکات کو غیر منظم کر دے تو اس کشتی کا کیا ہو؟ یقیناً وہ ڈوب جائیگی"۔ مس تیو نے فوراً کہا۔

"قدرت نے زندگی کے مختلف مراحل میں سفر کرنے کے کیلئے عورت اور مرد کا ایک جوڑا مقرر کیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے غمگسار اور مددگار ہیں۔ جوں جوں انسان متمدن ہوتا گیا وہ جنگل سے نکل کر دیہاتوں اور شہروں میں آباد ہوتا گیا اس نے رہائش کے لئے ایک مکان تعمیر کیا اور اس کے تمام انتظامات عورت کے سپرد کئے اور خود بیرونی دنیا میں ہاتھ پاؤں مار کر روزی کی ضروریات کا بوجھ اپنے سر لیا۔ عورت گھر کی آرائش بچوں کی پرورش مہمانوں کی نگہداشت بیماروں کی عیادت کا کام کرتی رہی اور مرد دن بھر محنت اور مزدوری کر کے شام کو دن بھر کی کمائی عورت کے دامن میں لا ڈالتا رہا۔ جب تک یہ گاڑی اس انتظام کے ساتھ چلتی رہی، ان کی زندگی پرسکون اور ان کا گھر رشک گلزار بنا رہا اور جونہی ان دونوں نے اپنے فرائض میں کوتاہی برتنی شروع کی۔ عورت نے گھر کی نگہداشت بچوں کی پرورش اور بیماروں کی عیادت کا کام چھوڑ کر گھر سے باہر گھومنا شروع کیا اور مرد نے دن بھر کی کمائی اپنی بیوی کے دامن میں ڈالنے کے بجائے خود خرچ کرنی شروع کی۔ دونوں پریشان ہو گئے دونوں کی زندگی اجیرن ہو گئی ان کا شیرازہ بکھر گیا ان کا اتحاد برباد ہو گیا۔ اب یا تو وہ شہروں اور دیہاتوں سے نکل کر پھر جنگلوں میں بھیڑیوں گیدڑوں اور ریچھوں کی زندگی گذاریں یا اپنے گھروں کو پھر اس طرح آباد کریں جس طرح ان کی فطرت نے انہیں سکھایا تھا، دونوں میں سے ایک صورت ضرور اختیار کرنی پڑے گی۔

"بات تو کچھ ایسی ہی معلوم ہو رہی ہے" مس تیو نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں مس تیو اس شخص نے سنگاپور سنڈے اسٹینڈرڈ میں بیان دیکر ہم پر زبردست احسان کیا ہے ہر زندگی کی طرف دعوت دی ہے جس کو اس نے خود حاصل کیا

اور ان نقائص کی مختصر سی نشاندہی بھی کردی ہے جو ایک سنگاپور کی عورت میں محسوس ہوتے ہیں۔

"تم دیانت داری کے ساتھ مس تیمو کہو۔ میرا تمہارا کیا رشتہ ہے۔ ہم میاں بیوی نہیں ہیں۔ ہمیں کیا حق پہنچتا ہے کہ ہم گھنٹوں ہوٹل میں بیٹھکر غپ شپ مارتے ہیں اور مفت میں چار پانچ ڈالر روزانہ خرچ کر دیتے ہیں۔ سینما دیکھتے ہیں کلبوں میں قہقہے اڑاتے ہیں۔

خدا کے لئے غور کرو۔ اگر تم ایک اچھی بیٹی ایک اچھی بہن بنکر یہ وقت گھر میں گزارو۔ اپنی ماں کے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹاؤ۔ چھوٹے بہن بھائیوں کو دیکھو۔ ان کو پڑھاؤ۔ ان کو سکھاؤ اور یہ روز کے چار پانچ ڈالر ہوٹل والے کی نذر کرنے کی بجائے گھر کی زینت اور رکھ رکھاؤ میں خرچ کرو تو تمہارا گھر چند ماہ میں رشک گلزار بن جائے۔

"کیوں میں سچ کہتا ہوں یا جھوٹ؟"

"بالکل سچ!" مس تیمو نے آنکھیں نیچی کرتے ہوئے کہا

"لیکن یہ انگریز لوگ تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" بات ادھوری چھوڑتے ہوئے اس نے رکتی ہوئی زبان سے کہا۔

"ہاں مس تیمو۔ یہ بات تو میں بھول ہی گیا تھا سنو۔ تم نے سنا ہوگا۔ ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور کھانے کے اور۔"

"ہاں"

"مس نیلی تیمو۔ دنیا پہلے چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں بٹی تھی ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کی فطری صلاحیتوں کو حیلے بہانے ختم کر کے اس پر اپنی سرداری کرتا رہا اس کے بعد ملکوں میں بٹی اور یہ ملک اسی طرح دوسرے ملکوں پر قبضہ جمائے رکھتے رہے لیکن اب دور تیسرا آگیا ہے اور دنیا مشرق و مغرب میں تقسیم ہو چکی ہے تم جانتی ہو کہ مغرب کی قوموں کا مشرق پر ایک مدت تک قبضہ رہا اور اب بھی بہت جگہ موجود ہے اس لئے مغرب کبھی نہیں چاہے گا۔ کہ مشرق کے لوگ زندگی کے مقاصد پر عمل کر کے ترقی کریں۔ وہ عورت اور مرد کو ایسی راہیں دکھائیگا جو انہیں ایک دوسرے سے دور لے جائیں ان کا شیرازہ زندگی منتشر ہو جائے ان کا خانگی سکون چھن جائے۔ وہ مشرق کے شہزادے کو مغربی ایکٹریسیں پیش کرے گا۔ لیکن اگر اپنا شہزادہ یہی قصور کرے تو اسکو ٹانگوں سے پکڑ کر تخت سے نیچے گرا دے گا۔

وہ مشرقی عورت کو ننگے ناچ سکھائے گا لیکن ڈوننگ اسٹریٹ کی کسی دوشیزہ کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیگا پھر آخر ہم انکی نقل کیوں کریں۔ انکی زمین ان کی آب و ہوا، ان کی زبان ان کی ہر چیز جب ہم سے جدا ہے وہ ہم سے جدا رہتے ہیں تو پھر ہم ان کی نقل کیوں کریں؟ اور تم تو مس تیمو پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ روزانہ اخبار دیکھتی ہو انگریزی اخباروں میں عورتوں اور مردوں کے ایک دوسرے کے خلاف روزانہ مقدمات عدالتوں میں تم نے پڑھے ہی ہونگے۔

"بیشک سنے ہیں" اس نے ذرا مسکرا کر کہا۔

"تو پھر تم ہی غور کرو، کہ ان کی خانگی زندگی میں کہاں سکون ہے؟"

"خانگی زندگی۔ میں تو سمجھتی ہوں ان کے گھر دوزخ ہیں جہاں جھگڑا فساد، تو تم بیزار اور مقدمات کی بھرمار رہتی ہے مسٹر باسط"

"شاباش مس تیمو، تم بہت سمجھدار ہو"

"اچھا خدا حافظ۔ پھر ملاقات ہوگی" میں نے اٹھتے ہوئے کہا

"نہیں مسٹر باسط۔ اب میں نہ مل سکوں گی۔ میں اپنے گھر میں رہونگی اور دنیا کو دکھا دونگی کہ سنگاپور کی ایک لڑکی اچھی بیٹی اچھی بہن اور اس کے بعد ایک اچھی ۔ اس کی آنکھوں میں سے آنسو بہہ نکلے۔

اور ہم دونوں روتی ہوئی آنکھوں اور مرجھائے ہوئے دلوں کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا ہوگئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دن مہینے گذرتے گذرتے سالوں میں تبدیل ہونے

لگے ہی تھے کہ ایک دن ابا جان کی میز پر ایک کھلا ہوا
پڑا تھا - مجھے ایک غیر محسوس قوت نے اس خط کو
ھ لینے پر مجبور کیا - شاید وہ خط اسی لئے رکھا تھا کہ
ں پڑھ لوں ——— یہ خط مس نیلی تیمو کے

والد کا تھا ——— اس والد کا جس کی اچھی بیٹی اب
اپنا ایک اچھی بیوی ہونا ثابت کرنے کے لئے
زندگی کے میدان میں قدم رکھ رہی تھی -
(جہانِ نو)

نسوانی امراض کے لئے حاذق دواخانہ کی مایۂ ناز ایجاد

فیمیلن ——— نسائی خاص

یہ گولیاں عورتوں کی پوشیدہ شکایتوں کو دور کرنے میں
اکسیر ہیں - سیلان ماہواری کی بے قاعدگی اور اسی قسم کی دوسری

زنانہ شکایتوں سے پیدا شدہ جملہ نقائص کو دور کرنے
میں اکسیر ہیں - استقرار حمل کو مدد دیتی ہیں - گویا
عورتوں کے لئے ایک جنرل ٹانک ہے - جس کا
متواتر استعمال عورتوں کے نظام عصبی کو درست
کرتا ہے جن عورتوں کو اسقاط حمل کی بار بار شکایت
ہوتی ہے ان کے لئے بے حد مفید ہے -

فی شیشی :- دو روپے بارہ آنے

تیار کردہ :- حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی نمبر ۱

رضیا جبین ناہید •

خاتونِ مشرق

"زینتِ ایوانِ مشرق اے بہارِ ایشیا"

رونق گلزارِ عصمت پیکرِ شرم و حیا

لافنا تیری وفا تیری محبت ہے غیور

تجھ کو پھر کہئے نہ کیونکر جنتِ مشرق کی حور

تو نے سیکھی ہی نہیں ہیں انجمن آرائیاں

نشانِ عفت جانِ عصمت ہیں تیری رعنائیاں

زیبِ شمعِ سامانِ آسائش ہے تیری سادگی

تو نزاکت میں ہے، گویا اک شگفتہ کی کلی!

دیکھ شعلے مغربی تہذیب کے اب تو ذرا

تیری جانب آرہے ہیں ہوش کر، دامن بچا

تیرے استقلال میں پنہاں ہے اک رازِ حیات

تیری خاموشی ہے گویا نغمۂ سازِ حیات

(شاہوار)

عبدالحفیظ خاں ●

قبولِ حق کی گھڑی

نسیم جب بھی گھر میں رہتا مسلسل اُداسی اور دائم فکر و غم کی تصویر بنا رہتا۔ اس کی بیوی نجمہ آج کل کے بے حس ماحول کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ نجمہ کی زندگی کا مقصد کھانا، پینا، پہننا، اوڑھنا اور اپنا وقت بیکار مشاغل میں برباد کر دینے کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

جاڑوں کی تاریک رات تھی، ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی، لحاف سے نکلنے کو جی نہ چاہتا تھا، ہر ایک مست خواب تھا۔ نجمہ لحاف میں دبکی ہوئی بے فکری کے مزے لے رہی تھی۔ نسیم چارپائی پر بیٹھا ہوا مطالعے میں غرق تھا۔ کمرے میں بالکل خاموشی تھی۔ صرف کبھی کبھی جھینگروں کی جھنجھناہٹ کی آواز آجاتی تھی یا قریب کھانے کی الماری میں چوہا۔ وہی کے سوٹے تکرانے کتر رہی تھی۔ نسیم پڑھتے پڑھتے سنجیدگی سے غور کرنے لگا کہ

عورت کے بگڑنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام نسل کی ذہنی اخلاقی حالت مسموم ہو جاتی ہے۔ کوئی ماں اپنے بچے کے منہ میں صرف دودھ ہی نہیں پلاتی بلکہ اس کے ساتھ اپنے اخلاق کی روح بھی اس کی رگ رگ کے اندر اتارتی ہے۔ اگر اس کے اندر روح دین کمزور ہے، اخلاق انسانی اور حس ایمانی مردہ ہے تو اس سے زیادہ مریضانہ جراثیم بچے میں سرایت کر جائیں گے جتنے ایک مدقوق ماں کا دودھ پینے سے بچے کے اندر پہنچ جاتے ہیں۔ صحیح اسلامی تربیت کا اصلی سرچشمہ اور بہترین ذریعہ ہماری مائیں ہیں۔

یہاں آکر نسیم یکایک رک گیا۔ کتاب اس نے اپنے سینے پر چھوڑ دی اور سوچنے لگا، اس ازدواجی اور خانگی زندگی میں روزانہ پیش آنے والے واقعات سنیما کی ریل کی طرح ایک ایک کر کے اس کے ذہن میں گھومنے لگے۔

اس کی خوشیوں کا مرکز، اس کی خواہشوں کا مرجع اور اس کی امیدوں کا ہر ابھرا کھیت اس کی نظروں کے سامنے سوکھتا ہوا دکھائی دے رہا تھا اور پھر ایسا معلوم ہوا جیسے چھوٹے منے کا گلا کوئی تیز چھری سے کاٹ رہا ہو اور ننا کر سب میں بری طرح تڑپ رہا ہے۔ وہ ایک ساتھ گھبرا اٹھا۔ اس کا دل بے چین ہو گیا۔ مضطرب ہو کر ذہن میں طرح طرح کے خیالات گھومنے لگے اور بے چینی کے عالم میں بے ساختہ اس کی زبان سے "یا اللہ" افسوس کے ملے جلے لہجہ میں نکل گیا۔

نجمہ جو قریب چارپائی پر ہی لحاف میں منہ چھپائے لیٹی تھی ایک ساتھ چونکی ہو گئی اور گھبرا کر نہایت سنجیدہ لہجے میں بولی "میرے سرتاج خیریت تو ہے، خدانخواستہ کہیں طبیعت ناساز ہے؟"

نسیم نے جب نجمہ کی طرف دیکھا تو وہ غیر معمولی سنجیدہ معلوم ہوتی تھی اس نے یہ موقع غنیمت جانا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ قبولِ حق کی کڑی گھڑی اور ایسے موقع پر ہی حق کا بیج بارآور ہوتا ہے۔ اس نے کہنا شروع کیا: "نجمہ تمہاری بے فکری، غیر ذمہ داری اور تغافل میرے لئے سخت سوہانِ روح بنا ہوا ہے۔ میں کن الفاظ میں تمہیں سمجھاؤں کہ میں نے اپنی زندگی کے لئے کونسا راستہ تجویز کیا ہے اور میری منزل مقصود کیا ہے جہاں تک میں پہنچنا چاہتا ہوں لیکن راستہ بہت دشوار گزار ہے اور پھر تنہائی بہت تھکن۔ پھر کوئی ہم سفر نہیں جو کلفتوں میں غمخوار بن سکے اور جو ساتھ چلو کہ ہمت بندھا سکے۔

اور سوچو تو سہی میری زندگی کی گاڑی ایک ہی پہیے پر کیسے سفر جاری رکھ سکے گی .... اور .... پھر مجھے بھی ......

....

.... کیا تم نہیں جانتیں کہ یہ منا جو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ ہمیں عزیز ہے۔ اللہ کی ایک زبردست امانت ہے اور ایک ایسی ذمہ داری ہے جس پر پورا اترنا ہماری تمہاری کامیابی ہے۔

نسیم نے بھرائی ہوئی آواز سے کہنا جاری رکھا۔

کیا کوئی ذاتی ماں یہ پسند کر سکتی ہے کہ اس کا لال آگ میں جا گرے اور سانپ بچھو اسے اذیت پہنچائیں۔

بیگم ننھے کی آخرت سدھارنا تمہاری تربیت اور تمہارے اخلاق پر منحصر ہے۔ کیونکہ بچہ ایک آئینہ ہے جو ماں کا عکس لازمی قبول کرتا ہے کیا تم نے کبھی سوچا۔
اور کہتے کہتے نسیم ایک ساتھ خاموش ہو گیا

نجمہ شدت احساس سے رو رہی تھی۔ اور نسیم پر امید نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا کہ گھڑی نے ٹن ٹن بارہ بجائے۔

(بشکریہ الحسنات)

پیغام اپنی بہنوں کے نام

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تن درستی اور بیماری ہر فرد بشر کے ساتھ ساتھ ہے جب کبھی آپ بیمار ہوں اور آپکو کسی دواخانہ کی طرف رجوع کرنا پڑے تو قدرتی طور پر ذہن میں یہ سوالات پیدا ہونگے۔ (ا) کیا دواخانہ جس کی طرف آپ رجوع کر رہی ہیں قابل اعتماد ہے محض اشتہاری تو نہیں اور کیا وہ اپنے مرکبات و مجربات کو دیسی نسخوں کے اصل وزن کے مطابق ڈال رہے ہیں۔ (ب) کیا تجربہ کار اور صحیح طبیب ہمارے مرض پر غور کر کے ہمارے مرض کیلئے صحیح دوا تجویز کر رہے ہیں جہاں تک حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی نمبر ا کا تعلق ہے مجھے فخر ہے کہ وہ اس معیار پر بفضلہ تعالیٰ پورا اتر رہا ہے۔ عالی جناب امام طب حکیم سید محمد صاحب دہلوی کی سرپرستی ہی اس دواخانہ کی صداقت کی بہترین ضامن ہے۔ حکیم صاحب موصوف کی شخصیت کسی نئے تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ فن طبابت میں ۴۰ سالہ تجربہ رکھتے ہیں۔ آپ کی زندگی کے قیمتی ۸ سال مسلسل طور پر جناب مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب دہلوی مرحوم و مغفور کے پیشی کی حیثیت سے انکے سفر و حضر میں انکے ساتھ کٹے۔ آپ ہندوستانی دواخانہ دہلی کے ہر شعبہ کے مسلسل چھ سال تک ہر شعبہ کے نگران رہے ہیں۔ کتاب حاذق، انا دات مسیح الملک، اور مطب کلاں آپ کی وہ مایہ ناز اور مقبول عام تصانیف ہیں جن پر طب یونانی ہمیشہ فخر کرے گی۔ علاوہ آپ یونانی طبیہ کالج دہلی کے اعلیٰ کلاسوں کے پروفیسر رہ چکے ہیں اور آپکی طبی خدمات کے اعتراف میں یونانی طبیہ کالج کی سلور جوبلی کے اہم موقعہ پر ۱۹۴۷ء میں منتظمان کالج نے آپ کو امام طب کی اعزازی ڈگری سے سرفراز فرمایا۔ ع

این سعادت بزور بازو نیست

حکیم صاحب موصوف بنفس نفیس "حاذق دواخانہ" کے جملہ امور کے نگران ہیں اور مطب کے علاوہ اپنا تمام وقت اور توجہ دواخانہ ہذا کی اصلاح اور درستی میں صرف کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے مجوزہ اور انکے زیر نگرانی تیار کرائے ہوئے اس دواخانہ کے مجربات اور مرکبات آپکی صحت کے بہترین ضامن ہیں۔

اگر آپکو اپنی یا اپنی عزیزوں، ملنے والیوں یا اپنے بچوں کے لئے کسی مفرد یا مرکب دوائی کی ضرورت ہو یا کوئی طبی مشورہ درکار ہو تو آپ بے تکلف لکھ کر اور اسے لفافہ میں بند کر کے مجھے بھیجدیں لفافہ پر حاذق دواخانہ کراچی نمبر ا کے ساتھ الفاظ "طبیبہ شعبہ زنانہ" لکھ دیجئے آپ کا خط سوائے میرے کوئی نہیں کھول سکتا میں آپکے خط کو اچھی طرح پڑھ کر اور حکیم صاحب سے مشورہ کر کے آپکے لئے مناسب دوائی بھجوا دوں گی یا اسکے متعلق آپ کو اطلاع دوں گی۔ اگر ذاتی مشورہ لینا ہو تو صبح نو بجے سے ایک بجے تک دواخانہ میں تشریف لائیں۔ میں وہاں موجود ہوں گی۔ پردے کا بہترین انتظام ہے۔ میری وساطت سے حکیم صاحب سے بہترین اور سچا مشورہ مل سکے گا۔ حاذق دواخانہ کے اصل انتظامات سے جہاں اب تک میری بے شمار بہنیں فائدہ حاصل کر چکی ہیں امید ہے کہ آپکو اپنی صحت کے بارے میں سچا اور مناسب مشورہ ملے گا۔

آپ کی خادمہ:-

طبیبہ شعبہ زنانہ حاذق دواخانہ، بندر روڈ، کراچی نمبر ا

...رنس گاوَلڈ

کیا آپ کا شوہر

اپنی شادی سے مطمئن ہے ؟

بیشتر عورتیں اپنے مردوں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتی ہیں
...ت کم ایسی خوش نصیب ہیں جنکو اپنے رفیق پر پورا پورا بھروسہ ہے
...ر وہ بیچاریاں کروٹیں بدلتی رہتی ہیں ، خلاؤں میں جھانکتی رہتی ہیں
...ر سوچتی رہتی ہیں۔ " مردوں کی فطرت ہی ایسی ہے ..... بھلا میں
...یا کر سکتی ہوں " ! ——— لیکن جس طرح تمام بیماریوں کا علاج
...ہو سکتا ہے۔ اسی طرح " بیوفا " شوہر کو بھی راہ راست پر لایا جا سکتا
...ہے . مردوں کی فطرت کو کوسنے سے کچھ بھی نہ ہوگا۔ آپ ان کو کوستی
...رہیئے ، برا بھلا کہتی رہیئے۔ وہ ایسے ہی رہیں گے۔ ضرورت اس بات
...کی ہے کہ آپ جذباتی انتقام کو بالائے طاق رکھکر حقائق پر نظر ڈالیے

۱۔ اگر ایک شوہر اپنی بیوی سے بیوفائی کرتا ہے تو اسکی
...وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی شادی سے خوش نہیں ہے۔ بیوی سے مطمئن
...نہیں ہے۔

۲ - اگر وہ اپنی شادی سے مطمئن ہے تو اپنی بیوی کی
...قربت چاہے گا نہ یہ کہ اس سے دور بھاگے۔

میرا مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہر شخص ، جو اپنی شادی
...سے مطمئن نہیں ہوتا ، وہ اپنی بیوی کا وفادار نہیں ہوتا ، وہ وفادار
...ہو سکتا ہے۔ مختلف وجوہ سے وہ اپنی بیوی کے ساتھ کسی نہ کسی
...طرح زندگی گزار دینا چاہتا ہے ، مثلاً مذہبی عقائد سے دب کر یا
...اس خوف سے ، کہ دنیا کیا کہے گی .... مگر صرف ایسی عورتیں
...اپنی شادی کی بنیادیں آہنی ہیں . جو بلا جھجک کہہ سکتی ہیں۔ " میرا
...شوہر اپنی شادی سے مطمئن ہے وہ ازدواجی زندگی میں کوئی کمی
...محسوس نہیں کرتا " لیکن سوال یہ ہے کہ آپ کو معلوم کیسے ہو کہ
آپ کا شوہر شادی سے مطمئن ہے اور اگر آپ یہ جان لیں کہ وہ مطمئن
نہیں ہے تو کس طرح اسے مطمئن کیا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ مرد شادی سے اسی وقت مطمئن ہو سکتا ہے جبکہ
اسے وہ سب کچھ مل جائے جو وہ اس سے چاہتا ہے۔ ہاں ، ایک دشواری
یہ پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ جانتا ہی نہ ہو کہ آخر وہ کیا چاہتا ہے ....
.... اور غالباً آپ بھی نہیں بتا سکتیں کہ وہ چاہتا ہے جبتک
آپکے مشاہدہ میں ایک بڑی تعداد شادی شدہ عورتوں کی حقیقی زندگی
کی نہیں آتی ، آپ سمجھتی ہیں کہ مرد ظاہری چمک دمک ، نقرئی قہقہوں کا
دلدادہ ہے ، اس لئے لڑکیاں شادی سے پہلے بیش قیمت ملبوسات
بناتی ہیں اور شادی کے بعد چاہتی ہیں کہ جب مرد کو ظاہری چمک
دمک مل گئی تو اسے کیا حق ہے کہ غیر مطمئن رہے۔

میرا دل چاہتا ہے کہ آپ مس ڈی آنا کو جانتی ہوتیں۔
شادی کے پانچ برس بعد بھی اسکی چال ڈھال اور ملبوسات کی رنگینی
کا یہ عالم تھا کہ وہ جدھر سے گزرتی۔ لوگوں کی نگاہیں بے اختیار
اُدھر اٹھ جائیں لیکن آپ کو معلوم ہے کہ بیچاری کا حشر کیا ہوا —؟
طلاق ...... کیوں ؟ اس کے شوہر کی زبانی سنیئے۔ میں مانتا
ہوں کہ ڈی آنا خوبصورت ہے ، آنکھیں اسکی گرویدہ ہو جاتی ہیں
لیکن میں کیا بتاؤں کہ اس کے ساتھ گزرے ہوئے ایام کتنی کوفت
کتنی گرانباری میں گزرے ، جب دیکھو نئے نئے کپڑوں کی فرمائش
جب سنو یہی کہ مجھے ایسے ملبوسات کی ضرورت ہے . جیسے مسز فلاں
پہنے تھیں ، میرے لئے ویسے زیورات بنا دو جیسے مسز فلاں کے ہیں
ہمیشہ کپڑوں کی باتیں ، پارٹیوں کے تذکرے —— آہ ! میری

رگی موت سے بدتر ہوگئی تھی۔ اب میں ایسی لڑکی سے شادی کروں
جو پارٹیوں میں شرکت ناپسند کرتی ہو، جس کے ساتھ میں گھر
آرام سے سکون سے رہ سکوں"!

میں یہ نہیں کہتا کہ آپ بناؤ سنگھار سے بالکل بےخبر ہو جائیں
ونکہ اسکی بھی بہت کچھ اہمیت ہے اور اس کے بغیر بھی ازدواجی
دگی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ مگر شادی تمامتر بناؤ سنگھار ہی کا نام
ہیں ہے۔ غالباً آپ کو ایسا تو ایک مرد بھی نہ ملے گا جو صرف بناؤ
سنگھار ہی سے مطمئن ہو جائے اور اس کے علاوہ اور کچھ نہ چاہتا
ہو ——!

مسز کاف شاکی ہیں کہ ان کا شوہر موقع پاتے ہی اپنے احباب
محفل میں چلا جاتا ہے اور " جب مجبوراً گھر میں ٹھہرنا ہے تو کوئی
تاب پڑھا کرتا ہے، ریڈیو سنا کرتا ہے، مجھ سے مخاطب نہیں ہوتا
یسے میں گھر میں موجود ہی نہیں ہوں......"! اس میں مسز کاف
بھی غلطی ہے لیکن زیادہ نہیں۔ وہ اپنے دوستوں کی محفل میں
س لئے جاتا ہے کہ اسے وہاں وہ باتیں نصیب ہوتی ہیں جو اپنی
یوی کی قربت میں نہیں ملتیں۔ آخر وہ باتیں کیا ہیں؟——
یرا خیال ہے رفاقت، ہمدردی، قدرشناسی۔ میاں بیوی ایک
دوسرے کو چاہنے کے باوجود رفیق نہیں بنتے اور کبھی دونوں کو
س بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ ایک دوسرے کے رفیق بھی
ن سکتے ہیں...... لیکن جب وہ رفیق بن جاتے ہیں تو ان
..قت کی مثال نہیں ملتی، کیونکہ دنیا میں جس قدر یہ دونوں ایک
دوسرے کے قریب رہ سکتے ہیں کوئی بھی نہیں ہو سکتا —— اور یہ بھی
مر واقعہ ہے کہ اگر دونوں کا رجحان طبع ایک ہو تو وہ آسانی سے باہم
فیق بن سکتے ہیں مثلاً اگر ایک ڈاکٹر کی بیوی نرس ہو یا دونوں
پڑھاتے ہوں، تو ان کو زیادہ مواقع رفاقت کو نباہنے، استوار
کرنے کے ملتے ہیں...... لیکن اگر شوہر دن بھر باہر رہتا ہے اور
آپ گھر میں، تب بھی گھریلو زندگی، اخراجات و آمدنی اور بچے
وغیرہ کے علاوہ کچھ چیزیں ایسی ضرور ہونگی جن میں آپ دونوں
کی پسند ایک ہو۔

ممکن ہے آپ بھی بہت سے مردوں اور عورتوں کی طرح
اس غلط فہمی کا شکار ہوں کہ عورت کبھی مرد کی فطرت کو سمجھ ہی
نہیں سکتی، کیونکہ وہ اتنا عجیب، اتنا مختلف نظر آتا ہے۔ جی نہیں
یہ سب غلط ہے۔ آپ مرد کی فطرت کو سمجھ سکتی ہیں اور اچھی طرح
سمجھ سکتی ہیں۔ بہترین ترکیب یہ ہے کہ ان باتوں کے متعلق اس
سے گفتگو کیجئے جن میں وہ سب سے زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ اس سے سوالات
کیجئے۔ خواہ ان سوالات میں سے کچھ کے جوابات آپ جانتی ہی
کیوں نہ ہوں۔ یہ یاد رکھیئے کہ مرد کی یہ دلی خواہش ہے کہ جن باتوں
کے متعلق وہ جانتا ہے ان کو کسی سے بیان کرے جبکہ دھیان دیکر
سننے والی ہستی ایک عورت ہو۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی نہ
بھولئے کہ اگر آپ سوالات کرکے اس کے جوابات پر دھیان نہ
دینگی تو آپکے بشرے سے فوراً پتہ چل جائیگا کہ آپ کچھ اور سوچ
رہی ہیں۔

اچھا اب ذرا ان سوالات کے جوابات تو دیجئے!

۱۔ اگر آپکا شوہر کہے کہ وہ کسی دوسرے شہر میں جاکر رہنا
بسنا پسند کرتا ہے تو...... کیا آپ بلاجھجک کہدینگی "ہاں، ہاں
جہاں تم جاؤگے میں بھی جاؤنگی، جہاں تم رہوگے میں بھی رہوں گی
ہمیشہ تمہارے ساتھ......؟

۲۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ اگر آپ کا شوہر کسی الجھن میں
گرفتار ہے، کسی ناگہانی مصیبت میں پھنس گیا ہے، تو وہ سب سے
پہلے آپ سے کہے گا؟

۳۔ کیا وہ اکثر اوقات اپنے پیشہ کے متعلق آپ سے
گفتگو کیا کرتا ہے؟

۴۔ کیا آپ اس کے پیشہ کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے
مسرور ہوتی ہیں؟

۵۔ کیا وہ اکثر آپکے گھریلو کاموں میں آپکی مدد کیا کرتا ہے
مثلاً صفائی میں، برتنوں کو دھونے میں، ان کاموں میں جو آپکے
سپرد ہیں؟

۶۔ کیا آپ اکثر اسکے اپنے کاموں میں اسکا ہاتھ بٹایا کرتی ہیں؟

۷ - کیا کوئی ایک کتاب آپ دونوں نے پڑھی ہے اور آپس میں اس کے متعلق گفتگو کی ہے ؟
۸ - کیا اس کے بیشتر اقربا (جن میں اعزا، و احباب شامل ہیں) آپ کو پسند کرتے ہیں ؟
۹ - کیا آپ اس کے بیشتر اقربا کو پسند کرتی ہیں ؟
۱۰ - کیا آپ کو کل رات کی گفتگو بالتفصیل یاد ہے ؟
۱۱ - جب وہ اپنی مخصوص پسند کی چیزوں کے متعلق آپ سے گفتگو کیا کرتا ہے جس میں بظاہر آپ کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، تو کیا آپ اس کی باتوں کو غور سے سنتی ہیں - یا کچھ اور سوچتی رہتی ہیں!
۱۲ - کیا آپ اپنے شوہر کی قربت کو اتنا ہی عزیز سمجھتی ہیں جتنا اپنی کسی عزیز سہیلی کی موجودگی کو ؟

اگر آپ ان بارہ سوالات میں سے سات کے جوابات "ہاں" میں دے سکتی ہیں اور باقی سوالات کے جوابات بھی ہاں میں دینے کی کوشش کر رہی ہیں، تو آپ کا شوہر آپ سے خوش ہے اور وہ اپنی شادی سے مطمئن ہے!

(فردوس)

حاذق ہسٹریا پلز (گولیاں)

یہ مرکب گولیوں کی صورت میں خالص اور کمیاب جڑی بوٹیوں سے جدید طبی اصول پر تیار کی گئی ہیں جو کہ ہسٹریا جیسے موذی مرض کو جو ہماری نوجوان بہنوں میں آجکل عام ہو گیا ہے سو فیصدی کامیاب دوا ثابت ہو چکی ہیں۔

علاوہ ازیں یہ دوا عورتوں کی دیگر شکایات اعصابی کمزوری، ضعف، اختلاج قلب کیلئے بیحد مفید ہے بچوں کی مرگی کی لاثانی دوا ہے ۔

قیمت :- چالیس گولیاں (ایک شیشی)، پانچ روپے، علاوہ محصول

تیار کردہ :- حاذق دواخانہ، بندر روڈ، کراچی نمبر (۱)

طیبہ یاسمین

یہ ماحول

صبیحہ بہت نیک اور اچھی لڑکی تھی وہ کشمیر سے مہاجرہ ہو کر آئی تھی۔ اس کا آبائی وطن کشمیر تھا۔ اسے اپنے وطن سے بے حد محبت تھی تقسیم ہند کے بعد وہ بہت خوش ہوئی۔ مسلمانوں کے لئے ایک ایسا گھر مل گیا ہے جس کا نام پاکستان ہے اور وہ "لا الٰہ الا اللہ" کے وعدے پر بنایا گیا ہے وہ سمجھتی کہ پاکستان کی ہر چیز [illegible] باشندے [illegible] میں سب کچھ ایک ہوگا اور وہاں کے تمام [illegible] ہوں گے [illegible] بہت امن سے رہتے ہوں گے۔ تمام اپنی رعایا کا بہت خیال رکھتے ہوں گے۔ [illegible] بالکل برخلاف [illegible] میں پاکستان کی دید کی خواہش [illegible]

تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے بعد گو صبیحہ پاکستان جانے کی بہت خواہش مند تھی۔ مگر ان کے حالات ایسے نہ تھے کہ وہ پاکستان جا سکتے تھے کیونکہ ان کی آبائی جائداد اور رشتہ دار وغیرہ سب کشمیر میں تھے۔ ان کی لاکھوں کی جائداد تھی جسے چھوڑنا آسان نہ تھا لیکن صبیحہ چاہتی تھی کہ خواہ سب کچھ چھن جائے مگر وہ پاکستان ضرور جائے۔ وہ تو ایک [illegible] لڑکی تھی اس لئے اسے اپنے گزارے کا فکر نہ تھا مگر اس کے والدین صرف [illegible] کے خیال سے رکے ہوئے تھے اور چاہتے تھے کہ جب تک گزارہ ہو سکے کشمیر ہی میں رہا جائے۔

اچانک حالات نے پلٹا کھایا۔ کشمیر میں ایک نئی رو پیدا ہو گئی تھی اور [illegible] اپنا بچپن کشمیر کی سرسبز و حسین شاداب وادی میں گزارا تھا وہاں فرقہ وارانہ آگ برس پڑی۔ وہ کشمیر جو اس کے لئے راحت اور امن کا مقام ہوتا تھا۔ اب وہ وحشت اور خونخواری کا مجسمہ تھا۔ کشمیر کی پرامن وادی میں قتل و غارت کا طوفان امڈ پڑا تھا۔ صدیوں کے تعلقات ٹوٹ [illegible] ہزاروں [illegible] لاکھوں بچے یتیم ہو رہے تھے۔ روزانہ ان گنت قافلے بے کسی کی طرح

ان خونخوار غنڈوں سے بچ جانے پاکستان کی طرف روانہ ہوتے صبیحہ یہ سب کچھ دیکھ کر بہت گھبرائی اور حیران ہوئی۔ کہ کشمیر میں ایسا کیوں ہو رہا ہے مگر جب وہ قافلوں کو پاکستان کی طرف روانہ ہوتے دیکھتی تو دل ہی دل میں خوش ہوتی کہ شکر ہے خدا کا کہ ایک ایسی جگہ بھی ہے جہاں امن اور آشتی ہوگی اور جہاں برباد مسلمان رہ سکتے ہیں —— اس طرح اس کے دل میں پاکستان آنے کی ہمت اور بھی زیادہ ہوتی تھی۔

کچھ عرصہ اسی طرح گزرا صبیحہ کے والدین تا حال محفوظ تھے۔ مگر آخر کار صدیوں کے تعلقات کا نتیجہ وہاں کے خود غرض ہندوؤں نے یہ دیا کہ سارا مال و متاع کو لوٹ لیا اور انہیں صرف جان بچا کر بھاگنے کی اجازت ملی۔ صبیحہ کے والدین اپنی جائداد کے کھو جانے اور رشتہ داروں سے بچھڑنے اور اپنے وطن کو چھوڑنے سے بھی بہت رنجیدہ تھے صبیحہ اگرچہ وطن چھوڑتے وقت بہت روتی تھی۔ مگر پاکستان کا خیال آتے ہی وہ خوش ہو جاتی وہ کشمیر کی خون ریز وادی سے تنگ آ چکی تھی۔

پاکستان کی سرحد دیکھ کر صبیحہ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھر آئے اس نے سوچا کہ پاکستان میں صرف ان باشندوں کو رہنے کی اجازت ہوگی جو اپنی زندگی اسلام کے پاکیزہ اصولوں کے مطابق گزارتے ہوں گے اور پاکستان میں جتنے لوگ جاتے ہوں گے خواہ وہ پہلے کتنے ہی برے ہوتے ہوں۔ مگر وہاں پہنچ کر وہ اپنی زندگی یقیناً تبدیل کر لیتے ہوں گے اور یہی سوچ کر اس نے بھی ایک عہد کیا وہ عہد "**لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ**" تھا وہ اب مطمئن تھی۔

لاہور میں اس کے والد کے ایک پرانے دوست تھے۔ وہ ان کے ہاں عارضی طور پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ اور ایک ماہ کے بعد انہیں بہت مشکلات کے بعد ایک مکان مل گیا صبیحہ کے والدین اپنی دولت وطن اور رشتہ داروں کو یاد کر کے بہت غمگین ہوتے۔ مگر صبیحہ ان کو یہ حقیقت

ی کہ خواہ مخواہ پاکستان جیسی نعمت کی ناشکری کر رہے ہیں۔
پاکستان میں صبیحہ ہر چیز کو نہایت غور سے دیکھتی تھی اور اس کی ہر
بو اسلام کے اصولوں کے مطابق پرکھتی۔
ابھی تک اس نے پاکستان کے بارے میں اپنے خوشنما ہوائی
کو قائم رکھا تھا ——— مگر آہستہ آہستہ اس کا وہ قلعہ مسمار ہو گیا
——— وہ حیران تھی کہ اس کی وجہ کیا ہے کہ پاکستان کا نظام حکومت
لامی نہیں ہے۔ ملک کے عام حالات بدتر ہیں۔ حکام اعلیٰ کی آپس میں
ابت اور اختلاف ہے۔ ملک میں بے حیائی اور بے پردگی عام ہے رشوت
سٹہ بازی، چوری، انگریزی تعلیم، فضول کلچر۔ یہ سب کیوں ہے؟
لوگوں کے اخلاق بُرے ہیں وہ خود پسندی، خود غرضی میں
مبتلا ہیں۔ خدا کے احکام کی پیروی نہیں کرتے۔
غریب لوگوں کا افلاس، بیوہ عورتوں کی آہیں، بھوکے ننگے
جاہل بچے۔ وہ غور کرتی کہ حضرت عمرؓ جیسے خلیفہ اب ان میں کیوں پیدا نہیں
حالانکہ وہ بھی مسلمان تھے اور یہ بھی مسلمان ہیں۔
امیر لوگ، متکبر، نفس پرست، خود غرض۔ یہ سب دیکھ کر وہ
بہت گھبراتی اور دل میں کہتی کہ خدا جانے وہ کونسا مبارک دن ہوگا
جب پاکستان میں اسلامی نظام قائم ہوگا اور پاکستان کی تباہ
نظام درست ہوگا لوگوں کا اخلاق درست ہوگا اور وہ ایک دوسرے
ہمدردی و خوش اخلاقی سے پیش آئیں گے اور اسلام کے پاکیزہ
پر عمل پیرا ہوں گے۔ وہ اس بات پر حیران ہوتی کہ وہ خود چھوٹی سی ہے
اور اسے اس بات کا احساس ہے کہ خدا کی نافرمانی ہو رہی ہے مگر
کا ہر فرد اس سے بڑا ہونے کے باوجود بے احساس سا ہے۔
(بشکریہ کوثر)

چسٹاکسیر

یہ دوا پرانی کھانسی کے جملہ امراض کیلئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے پھیپھڑوں کو طاقت دیتی ہے
نزلہ زکام کھانسی کے مریضوں کے لئے بے حد مفید ہے
پھیپھڑوں سے خون آنا، ابتدائی سل اور بلغمی کھانسی کے واسطے نہایت مجرب دوا ہے
جن خاندانوں میں مرض سل موروثی ہو ان کے
نوجوانوں کو اس دوا کا مستقل استعمال اس موذی مرض سے محفوظ رکھتا ہے۔

قیمت:۔ ۲۰ یوم چار اونس دو روپے آٹھ آنے

حاذق دواخانہ، بندر روڈ، کراچی نمبر ۱

Asmar
The TONIC FRUIT DRINK
REFRESHING
INVIGORATING
Excellent
with
SODA WATER
OR HOT OR
COLD WATER
اثمار
پھلوں کا
فرحت بخش اور مقوی
شربت۔ سوڈا واٹر یا ٹھنڈے
پانی میں استعمال کیجئے
حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی
ALWAYS DRINK
Asmar
REFRESHING & INVIGORATING
FRUIT FLAVOUR UNANI SYRUP
HAZIQ DAWAKHANA
HAZIQ DAWAKHANA KARACHI
KAMIL

1952 Regd. No. S.

Monthly "MUSHIR" Karachi

ماہنامہ
مشیر
کراچی
3 (8)
اگست سنہ ۱۹۵۲ء
ماہنامہ مشیر کراچی
0-6-0 Pakistan

Young in Spirit and Appearance at 40
ڈرائیونگ موڈ
چالیس سال
آپکے شہر کے بڑے بڑے دوافروشوں سے مل سکتی ہیں۔ یا براہ راست
حاذق دواخانہ۔ بندر روڈ کراچی سے طلب کیجئے

ضیاء محمد ضیاء ؔ

نغمۂ آزادی

پرچم آزادئ انساں اُٹھایا جائے گا
نغمۂ بیداریٔ جمہور گایا جائے گا

آج سینوں میں بٹھایا جائیگا پھر نقشِ حق !
حرفِ باطل لوحِ ہستی سے مٹایا جائے گا

آسیائے جور میں پستی ہوئی مخلوق کو
پنجۂ جبر و تشدد سے چھڑایا جائے گا

عام ہوگا آدمیت کا تقاضا دہر میں
شیطنت کو پوری قوت سے دبایا جائے گا

کچھ درندے پھر رہے ہیں آدمی کے روپ میں
آدمی کو ان درندوں سے بچایا جائے گا

مدتوں کھایا ہے ہم نے رہنماؤں کا فریب
آج اِن کا چہرۂ اصلی دکھایا جائے گا

دستِ گلچیں نے چمن کی لوٹ لیں شادابیاں
پھر چمن کو تازہ پھولوں سے سجایا جائے گا

وحدتِ اقوام کا جو گُر ہمارے پاس ہے !
آج وہ گُر ساری دنیا کو بتایا جائے گا

یہ زمیں جنت بنے گی نسلِ آدم کے لئے
اس زمیں پر اِک نیا عالم بسایا جائے گا

آدمی بن جائے گا پھر آدمی کا پاسباں
بھائی کو بھائی سے پھر باہم ملایا جائے گا

پھر جلیں گے شامِ نفرت میں محبت کے دیئے
پھر دلوں میں پیار کا جذبہ جگایا جائے گا

خانۂ مزدور و دہقاں میں پھر آئیگی بہار
جھونپڑوں کو رشکِ ایواں بنایا جائے گا

"شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے!"

اقبال

(جہانِ نو)

پاکیزہ ادب اور صحیح اسلامی مشورے لئے ہوئے

ماہنامہ مشیر کراچی

فہرست مضامین ماہ اگست سنہ ۱۹۵۲ء

بدل اشتراک:—

پاکستان —— سالانہ —— تین روپے

〃 —— فی پرچہ —— چھ آنے

بھارت —— سالانہ —— ساڑھے چار روپے

〃 —— فی پرچہ —— آٹھ آنے

جلد ~~~~~~ ۳

شمارہ ~~~~~~ ۸

مرتبہ:۔ عبدالغفور بیگ

طابع و ناشر:۔ عبدالغفور بیگ۔ مطبع مشہور پریس۔ دفتر بندر روڈ، کراچی نمبر ۲ کتبہ عابد سعید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تنقید یا تنقیص ؟

گذشتہ ماہ ہم نے ماہنامہ مشیر کے "افسانہ نمبر ۱۹۵۲ء" کی کچھ کاپیاں مختلف جرائد و رسائل اور اخبارات کے ایڈیٹروں کے نام "برائے تبصرہ" ارسال کی تھیں۔ شومئی قسمت سے ایک کاپی روزنامہ امروز کراچی کے ایڈیٹر صاحب کی خدمت میں بھی چلی گئی۔ یہ روزنامہ بظاہر "ترقی پسند ادب" کا علمبردار ہے اور پروگریسو رائٹرز نیوز پیپر ایسوسی ایشن کی ملکیت ہے۔ اس معاصر نے جس انداز میں مشیر کے افسانہ نمبر پر تبصرہ فرمایا ہے وہ پورے کا پورا بطور تفنن طبع ناظرین مشیر کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اپنے متعلق دوسرے اخبارات میں شائع شدہ تعریفی تبصرے یا اُنکے اقتباسات پیش کرنا صحافی برادری میں آجکل عام رواج ہے۔ گو "گالیاں کھا کے بھی بے مزہ نہ ہونا"، در پھر اپنے ہی رسالہ میں نقل کرنا قارئین مشیر کو بڑی عجیب سی بات معلوم ہو گی۔ مگر چونکہ یہ تبصرہ "ترقی پسند ادب" کا ایک "مثالی شاہکار" ہے۔ ایک "لاثانی فن پارہ" ہے اس لئے ہم قارئین مشیر کو اس سے لطف اندوز ہونے سے محروم نہیں رکھنا چاہتے۔ ارشاد ہوا ہے :-

> ماہنامہ مشیر بظاہر جماعت اسلامی کا نقیب معلوم ہوتا ہے۔ رسالہ کی ابتدا میں مولانا مودودی صاحب کے خط کا ایک اقتباس درج ہے جس میں مشیر کے افسانہ نمبر کے لئے گنجائش پیدا کی گئی ہے۔ لیکن مندرجات کو ایک نظر دیکھنے کے بعد "صالحین" کی دھاندلی پر حیرت ہوتی ہے کہ رسالے کے جس شمارے کو انھوں نے "افسانہ نمبر" کا نام دیا ہے وہ اصل میں "تبلیغی نمبر" ہے۔ کیونکہ نوّے فیصدی افسانے اور مضامین پاکستان ہی کے اخبارات و جرائد سے نقل کر لئے گئے ہیں۔ اس کے باوجود مشیر کے مدیر اس پر مصر ہیں کہ قارئین مشیر کے اس نمبر کو ایک انفرادی خصوصیت کا حامل پائیں گے۔ حالانکہ اس خصوصیت کے مزے دوسرے اخبارات پہلے ہی لوٹ چکے ہیں اور "صالحین" کے اس نقیب کے حصے میں محض تلچھٹ آئی ہے۔
>
> دلچسپ بات یہ ہے کہ مدیر نے اداریہ میں اپنے دوست احباب کا تو شکریہ ادا کر دیا ہے مگر اداریہ میں ان اخبارات و جرائد کا نام تک نہیں لیا گیا جن کے مضامین اور افسانے اس نمبر کی "زینت" ہیں۔ غالباً صالح اخلاق اسی کا نام ہے۔
>
> جہاں تک افسانہ نمبر کے مندرجات کا تعلق ہے، یہ انتخاب گھٹیا پن میں لاجواب ہے۔ ایک آدھ مضمون کے علاوہ کسی اور افسانے یا مضمون کو پڑھنے کے لئے خاصے دل گردے کی ضرورت ہے۔ اگر مشیر پر ۱۹۵۲ء درج نہ ہوتا تو قاری کو یہ غلط فہمی ہو سکتی تھی کہ یہ انتخاب ۱۹۲۵ء میں کیا گیا۔ جب کہ اردو افسانہ کی ابتدا تھی۔ مشیر کے مدیر اور ان کے احباب کا ادبی ذوق اور نظر انتخاب ابھی بسم اللہ کے گنبد میں محبوس ہے اس نمبر سے یہ ہرگز اندازہ نہیں ہوتا کہ اردو افسانہ مغرب کی ترقی یافتہ زبانوں کے بہترین افسانوں سے آنکھیں چار کر سکتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ وہی خوفناک تنگ نظری ہے جو جماعت اسلامی کی پوری حکمت عملی میں کارفرما ہے۔ جسے اب اردو ادب پر بھی مسلط کرنے کی کوشش ہو رہی ہے لیکن ذہین باشعور اور اہل دانش پاکستانی افغانستان اور پاکستان کے درمیان امتیاز کر سکتے ہیں اور وہ اپنے وطن کو ہرگز افغانستان بنانے کی اجازت نہیں دے سکتے وہ ادب و فن کو زندہ رکھنے کا تہیہ کر چکے ہیں اس لئے سیاست کی طرح ادبی میدان میں بھی جماعت اسلامی کی شکست شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

مدیر مشیر نے اپنے اداریہ میں، اور ایک دوسرے صاحب نے اپنے مضمون میں ترقی پسند ادیبوں پر نکتہ چینی کی ہو لیکن اس تنقید یا تنقیص میں بھی ایسی

پھوہڑ پن اور غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے جو اس شمارے کا طرۂ امتیاز ہے " صالحین" نے وہی پرانا الزام دہرایا ہے جو اس سے پہلے ہمیشہ وہ لوگ عائد کرتے آئے ہیں، رجعت پسندی جنکا شیوہ اور ترقی دشمنی جنکا ایمان ہے

مثلاً یہ کہا گیا ہے کہ ترقی پسند ادیب فحاشی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ حالانکہ پاکستان کے ترقی پسند ادیبوں کی انجمن بارہا اعلان کر چکی ہے کہ فحاشی یا فحش نگاروں سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ صرف صحت مند اور زندگی آموز قدروں کی حامی ہے وہ ادب کو زندگی کا ترجمان اور آئینہ دار سمجھتی ہے اور ادب کی مدد سے اسے بنانے اور سنوارنے کا تہیہ کر چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس راہ میں کسی فحش نگار یا مریض ذہنیت کو کسی صورت میں بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ اسلئے دور حاضر کے کسی ترقی پسند ادیب کی تحریروں میں فحاشی نام کو بھی نہیں ملے گی اور اگر کوئی ادیب، اس کا شکار ہوا بھی ہے تو ترقی پسند نقادوں نے ہمیشہ اس پر کڑی نکتہ چینی کی۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ " صالحین" ان ادیبوں کو بھی ترقی پسند مصنفین کے زمرے میں شامل کرنے پر مصر ہیں جنکی نگارشات کو ترقی پسند تحریک اپنانے پر آمادہ نہیں اور جب صالح اخلاق اور تنقید کا یہ معیار ہو تو بحث کی گنجائش نہیں رہتی۔

بہرحال " مشیر" کا افسانہ نمبر انتہائی ناکام ہے۔ اگر مرتب افسانوں کے انتخاب میں تھوڑے سلیقے کا ثبوت دیتے تو شاید قارئین کو سوا روپیہ ضائع کرنے کا افسوس نہ ہوتا، سلیقہ تو سرے سے غائب ہے۔ البتہ کسی حاذق دواخانہ کی " شباب آور" دواؤں کے اشتہارات جابجا موجود ہیں "

روزنامہ امروز، کراچی ، ۹ر جولائی ۱۹۵۲ء

تنقید کے پردے میں تنقیص کا یہ پلندہ کسی جواب کا مستحق تو نہ تھا مگر اس ٹکنک کی پردہ دری ضروری تھی جس کے ذریعے الفاظ کی خوشنما دیواروں پر ہمارے نام نہاد ترقی پسند " جھوٹ وافترا" کے ہوائی قلعے تعمیر کرتے ہیں

ادارۂ مشیر، ماہنامہ مشیر کے ڈائی جسٹ ہونیکے اعلانات مشیر کے ذریعے و دیگر اخبارات کے ذریعے متعدد بار کر چکا ہے۔ خود اس روزنامہ امروز کراچی ولاہور میں برابر ایک سال تک ماہنامہ مشیر کے بامعاوضہ اشتہارات چھپتے رہے ہیں جن میں مشیر کے ڈائجسٹ ہونے کے اعلانات باربار شائع کئے گئے تھے مشیر میں جتنے مضامین دوسرے جرائد سے نقل کئے جاتے ہیں ان کا حوالہ شکریہ کے ساتھ دیا جاتا ہے اس طرح کے رسائل دوسرے ممالک میں بھی شائع ہوتے ہیں مگر وہاں کی صحافت نے کبھی اس قدر بددیانتی کا ثبوت نہیں دیا کہ انھیں " قینچی نمبر" کا طعنہ دے۔ یہ خصوصیت پاکستان کی ترقی پسند صحافت ہی کے لئے مخصوص ہے یہ پاکستان کی بڑی بدقسمتی ہے اور یہ لوگ خوش قسمت ہیں کہ یہ پاکستان میں ہیں۔ ——— مشیر کے افسانہ نمبر کی جس خصوصیت کا ہم نے افتتاحیہ میں ذکر کیا تھا وہ یہ تھی کہ " اس میں جس قدر مواد آپ پائیں گے وہ اخلاقی، اصلاحی اور تعمیری ہوگا" نہ کہ یہ کہ یہ ڈائی جسٹ ہے۔ ہم نے جن اخبارات، کتب و جرائد سے مضامین نقل کئے تھے ان مضامین کے آخیر میں شکریہ کے ساتھ ان جرائد و رسائل و کتب کا حوالہ دیکر صرف زبانی ہی ان کا شکریہ ادا نہیں کیا تھا بلکہ ان کے صفحات کے عین نیچے ان اخبارات، جرائد و کتب کے اشتہارات بھی بلامعاوضہ شائع کئے تھے۔ مگر ہمارا اس قسم کا شکریہ " بھلا" صالح اخلاق " کی تعریف میں کس طرح آسکتا ہے۔ صالح اخلاق تو وہ ہے جسکا مظاہرہ ہمارے معاصر نے مندرجہ بالا سطور میں کیا ہے " ادبی ذوق" اور " معیار انتخاب" کا " بسم اللہ کے گنبد" میں محبوس ہونا بہرحال " سرخ گنبد" میں محبوس ہونے سے بدرجہا غنیمت ہے اور " یہ تنگ نظری" بہرحال اس " وسعت نظری" سے کہیں بہتر ہے جسکی حدیں " اسٹالن نگر" تک محدود ہو کر رہ گئیں ہیں۔

ترقی پسند ادب فحاشی کا مرتکب نہ بھی ہوا ہو مگر ترقی پسند ادیبوں کی انجمن نے اپنے دوسرے سالانہ اجلاس میں ضرور اس گناہ کا اعتراف کر لیا ہے۔ گواہ کی چستی کیا کرے جب مدعی ہی سست ہو اور شوکت تھانوی صاحب کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ انھوں نے ترقی پسند ادیبوں کی اس کانفرنس کو یہ پیغام بھیج کر ———

" ترقی پسند تحریک کا آغاز کچھ اس طوفانی صورت میں ہوا کہ ہر طرف ترقی ہی ترقی نظر آنے لگی۔ ہر نا اہل ترقی پسند کی

کا سہارا لیکر ابھری ہر جنسی انتشار نے اور ہر ادبی بربریت نے ترقی پسندی کی آڑ لے لی۔ نتیجہ ہوا کہ در و دیوار سے آواز آنے لگی "میر صاحب دونوں ہاتھوں سے دستار تھامئے زمانہ نازک ہے"

رقی پسند ادب میں فحاشی اور جنسی انتشار کا بھانڈا پھوڑا ہے پر پھوڑ دیا ہے اب دیکھنا یہ باقی رہ گیا ہے کہ ہمارے یہ ترقی پسند دوست آئندہ بھی لاحول پڑھکر آنکھیں بند کر لینے والا، ادب ہی تخلیق کرتے ہیں یا "آنکھیں کھول کر سبحان اللہ کہلوانے والا" ادب پیش کرتے ہیں۔ شوکت صاحب کا یہ اشارہ لطیف ہی ہی مگر ہے دکھتی رگ پر انگلی رکھنے کے مترادف۔ بات آئندہ کے لئے ہی سہی مگر ہے پتے کی۔ خدا کرے ترقی پسندوں کی باریک عقل میں یہ موٹی سی بات آ سکے اور اپنے پاکستان کے مشہور شاعر جناب حفیظ ہوشیار پوری صاحب نے تو اپنے پیغام میں صرف دو باتوں ہی کو غور طلب قرار دیا ہے جن میں سے ایک یہ ہے کہ:-

"ترقی پسندی کے وہ عناصر کیا ہیں جن سے "صالح ادب کی ترقی میں مدد مل سکتی ہے" ——— امید تو ہے کہ صالح ادب کے نام سے بدکنے والے ہمارے یہ ترقی پسند دوست ضرور ادب میں "صالحیت" کا کھوج لگانے کی کوشش کرینگے۔ خدا کرے وہ ادب میں "صالحیت" قسم کا کوئی عنصر پا سکیں ہماری دعائیں ان کے ساتھ ہیں ——— مدیر امروز کا حافظہ شاید کمزور ہے۔ مشیر میں "شباب آور" دواؤں کے اشتہارات کسی حاذق دواخانہ کے نہیں بلکہ اسی حاذق دواخانہ کے وہی اشتہارات ہیں جو انکے مؤقر روزنامہ میں دو سال تک شائع ہوتے رہے ہیں اور جنھیں دوبارہ حاصل کرنے کے لئے ان کے روزنامہ کے نمایندے سٹر........ چھ ماہ تک مسلسل اور سر توڑ کوشش کرتے رہے اور کامیابی شاید اس لئے نہیں ہوئی کہ حاذق دواخانہ کا منیجر غریب "سرخ انقلابیوں" سے بڑا کتراتا ہے۔ خدا جانے کیوں؟ ——— یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ مگر برا ہو اس دور کی اس خصوصیت کا کہ اس نے ادب کو پیشہ بنا کے رکھدیا ہے۔ اور ہمارے یہ پیشہ ور ادیب بقول نعیم صدیقی کے "ادب کے یہ خوانچہ فروش "پیٹ" کی خاطر "روٹی" کی خاطر سب ہی کچھ لکھنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں" "انکی زندگی کا سب سے بڑا عیش یہ ہے کہ ان کو دو وقت کی روٹی ملتی رہے" انھیں روٹی دے دو سب ہی کچھ کرنے کیلئے تیار ہیں۔ اس دور میں پیشہ ور ادیب کا روگ بھی "ادب برائے ادب کی بلا سے کچھ کم نہیں ہے۔ ادب برائے زندگی تو ایک نعرہ تھا جس کے لگانے والوں نے کبھی اس پر یقین نہیں رکھا ادب برائے زندگی سے انکی مراد "ادب برائے پیشہ" ہی رہی ہے۔ سرمایہ داری اور کمیونزم نے انسانی قابلیت کو ایک قابل خرید شے بنا دیا ہے۔ اب میاں افتخار الدین صاحب اگر اپنے چند دوستوں کی مدد سے ایک "پروگریسو رائٹرز نیوز پیپرز ایسوسی ایشن" کھڑی کریں تو انکو اپنے اخبارات چلانے کے لئے بے شمار نام نہاد ترقی پسند ادیب تنخواہوں پر مل جائیں گے جو "سرخ سویرے" کی آمد کے انتظار میں چشم براہ نظر آئیں گے۔ اور میاں افتخار الدین تو رہے ایک طرف۔ اگر ہمارے دوست خیراتی اور شبراتی بھی سرمایہ دار ہوں اور اپنے اخبار جاری کریں تو یہی پیشہ ور ادیب "خیراتی ادب" اور "شبراتی ادب" کی تخلیق کیلئے نوکر رکھے جا سکتے ہیں۔ روٹی ملنی چاہیئے۔ زندگی کا مطلب ہی روٹی رہ گیا ہے اور روٹی بغیر پیشہ کے نہیں ملتی اس لئے زندگی کا مقصد سوائے پیشہ کیلئے جد و جہد کے اور کچھ نہیں رہا چونکہ زندگی خود "برائے پیشہ" ہو گئی ہے اس لئے زندگی کی ہر چیز خواہ وہ ادب ہی کیوں نہ ہو "برائے پیشہ" بنے بغیر نہیں رہ سکی۔

اس لئے ہم اپنے ان پیشہ ور دوستوں کو خواہ وہ کچھ بھی لکھیں اور جیسا کچھ بھی لکھیں معذور سمجھتے ہیں اور کبھی ان کی باتوں کا برا نہیں مانتے بلکہ خوش ہوتے ہیں کہ بیچارے کچھ تو کر رہے ہیں ع ——— روٹی تو کما کھائے کسی طور مچھندر

ہمارے یہ دوست "بارزگار" ہیں۔ یہ امر بڑی تسلی کا باعث ہے۔ ورنہ آپ جانتے ہیں "اخلاقی گراوٹ کی اصل وجہ بے روزگاری ہے" بھرے پیٹ پر تو یہ حالت ہے۔ اگر کہیں یہ بیچارے "بے روزگار" ہو گئے تو خدا جانے کن کن آفتوں کا سامنا کرنا پڑے ع

خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے

ہم تو پروگریسو رائٹرز نیوز پیپرز ایسوسی ایشن کے ڈائرکٹروں کے سروں کو دعا دیتے ہیں جنہوں نے ہمارے ان کرم فرماؤں کو "ہم استعمالوں" پر پابند رکھا ہے۔

عبد الغفور بیگ

۱۸ جولائی سنہ ۱۹۵۲ء

محمد حمید اللہ صدیقی ●

اردو ادب میں اسلامی رجحانات (یا اسلامی ادب)

(۳)

اب اس بنیادی تصور کی روشنی میں یہ دیکھنا ہے کہ اسلامی ادب کے وہ کون سے موضوعات ہیں جن سے اس کی پوری تشریح ہوتی ہے، اور پھر ان موضوعات کو کس انداز میں پیش کیا گیا ہے اور مزید یہ کہ اس انداز کے ساتھ اس میں کس حد تک ادبیت پائی جاتی ہے اس لئے کہ ادب نہ تو صرف زندگی کیلئے ہو سکتا ہے اور نہ صرف ادب کے لئے! ان دونوں پہلوؤں کا مناسب امتزاج لازم ہے۔ ورنہ یا تو وہ ایک تبلیغی وعظ رہ جائیگا جس میں اعلیٰ پیغام ہونے کے باوجود ادب کی چاشنی نہ ہوگی اور یا پھر محض چاشنی ہی چاشنی رہ جائے گی۔ کوئی اعلیٰ پیغام نہ مل سکے گا۔ یہی وہ امتزاج تھا جسکو متقدمین نے بالکل نظر انداز کر دیا اور اب اسی کو ترقی پسند ادب نے پس پشت ڈال دیا ہے۔ درحقیقت تصویر کا ایک رخ اطمینان بخش نہیں کہا جا سکتا۔ اس بات کا امکان بھی ضرور ہے کہ کسی کو اس بنیادی تصور ہی سے انکار ہو لیکن اسلامی ادب یا کسی بھی ادب کا تجزیہ اسکے پیش کردہ تصورات کی روشنی ہی میں ممکن ہو سکتا ہے ورنہ دوسری صورت گول خانوں میں چوکور پتھر رکھنے کے مترادف ہوگی

اسلامی ادب میں یوں تو بے شمار موضوعات نظر آتے ہیں لیکن اگر ان کا صحیح جائزہ لیا جائے تو ان میں سے بہتیرے کسی ایک اہم موضوع کی تشریح و توضیح معلوم ہونگے۔ اس طرح موضوعات کا یہ وسیع دائرہ ذرا تنگ ہو کر چند موٹے موٹے اور اہم موضوعات پر مشتمل کیا جا سکتا ہے جن میں بنیادی تصور کی طرح ایک اہم موضوع اسلام کے بنیادی اصول و ضوابط ہیں اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اسلامی ادب بہرحال ایک تحریک کی پیداوار ہے۔ جس کا بنیادی مقصد ان اصول و ضوابط کے نفاذ کی جد و جہد ہے اور اس مقصد کی تکمیل میں اسلامی ادب بھی ایک آلۂ کار نظر آتا ہے اسلام پسند ادیب چونکہ بذات خود ان اصول و ضوابط کی اہمیت کو سمجھتا ہے اور محض سمجھتا ہی نہیں بلکہ ان پر سختی سے عمل بھی کرتا ہے اس لئے وہ انہی اصول و ضوابط کو دوسروں کے لئے اعتقاد و ایمان کی بنیاد اور لائحۂ عمل بنا کر پیش کرتا ہے۔ یوں تو خدا کی وحدانیت، رسول کی رسالت اور بندوں کے حقوق و فرائض اس سے پیشتر بھی ہزاروں بار دہرائے جا چکے ہیں لیکن شعر و ادب کے قالب میں ان کا انداز کچھ اور ہی ہو جاتا ہے اور کمال شعر و ادب کا دار و مدار تو محض انداز ہی پر ہے۔ کیونکہ نفسیاتی طور پر مجرد تخیل یا تصور خواہ کتنا ہی بلند و ارفع ہو سیدھے سادے الفاظ میں قبول خاطر نہیں ہوتا اسکے لئے ضروری ہے کہ یا تو بہت مضبوط اور ٹھوس دلائل دیئے جائیں جو کہ بہرحال شعر و ادب کی دنیا میں کچھ زیادہ ممکن نہیں ہے۔ اس کیلئے لازمی شکل صرف یہی ہے کہ تصور کا حسیاتی پیکر اتنا جاذب نظر ہو کہ دل کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ یہ حسیاتی پیکر احساس کو بیدار کرتا ہے، ذہن کو روشن کرتا ہے، بسا اوقات اسی طرح جیسے گھپ اندھیرے میں یکایک کوئی بجلی کا بلب جل اٹھے اور پھر وہ شعر جو کہ محض اپنی لطافت و شعریت کی بدولت دل میں سماتا ہے رفتہ رفتہ دھندلا ہو کر مٹ جاتا ہے اور پھر وہی مجرد تصور باقی رہ جاتا ہے، پھر اس قسم کے بنیادی عقائد کا دلوں میں اتارنا کوئی کھیل نہیں ہے۔ شاعر یا ادیب ہر ہر قدم پر یہ خوف محسوس کرتا ہے کہ کہیں اسکا پیش کردہ ادب تبلیغی وعظ تو نہیں بنگیا۔ اسلامی ادب کی بڑی کوشش یہی معلوم ہوتی ہے کہ شعر و ادب میں ان اہم مقاصد کے ساتھ ساتھ وہ شعریت و ادبیت بھی پیش کرے جو بیشتر پڑھنے والوں کو غیر شعوری طور پر ان تصورات کو اپنانے پر مجبور کر دے

تحریکی ادب ہونے کی وجہ سے اسکا ایک دوسرا اہم موضوع اسلامی تحریک انقلاب ہے جس نے ادب میں کافی جان پیدا کر دی ہے، شاعر یا ادیب جب انقلاب کا نعرہ لگاتا ہے تو بڑے ہی نازک مراحل سے

گزرنا ہوتا ہے اس لئے کہ ایک طرف اگر اسے اپنے جوشِ بیان کی مدد سے رزم اور جوش پیدا کرنا ہوتا ہے تو دوسری طرف یہ خیال بھی دامن گیر ہوتا ہے کہ کہیں انقلاب کا نعرہ محض تبرا یا تشنج کی کرخت چیخ بنکر نہ رہ جائے انقلاب کی پکار جذبۂ بغاوت کا ردِ عمل ہوتی ہے اور یہ جذبۂ بغاوت بہرحال اسی وقت رنگ لاتا ہے جب انسان "تنگ آمد بجنگ آمد" کا مصداق بن جاتا ہے۔ اس مقام پر اردو ادب کے چوٹی کے شعرا بھی توازن کھو بیٹھتے ہیں اور اسکا بڑا سبب یہ ہے کہ جذبۂ بغاوت ان کے اندر ضرور پیدا ہوا مگر ان لوگوں نے نہ تو زندگی کے رموز اور انقلاب و ترقی کے اصول کا کوئی غائر مطالعہ کیا اور نہ زیادہ غور و فکر ہی سے کام لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جذبات کے بے پناہ ہیجان میں انکے اندر ضبط و تحمل، تفکر اور تامل پیدا ہی نہ ہو سکا اور وہ آپے سے باہر ہو کر محض چیخ و پکار اور واویلا ہی کو انقلابی نعرہ سمجھ بیٹھے اور دل کو تو چھوڑ دیجئے اس سلسلہ میں ترقی پسند شاعروں کا امام بھی اس ٹھوکر سے نہ سنبھل سکا اور بقول مجنوں گورکھپوری "جوش کی انقلابی شاعری کا بہترین حصہ اکثر و بیشتر ایک کف در دہان چیخ سے زیادہ وقیع نہیں ہے جوش کی شاعری اندر سے بے انتہا بے مغز اور کھوکھلی ہے"! مثال کے طور پر مقتل کانپور پر بے انتہا غضبناک ہو کر محض گالیوں پر اتر آتے ہیں ؎

اے سیہ رو، بے حیا، وحشی، کمینے، بدگماں!
اے جبینِ ارض کے داغ اے ذلیٔ ہندوستاں
تجھ پہ لعنت اے فرنگی کے غلامِ بے شعور
یہ فضائے صلح پرور یہ قتالِ کانپور
اے درندے یہ تیرا جبڑا ہے کیوں سمٹا ہوا
کس کا یہ گودا تیرے تالو میں ہے چمٹا ہوا!

ایک جگہ غدار کو یوں کوسنے دیتے ہیں ؎

ہوشیار اے بے حیا غدار اے نفسِ دنی
دیکھ آپہنچا وہ اے بدبخت وقتِ جاں کنی
انگلیاں اٹھیں گی دنیا میں تری اولاد پر
غلغلہ ہوگا وہ آتے ہیں رذالت کے پسر
تیری مستورات کا بازار میں ہوگا قیام
معرضِ دشنام میں تیرا لیا جائے گا نام

اس طرف منہ کر کے تھوکے گا نہ کوئی نوجواں
بر کی [illegible] میں رہیں گی تیرے گھر کی لڑکیاں

"بلوغِ حیات" میں بدحواسی کی یہ کیفیت قابلِ دید ہے ؎

دل یہ کہتا ہے کہ ہر سینے میں خنجر بھونک دوں
خلق کو بھڑکے ہوئے دوزخ کے اندر جھونک دوں
زندگی کی موج میں زہرِ ہلاہل گھول دوں!
جی میں آتا ہے کہ توپوں کے دہانے کھول دوں
ذبح کر دوں قتل کر ڈالوں سروں کو پھوڑ دوں
ہمتوں کو پست کر دوں گردنوں کو توڑ دوں
خون کی پیاسی زمیں کو آدمی کا خون دوں
خاک ڈالوں بھسم کر دوں اور جلا دوں بھون دوں
قہر بنکر میں جوابِ فتنۂ ابلیس دوں!
دفن کر دوں سرمہ کر ڈالوں رگڑ دوں پیس دوں

سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ دیوانگی اور جنون کی کس منزل سے یہ آواز آ رہی ہے اور پھر جو انقلاب ان جذبات کے ساتھ بپا ہوگا وہ انسانیت کا کیا حشر کریگا۔ اسلامی ادب میں اکثر نعرہ ہائے انقلاب بلند ہوئے ہیں لیکن یہ بات بڑی ہی اطمینان بخش ہے کہ وہاں اس قسم کی شدت اور مجنونیت کا گذر نہیں اس لئے کہ اسکے پیچھے ایک خاص اسلامی فکر کام کر رہا ہے۔ درحقیقت انقلاب و بغاوت کی بنیاد تخریب پر رکھکر پر ہول نعروں سے دل و دماغ کو ایک جنونی کیفیت میں مبتلا کر دینا اور پھر زمین کو لالہ زار بنا دینا تو آسان ہوتا ہے لیکن قلوب کو مسخر کر لینا اور انداز و فکر کی باگیں موڑ دینا بڑے جیوٹ حوصلے اور صبر و تحمل کا کام ہے اس کے لئے حکیمانہ نظر چاہئے۔ پھاڑنے اور جھنجھوڑنے سے نہیں۔ انقلاب کا مقصد توڑنا پھوڑنا اور برباد کرنا نہیں ہے بلکہ بنانا سنوارنا اور آراستہ کرنا ہے۔ دورانِ انقلاب میں قابلِ مسمار وہ نظام ہوتا ہے نہ کہ اس نظام کے اندر زندگی بسر کرنیوالی انسانیت۔ اسلامی ادب یہ بتاتا ہے کہ دراصل قابلِ نفرت وہ نظام ہے نہ کہ عام انسانیت جو کہ بذاتِ خود مفسد نہیں ہوتی بلکہ فاسد نظام اسے مفسد بنا دیتا ہے اور اگر فاسد نظام اس کو مفسد بنا سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک صالح نظام اسکو صالح نہ بنا سکے اسی وجہ سے

اسلام پسند ادیب جب دعوتِ انقلاب دیتا ہے تو اس کا مقصد تعمیری
ہوتا ہے اور انداز نرم ہوتا ہے ؎

ساتھیو آؤ علاجِ دیدۂ گریاں کریں
چارۂ درد و مداوائے غمِ پنہاں کریں
پاس ہے جب نوعِ انساں کے مصائب کا علاج
اس شکستہ انسانیت کے درد کا درماں کریں
موت کی سرحد پہ آ کر رک گیا ہے کارواں
آؤ اسکو آشنائے چشمۂ حیواں کریں
شاہراہِ زندگی پر پھر اندھیرا چھا گیا!
اس اندھیرے میں طلوعِ صبح کا ساماں کریں
مدتوں نظارۂ بربادئ انساں کیا!
آج فکرِ رونقِ کاشانۂ انساں کریں

پھر جگائیں سینۂ مسلم میں احساسِ خودی
ذرّے کو صحرا بنائیں قطرے کو طوفاں کریں
عام کر دیں دولتِ دردِ جگر کو [illegible] میں!
جوہرِ انسانیت کو آج پھر ارزاں کریں
اب تلک شاہد ہے جس پر کوہِ فاراں کا سکوت
ساتھیو آؤ دلوں میں یاد وہ پیماں کریں
(ضیا محمد ضیا)

دنیا کے ہر ادب نے انسانی سیرت و اخلاق کو بحیثیت ایک موضوع کے اختیار کیا ہے اور اس کی تعمیر گوناں گوں انداز میں کی ہے کیونکہ سیرت و اخلاق ہی وہ متاعِ بیش بہا ہے جس پر قوموں کے عروج و زوال کی داستان مرتب ہوتی رہی ہے۔ اسلامی ادب کو بھی اپنا معیاری انسان تیار کرنا ہے اس کے لئے اگر ایک طرف وہ تاریخ اسلام سے مثالی کردار پیش کرتا ہے۔ ان کے اوصاف و خصائل کی تشریح کرتا ہے تو دوسری طرف وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ آج کا انسان اس مثالی معیار کے لحاظ سے کس مقام پر ہے۔ اسکے لئے وہ آئینہ کی طرح ایک بیباک نقاد بنکر سامنے آتا ہے اور انسانیت کے خد و خال کی ہو بہو عکاسی کرتا ہے۔ اس معیاری انسان کی تعمیر میں عموماً ایسا ہوتا ہے کہ صحیح معیار متعین نہیں ہو پاتا یا سرے سے کسی معیار کو قائم ہی نہیں کیا جاتا۔ اسکے برخلاف جب نکتہ چینیاں کرتے ہیں تو شدتِ بیان میں انسانیت کو اس قدر پست اور ذلیل کر دیتے ہیں کہ وہ احساسِ کمتری کا شکار ہو کر یہ بھول جاتا ہے کہ اس کے اندر کبھی عظمت و بلندی بھی تھی اور اسکا یقین فوت ہو جاتا ہے کہ وہ کبھی اسی عظمت و بلندی تک پہنچ سکتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یاسیت اور قنوطیت (Pessimism) ہوتا ہے جو تعمیر کے بجائے تخریب کرتا ہے۔ اسلامی ادب اس نفسیاتی پہلو کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھتا ہے اور دورانِ تنقید انسان کے اندر بار بار اس بات کا یقین پیدا کرتا ہے کہ دراصل اس کی یہ ساری پستی و انحطاط محض امتدادِ زمانہ کا نتیجہ ہے اس میں خطا اس کی نہیں ہے بلکہ اس نظامِ معاشرت کی ہے جس میں وہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے اس طرح وہ ایک جذبۂ انفعال ایک اضطراب اور بے چینی پیدا کرتا ہے تاکہ وہ اس میں انقلاب پیدا کرسکے اوصاف کی تعمیر و تجدید کا یقین دلا سکے جسکا تمامتر انحصار محض اس کے کوششِ اصلاح پر ہے۔ مثلاً ؎

سنگ و آہن کے بھی سینے میں شرر جاگ اٹھے
چشمِ انساں ہے کہ محرومِ بصیرت ہے ابھی (ماہر)

زندگی صرف فسانے میں مقید تو نہیں!
زندگی ایک حقیقت ہے حقیقت کو سمجھ!
فحش افسانے کے کردار کی تخلیق نہ کر
اپنے کردار کے جوہر کی حقیقت کو سمجھ (سجاد شاہد)

برق کیا ہے تیری نظر کا جلال
کہکشاں کیا تیرے پاؤں کی دھول (احمد نسیم)

اتنے مقامِ شوق سے ہم گزر گئے ندیم
توہینِ یار سامنے آنکھوں کے سہہ گئے (طالب حجازی)

میں جہاں بھر کی مشقت کو سہوں گا لیکن
آستانوں پہ کروں گا نہ جبیں فرسائی
مجھکو منظور ہے افلاس میں جاں دے دینا
ابنِ آدم کی نہ مانوں گا مگر میں شاہی (کوثر نیازی)

سیرت و کردار کے بناؤ بگاڑ کا انحصار بہت بڑی حد تک نظام تعلیم پر ہے یہی وہ سانچہ ہے جس میں انسان ڈھلتے ہیں اور بدقسمتی سے یہ سانچہ ہمارے لئے اس دماغ نے تیار کیا تھا جسکو انگریز نما ہندوستانی درکار تھے تاکہ ان کی صحیح نیابت ہو سکے اور اس حق نیابت کو ہم نے خوب ادا کیا شاید انکی توقعات سے بھی زیادہ! اس طرز تعلیم نے اندھی تقلید کی وہ روح پیدا کی کہ تقریباً پوری قوم و ملک کے روح تحقیق پرواز کر گئی۔ اسلامی ادب یہ بتلاتا ہے کہ یہ وراثت میں ملا ہوا طرز تعلیم اسلامی اصول و ضوابط ہی نہیں بلکہ انسانی سیرت و کردار کیلئے کس قدر مضر اور مہلک ہے! اور اگر اس کو اسی طرح چلنے دیا گیا تو اس کے اثر سے وہی نسلیں کھڑی ہونگی جن کا جسم مشرقی ہوگا اور دماغ مغربی! پھر جسم و دماغ تو کسی نہ کسی صورت میں رہ جائیگا لیکن روح حق فنا ہو جائے گی۔ اس کے اندر بھی وہی مسائل و مصائب رونما ہونگے جن سے آج مغرب دوچار ہے علم و تمدن کی ترقی تو ہو جائے گی لیکن اسکے ساتھ وہ اخلاص پیدا نہ ہو سکیگا جو اس بات کی ضمانت کر سکے کہ یہ علم انسان کی تباہی کے بجائے اسکی بھلائی کے لئے استعمال ہوگا۔

ایک اور اہم موضوع اس دور کے معاشی مفاسد ہیں اور چونکہ ان فسادات کے حل کے طور پر زندگی کے لئے روٹی اور صرف روٹی کی بدولت ایک تحریک کی شکل میں آچکی ہے اس لئے یہ تحریک بھی ایک مستقل موضوع ہے یہ تحریک اشتراکیت کی ہے اس تحریک سے بڑا بنیادی اختلاف یہ ہے کہ یہ سرمایہ و محنت کی کشمکش ہی کو تمام انسانی تاریخ کی وجہ سمجھتی ہے اسلامی ادب اس کشمکش کو خطرناک اور مہلک ضرور سمجھتا ہے لیکن "تاریخ کا اصل معرکہ اسلام و جاہلیت یا خیر و شر کے تصادم کو سمجھتا ہے"! پھر یہ تحریک ایک زندہ تحریک کی حیثیت سے حریف میدان ہے اس کا پیش کردہ ادب ایک طرف خالص مادیت کی تلقین کرتا ہے تو دوسری طرف جنسیت کو چھیڑ کر ایک لاشعوریت پھیلاتا ہے تاکہ تحریک کیلئے زمین ہموار ہو سکے۔ اسلامی ادب اسکے انداز فکر، تصورات عمل اور لائحہ عمل پر شدید نکتہ چینی کرکے اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ اگر موجودہ نظام معاشرت تباہ کن ہے تو اس تحریک کا موجودہ نظام اس سے زیادہ تباہ کن ہوگا اور اسکے ساتھ ایک ایسا نظام پیش کرتا ہے جس سے انسان محض ایک ذریعہ پیداوار ہی بنکر نہ رہ جائے بلکہ اس کی انسانیت کے دوسرے خصائص بھی اس کے اندر موجود رہ جائیں اور پھر اسلامی تحریک ہی وہ پہلی تحریک ہے جس نے پہلی مرتبہ اسکا مقابلہ ایک جوابی سیلاب بنکر کیا اور اس تحریک کے داعیوں کو توڑ کر اسلام کے پرچم کے نیچے لانے میں کامیاب ہوئی۔ یہ گھر کے بھیدی ایک طرف تو اپنے ذہنی انقلاب کی تاریخ پیش کرتے ہیں اور دوسری طرف اس تحریک کے طریق کار پر شدید گلے کرتے ہیں ؎

کفر و الحاد کی دنیا میں سبھی کچھ ہے مگر
صرف روٹی تو مرے زخموں کا مداوا تو نہیں
خوش خیالی میں حقائق کو تڑپتا چھوڑ دوں
اس قدر ذوق تمنا مرا رسوا تو نہیں!
ہاں بتاؤ تو مجھے ذوق ہوس کے بندو
نکہت و نغمہ و انوار کی دنیا کیا ہے
گر فقط بھوک ہے مقصود حیات آدم
پھر یہ دل کیا ہے دلِ زار کی دنیا کیا ہے

(بہاؤالدین احمد)

کہنہ زرداروں نے گر حاصل محنت لوٹا!
سرخ زرداروں نے لی حاصل افکار بھی لوٹ (طالب حجازی)

عورت بھی ہمیشہ سے موضوع ادب ہی ہے البتہ اس موضوع کے مدارج میں بڑا فرق رہا ہے۔ کبھی تو یہ شعر و ادب میں ایک طلسم ہوشربا بنی رہی اور اسکی حقیقت کسی بھی ورد "سم سم" سے نہ کھل سکی۔ کبھی شاعر و ادیب کے اعصاب پر ایک مرض کی طرح طاری ہوئی اور تشنج کے ایسے دوروں میں مبتلا کیا کہ جنون و ہذیان شروع ہو گیا اور کبھی شاعر و ادیب اسکی روحانی و کیفیاتی عظمت کو چھوڑ کر اسکے جسمانی حدود میں داخل ہو گئے اور پھر اس طرح اس کے ایک ایک عضو کا تجزیہ کیا کہ اس کی خارجی رعنائیوں کے بجائے داخلی برنائیاں ظاہر ہونے لگیں اور پھر اس تجزیہ کی بدولت صنف شعر و ادب پر اسکا شیرازہ اس طرح منتشر ہوا کہ صحیح پہچان بھی مشکل ہو گئی۔ اسی طرح کبھی اس کو انفرادی ملکیت سمجھا گیا اور کبھی نظریات کی وسعت نے لیے قومی ملکیت بنا دیا اور اسی پر بس نہیں بلکہ وہ عورت

جس کی جھلک کے لئے چشم فلک بھی ترستی تھی صفحۂ شعر و ادب پر اب مادر زلو
ننگی ہونے کی بدولت اس مقام پر پہنچ گئی جہاں مصوران فن اسکی چھاتی سے
نسل انسانی کی تربیت کرنے والے دودھ کے بجائے Palmolive
Soap کی ٹکیاں نکالدیتے ہیں اور سیرفن کے اس نمونہ کو شاہراہوں
اور چوراہوں پر بڑے ہی رنگین پیرائے میں ویدۂ بینا کی جنت بنا کر
لٹکا دیتے ہیں اور پھر لطف یہ ہے کہ عورت بھی اپنی اس حیثیت کذائی کو قدر
افزائی سمجھکر شاداں و فرحاں گزر جاتی ہے۔ اسلامی شعر و ادب نے بھی اس
موضوع کو بڑے شد و مد کیساتھ اپنایا ہے اور اخلاقی پستی و انحطاط کے
ان تمام تصورات کے خلاف ایک مستقل محاذ جنگ قائم کیا ہے اسکے
نزدیک معاشرے کی سلامتی کا راز بھی اس میں ہے کہ عورت کا اس میں
صحیح مقام متعین کیا جائے۔ اور اسے ان حدود کا پابند کیا جائے جن حدود
کی پابندی شارع اسلام نے لازمی قرار دی ہے۔ اس سلسلہ میں اسکے
سامنے ان حدود کو توڑنے کے وہ مہلک نتائج بھی ہیں جن سے آج مغرب
مشرق کی بیشتر اقوام دوچار ہیں، وہ عورت اور مرد کے درمیان محبت اور
بے پناہ محبت لازمی سمجھتا ہے مگر وہ یہ نہیں گوارا کر سکتا کہ اس کا معیار
وہ ہو جس کے پیش نظر ایک روسی سپاہی میدان جنگ کو جاتے ہوئے اپنی
محبوبہ سے کہتا ہے ؎

ہاں یہ سچ ہے تو مجھے کرتی ہے پیار!
تیرا پیمانِ وفا ہے استوار
لیکن اے تسکینِ جانِ بے قرار
عمر بھر یونہی نہ رہنا سوگوار
تو ہے جن اچھائیوں کی مایہ دار
دوسروں پر بھی تو ہوں وہ آشکار
شمع، محفل سے اگر مستور ہے
فائدہ پھر کیا جو اس میں نور ہے
اس لئے تنہا نہ رہنا چاہیئے
تیرا دل سونا نہ رہنا چاہیئے
گر بخارا میں ہو کوئی نوجواں
جو سمجھتا ہو ترے غم کی زباں
عشق میں اپنے سمو لینا اسے!
ہار میں اپنے پرو لینا اسے!
اس ہوا سے کوئی گر غنچہ کھلے
یاد کرنا اسکو میرے نام سے

(علی سردار جعفری)

اس کے بالکل برعکس اسلامی شعر و ادب عورت کو ایک دوسرے
زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے اور پیش کرتا ہے اور جگہ جگہ اس بات کا اعادہ
کرتا ہے کہ حسن صورت کے بجائے حسن سیرت زیادہ قابل قدر چیز ہے وہ
سب سے پہلے عورت کو اسکی عظمت یاد دلاتا ہے جسکو اگرچہ وہ کھو چکی ہے
مگر پھر بھی اس کی مستحق ہے مثلاً ؎

تو اپنی قوم کی عظمت ہے دختر اسلام
ہے بزم لالہ و گل سے بلند تیرا مقام
تری نگاہِ مقدس کا مرتبہ یہ ہے
کہ تجھ کو عظمتِ جبریل نے کیا ہے سلام
جہاں پڑے ہیں تیری طاعت و رضا کے قدم
وہ ارضِ پاک فرشتوں کی بوسہ گاہ مدام
تری بہار ہے قائم وفا کے پھولوں سے
وہ ایک حُسن جو ہوتا ہے زینتِ در و بام
ضمیر و روح کی پاکیزگی سے خالی ہے
وہ جسم جو سرِ بازار ہو گیا نیلام
تو شکر کر کہ ہیں بے داغ خلوتیں تیری
مری نظر میں ہے جلوت گرو کی رنگیں شام
مری سخن کی وساطت سے عصمت مریم
تیری حمیت ملّی کو بھیجتی ہے سلام

(عاصی کرنالی)

معاشرے میں عورت کا صحیح مقام متعین کرنے میں اب تک
انداز فکر ہی بالکل غلط رہا ہے اور جب بھی عورت کے متعلق سوچا گیا اس
انداز سے سوچا گیا کہ اس کو کس طرح مردوں کے ہمرکاب کر دیا جائے
اسی فکر و عمل نے عورت کی فطری کمزوریوں کو نظر انداز کر کے سوچا

میں تقسیم کار کے بجائے یگانگت کار پیدا کر دی اور عورت کو ہر اس کام کے لئے موزوں و مناسب سمجھ لیا جسکے لئے وہ طبعاً و فطرتاً ناموزوں تھی اس غلط تصور سے بہتر نتائج کس طرح حاصل ہو سکتے تھے اسلامی ادب بتلاتا ہے کہ عورت اور مرد کی فطرت میں بڑا فرق ہے اور دونوں کو ایک ہی قالب میں نہیں ڈھالا جا سکتا۔

ان چند موضوعات کی مختصر سی توضیح کے بعد اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلامی ادب ادبیت کے تقاضوں کو کس حد تک پورا کرتا ہے کیونکہ ادب خواہ کسی بھی تحریک سے وابستہ ہو اگر ادبیت کے تقاضوں کو صحیح معنوں میں پورا نہیں کرتا تو اسے ادب کے بجائے کوئی اور نام دینا زیادہ موزوں و مناسب ہوگا۔ ادب اسی وقت ادب کہلانے کا مستحق ہے جب وہ بلند و بالا تصورات کے ساتھ ساتھ اس میں حسن و جمال کی بھی آمیزش ہو۔ ٹھوس اور دقیق مضامین کے ساتھ ساتھ لطافت اور سلاست بھی ہو تنقید میں تعمیر کا پہلو بھی مضمر ہو۔ اور ان سب کے ساتھ ساتھ جذبات کی پاکیزگی کا شوخ رنگ جھلکتا ہو۔ شاعر و ادیب کا کمال یہ ہے کہ وہ ترجمان حقیقت بھی ہو اور ترجمان زندگی بھی! پھر زندگی کے جو خاکے بھی وہ مرتب کرے وہ کسی مخصوص قوم اور نسل ہی کے لئے موزوں نہ ہو بلکہ اتنا ہمہ گیر اور لچک دار ہو کہ پوری انسانیت کی تعمیر انہی خطوط پر ہو سکے۔ کیونکہ جس طرح زندگی کی انفرادی اور اجتماعی حیثیتیں ہیں۔ اسی طرح قوموں کی بھی انفرادی اور اجتماعی حیثیتیں ہیں اسکے علاوہ یہ بھی دیکھنا لازم ہوتا ہے کہ زبان کے تقاضوں کو کس حد تک پیش نظر رکھا گیا ہے اور فصاحت و بلاغت کے کس معیار کو قائم کیا ہے۔ استعارات تشبیہات کس نوعیت کی ہیں اور تمام چیزیں مجموعی طور پر زبان کو مجلا کرتی ہیں یا منغض۔ حرف آخر کے طور پر ادب کو بحیثیت ایک ادب کے جانچنے اور پرکھنے کے لئے مجنوں گورکھپوری کا یہ قول زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔

" مختصر یہ کہ کامیاب ترین ادب وہ ہے جو حال کا آئینہ دار اور مستقبل کا اشاریہ ہو جس میں واقعیت اور تخئیلیت، افادیت اور جمالیت ایک آہنگ ہو کر ظاہر ہوں جس میں انفرادیت اور اجتماعیت دونوں ملکر ایک مزاج بن جائیں۔ جو ہمارے ذوقِ حسن اور ذوقِ عمل دونوں کو ایک ساتھ آسودہ کر سکے اب تک ادب جو کچھ بھی رہا ہو لیکن اب اسے یہی ہونا ہے "

اس معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر اسلامی ادب کا ایک جائزہ لیا جائے تو یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ یہ تقاضے اطمینان بخش حد تک پورے ہوئے اس میں خامیاں بھی ہیں اور محاسن بھی لیکن خامیوں سے کسی بھی چیز کو معرا نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اسلامی ادب نے تقریباً تمام رائج الوقت اصناف سخن و ادب کو اپنایا ہے لیکن نظموں، غزلوں، افسانوں، ناولوں اور مقالوں کو دیکھنے کے بعد یہ واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ ان سب کی ترقی کی رفتار یکساں نہیں ہے اور خصوصاً ناولیں تو اس دوڑ میں بہت پیچھے ہیں۔ ویسے بھی اردو ادب میں شاعری اور افسانہ نگاری کے مقابلہ میں ناول ہر جگہ پیچھے نظر آتی ہے اسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ اب ادب بھی کسی دعوت، نہ تحریک کا آلہ کار بن گیا ہے اور یہ احساس خاصا قوی ہو گیا ہے کہ مختصر افسانے ناولوں سے زیادہ بار آور ثابت ہوئے ہیں۔ یہ ایک حقیقت بھی ہے اسی طرح شاعری میں غزل کے مقابلے میں نظم پیش پیش ہے اور یہ ہونا لازم ہے کیونکہ غزل کسی بھی تحریک کے تقاضوں پر پوری نہیں اتر سکتی۔ اسکے اصول و ضوابط کچھ ایسے تنگ اور محدود ہیں کہ شاعر اپنا مافی الضمیر کھل کر نہیں بیان کر سکتا۔

(باقی)

چساکیئر

یہ دوا پرانی کھانسی کے جملہ امراض کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ پھیپھڑوں کو طاقت دیتی ہے۔ نزلہ زکام کھانسی کے مریضوں کیلئے بیحد مفید ہے۔ پھیپھڑوں سے خون آنا ابتدائی سل اور بلغمی کھانسی کے واسطے نہایت مجرب دوا ہے۔ جن خاندانوں میں مرض سل موروثی ہو ان کے نوجوانوں کو اس دوا کا مستقل استعمال اس موذی مرض سے محفوظ رکھتا ہے

قیمت ۲۰ یوم چار اونس دو روپے آٹھ آنے۔

حاذق دواخانہ، بندر روڈ، کراچی نمبر ۱

ابوالمجاہد زاہد

اشعار

تری طلب ہے ترا انتظار ہے اب تک
حیات، رحمت پروردگار ہے اب تک

رموزِ حسنِ خزاں آشکار کیونکر ہوں
تری نگاہ اسیرِ بہار ہے اب تک

زمانہ امن کے سانچے میں ڈھلنے والا ہے
بلند ظلم زدوں کی پکار ہے اب تک

اٹھ اور رہنمائی کا حق ادا کر دے
تری طرف نگہِ روزگار ہے اب تک

بدل سکا نہ کوئی فطرتِ گلستاں کو!
کہ پھول پھول ہے اور خار خار ہے اب تک

کسے مجال، ستم کو ترے ستم کہدے
نیازمند مگر حق شعار ہے اب تک

نوید ہے یہ کسی انقلابِ تازہ کی!
اداس اداس چمن کی بہار ہے اب تک

نظامِ نو کی "مسیحائیوں" کو دیکھ لیا!
جو بیقرار تھا وہ بیقرار ہے اب تک

"قراردادِ مقاصد" کے ملک میں زاہد
شریعتِ نبوی سوگوار ہے اب تک

نعیم صدیقی •

میں نہیں چاہتا، مگر

میں بعض اوقات مطالعہ کے کمرے میں بیٹھکر کوئی چیز پڑھ رہا ہوتا ہوں، اپنے بجلی کے دفتر کے فائل کھولے ان پر دماغ سوزی کر رہا ہوتا ہوں اور اچانک کچھ بچے سامنے کے صحن میں کرکٹ کھیلنے لگ جاتے ہیں۔ میرے بچے، پڑوسیوں کے بچے، اہل محلہ لوگوں کے بچے پٹن کی پلٹن کہیں سے نکل آتی ہے اور ایک طوفان پیدا ہوتا ہے یاں گویا لگتا ہے کہ بڑا دماغ پاش دھماکہ ہوتا ہے اور کبھی واہ واہ ہوتی ہے، کبھی جھگڑا ہو جاتا ہے، کبھی گالم گلوچ پر نوبت آجاتی ہے، کبھی ہاتھا پائی شروع ہو جاتی ہے پھر چیخم دھاڑ ہوتی ہے، یہاں تک کہ آخر کار کوئی مقدمہ مرتب ہو کر میرے سامنے آتا ہے، مدعی فریق اپنی ہانکتا ہے اور مدعی علیہ اپنی، کوئی کسی کی نہیں سننے دیتا۔ اس میں کیا کرایا مطالعہ غارت ہو جاتا ہے، بنے بنائے حسابات ذہن میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں، حساب کے اعتراضات کے جوابات جو ابھرے ہوتے ہیں وہ غبار پریشاں بن جاتے ہیں، حریف کار کو شکست دینے کیلئے جو تجویزیں جمع کی ہوتی ہیں وہ نہ جانے کدھر غائب ہو جاتی ہیں۔ بچوں کے کھیل میں میری گھنٹوں کی کمائی لٹ جاتی ہے ان میں سمجھوتہ کرا کے یا ان کو ڈانٹ ڈپٹ کر بھگاتا ہوں مگر وہ پھر آکر الجھا دیتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا ہوں کہ ایسا ہو مگر یہ ہوتا ہے، روز ہوتا ہے، کئی کئی بار ہوتا ہے، میری مرضی کے خلاف ہوتا ہے میرے چاہنے کے علی الرغم ہوتا ہے اور میں خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہوں۔

صبح سیر کو نکلتا ہوں تو مسٹر رشید احمد ایم، اے، ایس سی جو میرے بے تکلف دوست ہیں ان کی سفید کتوری (کتیا کی تصغیر پنجابی قواعد میں) اپنی ایک ناز آمیز اور نزاکت آمیز بھونک سے میرا استقبال کرتی ہے۔ میں چاہوں یا نہ چاہوں وہ ضرور کرتی ہے پھر کبھی رشید کے ہاں شام کو جاتا ہوں تو یہ لپک کر آتی ہے اور میرے جوتے چاٹنے اور میری شلوار کے پائنچوں کو سونگھنے کی کوشش کرتی ہے، اور یہ چیزیں مجھے سخت ناپسند ہیں مگر رشید کی کتوری بھالی (اسکا نام) کو یہ پسند نہیں اور وہ کبھی معاف نہیں کرتی، دل نہیں چاہتا مگر رشید کے پاس خاطر کئی مرتبہ ناگواری کے احساس کو ایک جھوٹی مسکراہٹ کے تلے دبا دینا پڑتا ہے۔ اس معاملے کو آپ کچھ ویسا ہی سمجھیں جیسے بال روم میں آپکے کسی دوست کی بیوی آپکے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالکر ناچنے کیلئے فکری اور عملی اقدام کریں۔ سوچئے کہ اس صورت میں یہ کتنی بری بات ہوگی کہ آپ اس بڑھ کر آنے والی خاتون کو قبول کرنے سے انکار کر دیں اور کوئی شرم، کوئی حیا، کوئی عصمت داری کا جذبہ آپکو غیر مہذب بنا دے، مصیبت یہ ہے کہ ہماری پوری دنیا ایک بال روم ہے اور اس میں کئی رشید ہیں اور انکی کئی کتوریاں ہیں اور یہاں اصول یہ ہے کہ مجھے چاہو تو میرے کتے کو بھی چاہو آپ چاہیں یا نہ چاہیں، یہ اصول مانے بغیر چارہ نہیں!

رشید کی اس کتوری کے کرشمے یہیں تو ختم نہیں ہو جاتے بلکہ دن بھر وہ رشید اور اس کے بچوں اور دوستوں کو سونگھنے اور چاٹنے کے بعد جب رات ہو جاتی ہے تو کوٹھی سے نکلکر سیدھی سڑک پر آجاتی ہے، سڑک پر ایک خاص جگہ گویا پہلے سے مقرر ہے، جیسے انسانی شہروں میں وائی۔ ایم۔ سی۔ اے اور وائی۔ ڈبلیو۔ سی۔ اے ہال ہوں۔ سڑک کے اسی مقررہ بے در و دیوار اور بے سقف و فرش وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں ہر طرف کتے کتیاں اور کتورے کتوریاں جمع ہو جاتی ہیں۔ رشید کی کتوری اور اس کے تنے جانے والے اور ملنے جلنے والیاں بڑی ترقی پسند ہیں، وہ جدید تقاضوں کو جانتے اور جانتی ہیں۔ اس لئے وہ سب اپنے ساتھی بدل بدل کر گنگناتے ہیں،

ہونے والا ہے اس کے لئے چندہ چاہیے۔ نہ پوچھئے کہ میرے دل کا حال کیا ہوا۔ کیا اس تربیت کے لئے کسی اسلامی مدرسہ طالبات کی ضرورت تھی؟ سرکار کے اسلامی مدرسے اس کام کے لئے کچھ کم تو نہیں تھے۔ میں نے پوچھا کیا ڈرامہ ہوگا؟ جواب ملا ردِ پٹی ریاض بہادر کا! میں نے پوچھا کہ اس کا مقصد کیا ہے؟ ان معصوم بچیوں نے بتایا کہ اس کی آمدنی سے غریب لڑکیوں کی فیسوں کی معافی کا انتظام کیا جائیگا۔ اس کے علاوہ ایک مقصد یہ بھی ہے کہ وزیر تعلیم آتے ہیں ان کو ڈرامہ دکھایا جائیگا۔ اور پھر ان کے سامنے مدرسہ کیلئے مزید گرانٹ کی درخواست پیش کی جائیگی۔ پچھلے سال بھی گرانٹ میں اضافہ کرانے میں اسی طرح کامیابی ہوئی تھی۔ میں نے ان سے بڑی نرمی سے کہا کہ تم مسلمان گھروں کی شریف بیٹیاں ہو تمہارا کام یہ ہے کہ عائشہؓ اور فاطمہؓ کے نقشے پر اپنے آپ کو استوار کرو اس کے جواب میں انہوں نے بجز اس کے کچھ نہ کہا کہ استانیوں نے ہمیں بھیجا ہے۔ ان سے اتنی لمبی چوڑی گفتگو کرنے اور ان کا وقت لینے کے بعد جب ان کا اصرار میں نے ان لفظوں پر ختم ہوتے دیکھا کہ "کچھ تو دے دیجئے"۔ تو مجبوراً دونی جیب سے نکال کر ان کی لیڈر کے ہاتھ پر رکھی ——— اور پھر جب سے اب تک ضمیر کا احساس گناہ مجھے کاٹتا ہے کہ میں نے ایک قوم سوز فتنے کی جڑوں کو پانی دینے میں حصہ لیا۔ میں مجرم ہوں! ہمارے وزیر مجرم نہیں ہونگے ہمارے استاد اور استانیاں مجرم نہیں ہونگی۔ ہمارے ناظمین مدارس مجرم نہیں ہونگے لیکن بہرحال میں مجرم ہوں!

اس طرح کے حادثات سے خدا جانتا ہے کہ میں دوچار ہونا پسند نہیں کرتا، مگر یہ روز ہوتے ہیں۔ شاید ہی کوئی دن خالی گیا ہو۔

میرے گھر میں یہ اہتمام ہے کہ زبان پاکیزہ استعمال کی جائے اور یہ اہتمام ایک مدت سے ہے اور اس کے بڑے اچھے اثرات بھی ہونے چاہئیں مگر چند دن کی بات ہے میری چھ سال کی لڑکی کہیں سے "مسلیگ زندہ باد" "نواب زادہ اکرام اللہ زندہ باد" اور "غدار مردہ باد" کا سبق لے آئی ہے اب دن رات بھی انہیں کی زبان پر رہتے ہیں۔ انہوں نے ابھی خاصی سیاست سیکھ لی ہے، خربوزے سے خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ اب یہ سیاست دوسرے بچوں میں بھی پھیل گئی ہے۔ اور اب شاید اس کی تان لاٹھی چارج پر ہی ٹوٹے گی۔ ادھر پرسوں سے میرا دو سالہ بچہ ایک گندی پنجابی گالی کہیں سے سیکھ آیا ہے۔ گھر میں جانتے بوجھتے میرے سامنے تو وہ اس ادب لطیف کو استعمال نہیں کرتا لیکن باہر کھیل میں وہ اس طرح کی شاعری کرنے لگا ہے۔ آپ خیال فرمائیے کہ جس باپ اور جس ماں نے سالوں اپنے بچوں کے اندر ذہنیت و سیرت کی ایک فصل اگانے میں محنتیں کھپائی ہوں وہ جب اس فصل کو اجڑتا دیکھیں، تو ان پر کیا گزرتی ہوگی۔ مگر جو کچھ بھی گزرے، گزرتی ہے، اس سے ہوتا کیا ہے، اس ہولناکی پر بس ہم اور آپ دیکھ رہے ہیں۔ ابھی نہ جانے اور کیا ہوگا۔

گھر میں اخبار آتے ہیں۔ یہ انتظام اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ لوگ دنیا کے حالات سے ناواقف نہ رہیں۔ مگر اخبارات کا حال یہ ہے کہ ان میں بحثوں اور اختلافی نوٹوں میں بڑے گھٹیا جذبات استعمال کئے جاتے ہیں۔ فکاہی کالموں میں حریفوں پر کیچڑ اچھالنے کی نئی نئی مثالیں پیش کی جاتی ہیں کہ بچہ پڑھتے ہی عش عش کر اٹھے، پھر سینما کے اشتہاروں کی تصاویر اور عبارات ہیں کہ روز چلی آرہی ہیں۔ اگلے دن کا ذکر ہے کہ میرا بچہ مجھ سے پوچھتا ہے کہ "ابا! رومان کیا ہوتا ہے؟" اس سے پہلے میری چھوٹی لڑکی نے ایک عورت کی نیم برہنہ رنگین تصویر دکھا کر مجھ سے کہا یہ میری پیاری امی ہیں۔ دوسری لڑکی نے بھی ایک مرتبہ ایک ایکٹرس کی اور ایکٹر کی اشتہاری تصویر دکھا کر سوال کیا کہ ابا یہ اس طرح کیوں کر رہے ہیں؟ اب میں آپ کو کیا بتاؤں کہ "اس طرح" کا مفہوم کیا تھا اسی طرح بار بار کا ایک اخبار دکھا کر مجھ سے پوچھنے لگے کہ یہ لفظ "لیکوڈیٹ" کیا ہوتا ہے۔ ایسے ایسے جو واقعات ایک ذہنی قیامت بن کر مجھ پر گزرے ہیں ان کے پیش نظر بارہا جی چاہا کہ ان اخبارات کو روزانہ پڑھنے سے پہلے اور پڑھنے کے بعد ...... خصوصاً ان کے لغویات کے تین اوپر ...... بچوں ہی کے ہاتھوں سے اٹھارہ جوتے

لگوائے جایا کریں، جیسے کسی کو اٹھارہ گوروں کی سلامی دی جاتی ہے، ان کا مندوں پر روز، نہ بڑے بھلک قسم کے اخلاقی امراض کے جراثیم چپک چپک کر بھیجے جاتے ہیں اور کتنے ہی ذہنی زہر ہیں کہ جن سے ان کو آلودہ کرکے اشاعت کے دفتروں سے نکالا جاتا ہے ہم ان جراثیم اور زہروں کو پیسے دے دے کر خریدتے ہیں، جو ان کو پسند کرتا ہے وہ بھی خریدتا ہے اور جو ان سے کراہت کرتا ہے وہ بھی خریدتا ہے، لیڈر بھی خریدتے ہیں، مولوی اور امام بھی خریدتے ہیں معلمین اخلاق اور مصلحین قوم بھی خریدتے ہیں، آپ بھی خریدتے ہیں اور میں بھی خریدتا ہوں۔ میں خریدنا نہیں چاہتا ہوں مگر خریدتا ہوں۔ ہم سب زمیندار اور آفاق خریدتے ہیں۔ ادب لطیف اور فلم اشار خریدتے ہیں۔ نفسیات اور جنسیات خریدتے ہیں، شمع اور مست قلندر خریدتے ہیں" مرد" اور "سن باتھ" خریدتے ہیں ہم ان کو معلومات کے لئے خریدتے ہیں اور معلومات کیساتھ اخلاقی نجاستیں ہمارے پلے پڑتی ہے۔ ہم ان سے تفریح حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن تفریح کے ساتھ تخریب بھی ہمارے سر مڑھ دی جاتی ہیں!
اب فرمائیے کہ آپکے اور میرے چاہنے اور نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے
چاہنے کو تو میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ ہسپتال روڈ کے فٹ پر جذامی اور لنگڑے اور لولے گاگا کر۔ فریاد کر کرکے۔ سر جھکا جھکا کر کٹے ہوئے اعضا دکھا دکھا کر، راہگیروں سے ایک ایک پیسہ اکلوائیں کیوں نہ حکومت ان کے لئے ادارات قائم کرے۔ اور عوام کو انفاق فی سبیل اللہ کی تعلیم دے ...... لیکن میرا یہ نہ چاہنا نہ لیا ہی ہے جیسے میں یہ نہیں چاہتا ہوں کہ میرے وطن کی سرزمین مقدس میں سیفٹی ایجنٹ کا دبدبہ چلے اور اس کی منڈیوں اور صنعت و زراعت پر ڈالر کی حکمرانی ہو اور بادشاہ انگلستان سے ہمارا سیاسی پیری مریدی کا رشتہ قائم رہے اور کامن ویلتھ کی سازش میں ہم مسکین بنکر شریک رہیں لیکن آخر میں یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ آپکے اور میرے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے چاہتے رہیئے اور نہ چاہتے رہیئے!
اب میں اپنے دفتر ہی میں جس صورت حالات سے دوچار رہتا ہوں وہ یہ ہے کہ میرے ساتھی کلرک صاحب روزانہ

کہ انگریزی صاحب کے جانے کے بعد اس کی کرسی پر اب جو بھی بیٹھتا صاحب ہی کہلاتا ہے) کو فرشی سلام کرنے میں اور خوشامدی کا ے رجنی کرنے میں ایک دوسرے سے روز مسابقت کرتے ہیں مجھے یہ طبعاً گوارا نہیں کہ اپنی خودی اور غیرت اور اپنے احساس انسانیت کو الفاظ کی ایک خوشنما طشتری میں سجا کر کسی کے ر بطور ہدیہ پیش کر دوں۔ کیونکہ میرے نزدیک جھکاؤ اگر ہو سکتا تو صرف ایک اللہ کے لئے۔ لیکن اگر میں اپنے مزاج کے اس تقا پر جم جاؤں تو مجھے پہلے تو طرح طرح سے یہ جتایا جائیگا کہ جب ہی خوددار اور غیور تھے تو ضمیروں کی اس منڈی میں آئے کیوں تھے ——— اور جب اس پر بھی میں نہ ہونگا۔ تو مجھے کسی نہ کسی طرح نوکری سے نکال باہر کیا جائیگا الاٹمنٹ کے مکان سے بھی۔ اور پھر میرے لئے سوائے اس کے راستہ نہ ہوگا کہ اپنے ہاتھ یا پاؤں کے پہنچے خود ہی کاٹ کر ہسپتا کے فٹ پاتھ پر فقیروں میں جا بیٹھوں۔ فرض کیجئے کہ مجھے نو سے نکالنے کے لئے عالم بالا کوئی کامیاب تدبیر نہ نکال سکے تو ترقی کے راستے میں تو لازماً دیواریں کھڑی ہو جائینگی۔ اس کلرکوں سے نمونہ لے کر انہی کی طرح ایکٹنگ کرتا ہوں ا سے مناسب الفاظ اور فقرے سیکھتا ہوں جو "صاحبوں" کے گفتگو اور تحریر میں استعمال کرنے چاہئیں۔ بلکہ دس بارہ تعلیم کی خرید لیتا ہوں اور وقتاً فوقتاً محکمے کے اوپر والے "یتیم ان کی خیرات کرتا رہتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ خیرات کا بدلہ "دہ در دنیا اور ستر در آخرت" کے فارمولے سے ہیں۔ بھائی اتنا تو آپ مانیں گے کہ حدیث میں مسلمانوں کو کی طرف ہدیہ و تحفہ دینے کی تاکید کی گئی ہے اور واقعہ یہ ہدایت پر عمل کرنے سے محبت بڑھتی ہے۔ بے تکلفی پیدا بدگمانیاں دور ہو جاتی ہے، شکایتیں اور گلے زائل ہو جا دل اور دل میں جوڑ پیدا ہوتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ ہے اور شریعت کا غلط استعمال ہے اور ایسی جدت نہیں واقعہ یہی ہے کہ کرنا میں بھی نہیں چاہتا مگر حالات کی طاق

یہ سب کچھ کرا دیتی ہے۔

اب بات چھڑی ہے تو فاش کر ہی کچھ اور چیزیں بھی کیوں نہ فاش کر دوں، ہمارے بجلی کے دفتر میں عمل دستِ غیب بھی بہت ہوتا ہے خصوصاً نیا میٹر لگوانے کی درخواست، جب کبھی بھی آتی ہے تو ہمارے کلرک اسے بغیر اسکے قبول نہیں کرتے کہ اس پر مقررہ اسٹیمپ فیس ادا کی گئی ہو، گھریلو میٹر کے لئے یہ فیس سو روپے ہے اور صنعتی میٹر کے لئے ڈھائی سو سے ایک ہزار تک۔ یہ فیس وصول ہونے کے بعد نیچے سے اوپر تک کے لوگوں میں ایک مقررہ تناسب سے بٹ جاتی ہے "صاحب" کو ۵۰ فیصدی ملتا ہے اور بقیہ میں سے ۲۰ فیصدی ہیڈ کلرک کے اور ۳۰ فیصدی سارا کارنامہ انجام دینے والے کلرک کے ہوتے ہیں میرا ضمیر کہتا ہے کہ اس قوم دشمنی کی کارروائی میں حصہ لینا اسلام میں بھی حرام ہے اور یوں بھی ایک اخلاقی جرم ہے لیکن اگر میں اس کاروبار سے بچنا چاہتا ہوں تو سارا عملہ مجھے تنگ کرتا ہے مجھ سے بحث کیجاتی ہے میرا مذاق اڑایا جاتا ہے اور آخرکار میری شکایتیں ہونے لگتی ہیں۔ علاوہ بریں جب کوئی عزیز یا دوست کسی طرح کا کام لے کے میرے پاس آتا ہے اور مجبوراً مجھے دوسرے ساتھیوں کو اپنے ہاتھ سے "ھٰذا من فضلِ ربّی" کا مالِ غنیمت دلوانا پڑتا ہے، اب میں سوچتا ہوں کہ "گنہگار بھی ہوں اور گناہ بھی نہ ہوا!" دلالی کر ہی تو پیشہ کرنے سے گریز کیوں؟ گڑ کھاؤں اور گلگلوں سے پرہیز! چنانچہ گلگلے کھانے پر مجبور ہو جاتا ہوں کام بڑا برا ہے، لیکن لت کرنے سے صاحب سے لیکر عملے تک ہی سب لوگ راضی نہیں ہو جاتے بلکہ خود میری بیوی بھی اسی روز زیادہ فدا کار بنتی ہے، جس روز اسطرح کا مالِ غنیمت لے کے گھر جاتا ہوں اب آپ سمجھ گئے ہونگے کہ میرے چاہنے نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔

میں مسلسل تجربات سے یہ مان گیا ہوں کہ "ہوتا ہے وہی جو منظورِ خدا ہوتا ہے" تقدیر کا مسئلہ برحق ہے۔ بندہ مجبور ہے فیصلے اوپر سے ہوتے ہیں اور یہ پہلے سے لکھ دیا گیا ہے کہ کس کو دوزخ میں جانا ہے اور کس کے لئے جنت آراستہ کی گئی ہے، لوگ "ماحول ماحول" کے لفظوں سے جس حقیقت کو بیان کرتے ہیں وہ یہی مشیتِ الٰہی ہے۔ جو کام ہم نہیں کرنا چاہتے وہ کرتے ہیں۔ جو کرنا چاہتے ہیں وہ نہیں کرتے۔ جس چیز کو حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ نہیں ملتی اور جس سے بھاگتے ہیں اسے کوئی ہمارے سر منڈھ دیتا ہے، ہم جن کو لیڈر بنانا چاہتے ہیں انکو کروڑوں ووٹ دیکر بھی نہیں بنا سکتے اور جن کو ایک ووٹ بھی نہیں دینا چاہتے وہی ہمارے وزیر بن جاتے ہیں۔ ہم جس قانون کے خلاف چیخنے ہیں وہ ہمارے اوپر مسلط رہتا ہے اور جس چیز کو قانون کی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں وہ کبھی قبول نہیں کی جاتی عجیب تماشا ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ جیوں مگر زندگی ہے کہ میری جان نہیں چھوڑتی!

لیجئے رشید صاحب اور ذوالفقار صاحب اور چودھری قمر الزماں کے ریڈیو بجنے لگے اور ان کے لاؤڈ اسپیکر پوری آواز میں استعمال کئے جا رہے ہیں۔ میری چھ سال کی لڑکی "نواب جادہ اکرام اللہ جبذہ باد" کے نعرے لگا رہی ہے۔ باہر بچوں کا خلاف قانون مجمع کرکٹ کھیلنے لگ گیا اور سنئے لیجئے میرے دس سالہ بچے نے بھی پنجابی کی بڑی گاڑھی گالی اگل دی ہے اور رشید کی کتورہی اپنی نسوانی بھونک سے کسی کا استقبال کر رہی ہے اور ادھر میرے مکان کی طرف رخ کرکے خواتین کا ایک غول ریڈ کراس کے ہفتے کی تحریک کے تحت غالباً چندہ لینے کیلئے مارچ کر رہا ہے اور ان کے جلو میں ڈاکر خیرات سلطے چلا آ رہا ہے میں نہیں چاہتا کہ بات کو ادھورا چھوڑدوں مگر........!!!

(چراغ راہ)

برمین ~~~~~ دماغی

دماغ کو روشن اور شگفتہ کرتی ہے؛ قوتِ حافظہ کو تقویت پہنچاتی ہے، مفرح اور مقوی قلب ہے، بڑھاپے میں صحت کا سہارا ہے۔ قیمت:۔ بیس یوم کیلئے چار اونس دوا، چار روپے۔ حاذق دواخانہ ہمدرد (وقف) کراچی

راغب مراد آبادی

پیامِ عزم و عمل!

تیرا پیام کیا ہے، سنائیں گے ہم ضرور
انساں کو راہِ راست پہ لائینگے ہم ضرور

ہم صاحبانِ عزم و عمل ہیں خدا گواہ
انسان کا وقار بڑھائیں گے ہم ضرور

آمادہ سرکشی پہ ہیں جو حق سے آج بھی
ان سرکشوں کے سر بھی جھکائینگے ہم ضرور

دار و رسن سے لاکھ ڈرائے کوئی، مگر
حق دوستی کے گیت تو گائینگے ہم ضرور

کھاتے رہے ہیں راہ میں تیری جو حق پرست
سینے پہ اپنے زخم وہ کھائینگے ہم ضرور

بطحا کی وادیوں میں جو گونجا تھا ایکدن
پیغام وہ زبان پہ لائینگے ہم ضرور

راغبؔ پھر آج دین سے جنگ آزما ہے کفر
میدانِ کارزار میں جائیں گے ہم ضرور

جیلانی بی، اے

موت کب آتی ہے

سورج عین نصف النہار پر تھا اور اس کی شعاعیں سیدھے تیر کی طرح ہر شے کے جسم میں چبھ رہی تھیں۔ رحمت علی سر پر چادر کا گوشہ اوڑھے چلا جا رہا تھا۔ اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا اور اس کی زبان سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ وہ دیوانے کتے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ نشک نالے کے پل کے قریب شیشم کا ایک بڑا درخت زمین پر اپنا ٹھنڈا سایہ ڈال رہا تھا۔ اس نے تھکے ہوئے گاؤں کی قبریں غیر منظم صورت میں بکھری پڑی تھیں۔ رحمت نے درخت کے نیچے اپنا بوجھ پھینک دیا اور درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا اس کے جسم میں ایک ٹھنڈی جھرجھری سی پیدا کرتا ہوا گذر گیا۔ رحمت کے منہ سے بے اختیار واہ واہ نکل گیا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی پیشانی ملی اور ایک لمبی سانس لی۔ جب ذرا دماغ ٹھنڈا ہوا تو اسے اپنی پوری زندگی دھوپ کی طرح چلچلاتی معلوم ہوئی۔ ہر روز اس کا یہی کام تھا۔ کڑکتی دھوپ میں کام جانا اور پھر کاٹ کرنا۔ آرام اور چین کب ملا؟ وہ سوچ رہا تھا۔ اس کی حیات کی چھوٹی سی دنیا میں خوشیاں ویسے ہی بہت کم تھیں۔ بچپن سے لیکر پچاس برس کی عمر تک اس کی زندگی ایک ہی رفتار پر چل رہی تھی۔

"اللہ! اگر تو نے اس بوڑھی عمر میں مجھے ایک بچہ بھی نہیں دیا تو بہتر ہے کہ موت ہی بھیج دے۔ میری موت پر میری بیوی کے سوا اور کون رونے والا ہے۔ مختصر سی پونجی پر میرا بھائی قبضہ کر لیگا اور تمام پونجی شراب کے گلاس اور جوئے کی بساط پر بہہ جائیگی۔"

یہ سوچتے سوچتے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور وہ پکار اٹھا "اے موت، اے موت! آ، اور مجھے عالم آلام سے لیجا!"

یکایک سرسوں کے نزدیکی کھیت میں سرسراہٹ پیدا ہوئی اور ایک شخص اس میں سے نکلا، وہ اسی کی طرف چلا آ رہا تھا لیکن اس کا سایہ زمین پر نہیں پڑتا تھا۔ اس کی ڈاڑھی خشخشی تھی اور مونچھیں تنی ہوئی۔ اس کی آنکھیں چاند کی طرح گول اور سورج کی طرح تیز تھیں۔ وہ اپنے لباس اور قطع وضع سے کسی نزدیکی علاقہ کا باشندہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ آیا اور رحمت کے پاس کھڑا ہو گیا۔

"کہو کیا کہتے ہو؟"

رحمت نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں اس کی آنکھوں میں تیر کی طرح چبھ رہی تھیں۔

"کیا تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو؟" رحمت نے پوچھا۔

"ہاں ہاں" اجنبی نے جواب دیا "تم نے ابھی ابھی مجھے یاد کیا تھا"

رحمت خطرے کا احساس کرتے کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہکلاتی ہوئی زبان میں پوچھا "یعنی ت ت تم موت ہو!"

"ہاں تم نے مجھے بلایا تھا"

اس کی آواز رحمت کے کانوں میں ایک چیخ کی طرح گونجی۔ رحمت نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ اس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا "مجھے یہ گٹھا اٹھوا دو گے؟"

فرشتہ موت ہنس پڑا۔ اس کی مسکراہٹ پر رحمت کی جان میں جان آئی، وہ سمجھ گیا کہ موت اتنی سنگدل نہیں جتنی کہ سمجھی جاتی ہے۔ رحمت نے پوچھا "تم کدھر آئے تھے؟"

"میں رمضان کسان کی جان لینے آیا تھا" اس نے جواب دیا

"رمضان" رحمت بے ساختہ چلا اٹھا۔ "اسے تو میں ابھی ابھی ہل چلاتے چھوڑ آیا ہوں!"

"ہاں اسی کے پاس جا رہا ہوں!"

رحمت کے دل میں جذبۂ شوق اٹھا۔ "کیا تم مجھے دکھاؤ گے کہ

موت کیسے واقع ہوتی ہے؟"

"ہاں تم قریبی کھیت میں چھپ کر بیٹھ جانا صرف تم ہی مجھے دیکھ سکو گے!"

رحمت اسکے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ رمضان درخت کے نیچے بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ وہ ابھی ابھی کام سے فارغ ہوا تھا۔ بیل دوسرے درخت کے نیچے بندھے چارہ کھا رہے تھے۔ رحمت گندم کے کھیت میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

رمضان بڑے مزے سے حقے کا کش لگاتا اور اسکا دھواں ہوا میں چھوڑتا، وہ بمشکل تیس برس کا ہوگا۔ اس کا مضبوط جسم اسکے پھٹے ہوئے کرتے میں سے اپنی جھلکیاں دکھا رہا تھا، وہ بار بار گاؤں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دور گاؤں کی سڑک پر اس کی بیوی سر پر ڈلیا اور لسی کی مٹکی اٹھائے چلی آ رہی تھی، اسکا دوپٹہ ہوا میں کشتی کے بادبان کی طرح لہرا رہا تھا، اس کو دیکھکر رمضان جلدی سے اٹھا، اور گھڑے میں سے چلو بھر پانی نکال ہاتھ دھوتے اور کلی کی، پھر اس نے اپنی چادر گھاس پر بچھا دی اور اس طرح بیٹھ گیا گویا وہ کسی دعوت میں دستر خوان پر بیٹھا ہو۔

اس کی بیوی ہنستی ہنستی آئی اور اسکے سامنے ڈلیا اور لسی کی مٹکی رکھ دی۔

"آج میں نے آٹھ کنال زمین پر ہل چلا دیا ہے" رمضان نے روٹی کا ایک لقمہ توڑتے ہوئے کہا۔ ابھی اس نے اپنا ہاتھ منہ کی طرف اٹھایا ہی تھا کہ بیل آپس میں بھڑ گئے۔

"ہئی ہئی" رمضان چلایا۔ مگر بیل بدستور ایک دوسرے کو دھکیلتے رہے۔

رمضان نے ہاتھ سے لقمہ رکھ دیا اور اٹھ کھڑا ہوا اتنے میں رحمت نے دیکھا کہ فرشتہ موت جو درخت کے نیچے کھڑا تھا مکھی بنکر ایک بیل کے سینگ پر جا بیٹھا۔ جونہی رمضان نے ان کو سینگوں سے پکڑ کر جدا کرنا چاہا اس بیل نے جس پر فرشتہ موت بیٹھا ہوا تھا، یکبارگی سر ہلایا اور رمضان کو سینگوں پر اٹھا کر زمین پر دے مارا، اس کی بیوی واویلا کرتی ہوئی اٹھی۔ رمضان نے ایک بار آنکھوں کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ پھر ہمیشہ کے لئے سو گیا۔

رحمت کی آنکھیں تر ہو گئیں اور وہ کھیت سے باہر نکل موت کا فرشتہ باہر کھڑا تھا اس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پو[چھا] "دیکھ لیا تم نے؟"

"ہاں زندگی کا انجام دیکھ لیا" رحمت نے غمگین لہجے میں جواب دیا۔

فرشتہ موت کھڑا ہو گیا۔ "اچھا اب میں رخصت چاہتا ہوں مجھے ابھی بہت کام کرنے ہیں!"

رحمت نے کہا۔ "ذرا ٹھیرو، جانے سے پہلے مجھے بتا[ؤ] میری موت کیسے واقع ہوگی"۔

فرشتہ موت مسکرا پڑا۔

"بھولے بھالے انسان تم مجھے زندگی کا مختار سمجھتے [ہو] میں بھی اسی طرح بے بس ہوں جس طرح تم۔ میں اس خدا کا ایک عاجز بندہ ہوں وہ مجھے جس وقت حکم دیتا ہے مجھے فوراً [تعمیل کرنا] ہوتا ہے یہ تو مجھے بھی علم نہیں کہ کس کی موت کس وقت آئیگی [اور کس] طرح آئے گی۔ ہاں اتنا میں تمہیں ضرور بتائے دیتا ہوں کہ [موت] بھی ایک قانون کے ماتحت ہے!"

رحمت پوری جرأت سے اس کی باتیں سن رہا تھا "مجھے وہ قانون ہی بتا دو"۔

"تم اس قانون کو ابھی نہیں سمجھ سکتے، جب تمہاری [باری] آئیگی۔ اسی وقت تمہیں بتاؤنگا" یہ کہکر وہ مڑا اور نظروں [سے] غائب ہو گیا۔

(۲)

جب رحمت گھر پہنچا تو اسکی بھاوج اسکی بیوی کے [پاس بیٹھی] ہوئی تھی۔ اسکی بھاوج کے دونوں بچے گڑیوں سے کھیل رہے [تھے۔ اس] نے گھر میں قدم رکھتے ہی انکی طرف دیکھا۔ دونوں عورتیں قریب بیٹھی ہوئی تھیں اور اپنے چہرے اوڑھنیوں کی بکلوں [میں چھپائے] رکھے تھے، وہ معاملے کا کچھ حصہ بھانپ گیا۔ لیکن اس [نے] توجہ نہ کی اور اپنا گٹھڑ ناند کے قریب پھینک دیا بغیر

زور سے ڈکرائی۔ رحمت نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور چارہ ناند میں ڈال دیا۔

"کیوں عائشہ کیا بات ہے؟" رحمت نے اپنی بھاوج سے پوچھا۔

عائشہ نے لمبا سا گھونگھٹ نکال لیا: "بھائی کوئی نئی بات ہو تو کہوں!"

رحمت نے مضطرب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اسکے جسم کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے، کہیں سرخ رنگ کی دھجی لگی ہوئی تھی تو کہیں کالے رنگ کی، وہ اپنی سسکیوں کو دبانے کے لئے اپنے دوپٹے کا پلو چبا رہی تھی۔

"کل سے دانے کی ایک کھیل بھی اڑ کر منہ میں نہیں گئی" عائشہ نے دبی آواز سے کہا "معلوم نہیں میری قسمت میں یہ دھکے کب تک لکھے ہوئے ہیں۔ بعض تک تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا زمین بھی ہمارے پاؤں کا بوجھ محسوس کر رہی ہے۔"

"فیروز کہاں ہے؟"

"وہ تو کل صبح سے غائب ہے!"

رحمت دالان میں جا بیٹھا تھکن سے اسکے جسم کا ہر رگ و ریشہ چور ہو رہا تھا۔ اس پر پسینہ اور مکھیاں مستزاد تھیں اس نے اپنے آپ کو زور زور سے پنکھا کرنا شروع کر دیا جب کچھ افاقہ ہوا تو لیٹ گیا مگر اسکی آنکھیں بدستور چھت کی کڑیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اسکے دماغ میں ہر قسم کے خیالات بجلی کی تیزی سے آتے اور غائب ہو جاتے۔ یکایک اس نے اپنے ہاتھ کی پشت پر کسی کا ننھا سا نرم ہاتھ محسوس کیا۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ ننھا بچہ اس کی چارپائی سے سہارا لئے کھڑا مسکرا رہا تھا رحمت نے اسے گود میں بٹھا لیا پھر اس کے سر سے خاک جھاڑی۔

"آہ بدقسمت ننھے!" رحمت کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

(۳)

پانچویں دن رحمت سن رہا تھا۔

"فیروز نے کل لال دین کے کھیت سے ایک کنال چارہ کاٹ لیا ہے۔"

رحمت کی دکان پر بیٹھے ہوئے ایک مریض نے اسے خبر سنائی اور کھانستے کھانستے اسکا چہرہ سرخ ہو گیا۔ رحمت نے اپنی آنکھوں سے گندے شیشوں والی عینک اتار کر رکھ دی اور دیوار سے سر لگاتے ہوئے ایک آہ بھری اس کی آنکھوں کے سامنے ایک لمبے تڑنگے نوجوان کی شکل آن کھڑی ہوئی جو شیشم کے درخت کے نیچے کھڑا ہوا ہے۔ اس کی بھاری مونچھیں بل کھاتی ہوئی اس کے رخساروں کی ہڈیوں کی تک جا پہنچی ہیں۔ اس کی پگڑی اس کے گلے میں لٹکی ہوئی ہے اور اس کے گھونگریالے بال ہوا میں لہرا رہے ہیں اسکی سیاہ موٹی موٹی آنکھیں ہر چیز کی گہرائی میں ڈوب جانا چاہتی ہیں۔ وہ باغی تیر کی طرح جسم میں اتر جاتی ہیں ان کے لئے شکست نہیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بید ہے جس سے وہ اپنے جوتے کی نوک کھٹکھٹا رہا ہے۔

کل رات وہ تاڑی کی دکان پر بیٹھا ہوا تھا اسکے ہاتھ میں ایک بوتل تھی اور خوب مخمور ہو رہا تھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں سرخ ڈورے لال مچھلیوں کی طرح تیر رہے تھے، لال سنگھ نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"فیروز گندم کے دو چھکڑے گاؤں سے نکلنے والے ہیں!"

فیروز کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔

رات کی سیاہی گہری ہو چکی تھی خشک نالے کے پل کے قریب دو چھکڑے گندم سے بھرے جا رہے تھے کہ ایکا ایکی دو آدمیوں نے انہیں روک لیا۔ ان کے ہاتھوں میں برچھیوں کے پھل رات کی سیاہی میں بجلی کی طرح چمک رہے تھے۔ اور ان کی آنکھیں چھکڑے والوں کو گھور رہی تھیں ایک نے آگے بڑھ کر ایک بوری اٹھالی۔ دوسرے نے بھی ایک بوری اپنی پشت پر رکھ لی اور دونوں کھیتوں میں گم ہو گئے۔

دوسرے دن چھکڑے کا مالک فیروز کے پاس آیا۔ وہ اس وقت کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھا ہوا تھا۔

"فیروز مجھے دونوں بوریاں واپس کر دو" اس نے چھوٹتے ہی کہا

فیروز نے اپنا رخ دوسری طرف پھیر لیا اور دور شہتوت کے درختوں کی طرف دیکھنے لگا۔

"فیروز تم مجھے دونوں بوریاں واپس کر دو!" اس نے پھر کہا۔

فیروز نے اس کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھا یہی اسکا جواب تھا

"ایک بزرگ سہی" اس نے لجاجت سے کہا۔

"تمہاری گفتگو میری سمجھ سے بالاتر ہے" یہ کہہ کر وہ چل دیا

چھکڑے والے کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا "بدمعاش! غریبوں کو لوٹنے والے۔ اگر تم بوریاں سیدھے ہاتھوں واپس نہ کروگے تو اچھا نہیں ہوگا۔"

فیروز نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ "تم مجھ سے مخاطب ہو؟"

"ہاں ہاں تم سے شرابی لٹیرے"

فیروز نے ایک قدم اس کی طرف بڑھایا، چھکڑے والے نے دیکھا اس کی آستین سے ایک چمکدار خنجر جھانک رہا تھا۔ وہ اس کی طرف تیزی سے بڑھتا آ رہا تھا۔

"تم مجھ سے مخاطب ہو؟"

چھکڑے والا یکایک چلاتا ہوا بھاگا "وہ مجھے قتل کر دیگا۔ لوگو! مجھے بچاؤ"

فیروز کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ پھر اپنے راستے پر ہو لیا۔

جب وہ اپنے بھائی کی دکان کے سامنے سے گزرا تو رحمت نے اسے آواز دی لیکن اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ رحمت علی نے بھاگ کر اسے جا لیا "بھائی کی بات سننا بھی تمہیں ناگوار ہے۔"

فیروز اس وقت بھی نشے میں دھت تھا رحمت کو اس کے منہ سے شراب کی گرم گرم بو آ رہی تھی اس کے گلے میں موتیا کا ایک کمہلایا ہوا ہار پڑا تھا۔

"میں نے آواز نہیں سنی تھی" فیروز نے اسی لاپرواہی سے جواب دیا

"فیروز! تمہیں شرم آنی چاہیے۔ تم دو بچوں کے باپ ہو۔ کل تمہاری اولاد بڑی ہوگی۔ تو دنیا کے منہ سے تمہارے متعلق کیا سنے گی؟"

"یہی کہ وہ بہادر اور نڈر تھا"

رحمت نے اپنے ہونٹ غصہ سے چباتے ہوئے کہا "تم ان کے لئے بری مثال پیدا کر رہے ہو!"

فیروز کی آنکھیں بیتابی سے اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ وہ بلائے ناگہانی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا "یہ پند و نصائح کے دفتر کس لئے؟ میرا کام اس زندگی سے چل رہا ہے جسے تم بری زندگی سے تشبیہہ دے رہے ہو۔ ابھی تک تو مجھے نیکی اور بدی میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوا۔ تم کہتے ہو نیکی سے چین کی زندگی بسر کرتا ہے۔ خدا کی رحمتیں اس پر نازل ہوتی ہیں، کہتا ہوں، بدی سے بھی انسان سب کچھ حاصل کر سکتا ہے بلکہ بدی تو سب سے زیادہ حلال کمائی ہے۔ رات کے بارہ بجے اٹھکر بوریاں پر لاد کر لانا۔ کسی سے لڑنا جھگڑنا اور مار کھانا"

فیروز چپ کھڑا رہا۔

"خدا نے تمہیں ایسی نیک بیوی دی ہے لیکن تم ہوا فاقوں پر پال رہے ہو۔ تم کب راستی کی زندگی پر آؤ گے، تمہارے ہاتھ سے مخلوق نالاں ہے، اور تو اور تم خود اپنے لئے کس قدر زہر ہو"

"تو عائشہ تمہارے پاس آئی تھی" فیروز نے تیوری چڑھا

"تو وہ کس کے پاس جاتی؟ تمہارے پاس؟"

فیروز اپنے دانتوں میں ایک تنکا چباتا رہا۔

"اگر تم اپنے بچوں سے بھی تنگ ہو تو انہیں میرے گھر میں ۔ انہیں پالوں پوسوں گا۔ ان ننھی جانوں کا کیا قصور ہے جو تم غریب عائشہ کیساتھ فاقوں مار رہے ہو۔ تم جانتے نہیں وہ تمہارے خون سے بنے ہیں۔ اگر پیٹ کے دوزخ میں کچھ ایندھن ڈال تو انہیں کیوں بھول جاتے ہو؟"

فیروز نے اپنی بھاری مونچھوں کو بل دیا اور اپنے نفی میں ہلایا۔

"میں اپنے بچوں کا گلا گھونٹ دونگا۔ میں عائشہ کو بند کر کے دریا میں پھینک آؤنگا!"

رحمت اس وقت ہوش میں آیا۔ جب فیروز

(۳)

چاند اپنے سایوں کو غور سے دیکھ رہا تھا، فیروز سے ہوتا ہوا اپنے گھر پہنچا۔ اس کی بغل میں ایک بوتل

سے کھڑا ہو گیا، چاروں طرف اتھاہ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے
کو کھولا اور اس کو منہ سے لگا دیا اور غٹا غٹ ایک ہی سانس میں
۔ بوتل کو دیوار سے دے مارا پھر دہلیز پر کھڑے ہو کر دروازے
زور سے کھٹکھٹایا۔ دروازہ پہلی ہی دستک پر کھل گیا وہ اندر داخل
گیا اور کواڑوں کو زنجیر چڑھا دی۔

آنگن میں بیری کے درخت نے چاندنی کو اپنے پتوں
چھپا رکھا تھا۔ اندرونی کمرے کا سیاہ دروازہ نیم چاندنی میں
بھوت سے کھڑا تھا۔ فیروز آہستہ آہستہ بڑبڑا رہا تھا "تم اسکے
گئی تھیں؟ تم اسکے پاس گئی تھیں؟" وہ سایوں کے ساتھ
ہوا اندر داخل ہوا۔

عائشہ اپنے مصلے پر بیٹھی رو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ آسمان کی طرف
اٹھے ہوئے تھے۔ "میرے اللہ! میرے خاوند کو ہدایت دے میرے
... میں جانتی ہوں تو مجھے اپنے دامنِ رحمت میں لینے سے پہلے
... کر میری اصلیت دیکھنا چاہتا ہے، اللہ تو ہی مجھے توفیق
... کہ میں تیرے امتحان میں پوری اتر سکوں۔"

باہر سے قدموں کی چاپ سنائی دی اور وہ جبلی طور پر جان
گئی کہ وہ کون تھا وہ اپنے مصلے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ فیروز دروازے
کی چوکھٹ سے ٹیک لگا کر کھڑا اسکی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تم ... اسکے پاس گئی تھیں؟"

عائشہ نے لمبے وقفے کے بعد جواب دیا۔ "میں بھوک سے
بے تاب ہو گئی تھی۔"

"ٹھیک!" اندھیرے میں سے کرخت آواز آئی "تمہارے
پاس مٹی نہیں رہتی تھی۔"

"میں بھی انسان ہوں — میں تو مٹی کھا لیتی لیکن
میرے بچے کیا کرتے؟"

"انھیں اپنا خون پلاتیں!"

یکایک اندھیرے میں سے ایک ہاتھ اٹھا اور دھم سے عائشہ
کے سر پر پڑا۔

"آہ!" وہ ایک ہلکی سی چیخ مار کر گر پڑی "تم کتنے ظالم ہو،
تمہیں خدا کے قہر کا خوف نہیں؟"

فیروز نے ایک قہقہہ لگایا "خداوندی قہر تمہارے لئے ہے،
میرے لئے نہیں۔"

"میری قسمت!"

وہ خاک میں لتھڑی پڑی تھی۔

"تم اس کے پاس کیوں گئیں؟" فیروز نے کڑک کر کہا "شیطان
کی بیٹی، کیا وہ تمہارا یار تھا؟"

"نہیں وہ بڑا بھائی ہے تمھیں شرم نہیں آتی، تم اپنے بھائی
کے متعلق منہ سے ایسے الفاظ نکال رہے ہو؟"

اس نے عائشہ کو چوٹی سے پکڑا اور کھڑا کر کے اس کے پیٹ
میں ایک ایسی لات ماری کہ وہ چیخنی کھاتی ہوئی دیوار سے جا لگی۔

"ظالم! میں تیری امانت اٹھائے پھر رہی تھی یہ تو نے کیا کیا۔"

عائشہ کی کانپتی ہوئی آواز اٹھی اور آہستہ آہستہ تیز اور بلند
سانسوں میں گم ہو گئی۔

(۵)

رحمت علی یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور سن رہا تھا لیکن وہ خود
بھی اسی طرح بے بس تھا جس طرح عائشہ! صرف کبھی کبھی فیروز کو روک
کر دل کی بھڑاس نکال لیتا۔ جب وہ فیروز کے نت نئے کرتوت سنتا تو
اسے اپنی بے کسی اور بے چارگی اور بھی زیادہ شدت سے یاد آتی۔ اس
کا کوئی بچہ نہ تھا۔ وہ خود طبیب تھا لیکن اپنے لئے کوئی ایسی دوا نہ
ڈھونڈ سکا جو اس کے گوہرِ مقصود کو اس کی جھولی میں لا کر ڈال دیتی
رات کے سناٹے میں کبھی کبھی اس کے ہاتھ دعا کے لئے اٹھ جاتے۔
اسکی چارپائی کے قریب فاطمہ سو رہی ہوتی تو گھنٹوں اس کے چہرے
کو دیکھتا رہتا پھر معاً اس کے دل میں سوال پیدا ہوتا "میری موت کے
بعد اسکا کون وارث ہوگا یہ بیچاری۔" اور اسکی آنکھوں سے آنسو ٹپ
ٹپ گرنے شروع ہو جاتے۔ اسکے بعد عائشہ کی مصیبت کا سوال تھا۔ ایک دفعہ
وہ عائشہ اور بچوں سمیت اپنے گھر میں لے آیا فیروز نے کوئی بات کہی
نہیں، وہ اس کے گھر کے سامنے سے اسطرح گزر جاتا گویا کچھ ہوا ہی نہیں گویا
وہ شادی شدہ تھا ہی نہیں۔ وہ پہلے سے زیادہ آزادی کیساتھ اپنی رنگ رلیاں

میں مصروف ہو گیا۔

وہ ان لوگوں کے لئے بہترین آلہ تھا جو کسی سے انتقام لینا چاہیں کوئی اسکے پاس آتا اور کہتا "فیروز! فلاں شخص گھر سے نکلے تو اسے ذرا ٹھیک تو کر دینا"۔ فیروز سائل کی طرف اپنی آنکھوں کے مخصوص گوشوں سے دیکھتا اور اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتا پھر وہ اپنے انگوٹھے کو اپنی انگلی پر اس طرح حرکت دیتا گویا وہ روپے کھنکھنا رہا ہو۔ سائل سمجھ جاتا اور اسکی ہتھیلی پر چاندی کے چند سکے یا بعض اوقات ایک بوتل رکھ دیتا۔

یہی اسکا پیشہ تھا اور یہی کام - وہ اپنے گاؤں میں ہوا کی طرح آزاد تھا وہ جس شے کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا وہی اس کی تھی۔

جب کوئی اس سے کہتا "فیروز تم کاشتکاری کیوں نہیں کرتے؟" تو اسکا جواب یہ ہوتا "میں یہ سب کام اس دن کرونگا جب میرے ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائیں گے!"

ایکدن وہ رحمت کے گھر آیا اور عائشہ کو زور زور سے پکارنے لگا۔

"کیوں چلا رہے ہو؟" عائشہ نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"تم اسی وقت میرے ساتھ گھر چلو۔ میں تمہیں کسی صورت میں بھی یہاں دیکھنا پسند نہیں کرتا"۔

اس کے الفاظ آخری الفاظ تھے۔ عائشہ نے بچوں کو ساتھ لیا اور اس کے آگے آگے ہو لی۔

کچھ دنوں کے بعد رحمت علی کو معلوم ہوا کہ کسی نے اسکے کان میں بھنک ڈالدی تھی کہ عائشہ اور رحمت کا ناجائز تعلق ہے۔

(۶)

پورے ڈیڑھ مہینے کے بعد عائشہ کے بچہ پیدا ہوا جس نے اس دنیا میں آکر چند سانس لئے اور پھر ہمیشہ کے لئے چپ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی عائشہ کی حالت بھی متغیر ہو گئی۔

جب دائی بچے کو کپڑے میں لپیٹے ہوئے باہر نکلی تو فیروز آنگن میں بیری سے لگا کھڑا تھا وہ چپ چپ سا تھا اس نے دائی کو باہر نکلتے دیکھا جب وہ اس کے قریب آئی تو وہ آگے بڑھا۔ دائی نے اس کا مطلب سمجھ لیا اور اس نے بچہ کے مردہ چہرے سے کپڑا الٹ دیا۔ بچہ ابدی نیند سو رہا تھا، اسکے ملائم سفید بال ریشم کے باریک لچھوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے اس کا حلیہ ہو بہو فیروز سے ملتا تھا۔

"عائشہ کیسی ہے؟"

"وہ تمہیں بلا رہی ہے"۔

عائشہ اندر چارپائی پر کپڑوں میں لپٹی لیٹی ہوئی تھی۔ روزن میں سے روشنی چھن چھن کر اس کے چہرے کو منور کر رہی تھی۔ فیروز اس کے قریب چارپائی پر بیٹھ گیا۔ عائشہ نے اس کی طرف اپنی بھوری آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ وہ زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔

عائشہ نے کہا "میں نے اپنے فرض کو پوری تندہی سے ادا کرنے کی کوشش کی ہے اگر مجھ سے کوئی خطا ہو گئی ہو تو مجھے معاف کرنا"۔ اس نے دیکھا فیروز کی آنکھوں سے ایک آنسو ڈھلک کر اس کے ہاتھ پر گر پڑا۔ عائشہ نے کہا۔

"خدا ہم سب کو معاف کرے ہم بہت کمزور ہیں۔ ہم پہاڑوں کو گرا سکتے ہیں لیکن نفس کے مقابلہ میں شکست کھا جاتے ہیں۔ ہم گناہ کرتے رہتے ہیں لیکن اس زندگی سے رخصت ہوتے وقت گناہوں کی گٹھڑی ہی سر پر ہوتی ہے۔ میں اس دن سے ڈرتی ہوں جب اعمال نامے، جب ہماری پوری زندگی کی کارگزاری ہمارے سامنے پیش ہو گی"۔

فیروز کا مضبوط سر عائشہ کے سینے پر ڈھلک گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ——— اسی شام عائشہ مر گئی۔

(۷)

فیروز اب بہت کم باہر دیکھا جاتا اب وہ غنڈوں کی مجلس یا شراب کی دکان کے بنچ پر لیٹا پایا جاتا۔ اگر کوئی اس سے ملنا چاہتا تو وہ اسے گھر ہی پاتا جہاں وہ بیری کے نیچے چارپائی پر بیٹھا اپنے بچوں کو کھلاتا۔ اگر کوئی اسے مارپیٹ کے لئے کرائے پر لینا چاہتا تو اول وہ خاموش رہتا اگر زیادہ اصرار کرتا تو صرف اتنا کہہ دیتا۔

"جی نہیں چاہتا"۔

عائشہ دو بچے چھوڑ کر گئی - ایک چار سال کا بچہ اور ایک دو سال کا۔ رحمت نے عائشہ کی وفات کے بعد چاہا کہ بچوں کے متعلق فیروز سے گفتگو کرے اور ان کو اپنے سائے میں لے لے،

پڑی۔ آخرکار وہ خود ہی محسوس کرنے لگا کہ فیروز کو آپ ہی اپنے بچوں کی نگہداشت کرنی چاہیئے۔ اس کے علاوہ اس نے سوچا شاید بچوں کا بوجھ اس کو راہِ راست پر لے آئے۔

(۸)

عائشہ کی موت کے کچھ دن بعد کا واقعہ ہے ایکدن رحمت علی شام کے وقت دوکان بڑھا کر گھر آیا تو اپنی بیوی کو دالان میں ٹوٹتے ہوئے پلنگ میں سسکیاں بھرتے ہوئے پایا۔

"کیا بات ہے" اس نے یہ منظر دیکھ کر دریافت کیا

لیکن وہ چپکے چپکے روتی رہی

"کیا وہ راز میرے لئے نہیں؟" رحمت علی نے پھر پوچھا

"نہیں"

فاطمہ اٹھی اور اس کے سامنے کھانا چن دیا۔ رحمت نے کھانا شروع کر دیا اور فاطمہ پھر بیٹھ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ رحمت آہستہ آہستہ لقمے چباتا رہا اور سوچتا رہا وجہ کیا ہے لیکن کچھ نہ جان سکا آخر کار اس نے فیصلہ کیا یہ بھی ایک قسم کا دورہ ہے جو عموماً عورتوں پر گزرے دنوں کی یاد سے پڑ جاتا ہے

رات کو سونے وقت اس نے اپنی بیوی سے پھر وجہ دریافت کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ یہ کہتے ہوئے کہ تمہیں بتانے سے کیا فائدہ ــ؟

"فاطمہ تمہیں میری قسم ضرور بتاؤ"

لیکن فاطمہ بدستور چپ رہی۔

"اگر تمہیں کوئی بات بتاؤں تو تم اسے صحیح مانو گے؟"

"ہاں"

"تم اپنے بھائی کی رعایت کروگے"

رحمت علی کی حیرت قدرے کم ہوئی۔ اس نے سوچا یہ بھی کوئی روز کی شکایت ہوگی۔

"نہیں تم کہو تو سہی"

وہ آج یہاں آیا تھا۔ اپنے بچوں کو ساتھ لایا تھا اور ـــــــ کہتا تھا کہ میں انھیں تمہارے سپرد کرنے آیا ہوں"

رحمت علی ہنس پڑا۔ "بس اتنی سی بات، یہ بھی کوئی معاملہ تھا جسے تم سوہان روح بنا بیٹھیں، ہشت"

"نہیں، نہیں"، فاطمہ نے جھنجھلا کر کہا "تم بات نہیں سمجھے وہ کہتا تھا میرے گھر چل کر رہو"

"کیا کہا؟" رحمت نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں ہاں اس نے یہی کہا تھا۔ وہ سخت اصرار کرتا رہا حتیٰ کہ مجھے چیخنا پڑا۔ وہ شراب سے مخمور تھا اور کہتا تھا کہ میں اپنے بھائی سے بدلہ لینا چاہتا ہوں"

رحمت علی کی آنکھوں کے سامنے اسکی بیوی کی شکل گھومنے لگی، چارپائیاں چھت اور مکان سب الٹ پلٹ ہو رہے تھے۔ اس نے محسوس کیا گویا کوئی اس کا گلا دبا رہا ہے اور وہ اس کے ہاتھ اپنے گلے سے اسوقت تک الگ نہیں کر سکتا جبتک کہ وہ اسکا ہاتھ کلائی ہی سے نہ کاٹ دے بس یہی علاج ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی اس کے دل پر ہاتھ ڈالے اور وہ بت بنا رہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی مرا[illegible] اس کی بے حرمتی کرے اور وہ چپ بیٹھا رہے یہ کیسے ہو سکتا ہے

اسکی بیوی سسکیاں بھر رہی تھی اور کہہ رہی تھی "اپنی زندگی بھر میں میں نے کسی سے ایسے الفاظ نہ سنے تھے۔ اگر اس وقت مجھے تمہارا خیال نہ ہوتا تو میں [illegible] کا [illegible] لیتی اف، اف، اف !!!"

رحمت علی اٹھ کھڑا ہوا، اس کی آنکھیں غیر معمولی قوت سے چمک رہی تھیں۔

"مجھے خنجر دو میں اسکا قصہ پاک کر دینا چاہتا ہوں میں خلقِ خدا کے لئے کانٹوں بھرا راستہ صاف کر دونگا"

اس کی بیوی کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اسکی آنکھوں کے سامنے خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ دنیا کا شور، قتل قتل کی آوازیں، ہلچل اور شیشم کے ٹنڈ کے نیچے لٹکتی ہوئی اس کے شوہر کی لاش سبھی کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے چند ہی لمحات میں پھر گیا۔ وہ چیخ مار کر اس کے قدموں میں گر پڑی اور اسکی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

"تم نہیں جاؤ گے۔ میں تمہیں نہیں جانے دونگی"

لیکن رحمت علی بدستور افق کی طرف دیکھ رہا تھا، اسکی مٹھی زور

مشیر کرام سے پہنچ گئی۔ اس کے جسم کی تمام قوت اس کے بازوؤں میں جمع ہو گئی تھی

"پیالہ چھلک چکا ہے۔ اب تم مجھے چھوڑ دو۔"

رحمت علی نے اپنی بیوی کو ایک ٹھوکر لگائی اور لپک کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ فاطمہ بے تحاشا اس کے پیچھے بھاگی لیکن رحمت علی اپنا دامن چھڑا کر پوری تیزی سے سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا یکایک اس کا پاؤں رپٹا اور وہ بیس زینے لڑھکتا ہوا نیچے بیہوش آن گرا۔

جب اسے ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو دالان میں چارپائی پر پایا۔ صبح کا تازہ سورج چمک رہا تھا اسکی بیوی اس کے قریب بیٹھی اسے پنکھا کر رہی تھی اور ڈاکٹر اس پر جھکا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر کے پیچھے فیروز غمگین نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اسے دیکھتے ہی رحمت غصے سے چیخ اٹھا "نکل جاؤ میرے گھر سے" جب سے نقرہ ادا کیا تھا کہ اس کا سر چکرا گیا۔ آنکھوں کے تو اسکا جواب یہ ہوتا "میں یہ سب [illegible] اس سے [illegible]

سامنے دنیا گھومنے لگی اور وہ پھر بے ہوش ہو [illegible] سے کراہنے لگا۔

دوپہر کے قریب اس کی آنکھ کھلی۔ اس کی بیوی اسے پنکھا کر رہی تھی اور ڈاکٹر ایک دوائی تیار کر رہا تھا۔ جب ڈاکٹر نے رحمت کو بیدار ہوتے دیکھا تو وہ اسکے قریب آیا۔

"کیا تم اب افاقہ محسوس کرتے ہو؟"

رحمت علی نے اپنے سر کو ہلانے کی کوشش کی مگر وہ ایک پتھر کی طرح جما ہوا تھا اس نے اپنے ہاتھ سے سر کو ٹٹولا۔ سر بھاری پٹیوں میں چھپا ہوا تھا۔

"میرا سر مردہ ہو چکا ہے۔"

اس نے بیوی کی طرف دیکھا وہ دوپٹے میں اپنا چہرہ چھپائے سسکیاں بھر رہی تھی۔ ڈاکٹر رحمت کیطرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا بہت جلدی"

رحمت علی دل ہی دل میں ڈاکٹروں اور طبیبوں کے اس فریب پر ہنسا۔ وہ کہنا چاہتا تھا "میں بھی طبیب ہوں" لیکن اس کی زبان کو یارائے کلام نہ تھا۔

ڈاکٹر نے اسے ایک پیلے رنگ کی دوا پلائی اور قریب کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

رحمت علی کی آنکھوں کے سامنے رات کے واقعا[ت] صورت میں آنا شروع ہو گئے۔ یکایک اس نے محسوس کیا زندگی کو بالکل چھوڑنا نہ چاہتا تھا۔

شام کے قریب ڈاکٹر نے اسے ایک اور خوراک پلا[ئی]

"ڈاکٹر صاحب! کیا میں بچ جاؤں گا؟" رحمت [illegible] آواز میں پوچھا۔

"یقیناً یقیناً" ڈاکٹر نے فاطمہ سے فیس لینے [کے بعد] کے بعد اس نے اپنا چھوٹا سا چرمی بیگ اٹھایا اور نکل گیا۔ فا[طمہ نے] روشن کیا اور اس کی پائینتی بیٹھ گئی۔

"کیا اب کچھ افاقہ ہے؟"

رحمت علی نے آنکھیں گھما کر اس کی طرف دیکھا اس [کی آنکھوں] میں دیے کی سرخ لو ناچ رہی تھی۔

"فاطمہ اگر میں مرگیا تو تم کیا کرو گی؟"

فاطمہ نے پھر رونا شروع کر دیا "یقیناً ایسا مت کہو، [تم] سے پہلے مجھے مار دو گے۔"

رحمت علی کو اس وقت اپنا بچپن یاد آگیا کس طرح کی سنہری دھوپ میں لوہے کا چکر چلاتا دوڑتا پھرتا تھا۔ پھر [باپ] کی انگلی پکڑے کھیتوں میں جاتا، سبز سہانے کھیت چاروں [طرف] پھیلے ہوتے اس کا باپ چنار کے درخت کے نیچے [بیٹھ کر] اسے ایک سرخ پھول توڑ دیتا۔

"کیوں بے رحمت تو بڑا ہو گا تو کیا بنے گا؟"

"بابو"

اس کا باپ کھلکھلا کر ہنس پڑتا اور اس کا دانتوں [کا چوکا] کھل جاتا۔ پھر اس کی شادی ہو گئی اور اس کی چاند سی بیوی آ[گئی]

رحمت علی نے فاطمہ کی طرف دیکھا "تمہیں شادی [کی] راتیں یاد ہیں۔"

"ہاں یاد ہیں" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب [دیا]

پھر اس کی شادی کے فوراً بعد ہی ساس بہو کا قدیم رسم[و رواج شروع] ہو گیا۔ اور جب اس کی بوڑھی ماں نے نوخیز نسل کی جگہ چھینی چ[اہی]

پھر ... کے بعد بوڑھا باپ بھی مرگیا۔ اور وہ اپنی طب کی دُکان
...، وہ انسانوں کی زندگی کو موت کے کنارے سے
... کرتا تھا لوگ خوش ہوتے تھے اور اپنی زندگی کی
... دیتے تھے۔

ز... ت بڑبڑایا۔ اس کے دل میں درد ہونے لگا۔ اسے
مرے ... بچے کی طرح یاد آرہی تھی۔

رات ... زیادہ گزر چکی تھی آسمان پر ستارے ٹمٹما کر
روں جا ... خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ فاطمہ اونگھتے اونگھتے
چارپائی کی پٹی ... لگا کر سوگئی تھی۔ اسے بھی نیند کی جھپکی آئی لیکن
یک اس کی آنکھ ... تمام کمرہ کسی آسمانی نور سے روشن ہو رہا تھا
پنے کانوں میں ... وں کے پھڑپھڑانے کی آواز سنی سامنے
فرشتہ موت کھڑا ... اسی دن اسے دیہاتی لباس میں ملا تھا۔
...نو میں ملبوس تھا وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔

"کیا میرا وقت آگیا ہے؟" رحمت نے پوچھا۔

"ہاں دوست اب تمہاری مہلت ختم ہے۔ تم نے زندگی کا
...ب پیا۔"

لیکن جب رحمت نے سوچا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ ابھی جام کو
...نے بھی لگا تھا۔

"مجھے تمہارا ایک وعدہ یاد آرہا ہے" رحمت نے کہا

"ہاں" فرشتے نے جواب دیا "تم یہ راز معلوم کرنا چاہتے تھے
...کب آتی ہے۔ یہ موت کا راز نہیں زندگی کا راز ہے۔ رحمت نے
...ی کی طرف دیکھا وہ بدستور سو رہی تھی

"انسان کو زندگی اس وقت عطا ہوتی ہے جب تک کہ وہ
...لئے اور نوع انسانی کے لئے مفید ثابت ہو اور جب اس کی
...ختم ہو جائے اسی وقت اس کی موت آجاتی ہے۔ تم نے اپنی
...بر غور کیا کل رات جب تم سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے
...ت تم انتہائی غصے میں تھے اگر تم نہ گرتے تو تم فیروز کو ضرور قتل
...کیونکہ وہ اس رات شراب سے خوب مخمور ہو کر سو یا پڑا تھا
...سے قتل کر دیتے تو اس کے بچوں کی پرورش و نشوونما بہت حد
تک رک جاتی اور قدرت تم سب کو دنیا میں محض اس لئے ڈھیل دے
رہی ہے کہ تم ان نئے شگوفوں کی ترقی کے موجب بنو اور ان کی راہ
میں حائل نہ ہو۔ خزاں اسی لئے آتی ہے کہ بوڑھے پتے نئے شگوفوں
کے لئے راستہ چھوڑ دیں، وہ اسی وقت تک شاخ پر لگے رہتے ہیں
جب تک وہ اپنا کام انجام دیتے رہتے ہیں اور درخت کو من حیث
المجموع فائدہ پہنچاتے رہتے ہیں اور جوں ہی وہ کام کے اہل نہیں رہتے
ان کے پاؤں خود بخود چھوٹ جاتے ہیں۔ وہ لڑھکتے ہوئے زمین پر
آگرتے ہیں۔ عائشہ کی زندگی بھی اسی لئے چھین لی گئی کہ اگر وہ زندہ
رہتی تو فیروز ہمیشہ لاپرواہ رہتا اور بچے پانی کے تنکوں کی طرح
ادھر ادھر بہتے پھرتے۔ کیا نیک کیا بد دنیا میں ہر ایک کا یہی حال
ہے ان کا زمین پر چلنا پھرنا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ قدرت
کے کسی مقصد کے لئے ابھی تک مفید ہیں۔

رحمت نے ایک لمبا سانس لیا "میرے بعد فاطمہ کا کیا بنے گا"

"تم دیکھ لوگے" یہ کہہ کر فرشتہ آگے بڑھا اور اس کے دل پر اپنا ہاتھ
رکھ دیا۔ زندگی کی لہر اس کے پاؤں سے چڑھتی ہوئی اوپر چلی آرہی تھی جوں
جوں زندگی دل کے قریب پہنچتی جا رہی تھی وہ بلند سے بلند ہوتا جا رہا تھا
اس نے محسوس کیا گویا وہ نادیدہ آفاق کی فضاؤں میں تیر رہا ہے
دور سے مؤذن کی تھراتی ہوئی آواز بلند ہوئی "اللہ اکبر اللہ اکبر"
اور رحمت کا آخری سانس ہوا کے جھونکے کی طرح اس کے جسد خاکی
سے نکل گیا۔ جب اس کی روح اپنے نشیمن سے نکل رہی تھی تو اس نے
دیکھا فیروز اپنے دونوں بچوں سمیت اندر داخل ہوا۔ فاطمہ چارپائی
کی پائینتی سے سر لگائے دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ وہ اس کے
قریب ہوا۔ وہ پہلے سے بہت بوڑھا اور سنجیدہ دکھائی دیتا تھا۔

"فاطمہ" اس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف
دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا گناہ معاف کر دو۔ اٹھو اور ان بچوں کو اپنے
دامن میں چھپا لو ...."

(بشکریہ یثرب)

نعیم صدیقی ●

اقبالؒ کے قدرداں

ہوا ہے خوگرِ اسراف جنکا کبر شیطانی　　جو اندھے بن جائیں مادے کے ماورا

ہوس کی بندگی نے جن سے چھینا نورِ ایمانی　　اگر زندہ ہیں ہم تو زندگی کا مدعا کر

ہیں صوفے جنکے افرنگی ہیں قالیں جنکے ایرانی　　جو دیکھیں ابتدا کو اور ... نہ

وہی ہیں جو تڑپ جاتے ہیں خود ہی گا کے یہ مصرع　　انھی سے پوچھیے اس نکتۂ حکمت کی تفسیریں

"لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی"　　نظامِ فکر انساں میں "مقامِ کبریا" کیا ہے

گنے جاتے ہیں جو "قوت" کے سچے حمد خوانوں میں　　ذرا سا کوئی خطرہ ہو تو دم جن کا کد

غلامی جنکے ذہنوں میں خوشامد ہے بیانوں میں　　جو پتہ بھی ہلے ذہنی توازن تک

عقابی روح ہے بیدار ایسے ہی جوانوں میں　　وہ جنکی قبرِ تن میں زندگی کا لاشہ

ترانہ ہے یہ اک انکے پسندیدہ ترانوں میں　　وہ ایماں کے حلاوت آشنا سر اس پہ دھنتے ہیں

"تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں"　　کہ "مومن ہو سپاہی تو وہ بے تیغ بھی لڑتا ہے"

ضمیر اپنا جو در زر بیچ کر یاں پیٹ بھرتا ہے　　وہ ملت کے مفکر جو تشدد پر ہے ر

وہ جس کا ہر اصولِ زندگی منڈی کا سودا ہے　　جنہوں نے رشتۂ قرآن و سنت کاٹ ک

جو اپنے دین و ایماں کو کرائے پر چڑھاتا ہے　　انہی کی سعی سے اقبالؒ کا پیغام

وہ اکثر گنگنا لیگا "خودی کو کر بلند اتنا"　　"تصور مصطفٰے خود را رساں او بر سرِ دیں است"

"خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے"　　"وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ"

یونہیں استاد طبلہ خاں کہ جنکے دم سے ہے ہل چل　　ہیں اسکے شعر آویزاں مقدس آستا

اُدھر سارنگی بائی ہیں بڑی کافر بڑی چنچل　　بہت مقبول ہے وہ نعت خوانوں سے خوا

اِدھر رقصندہ بانو ناچتی پہنے ہوئے چھاگل　　صدائیں گونجتی ہیں اسکی اپنے بادہ خ

انھیں زیبا ہے گائیں مل کے "طاؤس و رباب آخر"　　بہت ہی وجد کرتی ہوگی روحِ شاعرِ مشرق

انھیں کے منہ سے سجتا ہے کہ "شمشیر و سناں اول"　　کہ بامِ عرش کے طائر ہیں کیسے قدر دانوں میں

لہ لہ لہ لہ ان مواقع پر اقبالؒ کے مصرعوں میں تصرف کرنا پڑا ہے ۔ منہ

(جاری)

الفت منہاس ●

انٹرویو

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر رعنا نے ٹائی باندھتے ہوئے سوچا۔

میں نے بی۔ اے کا امتحان آخر پاس کر ہی لیا۔ لوگ کہنے لگے تھے۔ امیر کا بیٹا ہے پڑھے گا کیسے۔ اگر یہ لوگ بلندیوں سے پستیوں کی طرف نہ آئیں گے۔ تو پستیوں میں گرے ہوئے لوگ کیسے ابھریں گے۔ لیکن یہ لوگ کیا جانیں۔ امیروں کے لئے وقت نکالنا کتنا مشکل ہوتا ہے، وہی حمید جس نے اس پر آوازہ کسا تھا۔ کیا جانتا ہے کہ امارت کیا ہے، غریب کو کام ہی کیا ہے۔ ایک غریب گھر میں زندگی کتنی سادہ ہوتی ہے اور زندگی کے پروگرام بھی کتنے سادہ ——— باورچی خانہ میں ماں کے پاس بیٹھکر ناشتہ کرو۔ جلدی سے چپل پہنو اور کالج چلے جاؤ۔ کالج میں فیس معاف۔ اس لئے کبھی فیس وغیرہ دینے کی بھی فکر نہ ہوگی کالج سے واپس آؤ، کھانا کھاؤ، اور پڑھنے بیٹھ جاؤ۔ نہ کسی دوست اور نہ کسی رشتہ دار کے آنے کا خطرہ ——— گھر میں مکمل خاموشی اور سکون بس رات تک پڑھتے جاؤ۔ پھر امتحان میں اگر درجہ اوّل میں نہ پاس ہو سکوں تو حیف ہے!

اس کے برعکس ——— امیر کی زندگی کا روزانہ پروگرام غریب سے کس قدر مختلف ہے۔ امیر کا بچہ صبح اٹھتا ہے۔ رات دیر تک جاگنے کی وجہ سے پلکیں نیند سے بوجھل۔ تقریباً پندرہ منٹ صبح کی میٹھی نیند سے مقابلہ کرنے کے بعد بستر سے اٹھے، باتھ روم میں گئے، گرم پانی کے لئے تھوڑا سا تو انتظار کرنا ہی پڑیگا۔ اس دوران میں شیو کرنا ضروری کام ہے، اگر شیو نہ ہو سکا تو نہ سہی، آخر ڈاڑھی ہی تو بڑھے گی، اگر بڑھ گئی تو لوگ ان پر اور رحم کھانے لگیں گے۔ لیکن امیر کو کسی کے رحم کی ضرورت نہیں۔ اپنے چہرے کو شیو کر کے ان پر پوڈر لگایا جائیگا تاکہ بلیڈ کی دھار نے جلد کو جو سختی اور کرختگی بخش دی ہے وہ نرم پڑ جائے غسل کرنے کے بعد چہرے کو کریم کی مدد سے خوبصور کی کوشش کی جائیگی تاکہ تین سو روپے کا سوٹ شرمندہ نہ اس میں وقت تو صرف ہوگا۔ پینٹ پہنی۔ ٹائی لگائی، سٹڈ چپل کی بجائے، بوٹ اور جرابیں پہنیں، کوٹ پہنا اور ڈرا میں آئے۔ یہ بھی تو مصیبت ہے کہ سارا دن ایک کمرے سے کمرے میں گھومتے پھرو۔ غریب کو دیکھو وہیں کھائیگا وہیں اور وہیں سوئے گا۔ ڈرائنگ روم میں ناشتہ میز پر پڑا ہے چونکہ گھر کے باقی ممبر میز پر نہیں تھے اس لئے کھانا شروع نوکر بتا رہے ہیں۔ اباجان کا انتظار رہے، وہ آئے، تا وقت دیکھا تو کالج کا ایک گھنٹہ نکل چکا ہے، کار گیراج سے کار کا یہ فائدہ ہے کہ راستہ جلدی ختم ہو گیا۔ کالج پہنچے، گا تھا۔ ڈر کی وجہ سے لیکچر روم میں داخل نہیں ہوتے۔ یہ گھنٹہ ف جیری کی کینٹین میں پڑھا۔ کالج ختم ہوا تو کسی نہ کسی سوسائیٹی کا ج جس میں سیکرٹری کی حیثیت سے پچھلے جلسے کی روداد پڑھنی ہ سیکرٹری نہیں تو صدر ضرور ہوگا۔ ان کے فرائض سے عہدہ کیسے وقت چاہئے۔ شام کو گھر پہنچے شکر ہے کہ دوپہر کا کھانا میں پہنچ گیا تھا۔ نہیں تو اس وقت خواہ مخواہ اس پر وقت ہوتا۔ چائے پی۔ گھر کے باقی افراد باغ میں جمع ہیں۔ وہاں ٹینس ضرور کھیلنا پڑے گی۔ اس کے بغیر صحت ٹھیک نہیں میں آئے کچھ لکھنا پڑھنا شروع کیا کہ کوئی دوست پڑھنے آئیگا، اب باتیں ہو رہی ہیں سینما کی، فلموں کی اور ایکٹر کتابوں کے متعلق باتیں ہو نہیں سکتیں۔ کیونکہ زیادہ کتابیں کے لئے وقت نہیں ملتا۔ کیسی مصیبت ہے۔ امیر کے سب بن جاتے ہیں۔ یہ نہیں جانتے۔ انکے آنے سے وقت کتنا ض

گردست نہیں تو کوئی نہ کوئی رشتہ دار ضرور آجائیگا۔ پھر ان میں سے کوئی لڑکی اس کو تنگ کرنے کے لئے ضرور [illegible] گی۔ اور کتابی کردار کا روپ دھار کر کوئی نہ کوئی رومان پیدا کرنے کی کوشش کرے گی۔ دُور کا رشتہ دار بھی گھر میں بڑے فخر سے ایسے داخل ہوتا ہے جیسے وہ اسکا بہت قریبی رشتہ دار ہے۔ ان رشتہ داروں میں بہت قریب بھی ہونگے۔ جو محض ان کا قرب حاصل کرنے کیلئے آتے ہیں تاکہ وہ دو چار الف نون میں کھڑے ہو کر فخر سے یہ کہہ سکیں کہ فلاں شخص ہمارا رشتہ دار ہے۔ اور ان سے ملنا بھی ہے اور اوٹ پٹانگ باتیں کرتے جائیں گے۔ اخلاق کا دامن بھاتے آخر کب تک ان سے فضول باتیں کی جائیں، بد اخلاقی سے پیش آئے، غریب رشتہ داروں نے شور مچایا، امیر ہو کر دماغ خراب ہو گیا ہے۔ دولت بہت کم لوگوں کو صحیح الدماغ رکھتی ہے۔

وہ گئے تو معلوم ہوا آج سینما جانے کا پروگرام ہے اب فلم کون چھوڑے جبکہ اس میں ثریا اور کامنی کام کرتی ہوں۔ اگر سینما نہ بھی گئے تو کہیں نہ کہیں ڈنر ضرور ہوگا۔ سارے گھر کی دعوت ہے، انکار کیسے کیا جائے۔ کسی کے ہاں نہ سہی خود اپنے گھر دوسرے لوگ مدعو ہونگے میل جول اسے ہی تو کہتے ہیں۔ رات کے بارہ بجے فارغ ہونے اور اس بات کا افسوس رہا کہ ریڈیو سے بہت اچھے اچھے پروگرام ضائع ہو گئے ان کے لئے 'آہنگ' کے پرچہ پر دس پندرہ دن پہلے سرخ پنسل سے نشان لگائے تھے۔ اب اس وقت کون پڑھتے۔ رات کو دیر سے سوئے، صبح پھر وہی زندگی کا چکر، کوئی انصاف سے بتلائے کہ ان دلچسپیوں اور مصروفیتوں میں کیا پڑھا جا سکتا ہے کسی غریب کو انکی مدد دے دی جائے۔ اور دیکھ لیا جائے کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے۔

تائی کی گرہ ٹھیک نہ بیٹھی تھی۔ اسلئے رضا نے اتنی ساری باتیں سوچ ڈالیں۔ اب اس نے بی۔ اے کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ پھر کیا ہوا اگرچہ ہر مضمون کا امتحان علیحدہ علیحدہ دیا۔ گریجویٹ تو ہو گیا تھا۔ اس کا باپ کہتا تھا۔ ایک بار تم گریجویٹ ہو جاؤ پھر کسی کی پرواہ نہیں۔ پچھلے دنوں اخبار میں ایک نوکری کا اشتہار نکلا تھا اگر یہ جگہ حاصل ہو جائے تو پھر مزے ہی مزے ہیں۔ شروع میں ہی

چھ سو روپے تنخواہ — [illegible] ترقی — ایک بار پھنس جاؤ پھر چاہے کتنی ہی غلطیاں سرزد ہو جائیں کوئی اپنا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ باپ نے کہا۔ درخواست بھیج دو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ درخواست بھیج چکا تھا۔ چند دنوں تک انٹرویو ہونے والا تھا۔ رضا کو صرف انٹرویو [illegible] تھا۔ بورڈ کے سامنے کھڑے [illegible] سوالوں کا جواب دینا بڑا کٹھن تھا۔ جب کہ ان کا واحد مقصد امیدوار کو گھبراہٹ میں مبتلا کرنا ہوتا ہے۔ آج اسکا بھی بندوبست ہونے والا تھا۔

رضا کے والد نے اسکے کمرے سے اسے آواز دی۔ وہ ہیٹ لئے باہر نکلا۔ باپ بیٹے کار میں بیٹھے اور کار چل پڑی راستہ میں باپ نے کہا تم کچھ فکر نہ کرو بیٹا! میں چاہتا ہوں۔ بورڈ کے ممبروں سے تمہارا تعارف ہو جائے تاکہ تمہیں بعد میں دقت نہ ہو — اور پھر کچھ دیر سوچ کر کہنے لگے۔

'اور انھیں بھی دقت نہ ہو! بغیر دفتری کارروائی کے کام بھی تو نہیں ہو سکتا۔ آخر انہیں بھی تو اپنے حاکموں کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنا ہوتی ہے۔ لائق لڑکوں کو چھوڑ کر تمہارا انتخاب کرینگے اسکے لئے زمین تو تیار کرنا ہی پڑیگی۔

بیٹا باپ کی گہرائی تک پہنچ گیا اور چپ چاپ کار میں بیٹھا رہا کار ایک عالیشان دودھ کی طرح سفید بنگلہ کے سامنے رکی چوکیدار نے استقبال کیا اور ایک پرتکلف ڈرائنگ روم میں بٹھا کر خود صاحب خانہ کو بلانے چلا گیا۔ باپ اور بیٹا سگریٹ پینے لگے۔ انہی اوقات کے لئے سگریٹ ایک نعمت غیر مترقبہ بن جاتا ہے۔ انتظار کی گھڑیاں اسکی مدد سے سگریٹ کے دھوئیں کی طرح ہوا میں اڑ جاتی ہیں۔ اور وقت کا پتہ نہیں چلتا۔ صاحب خانہ تشریف لائے۔ بڑے تکلف سے ہاتھ ملایا رضا کے والد نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اپنا مافی الضمیر بیان کیا۔

'رضا نے امسال بی۔ اے کر لیا ہے جس آسامی کیلئے اس نے درخواست دی ہے، معلوم ہوا ہے اس کے بورڈ کے تم ہیڈ ہو!'

'کونسی آسامی؟' کے جواب میں اسکے والد نے پوری تفصیل دی، اطمینان سے سنکر صاحبِ خانہ نے کہا۔ 'کوئی بات نہیں

[illegible]مولی کام ہے ، ا[illegible]اللہ ہو جائیگا !

[illegible]وہ نہ کیسے کر سکتے تھے ۔ آخر انہیں بھی تو رضا کے والد سے [illegible]دل [illegible] رہتا تھا ۔ لیکن تھوڑی دیر بعد کچھ سوچ کر بولے ۔

[illegible]سئلہ ایک [illegible] ہے !

" کیا " ؟ [illegible]کے والد نے فکر مندانہ لہجے میں پوچھا

" رضا پر مجھے یقین ہے [illegible]ڈ کے ممبر بعض اوقات کچھ سوال کر دیا کرتے ہیں جن سے امید وار [illegible] ہے !

رضا کے والد نے تیقن سے کہا " رضا نے بی ۔ اے کا امتحان [illegible] ڈویژن میں پاس کیا تو کیا بات ہے ، قسمت کی بات ہے ، [illegible]میں انشاء اللہ آپکی عزت رکھ لے گا ! "

بورڈ کے ہیڈ نے خوش ہو کر کہا ۔

" یہ تو ٹھیک ہے دو چار باتیں ان کو اور بتائے دیتا ہوں [illegible]یہ کہ کمرہ میں داخل ہوں تو ایسے جیسے ان کے دل پر بورڈ کا ڈر یا خوف نہیں ہے ۔ ڈٹ کر کرسی پر بیٹھ جائے اور یہ ظاہر [illegible]، کہ وہ انکے ہر سوال کا معقول جواب دینے کو تیار ہے ۔ سب سے پہلے [illegible] سوال کرونگا ۔ ان کے جوابات بھی ابھی بتائے دیتا ہوں ۔ بس وہ [illegible]لے ۔ پھر کسی قسم کا فکر نہیں ہاں یہ میں دوبارہ کہے دیتا ہوں کہ [illegible]رے ممبروں کا میں ذمہ دار نہیں " ۔

" اجی آپ کیا کہتے ہیں ۔ رضا اتنا کند ذہن نہیں کہ بورڈ کے [illegible]رں ممبروں کے سوالوں کا جواب بھی نہ دے سکے ۔ آپ [illegible]کر رہیئے ! "

اس کے بعد اس نے رضا کو وہ سب کچھ بتا دیا جو ہونیوالا تھا [illegible]ں اس نے رضا کو دعا دی ۔

" جاؤ تمہیں خدا کامیاب کرے " !

" آمین " باپ بیٹے نے کہا اور دونوں پیشگی شکریہ ادا کر کے چلے گئے کار نے اپنا سفر دوبارہ شروع کیا ۔ اب ان کے سامنے ایک [illegible] انہ تھا ۔ کار کو دوسری طرف مڑتے دیکھکر رضا نے پوچھا

" اب کہاں جا رہے ہیں ابا جان " ؟

" تم دیکھتے رہو " اس نے ڈائری نکالی ۔ اس میں کچھ پڑھا

اور خود بخود مسکرا دیا ۔ کار ایک اور بنگلہ کی پورچ میں کھڑی ہو گئی بنگلہ سرخ رنگ کا تھا ۔ اور اس کے مقابلہ میں اسکے چاروں طرف لگے ہوئے درخت اور سبزہ اپنے دامن میں عجیب دلکشی لئے کھڑا تھا ۔ صاحب خانہ نے ان کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا ۔ دو چار باتوں کے بعد آنیکا مقصد بیان کیا گیا ۔ اس نے کہا ۔

" میری طرف سے پوری کوشش ہوگی لیکن مجھے ہیڈ کی طرف سے فکر ہے اسکے علاوہ بورڈ کے دوسرے ممبر بھی ہونگے " ۔

" آپ اپنی طرف سے کوشش کیجئے ۔ کامیابی و ناکامی خدا کے اختیار میں ہے !

رضا کے والد نے خدا پر کامل یقین رکھتے ہوئے کہا اور ہاں آپ کو کچھ ہدایات دیتا ہوں تو ۔ ۔ ۔ ! "

" جی ہاں ، میری کوشش یہی ہوگی کہ بجائے بورڈ کے دوسرے ممبروں کے میں زیادہ سوال کروں ۔ سوال مشکل بھی ہونگے اور آسان بھی ۔ تاہم مجھے امید ہے کہ رضا صاحب ضرور کامیاب ہونگے انکی سہولت کے لئے میں سوالات کے جوابات بتائے دیتا ہوں " ۔

" جی ہاں ، جی ہاں ، یہی میں چاہتا ہوں " رضا کے والد نے خوش ہو کر کہا ۔

سوالات و جوابات بہ تفصیل بتائے گئے اور باپ اور بیٹا باہر آ گئے ۔ یہ بورڈ کا ایک ممبر تھا ۔

کار پھر چل پڑی ، شہر کی دوسری طرف ۔ یہ علاقہ شہر سے باہر ایک گنجان آباد علاقہ تھا ۔ یہاں پر متوسط طبقہ اور غریب لوگ زیادہ رہتے تھے ۔ سڑکیں اچھی نہ تھیں اور کار کو بار بار نشیب و فراز میں سے گزرتے ہوئے ایسے ہچکولے کھانے پڑتے تھے ۔ جیسے کسی شاعر کے خیالات ۔ کار ایک متوسط درجے کے مکان پر جا کر رکی ۔ اس گھر کے افراد بیوک کا جدید ترین نمونہ اپنے گھر کے سامنے دیکھکر حیران رہ گئے ۔ صاحب خانہ بوکھلائے ہوئے باہر نکلے ۔ مہمانوں کا استقبال کیا ۔ انہیں اس کمرے میں بٹھایا جس کو ڈرائنگ روم کی طرح استعمال کیا کرتے تھے ۔ لیکن جس میں عمر عیار کی زنبیل کی طرح کئی کمرے تھے ، کمرے کے ایک طرف پلنگ پڑا تھا جس پر لیٹنے کی سفید چادر

مختلف رنگوں کے دھاگے سے کاڑھی ہوئی بچھی ہوئی تھی۔ پلنگ کے قریب ایک میز اور چار کرسیاں رکھی تھیں۔ دونوں کو کرسی پر بٹھا کر وہ پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اور بڑی عزت و تکریم سے پوچھنے لگا کہ ان کے آنے کا مقصد کیا ہے۔ رضا کے والد نے بڑے خوبصورت الفاظ میں رضا کے متعلق سب کچھ بتایا۔ اور امید ظاہر کی کہ وہ صاحب انکی استدعا کو رد نہ کرینگے۔ اور رضا کے مستقبل کو برباد نہ ہونے دینگے۔ بورڈ کے اس ممبر کو بھلا کیا عذر ہو سکتا تھا۔ اسکی آنکھیں تو کہہ رہی تھیں ؎

وہ گھر میں ہمارے خدا کی قدرت

ہاں البتہ بورڈ کے دوسرے ممبروں سے وہ بھی خائف تھے اصل میں بورڈ میں ان کی زیادہ چلتی نہ تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اپنی لیاقت کی وجہ سے وہ اس رتبے تک پہنچ گیا تھا۔ لیکن اسکی مالی حالت ابھی تک ویسی ہی تھی۔ کیا کرتا گھر کے ممبر بھی تو بہت تھے، باپ بیکار تھا بہن بیوہ تھی، ماں باپ اور بہن بھائیوں کا بوجھ اس کے کندھے پر تو تھا۔ خود اپنی اولاد بھی کافی تھی۔ اللہ میاں اس معاملہ میں غریب کے حال پر بہت مہربان ہوتا ہے۔ خیر وہ جوں توں کر کے زندگی بسر کر رہا تھا۔ اونچے طبقے کی سوسائٹی میں جانے کے لئے ایک دو اچھے سوٹ بنوا رکھے تھے جو وقت ضرورت "رسید" کی طرح کام آتے۔

اس نے کہا۔

"رضا صاحب کی کامیابی کے لئے میں پوری کوشش کرونگا لیکن ان کو بھی چاہیئے کہ وہ تھوڑا بہت پڑھ لیں تاکہ دوسرے ممبروں پر رعب پڑ سکے"

"آپکا کہنا سر آنکھوں پر! رضا اپنا مطالعہ جاری رکھے گا"

صاحب خانہ کو اس معاونت سے انکار ہی کیا ہو سکتا تھا رضا کے والد سے واقفیت رکھکر وہ اپنے بہت سے کام نکلوا سکتا تھا

کار چل پڑی ایک بار پھر۔ سڑک نوردی کے بعد بورڈ کے تیسرے ممبر بڑے تپاک سے ملے اور یہاں تک کہہ دیا۔

"میں تو خود سوچ رہا تھا کہ اس آسامی کے متعلق آپ کو لکھوں۔ لیکن مصروفیات راستہ میں حائل رہیں —— اجی آپ فکر نہ کریں بس مٹھائی تیار رکھیں۔ سمجھ لیجئے کہ کام بنگیا ہے یہ کہیئے کب دعوت کر رہے ہیں آپ؟"

رضا کے والد ہنس پڑے۔

"دعوت کا کیا ہے۔ جس دن آپ کہیئے!"

رضا کے والد کو کیا گھاٹا پڑ سکتا تھا۔ پیر پائنٹ ڈنر ہوتے تھے کبھی ان کو بھی بلا لیا۔ تو فرق کونسا پڑ جائیگا۔ "لیکن یہ تو بتایئے کہ آپ ان سے پوچھیں گے کیا؟"

"یہ میں ابھی بتائے دیتا ہوں۔ رضا اسے رٹ لے۔ ہاں بورڈ کے دوسرے ممبر اگر سوال ذرا سخت کر بیٹھیں۔ تو اس کا ذمہ دار رضا ہے ہمارا ہیڈ ذرا سخت قسم کا آدمی ہے کسی کی سفارش قبول نہیں کرتا!"

"اجی آپ میرے رضا کو اتنا نالائق سمجھ بیٹھے ہیں۔ کالج کے زمانہ میں یہ کئی سوسائیٹیوں کا سکرٹری رہ چکا ہے۔ یہ کیا انکے سوالات کے جوابات نہیں دے سکتا۔ میں نے تو سنا تھا کہ آپ بڑے سخت ہیں۔"

"جی ہاں میں انتخاب کے معاملے میں تو بہت سخت ہوں لیکن آپکی اور بات ہے!"

انٹرویو کے متعلق مزید گفتگو کرنے کے بعد کار باپ بیٹے کو اپنی گود میں لئے پھر چلنے لگی۔ منزل کا فاصلہ اب کم رہ گیا تھا۔ رضا کے والد کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ شہر کے باہر بورڈ کے چوتھے ممبر کا گھر تھا۔ رضا کے والد کی اس سے واقفیت تو تھی لیکن وہ ذرا اصول کا پابند تھا اور اس سے اپنا مقصد حل کروانا کچھ آسان نہ تھا تاہم کوشش لازمی تھی۔ گھر آ گیا۔ کار رک گئی۔ کوٹھی کا پھاٹک کھولتے ہوئے چوکیدار کے ماتھے پر دو چار شکن نمودار ہوئے واقعی وہاں شکنیں تھیں یا رضا کے والد نے ایسا سمجھا۔ یہ خدا بہتر جانتا ہے لیکن انہیں ایسا محسوس ضرور ہوا کہ وہ ان کی آمد سے زیادہ خوش نہیں ہے۔

صاحب کو اطلاع دی گئی۔ انہیں ایک پر تکلف کمرے میں بٹھایا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد ایک میز پر تازہ پرچہ اور ایک دو رسالے رکھ گیا۔ رضا کے والد نے سمجھ لیا کہ انتظار کرنا ہی پڑے گا

ئی بات نہیں اس وقت گدھے کو بھی باپ بنانا کچھ دور نہ تھا۔
یہ تو اچھا بھلا انسان ہے۔ لیکن اگر یہ گدھا ہوتا۔ تو زیادہ اچھا
اسکو مرعوب تو کیا جا سکتا تھا۔ یہ شخص جو اصولوں کی ہر وقت
لگائے رکھتا ہے۔ اس سے بات چیت کرنا بڑا مشکل ہے اس نے
زندگی کے ارد گرد چند خطوط کھینچ رکھے ہیں جن کو پار کرنا اپنی توہین
سمجھتا ہے ــــ خیر ــــ اور تھوڑی دیر بعد عدم کے اس
شعر نے رضا کے والد کو ڈھارس بندھا دی۔

جہاں اصول پہ مبنی ہوں کاروبار، وہاں
ہر ایک بات خلافِ اصول ہوتی ہے

م سے معلوم ہوا کہ صاحب خانہ کچھ لکھ رہے ہیں۔
مسلسل ایک گھنٹہ کے انتظار کے بعد وہ تشریف لائے
ے پر ایک خاص قسم کی مسکراہٹ، جو ان موقعوں کے لئے مخصوص
۔ جب وہ ان لوگوں سے جن سے انہیں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں
ہوتی علیک سلیک ہوئی۔ انہوں نے آتے ہی رضا کے والد
آنے کا سبب پوچھا یہی ان کا اصول تھا۔ رضا کے والد نے
جھجک کر کہا۔

رضا نے اس آسامی کے لئے درخواست دی ہے جس کا
اشتہار چند دن ہوئے اخبار میں نکلا تھا۔ وہی جس کے انتخاب
میں آپ کا بھی ہاتھ ہے ....

"تو آپ سفارش لیکر آئے ہیں۔ آپ جانتے تو ہیں کہ میں
رشوت وسفارش دونوں سے نفرت کرتا ہوں؟"

یہ آپسے کس نے کہا کہ میں آپ کو رشوت دینے یا سفارش
کرنے آیا ہوں۔ میرا مسلک یہ کبھی نہیں رہا۔ میں ذاتی قابلیت
کا قائل ہوں میرا رضا اتنا غبی نہیں ہے۔ میں تو اس کو آپکے پاس اس
لئے لایا ہوں کہ اسکی جھجک اور بے جا خوف دور ہو جائے اور وہ
آپکے سوالوں کا اچھی طرح جواب دے سکے۔

"خیر خیر" صاحب خانہ نے کہا
چند منٹ کے توقف کے بعد رضا کے والد نے پوچھا۔
"کیوں صاحب۔ وہاں پر عام طور پر کس قسم کے سوالات
کئے جاتے ہیں؟"

بورڈ کا یہ ممبر اصول کا پابند تھا۔ لیکن رضا کے والد کی ہوشیاری
کو زیادہ نہ سمجھ سکتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد عام قسم کی باتیں شروع
ہوگئیں۔ صاحب اصول نے بورڈ میٹنگ کے بہت سے دلچسپ
واقعات سنائے اس نے چند ایسے لڑکوں کی بھی تعریف کی جو
بہت ہوشیار تھے اور چند لڑکوں کے احمقانہ جواب پر خود ہی قہقہے
بھی لگائے اور اس طرح سے بہت سے وہ سوالات بھی بتا دیئے
جو اس سال کئے جانے والے تھے۔

رضا کے والد تھے۔ اور وہ انکی باتوں سے بہت کچھ حاصل کر چکے
تھے اور جانتے تھے کہ بورڈ کے ممبر اکثر ہر سال ایک ہی قسم کے سوالات
کیا کرتے ہیں۔

دونوں گھر پہنچے۔ ماں خوش ہوئیں کہ رضا نے انٹرویو سے پہلے
بورڈ کے ممبروں سے ملاقات کر لی۔ اور جب رضا اپنے کمرے میں پہنچا،
تو پلنگ پر لیٹتے ہوئے اسے مسعود یاد آگیا۔

مسعود رضا کا دوست تھا۔ لیکن اس نے پڑھائی میں اس سے
وفا نہ کی اور دو سال میں بی۔ اے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ اسی طرح
کی ایک نوکری اس سال بھی نکلی تھی۔ مسعود متوسط طبقے سے تعلق رکھتا
تھا۔ لیکن پھر بھی اسے امید تھی کہ کسی نہ کسی طرح سے واقفیت نکال کر
وہ ضرور سفارش لگوا سکے گا۔ چند دن بعد اس نے رضا کو بتایا کہ بورڈ
کے ہیڈ نے اسے یقین دلا دیا ہے کہ وہ اس کے لئے پوری کوشش
کریگا۔ مسعود خوش تھا۔ اور جب انٹرویو ہوا تو اس نے بورڈ کے ممبروں
کے سوالات کا جواب بڑی عقلمندی سے دیا۔ وہ اکثر رضا سے کہتا
"تم جب افسر بن جاؤ گے پھر تمہیں کبھی ضرورت ہوئی تو میرے
دفتر میں چلے آنا۔ میں تمہارا کام کر دیا کرونگا۔"

رضا ہنس پڑتا اور مسعود بھی۔ بورڈ کی میٹنگ ہوئی۔ مسعود نے
نتیجہ سنا تو ہکا بکا رہ گیا اسکی بجائے ایک اور لڑکا چنا گیا۔ ایسا کیوں
ہوا یہ وہ نہیں جانتا تھا۔ لیکن چند دن بعد وہ رضا سے کہہ رہا تھا۔
"ان بڑے لوگوں کے وعدے بھی جھوٹے ہوتے ہیں۔ ان میں اتنی
اخلاقی جرأت نہیں کہ وہ صاف انکار کر سکیں۔ وہ دوسرے شخص

یںد کے پھندے میں پھنسا کر اسے موت کی نیند سلا دیتے ہیں۔"
رضا نے سوچا کہ کہیں اس کے ساتھ ہی ایسا نہ ہو۔ اور وہ کچھ
ں سا ہو گیا۔
بورڈ بیٹھا۔ رضا طلب کیا گیا۔ سب سے پہلے ہیڈ نے سوال
۔ رضا نے بڑی تمکنت سے رٹا ہوا جواب سنا دیا۔ بورڈ کے
رے ممبر حیران رہ گئے۔ ہر ممبر نے علیحدہ علیحدہ سوال کئے اور
بغیر کسی جھجک کے دانشمندانہ جواب دیتا رہا تھا۔ ایسے جواب
ر ڈ کے ممبروں کی آنکھیں کھل گئیں۔ انٹرویو ختم ہو گیا اور
باہر نکل آیا۔ بورڈ کا ہر ممبر اپنی اپنی جگہ پر سوچ رہا تھا کہ رضا
ت خود اتنا لائق ہے کہ اس نے سب ممبروں کے بڑے اچھے جواب
ئے۔ اگر اسکا باپ سفارش نہ بھی لیکر آتا تو وہ یقیناً منتخب کر لیا
۔ شکر ہے کہ انکی عزت رہ گئی۔ ہیڈ اور ممبروں نے کتنے سخت
ال کئے۔ لیکن وہ ذرا نہ گھبرایا۔ اب ان کی کارروائی پر کوئی
ت نہ کر سکیگا اور رضا کے والد کی خوشنودی بھی حاصل ہو جائیگی

اور ہیڈ سوچ رہا تھا۔ رضا تو واقعی قابل ہے اور اس نے بلند
آواز سے کہا۔
"میرے خیال میں سب سے زیادہ لائق طالبعلم رضا ہے
ہم اسکے علاوہ کسی اور کو منتخب کریں تو یہ اس پر ظلم ہو گا۔"
سب ممبروں نے ہاں میں ہاں ملائی۔ سب سے آخر
میں اصول کے پابند ممبر نے پُر زور تائید کی۔ وہ رضا کی قابلیت سے
مرعوب ہو گیا تھا۔ میٹنگ ختم ہوئی۔ رضا چنا گیا۔ وہ افسر بن جائے
گا۔ بورڈ کے ممبر اس کی داستانیں لوگوں میں فخر سے بیان کیا کریں
گے۔ لیکن وہ کیا جانیں کہ رضا کے والد نے ہر ممبر سے ملاقات کے
خط میں ہر ایک سے یہی کہا تھا کہ
"دیکھئے صاحب! یہ معاملہ آپکے اور میرے درمیان رہے
اگر کسی تیسرے شخص کو پتہ چل گیا تو خواہ مخواہ آپ پر حرف آئیگا۔"
اور ہر ممبر نے جواب میں کہا تھا۔
"آپ بے فکر رہیے!"

"نظام"

سلورین پلز ——— مقویات کا سرتاج

مردوں کے لئے ایک اچھا متوازن اور آج کل کا
آزمودہ جنرل ٹانک ہے۔ جو بھوک کو بڑھاتا
ہے۔ جسم میں تازہ سرخ خون پیدا کرتا ہے،
طاقت بڑھاتا ہے، سلورین پلز پر آپ بھروسہ
کر سکتے ہیں۔

۴۰ گولی ——— چار روپے بارہ آنے
۸۰ گولی ——— نو روپے

تیار کردہ :-
حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی نمبر۱

عبدالکریم ثمر

حقائق

(اس سال انجمن حمایتِ اسلام لاہور کا سالانہ اجلاس
زیرِ صدارت جناب ممتاز دولتانہ وزیرِ اعظم پنجاب
منعقد ہوا تھا۔ یہ نظم اس اجتماع میں خود شاعر کی زبانی سنی گئی
جسے ہم ہفت روزہ حمایتِ اسلام کے شکریہ کیساتھ پیش کر رہے ہیں!)

حکمراں اس ذاتِ یکتا کے سوا کوئی نہیں
صاحبِ عظمت وہی ہے دوسرا کوئی نہیں

صبحِ پاکستاں پیامِ خیریت لائی تو ہے
اس خزاں دیدہ گلستاں میں بہار آئی تو ہے

نقشۂ عالم پہ لیکن غور جب کرتا ہوں میں
آنے والے وقت کے طوفان سے ڈرتا ہوں میں

ارضِ پاکستان کا آغاز کہتا ہے کچھ اور
دورِ ماضی کا مگر غماز کہتا ہے کچھ اور

میرے دل کی دھڑکنوں میں سن ذرا آوازِ قوم
سوچ اے نبّاضِ ملت، دیکھ اے ممتازِ قوم

منتظر تھی انجمن اس ربطِ باہم کے لئے
دل بچھے جاتے ہیں تیرے خیر مقدم کیلئے

شعر کے نغمے ہیں لیکن رنگ بھرنا ہے مجھے
معذرت کرتے ہوئے کچھ عرض کرنا ہے مجھے

اے وزیرِ اعظمِ پنجاب اے عالی وقار
تیرے ہاتھوں میں ہے ملت کی زمامِ اقتدار

زندگی کے واسطے فتحِ مبیں ہے انقلاب
صرف آقاؤں کی تبدیلی نہیں ہے انقلاب

یہ نظامِ کہنہ اب بھی قابلِ ترمیم ہے
منصب و عہدہ میں قائم ناروا تقسیم ہے

آہ یہ جمہور یہ صبحِ وطن کی آبرو!
ارضِ پاکستان میں جو شاہ رگ کا ہیں لہو

یہ زبوں حالی بیاں اپنی جو کر سکتے نہیں
جینا کیسا، مرنا بھی چاہیں تو مر سکتے نہیں

انکی ناداری ہے آبِ رنگ زرداروں میں ہے
بھوک سے انکی توانائی زمینداروں میں ہے

ہیں عوام الناس بیکاری کے صدموں سے نڈھال
کارزارِ زیست میں ہیں یہ بطورِ یرغمال؟

ملک ہے آزاد لیکن یہ ہیں پابندِ خراج
آدمی کے خون سے بھی کچھ گراں تر ہے اناج

ان کو آزادی ملی ہے اور وہ بھی نام کی
آج تک بدلی نہیں تقدیر خاص و عام کی

ان کی نظروں سے نمایاں احترامِ دین ہے
آج تک ان پر مسلط کفر کا آئین ہے

آج بھی الجھا ہوا ہے مسئلہ کشمیر کا
بالیقیں محتاج ہے یہ ناخنِ شمشیر کا

آج بھی تو آدمی کا آدمی محکوم ہے
آج بھی دینِ محمد ہر جگہ مظلوم ہے

چند لوگوں کو میسر مال و زر جاہ و جلال
اور لاکھوں کے لئے ہے سانس بھی لینا محال

رشوتوں کی گرم بازاری ہے ٹیکسوں کا ہجوم
راہبر جب رہزنی کا زیبِ تن کر لیں لباس
ترجمانی کر رہا ہوں میں یہ لحنِ دل میں
جادۂ حق کے مسافر تو نے سوچا ہے کبھی
انقلاب وقت نے بدلا نہیں اب تک مزاج
قصر و ایوان تعیش صولتِ تاج و نگیں
ایسی صورت میں سبیل ستمکاری کے لئے

بند ہیں زنداں میں اربابِ نظر اہلِ علوم
کام ایسے وقت میں آتے ہیں فکر و قیاس
یہ مری تنقید تعمیری ہے تخریبی نہیں!
مختلف راہوں میں سیدھی راہ ہے اب کونسی
دورِ حاضر میں فقط اسلام ہے تیرا علاج
اور سب کچھ ہے یہاں اسلام ہی باقی نہیں
بے نواؤں مفلسوں کی پاسداری کے لئے

پھر ضرورت قائد اعظمؒ کی پاکستان میں ہے
آج بھی نا استواری زیست کے پیماں میں ہے

اب مجھے کچھ عرض بھی کرنا ہے جانِ قوم سے
اس نئی تہذیب میں ایسی بھی ہیں کچھ بیگمات
دشمنِ مہر و وفا ہے ان کے چہرے کی نمود
اس طرف تھا حسنِ یوسفؑ کیلئے لازم حجاب
دیکھ لے خاتونِ مشرق سُن لے فخرِ ایشیا
دیکھ لغزش میں نہ آ جائے کہیں پائے ثبات
ہے نظامِ زیست میں کردار تیرا دلنشیں
اے وقارِ زندگی "اپوا" نہیں تیرا مقام
تیرے شایاں ہی نہیں یہ انجمن آرائیاں
تیرے مرہونِ نظر ہیں خانہ داری کے امور
پاکبازی تیرا زیور شرم ہے تیرا لباس
مدتوں ناقص رہا ہے تیرا تعلیمی نظام
تیری عظمت کی قسم کھاتے ہیں جبریلِ امیں
تُو بقائے نسلِ انسانی کی ذمہ دار ہے
آ بتاؤں زیست کا تجھکو اصولِ دلنشیں!
تو سپاہی بن نہیں سکتی کبھی اے نورِ عین
سامنے تیرے ہیں کچھ اسلام کے زریں اصول
کیوں تیری نسوانیت میں آ گیا بیگانہ پن

مادران و خواہران و دخترانِ قوم سے
غارتِ شرم و حیا ہے جن کا اسلوبِ حیات
صنفِ نازک کی کھلی توہین ہے ان کا وجود
دورِ حاضر کی زلیخا پھر رہی ہے بے نقاب
لے سراپا سادگی اے پیکرِ صبر و رضا!
مغربی تہذیب میں ہرگز نہیں تیری نجات
عزت کا شانہ ہے تُو رونقِ محفل نہیں!
تیری جمعیت کی خاطر اور ہے کچھ اہتمام
ننگ ہیں تیرے لئے تہذیب کی رعنائیاں
تیری تربیت سے زندہ قوم کا ذوقِ شعور
خدمتِ بے لوث تیری زندگانی کی اساس
تیری خاطر ہے مگر موجود ربانی کلام!
تُو ہوس کے ہاتھ کا رنگیں کھلونا تو نہیں
دستِ قدرت کا حسیں اور آخری شہکار ہے
جنتی ہے عورت سپاہی خود مگر بنتی نہیں
ہاں مگر آغوش میں کر سکتی ہے پیدا حسینؑ
کافی ہے تیرے لئے اک اسوۂ بنتِ رسولؐ
تیرے شایاں ہی نہیں ہے یہ ترا مردانہ پن

جذبۂ غیرت ترا بیدار ہونا چاہیئے
تجھ کو اپنے قافلہ سالار ہونا چاہیئے

(بشکریہ حمایت اہل

صفدر حدید ●

نوٹ بُک

اسے ڈائری لکھنے کا شوق تھا۔ بہت دنوں سے وہ اپنی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو ایک موٹی سی نوٹ بک پر تحریر کر رہا تھا اور اب چار پانچ سو صفحات کی نوٹ بک آدھی سے زیادہ بھر چکی تھی اس کا شوق عادت بن گیا تھا۔ اس کی زندگی کا چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا واقعہ ان صفحات میں محفوظ تھا اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ان محفوظ اوراق میں اچھائی کم ہے اور برائی زیادہ نیکی کا پلڑا ہلکا اور معصیت کا بھاری ہے۔ اسی لئے وہ نوٹ بک کو انتہائی حفاظت سے مقفل الماری میں کبھی تکیہ کے غلاف میں اور کبھی بیکار اور پرانی کتابوں کے پیچھے چھپا چھپا کر رکھتا۔ وہ جانتا تھا کہ دنیا کی نگاہ میں اس کی حیثیت اس سے بالکل مختلف ہے جو نوٹ بک میں نظر آتی ہے۔ لوگ اسے دیانتدار امین، دین کا پابند اور اللہ کا خاص بندہ سمجھتے تھے اور وہ کسی طرح بھی اس بات پر آمادہ نہ تھا اس کے بارے میں عوام کی یہ رائے تبدیل ہو جائے مگر یہ خوف بھی اسے نوٹ بک لکھنے سے روک نہ سکا۔ وہ نوٹ بک لکھتا رہا اور چھپ چھپا کر رکھتا رہا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ ایک روز اچانک ہی یہ نوٹ بک اس کے شریر دوستوں کے ہاتھ لگ جائے گی اور آج جبکہ یہ حادثہ رونما ہو چکا تھا وہ بے بسی سے اپنے دوستوں کے فاتحانہ قہقہے سنتا ہوا دھم سے کرسی پر گر پڑا اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ ہونٹ کپکپا رہے تھے، دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اور آج پہلی بار وہ اپنے شوق پر جھنجھلا رہا تھا۔ آخر اس کی ضرورت ہی کیا تھی؟ کونسی آفت ٹوٹ پڑتی اگر میں ڈائری نہ لکھا کرتا؟ اس کے بغیر زندگی میں کیا کمی رہ جاتی! اور پھر یہ دوست بڑے دوست بنتے ہیں۔ بدتمیز جنہیں یہ تک معلوم نہیں کہ کسی کی نجی تحریر کو پڑھنا اخلاقی جرم ہے۔ بداخلاق۔ بیہودہ "اس کے دل میں دوستوں کے خلاف شدید نفرت پیدا ہو گئی۔ مگر اس کے دوست آج بڑے ہی بیباک اور شریر بن گئے تھے۔ وہ پوری دلچسپی کے ساتھ نوٹ بک کا مطالعہ کر رہے تھے مطالعہ کے دوران چھینا جھپٹی بھی ہو رہی تھی ایک صاحب کو نہ جانے کیا خیال آیا کہ وہ نوٹ بک لے کر کرسی پر کھڑے ہو گئے اور باآواز بلند کہا۔ معززین و حاضرین جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے محترم دوست جن کی خود نوشت سوانح حیات کا مسودہ میرے ہاتھ میں ہے اپنی ذات سے بڑے ہی نیک متقی اور پرہیزگار ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ ادیب بھی ہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ان کی مخصوص طرز تحریر میں ان کی دینی زندگی کے حالات و واقعات رفاہ عام کے لئے کتنے اہم ہونگے۔ مگر گستاخی معاف آپ کی اخلاقی کمزوری حد درجہ قابل اعتراض ہے۔ آپ میں سے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ پہلے وہی مستفید ہو اور دوسرے منہ تکتے رہیں۔ ڈر یہ تھا کہ یہ کشمکش کہیں سیفٹی یا سیکورٹی ایکٹ کو مداخلت کا موقع نہ دیدے۔ اس لئے میری تجویز یہ ہے کہ اسے بلند آواز سے پڑھ کر سنایا جائے۔ چونکہ یہ کافی طویل ہے اس لئے فی الحال خاص خاص واقعات ہی سنائے جائیں گے۔ ہاں تو حضرات غور سے سنیئے۔ میری سنو یہ گوش حقیقت ہوش ہے۔

۱۳ جنوری ۱۹۴۸ء۔ آج مغرب کی نماز پڑھنے کو قطعی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر مجبوری یہ تھی کہ سید صاحب ساتھ تھے ان کے سامنے نماز قضا کرتا تو تمام عزت کرکری ہو جاتی۔ پڑھنا پڑی۔ مگر پھر بھی کاہلی نے وضو کرنے کی اجازت نہ دی اور یوں ہی کھڑا ہو گیا۔ سوچا کہ جب وضو ہی نہیں کیا ہے تو پھر جو کچھ نماز میں پڑھا جاتا ہے اس کے پڑھنے سے کیا فائدہ۔ چنانچہ میں نے اپنے آئندہ افسانے کا پلاٹ سوچنا شروع کر دیا۔ تیسری رکعت میں اچانک خیال آیا کہ اس طرح دنیا کو تو دھوکہ دیا جا سکتا ہے مگر جس کے حضور میں یہ جعلی نماز پیش کر رہا ہوں کیا وہ فریب کھا جائے گا۔ دل ہی دل میں خود پر لعنت بھیجی اور طے کر لیا کہ عشا کی نماز میں توبہ کر کے معافی مانگ لیں گے۔ سلام کے بعد سے

دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو خودداری نے تقاضہ کیا کہ جب تو نے خدا کے حکم کو یوں ٹھکرایا ہے تو اب تجھے اس سے کچھ مانگنے کا بھی کیا حق ہے چنانچہ میں نے دعا نہیں مانگی .... افسوس کہ مشاعرے کی شرکت نے عشا کی نماز ہی قضا کرادی۔ چلو کل فجر کی نماز میں توبہ کرلیں گے۔

۱۹ فروری ۴۸ء

مسعود صاحب کہہ رہے تھے کہ روشنی ٹاکیز میں "دو جیلانی" چل رہا ہے۔ میں ویسے بھی دلیپ کمار کا مداح ہوں۔ ارادہ کرلیا کہ ملان ضرور دیکھا جائیگا۔ مگر مصیبت یہی کہ چونکہ چہرہ پر داڑھی ہے اس لئے سینما ہال میں لوگ خواہ مخواہ اچک اچک کر دیکھنے لگتے ہیں۔ یہ اندیشہ بھی لگا ہے کہ کہیں کوئی صورت آشنا یا کوئی دوست یا چچا والد صاحب ہی مل جائیں۔ ان سب کو یہ معلوم ہے کہ میں سینما نہیں دیکھتا اسی وجہ سے اکثر آخری شو دیکھتا ہوں۔ رات کے تک گھر سے غائب رہنے پر طرح طرح کے بہانے بنانا پڑتے ہیں۔ آج بھی ایک میلاد شریف میں شرکت کا بہانہ کرنا پڑا۔ فلم اچھا تھا موقع ملا تو پھر دیکھوں گا۔ سینما سے لوٹتے وقت ایک حلوائی کی دوکان نظر پڑ گئی اور میں نے اسے ... آنے کی مٹھائیاں خرید لیں تاکہ میلاد شریف میں شریک ہونے کا ثبوت دیا جاسکے کچھ نہ سہی تو صبح ناشتہ ہی کے کام آجائیں گی۔

۱۱ اپریل ۴۸ء

میرا کمرہ گھر بھر سے کچھ الگ سا ہے اور صرف اسی خصوصیت کی وجہ سے مجھے یہ کمرہ بہت پسند ہے۔ کمرے میں پوری آزادی سے جو چاہتا ہوں کرتا ہوں۔ گھر میں سب پر رعب ڈال رکھا ہے کہ صبح چار بجے سے اٹھ کر نماز اور تلاوت قرآن میں مشغول ہوجاتا ہوں مگر حالت یہ ہے کہ آٹھ بج جاتے ہیں اور بستر سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ فجر کی نماز ہمیشہ قضا ہی پڑتی ہے کبھی کبھی ضمیر ملامت کرتا ہے مگر کیا کیا جائے جب رات کو ایک یا دو بجے سویا جائے گا تو پھر فجر کی نماز کے وقت کس طرح اٹھا جاسکتا ہے اور میرا پروگرام ایسا ہے کہ روزانہ رات کے ایک دو ضرور بج جاتے ہیں۔ آج بھی حسب معمول سو رہا تھا۔ ایک دور کے عزیز جو میرے بڑے مداح تھے سیدھے کمرے میں چلے آئے۔ معلوم نہیں مجھے سوتا دیکھ کر انھوں نے کیا سمجھا ہوگا جب انھوں نے مجھے جگاکر اس خلاف دستور سونے کی وجہ پوچھی تو میں نے بڑی معصومیت سے کہدیا کہ طبیعت خراب ہے اور رات بھر آنکھ نہ لگنے کی وجہ سے سر میں درد ہو رہا ہے۔ اس لئے نماز پڑھ کر ذرا لیٹ گیا تھا شاید انھیں یقین آگیا۔ مگر فوراً ہی بولے "کچھ دن ہوئے حمید صاحب ملے تھے وہ کہہ رہے تھے کہ انھوں نے آپ کو سینما میں دیکھا تھا کیا آپ سینما دیکھتے ہیں؟" میں گھبرا گیا مگر اپنے آپ کو سنبھال کر چہرے سے حیرانی اور تعجب کا حتی الامکان اظہار کرتے ہوئے جواب دیا انھیں دھوکا ہوا ہوگا میں سینما کب دیکھتا ہوں۔ اور وہ مطمئن ہوکر چلے گئے۔ مگر ان کے جانے کے بعد دیر تک ضمیر ملامت کرتا رہا اور میں بستر پر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

۲۸ جولائی ۴۸ء

آج بے انتہا گرمی ہے اور اس پر طرہ یہ کہ روزہ تھا۔ آخر گھبرا کر نہانے چلا گیا غسلخانے میں ٹھنڈے پانی کو دیکھ کر پیاس بھڑک اٹھی۔ کافی دیر تک ضبط کیا۔ مگر پیاس بڑھتی گئی۔ دل نے کہ تھوڑا سا پانی پی لوں۔ کون دیکھ رہا ہے ضمیر نے جواب دیا کوئی دیکھے نہ دیکھے خدا تو دیکھ رہا ہے۔ دل نے پینترا بدلا وہ تو غفور الرحیم ہے ایک بار کا گناہ ضرور معاف کردیگا روز روز کون پیئے گا اور دوسرے لمحہ لوٹے کی ٹونٹی میرے منہ سے لگی ہوئی تھی۔ پانی پینے کو تو پی لیا مگر جب نہا کر باہر نکلا تو نہ معلوم آنکھیں کیوں جھکی جارہی تھیں۔ گھر میں سب ہی کا تو روزہ تھا جلدی سے اپنے کمرے میں آگیا دل یوں گھبرا رہا تھا جیسے سچ مچ کسی نے دیکھ لیا ہو۔ دل نے کہا روزہ توڑ کر شام کو سب کے ساتھ افطار کرتے ہوئے کیا اچھے لگوگے میں نے پوچھا تو پھر کیا کرنا چاہیئے۔ جواب ملا افطار کے وقت غائب ہوجانا۔ میں نے کہا کہاں جاسکتا ہوں۔ رمضان کا مہینہ ہے۔ سب کے روزے ہو رہے ہیں۔ جواب ملا تو پھر آج پہلا شو دیکھ ڈالو۔ فلم بھی اچھا لگا ہوا ہے۔

اور جب رات کو دس بجے گھر میں قدم رکھا تو والد صاحب نے پوچھا کہاں گئے تھے جی دھک سے ہوگیا کہ شاید کسی نے دیکھ لیا اور گھر میں آکر بھانڈا پھوڑ دیا۔ ڈرتے ڈرتے جواب دیا کہ ایک دوست نے افطار کی دعوت دی تھی وہیں گیا تھا اب تراویح پڑھ کر آرہا ہوں والد صاحب خاموش ہوگئے اور میں دل ہی دل میں خود کو برا بھلا کہتا کمرے میں آگیا۔ ضمیر نے کہا کہ اس طرح کب تک جھوٹ بول کر اپنے آپ کو بچاتے رہوگے اگر کسی دن سچ مچ بھانڈا پھوٹ گیا تو کیا کروگے۔ میں نے کہا بات تو

ہے مگر کیا کروں ہر مرتبہ ارادہ کرتا ہوں کہ سب برے کام چھوڑ دونگا
ن شیطان مردود ہر مرتبہ پھسلا لیتا ہے یہی سب کچھ سوچتا
بستر پر لیٹ گیا اور پھر نہ معلوم کب نیند آگئی۔

شریر دوست بڑے مزے سے یہ روداد سن رہے تھے
بان میں کبھی قہقہے، کبھی طرح طرح کے ریمارک، تبصرہ
یہ فقرے بھی چست کئے جارہے تھے اور وہ کرسی پر سر جھکائے
بے حس و حرکت بیٹھا تھا گویا اس میں جان ہی نہ تھی۔ اس کا دماغ
شدید کش مکش میں مبتلا تھا۔ زندگی کے دونوں متضاد رخ
کی نگاہوں کے سامنے ایک دوسرے کے خلاف دلائل اور
ن کے نشتروں سے نبرد آزما تھے۔ زخم لگائے جارہے تھے
یں اٹھ رہی تھیں اور یہ روحانی اذیت اس کا دماغ ماؤف کئے
رہی تھی۔ کبھی وہ جھنجھلا اٹھتا۔ ہاں میں منافق ہوں، مکار ہوں
نے دنیا کو دھوکا دیا ہے۔ اسلام کو بدنام کیا ہے۔ کرنے دنیا جو
ہے۔ میں نے بے وضو نمازیں پڑھی ہیں۔ جعلی روزے رکھے ہیں
دیکھے ہیں۔ جھوٹ بولے ہیں۔ سب کچھ کیا ہے۔ پھر کسی کو کیا
پنی مرضی کا مالک ہوں جو چاہوں کروں گا۔ دنیا میں مجھ سے زیادہ
ن مجھ سے زیادہ مکار اور فریبی موجود ہیں وہ بھی جو نہ صرف خود شراب
ہیں بلکہ شراب کو حلال ثابت کرنے کے لئے قرآن کی آیتوں میں
علم کھلا تحریف بھی کرتے ہیں جو دو چار دس پانچ کو نہیں پوری قوم
یب دیتے ہیں۔ جھوٹ بولتے ہیں، سود کھاتے ہیں۔ رشوت
ہیں اسلام کا نام لے کر کفر کی پوجا کرتے ہیں۔ انھیں کیوں
ہیں کہا جاتا مجھ ہی پر طعن و طنز کے تیر کیوں چلائے
ا۔ یہ سب کچھ سوچ کر اس دل کھول اٹھا اس کا دل چاہا کہ
خ کر اپنی منافقت کا اعلان کر دے۔ مگر یوں جیسے کسی
ست قوت نے اس کا گلا دبا لیا ہو۔ الفاظ اس کے گلے
ٹک گئے اور کوئی آواز اس نے سنی "نادان نہ بن آج ایک
ن نوٹ بک کے ظاہر ہونے پر جس میں تیری زندگی کے بہت
اور مختصر واقعات درج ہیں تو دنیا کے طعن اور نفرت انگیز
ں کا مقابلہ کرسکتا ہے تو انھیں نظر انداز بھی کرسکتا ہے

مگر اس نوٹ بک کے علاوہ ایک نوٹ بک اور بھی ہے جس میں پوری
شرح و بسط کے ساتھ تیرے اعمال تحریر ہو رہے ہیں۔ وہ
بھی جن کا تجھے شعور نہیں۔ یہ نوٹ بک آج تیرے گنتی کے چند
آدمیوں کے سامنے کھلی ہے اور وہ نوٹ بک کل حساب
کے دن ساری دنیا۔ گزرے ہوئے اور آنے والے تمام
انسانوں کے سامنے کھلے گی۔ پھر اس دن اپنی ندامت اور
شرمندگی کو جہالت اور ضد کے کون سے پردوں میں چھپا
سکے گا۔

یہ تصور اس کے دماغ کے لئے بڑا وزنی ثابت ہوا
ضمیر کی اس چوٹ سے وہ تلملا اٹھا۔ اس جان لیوا
خیال نے اس کی تمام سوچوں کو ضبط کرایا۔ بار بار سر کو جھٹک
کر اس نے اس خیال سے پیچھا چھڑانا چاہا۔ مگر ہر مرتبہ یہ تصور
اور زیادہ روشن ہو کر اس کی نگاہوں کے سامنے ناچنے
لگتا اس کی قوت برداشت ختم ہونے لگی۔ بڑے زور سے
اس نے اپنے سر کو بھاری میز سے ٹکرادیا۔ پاگلوں جیسے
انداز سے اٹھا اور دیوانوں کی طرح کمرے سے
باہر نکل گیا۔

دوست حیران و ششدر دیکھتے رہ گئے انھیں
کیا معلوم تھا کہ ان کے ایک مذاق نے اسے کتنی تلخ حقیقت
سے دوچار کردیا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس منافق کے دماغ
میں کتنا شدید طوفان برپا تھا۔

اور اس طوفان نے اس کا سکون چھین لیا۔ وہ
راتوں کو چونک چونک کر اٹھتا۔ دن بھر کمرے میں بند اپنے بے
ترتیب بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہتا۔ یہ کھٹک چھین، وہ ان
سے لڑتے لڑتے تھک گیا تھا۔ اور ایک رات جب ضمیر کے
مقابلے میں شکست قبول کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا
پچھلے کئی دنوں سے جو لاوا اس کے دماغ میں کھول رہا تھا
پھوٹ پڑا۔ بہتے ہوئے آنسوں کے ساتھ وہ سجدے میں
گر گیا۔ وہ اپنے آقا کے سامنے تھا اور اس سے کتنا قریب

ج سے پہلے وہ کتنے ہی سجدے کر چکا تھا کتنی بار اس دربار
یں حاضری دی تھی مگر قربت کا یہ احساس اس کے لئے بالکل
نوکھا تھا اور اس انوکھے پن سے متاثر ہو کر اس نے اپنے
نسوؤں سے وہ کچھ کہہ دیا جو پہلے اس کی زبان —— بھی نہ
کہہ سکی تھی۔

اور تب اچانک ہی اسے محسوس ہوا جیسے کوئی بہت بھاری
بوجھ اس کے سر سے اتر گیا ہو مسرت کے سوتے پھوٹ رہے تھے
طبیعت میں لطیف بشاشت، دل و دماغ پر بڑی ہی مسحور کن محویت
اور روح کسی انجانے سرور میں کھوئی ہوئی آج اس نے پہلی
بار وہ لذت پائی جس سے اب تک وہ ناآشنا تھا اسے پہلی
مرتبہ وہ سکون ملا جو کبھی نہ ملا تھا۔

پورے ماحول پر ایک عجیب پر اسرار سکوت
چھایا ہوا تھا۔ کمرے کے روشندان سے چودھویں
کا چاند اپنی ضیا بار کرنیں نچھاور کر رہا تھا۔

سامنے کی دیوار پر لگا ہوا ایک طغرا ان نورانی
شعاعوں سے جھلملا اٹھا۔ بے شک خدا ہدایت طلب کرنے
والوں کو ہدایت دیتا ہے۔

(بشکریہ سوداگر)

معدہ کی خرابیوں کو نظر انداز نہ کیجئے —— کہیں

معدہ کی خرابیاں آپ کو نظر انداز نہ کر دیں

ہاضمی!

ایک بہترین سفوفِ معدہ ہے!

HAZMEE
HAZIQ'S
STOMACH POWDER
FOR
Indigestion and all
other troubles
caused by
STOMACH DISORDERS
HAZIQ
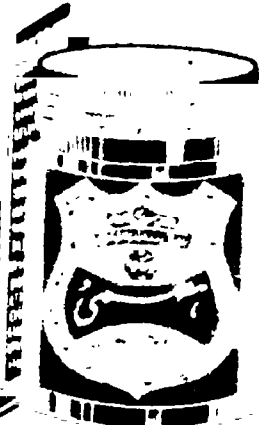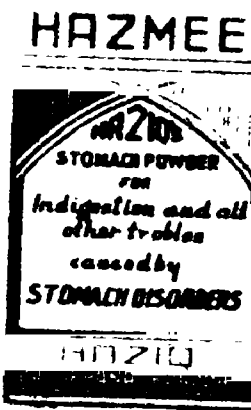
جو فعلِ ہضم کو فطری طور پر کام کرنے میں مدد دیتا ہے
اور معدہ کو ہر خرابی سے محفوظ رکھتا ہے،
حفظ ما تقدم علاج سے بہتر ہے، اس لئے "ہاضمی"
استعمال کیجئے۔ تاکہ آپ کا معدہ ہر خرابی سے
محفوظ رہے۔ قیمت فی شیشی۔ ایک روپیہ چار آنے

ملنے کا پتہ

حاذق دواخانہ، بندر روڈ
کراچی نمبر (۱)

طالب حجازی ●

غزل

کیا بتاؤں ہم نشیں کیا وہ حریمِ ناز ہے
کیا عبودیت میں پنہاں کیفِ سوز و ساز ہے

کون کہتا ہے حدیثِ دل ابھی تک راز ہے
اپنا چہرہ وارداتِ شوق کا غمّاز ہے!

مصلحت بینی سے طبعِ شعلہ خو واقف نہیں
بے خطر ہر معرکہ میں عاشق سرباز ہے

طائرِ تخئیل کی جولانیاں ! اللہ رے!
فرش سے تا عرش اسکی وسعتِ پرواز ہے

ڈالیوں پر جھومتے ہیں خوش نوایانِ چمن
اور چمن کا پتّہ پتّہ زمزمہ پرداز ہے

آمدِ فصلِ بہاری کس کا لائی ہے پیام؟
جس کو دیکھو خندہ زن اور گوش برآواز ہے

اس کی شانِ کبریائی اور مرا ذوقِ سجود
میں سراپائے نیاز اور وہ سراپا ناز ہے

سیکھئے ہم سے رہِ تسلیم و الفت کا چلن
یار کی مرضی ہماری زیست کا انداز ہے

آرہا ہے وقت جب گائے گا ہر اک خوش نوا
میں قفس میں ہوں گلستاں میں مری آواز ہے

انتہائے شوق کے نہ پوچھ مجھ سے مرحلے
ربطِ حسنِ یار کا طالب ابھی آغاز ہے

ثر نیازی •

دین کے یہ سرپرست

دین کی خاطر جو دنیا بھر سے لڑ جاتے رہے
خانقہ سے کفر کے فتوے وہی پاتے رہے

تم نے پانے میں بھی کچھ پایا نہ کھونے کے سوا
ہم مگر اہلِ ہوس ! کھونے میں بھی پاتے رہے

دوش پر اغراض کے دیں کا جنازہ اٹھ گیا !
آپ لیکن مسندوں سے وعظ فرماتے رہے

مہرِ تقویٰ ثبت تھی جن کے ہر اک ارشاد پر !
وقت کی رَو میں وہ اہلِ دیں بھی بہہ جاتے رہے

زیست کے سارے مسائل کفر سُلجھا یا گیا !
تم ادھر " آمین " پر لوگوں کو اُلجھاتے رہے

شیطنت نے بڑھ کے ایوانوں پہ قبضہ کر لیا
اور تم لے دے کے اک تعویذ کر پاتے رہے

" جلوتوں " میں ذبح کر ڈالا گیا اسلام کو !
" خلوتوں " میں پیرجی آرام فرماتے رہے

جوں تک رینگی نہ ان کے آہنی اجسام پر !
داعیانِ دینِ حق آتے رہے جاتے رہے

دین کے ان سرپرستوں کا یہ شیوہ واہ واہ !
جس کا کچھ کھاتے رہے ، بس اسکے گن گاتے رہے

آثم میرزا

سسکیاں!

دادا :۔ ساٹھ سالہ بوڑھا مہاجر ——— شوکت :۔ دس سالہ پوتا جسکی ایک ٹانگ کٹی ہوئی ہے

شہناز :۔ پندرہ سالہ پوتی

(بوڑھا چولہے کے قریب اکڑوں بیٹھا میلی ہنڈیا کو گھور رہا ہے۔ اسکے قریب بوسیدہ ٹاٹ پر اوندھا لیٹا ہوا شوکت سسکیاں بھر رہا ہے چولہے پر رکھے ہوئے چراغ کی پھیکی روشنی میں بوڑھے کے چہرے پر پھیلا ہوا اضطراب اور خوف کی ملی جلی لکیریں صاف نظر آرہی ہیں — شوکت کی سسکیاں بلند ہو جاتی ہیں۔ بوڑھا گردن گھما کر نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دلتے ہوئے اس کی طرف دیکھتا ہے۔ اور بایاں ہاتھ اس کے سر پر آہستہ آہستہ پھیرنے لگتا ہے) ———

دادا :۔ ننھے ذرا صبر کرو، ابھی تمہاری باجی کھانا لیکر آجائیگی اچھے بچے یوں نہیں رویا کرتے۔

شوکت :۔ (کروٹ بدل کر) دادا۔ میرے پیٹ میں کوئی آنتوں کو زور سے بھینچ رہا ہے۔ تم بھی آج روٹی نہیں لائے۔ نہ جانے باجی کب آئے گی۔

دادا :۔ شہناز کو میں نے جلدی آنے کی تاکید کی تھی۔ وہ اب آتی ہی ہوگی۔ کار پہ گئی ہے۔ وہ لوگ اسے کار پر ہی چھوڑ جائیں گے (بوڑھے کے جسم میں سنسناہٹ کی لہر دوڑ جاتی ہے اور آنکھیں بند کرکے گھٹنوں پر سر رکھ دیتا ہے)

شوکت :۔ دادا وہ لوگ کون ہیں۔ پہلے تو تم نے انکا ذکر نہیں کیا تھا۔ بہت بڑے آدمی ہونگے۔ تب ہی تو ان کے پاس کار ہے

دادا :۔ لمبی آہ بھر کر خاموش رہتا ہے

شوکت :۔ دادا۔ وہ ہمارا گھر اور گھوڑا گاڑی نہ جانے کس حال میں ہوگی ——— تم نے تو کہا تھا اسکے عوض یہاں پہ ہمیں کوٹھی اور کار مل جائے گی۔ لیکن۔ ابھی تک ایسا کیوں نہیں ہوا ———؟ ابا جان بھی نہیں آئے۔ وہ کہاں ہیں؟ تم انہیں بلا کیوں نہیں لیتے، اور نہ جانے باجی کہاں چلی گئی ہے۔ تم بولتے کیوں نہیں؟

دادا :۔ (روندھے ہوئے لہجہ میں) ننھے تم ایسی باتیں کرکے میرے دل میں زلزلے پھیلا دیتے ہو خاموشی سے لیٹے رہو ابھی تمہاری باجی آجائیگی۔

(شوکت کی سسکیاں بلند ہو جاتی ہیں!)

دادا :۔ (دھیمے لہجہ میں) آج تمہیں کیا ہوگیا ہے تم بہت اچھے لڑکے تھے۔ اور ——— مجھے بھی تو ——— کچھ ہوگیا ہے ——— شہناز ابھی تک نہیں لوٹی۔ اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ انہوں نے تو کہا تھا وہ اسے ایک گھنٹہ کے اندر ہی بھیج دیں گے اور اب تو ایک گھنٹہ سے زیادہ وقت ہوگیا ہے۔ نہ جانے وہ اس وقت کس حال میں ہے ——— اُف خداوند ——— میری توبہ! ———

(دادا گھٹنوں پر سے سر اٹھا کر دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیتا ہے)

شوکت :۔ (اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے) دادا۔ تم رونے لگے ہو۔ آخر کیوں؟ پہلے تو وہ آدمی کبھی باجی کو لینے نہ آئے۔ تم نے تو کہا تھا۔ ہمارا یہاں کوئی ہمدرد نہیں، یہ دھرتی جس پہ شادمانیوں کو جنم دینے کی خاطر ننھے انسانوں کے خون کی ندیاں بہہ گئی تھیں، اب ہمارے بوجھ کو برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ بڑے لوگ جن کو اونچی مسندوں پہ بٹھانے کی خاطر ہم نے اپنے گھر لٹا دیئے تھے، انکی نظروں میں ہماری کوئی وقعت نہیں رہی اور.........

دادا :۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) ننھے تمہارے یہ سوا

مجھے ابدی نیند سلا دینگے۔ خدا کے لئے خاموش رہو۔ تمہاری باجی مزیدار کھانا لیکر ابھی آجائے گی۔ اگر زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرسکتے تو سوجاؤ شہناز کے آتے ہی میں تمہیں جگا دونگا۔

شوکت :۔ لیکن دادا نیند بھی تو نہیں آتی۔ مجھے یوں محسوس ہورہا ہے۔ جیسے باجی اب کبھی واپس نہ آئے گی۔ اباجان بھی تو ابھی تک واپس نہیں آئے، ان کو گئے ہوئے کئی مہینے گزر چکے ہیں ہر روز تم کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتے ہو۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ مجھے اباجان کے پاس چھوڑ آؤ۔

دادا :۔ (سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے) ننھے۔ تمہارے اباجان بہت دور گئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے سندیسہ بھیجا ہے کہ وہ جلد آجائیں گے۔ یہ آدمی بھی شہناز کو ان کے پاس لے گئے ہیں۔ انہیں کے پاس سے آئے ہیں تمہارے اباجان وہاں بڑے مزے میں ہیں۔ ان کے آنے پر ہماری سب مصیبتیں ختم ہوجائیں گی۔ اب تم سو جاؤ۔

شوکت :۔ (مچلتے ہوئے) میں اباجان کے پاس جاؤنگا۔ تم ان آدمیوں کا ٹھکانہ جانتے ہوگے۔ مجھے بھی ان کے پاس لے چلو۔ وہ ضرور مجھے اباجان کے پاس پہنچا دینگے۔ ابھی۔۔۔ ابھی۔

دادا :۔ (خون بھری نظروں سے دیکھ کر)۔۔۔ تم۔ تم بھی اباجان کے پاس جانا چاہتے ہو! نہیں۔ تم نہیں جا سکتے۔ وہ آدمی تمہیں نہیں لیجائیں گے لیکن ننھے تم سوئے کیوں نہیں جاتے۔ آج کیوں تم اتنی باتیں کر رہے ہو۔ آج۔ مجھے تمہاری سوالوں سے خوف محسوس ہورہا ہے۔ میرا دل کیوں بیٹھا جارہا ہے۔ میرے سینے میں کانچ کے تیز ٹکڑے کیوں اچھل رہے ہیں۔ میں نے ایسا کیوں کیا؟ آخر کیوں؟

شوکت :۔ (گھبرا کر) دادا یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ کیا کیا ہے تم نے۔۔۔ تمہارا دل کیوں بیٹھا جا رہا ہے۔ تمہارے سینے میں......

دادا : (چونک کر) آں۔ ہاں۔ کیا کہا مجھے تو کچھ نہیں ہوا۔ میں اچھا بھلا ہوں۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ جرم! کیا یہ جرم ہے کیا شہناز کو نہیں بھیجا جانا چاہئے تھا اور یہ بھوک سے کمھلائے ہوئے چہرے کیا۔۔۔ سسک سسک کر مٹ جانے کیلئے ہی بنے تھے اندھیرا بڑھتا جارہا ہے۔ اور شہناز ابھی تک نہیں آئی۔ میں نے اسے کیوں بھیجا تھا۔ وہ کیا خیال کرتی ہوگی........

شوکت : (دادا کا بازو ہلاکر) دادا یہ تم کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ باجی کو وہ لوگ کہاں لے گئے ہیں؟ بھوک سے میری آنتیں سلگ رہی ہیں۔ وہ آدمی کب باجی کو لیکر آئیں گے؟

دادا :۔ (حواس باختہ ہوکر) دن بھر مارا مارا پھرنے سے میرے ذہن پر بھوک کے بپھرے ہوئے سانپوں کی پھنکار پھیل گئی تھی تھکے ہوئے پاؤں، میرے بڑھاپے کی جد و جہد کو ناامیدی کے گھورانند میں پھینک چکے تھے، میرے دل کی دھڑکنیں مستقبل کے دلکش بہلاؤ کو نذر آتش کرچکی تھیں۔ اور اس وقت، اچانک وہ آدمی مل گئے دیکھنے میں کیسے شریف نظر آتے تھے۔ جیسے انہوں نے کبھی کوئی گناہ ہی نہ کیا ہو۔۔۔ اور اب۔۔۔ نہ جانے شہناز پر کیا گزر رہی ہوگی۔ ابھی تک وہ اسے واپس چھوڑنے نہیں آئے۔ انہوں نے تو ایک گھنٹہ کا وعدہ کیا تھا۔۔۔ اور میں نے نہ جانے کیوں سر جھکا لیا تھا۔ جیسے جو کچھ انہوں نے مطالبہ کیا تھا۔ وہ جائز تھا۔ لیکن آگ اور خون کے طوفان میں بھی درندوں نے یہی مطالبہ کیا تھا۔ اس وقت کیوں میری رگیں غصے سے تن گئی تھیں۔۔۔ میرے مستقبل کے حسین نغموں کو کیوں زخمی کردیا۔ ماحول کی رگ رگ سے آتشی جذبات سے گندا مواد کیوں بہنے لگا ہے میری تڑپتی ہوئی مسکراہٹیں۔ ابھی تک کیوں نہیں مجھے واپس ملیں۔ حیوانی اندھیروں کا بھیانک چکر کیوں گھومے جارہا ہے۔۔۔

۔۔۔ دروازہ کے اندر قدم رکھتے ہوئے شہناز گر پڑتی ہے۔۔۔

۔۔۔ (دادا۔ چونک کر)۔۔۔ آں۔۔۔ کون ہے؟ (پہچان کر) شہناز۔۔۔ بیٹی تم آگئیں۔۔۔

(بوڑھا جلدی سے اٹھکر اس کے قریب جاتا ہے اور اس کے قریب بیٹھکر دیوانوں کی مانند گھورنے لگتا ہے)

شوکت :۔ (شہناز کی طرف گھسٹتے ہوئے)۔ باجی آخر کہاں تھیں؟

دادا :۔ (گھبرا کر) شہناز! کیا ہوگیا ہے تمہیں (اسکا سر اٹھا کر) تمہاری پیشانی سے تو خون بہہ رہا ہے۔ آنکھیں کھولو بیٹی

شہناز :۔ (آنکھیں نیم وا کرکے) میں۔۔۔ میں کہاں

وہ لوگ کہاں گئے مجھے بچاؤ۔ وہ سب مجھے مار ڈالیں گے۔

دادا:۔ (جھک کر) میں تمہارا دادا ہوں۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ یہ تمہارا بھائی شوکت ہے (ہتھیلی سے خون صاف کرتا ہے)

شہناز:۔ (کراہتے ہوئے) دادا تم نے تو کہا تھا وہ لوگ بہت اچھے ہیں۔ مجھے اچھے کپڑے اور کھانا دینگے......

دادا:۔ (جلدی سے) ہاں بیٹی وہ بہت اچھے آدمی ہیں تمہارے ابا کے پاس سے آئے ہیں!

شہناز:۔ یہ جھوٹ ہے دادا تم نہیں جانتے۔ وہ درندے ہیں۔ ان میں کوئی بھی اچھائی نہیں —— وہ مجھے جان سے مار ڈالنا چاہتے تھے۔ تم نے مجھے ان کے ساتھ کیوں بھیجا تھا۔

دادا:۔ (گھبراہٹ سے) یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ دیکھنے میں بہت شریف نظر آتے تھے۔ انہوں نے تو کہا تھا۔

شوکت:۔ (بات کاٹ کر) کیا کہا تھا دادا؟

شہناز:۔ انہوں نے جو کچھ کہا تھا وہ جھوٹ تھا۔ اگر میں بھاگ نہ آتی تو —— (لمبا سانس لیتی ہے) ——

دادا:۔ کیا یہ دھوکا تھا —— میری بچی تیری پونجی کو لوٹنے کی سازش تھی۔ میری اونگھتی ہوئی امیدوں کو نذر آتش کرنے کی جسارت تھی۔

شوکت:۔ (آگے جھک کر) باجی۔ وہ لوگ تمہیں کہاں لے گئے تھے۔ انہوں نے کھانا کیوں نہیں دیا

شہناز:۔ دادا نے کہا تھا۔ وہ لوگ بہت نیک ہیں۔ ابا جان نے ان کے ہاتھ کپڑے اور مٹھائی بھیجی ہے۔ جا کر لے آؤ۔ وہ مجھے کار میں بٹھا کر اسٹیشن کی طرف لے گئے تھے۔ کار سے اتر کر میں ایک پیچھے ایک تنگ سی گلی میں چھپ گئی۔ اس وقت میرا دل زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے میں اب اس گلی سے باہر نہ نکل سکونگی۔ کاش یہ احساس یقین میں بدل جاتا —— اور میں درندوں کے حملہ سے بچ جاتی۔ آہ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ مجھے میں ابا جان کے آنے تک جینا چاہتی ہوں.........

دادا:۔ (تڑپ کر) شہناز بیٹی یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟

شوکت:۔ (سہمی ہوئی آواز میں) پھر کیا ہوا باجی؟

شہناز:۔ پھر وہ مجھے ایک مکان میں لے گئے۔ ایک سجے ہوئے کمرہ میں مجھے بٹھا کر وہ باہر نکل گئے۔ دروازہ کے پاس ان کی سرگوشیاں سنائی دیتی رہیں لیکن میں ان کا مطلب نہ سمجھ سکی۔ جب وہ اندر آئے تو ایک کے ہاتھ میں مٹھائی کا لفافہ تھا۔ دوسرے کے ہاتھ میں دو بوتلیں تھیں اور تیسرا گلاس پکڑے ہوئے تھا۔ وہ تینوں میرے پاس ہی پلنگ پر بیٹھ گئے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔ ایک نے بوتل کا کارک کھولا۔ اور تیز بھبکے سے میرے نتھنے جلنے لگے۔ میں نے ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔ دوسرے نے میرا ہاتھ ہٹا کر مجھے اپنی طرف کھینچا۔ تیسرا بولا۔ یہ خوشگوار انسان کو آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیتا ہے اور تم ناک چڑھا کر اس کی توہین کر رہی ہو۔ میں گھبرا گئی ان کی آنکھوں سے مجھے ڈر لگنے لگا تھا وہ تینوں مجھے بازوؤں میں جکڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ میں جب چیخنے لگی۔ تو وہ میرے منہ پر زبردستی ہاتھ رکھ دیتے میں نے بھاگنا چاہا۔ لیکن انکے سخت بازوؤں نے مجھے دبوچ لیا میرے کپڑے پھاڑ ڈالے اور زبردستی مجھے پلنگ پر لٹا دیا۔ انکی انسانیت مر چکی تھی۔ کمرہ میں ہر طرف درندگی ناچ رہی تھی۔ درد سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ اور —— وہ —— وہ ——

دادا:۔ (اسکے منہ پر ہاتھ رکھکر) آگے کچھ نہ کہو بیٹی: مجھے معاف کر دو —— یہ سب کچھ میری وجہ سے ہی ہوا۔ تم دونوں کی بھوک نے مجھے اندھا کر دیا تھا —— تمام دن شہر کی خاک چھاننے کے بعد (بھی) میں تمہارے لئے روٹی حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا میری آنکھوں پہ اندھیرے کے دبیز پردے چھا گئے تھے میرا جی چاہ رہا تھا کہ ان اونچے محلوں کو آگ لگا دوں۔ جہاں پر کتوں کے لئے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے لیکن غریب انسان کو سوکھا ٹکڑا نہیں مل سکتا۔ جہاں ... کو ... سے نجات دلانے کے لئے منصوبے باندھے ... لیکن ان پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں عصمت کے بدلے مسکراہٹیں مل سکتی ہیں لیکن آنسوؤں کے عوض کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ کسی ہوٹل سے روٹی چرا کر بھاگ جاؤں کہ اچانک وہ بھلے لوگ مجھے مل گئے —— اور —— نہ جانے اس وقت

کیا ہو گیا تھا۔ مجھے یہ احساس بھی نہ رہا تھا کہ اس بیوپار سے تو موت بہتر ہے ـــــ مجھے تمہاری بھوک نے پاگل بنا دیا تھا اور یہ خیال بھی نہ رہا تھا کہ ان لوگوں کا مطالبہ میرے بڑھاپے کو کچل دیگا ـــــ آہ کاش! میں اس مطالبہ کے بھیانک انجام کے متعلق سوچ سکتا ....

شہناز:۔ (ہچکیاں لے کر) دادا وہ ـــــ مجھے پکڑنے کے لئے ـــــ بھاگ رہے ہیں ـــــ مجھے بچاؤ ..... (آہستہ آہستہ اس کی آواز مدھم پڑ جاتی ہے) ــــ ـ ـ ـ ـ

شوکت:۔ (گھبرا کر) دادا، باجی کی آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے یہ کیسے دیکھ رہی ہے۔

دادا:۔ (خوفزدہ لہجہ میں) شہناز۔ تم بولتی کیوں نہیں! (نبض ٹٹول کر) آہ تم بھی مجھ سے۔ روٹھ گئیں ـــــ اپنے ابا کے پاس پہنچنے میں تم نے بہت جلدی کی ہے۔ میں ہمیشہ تمہیں حسین بہلاووں سے پرچاتا رہا ہوں۔ میری یہی کوشش ہوتی تھی کہ تم اپنے ابا جان کو بھول کر ہمیشہ ہنستی رہو۔ میں نے آج تک اس راز کو اپنے سینے میں چھپائے رکھا کہ تمہارا ابا اچھے کپڑے اور کھانا لینے نہیں گیا۔ بلکہ بھوک سے تنگ آکر اس نے خودکشی کر لی ہے۔ اسکے تخیلات کے رنگ محلوں میں بیکاری نے آگ لگا دی تھی۔ وہ تمہیں دکھی دیکھنا نہ چاہتا تھا ـــــ لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا اور اس نے زندگی سے فرار کا راستہ ڈھونڈ لیا۔ ـــــ اور ـــــ میں بھی تمہاری آنکھوں میں آنسوؤں کی تڑپ دیکھ کر بے چین ہو جایا کرتا تھا۔ بھوک نے میرے ذہن کو بھی ـــ تھا۔ میرے ضمیر کو بوجھل چٹان تلے دبا دیا تھا ـــــ میں نے اپنے ہاتھوں سے تمہارے لئے موت کا دروازہ کھول دیا۔ میں ہی تمہاری موت کا سبب بنا ہوں۔ مجھے معاف کر دو بیٹی ـــــ میں ہی تمہارے اس جہنم میں دھکیلنے کا سزاوار ہوں۔ (بوڑھا اپنی پیشانی شہناز کے سرد چہرے پر رکھ دیتا ہے)

شوکت:۔ دادا باجی مر گئی ہے! باجی کیوں مری ہے

دادا:۔ (سسکیاں بھر کر) باجی اپنے ابا جان کے پاس چلی گئی ہے۔ اب وہ کبھی پلٹ کر نہ آئیگی۔

شوکت:۔ (روتے ہوئے) دادا ـــــ میں بھی ابا جان کے پاس ـــ جاؤنگا ـــــ میں ـــ ـ ـ بھی ـــ ابا ـــ جان کے پاس ـ جاؤں ـ گا ـ!

(دونوں کی سسکیاں بلند ہو جاتی ہیں)

مفرّح فولادی

نیا تازہ اور سرخ خون پیدا کرتا ہے، وزن بڑھاتا اور ہڈیوں کو مضبوط کرتا ہے۔ قوت و طاقت بخشتا ہے۔ کھانا ہضم کر کے بھوک بڑھاتا ہے۔

خوراک:۔ کھانے کا ایک چمچہ روزانہ تین چار مرتبہ کھانے کے بعد استعمال کریں۔ بچوں کے لئے نصف خوراک

قیمت فی شیشی دو روپے آٹھ آنے (عہ؍)

تیار کردہ

حاذق دواخانہ، بندر روڈ۔ کراچی نمبر ۱

ماہر القادری •

ابن رشد وحدانی

یہ دفتر کلب ہے کو ہے اچھی خاصی محل سرائے ہے، دروازوں پر ریشمین پردے ہوا سے سرسرا رہے ہیں ...... بلکہ گنگنا رہے ہیں۔ بہت ہی قیمتی سردوں میں! ایرانی قالین کے بیل بوٹے تو دیکھئے جیسے سچ مچ پھول کھلے ہیں اور سبزہ لہک رہا ہے ——— اور میز کتنی شاندار ہے، تو بہ! یہ میز نہیں "ٹیبل" ——— کہیئے ٹیبل! میز تو ہم جیسے مفلسوں کے یہاں ہوتی ہے! اس ٹیبل کی درازوں میں زنگارنگ کاغذات رکھے ہیں ——— کسی نیازمند کا خط غلامی ——— کسی عہدیدار کا نوشتۂ قسمت ——— کسی بہت بڑی اسکیم کا خاکہ ——— کسی عہدیدار کی شکایتوں کی فائل ——— کسی کی ترقی کا پروانہ ——— اور دعوتوں کی یادداشت بھی لنچ، ڈنر اور ایٹ ہوم کی تاریخ وار تفصیل کہ کب جانا ہے اور کس کے یہاں جانا ہے! اور ہو! اس کمرے کا ردی دان کتنا خوبصورت ہے ——— ان بصورت ہے کوئی چیز! پیسہ میں بڑی طاقت ہے بھیا! خوبصورتی اور سلیقہ آپ ہی آپ کھنچا چلا آتا ہے۔ بے ڈھنگا پن تو مفلسوں کے ہاں ملتا ہے۔ بڑے آدمیوں کے گھروں سے لیکر دفتر تک خوبی ہی خوبی اور زیبائی ہی زیبائی نظر آتی ہے! اس ردی دان میں کاغذ کے پرزے بھی پڑے ہوئے ہیں ——— یہ "بھی" کا غیر ضروری استعمال کیسے منہ سے کچھ اچھا نہیں لگتا، ارے میاں! ردی دان کاغذ کے پرزوں کے لئے ہی بنایا جاتا ہے اس کا یہی مصرف ہے! مگر ہاں! اس ردی کے کاغذ کے پرزوں میں کوئی ایسا کاغذ بھی ہے جس کے حروف لکھنے والے کے خون میں بھیگے ہوئے ہیں ——— مگر بھائی! اول تو

> رموز مملکت خویش خسروان دانند

پھر سے ساری دنیا پریشان اور ایک مخلوق ہے کہ بدحال ہے، کس کس کے آنسو پونچھے جائیں اور کس کس کے زخم پر پھایا رکھا جائے ...... مگر

...... حضرت عمر فاروق تو ...... بس بس! خاموش! جو لفظ زبان سے نکل چکے ہیں ان کو بھی واپس کھینچنے کی کوشش کرو، یہ مقامِ ادب اور بارگاہِ ناز ہے! یہاں اس انداز پر سوچنا ہی بہت بڑی گستاخی ہے کیا زندگی سے تنگ آ گئے ہو ایسی باتیں کرکے بیٹھے بٹھائے شامت مول لینے کا ارادہ ہے! غبارے میں اتنی ہوا نہ بھرو کہ ٹوٹ جائے آنیوالے آتے اور جاتے رہے ..... مگر اس طرح کہ

> جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

اتنے میں ایک صاحب تشریف لائے، چپراسیوں نے دوڑ کر دفتر کے دروازہ کا پردہ اٹھایا جیسے ان کا انتظار کیا جا رہا تھا، ان کے اندر جاتے ہی کمرے کے دروازے بند کر دیئے گئے، اوپر کے روشندان اور پیچھے کی ایک کھڑکی البتہ ادھ کھلی رہی۔

ان کی باتیں ——— کراماً کاتبین را ہم خبر نیست! جنگ کی اسکیمیں بھی اس قدر رازداری کے ساتھ شاید نہ بنائی جاتی ہوں کی جائیں ———

مگر صاحب دیوار ہم گوش دارد! ایک چپراسی کو کسی ضرورت سے گھنٹی بجا کر اندر بلایا گیا اور اس نے سن لیا ....

——— "ابن رشد وحدانی ...." یہ نام بہت خوب رہے گا .... بس مولانا! کام شروع فرما ہی دیجئے! بہت بڑے معرکہ کو سر کرنا ہے۔

——— جی حضور! کل ہی سے! شاید ایک مضمون تو رات ہی میں تیار ہو جائے گا! چاہئیں ...... قلم کے گھوڑے اسی میدان میں دوڑائے ہیں جناب والا مطمئن رہیں۔

ابن رشد وحدانی صاحب کمرے سے شاداں و فرحاں نکلے جیسے منہ مانگی مراد لیکر آئے ہیں بلکہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی کر اور توقع سے کہیں زیادہ ان کو نوازا گیا ہے۔ نیچے آکر موٹر رکشا پر بیٹھے رکشا والے

نے پیر کو جنبش دی، اور ذرا سی دیر میں یہ جا وہ جا۔

ہوٹل میں پہنچ کر وحدانی صاحب نے شیروانی اتاری اور آرام کرسی پر دراز ہو گئے۔ چہرے کا رنگ متغیر سا ہونے لگا جیسے وہ کسی ذہنی کش مکش میں مبتلا ہیں، وہ آپ ہی آپ باتیں کرنے لگے۔ عینک کی کمانی کو بار بار انگلیوں میں پکڑنے اور لچکا دیتے۔

—— مگر یہ تو ضمیر فروشی ہے (اندر سے آواز آئی)

...... کیسی نادانوں کی سی باتیں کرتے ہو ضمیر کو تم نے مولی گاجر سمجھ رکھا ہے جس نے چاہا خرید لیا ضمیر اس طرح نہیں بکا کرتا (نفس نے کہا) مگر یہ دیانت کے تو خلاف ہے (ضمیر نے پکارا) اول تو یہی بات مشتبہ ہے کہ ایسا کرنا دیانت کے خلاف ہے بھی یا نہیں، پھر کھالی ایسا کرنے میں تھوڑی بہت بددیانتی بھی ہو گئی تو اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہے توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے، بس ایک شرک معاف نہیں ہو، باقی ہر گناہ معاف ہو جاتا ہے (نفس نے تابڑ توڑ جواب دیا) اور توبہ کرنے سے پہلے موت آ گئی .... (ضمیر فوراً بولا) وہمیوں کی سی باتیں نہ کرو ...... دو ہزار روپے ماہوار تھوڑے نہیں ہوتے .... آئی ہوئی لچھمی کو نہ ٹھکراؤ .... دو ہزار .... جس جگہ سو سو .... ایک سال کے ہوئے چوبیس ہزار .... اس کے علاوہ کچھ اور نوازشیں بھی ہوں گی ـ اور —— اتنے میں ہوٹل کا خانساماں چائے کی ٹرے لیکر آ گیا .... اور چائے دانی کی ٹکوزی اتار کر چمچے سے چائے ہلایا ہی جا رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔

.... حضور .... جی .... حضور

مسرت آمیز گھبراہٹ کے ساتھ) جی: ضرور حاضر ہوں گا، کھانے سے آدھ گھنٹہ قبل ہی آجاؤں گا .... بہت اچھا ...... جو حکم ....!

کام جاری ہو گیا —— ادھر مہینہ ہوا اور سو سو کے بیس ہرے ہرے پتے حاضر! اس پر سے کچھ اور نوازشیں بھی! چاندی ہی چاندی تھی اور کام کچھ نہیں، مہینہ میں دو چار مضامین "کسی" کی مخالفت میں لکھنے پڑتے تھے، ہاں یہ ضرور تھا کہ اس طرح ضمیر کی قربانی دینی پڑتی تھی ...... مگر ان داموں میں یہ سودا زیادہ مہنگا تو نہ تھا اس دنیا میں تو ..... روپیہ اور روپیہ پر لوگ ایمان بیچ دیتے ہیں .... اور پھر حجاج ابن یوسف، ابن علقمی، میر عالم، میر جعفر اور میر صادق مسلمان ہی تھے کوئی کافر نہ تھے سب ہی طرح کے لوگ مسلمانوں میں پیدا ہوتے رہے ہیں ....

شہنشاہ اکبر کی نبوت کی تصدیق مسلمانوں نے ہی کی تھی ...... مصطفیٰ کمال پاشا کے قتل کا بیڑا کسی "مسٹر ایڈورڈ" یا "مہاشہ نا نادین" نے نہیں "مصطفیٰ صغیر" ہی نے اٹھایا تھا .... اخوان المسلمون کے رہنما حسن البنا کو ایک کلمہ گو نوجوان ہی کی گولی نے خاک و خون میں تڑپایا تھا ——

بیچارے "ابن رشد وحدانی" کے ساتھ بھی بیوی ضرورتیں لگی ہوئی تھیں بیوی بچے تھے، عزیز و اقارب تھے اپنی ترقی اور خوش حالی کون نہیں چاہتا۔

دن گزرے، ہفتے اور مہینے گزرے، پورا ایک سال بیت گیا زمانہ بڑا گریز پا واقع ہوا ہے روپیہ اپنا کام کر رہا تھا۔ ابن رشد وحدانی کے مضامین اخبارات میں دھڑا دھڑ نکل رہے تھے اپنے نام سے بھی اور دوسرے فرضی ناموں سے بھی۔

ایک سال کے بعد اسی کارگاہ نظم و سیاست میں ابن رشد وحدانی صاحب کو جاتے ہوئے دیکھا گیا، وہی در و بام، وہی ماحول، وہی پردے وہی صوفے اور کرسیاں، البتہ داڑھی والے بوڑھے اردلی کی جگہ ایک لمبا تڑنگا آدمی آ گیا ہے، داڑھی ایک دم صفا چٹ ...... ہاں مگر مونچھیں عاشق کی شب جدائی کی طرح سیاہ بھی اور لانبی بھی؛ مونچھیں خم کھائی ہوئی نوکیں سیاہ رنگت، کبودی آنکھیں، چیچک کے داغ۔ یہ اردلی جب تن کر کھڑا ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کوئی جلاد کھڑا ہوا ہے ...... سرکار دربار کا رعب داب قائم رکھنے کے لئے ایسے ہی باوقار اور ہیبت ناک اردلیوں پیراسیوں اور دربانوں کی ضرورت ہے!

دفتر کے دروازے کا پردہ جب اس اردلی نے اٹھایا ہے تو وحدانی صاحب نے قدرے جھجکتے ہوئے قدم رکھا —— اور دونوں طرف رسمی آداب و سلام کے بعد گفتگو ہونے لگی ——

—— مولانا! آپ نے تو بیڑا اٹھایا تھا کہ ان "لوگوں" کی ساری جد و جہد خاک میں ملا کر رکھ دوں گا اور سال کے اندر ساری فضا بدل جائے گی، مگر وہ "تحریک" تو اور زور پکڑ رہی ہے، لوگ ادھر کھنچے چلے جا رہے ہیں۔

حضور! انسان کا کام کوشش کرنے کا ہے خاکسار نے اپنے کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی! عنوان بدل بدل کر کیسے معرکہ کے مضامین لکھے ہیں کیا کیا منطقی دلائل پیش کئے ہیں "سیکولر حکومت" کی تعریف ——— مذہبی حکومت کی برائی ——— اور یہ بھی کہ سیاست اور دین دو جدا جدا چیزیں ہیں ——— متقی اور دیندار لوگوں کو سیاست سے جو دنیاداری کا کام ہے، دور رہنا چاہیئے ...... پھر مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے مذہبی اختلافات کو کس کس نفسیاتی انداز سے اس کمترین نے اجاگر کیا ہے اور ان ناشدنی کمبختوں کے خلاف عوام کے دلوں میں کس کس ڈھنگ سے شبہات اور بدگمانیاں پیدا کی ہیں .... مگر.........

——— مگر....... لیکن........ ان معذرتوں اور اس قسم کی گریز سے کیا ہوتا ہے صاف اقرار کیجئے کہ آپ ناکام رہے، آپ کا ہر حربہ بیکار ثابت ہوا، جیت فریق مخالف ہی کی رہی. ہم سے تو لوگوں نے یہ کہا تھا کہ آپکے قلم میں وہ زور اور وہ طاقت ہے کہ تحریر و استدلال کے میدان میں آپکے مقابل کوئی ٹھیر نہیں سکتا ...."

——— حضور! سے وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

——— ارے! یہ آپنے کیا کہہ دیا ایں! اتنی مرعوبیت تو پھر آپ کیا کر سکیں گے.........

سرکار! بدحواسی میں یہ مصرعہ زبان سے نکل گیا....... میری عادت ہے کہ کبھی کبھار بے موقعہ شعر پڑھ دیا کرتا ہوں،

پورے ایک گھنٹہ تک اسی قسم کی گفتگو رہتی ہے۔ وحدانی صاحب معذرتوں پر معذرتیں پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔ مگر ادھر کا پارہ اتنا اونچا چڑھ گیا ہے کہ درجہ اعتدال تک اترنا مشکل ہو گیا ہے ——— آخری جملہ "آپکو ایک آخری موقعہ اور دیا جاتا ہے........ اور وحدانی صاحب اس جملہ کے ایک ایک لفظ کی کسک کو لئے ہوئے رخصت ہوتے ہیں، راستہ بھر یہی الفاظ کانوں میں گونجتے رہے........ ہوٹل میں جا کر پلنگ پر دراز ہو گئے. ان کے اعصاب تکان سی محسوس کر رہے تھے چہرہ کا رنگ اڑا اڑا سا تھا۔ اسی عالم میں نیند آگئی۔

وہ سوتے میں بڑبڑاتے جاتے تھے .... آپ کو ایک آخری موقع اور دیا جاتا ہے.......... آخری موقع" اور مکھیاں وحدانی کے ہونٹوں پر بیٹھ بیٹھ کر اڑ جاتی تھی........ آج انکی نیند ہائے تجے جواری کی سی نیند تھی!

(فاران)

حاذق نروائن پلز (حب خاص)

ایک جنرل ٹانک ہے جو عصبی اور دل و دماغ کی کمزوریوں کا مجرب علاج ہے یہ گولیاں دماغی کام کرنے والے حضرات یعنی وکیل بیرسٹر، پروفیسر اور طالب علم اصحاب کے واسطے آبحیات کا کام دیتی ہیں اور جسم انسانی کی جملہ عصبی کمزوریوں بحال کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں! دواخانہ ہذا کے خاص مجربات میں سے ہیں۔

خوراک ۱۰ یوم ۲۰ گولی دو روپے (عہ)

حاذق دواخانہ، بندر روڈ، کراچی نمبر ا

ت یزدانی

"چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر!"

بقدرِ ذوق نظر حسن کا نظارا کر
فریب سود و زیاں سے مگر کنارا کر

اگر خلیلؑ کا عزم صمیم ہے تجھ میں
تو شعلہ زار میں فردوس کا نظارا کر

خدا گواہ اسی میں ہے عشرتِ کونین
اٹھ اور زہرِ غمِ آرزو گوارا کر

گذر کے منزلِ ترکِ طلب سے اے غافل
جمالِ شاہدِ مقصود کا نظارا کر

حقیقتوں سے اگر ساز باز کرنا ہے
"سیاسیات" سے پہلو بچا، کنارا کر

عبث ہے اہل دول سے امید لطف و کرم
خود اپنے ذوق طلب کا مگر سہارا کر

اُٹھ اور پھونک دے اک آہ بے اثر سے جہاں
جو اشک آنکھ میں آئے اسے شرارا کر

جو گلستاں کو تجھے گلستاں بنانا ہے
چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر

بس اب تو دامنِ ہستی کو پھونک دے بجلی
نگاہِ قہر سے بجلی کو اک اشارا کر

تاج الدین احمد امنگری •

آخری تمنّا

منم و ہمیں تمنا کہ بہ وقت جاں سپردن
بہ رخ تو دیدہ باشم۔ تو درون دیدہ باشی

جمعہ کا دن ——— سہ پہر کا وقت ———

احد کی وادی!

حق و باطل کا معرکہ گرم ہے۔ سات سو اللہ کے بندے تیتے پر قریش کے حملے کی اطلاع پاکر کمال بے سروسامانی کے ساتھ میدان میں نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کی زنبیلوں میں کچھ سوکھی ہوئی کھجوروں اور ستو کی پوٹلیوں کے سوا اور کچھ نہیں، جسموں پر پیوند دار لباس ہیں، ہاتھوں میں ٹوٹی ہوئی تلواریں اور زنگ خوردہ نیزے ہیں۔

——— لیکن انھیں اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ جو جان تو انکی ہے نہیں اسے تو خدا نے خرید لیا ہے، اس لئے وہ مارے گئے تب بھی کامیاب، کہ امانت کو صاحب امانت تک پہنچا دینے سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے۔ اور جیتے بچ گئے تب بھی کامیاب کہ بچی ہوئی جان آئندہ دوسرے موقع پر اللہ کے دین کے کام آئے گی، یہی وہ جذبہ ہے جس نے انھیں کشاں کشاں نہیں، بلکہ شاداں و فرحاں عرصۂ رزم میں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔

دوسری طرف قوت کے پرستاروں کا ہجوم غفیر ہے۔ قریش کے آہن پوش جنگجو ہر طرح کے سامان جنگ سے آراستہ ہو کر آئے ہیں۔ بافراط زاد راہ ساتھ ہے طبل و دف ساتھ ہیں۔ دلبستگی کے لئے رقص و شراب کا انتظام ہے۔ آتش غیرت کو مشتعل کرنے کے لئے شعلہ نوا عورتیں ہمراہ ہیں جن کی زبانوں پر کشتگان بدر کے آتشیں مرثیے مچل رہے ہیں ———

انھیں یہ فکر مکہ سے کھینچ لائی ہے کہ تحریک اسلامی کے نوزائیدہ پودے کی اگر بروقت بیخ کنی نہ کردی تو دیکھتے دیکھتے وہ ایک تنومند درخت بن کر پورے عرب پر اپنی شاخیں پھیلا دے گا اور اس وق اس کا استیصال ایک خیال خام ہوگا۔

جنگ اپنی جوانی پر ہے کشتوں کے پشتے لگتے جا رہے ہیں۔ اسلحوں کی کھڑکھڑاہٹ، طبل جنگ کی صدائیں اور مجروحین [illegible] بکا سے احد کی وادی عرصۂ حشر کا سماں پیش کر رہی ہے۔

ام المومنین عائشہؓ کی کمر پر مشک ہے، اور ہاتھوں میں وہ دوڑ دوڑ کر زخمیوں کو پانی پلا رہی ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ ام مرہم پٹی کا سامان لئے ہوئے پھر رہی ہیں

اچانک ام المومنین دیکھتی ہیں۔ کچھ فاصلے پر ایک شخص زخ چور پڑا ہے نیم خاک و خون میں غلطیدہ ہے درد کی شدت سے مسلسل کراہ رہا ہے۔

ام المومنین اس کے سرہانے پہنچ گئیں۔ دیکھا چند لمحے مہمان ہے۔ آہستہ آہستہ سانس چل رہی ہے آواز بند ہو چکی پھر بھی وہ اپنی بے نور آنکھوں کے اشارے کچھ کہنا چاہتا ہے ام نے پانی کا پیالہ جو اس کے ہونٹوں سے لگا دیا اس نے گھونٹ کر کے پیالہ خالی کر دیا۔ پانی پینے سے اس میں قدرے جان جیسے بجھتا ہوا چراغ تیل کے چند قطرے پڑ جانے سے سنبھالا لے۔ ام المومنین نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کہہ رہا ہے، انھوں نے کان زخمی کے منہ سے قریب کر دیا وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا "اللہ کے رسول .... ان پر خدا کی رحمتیں ہوں ..... کہا ——— کاش آپ حضور تک یہ اطلاع پہنچا سکتیں ک غلام ——— زیاد دنیا سے جدا ہو رہا ہے ...."

ام المومنین نے سر اٹھا کر میدان کا جائزہ لیا۔ دیکھا رسو فاصلے پر کھڑے کافروں کی یلغار کا مقابلہ کر رہے ہیں رام المو

ہوئی حضور کے پاس پہنچیں ——— عرض کیا، "رسول اللہ، ابن زیاد کا آخری وقت ہے، آپ کو یاد کر رہے ہیں۔"

رحمت عالم سنتے ہی دوڑ پڑے، وہاں یا ب عاشق کے سرہانے پہنچے تو دیکھا آنکھیں بند ہو چکی ہیں۔ دھیرے دھیرے سانس چل رہی ہے جسم بھر پر زخم ہی زخم مسکرا رہے ہیں۔

حضور تڑپ گئے ——— "زیاد! ——— زیاد آنکھیں کھولو، دیکھو میں آگیا۔"

اور زیاد نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ نظریں محبوب کے رخ دلآرا پر پڑیں تو آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہو گئی۔ پلکوں کی اوٹ میں اشکوں کے موتی جھلکنے لگے، کون جانے یہ غم کے آنسو تھے یا مسرت کے، لیکن نہیں وہ یقیناً اشک مسرت تھے کیونکہ یہ زخمی اپنے چہرے پر مسکراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"زیاد! کوئی وصیت کرنی ہے؟" اللہ کے رسول نے سرہانے کھڑے ہو کر پوچھا۔ زیاد نے نفی میں سر ہلا دیا "اور کچھ کہنا چاہتے ہو ———؟" زیاد نے کچھ جواب نہ دیا۔ صرف ٹکٹکی باندھے حضور کو دیکھے رہے جیسے پیکر محبوب کو سراپا اپنی پیاسی نظروں میں جذب کر لینا چاہتے ہوں۔

"کوئی آخری تمنا ہے زیاد!"

"ہاں بس ایک تمنا۔" زیاد نے بڑی کوشش سے جسم کی ساری قوت مجتمع کی، ایک بار تڑپے، اور دوسرے ہی لمحے کا سر محبوب کے پائے اقدس پر پڑا تھا۔

ان کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے ——— لا إلٰہ إلا اللہ .... محمد رسول اللہ! .... رضیت باللہ ربا .... وبمحمد فداہ امی و نبیا .... وبالاسلام دینا!"

پھر ایک ہلکی سی ہچکی، اور مستقل سکوت

اور رحمت عالم کی چشم اقدس سے جیسے آبدار موتیوں کی لڑی ٹوٹ گئی ہو اور اس کے دانے قطار باندھ کر سرکنے اور فرش خاک میں غائب ہونے لگے

بمشکل زبان اطہر سے اتنا نکل سکا ——— یا ایتہا النفس المطمئنۃ! ارجعی الیٰ ربک راضیۃ مرضیۃ

ام المومنین کمرہ مبارک کے آبدیدہ نگاہوں سے یہ پراثر منظر دیکھ رہی تھیں اور دانتوں میں انگلی دبائے ہوئے سوچ رہی تھیں ——— کیسی عجیب تھی زیاد کی آخری تمنا! اور کس قدر قابل رشک ہے یہ موت!

بچہ نازِ رفتہ باشد ز جہاں نیاز مندے
کہ بوقت جاں سپردن بسرش رسیدہ باشی!

اِفاداتِ مسیح الملک

مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب مرحوم کا

مکمل دستور العلاج

سر سے پاؤں تک کثیر الوقوع بیماریوں کا بیان مع تشخیص اور علاج حکایات کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ قابل قدر اور مفید کتاب ہے۔ فی جلد تین روپے آٹھ آنے

حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی نمبرا سے خریدیں

خان اسرار احمد خان •

نادان دوست

آج چھٹی کا دن تھا۔ گرمی میں بھی کچھ کمی سی محسوس ہو رہی تھی اس لئے سائیکل لیکر ایک عزیز سے ملنے چل دیا۔

راستے میں ایک کشادہ سڑک سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ ایک انگریز نما پاکستانی افسر کے بچے لب سڑک کھیل رہے تھے، دو نرسیں انکے ساتھ تھیں۔ ان بچوں میں ایک لڑکی جس کی عمر چار سال تھی بہت شوخی کر رہی تھی۔ مجھ سے آگے ایک سن رسیدہ بزرگ آہستہ آہستہ سائیکل پر چلے جا رہے تھے۔ اس شوخ بچی نے ان کی طرف دیکھا اور بولی "کہاں جاتا ہے تم بڈھا!"

بڑے میاں نے غیظ آلود نظروں سے اس مجمع ناجائز کو دیکھا اور خون کا سا گھونٹ پی کر آگے بڑھ گئے۔ ان کے پیچھے ایک نوجوان جا رہا تھا۔ اس بچی نے بالکل اسی طرح جیسے لے [illegible] اسکو بھی ڈانٹا "کدھر جاتا ہے تم ——— ادھر آؤ!" یہ کہہ کر [illegible] تو منہ بھی چڑا دیا۔ نوجوان کو تاؤ آگیا اور سائیکل سے اتر کر اس بچی کی دایہ کی طرف گیا اور بولا "یہ کس کی بچی ہے؟ اسقدر بیہودہ اسکی تربیت کی ہے کہ راستہ چلتوں کو گالیاں دیتی ہے۔ بظاہر تو کسی شریف آدمی کی معلوم ہوتی ہے لیکن تربیت بالکل لفنگوں کی سی ہے!"

یہ تقریر کرتے ہوئے ساتھ ساتھ [illegible] سے اس نے بچی کی طرف بھی ذرا تادیبی نظروں سے دیکھ لیا۔ بچی مچل گئی اور بے تحاشا رونا شروع کر دیا۔ دایہ نے البتہ معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"یہ انکی والدہ صاحبہ کی تربیت ہے، یہ بچی ماں باپ کی بہت لاڈلی ہے! اس لئے اس کی تربیت اس طرح کی جاتی ہے کہ گھر کے ملازموں کو اس بچی سے ڈانٹنے کو کہا جاتا ہے۔ ملازم اپنی مجبوری پہ ہنس دیتے ہیں اور گھر والے اپنی فوقیت پر پھولے نہیں سماتے اور اس طریقہ کو ایک چونچلا اور لاڈ سمجھتے ہیں۔ اب اس کی عادت اتنی بگڑ گئی ہے کہ یہ راستہ چلتوں کو برا بھلا کہتی ہے!"

دایہ کی تقریر ختم ہوتے ہوتے بیگم صاحبہ دہاڑتی ہوئی کوٹھی سے نکل آئیں اور بولیں۔

"کیا ہوا نسرین کو! فاطمہ تو نے اسکو مارا ہوگا!"

فاطمہ بیچاری سہم گئی۔

بیگم شاید کہیں جانے کے لئے تیار ہو رہی تھیں اس لئے سرمہ وسمے سے نوک پلک درست کئے اور سرخی پاؤڈر سے آراستہ تھیں۔ نوجوان اس بلائے ناگہانی کے لئے تیار نہ تھا۔ بہت سٹ پٹایا اور اس سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ سائیکل لیکر بیک بینی و دو گوش فرار ہو جاتا۔

فاطمہ نے اپنی بے قصوری ثابت کرنے کے لئے تمام ماجرا کہہ سنایا پھر کیا تھا بیگم صاحبہ نوجوان کی جان کو آگئیں اور جو منہ میں آیا اس غریب کو کہہ سنایا۔ بچی نے جو شہ پائی تو نوجوان کو لپٹ گئی اور مارنا شروع کر دیا۔

گو مجھے بھی اپنی بے آبروئی کا بڑا اندیشہ تھا۔ لیکن میں نے ہمت کرکے بیگم صاحبہ کو مخاطب کر کے کہا۔

"محترمہ! یہ مانا کہ آپ بڑی آزاد ہو سکتی ہیں لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ آپ کے بچے راہ چلتوں کو گالیاں دیں۔ ذرا آپ ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ اس میں گالی کھانے والوں سے آپکا زیادہ نقصان ہے وہ تو یہ سمجھ کر طرح دے جائیں گے اور انکا اس میں بگڑتا بھی کیا ہے لیکن آپ کی بچی کا اخلاق ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خراب ہو جائیگا اور ان صاحبزادے نے بھی یہی کہا ہے کہ اس بچی کی تربیت بڑی خراب کی گئی ہے اور یہ بچی [illegible] بڑی معمول ہو سکتا ہے!"

بیگم صاحبہ تھوڑے پہلا کر بولیں۔ "آپ کیوں دخل در معقولات فرماتے ہیں؟ آپ کو میری بچی کی تربیت سے کیا مطلب! اچھی ہو یا بری

میں اپنی بچی کو گڑیا بنا کر تو گھر میں بٹھا نہ سکی۔ یہ بات کہ پیدا نہ ہوگی تو یہ دنیا میں کیا کر سکے گی ملکی خدمات کیا سر انجام دے گی اور کیا قوم کو سربلند کرے گی۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ ہم اپنی بچیوں کو مکانوں کے کونوں میں چھپا کر بٹھاتے رہیں۔

میں نے کہا کہ بیشک آپ اپنی بچی کو ملک و ملت کی خدمت کرنے کیلئے تیار کریں۔ لیکن ان خدمات کے لئے بھی تو تہذیب و تربیت کی ضرورت ہے۔ خوش اخلاقی اور تہذیب اطوار چاہئے۔ بدتمیز اور بیہودہ آدمی تو کسی کی بھی خدمت نہیں کرتا بلکہ وہ تو جہاں جائیگا۔ اپنے ملک وملت کو بدنام ہی کرے گا۔

بیگم صاحبہ نے مجھے بہت ہی قہر آلود نظروں سے دیکھا اور میں نے بھی مناسب سمجھا کہ اس قوم و ملت کے ہاں سے جان و آبرو سلامت لے جاؤں۔ نوجوان کو ہاتھ سے ساتھ آیا۔ اور بے ساختہ میری زبان پر یہ شعر آگیا ؎

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جسکے اسکا دشمن آسماں کیوں ہو

(سیفی)

جب کبھی آپ بیمار ہوں

جب کبھی اپنی صحت کی خاطر آپ کو کسی دواخانہ کی طرف رجوع کرنا پڑے تو اس وقت قدرتی طور پر آپ کے دل میں یہ سوال پیدا ہوگا۔

(الف) کیا وہ دواخانہ جس سے آپ دوا لینا یا منگانا چاہتے ہیں اپنے مرکبات میں ٹھیک اور اصلی ادویہ صحیح وزن کے مطابق ڈال رہا ہے۔

(ب) کیا تجربہ کار اور صحیح طبیب آپکے لئے صحیح دوا تجویز کرتے ہیں **خدا کا شکر ہے** کہ اس کے فضل و کرم سے حاذق دواخانہ بعد اس دھوکہ بازاد اشتہاری زمانہ میں بھی اس دوگونہ معیار پر پورا اتر رہا ہے۔

عالی جناب حکیم سید نذیر احمد صاحب دہلوی کی سرپرستی حاذق دواخانہ کی اس صداقت کی بہترین

حکیم صاحب موصوف کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ہندوستانی پبلک عموماً اور طب یونانی سے دلچسپی رکھنے والے خصوصاً ان کی ذات کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ ۴۷ سالہ تجربہ رکھتے ہیں۔ آپ کی زندگی کے اٹھائیس سال مسلسل طور پر **مسیح الملک حکیم اجمل** کے طبیب پیشی کی حیثیت سے ان کے ساتھ سفر و حضر میں گذرے۔ آپ ہندوستانی دواخانہ کے مسلسل چھ سال تک ہر شعبہ کے نگران رہے کتاب مطب کلاں آپ کی وہ مایۂ ناز اور مقبول عام تالیفات ہیں جو محتاج تعارف نہیں۔ آپ طبیہ کالج دہلی کے اعلیٰ کلاسوں کے پروفیسر رہے ہیں اور آپ

کے اعزازات

یونانی طبیہ کالج کے جشن طلائی کے اہم موقعہ پر مارچ ۱۹۴۵ء میں منتظمان کالج نے آپکو **امام طب** کی اعزازی ڈگری سے سرفراز فرمایا

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ان حقائق کے پیش نظر چونکہ حکیم صاحب موصوف بنفس نفیس حاذق دواخانہ کے جملہ امور کے نگران ہیں اور مطب کے علاوہ اپنا تمام وقت اور توجہ دواخانہ کی اصلاح اور درستی میں صرف کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی نگرانی میں تیار کرائے ہوئے اس دواخانہ کے مجربات اور مرکبات آپ کی صحت کے بہترین ضامن ہیں

مینیجر، حاذق دواخانہ، بندر روڈ، کراچی نمبر ۱

شاد علیخاں ●

لڑائی

دونوں سانڈ صبح سے لڑ رہے تھے اور ہر لمحہ ان کی لڑائی جاری تھی۔ تماشائیوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ اِدھر اُدھر کھڑے دیکھ رہے تھے۔ یہ تماشائی بھی دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروہ وہ تھا جو سفید سانڈ کا طرفدار معلوم ہوتا تھا وہ اس کی سفید چمکدار کھال کی تعریف کر رہے تھے۔ اس کے تیکھے سینگ نیزے کی طرح معلوم ہوتے تھے وہ اپنے حریف سے زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے سینگوں کے کھردرے پن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ میدان جنگ کا ایک پرانا اور آزمودہ کار سپاہی ہے یہی وجہ تھی جس کی بنا پر اس کے طرفداروں کو اس کے جیتنے کی توقع تھی۔ دوسرا گروہ سرخ سانڈ کی حمایت کر رہا تھا جو قد میں چھوٹا تھا مگر جسم گٹھا ہوا تھا اور چھوٹے چھوٹے نوکیلے سینگ اس بات کا پتہ دیتے تھے کہ وہ بھی اپنے مقابل سے کچھ کم نہیں ہے۔

جب دونوں سانڈ کوئی جھڑپ کرکے تھک جاتے اور ستانے کے لئے ذرا پیچھے ہٹ جاتے تو تماشائیوں کے دونوں گروہ پھر کسی نہ کسی طرح انھیں لڑنے پر اکساتے۔ سرخ سانڈ اپنے کھروں سے زمین کھودتا اور خوب گرد اڑاتا۔ سفید سانڈ اپنی گردن اوپر سے نیچے کرکے ——— اور پھر دیکھتے دیکھتے دونوں لپک کر ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے ——— اس کے بعد قوت آزمائی شروع ہوتی۔ ایک سانڈ دوسرے کو ڈھکیلتا ہوا دور تک پیچھے لے جاتا اور کبھی دوسرا ——— اور پھر "سرخ سانڈ زندہ باد" "سفید سانڈ زندہ باد" کے نعروں سے فضا گونج جاتی۔

اس دوران میں میدان کارزار بھی بدلتا رہا۔ ابھی اس چوک میں لڑ رہے تھے تو تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک دوسرے کو ڈھکیلتے دوسری گلی میں جا نکلے۔ غربی محلے کے شاطروں نے اپنی ایک چال سے دونوں سانڈوں کا رخ شرقی محلے کے چوک کی طرف کر دیا جہاں چاروں طرف کچے خستہ مکانات اور جھونپڑے تھے۔ سانڈوں کی ٹکر سے کچے مکانات کی دیواریں یکے بعد دیگرے گر رہی تھیں جو مکان جس سانڈ کی ٹکر سے گرتا اس کے رہنے والے دوسرے سانڈ کے طرفدار گروہ میں شامل ہو جاتے ——— تماشائیوں کا ایک گروہ مکان دار کی امداد کے بہانے اس کی رہی سہی دولت پر بھی ہاتھ صاف کر دیتا۔

میں یہ سب منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور کف افسوس مل رہا تھا۔ میں نے اپنے پاس کھڑے ہوئے چند لوگوں کو سمجھانا چاہا مگر وہ ایسے کھوئے ہوئے تھے کہ انہوں نے تو ان سنی کر دی۔ دوسرے لوگوں سے میں اپنی پوری بات ابھی کہہ بھی نہ سکا تھا کہ انھوں نے مجھے فریق مخالف کا ایک فرد سمجھ کر مجھ پر سنگ باری کا سلسلہ شروع کر دیا۔ لڑائی آخری مرحلوں میں پہنچ رہی تھی۔ دونوں سانڈ سوں سوں کرتے جلدی جلدی ایک دوسرے پر چڑھ دوڑ رہے تھے۔ دونوں گھائل ہو رہے تھے۔ تماشائیوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ مکانات کی بربادی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا میں کڑھ رہا تھا ——— اور میرا دل بیٹھا جا رہا تھا
آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں ایک ٹوٹے ہوئے مکان پر چڑھ کر ———
اپنی پوری طاقت سے چلایا۔

"——— اس حماقت کو بند کرو ——— ورنہ پوری بستی تباہ ہو جائے گی ...."

ابھی میں اپنی بات پوری بھی نہ کر سکا تھا کہ کسی نے میرے منہ پہ ہاتھ رکھ کر کہا ——— "کیا آپ ڈر گئے تھے ......؟" ———
کلمہ پڑھیے میری بیوی سرہانے کھڑی کہہ رہی تھی۔

(دائرۂ ادب اسلامی دہلی کے اجتماع میں پڑھا گیا)

(بشکریہ معیار)

ساغرؔ ہوشیار پوری •

"ماحول تقاضا کرتا ہے"

احساس کی دل میں آگ لگا ، ماحول تقاضا کرتا ہے
پیغامِ عمل انساں کو سُنا ، ماحول تقاضا کرتا ہے

پستی کا تصوّر رہنے دے ، رفعت کی تمنّا پیدا کر
خورشید و قمر سے آنکھ ملا ، ماحول تقاضا کرتا ہے

تقدیر کے شکوے لاحاصل ، غیروں کا سہارا کیا معنی ؟
تدبیر و عمل کو کام میں لا ، ماحول تقاضا کرتا ہے

محفل بھی ہے میکش بھی ہیں ، ساغر بھی ہے ، صہبا بھی ہے
انکار نہ کر اب جام اٹھا ، ماحول تقاضا کرتا ہے

آرام کے لمحے ختم ہوئے ، عشرت کا زمانہ بیت گیا !
انساں کو حسیں خوابوں سے جگا ، ماحول تقاضا کرتا ہے

ایمان و عمل کا نور ہوئے ، چہرے پہ یقیں کا نور نہیں
توحید کی مشعل دل میں جلا ، ماحول تقاضا کرتا ہے

ہر موج سے بحرِ ہستی میں طوفانِ قیامت برپا ہے
گرداب سے بچ اوروں کو بچا ، ماحول تقاضا کرتا ہے

کردار سے قومیں بنتی ہیں ، گفتار کی وقعت کچھ بھی نہیں !
اب ملّت کو یہ راز بتا ، ماحول تقاضا کرتا ہے

حالات نئے ، آثار نئے ، انداز نئے ، افکار نئے !
تاخیر نہ کر میدان میں آ ، ماحول تقاضا کرتا ہے

جینے کی ہوس محکومی میں ، ذلت کے سوا کچھ اور نہیں
کھا باغِ آزادی کی ہوا ، ماحول تقاضا کرتا ہے

مصباح دیسنوی

جب امتحان ختم ہو رہا تھا!

دانتوں کا درد جتنی تکلیف کا باعث ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے اس موذی مرض سے نجات پانے کی غرض سے بتیسی اکھڑوا دی اور مصنوعی دانتوں کے سہارے زندگی بسر کر رہے ہیں میں بھی اس مرض میں گرفتار تھا اور ہفتوں سے تکلیف برداشت کر رہا تھا۔ امید تھی کہ ہفتہ عشرہ میں یہ مرض قدرتی طور پر جاتا رہیگا لیکن یہ تو صاحب جیسے قسم کھا کر آیا تھا۔ یا ہم رہیں یا دانت رہیں۔ مجبوراً علاج کی طرف متوجہ ہوا۔ ایلوپیتھک، ہومیوپیتھک، آیورویدک، بائیوکیمک، اسپیسیفک یونانی، ہر طرز کا غرض جتنے بھی دیگر طریقہ کا علاج کرایا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ الٹا بیماری کا غلبہ ہوا۔ اب کیا کیا جائے، صرف ایک علاج ہے دانتوں سے جدائی۔ یہ خیال آتے ہی آنکھوں سے اندھیرا چھانے لگا ہائے رے میری بتیسی! اتنے دنوں تک بلا چوں و چرا میرا ساتھ دیتی رہی اب اسکے دشمن اسے ترک وطن پر مجبور کر رہے ہیں۔

دو تین دن تک دانتوں کی تکلیف برداشت کرتا رہا لیکن طبیب دنداں کے یہاں جانے کی ہمت نہیں پڑی، دانتوں کی تکلیف جب زیادہ ہوتی تو آس پاس کی تمام چیزیں ایک اضطراب ایک کرب اور ایک اذیت میں مبتلا نظر آتیں، دن کو تارے نظر آنے لگے اور عین اس وقت چچا جان مرحوم کا یہ جملہ یاد آتا کہ "ایسا چانٹا رسید کروں گا کہ دن کو تارے نظر آنے لگیں گے"۔ مجھے بھی دن کو تارے نظر آ رہے تھے۔ لیکن دانتوں کے درد نے صرف تارے ہی نہیں دکھائے، بلکہ نظام شمسی کے تمام سیارے گردش کرتے دکھا دیے۔۔۔

ابھی دانتوں کے درد کا سلسلہ جاری تھا کہ بچوں کے امتحانات شروع ہو گئے۔ چلئے "ایک نہ شد دو شد" دانتوں کا درد بھی گوارا کرو اور کمرۂ امتحان میں نگرانی بھی کرو۔ نگرانی کوئی معمولی چیز ہے؟ اور وہ بھی کمرۂ امتحان کی اور وہ بھی ان بچوں کی، جو پلکوں کی جھپک میں کیا سے کیا کر لیتے ہیں۔ سرحدی علاقوں کی نگرانی کرنے والے اگر کمرۂ امتحان میں چند گھنٹوں کے لئے تعینات کر دیئے جائیں۔ تو انہیں اپنی کمتری کا شدید احساس پیدا ہو جائے، فوجی ہوں یا محکمہ پولیس کے سپاہی، کوئی بھی کمرۂ امتحان میں نگرانی کے فرائض بخوبی انجام نہیں دے سکتے، اس کام کے لئے وہی لوگ مناسب ہیں۔ جن کی نگاہیں کبوتر کی نگاہوں سے زیادہ تیز ہیں، شاہین بچوں کی دیکھ بھال صرف شاہین ہی کر سکتا ہے۔

خیر صاحب، قہر درویش بر جان درویش، دانتوں کا درد لئے کمرۂ امتحان میں پہنچا اور نگہبانی کرنے لگا۔ آنکھوں کی روشنی کا استعمال اس کثرت اور اس سرعت سے کرنا پڑا کہ درد کا خیال اتر گیا۔ جب تک کمرۂ امتحان میں ہوتا درد کا احساس نہیں ہوتا، اس صورت سے امتحان کا آخری دن آ پہنچا، اتفاق سے یہ ماہ مئی کی آخری تاریخ تھی، امتحان کا آخری دن، ماہ کا آخری دن اور غالباً میرے دانتوں کے درد کا آخری دن! اس لئے کہ اسی دن میرے ایک عزیز نے دانتوں کے درد کا نہایت آسان علاج بتایا۔۔۔ تنبل ـــــ ایک بہت معمولی شے صرف دو آنے کا تنبل دانتوں تلے دبانا، لیکن قبل اسکے کہ میں اس دوا کو منگا کر استعمال کر سکوں مجھے کمرۂ امتحان میں جانا پڑا، دانتوں میں ہلکا ہلکا درد تھا۔ جونہی امتحان شروع ہوا احساس درد جاتا رہا۔ نگرانی میں انہماک تھا اور خاص طور سے، اس لئے کہ امتحان کچھ گھنٹوں کے بعد دم توڑنے والا تھا۔ عین اس وقت۔ جبکہ تمام اساتذہ نگرانی میں مستغرق تھے مجھے خیال آیا کہ تمام بچوں کے ذہنی اور قلبی کیفیات کا عکس لیا جائے۔ چنانچہ ایک کاغذ کا ٹکڑا لیا اور ایک دوست سے فرمائش کی انہوں نے فرمایا کہ فلاں صاحب سے پہلے لکھوا لیں میں بعد میں لکھونگا!

دوسرے صاحب کے پاس گیا تو وہ مشغول ہونے کے ساتھ ساتھ پریشان بھی تھے۔ انہوں نے بھی عذر کیا چنانچہ میں کچھ جھلا گیا اور اپنی جگہ پر آکر فوراً کاغذ پر یہ مصرعہ لکھدیا ع زندگی زندہ دلی کا نام ہے !

بس اب کیا تھا، ابتدا ہو چکی تھی۔ کسی کو عذر کیوں ہوتا۔

سعید صاحب نے یوں جواب لکھا ع

مردہ دل کو دعویٰ ہے اب زندگانی کا

سعید صاحب کو عام طور سے مردہ دل ہی سمجھا جاتا ہے اس لئے کہ وہ دنیا کی تمام دلچسپیوں سے کنارہ کش ہو گئے ہیں اور صرف دو ہی کاموں کو فرض سمجھکر انجام دیتے ہیں۔ ایک درس و تدریس اور دوسرا چھوٹے پیمانہ کا بزنس۔ بزنس میں کوئی خاص تجربہ تو نہیں رکھتے ہیں لیکن غالباً ابھی سیکھ رہے ہیں تاکہ اپنے بچوں کو اس فن کی تعلیم بھی دے سکیں اور اسی بزنس نے شاید انہیں یہ لکھنے پر مجبور کیا کہ ع

مردہ دل کو دعویٰ ہے اب زندگانی کا

خدا ہر مسلمان کو ایسے ہی بزنس کے چکر میں پھنسا دے کہ وہ زندگی کا دعویٰ کرنے لگے۔

پھر میں رمز صاحب کے پاس پہنچا۔ انہوں نے لکھا ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی ——!

اور واقعی ان کو اپنی بھی خبر نہیں رہتی۔ نہایت ہی یار باش اور مرنجان و مرنج قسم کے آدمی ہیں شاعری کا شوق طالب علمی کے زمانہ سے ہے، ابھی کچھ زیادہ عمر نہیں ہوئی ہے یہی پینتالیس کے قریب ہیں۔ طبیعت میں شوخی، رنگینی اور جولانی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اپنا کلام سنانے سے پہلے ذرا سنبھل کر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر جھوم جھوم کر پڑھتے ہیں بعض اوقات تو مصرعہ ختم ہونے سے پہلے ہی ان کو سرور آجاتا ہے، کلام پڑھنے کا انداز بالکل ڈرامائی ہے فرماتے ہیں کہ "بغیر اداکاری کئے شعر پڑھنے کا لطف خود مجھے نہیں ملتا ہے"!

ایک دفعہ دو چار دوستوں کی صحبت میں شعر سنا رہے تھے، چائے کی پیالی ہاتھ میں تھی مصرعہ اولیٰ پڑھا اور چائے کا ایک گھونٹ لیا، مصرعہ ثانی شروع کیا تو آنکھیں اسطرح بند کرلیں، جیسے چائے کے ایک ہی گھونٹ سے نشہ آگیا اور پھر ایک چٹخارہ لیا تو معلوم ہوا کہ شعر کی ساری لطافت خود ہی پی گئے۔ ہم لوگوں کے حصہ میں کچھ بھی نہ آئی۔

اب فروغ صاحب کی باری آئی۔ ان کے قلم نے یہ لکھا

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

فروغ صاحب ان لوگوں میں ہیں جو فطرتاً گوشہ نشین، سلیم الطبع اور خشک مزاج ہوتے ہیں انکی تعلیم علیگڑھ میں مکمل ہوئی ہے۔ علیگڑھ کے گریجویٹ ہونیکے باوجود ان میں وہاں کی خو بو نہیں ہے۔ صورت اور سیرت کے لحاظ سے یہ نرے "مولوی" ہیں علیگڑھ میں بھی رہے تو وہاں کی ہنگامی زندگی سے الگ تھلگ۔ میرے بھائی سیف الہدیٰ نے انہیں پہلی مرتبہ دیکھا تو خیال کیا کہ کوئی مولوی صاحب ہیں جو بچوں کو صرف عربی اور فارسی پڑھاتے ہوں لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ علی گڑھ کے گریجویٹ ہیں تو سخت متعجب ہوئے۔ انہیں مطالعہ کا شوق حد سے زیادہ ہے، ادب سے گہرا لگاؤ ہے فن شاعری کا بھی خاصا شوق ہے، ان کے رشحات قلم سے بھی وہی خشکی ظاہر ہوتی ہے۔

ان کی طبیعت بڑی انوکھی ہے، بڑی سیدھی سادی سی زندگی بسر کرتے ہیں، مکروہات مثلاً سگریٹ، چائے، پان، فوٹو وغیرہ کسی چیز کا شوق نہیں ہے، فوٹو کے متعلق انکی "ماہرانہ اسکولپک تھیوری" یہ ہے کہ ایک قسم کا کیڑا ہے جس سے خود نمائی، خودستائی اور تکبر جیسے امراض پیدا ہوتے ہیں۔

فروغ صاحب کو سوائے اسکول کے کوئی ملازمت پسند نہ آئی۔ یہ بات نہیں ہے کہ ان کو سرکاری ملازمت نہیں مل سکتی تھی وہ ابھی ابھی رضامند ہوں تو ان کو "اچھی ملازمت" مل سکتی۔ لیکن وہ نہایت پاک و صاف زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ درس و تدریس کو کچھ حد تک اپنی طبیعت کے موافق پاتے ہیں اور اسی صورت سے ملک و قوم کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔

ان کے بعد ستار صاحب آتے ہیں۔ جو فرماتے ہیں

؎ فکر فردا ہے گم عقل لے نشتر اپنی
اور دنیا یہ سمجھتی ہے کہ دیوانہ ہے

آپ مدرسہ شمس الہدیٰ، پٹنہ سے فارغ التحصیل علم ہوئے ہیں اسکے بعد آپنے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ آپ شاعر بھی ہیں اور نشتر تخلص کرتے ہیں۔ یہاں کے مشاعروں میں اکثر شریک ہوتے ہیں۔ آپ لفظ مولوی سے بہت چراغ پا ہوتے ہیں اور جب غصہ آتا ہے تو بات بٹ پہن لیتے ہیں۔ جامہ سے باہر ہوتے سنا تھا لیکن آپ پینٹ کے باہر ہو جاتے ہیں۔ آپکا قول ہے "مجھے احمق کہئے، بیوقوف کہئے، دیوانہ کہئے، جی چاہے مہاجر کہہ کر پکاریئے۔ لیکن "مولوی" ہرگز نہ کہئے"

آپ خواہ مالی مجبوریوں میں پریشان رہیں یا نہ رہیں لیکن آپ کو اسکا شدید احساس ہر وقت رہتا ہے کہ کل کیا کھانے کو نہیں ہے چنانچہ اپنی دیوانگی کا باعث فکر فردا کو بتاتے ہیں۔

اور پھر معین الدین احمد صاحب لکھتے ہیں ع
زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

معین صاحب بھی کم سخنوں میں سے ہیں۔ آپ پٹنہ یونیورسٹی سے گریجویٹ ہیں جب سے یہ ادارہ قائم ہوا ہے۔ آپ اس کے سرگرم کارکن ہیں لیکن بدقسمتی سے ایک سال سے ضعف معدہ کے شکار ہیں اور برابر علاج معالجہ میں پریشان رہتے ہیں۔ آپ ایک دو ماہ تک بچوں کو تعلیم دیتے ہیں اور پھر تین چار مہینے تک غائب رہتے ہیں۔ وہ بھی ضعف معدہ کے علاج کے سلسلہ میں! اور جب آپ طویل عرصہ کے بعد تشریف لاتے ہیں تو بچوں میں شور ہوتا ہے نئے ماسٹر آئے ہیں۔ آپ ہر بار نئے ہو جاتے ہیں۔ کاش آپکا نیا پن برقرار رہے اور کبھی بڑھاپا نہ آئے۔

میں جب سید احمد کے پاس پہنچی تو انہوں نے تحریر فرمایا
تمغۂ ایماں نہیں ملتا نمائش کے لئے

آپ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے عالم و فاضل ہیں۔ آپ نہایت ہی سادہ لوح اور نیک مزاج انسان ہیں۔ صابر و شاکر ایسے کہ نہایت ہی قلیل آمدنی پر بھی گذارہ کر لیتے ہیں۔ سبھوں کو سخت حیرت ہے کہ آخر اتنی کم آمدنی پر کس طرح بال بچوں کیساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں اور یہ عبادت و ریاضت کی برکت ہے، کوئی مغرب زدہ ہوتا تو وہ ہی دن کے بعد بال بچوں سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا یا ناجائز ذریعۂ آمدنی ڈھونڈنا شروع کرتا۔

اور جب فضل الرحمن خاں صاحب سے کچھ لکھنے کی فرمائش کی گئی تو آپنے یہ شعر صفحہ قرطاس پر منتقل کیا ؎

عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر!

آپ گریجویٹ ہیں، وکالت پاس ہیں اور ایل ٹی سی کی سرٹیفکٹ بھی رکھتے ہیں۔ آپ نہایت متقی اور پرہیزگار انسان ہیں، پانچوں وقت کی نماز مسجد میں جاکر پڑھتے ہیں اور نماز بھی تزک و احتشام سے پڑھتے ہیں۔ یہ نہیں کہ قمیص اور پائجامہ پہنکر نماز پڑھ لیں جو بھی اچھا لباس آپکے پاس موجود ہے آپ نہایت ہی سلیقہ سے پہنکر نماز کیلئے کھڑے ہوتے ہیں۔ اسکے متعلق آپ فرماتے ہیں کہ جب آپ کسی معمولی افسر کے پاس جاتے ہیں تو سوٹ بوٹ، ہیٹ وغیرہ پہن لیتے ہیں کسی نواب کے دربار میں جاتے ہیں تو اپنے بہترین کپڑے زیب تن کرتے ہیں۔ اگر آپکے پاس کپڑے نہیں ہوتے ہیں تو آپ دوسروں سے مانگ لیتے ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ آپ جب خدا کے دربار میں جائیں، وہ دربار جو سب سے اعلیٰ اور سب سے بڑا ہے تو معمولی کپڑوں میں جائیں!

میں آخر آپ سے ملنے میں اسقدر سرگرم تھا کہ اپنے کرمفرما محمد کلیم صاحب کی مصروفیت کو نظر انداز کر دیا اور یک بیک ان کے سامنے کاغذ پیش کر دیا۔ آپنے اوپر کی عبارتوں کو پڑھا اور پھر یہ مصرعہ لکھ دیا ع

دل اچھا ہو تو مٹ جاتی ہے شاید بدحال ہو کر!

کلیم صاحب پٹنہ یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں اور سی ٹی بھی، آپ بڑے صاحب الرائے ہیں اور معاملہ فہمی کی بڑی اچھی صلاحیت رکھتے ہیں کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو آپ نہایت ہی سنجیدگی سے اس پر غور کرتے ہیں اور بہت اطمینان سے اسکا فیصلہ کرتے ہیں۔ آپ کسی کام میں عجلت نہیں کرتے۔ آپکا قول ہے کہ "عجلت کا

دوسرا نام تخریب ہے دیر آید درست آید۔ آپ کو انگریزی ادب، تاریخ ہند و پاکستان اور تاریخ اسلام سے بڑا گہرا لگاؤ ہے۔ چنانچہ آپ نے پاک میٹریکولیشن ٹرانسلیشن کو مرتب کیا، اور ایک کتاب مختصر تاریخ اسلام کی تالیف کی۔ آپ کی طبیعت میں مزاح اور طنز بدرجہ اتم موجود ہے گفتگو کا انداز کبھی کبھی خوشگوار حد تک شوخ رہتا ہے۔ بدزبانی سے آپکو سخت نفرت ہے۔ لیکن اس سے زیادہ نفرت ان لوگوں سے ہے جو دل کے برے ہیں۔

کلیم صاحب کے بعد میں نے علی حسن صاحب سے فرمائش کی آپنے لکھا

"وقت، دولت ہے"

علی حسن انصاری صاحب کلکتہ یونیورسٹی کے گریجویٹ (سائنس) ہیں آپ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں مدرس تھے، حالیہ فسادات نے آپ کو یہاں پہنچا دیا۔ آپ وقت کو دولت اور دولت کو وقت سمجھتے ہیں چنانچہ آپ نے وقت کا خوب مصرف لیا اور دونوں کشتیوں پر پیر رکھے رہے اور پھر جب حالات بدل گئے تو آپ نے پہلی کشتی کے حق میں فیصلہ کیا اور اسی کے ہو رہے۔ دوسری کشتی کے مسافروں کو اپنی دوروزہ دیدار دکھلا گئے۔

میں جب عبدالستار صاحب کے پاس گیا تو وہ کمرۂ امتحان سے علیحدہ ہو کر ایک گوشہ میں بیٹھے درست کر رہے تھے اور بشرہ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کسی الجھن میں مبتلا ہیں۔ میں نے پرزہ بڑھا دیا تو کچھ جھنجھلا گئے اور یہ تحریر فرمایا۔

ہر کسے بخیال خویش خبطے دارد

یہ لکھنے کے بعد آپنے زور سے قہقہہ لگایا۔ میں نے محسوس کیا کہ جیسے انکی الجھن دور ہو گئی اور قبل اسکے کہ میں وہاں سے واپس آؤں آپ اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔

ستار صاحب پرانے گریجویٹ ہیں۔ انگریزی میں آنرز کے ساتھ بی۔ اے پاس کیا۔ آپ کو اسکول کی ہیڈ ماسٹری ملی۔ آپنے کچھ دنوں تک کام کیا پھر آپ کو انگلستان جانیکا موقع دیا گیا۔ لیکن آپنے پست ہمتی کے ساتھ انکار کر دیا کہ میں گراں گوش ہوں، وطن سے لاکھوں میل دور جانے سے کیا فائدہ۔ پھر آپنے اسکول کی ملازمت کی۔

ایک ہی اسکول میں تقریباً تیس سال تک نائب صدر مدرس لوگوں نے لاکھ سمجھایا کہ ہیڈ ماسٹری کے عہدہ کو سنبھال لیجئے لیکن اپنی جگہ اٹل رہے۔ یہاں تک کہ آپکا ایک شاگرد اسی اسکول میں ہیڈ ماسٹر بنکر آیا اور آپ اسکی ماتحتی میں کام کرنے پر رضامند ہو آپ کو انگریزی ادب سے گہرا لگاؤ ہے۔ انگریزی کی عبارت ہی عمدہ لکھتے ہیں۔ لیکن اردو بولنے اور لکھنے سے دور بھاگتے ہیں میرا اندازہ ہے کہ اردو میں آپ کی صلاحیت بڑی اچھی ہے۔

اور جب جہانگیر صاحب کی باری آئی تو آپ نے لکھا۔

امتحان کے صحیح معنی سے طلباء واقف نہیں ہیں

آپ جہانگیر خاں ہیں تجربہ تماشا ہے کہ بچے جب داخلہ کے لئے آتے ہیں اور جہانگیر صاحب ان کو ٹسٹ کے سلسلہ میں پوچھتے ہیں کہ ہندوستان بادشاہ کا نام بتا سکتے ہو تو وہ بے دھڑک کہتے ہیں "جی ہاں! جہانگیر کو جانتا ہوں" اور جہانگیر صاحب انکی پیٹھ ٹھونکنے لگتے ہیں۔

جہانگیر صاحب پرانے مسلم لیگی ہیں اور قائد اعظم رحمۃ اللہ علیہ زبردست شیدائی۔ حکومت پاکستان کے خلاف ایک لفظ بھی سننا چاہتے۔ ابھی حال میں ہم لوگ مسلم لیگ کی موجودہ حالت پر تبصرہ کر رہے تھے کہ آپ ایکدم برافروختہ ہو گئے "آپ لوگ مسلم لیگ پروپیگنڈا کرکے اسے مردہ مشہور کرنا چاہتے ہیں مسلم لیگ کبھی ناکارہ نہیں ہو سکتی۔ اس پر عوام کو بھروسہ رہیگا" اور پھر جب ہمارے وزیر اعظم جناب لیاقت علی خاں مرحوم مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے تھے تو جہانگیر صاحب نے ازحد خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ اب اس جماعت میں نئی روح پیدا ہو جائے گی!

جہانگیر صاحب امتحان کی نگرانی کرنے میں نرمی نہیں کرتے لیکن انہیں اسکا افسوس ضرور ہے کہ طلباء امتحان کی روح کو نہیں سمجھتے۔ میرا تو ذاتی خیال ہے کہ یہ لفظ "امتحان" ہی بہت فرسودہ ہو گیا ہے اب اسے بدل دینا چاہئے، نام کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ طریقۂ امتحان میں بھی تبدیلی مناسب ہو گی۔

جہانگیر صاحب کا شکریہ ادا کرنے کے بعد میں محبوب حسن خاں کے

پاس پہنچا، انہوں نے اپنے والد کے شعر کا ایک مصرعہ لکھدیا ع

وہ دن کی تن آسانی کہئے تقدیر کا شکوہ کون کرے

آپ بھی کم سخن سے ہیں۔ طبیعت کے بڑے اچھے ہیں لیکن آپکے دل و دماغ پر احساس کمتری ہر لمحہ چھایا رہتا ہے چنانچہ آپکا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ آپ آج سے کچھ مہینے پیشتر بھارت تشریف لیجا رہے تھے جب سرحدی اسٹیشن پر پہنچے تو کچھ بھارتی جاسوس نظر آئے۔ انہوں نے ازراہ یا قصداً آپ کو دو تین مرتبہ سر سے پیر تک دیکھا آپکا دماغ سنسنا گیا اور آپ کو اپنی گرفتاری یقینی نظر آنے لگی چنانچہ آپ وہیں سے پلٹ پڑے۔ واپسی کے سفر میں ایک نئی مصیبت لگ گئی۔ پاکستانی جاسوس خواہ مخواہ تفریح کے طور پر آپ کو گھورنے لگا۔ آپ بہت ہی گھبرائے اور ہانپتے کانپتے گھر آکر دم لیا، وہ دن اور آج کا دن، پھر کبھی آپ بھارت جانے کا تصور بھی کر سکیں
میں اب سلطان احمد۔ جب کوئی موڈ رہتا وہ ایک جگہ

امتحان کی کاپیاں درست کر رہے تھے اور بڑے مسرور تھے کہ اب امتحان ختم ہو رہا ہے میں نے فرمائش کی تو آپنے بلا کچھ سوچے سمجھے یہ مصرعہ لکھدیا ع

"کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے"!

آپکا وطن صوبہ متحدہ (بھارت) ہے لیکن آپکی زندگی کا بیشتر حصّہ صوبہ بہار میں گزرا۔ آپ ابھی نہایت ہی کمسن ہیں، اور مدرسہ ہونے کے ساتھ ساتھ طالبعلم بھی ہیں۔ معلوم نہیں آپکو معلمی میں اپنا مستقبل شاندار نظر آتا ہے یا متعلمی میں۔

سلطان طبیعت کے لحاظ سے کلیم صاحب کے برعکس ہیں کلیم صاحب نہایت ہی پرسکون اور سنجیدہ انسان ہیں لیکن سلطان صاحب بڑے عجلت پسند اور انتشار پسند آدمی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر آپکا کام خراب ہو جایا کرتا ہے۔

قوت طاقت اور مردانگی چوبیس گھنٹے میں تو نہیں مگر ہاں تیس دن میں ضرور حاصل ہو سکتی ہے

کیا آپ تھکاوٹ، پژمردگی نقاہت اور کمزوری محسوس کرتے ہیں۔ کیا آپ کی قوت حافظہ کمزور ہے کیا آپ ہر وقت خوف زدہ اور غمگین رہتے ہیں۔ کیا آپ کا جسم دبلا ہے اور آپ سستی اور کمزوری محسوس کرتے ہیں کیا آپ احساس کمتری کے شکار ہیں ــــ؟ ــــ اگر ایسا ہے تو یقین جانیئے کہ آپکے وہ غدود جو قوت مردانہ کے مخزن ہیں کمزور ہو گئے ہیں اور جب تک آپ ان غدود کو طاقت ور بنا کر ان کی حفاظت نہیں کرینگے آپ کبھی بھی قوت وطاقت و مردانگی کی صفات سے متصف نہیں ہو سکتے۔ خوش قسمتی سے امام طب حکیم سید نذر احمد صاحب دہلوی اپنے ۳۵ سالہ تجربہ کے بعد ایک ایسا نسخہ عمل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو کہ مردانہ غدود کی جملہ کمزوریوں کو دور کرکے انہیں طاقت ور بنانے کا تیر بہدف مگر سادہ اور سہل علاج ہے۔ طب یونانی اس جدید اور مایۂ ناز ایجاد کا نام:ــ

حاذقی کورس

یہ جو تین مختلف ادویہ پر مشتمل ہے اور تیس دن کا مکمل کورس ہے جس کا ابتدائی استعمال آپکے جسم میں طاقت، قوت اور تن درستی کا احساس پیدا کردے گا اور پورے تیس روز کے بعد آپ ایک مکمل نوجوان، تن درست و توانا اور طاقت ور مرد بن جائیں گے۔

حاذقی کورس کا استعمال فوراً آپکے غدود کو طاقت ور بنا کر اپنا اثر شروع کردیگا آپکے بدن میں تازہ سرخ خون پیدا کرکے اس میں جوانی کا جوش پیدا کردے گا اور جوں جوں آپکے غدود طاقتور ہوتے جائینگے آپ اپنے اندر زندگی ایک نئی لہر محسوس کرینگے اور آپ زندگی کے ہر شعبہ حقیقی زندگی سے لطف اندوز ہو سکیں گے یعنی لطف شباب!

حاذقی کورس مکمل برائے تیس یوم بارہ روپے

ملنے کا پتہ:ــ حاذق دواخانہ بندر روڈ، کراچی نمبر ۱

شورش کاشمیری

"حقیقت سے بدظن جہاں آج کیوں ہے؟"

لبوں پر مسلسل فغاں آج کیوں ہے
ہر اک بات مجھ پر گراں آج کیوں ہے

بتاؤ وطن پر فدا ہونے والو
کہ بے ربط نظمِ جہاں آج کیوں ہے

زبانِ صداقت پہ مہریں لگادیں
حقیقت سے بدظن جہاں آج کیوں ہے

گلوں کا تبسم کہاں چھپ گیا ہے
گلستاں پہ حاوی خزاں آج کیوں ہے

اذاں سے کبھی بحر و بر کانپتے تھے
مسلماں اسیرِ بتاں آج کیوں ہے

نکل آیا بچ کر سفینہ بھنور سے
نہ جانے خدا مہرباں آج کیوں ہے

قدم ڈگمگاتے ہیں ہر حادثے پر!
حوادث سے لرزاں جہاں آج کیوں ہے

نہیں خون باقی بشر کی رگوں میں
بشر مفلس و ناتواں آج کیوں ہے
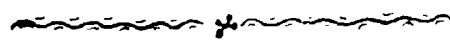
بزمِ اکبر کی شاندار مطبوعات

بہترین جلد، کاغذ اعلےٰ، لکھائی چھپائی باصرہ نواز

حیاتِ اکبر حضرت اکبر الہ آبادی کے یہ حالات اُنکے فرزند سید عشرت حسین مرحوم کے جمع کردہ مواد سے کہنہ مشق ادیب ملا واحدی صاحب نے بہت ہی دلنشین زبان میں لکھے ہیں۔ حضرت اکبر کی مختلف عمروں کی تصاویر بھی شامل ہیں۔ ضخامت ڈھائی سو صفحے۔ قیمت تین روپے، محصول نو آنے

قطعات و رباعیاتِ اکبر (جلد اول) اکبر الہ آبادی کا وہ کلام جس نے انھیں لسان العصر بنایا اور دوسرے شعراء سے نمایاں کیا۔ ممتاز ادیب بھیا احسان الحق اس کتاب کے مرتب ہیں۔ بھیا نے قطعات و رباعیات اکبر کو ۲۶ ابواب کے تحت تقسیم کیا ہے اور ہر قطعہ و رباعی کا الگ عنوان ہے۔ تشریح و توضیح سونے پر سہاگہ۔ ضخامت چار سو صفحات۔ قیمت ساڑھے پانچ روپے محصول ڈاک بارہ آنے۔ (دوسرا حصہ زیر طبع)

اکبر اس دور میں نامور اہل قلم اختر انصاری اکبر آبادی کی الافانی ترتیب۔ ممتاز ناقدین کے حضرت اکبر کی شاعری اور زندگی پر نئے بلند معیار مضامین کا مجموعہ۔ ضخامت تین سو چھتیس صفحے۔ قیمت پانچ روپے۔ محصول ڈاک نو آنے۔

لسان العصر حضرت اکبر پر ایچ نامور شعراء کی نظمیں جنھیں اختر انصاری اکبر آبادی نے کتابی صورت میں ترتیب دیا۔ حفیظ ہوشیار پوری۔ حامد حسن قادری۔ اسد ملتانی۔ سراج الدین ظفر۔ ماہر القادری۔ سجاد باقر۔ شاد عارفی۔ خمار انصاری۔ عابد حشری۔ سرشار صدیقی۔ ادیب سہارنپوری۔ سلطان برنی۔ سجاد شاہد۔ شبنم رومانی جیسے شعراء شامل ہیں۔ ضخامت ایک سو بانوے صفحے۔ قیمت تین روپے۔ محصول نو آنے

کلیاتِ اکبر (جلد اول) حضرت اکبر الہ آبادی کا سترہ سال سے پچاس سال تک کی عمر کا کلام۔ ضخامت چار سو چالیس صفحے قیمت چھ روپے (محصول بارہ آنے)

کلیاتِ اکبر (جلد دوم و سوم) اس میں کلیات کے پرانے ایڈیشنوں کے حصہ دوم سوم کو یکجا کر دیا ہے۔ ضخامت چار سو چہتر صفحے قیمت سات روپے۔ محصول بارہ آنے

مہتمم مکتبہ بزمِ اکبر۔ بزرٹا لائنز۔ کراچی ۴

عذرا سعید •

مینا بازار میں

موسم خوشگوار تھا اور دن چمکیلا۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی کہ اچانک ایک جھنجھلائی ہوئی سی آواز میرے کان میں پڑی۔ "نجمہ ...... او نجمہ ...... ارے کہاں ہو بھئی کب سے ڈھونڈ رہی ہوں، جانے بیگم صاحبہ کہاں گم ہیں۔ یہ کیا بدتمیزی ہے آخر؟" زرینہ جو مجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک چکی تھی۔ دروازہ ایک دھکے کے ساتھ کھول کر تیر کی طرح آخر میرے کمرے میں آ پہنچی۔ اس کی تھرتھراتی نظریں اور غصے سے تمتایا ہوا چہرہ دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ زرینہ صاحبہ کے غصے پر کوئی پر سکون انداز سے ہنسے جائے اور وہ زیادہ چراغ پا نہ ہوں؟ قطعی ناممکن ہے۔ اسی طرح ناممکن جیسے اس کے غصے پر میرا نہ ہنسنا۔ اب آئی میری شامت، میں نے سوچا، اور کتاب کو ہاتھ سے رکھنے ہی والی تھی کہ زرینہ نے بڑھ کر ایک جھٹکے سے لے کے میرے ہاتھ سے چھیننا چاہا —— "اچھی ذری ...... نہ بھئی یوں نہ کرو!" میں نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔ مگر وہ کیوں مانتی۔ "کیوں نہ کریں؟ بڑی آئیں کہیں سے، کب سے سب کمروں میں تلاش کر رہی ہوں۔ اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے یوں بیٹھی ہیں جیسے کوئی یہاں تک تو پہنچ ہی نہیں سکتا۔ اب اٹھو کسی بھی طرح میرے ساتھ چلو ورنہ سچ کہتی ہوں بہت برا کرونگی!" میں نے ایک شرط پیش کی، "اچھا پہلے نہ لڑنے کا وعدہ کرو ——" "ہونہہ، نہ لڑنے کا وعدہ، تم پہلے کتاب تو رکھو۔ نہیں لڑینگے اچھا!"

میں نے مطمئن ہو کر کتاب میز پر رکھ دی۔ مگر زرینہ وعدے کی پابندی کچھ ایسی ضروری نہیں سمجھتی۔ اس کا ہاتھ میرے گالوں کی طرف لپکا اور کیوٹکس لگے ہوئے لمبے لمبے، نوکیلے ناخنوں کے تصور سے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ "نہ نہ ذری بہن بھئی یہ بات ٹھیک نہیں۔ اب تو صلح ہو گئی، بیٹھ اطمینان سے بات سنا تو کیا حال ہے؟" میں نے اسے دوسری طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گئی۔ ورنہ ...... اس کے وہ تیز تیز ناخن تو میرے چہرے پر عمل جراحی ہی کر بیٹھتے۔ وہ اسی طرح خفگی کے لہجے میں بولی "سنا کیا خاک؟ تم نے سارا مزا کرکرا کر دیا۔ بیگم صاحبہ کے کہیں مزاج نہیں ملتے۔ اور پھر سنانے سے فائدہ ہی کیا۔ جب کہ تم خود ہی بھول ہو کہ آج ۱۷ تاریخ ہے اور تمہیں میرے ساتھ مینا بازار کیلئے جانا ہے ......!" —— "ارے سچ مچ یہ مینا بازار مجھے واقعی یاد ہی نہ رہا تھا۔ ایک بار کہا تھا زرینہ نے، کہ ستہ پردہ باغ میں مینا بازار لگے گا۔ اور ہم دیکھنے کے لئے اکٹھے چلیں گے۔ میرا کچھ پہلے ہی ارادہ نہ تھا، مگر زرینہ کی ناراضگی کے خیال سے سوچا چلو دیکھ ہی آئیں اور پھر یہ بھی تو پتہ چلے کہ ہماری قوم کی لڑکیاں یہ خدمت کس طرح انجام دیتی ہیں۔ زرینہ کی خوشی کا خیال رکھنا میرے لئے ضروری ہے، کیونکہ وہ اول تو میری خالہ زاد ہے پھر اگر وہ اتنی تیز مزاج اور مغرب پرست نہ ہوتی، تو میں اپنی بہترین سہیلیوں میں شمار کرتی۔ تاہم وہ مجھے عزیز ضرور ہے۔ مینا بازار یاد آیا، تو میں نے اس وقت پہلی بار اس کو بہت سے پیرہنگ توجہ سے دیکھا اس کے قیمتی، خوبصورت، جدید ترین کے لباس کو، اس کے پاؤڈر اور لپ اسٹک سے چمکاتے ہوئے چہرے کو، اس کے بالوں کو، جو بڑی دلکش وضع سے بنا کر کھلے چھوڑ دیئے گئے تھے۔ "واہ، واقعی یہ آج تم کیسی اچھی لگ رہی ہو۔ یہ شان تو میں نے اب تک نہ دیکھی تھی ......" میں نے کہا۔ اور وہ حسب عادت سن کر خوش ہوئی، مگر اپنی

کو چھپاتے ہوئے بولی "خیر میری تعریف تو رہنے دیجئے۔ اب جلدی اٹھ کر تیار ہو جائیے۔ اور دیکھو اگر تم نہ گئیں تو میں پھر کبھی تم سے نہ بولوں گی ــــ" "نہیں نہیں ابھی ذرا سی تم صرف دس منٹ انتظار کرو، میں ابھی آتی ہوں" میں اسے یہ کہہ کر کپڑے بدلنے چل دی۔ اور جب تیار ہو کر آئی تو زرینہ نے جانے کیسی عجیب نظروں سے مجھے دیکھا، مجھے نہیں بلکہ میرے پرانے اور سیدھے سادے لباس کو "ارے احمق لڑکی! مینا بازار میں یہ لباس؟" وہ بولی "مجھے اپنی یہ حماقت بہت عزیز ہے" میں نے اسے جواب دیتے ہوئے جلدی سے برقعہ پہنا۔ اس نے بھی بیزاری سے اپنا خوبصورت معطر برقعہ پہن ہی لیا اور ہم دونوں تانگہ میں بیٹھکر پردہ باغ کی طرف چل دئے۔

باغ کے راستے پر اور پھاٹک کے پاس مردوں کا ہجوم دیکھ کر میں حیرت زدہ اور پریشان ہو کر رہ گئی۔ اس میں کوئی ہندو نہیں، کوئی سکھ نہیں، کوئی یہودی نہیں، کوئی عیسائی نہیں، سب مسلمان ہیں۔ ہمارے اپنے بھائی جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی نظریں نیچی رکھنے کا حکم دیا ہے مگر اب "نہیں" آزادی مل چکی۔ اپنے وطن میں یہ وہ سب کچھ کیوں نہ کریں، جسے کرنے کو ان کا دل چاہتا ہے، چاہے وہ کتنا ہی برا ہو، مگر کسی کو انہیں روکنے کا کیا حق ہے؟ پھر ہمارا تانگہ پھاٹک سے کچھ فاصلے پر رک گیا۔ اور ہم نے اتر کر اندر جانا چاہا مگر تو بہ عورتوں کے اس ہجوم میں چلنا بھی دوبھر تھا۔ ہم کسی نہ کسی طرح اس حلقے کے بیچ درمیان پہنچ گئیں، جس کے دونوں طرف آوارہ نظریں تھیں اوباش چہرے اور چبھتے ہوئے ذلت آمیز فقرے!

"ٹکٹ کہاں ملے گا؟" میں نے ہر چہار جانب سے عورتوں کے دھکے کھا کر، بوکھلاتے ہوئے زرینہ سے پوچھا مگر اسے خود علم نہ تھا، اس نے اپنی ایک کلاس فیلو کی تلاش میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں جس نے اسے ٹکٹ آسانی سے دلوانے کا وعدہ کیا تھا اور چونکہ ہماری زندگی کے دن ابھی کچھ باقی تھے اس لئے وہ ہمیں ایک جگہ مل ہی گئی۔ اب زرینہ بی کیوں میرے ساتھ رہتیں؟ مجھے وہیں کھڑے ہو کر چند منٹ انتظار کرنے کے لئے کہہ کر وہ اپنی سہیلی کے ساتھ قہقہے لگاتی ہوئی چل دیں اور میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں کیا کروں؟ چند لمحے بدحواس رہنے کے بعد میں نے اپنے گردوپیش ہر ایک چیز کا جائزہ لینا شروع کیا۔ آخر اس طرح کھڑی کھڑی اور کیا کرتی۔ مجھے اپنے ہر طرف "رنگ و بو" کا ایک طوفان نظر آیا۔ یہ سب "مہذب" خواتین تھیں۔ کالی، سفید، سرخ، پیلی، اونچی نیچی، بوڑھی جوان، ہر طرح کی عورتیں ہی عورتیں جگمگاتے ہوئے لباس "میک اپ زدہ" چہرے جھلمل کرتے زیورات" یا اللہ! پاکستان میں اتنے امیر بستے ہیں۔ یہ تو مجھے آج ہی معلوم ہوا کاش کوئی غیر ملکی مہذب انسان یہ مناظر دیکھتا تو اپنے ملک میں جا کر ضرور پاکستان کی خوشحالی اور ان عورتوں کی "ترقی پسندی" کا ذکر کرتا، جو اپنے گھربار چھوڑ کر سارا سارا دن، باغوں میں بیٹھکر، قوم کے غم میں اودھم مچاتی اور قہقہے لگاتی، نیز گانے گاتی ہیں لیکن ـــــ یہ تو تصویر کا صرف ایک رخ ہے! پھر اچانک مجھے یاد آئیں اسی قوم کی وہ بدبخت و مظلوم بیٹیاں، جو اغیار کے پنجۂ ظلم سے نکل کر ساری اسلامی حکومت کے دامن میں پناہ ڈھونڈنے آئی ہیں، ان کی آبرو لٹ گئی اس تصور پر کہ وہ مسلمان ہیں، ان کے ہونٹوں کی پاکیزہ مسکراہٹیں چھن گئیں۔ اس لئے کہ ان ہونٹوں سے سوائے "لا الٰہ الا اللہ" کے کوئی اور کلمہ نہ نکل سکا، ان کی زندگی کا سکون کھو گیا۔ وہ اس خطے کے ایک کروڑ مسلمانوں میں رہنے کے باوجود خود کو دنیا میں بالکل تنہا پاتی ہیں۔ وہ بدقسمت لڑکیاں جو سرکاری اداروں میں اپنی بے بس زندگیوں کے دن پورے کر رہی ہیں۔ ان کی مثال موسم خزاں کے گرتے ہوئے خشک زرد پتوں کی سی ہے جو اپنی شاخوں سے جدا ہو کر ہوا کے تیز و تند جھونکوں میں جلنے کہاں کہاں سے پہنچ جاتے ہیں۔ ان کی تازگی ان کا حسن کچھ بھی تو نہیں رہتا ...... اور ...... ! پھر پیچھے سے عورتوں کا ایک ریلا آیا اور میں ان دھکوں میں اپنی جگہ سے ہٹ کر کافی دور پہنچ گئی۔ یہ پاکستان کی تعلیمیافتہ خواتین تھیں۔

جن کے نظم و ضبط کا یہ عالم ہے کہ کسی تقریب میں چلے جائیے ، ان دھکوں سے بچنا قریب قریب ناممکن ہے۔ ہائے اللہ زرینہ کیوں نہیں آئی ..... " میں نے انتظار کرتے کرتے تنگ آ کر سوچا لیکن —— " بھئی کیا تماشہ ہے یہ زرینہ تو مجھ سے تھوڑی ہی دور کھڑی گھبرائی ہوئی نظروں سے ہر طرف دیکھ رہی تھی۔ یقیناً میری تلاش میں ہے" پھر میں نے چلا کر اسے پکارا " زرینہ ..... زر ..... ی ..... ک۔ بھئی میں یہاں ہوں یہاں پھاٹک کے دائیں طرف "! لیکن میری آواز اس ہنگامے میں کہاں سنائی دیتی تھی۔ دو تین بار چلا کر اسے اپنے موجود ہونے کی اطلاع دے سکی، مجھے دیکھ کر بی زرینہ کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے اور پھر ایسا دل جلا دینے والا سوال " بجو تم کہاں چلی گئی تھیں؟ " ہونہہ جیسے یہاں مجھ جیسی صلح پسند لڑکی کے لئے اپنی مرضی سے چلنا یا اپنی جگہ کھڑے رہنا ممکن ہی تو تھا " اس کے ایسے نامعقول سوال کا میں کیا جواب دیتی۔ مارے حیرت اور غصے کے اسے دیکھ کر ہی رہ گئی —— زرینہ کو ٹکٹ مل گئے تھے ، ہم نے جلدی سے اندر پہنچنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں جس جس طرح اندر داخل ہونے والی عورتیں کچلی جا رہی تھیں اور جیسے جیسے " ہمت شکن " دھکے ہم نے کھائے ، ان کا ذکر بات کو بڑھا دے گا بس اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ ہم حد سے زیادہ تکلیف اٹھا کر اندر پہنچے ، اب ایک بات یہ بھی سوچنی پڑی کہ سیر کدھر سے شروع کی جائے یہاں پہنچ کر زرینہ صاحبہ تو مجھ سے بات کرنے کو بھی تیار نہ نظر آتی تھیں۔ چنانچہ وہ ہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا ۔ چند ہی منٹ بعد انہیں ان کی قدردان سہیلیاں اپنے ہمراہ لے گئیں اور میں اتنے بڑے مجمع میں خود کو تنہا پا کر احمق سی بن گئی ۔ وہ تو شکر ہوا کہ مجھے اپنی ایک عزیز مل گئی ۔ جو کسی زمانے میں میری بہت دوست تھی۔ لیکن اب خیالات کے اختلاف نے اسے مجھ سے دور کر دیا تھا۔ بہرحال اس وقت یہ لڑکی اور اسکی بہن مجھ مصیبت زدہ کو فرشتۂ رحمت معلوم ہوئیں پھر انہوں نے اپنی کچھ سہیلیوں سے بھی ملوایا اور اس طرح مجھے چند ساتھی مل گئیں ، پھر ہم نے مینا بازار کی دکانیں دیکھنی شروع کیں۔ سب سے پہلے سلائی اور کشیدہ کاری کے چند سٹال دیکھے یہ سب قیمتی چیزیں تھیں اور ان میں بیشتر صرف نمائش جنکی قدر ہمارے قوم کے امراء کا ایک محدود طبقہ ہی محسوس کر سکتا ہے۔ پھر کچھ دور چل کر کتابیں فروخت ہوتی دیکھیں ، ہم یہاں مطلب کی چیز سمجھ کر دیکھنے کے لئے آگے بڑھے۔ مگر وہاں تھا ؟ اخلاقی آوارگی کے معلم ترقی پسند ادب کی بہترین کتابیں فلمی رسالے ، ایکٹرسوں کی نیم عریاں تصویریں اور فلمی گانوں کی کاپیوں کا ایک بک ڈھیر ، جس میں سے ہمارے دیکھتے دیکھتے کئی کاپیاں خریدی گئیں۔ اس کے پاس ایک جگہ گراموفون ریکارڈ بجائے جا رہے تھے۔ وہی ریکارڈ جنہوں نے اپنے برے اثرات سے ہماری قوم کے ایک بڑے ، بہت بڑے حصے کی ذہنی حالت کو فضولیات میں الجھا کر رکھ دیا۔ لیکن ہماری قوم کی اکثریت ان میں کم سن بچے ، معمر آدمی اور نوجوان سب شامل ہیں سب کے سب ان گیتوں کے دیوانے ہیں۔ جن میں زندگی سے فرار ، اور فرائض سے غفلت کی تعلیم ملتی ہے ایک میز پر گراموفون اور بہت سے ریکارڈ رکھے تھے۔ دو تین لڑکیاں معزز خواتین یہ " خدمت " بڑی تندہی سے انجام دے رہی تھیں اسی لئے کہ گرد عورتوں کا ایک ہجوم تھا ، پھر ہم نے اور کئی چیزیں دیکھیں کئی دکانیں سامان آرائش کی بھی تھیں۔ جو کہ سب کا سب غیر ملکی چیزوں پر مشتمل تھا ۔ سینٹ لپ اسٹک ، کوتی کا پاؤڈر ، " پونڈز " کریم ، چند ایک پرس تھے ، کچھ چھوٹے بڑے کنگھے کیا یہ چیزیں بازار میں نہیں ملتیں ، جو یہاں ان کی فروخت کی ضرورت سمجھی گئی ؟ شہر میں بہت سی دکانوں پر یہ چیزیں مل سکتی ہیں البتہ ایک فرق ہے کہ بازار میں یہی چیزیں کچھ سستے داموں مل جاتی ہیں اور یہاں زیادہ قیمت پر بیچی جا رہی تھیں یہاں ایک جگہ تاش بھی کھیلا جا رہا تھا ، دوسری طرف چند چکر کھاتے ہوئے دیکھے ، جن کے مالک چند لڑکے تھے ایک جیپ کار ، اور دو چار اونٹ بھی دیکھے جن پر لڑکیاں اور عو

محترمہ ام سلمیٰ صبا صاحبہ

گلیاں اور گالیاں!

گلی کا نام زبان پر آتے ہی عجیب عجیب شاعرانہ کیفیتیں دل و دماغ پر چھانے لگتی ہیں۔ کبھی دنیا مجسم ہو کر گلی میں نظر آنے لگتی ہے تو کبھی عقبیٰ کے اسرار سے پردے اٹھیں گلیوں میں اٹھتے دکھتے ہیں اور ان گلیوں میں کچھ نظر نہ آنے والی زنجیریں بھی ہوتی ہیں کہ اگر کوئی قدم ان کی گھومن گھیریوں سے باہر نکلنا چاہے تو وہ بڑھ کر اسے اپنے حلقہ میں لے لیں اور ان میں ایسی کشش ہوتی ہے کہ میلوں پرے سے قدموں کو واپس گھسیٹ لاتی ہے اور ایک شہر تو ایسا سننے میں آیا ہے جس میں خدا جانے کتنے عجائبات موجود ہونگے مگر اس کی ہر گلی بھی پورا ایک عجائب گھر تھی اور جس شہر کی ایک گلی میں جیسیوں قیامتیں نمایاں اور پنہاں ہوں تو وہ پورا شہر خدا جانے کیا کچھ نہ حشر برپا کر سکتا ہوگا۔

اگر ہم گلیوں کا نام سنتے ہی شاعرانہ خواب نہ دیکھنے شروع کر دیں اور ان رنگین بادلوں کو آنکھوں پر سے ہٹا دیں تو پھر ایسی قیامتیں گردش کرتی نظر آئیں کی کہ ذہن مفلوج ہو جائے تو عین ممکن ہے کہ گلیوں کو ڈھونڈنا شروع کر دے۔ بھلا بتایئے تو سہی آپ کے نزدیک ان گلیوں کا سب سے بہترین مصرف کیا ہے۔ یہ خیال رہے کہ میں عورتوں کے نقطہ نظر سے پوچھ رہی ہوں۔ عورتوں کا ذکر آتے ہی بات بچوں پر آ پہنچتی ہے۔ بچوں کی پرورش کے سلسلے میں یہ گلیاں عورتوں کی بڑی مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ ابتدائی دنوں سے بچوں کے لئے پرورش گاہوں کا مطالبہ عورتوں نے اسی لئے نہیں کیا کیونکہ یہ فرض اور خدمت بے چاری گلیاں رہی ہیں۔ خاموشی کے ساتھ انجام دیتی چلی جاتی ہیں۔ اگر بچے روز روز ماؤں کو تنگ کریں۔ رو رو کر گلے میں دوپٹہ گھسیٹ لے جائیں۔ کپڑے سینے یا دھونے کے وقت وہ چاہیں کہ ماں گود میں لے کر ٹہلنا شروع کر دے۔ تو مائیں اپنی گود سے اتار کر اسے گلی کی گود میں پٹخ دیں گی اور اطمینان سے کام میں لگ جائیں گی ذرا بچہ گھٹنوں چلنے لگا نہیں کہ گلی اپنی آغوش شفقت ان کے لئے کھو ل دیتی ہے۔ پھر بچہ انتہائی فطری طریقہ پر وہ نئے نئے تجربات سیکھنا شروع کر دیتا ہے کہ ماہرین نفسیات لاکھ سر ماریں وہ فطری ماحول مہیا نہیں جو گلی چپ چاپ اور بلا معاوضہ فراہم کرتی ہے۔

ایک ننھے کو دیکھئے وہ چوسی ہوئی مسواک اٹھا لایا غالباً وہ اس سے فطری مناسبت رکھتا ہے۔ چنانچہ اس برش کو پا کر بہت ہی خوش ہو گیا۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی کہ رنگ کہاں سے لائے۔ نالی کے گاڑھے کیچڑ نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ اب وہ مسواک کو کیچڑ میں ڈبو ڈبو کر گھر کی دیوار پر کسی آئل پینٹنگ کی نقل اتارنے میں مصروف ہے۔ پاس ہی ایک بچی کیوں بیکار رہتی کیچڑ کی ملائمت اسے بھا گئی۔ اس نے چہرہ کی آرائش کی ٹھان لی۔ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے نالی کا غازہ منہ پر تھوپنا شروع کر دیا۔

گلیوں میں ہر قسم کے جانور بھی آزادانہ گھومتے پھرتے ہیں۔ مرغیاں۔ کتے بلیاں بطخیں گائیں بھینسیں۔ بچوں کو آنکھ کھولتے ہی ان سے خوب واقفیت ہو جاتی ہے کسی چڑیا گھر جانے کی ضرورت نہیں علم حیوانات کے تمام اسرار و رموز آہستہ آہستہ ان پر منکشف ہو جاتے ہیں یہ تجربات انکے لئے انسان کے اندر چھپے ہوئے حیوان سمجھنے میں بڑے کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ نہیں ان پر کھلتا ہے کہ صفائی پاکیزگی بے کار کی باتیں ہیں۔ خالص فطری اصول تو انسان آج کل جانوروں سے سیکھتا ہے کتے نالیوں سے پانی پیتے ہیں۔ ٹھنڈے ٹھنڈے کیچڑ میں لوٹتے ہیں۔ مرغیاں مزے سے گھوروں پر چہل قدمی کرتی ہیں۔ گوبر کرید کر بچے گلیوں میں بیٹھے یہ سب غور سے دیکھتے ہیں۔ پھر گھورے پر اپنے لئے کارآمد چیزیں تلاش کرتے ہیں۔ گوبر کے اپلے بناتے ہیں۔ گیلا پانی سے ہاتھ دھوتے ہیں۔ کرتے کے دامن سے ناک پونچھ کر قریب کتے کی پیٹھ پر سواری کی مشق کرتے ہیں۔ کیا ہمارے ملک کو فوجی سوا

روت نہیں -

ذرا زبان تتلانے لگی تو پہلے ابا جان پھر اماں جان گلی کے کلمہ ملام اور آداب کی مشق شروع کرا دیتی ہیں - جب وہ اپنی توتلی زبان میں ان بہنوں کو یاد کرتے ہیں تو ماں باپ خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتے - گالی کے علم میں ان کی ذہانت اور رندا داد جوہر گلیوں میں دن چراتے ہیں - نئی نئی گالیاں ایجاد ہوتی ہیں ان کے ترجمے اور تفسیریں بیان ہوتی ہیں - گالیوں کو باقاعدہ وظیفوں کی طرح ورد زبان رکھنے کی مشق بھی کی جاتی ہے اکثر تسبیح کی طرح رٹتے ہوئے سنا جا سکتا ہے بہار گالیوں کے راگ ہیں - گالی اور گلی گلی اور گالی - گلیوں کی رونق بچوں کے بول بنتے ہیں -

دیکھا آپ نے عورتوں کے لئے گلیاں کتنی اہمیت رکھتی ہیں بچوں کی پرورش گاہ ہیں - ان کی قدرتی تعلیم اور تربیت کا ذریعہ بہت بڑا ہے - یہاں نئی نئی گالیاں جنم لیتی ہیں - ان پر لب ہر تہذیب ہوتی ہے - گالیوں کے سیلاب اور طوفان گلیوں میں امڈتے ہیں - ذرے پھٹتے ہیں چھینٹیں اڑتی ہیں - بتائیے کون بچے اپنا دامن کانوں میں پھاہا دا - - - بیر لعینا ہی تو ممکن نہیں

عریاں لٹریچر - ریڈیو کے فحش گانوں پر تو خواہ مخواہ فحاشی کا الزام آتا ہے - خاصی ڈھکی چھپی چیزیں ہیں - چونکہ یہ خواص کے مشغلے ہیں - اس لئے عموماً اعتراض ہو جاتے ہیں - گالی کی سادگی اور بے ساختگی قابل داد ----- اور عوامی شے ہے - اس کے برخلاف بولنے کی کسی میں ہمت نہیں، عریاں لٹریچر اور فلمی گانوں کے خلاف ایک آدھ خطبہ دے دیا - چند خطوط اخبار میں شائع ہو گئے - چلئے فرض سے ادا ہوئے - اب حکومت جانے اور رسالے پڑھنے والے - اور فلمی گانے سننے والے جانیں - گلی گلی گھوم کر گالی چھوڑ دو کی تحریک چلانا اتنا سہل نہیں - یہ درد سری کس کے بس کی - گلی چھوڑ دیں گے - گالی نہیں چھوڑیں گے اس راہ سے ذرا گلی میں قدم دھر کے دیکھو - یہی گالیاں گلے کا ہار نہ ہو جائیں تو سہی ——

خدا کا قانون اٹل ہے اب بغیر نہیں آ سکتے - ورنہ حالت یہ ہے کہ آج کل گالیوں کے خلاف تحریک اٹھانے کے لئے ایک خاص پیغمبر کی ضرورت شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی ہے - ورنہ یہ فحش ترکیبیں اپنی گندگی - عریانی اور سڑاند یونہی پھیلتی، پھولتی اور پھبتی رہے گی - (شکریہ کوثر)

حاذق ہسٹریا پلز (گولیاں)

یہ مرکب گولیوں کی صورت میں خالص اور کمیاب بوٹیوں سے جدید طبی اصول پر تیار کی گئی ہیں جو ہسٹریا جیسے موذی مرض کو، جو ہماری نوجوان بہنوں میں آجکل عام ہو گیا ہے مفید اور کامیاب ہو چکی ہیں - علاوہ ازیں یہ دوا عورتوں کی دیگر شکایات، عصبی کمزوری، ضعف ہضم، اختلاج قلب کے لئے بھی مفید ہے اور بچوں کی مرگی کے لئے لاثانی دوا ہے!

قیمت چالیس گولی (ایک شیشی) پانچ روپے علاوہ محصول ڈاک

حاذق دواخانہ ، بندر روڈ ، کراچی

دن شکایتوں اور مایوسیوں کا اظہار نظر آئے گا جس کا اظہار وہ منہ سے نہیں کر سکتا۔ البتہ اس کے جسم کی چال ڈھال سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بچے میں ایک خاص قسم کا نرالا پن آگیا ہے۔ سینے کو چوڑا کر کے بیٹھنا بچے کی عام عادت ہو جاتی ہے۔ دودھ پیتے بچے میں ایسی چیز اکثر دیکھنے میں آتی ہے اور خاص کر اس وقت جبکہ ماں نے دودھ پلاتے پلاتے روک دیا ہو۔ ایسے بچے جو ماں کی محبت سے محروم رہ چکے ہوں وہ بھی ایسی حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں اور اگر دیکھا جائے تو ان کے جسم کا یہ پھیلاؤ صحت اور طبی لحاظ سے نہایت مفید ہے کیونکہ یہ چیز اس کے جسمانی اور دماغی توازن کو اصلی حالت پر قائم رکھتی ہے۔

بڑا ہو کر بچہ خفگی اور غصے کا اظہار جسم کے ذریعہ سے نہیں بلکہ بول چال سے کرتا ہے چونکہ اس میں سوچنے کی قوت بھی کافی حد تک بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے وہ موقعہ کے مطابق گفتگو کرنا سیکھتا ہے، ماحول کو اچھی طرح پرکھتا اور لوگوں کے دل و دماغ کو پڑھنے میں دلچسپی لیتا ہے۔

ننھے بچے میں منہ سے کاٹ کھانے کی عادت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ دانت نکال رہا ہو۔ اس وقت بچے کی عمر پانچ ماہ سے سات ماہ تک ہوتی ہے۔ بچہ چاہتا ہے کہ وہ سخت روٹی یا کسی اور سخت چیز پر اپنے دانتوں کے پٹھوں کو آزمائے تاکہ وہ مضبوط ہوں۔ اس زمانہ میں وہ سخت چیز کو کاٹ کر بڑا لطف اٹھاتا ہے۔ دودھ پیتا ہوا بچہ ماں کی چھاتی کو کاٹ لیتا ہے اور وہ اس عادت سے کبھی باز نہیں آتا۔ اگر اسے کاٹنے کیلئے ٹھوس خوراک نہ دی جائے ایسی حالت میں ماں کو بہت تکلیف ہوتی ہے اور وہ ناراض ہو جاتی ہے۔ اس طرح وہ بچے کو ضرور زور سے دھمکاتی ہے اور بچے میں کاٹنے کا خوف ہمیشہ کے لئے بیٹھ جاتا ہے۔ اکثر مشاہدہ سے ہمیں پتہ چلا ہے کہ مائیں عام طور پر بچے کو سزا دے کر کاٹنے سے روک دیتی ہیں جس کا اثر اس کی زندگی پر بہت برا پڑتا ہے۔ بچہ ضدی بن جاتا ہے اور اس کی عادت دور ہونے کے بجائے ابھرتی ہے۔ ماں اور بچہ کے تعلقات میں کشیدگی آجاتی ہے اور وہ ماں سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ دو تین سال کی عمر تک بچہ کسی سخت چیز کو نہیں کھا سکتا۔ اس لئے ماں کا فرض ہے کہ وہ اس عمر کے بچے کو سخت روٹی یا بسکٹ کھانے کے لئے مہیا کرے تاکہ اس کے دانتوں کے پٹھے مضبوط ہوں اور وہ کھانا کھانے کے جلد قابل ہو جائیں۔

ننھا بچہ جب چلنا پھرنا شروع کرتا ہے تو وہ آس پاس کی چیزوں کو ٹھوکر لگا کر بڑا لطف اٹھاتا ہے۔ ماں اکثر دفعہ بچے کی اس حرکت کو غصہ پر محمول کرتی ہے اس لئے وہ اس کی ٹانگوں کو زور سے پکڑ لیتی ہے اور پھر نہیں چھوڑتی یا پھر ذرا زور سے تھپڑ لگا کر چھوڑ دیتی ہے ایسا کرنے سے بچے کی ٹانگوں میں کمزوری پیدا ہونے کا خدشہ ہوتا ہے ماں کو چاہیئے کہ وہ بچوں کو آزاد چھوڑ دے اور ان کی ٹھوکر لگانے کی عادت کو دور کرنے کی کوشش نہ کرے تاکہ اس کی ٹانگوں میں مضبوطی پیدا ہو اور وہ اچھی طرح چلنا پھرنا سیکھ لے۔ بعض ایسے بچے دیکھنے میں آئے جو ماؤں کی لاپروائی سے کافی عرصہ تک چلنے پھرنے سے روکے رکھے اور ان کی ٹانگوں میں کوئی قوت پیدا نہ ہوئی۔

ننھے بچوں میں دو قسم کا خوف پایا جاتا ہے اور یہ ہے تنہائی اور اندھیرے کا خوف۔ تنہائی کے خوف کے ساتھ ساتھ بھوک لگنے پر خوراک نہ ملنے کا خوف بچے کو بے حد بیقرار کئے رکھتا ہے۔ سانس پھولنے کا بھی فکر اسی وجہ سے لگا رہتا ہے۔

اندھیرے کا خوف ننھے بچوں کے لئے نئی مصیبت کا باعث ہوتا ہے۔ اندھیرے میں وہ اپنی ماں کو دیکھ کر خوف کھانے لگتا ہے اور اسے طرح طرح کی ڈراونی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ تنہائی اس کے خوف میں اور اضافہ کر دیتی ہے۔ ایسی حالت میں بچہ خوف کھانے کا ذمہ دار ماں ہی کو ٹھہراتا ہے اور جب کبھی بچہ کو بستر پر سوئی یا کسی سخت چیز کے چبھ جانے سے تکلیف پہنچے تو وہ اپنی تکلیف کا باعث ماں کو تصور کرتا ہے اور آہستہ آہستہ ماں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا اور حتی الوسع اس سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ ماں کا فرض ہے کہ وہ بچے کو اندھیرے میں کبھی نہ چھوڑے تاکہ بچہ اس کے لئے مصیبت کا باعث نہ بنے۔

ایک ننھے بچے کا واقعہ ہے جو ابھی سات دن کا تھا اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اب کوئی رشتہ دار نہیں تھا جو بچے کی پرورش کا ذمہ لے۔ یہ نرسنگ ہسپتال میں نرسوں کی غیر معمولی توجہ کا

باعث بنا۔ ہر نرس کی کوشش یہی تھی کہ وہ بچے کو شفقت و محبت سے پالے تاکہ وہ ماں کی محبت سے محروم نہ رہے اور زندگی کی الجھنوں کا شکار نہ ہو۔ تین مہینے تک بچہ ہسپتال میں پڑا رہا اور اس کی ذہنی اور جسمانی نشوونما باقاعدہ ہوتی رہی۔ اسے تمام آسائشیں میسر تھیں۔ ہسپتال کا ہر فرد اسے دل سے چاہتا تھا۔ اگرچہ بچہ کسی پڑھے لکھے گھرانے سے تعلق نہ رکھتا تھا لیکن اس کی شخصیت سے غیر معمولی ذہنیت کا پتہ ملتا تھا۔ ہر شخص اس بات کا متوقع تھا کہ بچہ ہونہار اور ذہین ہوگا اور بعینہ ایسا ہی ہوا ابھی دو تین ہفتہ کا ہوگا کہ وہ بہت چوکنا اور ہوشیار نظر آتا تھا۔ پانچویں ہفتے میں وہ مسکراہٹ سے دوسروں کو پہچاننے لگا۔ آواز سن کر سر اٹھا اور غور سے آواز کی طرف دھیان دیتا تھا۔ تین مہینے کی عمر میں وہ ذرا منہ سے بھی آوازیں نکالنے لگا۔ جیسا کہ سمجھا، اس میں غیر معمولی ترقی ہوئی یہ بھی ہوا کہ بچہ ہشاش بشاش رہنے لگا اور اس کی ذہنی اور جسمانی نشوونما بخوبی ہوتی رہی اور چند مہینوں میں توانا اور مضبوط بن گیا۔

ساڑھے تین مہینے کی عمر میں اسے لاوارث سمجھ کر یتیم خانے میں بھیج دیا۔ اگرچہ یتیم خانے میں ایسے بچوں کے لئے تمام قسم کی ضروریات مہیا کی گئیں تھیں لیکن وہ ماں کی شفقت سے محروم رہنے لگا اور جلد ہی بالکل ناامید ہوگیا۔ اسی شفقت کی محرومی کے باعث اس کی صحت بھی خراب ہوتی گئی اور وہ بہت دبلا ہوگیا۔ چند دنوں میں اس کا چہرہ مرجھا گیا۔ کے علاوہ وہ ہر وقت سونے کا عادی بن گیا۔

یتیم خانے والوں نے بچہ کی یہ حالت دیکھ کر اسے ایک ... سپرد کر دیا تاکہ بچہ اپنی صحت کو پھر حاصل کر لے۔ پہلے کی طرح اس نے بھی بچہ کو محبت و شفقت سے پالنا شروع کیا اور اس کے لئے آسائشیں میسر کی گئیں۔ اس شفقت و ہمدردی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جلد ہی اپنی پہلی حالت پر آگیا اور خوش دل رہنے لگا۔

آپ نے دیکھا کہ ماں کی شفقت اور ہمدردی کتنی بڑی چیز ہے۔ شفقت اور ہمدردی کا برتاؤ بچہ کے لئے نعمت ہے۔ ننھے بچے کی شخصیت کی صحیح نشوونما اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ اسے شفقت سے محروم نہ رکھا جائے اور اس کے جذبات اور احساسات کو پروان چڑھنے کا پورا موقع دیا جائے۔

(شکریہ اردو سائیکولوجی)

نسوانی امراض کے لئے حاذق دواخانہ کی مایۂ ناز ایجاد

فیمیلن (نسائی خاص)

یہ گولیاں عورتوں کی پوشیدہ شکایتوں کو دور کرنے میں اکسیر ہیں۔ سیلان، ماہواری کی بے قاعدگی اور اسی قسم کی دوسری زنانہ شکایتوں سے پیدا شدہ جملہ نقائص کو دور کرنے میں اکسیر ہیں۔ استقرار حمل کو مدد دیتی ہیں، گویا عورتوں کے لئے ایک جنرل ٹانک ہے۔ جس کا متواتر استعمال عورتوں کے نظام عصبی کو درست کرتا ہے جن عورتوں کو اسقاط حمل کی بار بار شکایت ہوتی ہے انکے لئے بے حد مفید ہے۔ فی شیشی دو روپے بارہ آنے

حاذق دواخانہ صدر روڈ، کراچی نمبر ۱

Asmar
The TONIC FRUIT DRIN
REFRESHING
INVIGORATING
Excellent
with
SODA WATER
OR HOT OR
COLD WATER
اثمار
پھلوں کا
فرحت بخش اور مقوی
شربت۔ سوڈا واٹر یا ٹھنڈے
پانی میں استعمال کیجئے
حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی
HAZIQ DAWAKHANA KARACHI

1952 Regd. No. S. 1375

Monthly "MUSHIR" *Karachi*

Title Printed at Royal Printing Press, Karachi.

کراچی
مشیر
ماہنامہ
ستمبر
سنہ ۱۹۵۲ء
مت فی پرچہ
پاکستان ۰-۶-۰
بھارت ۰-۸-۰
ر ماہنامہ "مشیر" بندر روڈ، کراچی نمبر (۱)

ھدیۂ تبریک

آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا
اقبال

عید الضحیٰ کے موقع پر قارئین کی خدمت میں

اِدارۂ "مشیر" کی جانب سے!!

پاکیزہ ادب اور صحیح اسلامی مشورے لئے ہوئے

ماہنامہ مُشیر کراچی

فہرست مضامین — ستمبر ۱۹۵۲ء

جلد ——— ۳

شمارہ ——— 9

ترتیب دینے والے

● ——— عبد الغفور بیگ

● ——— محمود فاروقی

بدل اشتراک :-

پاکستان :- سالانہ ، تین روپے

پاکستان :- فی پرچہ ، چھ آنے

بھارت :- سالانہ ، ساڑھے چار روپے

بھارت :- فی پرچہ ، آٹھ آنے

[illegible] مشیر [illegible] کراچی [illegible] سے شائع کیا [illegible]

ہر کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ترقی پسندوں کی نئی پالیسی

ماضی اور حال کے پس منظر میں

۱۲ اور ۱۳ جولائی ۱۹۵۲ء کو کراچی میں ترقی پسند مصنفین کی دوسری سالانہ کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ان کی انجمن نے اپنا نیا منشور پیش کیا۔ ں منشور کو ادبی حلقوں میں عام طور سے "توبۃ النصوح" سے منسوب کیا جا رہا ہے اور بعض ادبی جرائد ترقی پسندوں کی اخلاقی جرأت کا پروپیگنڈہ کر رہے ب کہ انھوں نے بغیر کسی جھجھک کے اپنی غلطیوں کا اعتراف کر لیا ہے اور اب نئے منشور کے ذریعہ ان کی تلافی کرنا چاہتے ہیں اور وہ لوگ جو ترقی پسندوں ے انکے پہلے منشور کی بنا پر خفا ہو گئے تھے یہ کہتے نظر آ رہے ہیں کہ اگر ترقی پسندوں نے نئے منشور پر مخلصانہ عمل کیا تو ہم دوبارہ ان کے ساتھ شریک وجائیں گے —— لیکن اس کے برعکس ادبی حلقوں میں ایک بڑی تعداد ایسی بھی ہے جو یہ سمجھتی ہے کہ نیا منشور محض دکھلاوا ہے ترقی پسند نہ تو بدلے یں اور نہ ہی بدل سکتے ہیں یہ تو محض عوام کو دھوکہ دینے کی ایک چال ہے۔

اس موقع پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان حقیقی اسباب کی نشان دہی کر دی جائے جن کی وجہ سے ترقی پسند مصنفین اس "توبہ" پر مجبور ہو گئے ن اسباب کو جاننے کے لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے ان کی ان غلطیوں کا ایک مختصر سا جائزہ لے لیں جن کے دوبارہ نہ کرنے کا وہ اب وعدہ کر رہے ہیں۔

—— • • • ——

ہمارے ترقی پسند ادیب جب پاکستان آئے تو انھوں نے یہ محسوس کیا تھا کہ اگر اس وقت وہ پورے زور شور کے ساتھ اپنے عقائد کی تبلیغ شروع ردیں تو بغیر کسی دقت کے وہ پاکستانی فکر پر چھا جائیں گے چنانچہ انھوں نے اپنا سب سے پہلا منشور اس انداز میں پیش کیا جیسے وہ میدان جنگ میں "رجز" پڑھ رہے ہوں۔ بلا شبہ ان کا یہ منشور انکے حقیقی جذبات اور احساسات کا آئینہ دار تھا اس منشور کے ہر لفظ میں مارکس اور لینن کا نفس ناطقہ اشتراکی عقائد کی علی الاعلان تبلیغ کر رہا تھا۔ چنانچہ اپنے پہلے منشور (منظورہ آل پاکستان کانفرنس انجمن ترقی پسند مصنفین ۱۱، ۱۲ و ۱۳ نومبر ۱۹۴۹ء منعقدہ لاہور) میں اپنے ادب کی اساس کا اعلان کرتے ہوئے انھوں نے کہا۔

> "ہم ترقی پسند ادیب ادب کو زندگی کے بدلنے اور بہتر بنانے کا ذریعہ اور وسیلہ تصور کرتے ہیں ہم ادب برائے زندگی ادب برائے جدوجہد اور ادب برائے انقلاب کے نظریئے کو اپنی تحریک کا سنگ بنیاد خیال کرتے ہیں۔ ہماری فکری اساس اشتراکی حقیقت پسندی ہے —— —— ہمارے نصب العین کی کامیابی اسی وقت ممکن ہے کہ ہم موجودہ سرمایہ داری جاگیر داری نظام کو توڑ کر محنت کشوں کی قیادت میں عوامی جمہوری نظام قائم کریں جو اشتراکی حقیقت کی تعبیر کرے"

اس اشتراکی حقیقت پسندی " کے لئے انھوں نے اپنے اس منشور کے ذریعہ پورے ماحول کے خلاف جو اعلان کیا تھا وہ ظاہر ہے صرف

ن کھائے بل بوتے کی بات نہیں تھی ملکان کے پیچھے پائیے دہشت پسناہ بھی تھے جن کا حوالہ دیکر وہ اپنے مخالفین کو مرعوب کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ
نھوں نے اس منشور میں اپنے حمایتوں کی بھی واضح طور پر نشان دہی کی وہ کن کے سہارے یہ جنگ جیتنا چاہتے ہیں۔

"ہمارے دشمن ہم پر جانب داری کا الزام لگاتے ہیں وہ کہتے ہیں تمہاری تحریروں میں سیاسی رجحان پایا جاتا ہے
ہمیں اس کا اعتراف ہے ہم حیات و موت کی جنگ میں جانب دار ضرور ہیں ہماری تحریروں میں
جمہوری رجحان پایا جاتا ہے اور ہم سچائی کا پروپیگنڈہ کرتے ہیں ہمیں اس بات پر فخر ہے کیونکہ ——
اس جدوجہد میں ہمیں اپنی ہمسایہ اشتراکی ریاست سوویٹ یونین کی راہ نمائی حاصل ہے ——
ہمارے ساتھ جمہوریہ چین کے سورما ہیں —— جیت ہماری ہوگی"

اس جنگ میں اپنی فتح و کامرانی کا ان کو اس قدر یقین تھا کہ انھوں نے اپنے "دشمنوں" سے کسی قسم کے سمجھوتہ اور مصالحت کا دروازہ کھلا نہیں رکھا

"ہم اپنے نصب العین پر بے باکی سے قائم رہیں گے اور ترقی پسند ادب کے دشمنوں سے کوئی
سمجھوتہ نہ کریں گے، تذبذب اور سمجھوتہ بازی سے ہماری ادبی تحریک کو سخت نقصان پہنچے گا"

اس منشور میں اُنھوں نے اپنے "دشمنوں" کی فہرست کا بھی اعلان کر دیا تھا کہ ان کے دشمن کون ہیں جن سے وہ کھلی جنگ لڑنا چاہتے ہیں

۱۔ ادب برائے ادب کے پرچارک —— جو پاکستان کے حکمران طبقے کے تنخواہ دار
اور ڈھنڈورچی ہیں۔
۲۔ ادب برائے پاکستان کے نقیب —— جو اپنی تحریروں میں انتہائی گھناؤنی اور
زہریلی قسم کی وطن پرستی کی تبلیغ کرتے ہیں
۳۔ انفرادیت پسند —— جو فرائڈ پرستی کی تعلیم دیتے ہیں۔
۴۔ اسلامی ادب کے علمبردار —— جو اسلامی ادب کے نام پر رجعت پرستی کا پرچار کرنے
والے ہیں اور لوگوں کے مذہبی جذبات سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اس کے علاوہ اُنھوں نے اسلامی ادب کی تحریک کے متعلق خطرے کی سرخ جھنڈی اس طرح ہلائی :-

"یہ تحریک انتہائی نقصان دہ تحریک ہے اس سے ہماری جمہوری تحریک اور حالات کو بہتر بنانے کی
عوامی جدوجہد کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے ہم اس کے خلاف پوری مستعدی سے
جدوجہد کریں گے"

اپنے دشمنوں کے اس تعارف کے بعد ترقی پسندوں کا منشور ان سب کے متعلق مجموعی حیثیت سے تبصرہ کرتا ہے۔

"اس گروہ کے تمام ادیبوں کا ادب مکاری، جھوٹ اور دغا بازی کا ادب ہے۔ انسانیت، جمہوریت
اور اس کے دشمنوں کا ادب ہے عوام سے غداری کرنے والوں کا ادب ہے۔ پست ہمتی یاسیت
وہم پرستی اور اخلاقی پستی کی تلقین کرنے والوں کا ادب ہے —— ہمارا حکمران طبقہ
ان ادیبوں کو سراہتا ہے اور ان کی رجعت پرست تحریروں کی ہمت افزائی کرتا ہے۔

———•••———

ان تقریروں اور تحریروں سے قطع نظر جنھیں ترقی پسندوں نے اپنے اس منشور کی روشنی میں اب تک پیش کیا ہے صرف اس منشور پر نظ

واضح طور پر ان غلطیوں کا تعین ہو جاتا ہے جن پر آج وہ شرمندگی اور اعتراف جرم کی اداکاری دکھلا رہے ہیں اور اپنی اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے توبہ کا اعلان کر رہے ہیں ان غلطیوں کی فہرست حسب ذیل ہو سکتی ہے۔

۱۔ ادب کے ذریعہ سیاسی رجحانات کی پرورش

۲۔ روس اور چین سے کمک حاصل کرنے کا اعلان

۳۔ عدم تعاون و عدم اشتراک کی جارحانہ پالیسی۔

۴۔ موجودہ نظام کو توڑ کر محنت کشوں کی قیادت میں اشتراکی نظام کے لئے عملی جدوجہد

اب ذرا ان غلطیوں پر ایک نظر ڈالیے اور سوچیے کہ یہ غلطیاں کیا ایسی ہی معمولی اور غیر اہم غلطیاں ہیں جو ہمارے ان معصوم دوستوں سے اضطراراً سرزد ہو گئی تھیں اور جن کا تعلق ان کے بنیادی عقائد سے اتنا معمولی اور کمزور ہے کہ وہ ان غلطیوں سے بری الذمہ ہوتے ہوئے اپنے عقائد پر قائم رہ سکتے ہیں ——— ظاہر ہے کہ ان غلطیوں کی حیثیت کسی معمولی فروگذاشت کی سی نہیں ہے بلکہ ہر واقف کار اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ غلطیاں تو ان غلطیاں ہیں جن پر پورے اشتراکی نظام کی عمارت کھڑی ہوتی ہے یہ وہ ستون ہیں جن کے بغیر کریملن کی چھت کسی صورت بھی تعمیر نہیں ہو سکتی ہے جتنے ملکوں میں بھی اشتراکی انقلاب برپا ہوا ہے اس کے پیچھے کام کرنے والے محرکات بجز ان "غلطیوں" کے اور کیا تھے۔ ان "غلطیوں" کو ہمارے ترقی پسند دوست غیر منقسم ہندوستان میں ایک عرصہ تک پرورش کرتے رہے ان کے شاعروں اور ادیبوں نے اپنی پوری توانائی صرف کر کے ان غلطیوں کی آبیاری کی ان کو اپنا خون دے دے کر رنگ اور تحریک بخشا انہی "غلطیوں" سے ان کا ماضی روشن ہے اور انہی "غلطیوں" کے ساتھ ان کا مستقبل بھی وابستہ ہے ——— یہ تو غلطیاں نہیں بلکہ ان کے اپنے سوچے سمجھے وہ معتقدات ہیں جن کی اساس پر وہ اپنے اشتراکی عمل کو پروان چڑھا رہے تھے کوئی بھی سچا اشتراکی ان "غلطیوں" سے دست بردار نہیں ہو سکتا کیونکہ ان سے دست برداری کے معنی ذہنی خودکشی کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں۔

اس حقیقت کے ہوتے ہوئے یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان کے ترقی پسند مصنفین نے اپنے معتقدات سے پوری دیانتداری اور سچائی کے ساتھ توبہ کر لی ہے اور انھوں نے اپنے محضر نامۂ قتل پر بہ رضا و خوشی دستخط کر دیئے۔ آپ ابتک کے پندرہ سولہ سالہ ترقی پسند ادب کو اٹھا کر دیکھ جائیے اس میں بجز ان "غلطیوں" کے اور کچھ ملے گا ہی نہیں اب اگر وہ اپنے ادب کو ان سے پاک کئے دیتے ہیں تو بیان کرنے کے لئے ان کے پاس آخر رہ کیا جائے گا۔ کیا وہ اس توبہ کے بعد ادب برائے ادب والوں کی صف میں شامل نہیں ہو جاتے لیکن انتہائی تعجب ہے کہ ترقی پسند مصنفین نے ان غلطیوں کا اعتراف کیا اور آئندہ ان کی تلافی کرنے کا وعدہ کیا اور اس سے زیادہ تعجب اس بات پر ہے کہ انکے کیمپ کے کسی آدمی نے بھی اب تک اس پالیسی کی کوئی مخالفت نہیں کی ان کے کسی انتہا پسند کارکن نے بھی اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کی۔ اور نہ ہی ان کی کوئی فارورڈ بلاک انجمن وجود میں آئی بلکہ اس کے برعکس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب نے ایک سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت اس گریز کو قبول کر لیا ہے۔

ان کے اس نئے منشور یا توبہ نامہ کے پیچھے کام کرنے والے اصلی محرکات کو جاننے کے لئے ضروری ہے کہ ہم پاکستان کے پچھلے چار سال کے حالات کا ایک سرسری نظر میں مطالعہ کریں اور ساتھ ہی ساتھ ترقی پسند پالیسی کے سمجھنے کی کوشش کریں۔

جس وقت ترقی پسند مصنفین نے اپنا نیا دستور مرتب کیا تھا اس وقت وہ اپنے مجاہدانہ جوش میں پاکستانی عوام کے احساسات کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکے تھے ——— چار سال پہلے پاکستان کی عوامی فکر بظاہر اس قدر منتشر اور پراگندہ نظر آتی تھی کہ ہر گروہ بڑی آسانی کے ساتھ اس بات کی توقع رکھ سکتا تھا کہ اگر وہ فراست سے کام لے تو عوام کے ذہن کو اپنے لئے الاٹ کرا سکتا ہے لیکن اس امکان کے ساتھ ساتھ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان

کے عوام کچھ ایسے خالی الذہن بھی نہیں تھے کہ بغیر کسی دقت کے ہر نو وارد اس خالی مکان میں گھس کر اقامت پذیر ہو جائے اور اس پر اپنی ملکیت کی تختی لگا دے ـــــــ پاکستان کے عوامی ذہن میں توحید، رسالت اور آخرت کے حقائق ایک عرصہ سے رچے بسے تھے ضرورت صرف ان کی مناسب تہذیب و تربیت کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہزارہا معاشی پریشانیوں کے باوجود انکے اندر طبقہ وارانہ تعصبات اپنا سر نہیں اٹھا سکے۔ ہمارے ترقی پسند دوستوں کے مطالعہ و مشاہدہ کی یہ کمزوری تھی کہ انھوں نے ان بنیادی حقائق کو واقعاتی اہمیت نہیں دی اور سطح پر نظر آنے والے معاشی بحران کو دیکھ کر یہ توقع قائم کر لی کہ وہ طبقہ وارانہ ادب کے ذریعہ اپنے مقاصد کے لئے آسانی سے زمین ہموار کر لیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے حکمران طبقہ کی غیر منصفانہ روش اور ملک کے پراگندہ اور اُلجھے ہوئے نظم و نسق نے ہمارے عوام کو اس قدر بوکھلا دیا تھا کہ اگر ان کے ذہن میں اسلامی قدریں پہلے سے موجود نہ ہوتیں تو معمولی سی کشمکش کے بعد ترقی پسندوں کی توقعات پروان چڑھ جاتیں اور تیزی سے ملک میں اشتراکی الحاد جڑ پکڑ لیتا لیکن اسلام کے بنیادی عقائد نے ایسا نہیں ہونے دیا اور پھر دوسری طرف ٹھیک وقت پر ملک کے اسلام پسند دانشوروں نے ان عقائد کو عملی سانچے میں ڈھالنے کا کام شروع کر دیا اور آہستہ آہستہ انھوں نے عوام کی اجتماعی خواہش کو ایک منظم اور مؤثر جدوجہد کی صورت میں بدل دیا۔

اسلامی نظام کے احیا کی یہ عوامی جدوجہد زندگی کے کسی ایک گوشہ میں محدود نہیں رہی بلکہ اس نے رفتہ رفتہ زندگی کے ہر پہلو کا بڑی سرعت سے احاطہ کر لیا۔ چنانچہ نئے حکمرانوں، اشتراکیت پسندوں، سرمایہ داروں روایتی مذہبیت کا ڈھونگ رچانے والوں کی شدید مخالفت کے باوجود زندگی کے ہر گوشہ میں یہی خدا پرستانہ فکر نکھرتی چلی گئی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ اس ہمہ گیر تحریک سے ادب اپنا دامن بچا لے جاتا۔ ادبی حلقوں میں بھی اس ابھرتی ہوئی فکر نے اپنا پرتو ڈالا اور بتدریج ان حلقوں سے لکھنے والے ٹوٹ ٹوٹ کر ادب کے ایک نئے زاویۂ نگاہ پر جمع ہوتے چلے گئے اس طرح ملک کے تمام ادبی حلقوں میں اسلامی ادب اور غیر اسلامی ادب کی کشمکش پیدا ہو گئی۔

―――― ••• ――――

ہمارے حکمران شروع ہی سے یہ نہیں چاہتے تھے کہ پاکستان میں کوئی صحت مند خدا پرستانہ نظام قائم ہو بلکہ ان کی یہ خواہش تھی کہ وہ لچکیلا نظام تیار کر کے عوام پر مسلط کر دیں جس کے اندر اسلام، سرمایہ داری اور اشتراکیت سب کے لئے گنجائش نکل آئے لیکن اللہ نے ہمیشہ ان کی اس چال کو ان پر ہی الٹ کر رکھ دیا اور وہ اپنی اس کوشش میں ابتک اسلام کی عوامی تحریک سے شکست اٹھاتے رہے۔

اب جبکہ پاکستان کی عوامی جدوجہد قرار داد مقاصد کے مرحلہ کو کامیابی سے عبور کرتے ہوئے اسلامی دستور کی صورت گری کے قریب آ رہی ہے ہماری نامہربان قیادت برابر اس امر کے لئے کوشاں ہے کہ کسی طرح اسلامی نظام کی اس تیز و تند جدوجہد کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر دے۔ ہماری قیادت کے لئے ابتک سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ اس کے پاس ایسے قلم کار موجود نہیں تھے جو اس فکری انقلاب کا منہ موڑ سکیں جسے اسلام پسند صحافیوں اور ادیبوں کا قلم تیز سے تیز تر کئے جا رہا تھا۔ کامیابی کے لئے ضروری تھا کہ حکمران طبقہ اسلامی افکار کے خلاف کرایہ کے صحافیوں اور ادیبوں کی خدمات سے فائدہ اٹھائے۔ چنانچہ اس نے ابتدائے کار کیلئے نقاب پوش صحافیوں کا ایک گروہ فراہم کر لیا جو برابر اسلامی اقدار کے خلاف اسلامی اصطلاحات میں ٹھنڈی جنگ لڑ رہا ہے۔ لیکن یہ جنگ صرف صحافت کے محاذ پر ہی جیتی نہیں جا سکتی۔ اس لئے اس بات کی باقاعدہ کوششیں جاری ہیں کہ اسلامی ادب سے اختلاف رکھنے والے تمام ادیبوں اور قلم کاروں کو اس محاذ پر جمع کر دیا جائے اور ان سے ادب کی ہر صنف میں پوری طرح کام لیا جائے تاکہ عوام کے ذہن سے اسلامی افکار کے نقوش کو دھندلا کیا جا سکے۔

―――― ••• ――――

اس دوران میں ہمارے ترقی پسند ادیب بھی برابر یہ محسوس کر رہے تھے کہ پاکستان میں حکومت کے علاوہ ان کے سب سے زیادہ خطرناک دشمن اسلام پسند اہل قلم ہیں اور ان کو اس بات کا بھی پورا یقین ہو چلا تھا کہ جب تک اسلامی احیاء کی اس ہمہ گیر تحریک کو ختم نہیں کیا جاتا اس وقت تک وہ ا

سر نہیں جما سکتے۔

دستور سازی کے اس نازک موقعہ پر ترقی پسندوں کے لئے مفید ترین راہ یہی ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے سب سے بڑے مخالف محاذ کو توڑنے کیلئے دوسرے چھوٹے چھوٹے دشمنوں سے وقتی مفاہمت کر لیں کیونکہ وہ اس بارے میں پوری طرح مطمئن ہیں کہ اگر کسی بھی مرحلہ پر اسلامی تحریک کو کمزور کر دیا جائے تو پھر موجودہ قیادت اور دوسرے نقاط نظر رکھنے والے ادارے ان کی انقلابی جدوجہد کے مقابل نہیں بن سکتے۔

چنانچہ اس موقعہ پر انھوں نے اپنی نئی پالیسی کے تعین میں اس مفاد کو سب سے زیادہ اولیت دی اور اس کی خاطر انھوں نے اپنے بنیادی تصورات تک کو "غلطی" قرار دینے میں تامل نہیں کیا اور توبہ واستغفار کرتے ہوئے انھوں نے اس اعلان جنگ کو اپنے نئے منشور کے ذریعہ واپس لے لیا جو وہ سنہ ۱۹۴۹ء کے منشور میں حکومت کے خلاف دے چکے تھے

اس نئی تبدیلی کے پیچھے سب سے زیادہ اہم پارٹ جس گروہ نے انجام دیا ہے وہ وہی نقاب پوش صحافیوں کا گروہ ہے جو عوام کے خلاف سرکاری چھاپہ ماراد بی فوج کا کام انجام دیتا رہا ہے۔ اس گروہ نے ترقی پسندوں کی دوسری سالانہ کانفرنس کے اخراجات کیلئے دوڑ دھوپ کی ہے ان کے اجلاسوں کی سرپرستی فرمائی ہے۔ ان کی انجمن کو غیر سیاسی قرار دینے کے لئے قانونی پیروی کی ہے اور حکمران طبقہ اور ان کے درمیان مفاہمت و مصالحت کے فرائض انجام دینے میں ابتک برابر مصروف ہے۔

حالات وواقعات کے اس عمود کو دیکھتے ہوئے یہ بات کسی طرح بھی نہیں کہی جا سکتی کہ ترقی پسند اپنے نئے منشور کے اعلان میں مخلص اور نیک نیت ہیں ان کا نیا منشور ایک خالص اشتراکی چال ہے جو وہ عوام کو بہکانے کے لئے چل رہے ہیں۔ اس منشور میں غلطیوں کے اعتراف کو ہم بجز "ادبی تقیہ" کے اور کچھ نہیں سمجھتے اور تمام سلیم الطبع اہل قلم سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس چال میں آگر بڑھتے ہوئے عوامی رجحانات سے خیانت نہیں کرینگے اور اپنا پورا زور غیر سرکاری ادیبوں اور نام نہاد ترقی پسندوں کے اس ناپاک گٹھ جوڑ کے خلاف استعمال کریں گے تاکہ اس ملک میں سچے خدا پرستانہ اسلامی نظام کا خاکہ وجود میں آسکے اور عوام اپنی مصیبتوں کی سیاہ رات کے بعد مسرتوں کی مبارک صبح سے روشناس ہو سکیں۔

"فاروقی" یکم ستمبر ۵۲ء

ہم مطالبہ کرتے ہیں!

کہ دستور ساز اسمبلی پاکستان کا نیا دستور سنہ ۱۹۵۲ء کے ختم ہونے سے پہلے بنا دے، جس میں حسب ذیل امور کی قطعی صراحت ہو!

نمبر ۱ ملک کا قانون اسلامی شریعت ہوگی۔

نمبر ۲ کوئی ایسی قانون سازی نہ کی جائے گی جو شریعت کے احکام یا اصول کے خلاف ہو۔

نمبر ۳ تمام ایسے قوانین کو منسوخ کیا جائیگا جو شریعت کے احکام یا اصول سے متصادم ہوں۔

نمبر ۴ حکومت کا یہ فرض ہوگا کہ ان برائیوں کو مٹائے جنہیں اسلام مٹانا چاہتا ہے اور ان تمام بھلائیوں کو فروغ دے جنہیں اسلام فروغ دینا چاہتا ہے۔

نمبر ۵ لوگوں کے شہری حقوق (تحفظ جان و مال، آزادی تحریر و تقریر، آزادی اجتماع اور آزادی نقل و حرکت) کو انکا جرم کھلی عدالت میں ثابت کئے بغیر اور ان کو صفائی کا موقع دیئے بغیر سلب نہ کیا جائیگا۔

نمبر ۶ لوگوں کو حق ہوگا کہ انتظامیہ یا مقننہ اگر اپنے حدود سے تجاوز کرے تو وہ ملک کی عدالتوں سے چارہ جوئی کر سکیں۔

نمبر ۷ عدلیہ انتظامی حکومت کی مداخلت سے آزاد ہوگی

نمبر ۸ حکومت اس بات کی ضامن ہوگی کہ ملک میں کوئی شخص بنیادی ضروریات زندگی غذا، لباس، مکان، علاج اور تعلیم سے محروم نہ رہے۔

—— ان امور کی صراحت کے بغیر کوئی دستور ہمارے لئے قابل قبول نہ ہوگا!

حسان کلیمی •

جہاں میں انقلاب آئے

رفیقو! چشمِ پُرنم سے لہو بن کر نہ ٹپکے دل
——— تو پھر کیا انقلاب آئے
بنے دنیا تمھاری کشتیٔ امید کا ساحل
——— تو پھر کیا انقلاب آئے

ردائے انقلابیت پہ خوں کے داغ کھلتے ہیں
نہیں اچھی ہوا اس پر ذوقِ آسائش کی گلکاری
نیامِ ریشمیں کو تیغ جوھر دار گر چھوڑے
تو پھر خارا شکن ہوتی ہے اسکی ضربِ کاری
تمھاری آہِ سوزاں سے جو خاکستر نہ ہو باطل
——— تو پھر کیا انقلاب آئے

جنوں کی آبلہ پائی کو تسکیں دے سکے جو اطلس و کمخواب کی نرمی
تو خوں آشام دشتِ ابتلاؤ آزمائش کے نکیلے خار کیا ہونگے
خدا کے چاہنے والے جو کچھ کاغذ کے پھولوں سے زمانہ میں بہل جائیں
تو گل اندام حوروں کے حنائی دستِ نازک میں مہکتے ہار کیا ہونگے
رفیقو! عشرتِ فانی کو ٹھکرا تے بڑھو آگے کہ دیکھو آگئی منزل
جہاں میں انقلاب آئے، جہاں میں انقلاب آئے ———

———•••———

محمد حمید اللہ صدیقی •

اُردو ادب میں اسلامی رُجحانات (اسلامی ادب)

(۴)

بہرکیف شعر و ادب کے اس ذخیرے میں معائب اور محاسن دونوں ہیں۔ سب سے پہلے معائب کو لیجئے۔ شاعری اور افسانہ نگاری دونوں میں ابتداء ہی سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر یا ادیب فلاں اخلاقی یا معاشرتی درس دے رہا ہے اسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ ادب زیادہ تر بلکہ مکمل طور پر ادب برائے تحریک ہے، تحریک کے مقاصد خواہ کتنے ہی اعلیٰ و ارفع کیوں نہ ہوں زبان شعر و ادب میں انہیں اس طرح سمو دینا لازم ہوتا ہے کہ تصورات کی بلندی کے ساتھ ادبیت کی چاشنی بھی قائم رہے۔ اسلام پسند ادیبوں میں اکثر اس توازن کو نباہ لے جاتے ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو تبلیغ و تدریس کی رو میں بسا اوقات یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ شعر و ادب کی زبان میں کہہ رہے ہیں اور یہیں شعر و ادب کی گردن پر چھری چل جاتی ہے غالباً اسکا سبب یہ ہے کہ ان لکھنے والوں میں خاصی تعداد نو مشق نوجوانوں کی ہے جو زندگی کے مختلف مشاغل میں مصروف ہیں اور تحریک سے متاثر ہونے کی بدولت یا اپنی گری پڑی ادبی صلاحیت اور ذوق کو پورا کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں یہ تحریک سے متاثر ہیں مگر تحریک کے مخصوص انداز فکر کو اپنا نہ سکے ہیں بعض نے انداز فکر پا لیا ہے مگر فکری گہرائی نہیں حاصل کر سکے۔ ان میں جذبات زیادہ ہیں۔ جوش و خروش بہت ہے لیکن تفکر کم ہے وہ فکر کم کرتے ہیں لکھتے زیادہ ہیں اور اسی وجہ سے صفِ شعر و ادب پر بھی سرگرم اور پر جوش مگر بے مغز مبلغ زیادہ نظر آتے ہیں پر مغز اور وسیع النظر ادیب کم، دوسری قسم ان ادیبوں کی ہے جو کسی زمانے میں ترقی پسند رہے ہیں اور غالباً اشتراکیت سے متاثر بھی۔ اب ایک نئی تحریک کے علمبردار بنے ہیں۔ یہ اپنے افسانوں اور شاعری میں کچھ بجھے بجھے سے نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس موڑ نے ایک طرف تو ان کے سابقہ آزاد ذہن و دماغ کو Brake سا لگا دیا جس سے وہ ایک شدید جھٹکے کے ساتھ رک گئے۔ اور پھر کچھ سوچ کر چل پڑے ایک ایسی سمت پر جہاں قدم قدم پر بندشیں ہیں اور ذہن و دماغ کے ساتھ نوکِ قلم بھی بہت سنبھل سنبھل کر چل رہا ہے۔ ان بندشوں اور پابندیوں کو انہوں نے قبول تو کر لیا ہے مگر ان پر قابو نہ پا سکے اسی لئے وہ زورِ بیان اور شگفتگی نہیں ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انکی شگفتگی اور زورِ بیان کا تصور ہی بدل گیا ہو اور قارئین میں ابھی وہی پچھلا تصور موجود ہونے کی بدولت انھیں ابھی اسی چیز کی تلاش ہو جس کی یہاں سرے سے افزائش ہی بند کر دی گئی ہے۔ ایک تیسری قسم ان شاعروں اور ادیبوں کی ملتی ہے جو اپنے ماضی کے اثرات سے بالکل آزاد ہو چکے ہیں۔ حال کے تقاضوں اور ضرورتوں کو پوری طرح سمجھتے ہیں اور انہیں کے مطابق مستقبل کے خاکے مرتب کرتے ہیں اس کے ساتھ ہی انہیں زبان و قلم پر پوری طرح قابو حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ادبیت کے جملہ تقاضوں کو بڑی حد تک پورا کرتے ہیں۔ ان تین مختلف معیار کے امتزاج نے بیک وقت ابتدا ارتقا اور انتہا کے نقشے ایک صفحہ پر کھینچ دیئے ہیں۔

گزشتہ پندرہ بیس سال کے عرصے میں زبان و ادب میں نئے موضوعات و تخیلات کے ساتھ ساتھ نئے محاورات، استعارات اور ترکیبیں بھی داخل ہوئیں۔ جن میں کچھ تو اس طرح کھپ گئیں کہ اپنی ہی زبان کی چیزیں معلوم ہونے لگیں لیکن کافی حصہ ایسا بھی آگیا جو بدنما پیوند ہو کر رہ گیا۔ ترقی پسند ادب نے ایک بڑی غلطی یہ بھی کی

ہ مغربی تصورات کے ساتھ ساتھ مغربی زبان کے محاورات، استعارات
وغیرہ کا ترجمہ لفظی اور معنوی دونوں لحاظ سے کرکے اردو زبان میں
سمویا۔ یہاں تک تو غنیمت تھا لیکن اسکے ساتھ لازم تھا احتیاط
برتی جاتی اور بھونڈے اور بے جان ترجمے چھانٹ کر الگ کردیئے
جاتے لیکن نقالی کے اندھے جوش میں یہ ہوش کسے تھا۔ اسلام پسند
شاعروں اور ادیبوں کا بیشتر حصہ بھی انھیں کمزوریوں میں گرفتار ہے۔ اور
ایسے ثقیل بھونڈے اور سقیم محاورے وغیرہ شامل کرلیتا ہے جو اسکے
شعر و ادب کے سنجیدہ ماحول میں بری طرح کھٹکتے ہیں اور اس سے کسی
طرح مناسبت نہیں رکھتے۔ شاعری میں اکثر بحر و وزن کی اہمیت کو
بھول جاتے ہیں جس کی وجہ سے پورے کا پورا شعر چوپٹ ہو کر رہ
جاتا ہے۔

موضوعات کی تشریح میں تمام ان کی توضیح میں ایک جامعیت
ہو گئی ہے اسی لئے یہاں تصور کی بلندی اور ہمہ گیری، موضوعات
کی شائستگی اور پاکیزگی، فکری گہرائی اور وسعت نظر کو جو کہ جمال
ادبیت کے لئے ضروری ہے نظر انداز کردینا بجا نہ ہوگا۔ جہاں تک
ادبیت کا تعلق ہے ایک سرسری جائزہ لینے سے جو چیز سب سے
پہلے محسوس ہوتی ہے وہ موضوعات کی بے پناہ وسعت ہے
اسلامی ادب مذہبی، معاشی، تمدنی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی
غرضیکہ زندگی کے ہر پہلو پر محیط دکھائی دیتا ہے وہ اس سلسلہ میں
تمام مروجہ اقدار کا جائزہ لیتا ہے اور انکے روشن اور تاریک پہلوؤں
کو اجاگر کرتا ہے، اگرچہ بڑی حد تک یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ
ان اقدار پر کڑی تنقیدی نظر نے زیادہ تر ان کے منفی پہلوؤں
کو نمایاں کیا ہے اور ان پر بے لاگ تبصرہ کیا ہے اسکے مقابل
مثبت پہلو عام طور پر یا تو نظر ہی نہیں آتے یا پھر انہیں منفی پہلوؤں
کے بار کے نیچے دبے اور کراہتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں اسکو
نہ بھولنا چاہیئے کہ مادی نظریات کے اس عروج کے زمانے
میں یہ اقدار اگرچہ ہمہ گیر ہو چلی ہیں لیکن اسلامی ادب انہیں پایہ
اور مضبوط نہیں سمجھتا اسکی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام اقدار زندگی کے بیشتر
مسائل حل کرنے میں بری طرح ناکام رہی ہیں۔ اور انسانیت کا بڑھتا ہوا
اضطراب کرب اور اذیت اس کے مستقل شواہد ہیں۔ اگر نظر میں
اتنی بصیرت ہو کہ انکی مصنوعی چمک دمک سے متاثر ہونے کے بجائے
انکی حقیقت کو پرکھے تو یہ بات چھپی نہیں رہتی کہ انکے اندر اچھائی
سے کہیں زیادہ مفاسد و معائب پنہاں ہیں جو رفتہ رفتہ
اور تمدن، اخلاق اور معاشرت کی اعلیٰ اقدار کی رگ رگ میں
ہو کر انہیں دن بدن کھوکھلا کرتے جا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ
پہلو سامنے آکر بھی پنہاں رہتا ہے اسلامی ادب نے ان مفاسد
کو ایک ایک کرکے بے نقاب کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ
بتایا ہے کہ انکا مداوا کیا ہے نعم البدل کہاں ہے اور کس طرح
حاصل کیا جاسکتا ہے اور پھر ان مفاسد کے علاج کے طور پر
جو چیزیں پیش کی گئی ہیں اور خود ان مفاسد پر جتنی گہری نظر ڈالی
اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا علمی محاذ کس قدر مضبوط
فکری گہرائی کتنی عمیق ہے۔

پھر اس میں زندگی کی ہر وہ چیز ملتی ہے جس کی بجا طور
زندگی کو ضرورت ہے اس میں اخلاقی تعلیمات ہیں تو
اصول وضوابط بھی، معاشرتی تنظیم ہے تو سیاسی جد و جہد
کے ہنگامے بھی ہیں اور بزم کا کیف و انبساط بھی، شعلوں کی
بھی ہے اور شبنم کی خنکی بھی۔ آفتاب کی حدت اور چندرماں کی
بھی، دلوں کو گرمانے والی رجز خوانی بھی ہے اور سکون بخش
بھی۔ لیکن ان تمام میں توازن اور اعتدال نمایاں ہے کسی
پر دوسرے کو چھا جانے کا موقع نہیں ملتا۔ تقاضے اور
کے تحت ایک ایک چیز سامنے آتی ہے اور گزر جاتی ہے
توازن اور اعتدال ہے جس نے ان تمام چیزوں میں ایک
آہنگ پیدا کردیا ہے اور یہ سب ایک ہی کل کے مختلف
حیثیت سے نظر آتے ہیں۔

اسلامی ادب میں قہقہوں کا شور و شغب تو نہیں ملتا لیکن
تابناکیاں جا بجا دکھائی دیتی ہیں جو ذوق لطیف کو آسودہ کرنے
کافی ہیں اور درحقیقت تصورات کی بلندی اور عقاید کی حد
جو سنجیدگی اور متانت پیدا کردی ہے اس میں قہقہوں کی توقع

در بہر شائستگی کا آواز بھی یہی ہے ، اگر ہم نے سخن داد دیجئے اس گلشن میں
بجا کھلتی ہوئی کلیوں کا سا سماں پیدا کر دیا ہے جس میں ایک غیر مرئی
ترنم کا بھی احساس ہوتا ہے ، یہ ترنم ممکن ہے کہ ہمہ وقت کان کے
پردوں سے نہ ٹکراتا ہو ۔ لیکن دل کے گوشوں میں ضرور محسوس ہوتا ہے
ممکن ہے کہ موسیقیت کے اس انداز پر کچھ لوگ مطمئن نہ ہوں اور
نظر کے سامنے بربط و رباب کے تاروں کو مرتعش دیکھ کر ہی اسکے
وجود کا اعتراف کریں لیکن یہ انسان کی اپنی اپنی افتاد طبع ہے کچھ
لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو آلات کے اس توسط کے بغیر فضاؤں
میں رچی ہوئی نغمگی سے لذت اندوز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں
اور ذوق لطیف کی آسودگی کے لئے اسی کو کافی سمجھتے ہیں ۔
اسلام پسند شاعروں اور ادیبوں میں سے اکثر کا شمار انہی میں ہوگا

تقریباً ہر زمانے کے ادب میں مسرت اور شادمانی کے ساتھ
حزن و یاس اور قنوطیت کے قوی رجحانات ملتے ہیں جو شکستگی
اور پسپائیت یا جمود پر آمادہ کرتے ہیں اسکے بالکل برعکس یہ خصوصیت
اسلامی ادب اور صرف اسلامی ادب میں نظر آتی ہے کہ اس میں
ان رجحانات کا پتہ بھی نہیں ملتا ۔ زندگی ہر جگہ پیہم رواں اور جاوداں
نظر آتی ہے ۔ حوادث کے سیلاب بھی ملتے ہیں ، مصائب کے طوفان
بھی اٹھتے ہیں اور پریشانیوں کے بادل بھی چھاتے ہیں لیکن ان سب کے
درمیان یہ یقین محکم جھلکتا ہے کہ یہ تمام چیزیں بہرحال وقتی دم ——
( ) ہیں اور یہ یقین ذوق عمل کو تازہ رکھنے
کے لئے کافی ہے ۔

ادب کا پاکیزہ تصور رکھنے والوں کے لئے اکثر ایسے کٹھن مراحل
بھی آتے ہیں ۔ جہاں بہت سی گھناؤنی اور مکروہ باتوں کا تذکرہ بھی
ناگزیر ہو جاتا ہے ۔ ایسے مقام پر دامن کو آلودگی سے بچا لے جانا ذرا
بڑے ظرف کا کام ہے ادیب اگر حقیقت نگار ہے تو اسکو نظر انداز
نہیں کر سکتا کیونکہ معاشرے کے اندر بہرکیف بہت سی گھناؤنی اور
مکروہ حقیقتیں موجود رہتی ہیں اور ایسے انسانیت سوز حادثات و
واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں ۔ اسلام پسند ادیب بھی ایسے ماحول
میں رہتا ہے ان حالات سے بھی متاثر ہوتا ہے اور انھیں نقل کر
کرتا ہے لیکن یہاں اسلامی ادب کا مخصوص مزاج اس بات کا تقاضا
کرتا ہے کہ بات کہی تو ضرور جائے مگر اس انداز میں کہی جائے کہ
امر واقعہ کی کراہتوں کے باوجود ادب کی پاکیزگی اور جمال برقرار
رہے امر واقعہ بالکل واضح ہو کر سامنے آجائے اسکا تاثر بھی قائم
رہے اور پڑھنے والے کو اس اظہار واقعہ میں کوئی لذت نہ محسوس
ہو بلکہ اس پر رنج و افسوس ہو اس سے نفرت اور کراہت ہو،
ورنہ اگر اسے لذت ہی محسوس ہو گئی تو پھر اس کی عملی لذات کے حصول
سے اسے کون باز رکھ سکتا ہے ، اسلامی ادب اس کٹھن گھاٹی سے بھی
گذر جاتا ہے اور صفحہ ادب گندگی کے داغ سے پاک رہتا ہے
مثلاً وہ ماں کی زبان سے اسکی حسین و جمیل بیٹی کی سرحدوں پر زبردستی
اغوا کا تذکرہ کرتا ہے ۔

غریب ماں نے بالآخر کہا تو اتنا کہا
وہ لے گئے اسے زیور اتارنے کے لئے (نعیم صدیقی)

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی ادب کو دیکھنے سے ممکن ہے
کہ کسی کے بدن میں سرسراہٹ اور اعضا میں تشنج اور کرختگی نہ محسوس
ہو یا پھر انسانیت کے کسی مخصوص طبقے کے خلاف غم و غصہ اور
خونریز انتقام کا جذبہ نہ پیدا ہو لیکن دلوں میں سوز و گداز ،
رگوں میں حرارت و جوش ضرور محسوس ہوگا اور یہی نہیں بلکہ اسے
بہتر نظام حیات کا تصور اور فکری بصیرت بھی میسر ہوگی ، اور
شاید زمانے کو اس کی زیادہ ضرورت ہے ۔

آخر میں شاید بیجا نہ ہوگا اگر کام و دہن کی لذت کیلئے ،
" مشتے نمونہ از خروارے " کے طور پر بھی کچھ پیش کر دیا جائے ۔

محبت عرش و گردوں ساز بھی ہے
محبت فرش پا انداز بھی ہے
ادب لے جوش غم جوش تمنا
حریم دل حریم ناز بھی ہے
(ماہر)

میں کارواں کو کسی اور سمت لے جاؤں
کہ مہر و ماہ کے اب تک چراغ جلتے ہیں

دم سحر مجھے شبنم کا انتظار رہا
چمن میں آج بھی لالے کے داغ جلتے ہیں

(عبدالکریم ثمر)

ں بے سود التجائیں فضول ؛ زندہ جینے کے اور ہی ہیں اصول
ستانِ فراق رہنے دے ؛ داستانِ حیات کرنے طول

(احمد نسیم)

میرے گھر جو دمِ گریہ ہو گئے ہوتے
ہر نگاہ میں موتی پرو گئے ہوتے

جو قسمتوں سے کیا اس نے خواب کا وعدہ
نصیب نہ ہوا یہ کہ سو گئے ہوتے

(ابوالوفا حجازی)

ں کو آگیا ہے گل کھلانا ؛ ذرا سے زندگی دامن بچانا
یں دیر و حرم میں ڈھونڈتے ہیں ؛ ذرا ، اہلِ نظر کا دل بڑھانا

(روش)

سی موجیں کیا منجدھار ؛ اب کے کشتی آر کہ پار
تق کہاں تک روکے گا ؛ حسن کے اوچھے اوچھے وار
یدوں کے تاج محل ؛ ارمانوں کے شالامار!

(ماہر القادری)

الہی کائنات آج ، کیوں اداس اداس ہے
گھٹی گھٹی سی ہے فضا
تھکی تھکی سی ہے ہوا
فسردگی چمن چمن ، نتادگی دمن دمن
نہ زیر و بم کی نغمگی صدائے آبشار میں
نہ پیچ و خم کی دلکشی روائے جوئبار میں

اجل پر بس اک آخری وار کرنے
بڑی شان سے آج نکلے ہیں دن میں
بھلا کس کی ہمت مقابل جو آئے
بھلا کس کی جرأت جو آنکھیں ملائے

سلگتے ہوئے خواب دم توڑتے ہیں
چراغ آج آندھی کا منہ موڑتے ہیں

(عرشی بھوپالی)

میرے اشعار سے
شیشہ و بادہ و جام خطرے میں ہے
جنت بادہ آشام خطرے میں ہے
میرے قرآن و سنت کے اسلام سے
حکمرانوں کا اسلام خطرے میں ہے

تو آئے تو ڈالر!

سو عیش تو ہوں گے ؛ سکھ چین اڑیں گے
زرخیز ہیں گو کھیت ؛ پر قحط آ گئیں گے
کھیتے تو بھریں گے ؛ ہم فاقے کریں گے
جالے تو سلیں گے ؛ تن کم ہی ڈھکیں گے
آمد تو گرے گی! ؛ اور بھاؤ چڑھیں گے

ڈالر میرے اس دیس کو ناپاک نہ کرنا! (نعیم صدیقی)

کی فتح خوآئین نے تہذیب کی اقلیم
اب جیت ہے اور مالِ غنیمت کی ہے تقسیم
ٹبرے میں ہر ایک سپاہن کے زر و سیم
تمغے بر عصیاں کے ہیں وردی پہ سجائے
لائی ہے کوئی لوٹ کے امراض پرائے
اور ہاتھ بچے بڑھتی ہے کوئی بار اٹھائے

کر فخر کہ مغرب کے عطیات یہی ہیں
افرنگ کے قرآن کی آیات یہی ہیں

(نعیم صدیقی)

قرآن کو اک غازی کردار سے پوچھو
ملّا تو سمجھتا ہے فقط " حدیثِ تہذیب

زبانوں میں پہلے تھے محکومیت کے افسانے
نظر سے آج بھی مایوسیاں ٹپکتی ہیں

م منزلِ ہستی ابھی نہیں آیا
ا ہراہوں پہ روحیں کئی بھٹکتی ہیں
مجھے تو آج بھی محسوس ہو رہا ہے دوست
خدائی لاکھوں خداؤں کے اختیار میں ہے
یہ تیرگی جو مسلط ہے آسمانوں پر
شعاع مہر اخوت کے انتظار میں ہے

(احمد نسیم)

ۂ نظم جہاں ہوس وکبر بدل دیں
ر بھی اگر راہ میں آئے تو کچل جائے
یوں جھوٹے خداؤں کی خدائی کو کچل دیں
انسانیت آدم کے رگ و ریشہ میں ڈھل جائے

(اعظم ادیب)

رسے تاریخ نے بھیجا ہے شہادت کا پیام
نہ ورنگ کی موجوں سے گریزاں ہو جاؤ
رقص کرتی ہوئی کرنوں سے مچلنا سیکھو!
بحر ہستی میں بھپرتا ہوا طوفاں ہو جاؤ

(سجاد شاہد)

راں کا موسم جواں ہے ابھی اپنی باہوں میں تاب تواں ہے ابھی
کیوں نہ تاروں کی چھاؤں میں بڑھتے چلیں دیکھو وہ سامنے شعلہ طور ہے
لہ سطور کی سرفرازی کے لئے موجۂ نیل کیوں راہ تکتی رہے
زندگی قبطیوں کے بیاباں میں کیوں بھٹکتی رہے سر پٹکتی رہے

(اعظم ادیب)

ستا ہوں کہ پیاسی ہے بہت خاکِ وطن ساقی
خدا حافظ چلا میں باندھ کر سر سے کفن ساقی
لامت تو، تیرا میخانہ تیری انجمن ساقی
مجھے کرنی ہے اب کچھ خدمتِ دار و رسن ساقی
انے پہ میں کبھی صہبا ہی صہبا رقص کرتی تھی
مگر اب زندگی ہی زندگی ہے موجزن ساقی

کبھی میں بھی تھا شاہد در بغل تو بشکن میکش!
مگر بنتا ہے اب خنجر بکف ساغر شکن ساقی
عجب کیا ہے یہ بہکی بہکی باتیں رنگ لے آئیں
بہت باہوش رہتا ہے میرا دیوانہ پن ساقی
نمود صبح کاذب ہی دلیل صبح صادق ہے
افق سے زندگی کی دیکھ وہ ابھری کرن ساقی

نوٹ:۔ مضمون کی بڑھتی ہوئی طوالت کے سبب سے نثر کے اقتباسات سے عمداً احتراز کیا گیا ہے لیکن ادب اگر تحریکی ہوتا ہے تو نثر کیا اور نظم کیا دونوں میں ایک ہی روح کارفرما ہوتی ہے

م۔ح۔ صدیقی

مفرّح فولادی

نیا اور تازہ خون پیدا کرتا ہے، وزن بڑھاتا اور ہڈیوں کو مضبوط کرتا ہے قوت وطاقت بخشتا ہے کھانا ہضم کرکے بھوک بڑھاتا ہے۔ خوراک: کھانے کا ایک چمچہ روزانہ تین چار مرتبہ کھانا کھانے کے بعد استعمال کریں؛ بچوں کے لئے نصف خوراک۔ قیمت فی شیشی دو روپے آٹھ آنے

حاذق دواخانہ بندر روڈ، کراچی نمبر ۱ سے طلب فرمائیں

نازش پرتابگڈھی

زمانہ اور ضرورت

کعبۂ دل وطن ولات وہبل آج بھی ہے
فتنۂ بولہبی گرمِ عمل آج بھی ہے

پنجۂ ظلم میں ہے اب بھی وجودِ انساں
قبضۂ کفر میں ہر تیغ و طبل آج بھی ہے

بے بسی ہے وہی اللہ کے بندوں کی ابھی
کل جو بوجہل کو حاصل تھا وہ بل آج بھی ہے

"شرک منجملۂ ارکانِ عبادت ہے ابھی"
کفر کا قلبِ ہر انساں پہ عمل آج بھی ہے

اب بھی ہوتی نہیں ہے پرسشِ اہلِ ایماں
اور سرافرازئ ہر اہلِ دول آج بھی ہے

اب بھی قرآن کا فرمان ہے ہر رسمِ غلط
حکم مذہب میں وہی ردّ و بدل آج بھی ہے

آج بھی بات کوئی خالقِ عالم کی نہیں
حکم ان جھوٹے خداؤں کا اٹل آج بھی ہے

چہرۂ شر و فساد آج بھی تابندہ ہے
سرنگوں حیّ علیٰ خیرِ عمل آج بھی ہے

عرصۂ دہر ہے آلودۂ ظلمت اب تک
مشعلِ مصطفویؐ کی ہے ضرورت ابتک

ابوالمجاہد زاہد

"غزل"
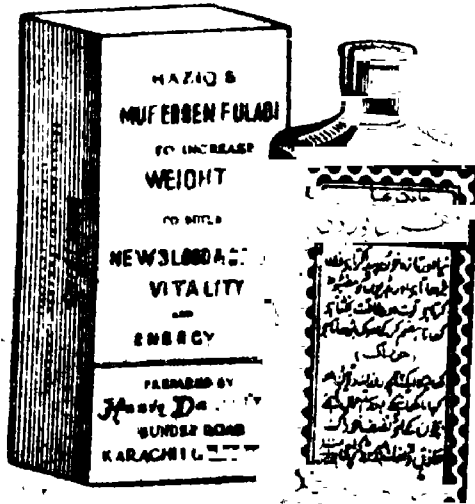
یہ تو مانتا ہوں میں دورِ ارتقا بھی ہے، عہدِ روشنی بھی ہے
یہ بھی اک حقیقت ہے رُوح بھی ہے پستی میں دل میں تیرگی بھی ہے

نفس کے پرستارو! میرے بغض میں بھی ہے شانِ حق شعاری کی
دوستی کے دیوانو! احترام کے قابل میری دشمنی بھی ہے

آہ وہ گلِ رنگیں جس نے خار و خس میں بھی روحِ زندگی بھر دی
آج اپنے گلشن میں وہ ستم زدہ بھی ہے اور اجنبی بھی ہے

یہ بھی اک حقیقت ہے میری نکتہ چینی سے تجھکو رنج ہوتا تھا
یہ بھی ماننا ہوگا تیری بزمِ رنگیں میں اک مری کمی بھی ہے

اے حجاز کے ساقی تا ابد ہے تیرا پاک میکدہ باقی
تیرے بادہ نوشوں میں سوزِ بندگی بھی ہے مستیٔ خودی بھی ہے

بزمِ شعر و نغمہ میں نعرۂ عوامی بھی فکرِ انقلابی بھی
اور کنجِ خلوت میں شغلِ جام و بادہ بھی، لطفِ زندگی بھی ہے

یہ بھی سچ ہے اے زاہدؔ آج راہِ منزل سے بھٹک گیا ہوں میں
یہ بھی جانتا ہوں میں فرض سارے عالم کی مجھ پہ رہبری بھی ہے

ڈ۔ فاروقی •

ایمان بالغیب

(ایک مختصر افسانہ)

ڈاکٹر معاشی اصلاح کا قائل تھا اور میں خدا پرستانہ انقلاب کا ——— وہ خدا کے متعلق "علم غیب" پر یقین لانے کو واہمہ کہتا تھا اور میں کہا کرتا تھا اللہ سے انکار اور بغاوت ہی تمام خرابیوں کی اصلی جڑ ہے۔

ہم دونوں اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے مختلف مسائل پر بحث کرتے رہے ——— یہاں تک کہ میرے جبڑے دکھنے لگے اور میری ڈاڑھ میں شدید درد پیدا ہوگیا۔

ڈاکٹر نے پوری توجہ سے جبڑے چیر چیر کر میری ڈاڑھ کا معائنہ کیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یا تو وہ ڈاڑھ نکال دینے کا مشورہ دے گا یا پھر کوئی تیز دوا لگانے کے لئے دے گا۔ لیکن اس نے صرف دو چھوٹی گولیاں دیں کہ ان کو پانی میں گھول کر ایک چمچہ پی لو۔

"پینے کے لئے" میں نے حیرت سے پوچھا

"ہاں" وہ ڈاکٹری لہجہ میں غرایا۔

"پینے سے کیا ہوگا ڈاکٹر کوئی دوا لگانے والی دی ہوتی"

"ڈاکٹر تم ہو یا میں" وہ بولا "مرض اور اسکے اسباب کیا ہیں۔ اس کا علاج کیسے ہوتا ہے، میں جانتا ہوں تم تو نہیں۔

میں نے اس سے وہ دو چھوٹی چھوٹی گولیاں لے لیں اگرچہ میں ڈاکٹر کی دی ہوئی اس دوا سے کچھ مطمئن نہیں تھا۔ مجھے متامل دیکھکر ڈاکٹر نے کہا۔

"جب کسی چیز کے متعلق صحیح علم نہ ہو تو بہتر رویہ یہی ہے کہ کسی جاننے والے کے علم اور تجربہ پر یقین و بھروسہ رکھا جائے"

"ڈاکٹر یہ یقین" ایک تیز اور چبھتا ہوا خیال میرے ذہن میں چمک اٹھا اور میں نے چونکا دینے والے لہجہ میں کہا۔ "یہ تو ایمان بالغیب ہے ڈاکٹر"!!!!

ڈاکٹر کے ہاتھ سے کانچ کی نلکی گر پڑی جس میں وہ ایک "سرخ سیال" کا مشاہدہ کر رہا تھا

حامد علیخاں •

فرعون کی محبوبہ

مصرِ قدیم کا ایک افسانہ

اب سے تقریباً نوے سال پہلے مصر کی وادی "ملوک" میں اس ملکہ کی ممی ملی تھی جو مشہور فرعون مصر کے بعد اس کے تاج وتخت کی مالک ہوئی۔ فرانسیسی ادیب گوتیئے نے اپنی کتاب "ممی کی کہانی" میں یہ دلچسپ انکشاف کیا ہے کہ ملکہ شاہی نسل سے نہ تھی ملکہ ایک مذہبی پیشوا کی نوجوان لڑکی تھی جسے فرعون مصر دیوانہ وار چاہتا تھا۔ گوتیئے کے بیان کے مطابق اس ملکہ کی پوری کہانی قدیم مصری کاغذ پر لکھی ہوئی اسی کے کفن سے برآمد ہوئی تھی یہ افسانہ جس میں مصر کے قدیم مناظر بڑی دلآویز تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں گوتیئے کی قلمی مصوری کا ایک شاہ کار ہونے کے اعتبار سے بھی قابل توجہ ہے:-

گرمی کا ایک دن تھا۔ مصر کے اسقفِ اعظم کی یتیم لڑکی طہوسر اپنے محل کے ایک کمرے میں غم وحرمان کا مجسمہ بنی بیٹھی بے اعتنائی سے اپنی باندیوں کے گیت سن رہی تھی اس کی کرسی کی مطلاچوبکاری کے نازک نقوش میں دہکتے ہوئے سرخ رنگ کی جھلملاہٹ شفق کی دل فریبیوں کو شرمارہی تھی۔ کرسی کے بازوؤں کی نفیس کندہ کاری سے شیر کی دو مورتیں نمایاں ہو رہی تھیں اور اس کے گہرے قرمزی رنگ کے گدیلوں میں جھلملاتے زریں ستارے ٹنکے تھے۔ سامنے ایک چھوٹی سی میز پر کنول کے پھولوں کے ایک گلدستے اور ہاتھی دانت کے پائے پر کانسے کے ایک خوب صورت آئینے کے علاوہ ایک تانبہ کم برہنہ لڑکی کا مجسمہ نقرئی عطردانیوں کا ڈبہ یوں سنبھالے ہوئے تھا جیسے کوئی تیرتی ہوئی جل پری احتیاط سے اپنے صندوق کو پانی کے اوپر اٹھائے ہوئے ہو۔

طہوسر کا چہرہ خالص مصری وضع کا تھا۔ ہلکے سنہرے اور گلابی رنگ کی آمیزش نے اس کی سانولی رنگت کو جلا دے کر ایک جگمگاہٹ سی پیدا کر دی تھی۔ اس کی بڑی بڑی اداس آنکھیں جن کے ابروؤں پر کاجل کے سیاہ خط کھنچے تھے اور جھکے پپوٹوں پر غازے کا رنگ چڑھا تھا، روشن ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں، اور اس کے انار کی کلیوں کے سے سرخ نیم وا ہونٹوں کے درمیان سفید مگر نیلگوں موتیوں کی نمناک چمک دکھائی دے رہی تھی اس کی ناک جس کا نچلا حصہ خفیف سا خم کھا رہا تھا، کسی دیوی کے مجسمے کی ترشی ہوئی ناک کی طرح ستواں اور خوش وضع معلوم ہوتی تھی اس کی ٹھوڑی کی گولائی میں عاج کی سی چمک تھی اور اس کے بالوں کی سیاہ تاب تجلی پر ایک پوشش تھی۔ ایک ٹوپی جو ایک سپید بطخ سے بنائی گئی تھی۔ بطخ کے بازو طہوسر کی کنپٹیوں کے وسط تک پھیلے ہوئے تھے۔ جانور کا خوب صورت سر اس کی پیشانی پر اور اس کی ستارہ کار دُم گردن کو مس کرتی ہوئی نیچے چلی گئی تھی۔ طہوسر کے کانوں میں بڑے بڑے طلائی بالے تھے اور سینے پر عقیق اور سونے کا ایک جڑاؤ کنگن جس کی سرخی اور سفیدی اس کے مہین لباس میں سے جھلملا رہی تھی۔ طلاء وا جرد کی تین تین مرصع چوڑیاں اس کی نازک کلائیوں کے گرد حلقہ زن تھیں اور وہ بادل کی طرح نرم اور سفید چمڑے کا جوتا پہنے ہوئے اپنے نازک پاؤں دیودار کی ایک شرخ وسبز مینا کار چوکی پر رکھے ہوئے تھی۔

یوں وہ اداس بیٹھی تھی: ایک اسرائیلی نوجوان پوری کی محبت سے

اس نے محض ایک بار کہیں دیکھ پایا تھا اس کے دل میں دنیا سے بیزاری پیدا کر دی تھی۔ اسی صبح فاتح جنگ کی حیثیت سے شہر میں فرعون کا جلوس نکل رہا تھا۔ طہوسر نے بھی کچھ دیر کے لئے اپنی خیالی دنیا کو چھوڑا اور سہیلیوں کو ساتھ لے کر یہ نظارہ دیکھنے کے لئے باہر نکل گئی۔ جلوس لامتناہی شان و شکوہ کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ سازندوں کے پاس گو رنر کے تنبورے اور کانسے کے بنے ہوئے عجیب و غریب ساز تھے۔ پیچھے کالے کی ہنسلیاں پہنے ہوئے قیدیوں کی لمبی قطاریں تھیں جن کے پیچھے سانولے چہرے والی لونڈیاں اشک آلود آنکھوں کے باوجود ناز و ادا سے چلتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ گرد و پیش باز کی مقدس تصویر والے علم بلند تھے۔ جاؤش پکار پکار کر مال غنیمت کی تفصیل بیان کر رہے تھے اس کے بعد زیبون، زرافوں اور چیتوں کے غول ——— اور پھر فرعون کی سراپا ہیبت کے سامنے جڑاؤ اگردان خوشبودار دھواں اگلتے ہوئے، اور شتر مرغ کے پروں کے اجلے اور براق پنکھے، پرشکوہ انداز میں حرکت کرتے ہوئے نظر آئے۔ فرعون ایک جواہر نگار پالکی میں سوار تھا اور اس کے پہلو میں ایک پالتو شیر پڑا لوٹ رہا تھا۔ فرعون کے ہاتھوں میں شاہی نشانات تھے اور اس کے ترشے ہوئے سانولے اور پیلے خد و خال دیکھ کر اس پر کسی دیوتا کے سنگین بت کا گمان ہوتا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں گرد و پیش سے بالکل بے خبر کسی ابوالہول کی آنکھوں کی طرح زمانے کی انتہا پر تکتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

لیکن یہ پراسرار آنکھیں طہوسر کو دیکھ چکی تھیں۔ فرعون کی یہ ایک نظر تقدیر کا فیصلہ کر دینے والی تھی۔ اس کے دل میں عشق کا تیر ترازو ہو چکا تھا دوسرے دن فرعون نے طہوسر کے گھر محبت کے تحائف ——— لعل و جواہر، زربفت و کمخواب اور طلائی زیور بھیجے لیکن شاہی غلام نامراد واپس آئے۔ طہوسر غائب ہو چکی تھی۔

ان ممالک میں خون، خون نہیں ہوتا، آگ ہوتا ہے۔ طہوسر خود اپنی جنون انگیز محبت سے مجبور ہو کر اپنے غلاموں تک کو اطلاع دیئے بغیر پوری کے دیہاتی قصر کی طرف نکل گئی تھی اور وہاں جا کر بربط نواز کی خدمت پر مامور ہو گئی تھی اس کا صرف اتنا کام تھا کہ اپنی نغمہ گری سے رات کو سوتے وقت پوری کی آنکھوں کو نیند کا نشہ پلا دیا کرے لیکن اس دلنواز خدمت میں بھی ایک اور مصیبت آ پڑی۔ پوری خود ایک عبرانی پری پیکر کو دل دے چکا تھا اور وہ ہر شام اس سے ملنے کو نکل جاتا۔ ایک شب طہوسر نے اپنی رقیب کو دیکھنے کے لئے پوری کے پیچھے پیچھے جانے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت نیل کو عبور کرنے کے لئے صرف ایک کشتی مل سکی۔ جسے لیکر پوری روانہ ہو گیا۔ لیکن طہوسر نے ہمت نہ ہاری اور چڑھے ہوئے دریا میں اس کے پیچھے پیچھے تیرنے لگی۔

ادبیات میں اتنے سحر انگیز منظر بہت کم ملیں گے کہ ایک بے خبر عاشق چپو چلاتا اپنی محبوبہ کی طرف جا رہا ہے اور دوسری لڑکی جو خود اس پر جان دیتی ہے چاندنی رات میں آہستہ آہستہ اس کے پیچھے تیرتی چلی جاتی ہے اور ڈرتی ہے کہ کہیں پانی کی آواز محبوب کے کانوں تک نہ پہنچ جائے۔

طہوسر بے اوسان اور نیم جان ہو کر کنارے پر پہنچی لیکن اس پر بھی جوش جنون نے اسے پوری کے پیچھے پیچھے راحیل کے مکان تک پہنچا دیا۔ اور آخر کار اگرچہ وہ خوش قسمت عاشق اور اس کی محبوبہ کو جھانک کر دیکھ لینے میں کامیاب ہو گئی مگر پوری کے جانے کے بعد وہ بیہوش ہو کر راحیل کی دہلیز پر گر پڑی۔ اتفاق سے راحیل نے اسے دیکھا تو وہ اسے اٹھا کر اندر لے گئی اور اس کی خبر گیری سے طہوسر کی جان بچ گئی ——— دوسری شام جب پوری وہاں آیا تو وہ اپنی بربط نواز کو راحیل کے پاس دیکھ کر سخت حیران ہوا لیکن جلد ہی وہ حقیقت کی تہ تک پہنچ گیا شاہی دربار کا ایک رکن ہونے کی حیثیت سے وہ یہ جانتا تھا کہ فرعون کے جاسوس بھوکے شیروں کی طرح طہوسر کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں۔ راحیل کی بوڑھی ملازمہ تامر بھی معاملے کو بھانپ گئی اور فرعون کو اطلاع دینے کے لئے چپ چاپ گھر سے نکل گئی

وہاں ایک عجیب منظر تھا۔ فرعون اپنے محل کی چھت پر بیٹھا، ساحت پر سب عت خبر لانے والے قاصدوں کی راہ دیکھ رہا تھا۔ وہ خاموش اور بے حس و حرکت، سیاہ پتھر کا ایک ہیبت ناک مجسمہ معلوم ہوتا تھا اور ایک شہر غدار کی پوری عظمت و شوکت اس کی آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی تھی۔ دریائے نیل کی آئینہ پوش سطح پر کھجوروں کے درختوں کے پنکھے جنبش کر رہے تھے۔ چاروں طرف ہزار ہا ابوالہول اور جا بجا قدیم معبدوں کے بلند گنبد نظر آتے تھے جس کو مس کرتے ہوئے خود زمانہ بھی اپنی کہنگی کا کوئی نقش چھوڑے بغیر یوں گزر جاتا ہے جیسے پانی کا قطرہ سنگ مرمر

پانی کی سطح پر سے ڈھل جاتے۔ مقدس پرندوں کے مجسمے آسمان کے گہرے نیل کے بالمقابل کہیں اپنے جادوانی پر پھیلائے دکھائی دیتے اور کہیں ایک نابُک پر بے حس و حرکت کھڑے نظر آتے۔ لیکن ان تمام چیزوں کا مالک ایک نوعمر لڑکی کے لئے جس سے ملنے کی امید لحہ بہ لحہ اس سے اپنا دامن چھڑاتی نظر آتی تھی۔ شدت درد و کرب سے بے حال تن تنہا بیٹھا تھا وقتاً فوقتاً جب کوئی پیادہ ناکامی کی بار بار دہرائی ہوئی خبر لے کر پہنچتا تو اس ہیبت ناک مجسمے کا ایک سنگین ہاتھ اٹھتا اور عصائے شاہی شعلۂ برق کی طرح سوختہ بخت قاصد کے سر پر آ کر طرفۃ العین میں اس کی لاش کو پتھر کے فرش پر گرا دیتا۔

آخر بوڑھی چڑیل تامر اپنی اطلاع لے کر وہاں پہنچ گئی۔ دفعتاً پتھر کا بادشاہ زندہ ہو کر اچھل پڑا اور لپک کر اپنی رتھ میں سوار ہو گیا۔ وہ گھوڑے سرپٹ دوڑاتا ہوا راحیل کے گھر پہنچا جہاں اس نے چیختی چلاتی طہوسر کو اپنے مضبوط بازوؤں کی گرفت میں لے لیا اور بگولے کی طرح جو پودوں کو اپنی زیر زمین مملکت کی طرف لے بھاگا تھا۔ فرعون طہوسر کو رتھ میں ڈالے کر بھاگو بھاگ کرتا دہانا دارالسلطنت کے بازاروں میں سے تند باد کی طرح گزر گیا۔

محل میں پہنچ کر فرعون کے جذبات میں نرمی پیدا ہو گئی اور اس نے طہوسر سے کہہ دیا کہ میں تم پر اس وقت تک کسی قسم کا دعویٰ نہ سمجھوں گا جب تک تم مجھے محبت کی نشانی کے طور پر کنول کا یہ پھول لوٹا نہ دو جو میں تمہیں دے رہا ہوں۔ اسی وقت فرعون ایک عجیب و غریب بزرگ کو بار یاب کرنے کے لئے رخصت ہوا۔ اس بزرگ کا نام موسیٰ تھا۔

اس کے بعد انجیل کی کہانی شروع ہوتی ہے۔ مصر پر رفتہ رفتہ مصائب کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں اور بنی اسرائیل وہاں سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ فرعون جو بچوں کے قتل عام کے دوران میں اپنے اکلوتے بیٹے کو بھی کھو چکا تھا یاس و قنوط اور قہر و غضب کی حالت میں طہوسر کو اپنی جانشین مقرر کر کے سپاہ کی فوج لئے سمندر کے پانیوں کی درمیانی شاہراہ پر ان کا تعاقب کر رہا ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل میں سے کچھ آخری افراد جن میں راحیل نامر اور بڑھیا بھی شامل تھے، اپنے آپ کو تقریباً کھو چکے تھے لیکن دفعتاً موسیٰ نے ..... ایک اشارہ کیا جس پر رتھوں کے پہیے نکل کر گر پڑے اور پانی کی دو عظیم الشان دیواریں دونوں طرف سے اٹھ کر باہم ٹکرائیں اس کے بعد سمندر پھر اپنی جگہ چلا گیا اور گاڑیاں گھوڑے اور آدمی طوفانی موجوں میں تنکوں کی طرح اچھلتے نظر آئے صرف فرعون اپنی تیرتی ہوئی رتھ میں تن کر بیٹھا تھا۔ تکبر اور طیش میں آپے سے باہر ہو کر وہ ساحل پر اترتے ہوئے حریف کو اپنے تیروں کا نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا آخر جب وہ بھی ڈوبنے لگا تو اس نے اپنے سینہ سے کہ اب وہی پانی کے اوپر رہ گیا تھا اپنا نیزہ سنبھالا اور اپنی بے چارگی کے باوجود اسے اٹھا کر نہایت دلیری سے ان دیکھے خدا کے خلاف دے مارا۔

اس طرح فرعون دریا میں غرق ہو گیا اور طہوسر مصر کی ملکہ بنی۔

(بشکریہ الحمرا)

عورتوں کا ڈاکٹر

یا الطبیب نسواں انضلہ چھپ گیا ہے۔ ماہنامہ صحت" کراچی کا یہ خاص نمبر کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ یہ خاص کتاب دو سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے جس میں عورتوں کے امراض اور ان کے علاج پر ہند و پاک کے چوٹی کے اطبا اور ڈاکٹر صاحبان نے مضامین لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کے زندگی بھر کے تجربات کا نچوڑ بھی اس کتاب میں پیش کر دیا گیا ہے۔ تجربات کے سلسلہ میں ڈاکٹری، ہومیوپیتھک، یونانی اور ویدک تجربات علیحدہ علیحدہ پیش کئے گئے ہیں۔ اس خاص نمبر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ تمام حکما اور ڈاکٹر صاحبان کے مضامین کے ساتھ ساتھ ان کے خود نوشتہ حالات زندگی اور فوٹو بھی شائع کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کی قیمت چار روپے ہے لیکن خریدار حضرات کو مفت پیش کی جائے گی۔

ترسیل زر کا پتہ :- بھارت میں :- فرقانیہ دواخانہ نظیر آباد، لکھنؤ - یو - پی

پاکستان میں :- مینجر ماہنامہ "صحت" بارنس اسٹریٹ، کراچی نمبر ۳

محمود عالم •

آنسوؤں کے گہر

میں دیکھتا ہوں حزیں مسکراہٹوں میں تری
تڑپ رہے ہیں دلِ کائنات کے آنسو
سکوتِ شب سے الجھتے ہوئے یہ گیت ترے
سنا رہے ہیں نوائے جہانِ رنگ و بُو
نہ مسکرا نہ کوئی گیت ابھی سُنا ہمدم
ڈھلک پڑے تری پلکوں سے آنسوؤں کے گہر
وہ دیکھ چند ستارے فلک سے ٹوٹ پڑے
اور اب تو ضبط کا دامن بھی مجھ سے چھوٹ چلا
سب آبلے دلِ محزوں کے ہائے پھوٹ پڑے
اِن آنسوؤں کے گہر کو نہ یوں لُٹا ہمدم

سکوتِ شب میں یہ حسرت ہے تک کے سوئے فلک
میں سوچتا ہوں ستاروں کو کس طرح چھو لوں
میں آبدیدہ نگاہوں سے جگنوؤں کی طرف
وفورِ شوق میں بڑھتا ہوں کیوں یہ کیسے کہوں
بتا ——— یہ کیفیتِ دل ہے کیا بتا ہمدم
یہ چاندنی یہ ستارے یہ کہکشاں کی لکیر
دمِ طلوعِ سحر یہ شفق کی سرخ جبیں
یہ رنگ و بوئے گلستاں یہ آبشار کے گیت
یہ دیکھ حسنِ ازل کے اشارہ ہائے حسیں
نگاہِ جہل سے پردہ ذرا اٹھا ہمدم

(بشکریہ معیار)

غلام عباس مولوی

اور بتی بجھ گئی

ظاہر ہے کہ جب بتی جلتی ہے تو بجھ بھی جاتی ہے۔ رات بھر میں ایک نہ ایک وقت ایسا آ ہی جاتا ہے جب روشنی کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور بتی بجھ جاتی ہے۔ اگر کسی صورت میں رات بھر جلتی بھی رہ جائے تو صبح ہر حال میں بجھ جاتی ہے۔ سورج کی اولین کرنیں تمام بتیاں گل کر دیتی ہیں۔ روشنی اور تاریکی، طاقت اور بے بسی زندگی کے لباس کا تانا بانا ہیں۔ بتی کا جلنا یا بجھ جانا کوئی قابل تذکرہ بات نہیں ہے۔ پھر بھی اس بار جب بتی یکبارگی بجھ گئی تو بہت ہی برا ہوا۔

خوشتر کمرے میں اکیلا نہیں تھا۔ کالی بھی ایک کونے میں منہ پھلائے پڑی تھی۔

دونوں نے ابھی ابھی ایک ساتھ کھانا کھایا تھا۔ یہ ان کا روزانہ کا معمول تھا لیکن آج کھانا کھاتے ہی بتی بجھ گئی۔ رات ابھی جوان تھی۔ سردی کچھ زیادہ تھی۔ باہر تیز و تند ہوا ایسے سنسنا رہی تھی جیسے بہت سے سانپ لگے ہوں اور ان کے کافوری نفس سے دنیا کی نبضیں سرد پڑ گئی ہوں۔ خود کمرے کے اندر بھی اتنی خنکی تھی کہ بات کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

خوشتر نے کھانا کھایا اور ذرا کمر سیدھی کرنے کی نیت سے پلنگ پر لیٹ رہا۔ کالی بھی سامنے پڑی ہوئی آرام کر رہی، سمٹ سمٹا کر گٹھڑی بن گئی۔ اتنے میں بتی بجھ گئی۔

خوشتر کو بڑا غصہ آیا۔ اس نے ابھی کپڑے نہیں بدلے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ کپڑے بدلنے کا آج اس کا ارادہ بھی نہیں تھا۔ وہ کھانا کھاتے ہی سو جانا چاہتا تھا۔ کبھی کبھی تفریح اچھی چیز ہے اور آج تو اس کی جیب میں پیسے تھے۔ کالی بے چاری کو کیا معلوم کہ آج اس کے مفلس آقا کی جیب میں پورے ایک ہزار روپے ہیں۔

ایک ہزار روپے کوئی بہت بڑی رقم نہیں ہے۔ پھر بھی اتنی کم نہیں کہ اسے بالکل ہی نظرانداز کر دیا جائے۔ اگر اتنی ہی رقم کسی بڑے سرمایہ دار کو تمام و کمال میں ہاتھ لگ جاتی تو وہ کم از کم تین جوڑے کپڑے بنوا کر دو سال تک اپنی امارت کا ڈھنڈورا پیٹتا پھرتا۔ مگر خوشتر غریب کو اس رقم کا کوئی مصرف سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بدقسمتی سے کالی اس باب میں کچھ نہیں کر سکتی تھی اور اب تو بتی بھی بجھ چکی تھی۔ اس لئے خوشتر نے سوچا کہ کل کی بات کل ہی سوچی جائے گی۔ آج تو بس اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ اور اندھیرے کا سفر معلوم۔۔!

کالی ابھی سوئی نہیں تھی۔ اس نے جو گھنگرو پہن رکھے تھے ان کی کھنکھناہٹ صاف بتا رہی تھی کہ وہ سونے کی فضول سی کوشش کر رہی ہے۔ رہ رہ کر گھنگروؤں کی روپہلی آواز خوشتر کے خیالات کے لئے مہمیز ثابت ہو رہی تھی۔ خیال ہی خیال میں وہ نور اور روشنی کی اس مثالی دنیا میں پہنچ گیا جہاں کے لئے تاریکی ایک بے معنی لفظ ہے۔

خوشتر خود ذہنی کاہلی کا قائل نہ تھا۔ اس لئے وہ منصوبے گانٹھنے اور خواب بننے کا بھی قائل نہیں تھا لیکن آج تو اسے تھوڑا بہت خیالی پلاؤ پکانے کا حق حاصل تھا اور خواب دیکھنے کا بھی اختیار تھا۔ محلوں کے نہ سہی نرم لباس اور گرم بستر کے ہی سہی۔ بڑی بے جان سی زندگی گزاری تھی اس نے ایک دو نہیں پورے تیس سال صاف اس طرح گزر چکے تھے کہ صبح کو کماؤ تو شام کو کھاؤ اور اگر نہ کماؤ تو مت کھاؤ۔ بہرحالت اس نے تباہی کبھی کرنا نہیں جانا تھا۔ وہ پڑھا لکھا تھا۔ روشن دماغ تھا۔ زندگی کی صاف اور سچی قدروں کو پہچانتا تھا۔ جفاکش تھا مگر دولت کبھی اس کے ہاتھ نہیں آئی۔ اس کا سبب بھی اسے معلوم تھا۔ دولت دراصل دولت مندوں سے حاصل کی جاتی ہے اور دنیا کے سارے دولت مند ضرورت سے کچھ زیادہ عقلمند ہیں۔ وہ اپنی دولت کو صرف اپنی ذاتی حاجتوں کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتے ہیں اس لئے دوسروں کے حق کے ساتھ ساتھ دوسروں کے وجود کو بھی نظرانداز کر دیتے ہیں۔ ابھی سماج نے اتنی ترقی نہیں کی کہ خوشتر جیسے لوگ خوشحا

یا -

کالی کے گھنگرو خاموش تھے - خوشتر نے سوچا شاید وہ سو گئی - سو گئی؟
یا جلد؟ کہیں باہر تو نہیں چلی گئی؟ مگر نہیں - کالی اتنی بے وفا نہیں ہے
لی سال سے اس کی ناہموار زندگی کا ساتھ دے رہی ہے - آج پہلی اندھیری
ن میں بھلا وہ کیسے گھر سے نکل جائے گی - اسے معاً خیال آیا کہ دروازہ
ہی رہ گیا ہے - مان لیا کہ کالی گھر سے باہر قدم نہیں رکھے گی - پھر بھی اگر
ئی شخص اندھیرے سے فائدہ اٹھانے کی نیت سے اندر چلا آیا تو؟
یک بات تھی بتی صرف اس کے ہی کمرے کی نہیں بجھی تھی - سب کی بجھ
ی تھی اور جب بتی بجھ جاتی ہے تو سب اپنے اپنے کمروں میں دبک جاتے
یا ایسے میں بھلا دوسروں کے کمروں میں کون جھانکتا پھرے گا -

بتی اس لئے نہیں بجھی تھی کہ لالٹین میں تیل نہیں تھا بلکہ اس لئے بجھ
ی تھی کہ بجلی کا کھٹکا بگڑ گیا تھا جس بلڈنگ میں وہ رہتا تھا اس میں ایک سو
اس کمرے تھے - ان کمروں میں ایک ہزار نو سو پچاس مرد عورت اور بچے
ہتے تھے جو آج سے چار روز پہلے تک اندھیرے میں رہا کرتے تھے -

بیسوی صدی کی جوانی ڈھل گئی - مگر اس بدنصیب عمارت میں بجلی کی
یک کرن بھی نہیں پہنچی - حالانکہ اسی شہر کے رہنے والے بہت سے لوگ آئے
ن ہوائی جہاز پر اڑتے پھرتے تھے اور اس عمارت کا مالک تو زمین پر قدم ہی
ہیں رکھتا تھا - کرایہ داروں کی مانگ مالک مکان کے کان ڈھونڈتی رہی
لیکن کبھی ہاتھ نہیں آئے - آخر کسی بڑے ہی سمجھدار آدمی نے مالک مکان کو سمجھایا
کہ اگر وہ اس عمارت میں بجلی لگوائے تو ڈیڑھ سو کرایہ داروں سے صرف اس ایک
مد میں کم از کم تین سو روپے ہر ماہ بچائے جا سکتے ہیں - اپنے فائدے کی بات بھلا
کسے بری معلوم ہوتی ہے - چنانچہ مالک مکان نے کرایہ داروں پر احسان کرنے
کے انداز میں بجلی کا انتظام کر دیا - ابھی چار روز ہوئے جب اس عمارت میں پہلی
بار بجلی کی روشنی پہنچی تو اس نے کرایہ داروں کی مفلسی کو اور بھی اجاگر کر دیا - شاید
یہ بات قدرت کو اچھی نہیں معلوم ہوئی اور آج یکایک بجلی غائب ہو گئی
بتی بجھ گئی اور ایسی بے وقت بجھی کہ خوشتر ایسے بیسیوں کرایہ دار روشنی
کی ایک کرن بھی نہ خرید سکے -

کالی یقیناً سو گئی تھی - لیکن خوشتر کو کسی طرح نیند نہیں آ رہی تھی ایک ہزار
روپے کا حساب کتاب اس کے دماغ کو بوجھل بنا رہا تھا - یہ روپے اسے

اللہ کی دین کی طرح ہاتھ لگے تھے - سمجھدار لوگ کام کرنے والوں سے کام لینے
کے بعد بھی روپے دینے کی بات ٹال جاتے ہیں - مگر آج تو دنیا الٹی گھوم رہی
تھی - ایسا معجزہ ذرا کم دیکھنے میں آتا ہے - آج تو اسے محض کام کا وعدہ کر لینے
پر پورے ایک ہزار روپے پیشگی مل گئے تھے - اب یہ محض اتفاق کی بات
ہے کہ ان روپوں کے عوض وہ کم از کم تین مہینوں کے لئے قطعی بک چکا تھا -
اس کا دماغ، دل، جذبات، آرام سب رہن رکھے جا چکے تھے - عین ممکن
تھا کہ کام طبیعت کے خلاف صورت اختیار کرے اور ذہنی خودکشی کی نوبت
آجائے - آپ جانیے ایک ہلکی سی کھٹک روح حیات کو فنا کر دینے کے لئے
کافی ہے - غلامی خواہ کسی نوعیت کی اور کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو موت سے بدتر
ہے - مگر یہ سب تو واہمے تھے یہ بعد کی باتیں تھیں اور بعید تھیں اس وقت
تو پورے ایک ہزار روپے اس کی جیب میں تھے اور بلا شرکت غیرے
اس کے تھے -

خوشتر نے سوچا کہ اندھیرے میں لیٹے لیٹے کم از کم یہ تو فیصلہ کرے
کہ صبح وہ ان روپوں کو کس طرح کام میں لائے گا - اس نے پہلے تو یہ فیصلہ
کیا کہ وہ فضول خرچی بالکل نہیں کرے گا اور فی الحال صرف وہی چیزیں خریدے گا
جو قطعی ضروری ہیں -

اس نے سوچا کہ سب سے پہلے تو ایک اچھی سی گھڑی خرید لی جائے -
وقت کی ایک ایک لمحے کی قدر کرنا کامیابی کے لئے اولین شرط ہے ایک
خوب صورت سی مضبوط اور چھوٹے فولاد کی جیب گھڑی اور ایک اچھا سا ریشم
کا فیتہ - ریشم کا فیتہ تو خیر لازمی ہے - البتہ کلائی کی گھڑی کی کوئی ضرورت
نہیں - کلائی کی گھڑی آج کل ہر جاہل اور غنڈہ لگائے پھرتا ہے جیب کی
گھڑی کی بات ہی کچھ اور ہے - یہ اچھا اتفاق ہے کہ یہ سستی بھی مل جائے گی
اور اس میں ایک نفاست اور وقار بھی ہے جو اس کی اپنی شخصیت اور مزاج کے
عین موافق ہے -

مگر جیب کی گھڑی تو اسی وقت زیب دیتی ہے جب لباس بھی ذرا
سلیقے کا ہو - ورنہ اچھا خاصا آدمی خواہ مخواہ پانچویں درجہ کی یادگار معلوم
ہونے لگتا ہے - جامہ زیبی کسی کے باپ کا اجارہ تو نہیں ہے - اس نے سوچا
کہ وہ کم از کم ایک سوٹ ذرا قیمتی سا بنوا لے گا - جاپانی ریشم کا ہلکا بادامی
بے داغ سوٹ، جسے پہن کر وہ خاص خاص جلسوں میں جایا کرے گا -

ایسے جلسوں میں جہاں اس کی تقریر سننے کے لئے بڑے بڑے سوجھ بوجھ والے انتہائی اشتیاق سے آتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے سامنے پھٹے حالوں جانا اگر حرام نہیں تو بے ڈھنگا پن ضرور ہے۔ ہمارے فاقہ مست شاعروں کی مشاعرے والی شیروانی اب ایک تاریخی اہمیت حاصل کر چکی ہے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اب اس روایتی شیروانی میں غرور یا انانیت کا ایک تانا بھی ہے۔ خیر تو جاپانی ریشم کا ہلکا بادامی بے داغ سوٹ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو میں بن جائے گا۔

ریشم کے ہلکے بادامی سوٹ کی بات اگر ہرن کی کھال کے بوٹ مل جائیں تو کیا کہنے ہیں۔ پھر ایک خوش رنگ لیکن سنجیدہ سی نکٹائی اور سفید براق خرگوش کے سستے موزے تو ہر وقت خریدے جا سکتے ہیں۔

سب سے عمارت میں تبدیلی آئی تھی۔ اس کے کمروں کی دیواروں کا اکھڑا ہوا روغن کو زہد کی طرح اس کی آنکھوں میں چبھتا تھا کئی کرایہ داروں نے شاید تعیش کے لئے اپنے کمروں میں نئی قلعی کر دی تھی۔ مگر عامیوں والی کوئی بات اسے پسند نہ تھی۔ وہ سوچا کرتا کہ اسے روپیہ ہو گا تو وہ دیواروں پر پلاسٹک والا یا مدھم سا خوش نما رنگ اور زیادہ سے زیادہ نقوش کا خرید کر لائے گا۔ اس سے کمرے میں ایک عجیب سی انفرادیت پیدا ہو جائے گی انفرادیت ہی تو زندگی کی جان ہے۔

نہ معلوم کیسے اس کے دل میں خیال آیا کہ گھر سجانے سے تو اچھا ہے کہ وہ شادی ہی کرلے۔ اس نے فوراً تخیل کے پر لگائے اور آنکھ جھپکتے میں وہ تمام علاقے چھان مارے جہاں دلہن دستیاب ہو سکتی تھی لیکن صرف ایک ہزار روپے میں کوئی بھی دلہن اس کے گھر آنے پر آمادہ نظر نہیں آئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شادی کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ کون جانے ایک اجنبی دلہن اس کی کالی کے ساتھ کیسا سلوک کرے۔ کسی نئی دلہن کی خاطر برسوں کی ساتھی کالی کو گھر سے نکالا نہیں جا سکتا۔ کالی اسے جان سے زیادہ عزیز تھی ایسی پیاری بلی تو ملک بھر میں کسی کے پاس نہ ہو گی۔

"نہیں نہیں"۔ اس نے سر کو زور سے جھٹکا دے کر اس خیال کو دل سے نکال دیا اور گھبرا کر کالی کی جانب دیکھا کہ کہیں کالی کو اس کے خیالات کی بھنک تو نہیں پہنچ گئی۔ مگر اندھیرے میں کالی بلی کس کو نظر آئی ہے خوشتر نے سوچا کہ شادی کرنے سے تو اچھا ہے کہ کتابوں کی ایک الماری خرید لی جائے اس کا آدھا ذخیرہ جھینگر چاٹ گئے تھے۔ یہ کم بخت جھینگر کسی سے ایل۔ سی۔ ڈی سے نہیں مرتے۔ کتابوں کے جامد الافکار جو پہلے رہتے ہیں جب تک کتابیں لکھی جاتی رہیں گی جھینگر پیدا ہوتے رہیں گے لیکن ایسی الماری جس میں جھینگر گھسیں چار پانچ سو سے کم میں نہیں ... اور اس وقت تک تو ایک ہزار میں سے تقریباً سب خرچ ہو چکا ہے ... نے سوچا کہ سب سے زیادہ ضروری تو کتابوں کی الماری ہی تھی جو ہزار روپے کے حساب میں جگہ نہیں پا سکی۔

بیوی ہو یا الماری محض تمنا کرنے سے نہیں آجاتی ان کے ... دن اور انتظار کرنا پڑے گا۔

سوچتے سوچتے اس کا منہ سوکھ گیا ... پیاس کی ... محسوس ہونے لگی اسے بڑی حیرت ہوئی کہ وہ ان تمام قطعی ضروری چیزوں کے بغیر ہی اتنے دنوں تک کیسے زندگی گزارتا رہا ہے اور صرف ایک ... اور اتنی ساری ضرورتیں۔ پھر کم بخت یہ ننھی سی بتی بیٹھے میں گل ہو گئی۔ کتنے ... وقت بھی ہے یہ بتی ما

جب وہ سوچتے سوچتے نڈھال ہو گیا تو اس نے دل میں فیصلہ کہ آئندہ وہ اپنی ضرورتوں کے بارے میں بالکل کچھ نہیں سوچے گا۔ ... انسان کی کمزوری ہے۔ تمنا کی وہی بات ہے کہ مانو تو دیو نہیں تو پتھر تمناؤں کی آبیاری اور مسرت کا حصول ایسا ہی ہے جیسے کوئی اندھیرے میں کالی بلی ڈھونڈ رہا ہو جو وہاں نہیں ہے۔ خود اپنی ہی تخلیق کردہ تمنا کا شکار ہو جانا انسانیت کی ہتک ہے۔ چنانچہ اس نے سوچا کہ ضرورتوں کے بارے میں سوچنا غیر ضروری ہے۔ صبح اٹھ کر وہ پہلا کام یہ کرے گا بازار جا کر کالی کے لئے ایک نیا ٹاٹ خرید لائے گا۔ اس کے بعد جو بھی ... سامنے آئے گی باقی تمام روپے اس کے آگے ڈال دے گا اور دوسری ضرورتوں کے بارے میں کچھ نہیں سوچے گا۔

معاً اسے خیال آیا کہ دروازہ کھلا رہ گیا ہے سونے سے پہلے بند کر لینا چاہیئے اور یاد آیا کہ اس نے ابھی تک کپڑے نہیں بدلے ... سے پہلے یہ کام بھی کرنا ہو گا خیالات کے ہجوم سے وہ اتنا بوجھل ہو گیا تھا کہ اٹھا نہیں گیا ایسے میں تو بستر پر پڑا رہنا ہی بہت بڑی عیاشی ہے اور وہ بلاقیمت لوٹ سکتا تھا۔ رات کا وقت اور ایسی دبیز تاریکی۔ کون ...

دروازہ بند ہے یا کھلا۔ اور وہ سونے کے کپڑوں میں جاگ رہا ہے یا جاگنے کے کپڑوں میں سو رہا ہے۔

بتی جلتی رہے یا بجھ جائے آدمی ہر حالت میں سو جاتا ہے۔ خوشتر سو گیا۔ موقع پاتے ہی اس کے سارے خواب جاگ اٹھے۔ کمرے کی تاریکیوں کے باوجود بیداری میں اس نے جو خواب نہیں دیکھے تھے آنکھیں بند ہوتے ہی وہ تمام اپنے متعلقین سمیت اس کے سامنے ننگے ناچنے لگے۔ روپہلی فولاد کی گھڑیاں، ریشمی بادامی سوٹ، ہرن کی کھال کے جوتے سفید لومڑی کی اون کے موزے۔ پیراہن پوش دیواریں، بتیاں بتیاں —— اور صبح ہو گئی۔

آنکھ کھلی تو اس کی طبیعت میں بڑی شدت کی گرانی تھی۔ مگر اس نے پروا نہیں کی۔ دروازہ کھلا تھا۔ کالی باہر جا رہی تھی اور دھوپ دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ رات بتی نہ بھی بجھتی تو اس وقت بجھا دی جاتی۔ روشنی اور تاریکی، مسرت اور مایوسی لباس زندگی کا تانا بانا ہیں سورج کی اولین کرنیں تمام بتیاں بجھا دیتی ہیں۔

اس نے سورج کی ترچھی کرنوں کی لپیٹ میں اپنے کپڑوں پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی۔ وہ جاگنے کے کپڑوں میں سو گیا تھا مگر سونے کے کپڑوں میں نہیں جاگا تھا۔ وہ مسکرا دیا۔ پھر اس نے بڑے چاؤ سے ہاتھ بڑھا کر تکیہ کے نیچے ٹٹولا اور ٹھٹک کر رہ گیا۔

تکیہ کے نیچے سے اس کا بٹوہ غائب تھا۔

اس نے گھبرا کر کھلے ہوئے دروازہ کی جانب دیکھا۔ کالی جا چکی تھی۔ دھوپ کمرے میں پہنچ گئی تھی۔ سورج کی اولین کرنیں تمام بتیاں بجھا دیتی ہیں۔

(بشکریہ ادب لطیف)

سلورین پلز

مقویات کا سرتاج

مردوں کیلئے
ایک اچھا متوازن اور آج کل کا آزمودہ جنرل ٹانک ہے

جو

بھوک کو بڑھاتا ہے جسم میں تازہ سرخ خون پیدا کرتا ہے اور طاقت بڑھاتا ہے۔

سلورین پلز پر آپ بھروسہ کر سکتے ہیں

قیمت

چالیس گولی :- چار روپے بارہ آنے۔
اسی گولی :- نو روپے۔

SILVERIN PILLS
for
EXTRA ENERGY AND VITALITY
Promotes Physical Strength
Builds Blood and Bones
Dose: 1 to 2 Pills twice a day with milk or fresh water, Morning and evening
HAZIQ DWAKHANA
BUNDER ROAD
KARACHI

ساختہ :- حاذق دواخانہ بندر روڈ، کراچی

پروفیسر سید فخر الاسلام فخر

ادب اور جنسیت

نئے ادب پر تنقید کے سلسلے میں 'ابہام' پر میرے چند مضامین اس سے قبل شائع ہو چکے ہیں آج میں نئے ادب کی ایک دوسری نمایاں خصوصیت یعنی 'جنسیت' پر ایک سرسری نظر ڈالتا ہوں۔

یوں آج نئے ادب کے تحت سب ہی کچھ لکھا جا رہا ہے لیکن تمام اصناف ادب سے بڑھ چڑھ کر نظم و افسانہ خصوصیت سے نئے ادب کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان دونوں پر جنسیت بری طرح چھائی ہوئی ہے اور ہمارے جدید شاعر اور افسانہ نگار کے اعصاب پر جنسیت کا بخار کچھ اس طرح طاری ہے کہ کسی کروٹ اس کو چین نہیں۔ آئیے اس کا تجزیہ کریں اور ہو سکے تو معلوم کریں کہ اس کے اسباب کیا ہیں اور اس کا ادب اور زندگی سے کیا تعلق ہے؟

ادب اور زندگی ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہیں اس اٹل حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے لیکن بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کو نہ ادب کا شعور ہے نہ زندگی کا لیکن ادب برائے زندگی کا نعرہ لگانے میں سب سے پیش پیش ہیں۔ ایک تو اس نظریے کا غلط مفہوم اور دوسرے ادب میں واقعیت پیدا کرنے کی دھن، شاید یہی دو چیزیں ہیں جو ہمارے نئے ادب میں جنسیت کے عنصر کو اکسانے کی بڑی حد تک ذمہ دار ہیں۔

ادب برائے زندگی سے اگر یہ مراد ہے کہ ادب زندگی کی پیداوار ہے۔ اس کی رنگارنگ کیفیات اور گوناگوں نفسیات کا آئینہ دار ہے۔ فطرت کی رعنائیوں اور قلب انسانی کی گہرائیوں کا راز دار ہے شریف اور اعلیٰ جذبات کا محرک ہے۔ انسان کو زیادہ مہذب عالی ظرف اور بلند فطرت بناتا ہے اس کے دکھ سکھ کا ساتھی ہے اسکی قابلیتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے اس کی زندگی کے حسین پہلوؤں کو روشن اور اجاگر کر کے اس کی مسرتوں کے سرمائے میں اضافہ کرتا ہے تو یہ سب صحیح اور بجا لیکن یاد رہے کہ یہی حسن اور مسرت دو ایسے اجزا ہیں جو ادب سے کسی حالت میں جدا نہیں کئے جا سکتے۔ ورنہ خود ادب کا وجود معرض خطر میں پڑ جائے گا۔ یہ بھی صحیح کہ ادب زندگی کا آئینہ دار ہونے کی حیثیت سے اسکے بدلتے ہوئے نظام رسم و رواج انداز فکر و خیال اور اسکے مختلف معاشرتی، اقتصادی اور نفسیاتی کیفیات کے خاکے اور جھلکیاں بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ تاریخ خود زندگی اور ادب کے اس مضبوط رشتے کی شاہد ہے لیکن فرض کیجئے کہ ادب اپنی اس انفرادی خصوصیت سے جو تخلیق حسن و مسرت سے وابستہ ہے بیگانہ ہو کر خود کو زندگی کے مختلف شعبوں کی تفصیلات میں کھو دے تو پھر کوئی بتائے کہ ادب میں اور معاشیات اور اقتصادیات، سیاسیات وغیرہ میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جہاں ادب برائے ادب کے حامی اس منزل پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ادب ہی ادب رہ جاتا ہے اور زندگی مفقود ہو جاتی ہے۔ وہاں دوسری طرف ادب برائے زندگی کے علمبردار اکثر اس مقام پر کھڑے نظر آتے ہیں جہاں زندگی ہی زندگی رہ جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ صحیح راستہ ان دونوں کے بیچ میں ہے جہاں ادب اور زندگی ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور دونوں کے امتزاج سے ایک حسین حقیقت وجود میں آتی ہے۔ ہمارے جنسیت زدہ ادیب اسی غلط فہمی کے شکار ہوئے ہیں وہ کیچڑ بغل میں دبا کر زندگی کی تصویریں لیتے پھرتے ہیں اور پھر لوگوں کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی یہ تصویریں ادب اور آرٹ کا اعلیٰ نمونہ ہیں اپنے فن کی موافقت میں ان کا سب سے قوی استدلال یہی ہے کہ یہ زندگی ہے اور وہ زندگی کی عکاسی کر رہا ہے اور آئیے ان کے اس استدلال کا تجزیہ کر کے دیکھیں۔

عمومیت سے قطع نظر ہمارے ملک کے ان گھرانوں کو لیجئے جو ہمارے شاعروں اور ادیبوں کے لئے پس منظر مہیا کرتے ہیں

و مجھے اسی سے اختلاف ہے کہ ان گھرانوں میں وہ تمام گندگی اور
ت اور آلائش بھری پڑی ہے جسکا یہ نئے لکھنے والے بر سرِ عام مظاہرہ
ہیں ہماری مذہبی اور اخلاقی روایات مٹ جانے پر بھی ابھی اپنے
تنی جان رکھتی ہیں کہ ہمارے ملک میں ناموس اور حیا کے الفاظ
بے معنی ہوکر نہیں رہ گئے ہیں ہوسکتا ہے کہ ان کی یہ تصانیف اس
س لکر محدود ماحول معاشرے اور سوسائٹی کی عکاسی کرتی ہوں جس میں
لکھنے والے چلتے پھرتے اور سانس لیتے ہیں۔ کیونکہ اکثر مجھے یہ محسوس ہوتا
ہے وہ اپنی آپ بیتی لکھ رہے ہوں اور اس کو جگ بیتی کے نام سے
کرنا چاہتے ہوں۔ یہ ایک زبردست اتہام نہیں تو اور کیا ہے
یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ ان کی تصویریں عام زندگی کے مطابق ہیں
دیکھنا یہ ہے کہ ان کا اس شد و مد کے ساتھ مظاہرہ اپنے اندر کیا کیا
انی پہلو رکھتا ہے۔

اس مظاہرے کی موافقت میں سب سے بڑی دلیل یہ پیش کی جاتی
۔ نئے ادب کا مقصد زندگی اور معاشرے کے ان گھناؤنے زخموں
ناسوروں کو نمایاں کرنا ہے جو اکثر نام نہاد شرافت، مذہب اور رسوم
پردے کے پیچھے ڈھکے رہتے ہیں۔ اس ادب کا مقصد یہ ہے کہ ان
پردوں کی دھجیاں کر کے اُن سڑتے ہوئے زخموں اور پکتے ہوئے
ناسوروں کو اس طرح اپنی نظروں کے سامنے لایا جائے کہ آپ انھیں
دیکھنے پر مجبور ہوں اور پھر ان پر ایسے تیر و نشتر لگائے جائیں کہ ان کا سب
مواد نکل پڑے اور وہ پاک و صاف ہوکر مائل بہ صحت ہو جائیں اور اس
مقصد اور نتیجہ ہے اصلاح، ہمارے معاشرے کی اصلاح، ہمارے
اخلاق کی اصلاح، ہمارے اندازِ فکر کی اصلاح، اور ہمارے رسم و
رواج کی اصلاح، اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ادب کیا اور اصلاح
کیا چیز ہے نہ کہ ادب کا مقصد اور مطمحِ نظر۔ اس کا مقصد وہی تخلیقِ حسن
... ہے لیکن اس ضمن میں غلط قدروں اور نظریوں کی اصلاح ہو جائے
تو یہ ادب کا افادی پہلو ہے جو اہم ہونے کے بعد ہمیشہ ضمنی ہوتا ہے اور
... ہیئے ادب میں اصلاحی عنصر کو ایک لطیف، غیر مرئی اور غیر محسوس لباس
میں ... کرنا چاہیئے۔ حالانکہ قوت اور اثر میں وہ عام مصلحین کی ضخیم کتابوں اور
طویل خطبوں سے بھی بڑھ چڑھ کر ہوتا ہے لیکن جب کوئی شاعر یا ادیب

کھلم کھلا ایک مصلح کا چوغہ زیب بدن کرلیتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے
کہ اس کے جسم پر ادب کا جامہ تار تار ہو کر رہ جاتا ہے

پھر اگر یہ نئے لکھنے والے بقول خود معاشرے کے کریہہ پھوڑوں
پر نشتر ہی لگائیں تو منظور لیکن بسا اوقات تو ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے
کہ ایک وسیع حوض ہے جو خون اور پیپ سے لبریز ہے اور ہمارے نئے
ادیب اس حوض میں پڑے غوطے لگا رہے ہیں اور اپنے اس فعل میں
ایک عجیب ناقابلِ فہم مسرت محسوس کر رہے ہیں گویا اس خون اور پیپ
کے حوض میں غوطے لگانا ہی بجائے خود ایک مقصد ہے۔ بات اصل میں
یہ ہے کہ یہ چیز اپنی جگہ پر صحیح ضرور ہے کہ جنسی تجربہ انسانی زندگی کا ایک
نہایت ہی اہم تجربہ ہے جو حیاتِ انسانی میں گوناگوں صورتوں میں ظہور
پذیر ہوتا ہے لیکن نئے ادیب محض اس جنسی تجربہ کو تمام حیاتِ انسانی
پر حاوی سمجھے بیٹھے ہیں۔ حالانکہ زندگی میں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے
پیٹ کی بھوک، روٹی کے لئے جد و جہد، ماں کی محبت اعلیٰ مقاصد کے
لئے ایثار و قربانی، طاقتور کا ظلم اور اس کے خلاف بغاوت اور جنگ، فرض
کا احساس، انسانی ہمدردی جیاتِ انسانی کی ترکیب میں شامل ہیں۔ پھر
ظاہر ہے کہ ایک تجربے کو باقی تجربات سے جدا کر کے اس پر ضرورت سے
زیادہ زور دینا حقیقت کو پیش کرنا نہیں ہے بلکہ اس کی ایک بگڑی ہوئی
اور مسخ شدہ صورت لوگوں کے سامنے لانا ہے اور جب ہمیں ہر افسانے
کی تان اس پر ٹوٹتی نظر آئے کہ افسانے کے کرداروں کو جنسی تجربہ کیونکر ہوا
اور جب ہر نظم کا انداز کچھ ایسا ہو کہ ؎

ہاتھ آلودہ ہے نمدار ہے دھندلی ہے نظر
ہاتھ سے آنکھوں کے آنسو ہیں پونچھے جاتے

یا

جواں سال ایک چنچل مہترانی
منہ سے پان کھاتی آرہی ہے

تو سوائے اسکے کہ شاعر اور ادیب کے پاکیزہ مذاق اور بلند تخیل کی داد دی
جائے اور کیا کہا جا سکتا ہے اور جب ہمارا ادب محض لحاف کے اٹھنے
گرنے، دراڑوں سے نکلنے والے دھوئیں اور جسموں سے نکلنے والی لوئیں
محدود ہوکر رہ جائے اور جب انسان کو ایسے رنگوں میں پیش کیا جائے
کہ وہ ایک نفس پرست جانور سے زیادہ کچھ نہ رہے تو سوائے اس کے

کیا کہا جاسکتا ہے کہ یہ خواہ کچھ ہو مگر نہ زندگی ہے نہ ادب۔

بات یہ ہے کہ حسن یا بدصورتی چیزوں میں بذاتِ خود اتنی نہیں ہوتی جتنی دیکھنے والے کی نظر میں ہوتی ہے اور جہاں ایک حسن پسند نظر بظاہر بدصورتی میں حسن کے پہلو ڈھونڈ لیتی ہے وہاں گندی ذہنیتیں کوڑے کے ڈھیر ہی کی تلاش میں رہتی ہیں اور اسی کو کرید کرید کر خوش ہوتی ہیں۔ انسانی نفسیات ایک بہت ہی پیچیدہ اور الجھی ہوئی چیز ہے کسے خبر کہ جنسیت زدہ ادیبوں کی ان تصانیف کے پیچھے جو معاشرے اور انسانی اخلاق کی اصلاح کے نام پر پیش کی جارہی ہیں خود ان کی اپنی جنسی بھوک اور نفس پرستی کی تسکین کی خواہش کام نہیں کر رہی ہے اور اگر ان کے پڑھنے والوں نے بھی ان میں بجائے اصلاح کے پہلو ڈھونڈنے کے لذت اور دلچسپی محسوس کرنی شروع کردی تو پھر ان اصلاح کرنے والوں اور اصلاح پانے والوں دونوں کا خدا ہی حافظ ہے۔

سماج اور افراد کی زندگیوں کا تجزیہ کرنا اور ان میں جنسی تحریکوں کو کہیں کہیں اصلاح کی غرض سے نمایاں کرنا سماج کے لیے مفید اور صحت بخش ہوسکتا ہے لیکن خود پر جنسیت کا سودا سوار کرلینا اور اس میں بری طرح کھوجانا ہر پہلو سے اسی کا ذکر کرنا انسان کے تمام تر تجربات کو اسی مرکز پر یکجا کردینا کسی کی بھی اصلاح اور صحت میں مدد نہیں دے سکتا بلکہ خود ایک ناقص اور علیل ذہنیت کا پتہ دیتا ہے جس کا مظاہرہ ہمارے بیشتر نئے ادیب کر رہے ہیں۔ اتنا تو ایک سرسری نظر میں اندازہ ہوجاتا ہے کہ نئے لکھنے والوں نے زندگی کا اتنا گہرا مطالعہ نہیں کیا جتنا کہ فرائڈ اور ہیولاک ایلس کا کیا ہے اور ان میں حقیقتاً صحیح اور بلند ادب پیدا کرنے کی خواہش اس قدر کارفرما نہیں ہے جتنا غیر شعوری طور پر ایک مسرت رساں تخیلاتی تسکین اور جنسی تفریح کے تلاش کا جذبہ کام کر رہا ہے

ہمارے نئے ادب کی بنیاد بڑی حد تک بیسویں صدی کے ربع اول کے ان انگریزی ادیبوں کی تصنیفات پر ہے جو مشہور فلسفی اور ماہر نفسیات فرائڈ کی تصنیفات سے متاثر ہوئے۔ فرائڈ نے ایک نظریہ دنیا کے سامنے رکھا اس نے کہا کہ جملہ انسانی خدمات کا محرک جنسی جذبہ ہے اپنے اس نظریے کو پیش کرنے کی دھن میں فرائڈ حقیقت سے کہیں آگے بڑھ گیا۔ اس نے انسان کے ہر جذبے اور عمل کا تجزیہ کرکے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس کا اصل جنسی جذبے کے سوا کچھ نہیں۔ در اصل یہ ایک بڑا مبالغہ ہے اس کا اثر یہ ہوا کہ مذہبی اور اخلاقی قدریں پامال ہو کر رہ گئیں فرائڈ نے اخلاق کو محض نمائش و تصنع قرار دیا۔ اس کے نزدیک مذہب جنسی آسودگی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ انسان کے باہمی تعلقات کے متعلق فرائڈ نے یہ اظہار خیال کیا ہے کہ افراد خاندان کے تعلقات کی بنا بھی جنسیت پر ہے۔ ماں اور بیٹے باپ اور بیٹی بھائی اور بہن کی محبت میں بھی جنسی عنصر کارفرما ہے۔ فرائڈ نے خوابوں کی تفسیر اس طور پر کی ہے کہ کوئی خواب بھی خواہ وہ کسی قدر جنسی خیالات سے دور کیوں نہ ہو مگر اس کی بنیاد صرف جنسی وجوہ سے ہوتی ہے۔ در اصل فرائڈ کوئی صحیح الدماغ حکیم نہ تھا۔ اس کے دماغ پر جنسیت سوار تھی۔ اس کے علاوہ اس کا مقصد خدا، مذہب اور اخلاق کا تمسخر اڑانا تھا۔ مگر ہمارے نئے ادیبوں نے فرائڈ کے ہر قول کو گرہ میں باندھ لیا ہے۔ ہرچند کہ فرائڈ کو ادب سے کوئی مخصوص تعلق نہ تھا اور نہ زندگی ہی کا مطالعہ اس نے پوری طرح کیا تھا۔

کاش کہ ہمارے نئے ادیب صاحبِ عقل ہوتے۔ کاش! وہ ادب برائے زندگی کا نعرہ بلند کرنے سے قبل سمجھ سکتے کہ زندگی کیا ہے اور ادب کس کو کہتے ہیں۔ (بشکریہ نیرنگ خیال)

برنز ——— دماغی

دماغی کام کرنیوالوں کے لئے بیحد مفید ہے

• دماغ کو روشن اور شگفتہ کرتی ہے۔
• قوت حافظہ کو تقویت پہنچاتی ہے
• مفرح اور مقوی قلب ہے۔
• بڑھاپے میں صحت کا سہارا ہے۔

قیمت ۲۰ یوم، چار اونس، چار روپے

حاذق دواخانہ، بندر روڈ، کراچی

یرا امروہی •

کوئی سُنے تو سُناؤں!

یں اُن کو چھوڑ کے اپنی تلاش میں گم ہوں
یہ وہ مقام طلب ہے جہاں خرد نہ جنوں

ما گئی ہے نظر میں یہ کس کی وضع جمیل
بدل رہا ہے زمانہ لباس گونا گوں!

نو کا جوش ہوا صرفِ رنگ و بو ورنہ
عجب نہ تھا کہ اُبلتا زمیں سے چشمۂ خوں

یہ کیا کہ چہرۂ حق جب بھی بے نقاب ہوا
فسوں زدوں کو نظر آئے خد و خال فسوں

ستارۂ سحر و شمع نیم شب کی قسم
یہاں فروغ نفس ہے بقدر سوز دروں

یہ نازِ حسن ہے یا امتحانِ شوق اے دوست
کہ تیرے ساتھ رہوں اور تجھ کو پا نہ سکوں

ریاضِ دہر سے اے دوست "سرسری" نہ گذر
روش روش ہے تحیر فروش د بوقلموں

ہر ایک گل کی جبیں پر لکھا ہوا ہے "کیا"
ہر ایک غنچہ کے دل میں کھدا ہوا ہے "کیوں"

بہارِ لالہ و گل کیا کہ یاد ہے اتنا
چمن کو ہم نے بھی دیکھا تھا غرقِ قلزم خوں

بس ایک آگ ہے جو حسن میں ہے گرمیٔ ناز
مزاج عشق میں ٹھہرے اگر تو سوزِ دروں

رتیں یاد ہیں لاکھوں حکایتیں لیکن
کوئی سنے تو سناؤں! کوئی کہے تو کہوں!

(بشکریہ کاروان)

محمود فاروقی

راز

لائبریری بہت بڑی اور خوب صورت تھی ——————
بہت ساری چھوٹی اور بڑی الماریاں، لانبے لانبے خاموش ہال، اونچی منقش چھت، خوبصورت مخروطی دریچے!

ایک دوپہر میں جبکہ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی میں ایک لانبے خاموش ہال کے گوشے میں بیٹھا کتاب دیکھ رہا تھا کتاب کا نام تھا "ہم اپنے آپ مالک ہیں" مصنف نے بڑے دل چسپ انداز میں انسان کی خود مختاری اور اس کی عظمت و سربلندی کے متعلق دلائل دیے تھے چونکہ میری طبیعت اچاٹ اچاٹ سی تھی، اس لئے یہ بحث دل چسپ ہونے کے باوجود میرے ذہن پر ایک بڑا بوجھ معلوم ہو رہی تھی میں نے کتاب میز پر رکھ دی اور کرسی پر سر ٹیک کر بے مقصد اِدھر اُدھر دیکھنے لگا —— ہال تقریباً خالی تھا۔ دوسرے ہال کی آخری نشست پر ایک موٹا سا آدمی اخبار پڑھ رہا تھا۔ لائبریری کا منتظم اپنی میز پر موٹی کمانی کی عینک لگائے اونگھ رہا تھا۔

واقعی وہ بڑا اداس دن تھا —— ایک ایسا دن جب میں ہلکی ہلکی خنکی سے جسم میں گدگداہٹ پیدا ہو جاتی ہے پورے ہال میں خاموشی اور ایک طرح کی افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ صرف ایک چڑیا کبھی کبھی چوں چوں کرنے لگ جاتی جو بجلی کے ایک تار پر سمٹ سمٹا کر بیٹھی ہوئی تھی اس اداس فضا سے اکتا کر میں دریچہ سے باہر دیکھنے لگا ——
بارش قدرے تیز ہو گئی تھی لوگ لانبے گرم کوٹ اور رنگ برنگی برساتیاں اوڑھے چائے اور قہوہ کے اسٹالوں پر کھڑے ہوئے تھے
ایک دوسرے سے اجنبیت اور بیگانگی کے باوجود ان کا ایک دوسرے سے قریب سمٹ سمٹا کر کھڑا ہونا مجھے بہت ہی بھلا معلوم ہوا ——
واقعی بارش لوگوں کو کس قدر قریب کر دیتی ہے! میں بہت دیر تک ان لوگوں کو دیکھتا رہا جن کے دل پھٹے ہوئے تھے لیکن ——
وہ سب کچھ بھول کر ایک دوسرے کے قریب آ چکے تھے کاش وہ ہمیشہ اسی طرح ملے جلے رہ سکتے اور ان کو کوئی علیحدہ نہ کر سکتا۔

باہر کے اس خوش گوار منظر کو میں محویت کے ساتھ دیکھتا رہا اور طرح طرح کی باتیں سوچتا رہا —— لیکن میری محویت اور لائبریری کی خاموش فضا میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا۔

کھٹ ...... کھٹ ...... کھٹ ......

کھٹاک!!

لائبریری کا منتظم بھی کاؤنٹر پر چونک اٹھا اور اپنی عینک درست کر کے اس شخص کو گھورنے لگا جو ابھی ابھی ہال میں داخل ہوا تھا ——
ایک اوسط جسم کا بوڑھا آدمی اچٹتی ہوئی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا اخباروں کے شیلف کے پاس کھڑا ہو گیا اس کا لانبا گرم کوٹ بے ڈھب اور پھٹا پھٹا سا تھا۔ ایک موٹی سی ٹوٹی ہیٹ جس پر مکڑی کے جالے اور رنگ برنگ کے دھبے پڑے ہوئے تھے اس کے سر پر مسلط تھی پتلون ٹخنوں سے اونچا اور پیوند لگا ہوا تھا —— اس کے بوٹ موٹے تہ بہ تہ تلے کے بے ڈھنگے اور بد وضع تھے۔ جسے ڈوریوں اور تسموں سے کس کر باندھا گیا تھا۔ غالباً ان کے نیچے لوہے کے نال جڑے ہوئے تھے اسی لئے جب وہ مضحک بوڑھا چلتا تھا تو بری طرح کھٹ کھٹ ہوا کرتی تھی۔

کچھ دیر تک وہ اخباروں کو الٹ پلٹ کرتا رہا۔ اس کے بعد دیواروں پر لگی ہوئی تصویروں کو دیکھتا ہوا وہ میرے بالکل ہی مقابل آکر بیٹھ گیا اور اپنی گھنی ڈاڑھی کو کھجاتا ہوا جمی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں گھبرا سا گیا .... ایک ایسے اداس دن میں خاموش لائبریری کے ہال میں اس قسم کے عجیب و غریب اجنبی کا بُری طرح گھورنا اور برابر گھورے جانا گھبرانے کے لئے ایک معقول سبب بن سکتا ہے۔

مجھے تو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ——— لائبریری کی کسی پرانی مصور کتاب کا کوئی قدیم مرقع اچانک باہر نکل آیا ہے
میں دوبارہ میز پر سے کتاب اٹھا کر دیکھنے لگا ———
لیکن ؟ ———

"دوست" ——— اس نے سرگوشی کرتے ہوئے چپکے سے مجھے مخاطب کیا۔ بلاشبہ میں چونک پڑا اور حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"دوست" اس کی آواز میں بڑا وقار اور ساتھ ہی ساتھ بڑی شفقت سی گھلی ملی ہوئی تھی۔ جب میں اس کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے تیز سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ یہاں سے بھاگ جاؤ! کتاب کاؤنٹر پہ پھینک دو اور چپکے سے بھاگ جاؤ"

کیوں ؟ میں نے اس طرح سرگوشی کرتے ہوئے سوال کیا۔

وہ میرے قریب کھسک آیا اور رازدارانہ لہجہ میں اس طرح کہنے لگا جیسے کسی اور کے سن لینے سے وہ خوف زدہ ہو "اس لئے .... یہ کتابیں تم کو تباہ کردیں گی، کتابیں بڑی خطرناک ہوتی ہیں، وہ غیرمحسوس طریقہ سے آدمی کو لوٹ لیتی ہیں مجھے بھی ان کتابوں نے بری طرح لوٹا ہے۔ میں ان کے فریب سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میں ان سحروں سے بھی خوب واقف ہوں جنھوں نے ان موٹی موٹی مجلد کتابوں کو لکھا ہے

"اِدھر دیکھو" اس نے دیوار پر لگی ہوئی تصویروں کی طرف اشارہ کیا۔ یہ سب مسخرے اور پکے بازی گر ہیں۔ ان سب کو مچھلیاں پکڑنے کا بڑا شوق تھا۔ اس لئے اُنھوں نے قلم اور کاغذ کے ذریعہ یہ خوبصورت کاغذی جال بنائے ہیں تاکہ تمھارے جیسے بیوقوف پھنس کر اس جال میں پھنس کر تڑپتے رہیں ——— میں اس لائبریری میں عرصہ سے آتا ہوں کتابیں پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ یہ دیکھنے کے کہ یہ کتابیں پڑھنے والوں کو کس طرح شکار کررہی ہیں۔ یہاں آکر لوگ کتابوں کو پڑھتے ہیں اور میں ان پڑھنے والوں کو .... تم بھاگ جاؤ .... چپکے سے اُٹھ کر بھاگ جاؤ .... ورنہ تم

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے میرا ہاتھ زور سے دباتے ہوئے کہا ہاں تم کھو جاؤ گے۔ ان موٹی موٹی کتابوں میں ہمیشہ کے لئے گم ہو جاؤ گے ان کی خوب صورت جلد سختی سے تم کو کھینچ لے گی۔ اور سطروں کے پھندے تمھاری معصوم زندگی کو بری طرح جکڑ لیں گے۔ الفاظ کی سنگینیں تمھارے ذہن میں پیوست ہو جائیں گی ——— اس کے بعد......!

"اس کے بعد کیا ہو گا ؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

تمہاری روح مضمحل ہو جائے گی۔ مایوسی اور تھکن تمہارے دماغ پر چھا جائے گی۔ تمہاری چمکتی ہوئی مسرور آنکھیں بے رونق ہو جائیں گی ——— آہ ! تم کو زندگی پر ایک بہت بڑا بوجھ محسوس ہو گا اور تمہاری بھولی بھالی چنچل زندگی اس بوجھ کے نیچے اس طرح دب جائے گی جیسے کسی موٹی کتاب کے درمیان کوئی منچلا پتنگا چپک کر رہ جاتا ہے

اپنی زندگی کو بچاؤ میرے دوست اور یہاں سے بھاگ جاؤ۔

یہ لائبریری تو ایک بہت بڑا مقبرہ ہے۔ یہ تمام کتابیں شکوک اوہام کی منحوس لاشیں ہیں جنھیں مصری ممیوں کی طرح مسالے لگا کر خوشنما جلدوں کے کفن اور دیدہ زیب الماریوں کے تابوت میں سجا سجا کر رکھ دیا گیا ہے ——— ——— شگفتہ اور مسکراتے ہوئے چہرے اُن پرانی لاشوں کا تماشا دیکھنے کے لئے یہاں آتے ہیں ——— لیکن آہ......... جب وہ یہاں سے واپس جاتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سہمی ہوئی تھکی ہوئی روحیں اہرام کے تہ خانوں سے باہر نکل رہی ہیں۔

اس مقبرہ سے جہاں ازلی نحوستیں پھڑپھڑاتی ہوئی مکروہ چمگادڑوں کی طرح فضا میں چکر لگا رہی ہیں ذرا باہر تو نکل کر دیکھو کائنات کے پھیلے ہوئے خطوط پر زندگی مچلتی ہوئی رقص کررہی ہے۔ آسمان کی وسعتوں اور زمین کی نت نئی ایلموزیوں میں ایک بہت بڑا راز پوشیدہ ہے۔ سڑکوں پر چلتے پھرتے انسان زندگی کی مچلتی ہوئی تفسیریں ہیں۔ ان سب میں سے ہر ایک کھلی ہوئی کتاب ہے جس میں مسرت و غم، یقین و شک، خندہ و اشک، سکون و اضطراب، خیر و شر کی ہزاروں کہانیاں واضح طور پر مسطور ہیں کچھ جاننا چاہتے ہو تو اس لائبریری سے باہر نکلو دنیا میں بسنے والوں کا مطالعہ کرو ان کے دلوں کو ٹٹولو تم کو وہ راز معلوم ہو جائے گا جس کی کھوج میں تم یہاں چلے آتے ہو"

وہ راز کیا ہے ؟ میں نے ڈرتے ڈرتے اس عجیب و غریب بوڑھے

سوال کیا۔
میں تم کو بتادوں گا! اس نے اپنے بجھے ہوئے پائپ کو منہ میں
تے ہوئے کہا۔ اگر میں یہ بات اس جگہ کہدوں تو معلوم ہے کیا ہوگا؟
"کیا"........ میں نے بے ساختہ سوال کیا؟
وہ دھیمی سرسراتی ہوئی آواز میں کہنے لگا ——— للاریوں
پٹ کھل جائیں گے اور یہ موٹی موٹی کتابیں اپنے ورق پھڑپھڑاتی
ی غصہ میں باہر نکل آئیں گی۔ اور ان تصویروں کے فریموں میں سے یہ بڑے
ے مصنف اور مفکر قلم تانے دانت پیستے ہوئے نیچے کود پڑیں گے
ہ ساری لائبریری میں ایسا ہنگامہ برپا ہو جائے گا کہ وہ بے وقوف منتظم
بے کتنی ہی مرتبہ گھنٹی بجائے یہ شور بند نہیں ہو سکے گا۔
باہر آؤ میں تم کو بتاؤں! بوڑھے نے مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام
یا اور اس طرح گھسیٹتا ہوا مجھے ہال سے باہر لے گیا جیسے اسے کسی حادثے
ے پیش آنے کا اندیشہ ہو۔
باہر لائبریری کے چمن میں بہار چھائی ہوئی تھی۔ بارش تھم چکی تھی
یک طرف قوس و قزح دمک رہی تھی اور سیاہ بادلوں کے پیچھے سے ڈوبتے
ہوئے سورج کی سنہری دھوپ اس طرح زمین پر پڑ رہی تھی جیسے کوئی نئی
نویلی دلہن ڈولی سے چھاجھن چھن کرا تر رہی ہو ——— گل بابونہ
کے خوبصورت جھنڈ پر لال اور نیلے گلدم مسلسل چہچہا رہے تھے۔ خوبانی
کے خوشوں پر رنگ برنگ کی تتلیاں اِدھر سے اُدھر چکر لگا رہی تھیں۔

میرے عجیب و غریب دوست نے قوس قزح کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے کہا "کتنی واضح اور روشن دلیل ہے" پھر اس نے سڑک
پر پانی میں کھیلتے ہوئے خوبصورت بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
کہا ———
"ایک معصوم اور خوبصورت ننھا سا ثبوت" منچلے اس پھیلی
ہو کائنات سے بڑھ کر کوئی معقول کتاب ہو سکتی ہے۔
"لیکن وہ راز" میں نے بوڑھے کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے
ہوئے کہا۔
قاہ، قاہ، قاہ ——— ہو، ہو ہو، میرے نادان
اور بے وقوف دوست وہ کوئی راز نہیں ہے وہ تو ایک کھلی ہوئی بات ہے
یہ مشکوک فلسفی اور منکر اس کھلی ہوئی بات سے آنکھیں بند کر لیتے
ہیں اس لئے اس لائبریری میں وہ ایک ناقابل انکشاف راز بن جاتی ہے
اور اگر کوئی کھلی آنکھوں اور کھلے دل سے دیکھے اور سوچے تو خدا کی بنائی
ہوئی اس کھلی ہوئی کتاب میں وہ ایک واضح حقیقت نظر آتی ہے۔
وہ عجیب و غریب اجنبی بوڑھا یہ کہہ کر تیزی کے ساتھ سیڑھیوں سے
اتر گیا جیسے اسے اس بات کا خوف تھا کہ میں اس کے ساتھ ہٹ دھرمی
کرنے لگ جاؤں گا اور اس کے خیال کی تردید کر دی جائے گی حالانکہ میں
ایسا نہیں کر سکتا تھا کیونکہ میرے سامنے پھیلی ہوئی دنیا اس قول کی
پوری طرح تصدیق کر رہی تھی! ——— (بشکریہ فاران)

حاذق ہیر ٹانک آئل ——— بالوں کی قدرتی خوراک

بالوں کو قبل از وقت سفید ہونے سے روکتا ہے۔ بالوں کو گرنے سے بچاتا ہے اور ان کو سیاہ لمبے اور چمکدار بناتا ہے سو فیصدی
نباتی تیلوں سے کیمیاوی طریقوں پر بنایا ہوا خوشبودار اور روزمرہ کے استعمال کے لئے بہترین ہیر آئل ہے۔ سر کی خشک جلد
جو عموماً بال گرنے گنج اور ریفا (چھلکے اترنا) کا باعث ہوتی ہے کو تازگی بخشتا ہے اور قدرتی سیاہ بالوں
کی نشوونما میں مدد کرتا ہے۔ مرد اور عورت دونوں کے لئے مفید ہے۔

قیمت، ایک روپیہ بارہ آنے (۱۲/۱)

حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی

اعجاز احمد رومانی ●

ستارہ شناس

"کیا تم مجھے انسانی خلقت کا راز بتا سکتے ہو؟"
میں نے اپنے نفس سے سوال کیا۔
"کتنے عرصے سے میرا دل بیقرار ہے کہ میں معلوم کروں یہ سب شور
کیسا ہے۔ میری آنکھیں گھومتی ہیں وہ رنگوں کی قوس وقزح اور صورتوں کی بو
قلمونی دیکھتی ہیں۔ صورت کے تال اور ننا سے میرے کان بھر جاتے ہیں۔
وہ کیا ہے جس سے ان میں تلخی اور شیرینی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ عالم آہنگ و
رنگ مجھ کو بتاؤ یہ سب کیا ہے جب میں ایک ساعت کے لئے اپنی آنکھیں
موند لیتا ہوں تو میرے اندر کی دنیا ہفت رنگ کی پنکھڑی کی مانند کھل جاتی
ہے جہاں سے نغموں کے سوتے پھوٹ پڑتے ہیں اور رنگ برنگے پھول بہار
کا دامن تھامے نمودار ہوتے ہیں مگر جب اس جانب سے ایک ثانیہ کے لئے
بھی توجہ ہٹتی ہے تو کچھ بھی نہیں رہتا۔ کیا یہ کھیل کسی کامل کی توجہ کا حاصل ہے
یا ایک وسیع و عریض کاووس ہے جو تمام جانداروں کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یہ چرخ
ستارے، مہر، ہُمر، کوہ، سمندر، برگِ شجر، برف، شعلے خارا ور گل یہ سب کیا ہے
یہ جلالی و جمالی کی آنکھ مچولی ہے یا اور کچھ، میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔ تم جو کون
مکاں کے اسرار سے آگاہ ہو"
نفس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا
جلد ہی ہم نے ایک شخص دیکھا جو ایک چٹان پر بیٹھا تھا اور شیشے کے
ایک خوش رنگ برتن سے شہد نکال کر کیچڑ میں گھول رہا تھا
یہ ایک رجائی ہے
میرے نفس نے کہا
"پنکھڑیاں میرے زخم کا پھایہ نہ بن سکیں گی۔
میں نے کہا
ہم آگے بڑھے اور اب ہمارا گزر ایک جلتے ہوئے صحرا سے ہوا جہاں
قدرت جہنم کے نتھنوں سے سانس باہر نکالتی ہے وہاں ایک نوجوان نظر
آیا جو ریت میں پھولوں کے بیج بو رہا تھا
"ریت تمہیں بیج ڈالنے سے منع نہیں کرتی۔
پھول دینے سے انکار کرتی ہے
اس نے کہا
یہ ایک قنوطی ہے
میرے نفس نے کہا
نمک سے میرے زخم چلا اٹھیں گے
ہم آگے چلے اور چلتے چلتے ایک پہاڑ کی چوٹی پر آ گئے۔ بلند ترین چوٹی
پر جہاں سے کہکشاں فقط چند ہاتھ بڑھا کر چھوئی جا سکتی ہے۔ وہاں ایک
منچلا نظر آیا جو آفتاب سے چراغ جلانے کی دھن میں مصروف تھا۔
"آفتاب بے شک آتشیں ہے۔
مگر تم اس سے چراغ روشن نہیں کر سکتے۔
میں نے کہا
"یہ ایک حقیقت پرست ہے اس کے پاس ہمارے سوال
کا جواب سالم نہیں ادھورا ہوگا"
میرے نفس نے کہا۔
ہم اس بلند چوٹی سے نیچے اتر آئے اور ایک چھوٹی سی مسافت
بعد ہم ایک رشکِ ارم گلستان میں داخل ہوئے جہاں حسین اور شاہکار مجسمے
ایستادہ تھے۔ وہاں ایک چمکیلے کنج میں ایک شخص نظر آیا جو ایک بت سے
والہانہ انداز میں لپٹا ہوا تھا اس کی آنکھیں بند اور لب گنگنا رہے تھے
اس کے قریب موسیقی کے آلات، سنگتراشی کے اوزار، رنگوں کے ڈبے
اور موقلم بکھرے ہوئے تھے۔ یہ ایک بالسری اٹھائی تاکہ اسے بیدار کر
یہ ایک تخیل پرست ہے آؤ ہم آگے بڑھیں گے
میرے نفس نے کہا۔

اس باغ سے نکل کر ہم ایک جنگل سے گزرے وہاں ایک کھلے میدان میں ایک شخص نظر آیا جو پرندوں کے لئے غلہ بکھیر رہا تھا۔ بہار کی نوید دینے والے خوش رنگ پروں والے پرندے اس کے قریب جمع تھے

یہ ایک مخیر ہے اور ہمارا سوال اس کے لئے غیر اہم ہے "

ہم آگے بڑھے حتیٰ کہ ہم سمندر کے کنارے تک گئے اور موجوں کا شور سننے لگے۔ وہاں ایک ٹاپو پر ایک شخص نظر آیا جو مری ہوئی مچھلیوں کو چن چن کر واپس سمندر میں ڈال رہا تھا

یہ ایک قدامت پسند ہے

میرے نفس نے کہا

تھوڑی دیر بعد ہم نے سمندر کا کچھ حصہ ایک سفینے کے ذریعہ عبور کیا اور اتر کر ایک عالی شان تجربہ گاہ میں آ گئے وہاں ایک شخص دکھائی پڑا جو برف کی قاشوں سے موم کے ذخیروں کو پگھلا رہا تھا اس کو دیکھ کر میرے نفس نے ایکا ایکی کہا۔

یہی وہ بدبخت ہے جس نے انسان کے سینے سے ایک بولنے والی شے نکالی۔ اس نے ہمیشہ فطرت کے پہاڑ کاٹنے اور عمر صحراؤں میں ہمیشہ عقل کے جھگڑوں کی راہنمائی قبول کی۔ اب جادہ ایام اور ادراک کی مسافت اسے اس منزل پر لے آئی جہاں سے یہ ان نرم گاہوں کو لوٹ جانا چاہتا تھا۔ جہاں وقت کی سانسیں دل کے ساتھ ہم آہنگ تھیں یہ ایک مادہ پرست ہے "

اس وقت وہ شخص ہماری جانب متوجہ ہوا اور کہنے لگا کہ وہ ذرات کے علم کا ماہر ہے اور اگر چاہے تو زمین کے تختے سے پہاڑوں کی میخیں اکھیڑ ڈالے۔

یہ بات سن کر میں بڑا مرعوب ہوا لیکن میں جان چکا تھا کہ یہ سحر کار لٹے ہوئے سیروں سے ریاضی کے سوال حل کرانا چاہتا ہے مگر نہیں جانتا بلبل قفس میں آشیانہ اس لئے نہیں بنائے گی کہ اسے اپنے بچے کی غلامی گوارا نہیں ہے

ہم اسے چھوڑ کر باہر آ گئے اور ایکبار پھر سمندر کے کنارے کھڑے موجوں کا شور سننے لگے۔ اب یہاں پر ایک اور جہاں کشا نظر آیا جو .... ریت پر ایک غیر مرئی سائے کا نقش اتار رہا تھا۔ سمندر کی تیز اور سرکش

موجیں بار بار آتیں اور سب کچھ مٹا ڈالتیں۔ مگر وہ اپنی عزم کیساتھ برابر اپنے کام میں منہمک تھا۔

" یہ ایک صوفی ہے۔ آؤ اس سے بھی بھاگ چلیں۔

میرے نفس نے کہا

اس کے بعد ہم میدانوں کی جانب گھوم گئے اور بڑھتے گئے حتیٰ کہ ہم نے ایک آواز سنی ۔

" یہ زندگی ہے گہری، وسیع حسین اور پرشکوہ "

جب ہم اس آواز کے قریب پہنچے تو ہم نے ایک شخص دیکھا جس نے آفتاب کی جانب پیٹھ کر رکھی تھی اور فقط اپنے لرزاں سائے کو دیکھ رہا تھا۔

" کیا اسے نہیں معلوم کہ ہم شباب کے خزانے مٹا کر زندگی کا تھوڑا مول لیتے ہیں۔

میں نے کہا

یہ ایک ظاہر بین ہے جو کسی شے کی کامل اصلیت اور سچائی کو سمجھے بغیر اس کے کسی جزو پر توجہ مرتکز کر دیتا ہے۔ یہ ہمارے سوال کا جواب کیونکر دے سکتا ہے

میرے نفس نے کہا

ہم آگے بڑھے حتیٰ کہ ہم نے ایک شخص دیکھا جو برگد کے ایک درخت تلے لیٹا ہوا تھا اور اپنا سر ریت میں دبائے ہوئے تھا

اسے دیکھ کر میں بے اختیار چلا اٹھا کہ یہ شخص ہمارے سوال کا جواب ضرور دے گا اور یہ سن کر میرے نفس نے کہا

یہ گزشتہ تمام آدمیوں سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ کیونکہ یہ ایک زاہد ہے "

اس طرح میرا سفر بے کار ہو گیا اور مجھے اپنے سوال کا جواب نہ مل سکا مگر میرا نفس مصر ہے کہ وہ مجھے میرے سوال کا جواب ضرور مہیا کرے گا صبح و شام وہ کسی ادھیڑ بن میں مصروف رہتا ہے اس نے مجھ سے کہہ رکھا ہے کہ وہ مجھے میرے سوال کیلئے ان چیدہ اور فرستادہ نفوس کے پاس لیجائیگا جنکے ایک ہاتھ میں آفتاب اور دوسرے میں ماہتاب بھی رکھ دیا جائے تو وہ سچائی کے امانت دار رہتے ہیں انکی ہیبت اور رعب سے شعلے گلزار بنجاتے ہیں اور دریاؤں کے سینے پھٹ کر وہاں پگڈنڈیں نمودار ہوتی ہیں وہ چلتے آفتاب کو ٹھہرا لیتے ہیں اور چاند کے ٹکڑے بھی کر سکتے ہیں وہ زندگی کے کامل ترین نمائندے اور لازوال تو

یاض انور •

طلوعِ سحر

سنور رہا ہے گلستاں میں زندگی کا نظام
ں سن رہا ہوں صدائے شکستِ مینا و جام
ہمیں ہے پھر بھی گلہ ہے نظر فریبی کا؟
دیا ہے تم نے خزاؤں کو خود بہار کا نام
سی سیاہی سے ابھرگی عہدِ نو کی سحر
چھنک چھنک کے سلاسل یہ دے رہے ہیں پیام
خزاں نصیب بہار و نشیمن بدلنا ہے
یہی ہے آج تقاضائے گردشِ ایام
ہم ہم کے گریں گے یہ "مہرباں آقا"
چمک چمک کے جو لہرائی تیغ خوں آشام
زمانہ کچلے گا کب تک ریاض ان کا جنوں
جو مسکرا کے کریں موت کو ہمیشہ سلام

(بشکریہ مساوات)

خالد بزمی •

نیت ٹھیک نہیں

حالات نے تیور بدلے ہیں اطوار کی نیت ٹھیک نہیں
افکار کی شکنیں ظاہر ہیں آثار کی نیت ٹھیک نہیں
اب صبح کے روشن ماتھے پر اک داغ سا لگنے والا ہے
اے اب تک سونے والو اٹھو، بیدار کی نیت ٹھیک نہیں
حالات کا وہ سیدھا دھارا اب الٹے رخ کو بہتا ہے
گفتار نے کروٹ بدلی ہے رفتار کی نیت ٹھیک نہیں
اب روز روشن میں اپنے ایمان پہ ڈاکے پڑتے ہیں
سرکاری بوٹ والوں کے اطوار کی نیت ٹھیک نہیں
ووٹوں کے بھکاری اب ہیں کہاں یہ کاش کوئی ان سے کہہ دے
سرکارِ دو عالمؐ کے حق میں اغیار کی نیت ٹھیک نہیں
خالدؓ کی شجاعت زندہ کرو طارقؒ کے فسانے دہرا دو
پھر آج اسلام کے فرزندو! اشرار کی نیت ٹھیک نہیں

(بشکریہ آزاد)

چیخوف

برنجی شمع دان

ساشا کوئی چیز کاغذ میں لپٹی ہوئی بغل میں دبائے ڈاکٹر کے مکان کی طرف تیز قدموں سے جا رہا تھا اس رفتار سے گھبراہٹ ضرور ظاہر ہوتی تھی۔ لیکن نہ اتنی کہ اسکے چہرے کے اطمینان کو دبا سکے۔

اس نے دروازہ کھٹ کھٹایا ڈاکٹر نے اندر بلا لیا اور پوچھا "ساشا تم کیسے ہو، مگر دیکھو مجھے اچھی خبر سنانا" (ہنستے ہوئے) "ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو"

ساشا نے گھبرائی ہوئی آواز سے کہا کہ "ڈاکٹر صاحب، میں اب بالکل اچھا ہوں اور میری ماں نے (بغل سے وہ چیز نکالتے ہوئے) یہ آپ کے پاس بھیجا ہے اور کہا ہے کہ آپ نے میرے اکلوتے بیٹے کی جان بچائی ہے، اس لئے معاوضہ تو نہیں کیا دے سکتی ہوں۔ لیکن اگر آپ نے یہ تحفہ قبول کر لیا تو بڑی مہربانی ہوگی"

ڈاکٹر (ہنستے ہوئے) "نہیں ساشا یہ تم کیا کہتے ہو میں نے تو اپنا فرض ادا کیا، احسان کیسا؟ میری جگہ جو بھی ہوتا وہی کرتا جو میں نے کیا"

ساشا (متاثر ہوکر) نہیں ڈاکٹر صاحب ... آپ نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا ہے جو دوسرا کبھی نہ کرتا۔ ہم آپکے احسان سے اتنے دبے ہوئے ہیں کہ کبھی سر نہیں اٹھا سکتے۔ ڈاکٹر صاحب یہ تحفہ آپ کو لینا ہی پڑے گا ورنہ میری ماں کو بڑا رنج ہوگا۔ ہم لوگ بہت غریب ہیں اور غریب کو بڑی خوشی ہوتی ہے اگر کوئی بڑا آدمی اس کی پیش کی ہوئی چھوٹی چیز لے لیتا ہے

ڈاکٹر "ساشا میں تمھارے اور تمھاری ماں کے اخلاق سے بہت متاثر ہوا، لیکن جو کچھ تم لائے ہوئے اسے واپس لے جاؤ سمجھ لو کہ میں نے اسے لے لیا۔

ساشا (ملول ہوکر) ڈاکٹر صاحب ایسا نہیں ہو سکتا۔ میری ماں کو سخت تکلیف ہوگی اور وہ مجھ پر بہت خفا ہوگی (کاغذ کھولتے ہوئے) یہ بہت پرانے زمانہ کی بنی ہوئی چیز ہے، ہمارے یہاں اسی قسم کی قدیم صناعی کی چیزوں کا کاروبار ہوتا چلا آیا ہے اور میرا باپ اس کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ فن کے قدردانوں کے نزدیک یہ بڑی قیمتی و نادر چیز ہے"

یہ کہتے ہوئے ساشا نے اسے نکال کر میز پر رکھ دیا۔

یہ ایک برنجی شمع دان تھا جس کی بیٹھک پر دو عورتیں کھڑی ہوئی شمعدان کے بالائی حصہ کو سنبھالے ہوئے تھیں۔ یہ عورتیں بالکل برہنہ تھیں اور نہایت شوخی کے ساتھ مسکرا رہی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اس کو دیکھ کر اپنا سر کھجایا اور تکلف کے ساتھ اپنا گلا صاف کرتے ہوئے کہا: "ہاں، ہاں یہ آرٹ کا بڑا اچھا نمونہ ہے لیکن —— تم یہ تو دیکھو —— کہ —— یہ کیا چیز ہے کس قدر عریاں، کس قدر غیر مہذب!"

ساشا (حیرت سے) ڈاکٹر صاحب، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ذرا اس کی صناعی تو دیکھیے تو غور فرمایئے کہ بنانے والے نے ان تصویروں میں مسرت کی کتنی زبردست روح پھونک دی ہے ان کو دیکھ لینے کے بعد انسان تھوڑی دیر کے لئے دنیا کے تمام غم بھلا سکتا ہے۔

ڈاکٹر: "ہاں یہ سب درست ہے لیکن تم جانتے ہو کہ میں شادی شدہ انسان ہوں۔ عورتیں اور بچے سب ہی میرے کمرے میں آتے جاتے رہتے ہیں اور میرے لئے یہ کیونکر ممکن"

ساشا: ڈاکٹر صاحب اب آپ کچھ نہ کہیئے۔ یہ آپ کو لینا ہی پڑے گا میں اسے واپس تو نہیں لے جا سکتا لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کا جوڑا ہمارے پاس نہیں ورنہ لطف تو یہ تھا کہ گلدان کے

دونوں طرف ایک ایک شمع دان آپ کی میز پر رکھا ہوتا اور سارا یہ تحفہ مکمل ہو جاتا "

ساآشا کے چلے جانیکے بعد ڈاکٹر دیر تک اس شمع دان کو دیکھتا رہا ——— " اس میں شک نہیں کہ یہ صناعی کا بڑا بے مثل نمونہ ہے اور اس کو پھینک دینا ظلم ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اپنے پاس رکھ بھی نہیں سکتا " وہ دیر تک سوچتا رہا کہ کیا کیا جائے اور آخر کار اس نے فیصلہ کیا کہ یہ تحفہ اوخوف وکیل کی نذر کر دینا چاہیئے اس نے مقدموں میں میری بڑی مدد کی ہے اور دوست ہونے کی حیثیت سے وہ روپیہ نہیں لیتا۔ یہ تحفہ اسی کو دینا چاہیئے وہ ہے بھی اکیلا۔ اسے کوئی عذر نہ ہو گا۔

ڈاکٹر نے فوراً کپڑے پہنے اور شمع دان کاغذ میں لپیٹ بغل میں دبایا اور چل دیا۔

ڈاکٹر " اوخوف! میں تمہارا بڑا احسان مند ہوں، تم نے مقدموں میں میری بڑی مدد کی ہے، روپیہ کی صورت میں تم معاوضہ لیتے نہیں۔ اس لئے میں تمہارے لئے ایک تحفہ لایا ہوں۔

یہ کہتے ہوئے، اس نے کاغذ علٰحدہ کر کے شمع دان سامنے میز پہ رکھ دیا اور بولا " دیکھو کیسی نادر چیز ہے "

اوخوف، یہ شمع دان دیکھ کر بہت خوش ہوا اور بولا " واقعی بڑی بے نظیر صنعت ہے لیکن میں اسے لے نہیں سکتا میری ماں مجھ سے کبھی کبھی ملنے آتی ہے۔ میرے موکل روز ہی آتے جاتے رہتے ہیں اور ان سب کو جانے دو میرے نوکر دیکھیں گے تو کیا کہیں گے "

ڈاکٹر " ہائیں، یہ تم کیا کہہ رہے ہو، یہ تو غور کرو کہ بنانے والے نے ان تصویروں میں مسرت کی کتنی زبردست روح پھونک دی ہے مجھے سخت تکلیف ہو گی اگر تم نے اسے رد کر دیا "

یہ کہہ کر ڈاکٹر فوراً وہاں سے چلا آیا تاکہ اوخوف کو کچھ اور کہنے کا موقعہ نہ ملے۔

ڈاکٹر کے چلے جانیکے بعد اوخوف نے اس شمع دان کو غور سے دیکھا دل ہی دل میں اس کی بہت تعریف کی اور سوچا کہ اس کو ضائع کر دینا تو بڑا ظلم ہے، کیوں نہ سوشکن کو دے دوں۔ وہ ایکٹر ہے اور اس کی بڑی قدر کرے گا۔

یہ سوچکر اوخوف فوراً اٹھا اور سوشکن کو یہ شمع دان دے آیا۔ اس دن سوشکن کے گھر میں بڑا ہنگامہ بپا رہا۔ اس کے ساتھی آتے تھے اور اس شمع دان کو دیکھ کر قہقہے لگاتے تھے لیکن جب کوئی عورت اندر آنے کی اجازت چاہتی تو وہ اسے باہر ہی روک دیتا اور کہتا " میں کپڑے پہن رہا ہوں وہیں باہر انتظار کرو "

اس نے سوچا کہ یہ تو بڑی مصیبت ہے، میرے پاس اکثر عورتیں آتی رہتی ہیں اور وہ یہ شمع دان دیکھ کر کیا کہیں گی۔ وہ اسی فکر میں تھا کہ اس کے ایک دوست نے مشورہ دیا کہ تم اسے فروخت کیوں نہیں کر دیتے یہاں ایک عورت ایسی ہی چیزوں کا کاروبار کرتی ہے، وہ اچھے دام دے کر خرید لے گی۔

سوشکن اسی وقت یہ شمع دان لے کر اس کے پاس گیا اور اونے پونے بیچ آیا۔

دو دن بعد ———

ڈاکٹر شلکاف اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا کسی دوا کی گولیاں بنانے میں مصروف تھا کہ دفعتاً دروازہ کھلا اور ساآشا کوئی چیز کاغذ میں لپٹی ہوئی بغل میں لئے ہوئے تھا۔ اندر آیا ڈاکٹر نے دیکھا لیکن قبل اس کے کہ اس کے آنے کی وجہ پوچھتا۔ ساآشا نہایت خوشی کے لہجہ میں بیتابانہ بول اٹھا " ڈاکٹر میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں (کاغذ کھولتے ہوئے) آج اتفاق سے اس شمع دان کا جوڑا بھی ہاتھ لگ گیا اور میری ماں نے کہا فوراً آپکے پاس اسے بھی پہنچا دوں "

یہ کہہ کر ساآشا نے شمع دان میز پر رکھ دیا۔ ڈاکٹر نے اسے دیکھا اور منہ کھول کر رہ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ کچھ کہے لیکن زبان سے کچھ نہ نکلتا تھا۔

(چیخوف)   (بشکریہ نگار)

عبدالمجید صدیقی •

علامہ اقبالؒ اور حدیثِ نبویؐ

ترجمانِ حقیقت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے کلام بلاغت نظام سے ملت محمدیہ مستفیض ہو رہی ہے۔ اور اکثر مضمون نگار علامہ موصوف کے کلام سے اپنے مضامین کو زینت دیتے رہتے ہیں علامہ کی مضمون آفرینی، بلند خیالی، شکوہ فکر و رفعت نظر کا کیا کہنا بقول حضرت گرامی ؎

در دیدہ معنی نگراں حضرت اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

جہاں تک دین کی تعلیمات کا تعلق ہے علامہ موصوف نے قرآن مجید و احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوال بزرگاں سے جا بجا استدلال کیا ہے اور بعض نہایت گہرے نکتے اور دلچسپ لطیفے پیدا کئے ہیں۔ جن سے دین و ملت کا جاہ و جلال اور اللہ اور اللہ کے رسول صلعم کا حسن کمال ظاہر ہوتا ہے علامہؒ نے قرآن مجید کی تعریف و توصیف میں نئے نئے اسلوب اختیار کئے ہیں اور قوم کو تعلیماتِ اسلامیہ کی طرف رغبت دلائی ہے۔
جزاھم اللہ خیر الجزاء

لیکن باوجود ان خوبیوں کے علامہ کا کلام کوئی وحی الٰہی نہیں ہے جس میں غلطی کا امکان نہ ہو۔ شاعر بہرحال شاعر ہے اور اس کے کلام میں تضاد پایا جانا ممکن ہے بقول سعدیؒ ؎

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم
گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

رسالہ طلوع اسلام جس کا مسلک حدیث رسول اللہ صلعم کا انکار ہے اس کے رئیس التحریر صاحب تقریباً ہر دو چار سطر کے بعد علامہ اقبال کا شعر یا مصرعہ لکھنے کے عادی ہیں اور ان کا حدیث دشمنی کا جذبہ یہاں تک بڑھا ہوا ہے کہ سیدھی سی بات پر مغالطے پہ مغالطہ دیئے چلے جاتے ہیں تاکہ حدیث سے نفرت پیدا ہو اس کی زد قرآن مجید پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ یہ صاحب اور قماش کے ایک اور صاحب جو اپنا نام بجائے ظلمت کے برق ہیں (برعکس نہند نام زنگی کافور) انہوں نے بھی دو نامعقول کتابیں لکھی ہیں۔ جس میں حدیث رسول اللہ صلعم اور صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین پر استہزا کیا ہے۔ طلوع اسلام کی تحریروں اور ان کتابوں میں جا بجا یہ کہا گیا ہے کہ مولوی نے دین کو بگاڑ دیا ہے اور دین کو اگر کسی نے سمجھا ہے تو علامہ اقبال وغیرہ ہیں۔ بادی النظر میں اس قسم کی تحریریں پڑھنے والوں کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہو جاتا ہے کہ یہی درست ہے۔ کیونکہ یہ حضرات مغالطہ اس زور کا دیتے ہیں جب تک پڑھنے والا ان کی دسیسہ کاریوں سے واقف نہ ہو اس کا غلطی کھا جانا ممکن ہے حالانکہ علامہ اقبالؒ قرآن اور حدیث دونوں کے عاشق ہیں اور یہ حضرات قرآن کا صرف نام لیتے ہیں اور حدیث کے منکر بلکہ دشمن ہیں اور دین کی ساری ہئیت بگاڑ رہے ہیں:-

الا انہم ہم المفسدون ولکن لا یشعرون

اس مضمون میں اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ اقبالؒ حاشا وکلا ادارہ طلوع اسلام اور اس قسم کے گمراہ لوگوں کے ہم خیال نہیں ہیں۔ اور ان لوگوں کی کس قدر بے حیائی ہے کہ اگرچہ علامہ موصوف کا مطبوعہ کلام ان کے خیال کی تردید کر رہا ہے لیکن یہ اپنے پروپیگنڈے کی ساحری سے عوام الناس کو گمراہ کئے جا رہے ہیں۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ علامہ موصوف نے قرآن مجید کی بڑی تعریف و توصیف اپنے کلام میں

لیکن یہاں موضوع بحث یہ ہے کہ علامہ نے حدیث نبویؐ سے اپنے
کلام کو کس قدر زینت دی ہے لہٰذا صرف ان اشعار کو پیش کیا جاتا ہے
جن سے حدیث کی عظمت و شان نمایاں ہے ، علامہ فرماتے ہیں ؎

مسلماں را ہمیں عرفان و ادراک
کہ در خود فاش بیند رمز لولاک
خدا اندر قیاس ما نگنجد !
شناس آں را کہ گفتہ ما عرفناک

اس قطعے میں دو مشہور حدیثوں کی طرف تلمیح ہے ۔

لولاک لما خلقت الافلاک

اے محمدؐ اگر تم نہ ہوتے ۔ تو میں دنیا کو پیدا نہ کرتا ۔ (حدیث قدسی)

؎ محمدؐ نہ ہوتے خدائی نہ ہوتی !
خدا نے یہ دنیا بنائی نہ ہوتی

ما عرفناک حق معرفتک وما عبدناک حق عبادتک (حدیث)

حضور فرماتے ہیں کہ اے رب ہم آپ کی پہچان کا حق ادا
نہ کر سکے اور آپ کی بندگی کا حق بھی ادا نہ کر سکے ۔

بندہ ہمہ بہ کہ ز تقصیر خویش
عذر بہ درگاہ خدا آورد
ورنہ سزاوار خداوندیش
کس نتواند کہ بجا آورد
(سعدی)

ظلمت (برق) صاحب کی احول چشمی کا یہ حال ہے کہ انکو
ایک قرآن کے "دو قرآن" اور ایک اسلام کے "دو اسلام" نظر آتے ہیں
چنانچہ کتاب "دو اسلام" میں استن حنانہ کا مضحکہ اڑایا ہے اور اس
روایت کو ملاؤں کی ایجاد قرار دیا ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ مدینہ طیبہ
میں جب مسجد نبوی بنائی گئی اور وہ محض ایک سیدھی سادی سی
عمارت تھی ۔ اس میں منبر نہ تھا ، حضور سرور دو عالم صلعم ایک
خشک کھجور کے تنے سے سہارا لگا کر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے بعد
میں منبر بن گیا تو حضورؐ نے اس خشک چوبی ستون کو چھوڑ کر منبر پہ
نزول اجلال فرمایا ۔ تب وہ خشک کھجور کا ستون رونے لگا ؛ اور
اور فراق رسول کو برداشت نہ کر سکا ، اسکے رونے کی آواز کو
صحابہ کرامؓ نے سنا اور حیرت میں آ گئے ۔ اس تمام واقعہ کو مولانا
جلال الدین رومیؒ نے اپنی مثنوی میں پوری تفصیل کیساتھ نظم کیا ہے
وہ مولانا رومیؒ جن کے لئے ملا عبدالرحمان جامیؒ فرماتے ہیں ؎

مثنویٔ مولویٔ معنوی
ہست قرآں در زبانِ پہلوی
من چہ گویم وصف آں عالیجناب
نیست پیغمبر ولے دارد کتاب

اور وہ مولانا رومیؒ جن کو علامہ اقبال اپنا مرشد مانتے ہیں ؎

پیر رومی مرشد روشن ضمیر
کاروانِ عشق و مستی را امیر

وہ اپنی شہرہ آفاق مثنوی میں ارشاد فرماتے ہیں ؎

استن حنانہ در ہجر رسول ÷ نالہ می زد ہمچو ارباب عقول
در تحیر ماند اصحاب رسول ÷ کز چہ می نالد ستوں با عرض وطول
گفت پیغمبر چہ خواہی اے ستوں ÷ گفت جانم از فراقت گشتہ خوں

آگے ساری حدیث نظم کرنے کے بعد مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

فلسفی کو منکر حنانہ ہست
از حواس انبیا بیگانہ ہست

گویا ظلمت اور طلوع اسلام جیسے بر خود غلط لوگ اگر آج استن حنانہ
کے واقعہ کا انکار کرتے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اس سے پہلے
بھی گمراہ فلسفی اپنی عقل نارسا کے زور پر ایسا ہی کرتے تھے ۔ کیونکہ
یہ گمراہ لوگ حواس انبیا یا ملکۂ نبوت یا علم لدنی سے بیگانہ تھے "
ان جنم کے اندھوں کو کیا خبر کہ سبزہ و آب رواں کا نظارہ کیا ہوتا ہے
آپ کہینگے کہ یہ تو مولانا رومیؒ کا فرمانا ، لیکن علامہ اقبالؒ نے کیا کہا
سنیئے اور ان عقل کے اندھوں کی کوتاہ بینی پر روئیے یا ہنسیئے ۔
علامہ فرماتے ہیں ؎

من چہ گویم از تولائش کہ چیست
خشک چوبے در فراقِ او گریست
اقبالؒ (اسرار خودی)

کیا ادارہ طلوع اسلام اور ظلمت صاحب میں یہ جرأت ہو کہ وہ علامہ اقبال رح کے اس تائیدی شعر کی تردید کر سکیں؟ اپ بھی اگر حدیث دشمنی میں اپنی ضد پر اڑے رہیں تو ان کو چاہیئے کہ علامہ اقبال کو اس زمانے کا سب سے بڑا ملّا (معہ تمام حقارت و نفرت کے جو وہ اس لفظ کے ساتھ چپکاتے ہیں، قرار دیں۔

اب آپکے سامنے علامہ اقبال رح کے کلام سے عشق محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈوبے ہوئے اور عطر محبت رسول میں بسے ہوئے وہ اشعار پیش کیے جاتے ہیں جن کا پس منظر آنحضور کی مختلف حدیثوں سے نگمگا رہا ہے ؎

بنگری با دیدۂ صدیق اگر ÷ قوت قلب و جگر گردد نبی
از خدا محبوب تر گردد نبی ÷ در دل مسلم مقام مصطفیٰ است
آبروئے ما ز نام مصطفیٰ است ÷ در شبستان حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید ÷ ماند شبہا چشم او محروم نوم
تا بہ تخت خسروی خوابید قوم ÷ وقت ہیجا تیغ او آہن گداز
دیدۂ او اشکبار اندر نماز ÷ بوریا ممنون خواب راحتش
تاج کسریٰ زیر پائے امتش ÷ در دعائے نصرت آمین تیغ او
قاطع نسل سلاطین تیغ او ÷ بر قبائے کہنہ چاک از دست او
قیصر و کسریٰ ہلاک از دست او

حدیث۔ لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من نفسہ و ولدہ و والدہ والناس اجمعین۔ او کما قال۔

تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا، جب میں اس کی جان، اولاد ماں باپ اور سب سے پیارا نہ ہو جاؤں۔

در دل مسلم مقام مصطفیٰ است الخ

حدیث:۔ ایک دفعہ حضرت عمر رض کاشانہ نبوت میں تشریف لائے تو دیکھا کہ حضور انور ایک بوریئے پر لیٹے ہوئے ہیں اور بوریئے کے نشان جسد مبارک پر نمایاں ہیں۔ یہ دردناک نظارہ دیکھکر عمر رض جیسے سخت کوش انسان میں تاب ضبط نہ رہی اور رونے لگے یا یا رسول اللہ قیصر و کسریٰ تو دنیا کی راحت و آرام سے مزے لیں اور حضور دونوں جہاں کے سردار ایسی تکلیف میں گزارہ کریں فرمایا اے عمر رض کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ وہ دنیا میں اور ہم آخرت میں آرام اٹھائیں۔

"بوریا ممنون خواب راحتش"

حدیث۔ حضور نے فرمایا۔ جب کسریٰ ہلاک ہوگا۔ تو اس کے بعد کسریٰ نہ ہوگا اور جب قیصر ہلاک ہوگا تو پھر قیصر نہ ہوگا۔ ان کے خزانے تم مسلمانوں میں تقسیم کر دوگے

اب علامہ رح کے یہ اشعار پڑھیئے اور لطف اٹھائیے ؎

در دعائے نصرت آمین تیغ او
قاطع نسل سلاطین تیغ او
بر قبائے کہنہ چاک از دست او
قیصر و کسریٰ ہلاک از دست او

واضح ہو کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ کے سلسلے میں جب بادشاہوں اور حاکموں کو فرمان لکھکر دعوت دی تو اکثر بادشاہوں اور حاکموں نے حضور کے فرمان کی عزت کی اور ادب و تعظیم سے جواب بھیجے، لیکن ایران کا بادشاہ (جس کا نام خسرو پرویز اور لقب کسریٰ تھا) گستاخی سے پیش آیا اور اس شقی ازلی نے حضور کے نامۂ مبارک کو پارہ پارہ کر دیا اور حضور کی گرفتاری کا حکم جاری کرنے کی جرأت کی۔ یہ اطلاع جب آنحضور صلعم کو پہنچی تو حضور نے زبان حق ترجمان سے فرمایا کہ جس طرح خسرو پرویز نے میرا خط پھاڑ ڈالا، اسی طرح عنقریب اسکی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگی۔ چند ہی سال میں ایران مسلمانوں کے دست تصرف میں آیا اور کسریٰ کی شاہی دولت حضرت خلیفہ دوم امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ کے دربار میں پہنچی اور حضرت عمر رض نے کسریٰ کے سونے کے کنگن سراقہ بن مالک جعشم کے ہاتھوں میں پہنا کر آنحضور صلعم کی پیشینگوئی کا عملی اظہار کیا۔ ع

"تاج کسریٰ زیر پائے امتش"

حیرت کی بات ہے کہ اس زمانے میں جو شخص قرآن کا اتنا بڑا ماہر ہونے کا دعویٰ کرے وہ صاحب قرآن کی

ایک وقتی پیغام رساں سے زیادہ حیثیت دینا تسلیم نہ کرے اور
مجزہ نام کو اپنے سینے سے لگائے پھرے جس نے فرمانِ رسولؐ
ڈالا تھا اور جس عجمی سازش کا ڈھول پیٹنے والے کو دوسروں
کی آنکھ کا تنکا تو نظر آ جائے لیکن عجمی لعنت "پرویز" کا یہ شہتیر اپنی
میں نظر نہ آئے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مصحف قرآن، صامت
اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مسعود قرآن ناطق ہے
یہ مضمون علامہ اقبال کی شاعری سے تعلق رکھتا ہے۔ لہذا
علامہ کے کلام سے ہی دلیل شاعرانہ پیش کی جاتی ہے ؎

وہ دانائے سُبُل ختم الرُسُل مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یاسیں وہی طاہا

(بالِ جبریل)

غزوۂ بدر میں جب تین سو تیرہ مجاہدین فی سبیل اللہ ایک ہزار
مشرکین مکہ کے مقابل ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک
بارگاہ رب العزت، میں سربسجود تھے اور ... عالم
نیاز میں عرض کر رہے تھے کہ یا الٰہ العالمین اگر حق پرستوں
چھوٹا سا گروہ آج مغلوب ہو گیا۔ تو قیامت تک تیرے نام
نصرت کا اعلان کرنے والا نہ رہیگا آپ جوشِ عقیدت و
دردمندی سے بے حال ہوئے جا رہے تھے۔ اور روتے جاتے
حضرت صدیق رضؓ آپ کو بار بار تسلی دیئے جا رہے تھے کہ
نازل ہوئی۔
کی جمعیت کو شکست ہوگی اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔
ایسا ہی ہوا ؎

وقتِ ہیجا تیغ او آہن گداز
دیدۂ او اشکبار اندر نماز
... حبیب اللہ کا رکن اللہ کا دوست کے
آنکہ خاشاک بتان کعبہ رفت
... را حبیب اللہ گفت

معجزہ شق القمر کے متعلق قرآن مجید میں سورۂ قمر موجود ہے۔
اقتربت الساعۃ وانشق القمر جس کی مزید تفصیلات
احادیث میں پائی جاتی ہیں۔ غالباً ادارہ طلوع اسلام تو ایسے معجزات
کا یا تو انکار کریگا یا تاویل کر کے قرآن کو پاژند بنا دیگا۔ لیکن علامہ
اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

پنجۂ او پنجۂ حق می شود
ماہ از انگشت او شق می شود

حدیث مشہور حدیث ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے
۱۔ کلمہ شہادت ۲۔ پنجگانہ نماز، ۳۔ صوم رمضان، ۴۔ ادائے
زکوٰۃ، اور ۵۔ حج بیت اللہ۔

علامہ فرماتے ہیں ؎

لا الٰہ باشد صدف گوہر نماز ÷ قلب مسلم را حج اصغر نماز
در کف مسلم مثال خنجر است ÷ قاتل فحشا و بغی و منکر است
روزہ بر جوع و عطش شبخوں زند ÷ خیبر تن پروری را بشکند
مومناں را فطرت آموز است حج ÷ ہجرت آموز و وطن سوز است حج
حب دنیا را فنا سازد زکوٰۃ ÷ ہم مساوات آشنا سازد زکوٰۃ

حدیثوں میں آیا ہے کہ ایک روز جناب رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زانو پر سر مبارک
رکھکر سو گئے۔ اور آفتاب غروب ہو گیا۔ حالانکہ حضرت علیؓ نے
اپنی نماز عصر ادا نہیں کی تھی جب آپؐ بیدار ہوئے۔ حضرت علیؓ نے
عرض کیا۔ یا رسول اللہ میری نماز عصر قضا ہو گئی اور میں نے آپ کی
استراحت میں خلل ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔ ارشاد فرمایا۔ سورج پھر
بلند ہو رہا ہے، تم اپنی نماز ادا کر لو۔
معلوم نہیں ادارہ طلوع اسلام اس غروب و طلوع کے متعلق
علامہ اقبال بلکہ ملا اقبال کے اس شعر کی کیا تاویل کریگا۔

ہر کہ در آفاق گردد بوتراب
باز گرداند ز مغرب آفتاب

مشہور حدیث ہے لی مع اللہ لا یسعنی فیہ
ملک مقرب ولا نبی مرسل ——— میرے لئے

شر کے ساتھ ایک ایسا وقت بھی ہوتا ہے جس میں کسی مقرب فرشتے اور نبی مرسل کی وہاں رسائی نہیں ہوتی۔

علامہ اقبال رح فرماتے ہیں۔

تا کجا در روز و شب باشی اسیر
رمز وقت از لی مع اللہ یاد گیر

حدیث۔ زندگی از دہر و دہر از زندگی است
لاتسبوالدھر فرمان نبی است

حدیث۔ حرز جاں کن گفتۂ خیر البشر
ہست شیطاں از جماعت دور تر

حدیث۔ الجنۃ تحت ظلال السیوف۔ جنت تلواروں کے سائے کے نیچے ہے۔ علامہ اقبال تلوار کے ذکر میں فرماتے ہیں ؎

آتش قہر خدا سرمایہ است
جنت الفردوس زیر سایہ است

حدیث۔ الجنۃ تحت اقدام امھاتکم۔ جنت تمہاری ماؤں کے پاؤں کے نیچے ہے۔

گفت آں مقصود حرف کن فکاں
زیر پائے امہات آید جناں

حدیث۔ الصلوٰۃ معراج المومنین۔ نماز مومن کی معراج ہے علامہ رح حضرت اورنگزیب علیہ الرحمۃ کے قصے میں فرماتے ہیں ؎

باز سوئے حق رمید آں ناصبور
بود معراجش نماز با حضور

حدیث۔ اللہ تعالیٰ نے روئے زمین کو میرے لئے مسجد بنایا ہے۔

تا ز بخششہائے آں سلطان دیں
مسجد ما شد ہمہ روئے زمیں

حدیث۔ حضور نے ارشاد فرمایا۔ تمہاری دنیا میں سے مجھ کو خوشبو اور عورت محبوب ہیں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے علامہ عورت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

حدیث۔ من رانی فقد رالحق۔ جس نے مجھے دیکھا اس نے حق دیکھا ؎

بچشم من نگہہ آوردۂ تست
فروغ لاالہ آوردۂ تست
دوچارم کن بہ صبح من رانی
شبنم را تاب مہ آوردۂ تست

حدیث۔ الفقر فخری والفقر منی۔

فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضاست
ما امینیم این متاع مصطفی است

حدیث۔ اتقوا فراستہ المومن فانہ ینظر بنور اللہ

آہ یورپ زیں مقام آگاہ نیست
چشم او ینظر بنور اللہ نیست

حدیث نعم مال صالح للرجل صالح۔

نکتہ ہا از پیر روم آموختم
خویش را در حرف او وا سوختم
مال را گر بہر دیں باشی حمول
نعم مال صالح گوید رسول

حدیث۔ امن الناس علی فی صحبتہ ومالہ ابوبکر۔

من شبے صدیق رضا را دیدم بخواب
گل ز خاک راہ او چیدم بخواب
آں امن الناس بر مولائے ما
آں کلیم اول سینائے ما

ہمارے زمانے میں پنجاب میں ایک ظلی بروزی (جعلی) نبی پیدا ہوا اور اس نے قرآن مجید کی آیت خاتم النبین کی [illegible] کرکے قرآن کو ایسا پازند بنایا کہ اپنے زعم باطل میں ہر کس و نا کس کے لئے نبوت کا دروازہ کھول دیا۔ حالانکہ حضور صلعم کی [illegible] ہے۔

"سیکون من امتی ثلاثون کذابون دجالون کلھم یزعم انہ نبی اللہ۔ وانا خاتم النبین الا لا نبی بعد

میری امت میں عنقریب تیس جھوٹے دجال پیدا ہوں گے
...ین سے ہر شخص نبوت کا دعوی کرے گا۔ حالانکہ میں نبیوں کا
...کرنے والا ہوں آگاہ رہو کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں اور
...رے بعد کوئی امت نہیں۔

علامہ اقبالؒ رموز بے خودی میں فرماتے ہیں۔

...س خدا بر ما شریعت ختم کرد — بر رسول ما رسالت ختم کرد
...ر لق از ما محفل ایام را — او رسل را ختم و ما اقوام را
...بی بعدی ز احسان خدا ست — پردۂ ناموس دین مصطفی است
...ن تعالی نقش ہر دعوی شکست — تا ابد اسلام را شیرازہ بست

دل ز غیر اللہ مسلماں بر کند
نعرۂ لا قوم بعدی می زند

...ندرجہ بالا اشعار سے علامہ اقبال رح کا عشق حدیث رسول اللہ
...ملی اللہ علیہ وسلم سے صاف ظاہر ہے۔ علامہ نے کتاب سنت
...ور اقوال بزرگاں سے جا بجا اپنے کلام کو زینت دی ہے لیکن
...س زمانے کے طلوع اسلام والے مجتہدین جن کی نسبت علامہ

کہہ گئے ہیں۔

ز اجتہادِ عالمان کم نظر
اقتدا بر رفتگان محفوظ تر

ایک قرآن مجید کا صرف نام باقی رکھکر احادیث رسول
اور اسوۂ صحابہ سب کو غلط اور ناقابل اعتبار اور عجمی سازش سمجھتے ہیں

کون ہے تارک آئینِ رسولِ مختار ؟
مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار ؟
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعار اغیار ؟
ہوگئی کس کی نگہ طرز سلف سے بیزار ؟
قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغام محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں

مندرجہ بالا اشعار کا جواب ہے۔ ادارہ طلوع اسلام جسکو
مخاطب کرکے علامہ کی روح کہہ رہی ہے ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

معدہ کی خرابیوں کو نظر انداز نہ کیجئے.......... کہیں

...... معدہ کی خرابیاں آپ کو نظر انداز نہ کردیں ....

ہاضمی

ایک بہترین سفوف معدہ جو
عمل ہضم کو فطری طور پر کام کرنے میں مدد دیتا ہے اور معدہ کو ہر خرابی سے
محفوظ رکھتا ہے۔ حفظ ما تقدم علاج سے بہتر ہے۔ اس لئے ہاضمی استعمال
کیجیے تاکہ آپ کا معدہ ہر خرابی سے محفوظ رہے۔
قیمت فی شیشی ایک روپیہ چار آنے

حاذق دواخانہ، بندر روڈ، کراچی، نمبر (۱)

، تیری کرنی کی بھرن ہے۔ لیکن کاش تو سمجھتا۔ اب اپنا انجام دیکھ لعنت ہے تیری روح پر۔

اس کی آنکھیں بند ہو چلیں۔ ایک زور کا بھنور پڑا۔ اور اس کا بحر بیکراں جانی لہروں نے اپنے دامن میں لے لیا۔ شاید ہی وہ اسکے گناہوں کے داغ دھو سکیں۔ شاید ——————

——————
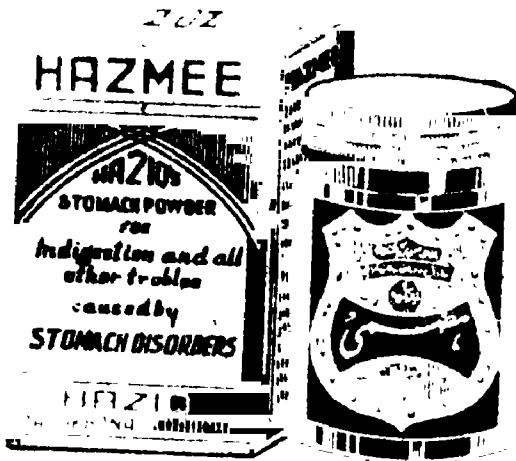
اور اگلی رات وہ معصوم چڑیا پھر آئی۔ چہچہاتے ہوئے وہ اس نغمہ کی منتظر رہی۔ مگر وہ سن نہ سکی اور آخر کار ایک لرزتی ہوئی پتی سے وہ مخاطب ہوئی۔ کچھ جانتی ہو؟ کیا؟ ہلکی سی آہ سنائی دی وہ نغمہ، وہ دل کش گیت۔ جو نیکی کا پیغام تھا۔ جو روح کی غذا تھی آج سنائی نہیں دیتا! بڑی پگلی ہو تم۔ پتی جھنجھلا کر بولی۔ اور اس نے وہ تمام بات .... وہ سارا قصہ اس سے بیان کر دیا۔ اور رات بڑھتی رہی۔ چڑیا سنتی رہی۔ چاند افق سے ابھرنے لگا۔ ستارے آنکھ مچولی کھیلنے لگے۔ ہوائیں گانے لگیں۔ دور آسمان پر ایک تارا ٹوٹا۔ اور فضا جگمگا اٹھی۔ وہ کچھ دیر یونہی .... تکتی رہی .... گھورتی رہی .... پھر چل .... چوں چوں۔ خاموشی میں نغمہ ابھرا ..... بہت دیر ابھرتا رہا ... ڈوبتا رہا ...... اور چڑیا دور کہیں ...... اپنے گھونسلے میں چلی گئی۔ خاموشیاں اور گہری ہو گئیں +

—— ••• ——

حاذق ہسٹریا پلز (گولیاں)

یہ مرکب گولیوں کی صورت میں خالص اور کمیاب جڑی بوٹیوں سے جدید طبی اصول پر تیار کی گئی ہیں جو ہسٹریا جیسے موذی مرض کو جو ہماری نوجوان بہنوں میں آجکل عام ہو گیا ہے، سو فیصدی کامیاب ہو چکی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ دوا عورتوں کی دیگر شکایات، اعصابی کمزوری ضعف ہضم، اختلاج قلب کے لئے بیحد مفید ہے اور بچوں کی مرگی کے لئے لاثانی دوا ہے۔ قیمت چالیس گولی (فی شیشی) پانچ روپے علاوہ محصولڈاک

——————

حاذق نروائن پلز (حب خاص)

ایک جنرل ٹانک ہیں جو عصبی اور دل و دماغ کی کمزوریوں کا مجرب علاج ہے یہ گولیاں دماغی کام کرنیوالے حضرات یعنی وکیل، بیرسٹر اور طالبعلم صاحبان کے واسطے آبحیات کا کام دیتی ہیں اور جسم انسانی کی جملہ عصبی کمزوریوں کو بحال کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں؛ دواخانہ ہذا کے خاص مجربات میں سے ہیں:

خوراک ۱۰ یوم، ۲۰ گولی، دو روپے (۲؍)

حاذق دواخانہ، بندر روڈ، کراچی سے طلب فرمائیے!

جب کبھی آپ بیمار ہوں

جب کبھی اپنی صحت کی خاطر آپ کو کسی دواخانہ کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے تو اس وقت قدرتی طور پر آپکے دل میں یہ سوال پیدا ہوتے ہیں

ب کیا وہ دواخانہ جس سے آپ دوا لینا یا منگانا چاہتے ہیں اپنے مرکبات بیش قیمتی اور اصلی ادویہ صحیح وزن کے مطابق ڈال رہا ہے؟

ج کیا تجربہ کار اور صحیح طبیب آپ کے لیے صحیح دوا تجویز کر رہے ہیں؟

خدا کا شکر ہے

کہ اسکے فضل وکرم سے حاذق دواخانہ بندر روڈ، کراچی نمبر۱، اس دھوکہ باز اور اشتہاری زمانہ میں بھی اس دوگونہ معیار پر پورا اُتر رہا ہے

عالی جناب حکیم سید نذیر احمد صاحب دہلوی کی سرپرستی

حاذق دواخانہ کی اس صداقت کی بہترین دلیل

حکیم صاحب موصوف کسی تعارف کے محتاج نہیں

ہندوستانی پبلک عموماً اور طب یونانی سے دلچسپی رکھنے والے خصوصاً مدت دراز سے حکیم صاحب کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ ۴۳ سالہ تجربہ رکھتے ہیں۔ آپ کی زندگی کے آٹھ قیمتی سال مسلسل طور پر مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کے طبیب پیشی کی حیثیت سے انکے ساتھ سفر وحضر میں کٹے۔ آپ ہندوستانی دواخانہ کے مسلسل چھ سال تک ہر شعبہ کے نگراں رہے — کتاب حاذق اور مطب کلاں آپ کی وہ مایۂ ناز اور مقبول عام تالیفات ہیں جو محتاج تعارف نہیں۔ آپ طبیہ کالج دہلی کی اعلا کلاسوں کے پروفیسر رہے ہیں اور آپ کی خدمات کے اعتراف میں یونانی طبیہ کالج کے جشن سلور جوبلی کے اہم موقعہ پر مارچ ۱۹۴۷ء میں منتظمان کالج نے آپکو اماجر طب کی اعزازی ڈگری سے سرفراز فرمایا ؎

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ان حقائق کے پیش نظر چونکہ حکیم صاحب موصوف بہ نفس نفیس حاذق دواخانہ کے جملہ امور کے نگراں ہیں اور مطب کے علاوہ اپنا تمام قیمتی وقت اور اپنی توجہ دواخانہ کی اصلاح اور درستی میں صرف کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی نگرانی میں تیار کرائے ہوئے اس دواخانہ کے مجربات اور مرکبات آپ کی صحت کے بہترین ضامن ہیں۔

منیجر:- حاذق دواخانہ، بندر روڈ۔ کراچی، نمبر (۱)

مشرق وسطےٰ کا پاگل حکمران

بادشاہ پاگل ہے ۔ بہت خطرناک قسم کا پاگل ہے ....

پاگل پن کی انتہا یہ ہے کہ وہ اپنے شاہانہ کروفر کو چھوڑ کر —— آداب وطور طریق کی پروا کئے بغیر دھوپ میں کسی نوکر چاکر کے بغیر ہی کی طرح عمان کے بازاروں میں گھومتا پھرتا ہے ——

کی طرح لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا بس چلا ہی جاتا ہے گویا کہ اسے منزل کی بڑی ہی جلدی ہے ۔ یا کوئی اس سے طاقتور اس کا تعاقب کر رہا ہے .... اس کی گرفت سے بچنے کے لئے بھاگ رہا ہو ۔ بے تحاشا ہے بھالے بغیر ۔

صرف یہی نہیں ، بادشاہ کی مجنونانہ حرکات سے سارا دربار پریشان اور محل بیزار ہے ۔ سارے مصاحب اور حواری پریشان ہیں ۔ ان سب ... میں بادشاہ پاگل ہے اس کا مرض لاعلاج ہے ۔

بادشاہ پاگل ہے وہ اکثر اپنے حواریوں اور درباریوں کی مصاحبت سے ... خود کو نشست گاہ خاص میں مقید کر لیتا ہے جیسے کہ یہ سب اس کے ... ہوں ۔ اس کے خون کے پیاسے ہوں ، اور بادشاہ نے ان سے اپنی جان ... کے لئے اس مقام میں پناہ لے لی ہو ۔ وہ گھنٹوں اپنے اس قید خانہ ... سادھے پڑا رہتا ہے اور پہروں سر جھکائے سوچتا ہے ۔

کیا میں واقعی پاگل ہوں

نہیں نہیں میں پاگل نہیں ۔ میرے ہوش وحواس بالکل درست ہیں ... درست اور صحت مند انسانوں کی طرح کام کرتا ہوں ۔ مجھے پاگل کہنے والے ... پاگل ہیں ۔ میرے خلاف اُنھوں نے سازشوں کا جال بچھا رکھا ہے ۔ مجھے ... تاج سے محروم کرنے کے لئے میرے اپنے ہی معتمد اغیار کے اشاروں پر ... رہے ہیں اور مجھے قید کرنے کے منصوبے باندھ رہے ہیں —— وہ ... یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے —— لیکن حالات نے اسے پاگل بنا رکھا ہے

بادشاہ ان سازشوں سے پناہ لینے کے لئے جنیوا میں اپنی ملکہ سے ملنے کے لئے جاتا ہے تاکہ اسی کے دامن میں ہی اسے کچھ سکون حاصل ہو سکے اور اپنی دماغی پریشانی کو دور کر سکے لیکن ملکہ پر بھی اغیار کا جادو چل گیا ہے وہ بھی پاگل بادشاہ کی حکمت سے اس قدر خائف ہوتی ہے کہ لوزان ہوٹل میں جہاں ملکہ پورے شاہی اہتمام کے ساتھ اقامت پذیر تھی بادشاہ کی آمد سے قبل ہی وہ وہاں سے کسی دوسری طاقت کی پناہ میں چلی جاتی ہے ۔

بادشاہ پاگل ہے وہ حکمرانی کے قابل نہیں ۔ اسے علاج کے لئے کسی ہسپتال میں داخل ہونا پڑے گا ۔ ریجنسی ان کی عدم موجودگی میں ملک کا نظم ونسق سنبھالے گی .... بادشاہ اور ملک کا مفاد اسی میں ہے

شاہ کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کابینہ نے اس کی قسمت کا یہ آخری فیصلہ کیا ۔

شاہ واپس آرہا ہے سحرزدہ معمول کی طرح اپنے آقا کا ہر حکم اور ہر اشارہ ماننے پر تیار ۔

پاگل بادشاہ ہسپتال میں سخت نگرانی میں اپنے پاگل پن کا علاج کرائے گا ۔

یہ ہے وہ ڈرامہ جو یردون کے چالیس سالہ ہاشمی شاہ طلال کے خلاف کھیلا جا رہا ہے ۔ اور پوری قوم اپنے ہردل عزیز بادشاہ کا انجام بڑی حسرت سے دیکھ رہی ہے ۔ یردون کے سیاسی اسٹیج پر درحقیقت آج یہ کوئی نیا ڈرامہ نہیں کھیلا جا رہا ۔ بلکہ موجودہ حالات کو اس کا ڈراپ سین کہا جا سکتا ہے ۔

اس ڈرامہ کا اصل ہیرو عرب لیجن کا انگریز کمانڈر جسے یردون کا بے تاج انگریز بادشاہ یا آمر مطلق کہا جا سکتا ہے گلب پاشاہ ہے ۔ گلب پاشاہ اور عوام کا ہر دلعزیز حکمران شاہ طلال ایک حیدار ولین کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کر رہا ہے

اس ڈرامہ کی ابتدا اس وقت ہوئی جب کہ شاہ طلال ابھی شہزادہ ولیعہد تھا ۔ اس نوجوان شہزادہ کی حب الوطنی اور ہردل عزیزی کے چرچے

عرب میں زبان زد خلائق تھے۔ اس کی یہ ہردل عزیزی اور حب الوطنی
معاد اور انگریز نواز وطنیوں کے منافی تھی۔ گلب بادشاہ دوررس نگاہوں
نپ لیا کہ طلال کے ہوتے ہوئے وہ نہ تو اپنی آمریت کو برقرار رکھ سکے گا
یردن میں برطانوی معاد محفوظ رہے گا اس لئے اس نے طلال کے
محاذ قائم کر لیا اور اپنا مستقبل محفوظ بنانے کے لئے طلال کو پاگل بنانا
ر دیا اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ برطانیہ مشرق وسطے کے
لامی ممالک کو کسی نہ کسی رنگ میں اپنے سیاسی مقاصد کے لئے
ل کرتا رہا ہے اور اب جبکہ سارے ایشیا میں اس کا سورج ہمیشہ
ے ڈوب چکا ہے برطانیہ کی حکمت عملی کا تقاضا ہے کہ وہ پس ماندہ اور
ی یافتہ اسلامی ممالک میں اپنے قدم جمائے رکھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ
نصوص سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر شرق اردن کو استعمال کر رہا ہے۔
لال کا باپ شاہ عبداللہ انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہ گیا تھا
فوجوں کا انگریز کمانڈر گلب پاشا ہی ملک کا صحیح معنوں میں حکمران ہے
تمام داخلی اور خارجی حکمت عملیوں میں اسے بہت زیادہ دخل ہے
طلال شہزادگی کے زمانہ میں جہاں باپ کی انگریز پرستی کا مخالف تھا
اس سے کہیں زیادہ گلب پاشا کی سرکاری امور میں مداخلت سے
نفرت تھی۔ وہ گلب پاشا کی آمریت ختم کرنا چاہتا تھا۔
اس بنا پر طلال نے کئی مرتبہ اپنے والدین سے جھگڑا مول لیا لیکن
پاشا اور اس کے دیگر انگریز نواز ساتھیوں نے طلال کی حب الوطنی کو پاگل
رار دے کر اسے راستہ سے ہٹانے کی کوشش کی
شاہ عبداللہ گلب پاشا کی بدولت انگریزوں کا بہت بڑا حلیف
سال ۱۹۵۱ء میں شاہ عبداللہ نے عرب کے تمام ممالک اور اردنی عوام کی زبردست
نت کے باوجود انگریزوں کے دباؤ سے مجبور ہو کر یہودیوں سے معاہدہ
کی گفت و شنید شروع کر دی۔
طلال کے لئے قوم کی یہ ایک زبردست توہین تھی۔ انگریز پرستی کی ذلت
شت کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ انگریز کے خلاف بغاوت طلال اور
ب پاشا میں دشمنی کی بنیاد تھی۔ گلب پاشا کے لئے اب میدان صاف

اس کے فوراً ہی بعد طلال کی دیوانگی کی خبریں مشہور ہونی شروع
ہو گئیں اس عالم میں اسے عمان سے نکل جانے کا حکم دیدیا گیا۔
گزشتہ جولائی میں شاہ عبداللہ کو قتل کر دیا گیا۔ طلال اس وقت پیرس
میں اپنے پاگل پن کا علاج کرا رہا تھا۔ عبداللہ کے قتل کے بعد یردن کا
انتظام حکومت سنبھالنے کے لئے انگریزوں کے حواریوں پر مشتمل ایک
کونسل قائم کر دی گئی جس کی باگ ڈور عبداللہ کے دوسرے بیٹے شہزادہ نیف
کو سونپ دی گئی۔ مگر شہزادہ نیف بھی انگریز نوازی میں اپنے مقتول باپ سے
کسی طرح کم نہ تھا لیکن اردن کی رائے عامہ نے ولیعہد طلال کو اپنا حکمران
تسلیم کر لیا یہ موقعہ پرستوں اور انگریز نوازوں پر ضرب کاری تھی۔
تخت نشینی کے بعد شاہ طلال نے ان داغوں کو دھونے کی کوشش
کی جو اس کے مقتول باپ نے انگریزوں کی حمایت میں لگائے تھے۔ انگریز
یردن کو محض اپنے مفاد کی خاطر دوسرے عرب ممالک سے بالکل الگ تھلگ
رکھنا چاہتا تھا اور اس پالیسی پر عمل پیرا ہو کر شاہ عبداللہ نے تمام عرب
ممالک کا اعتماد کھو دیا تھا۔
طلال نے زمام حکومت سنبھالتے ہی سب سے پہلے عرب ملکوں کا اعتماد
حاصل کرنے کی کوشش کی۔ شاہ عبداللہ نے برطانیہ کے ایماء پر شام
اور سعودی عرب کو دشمن بنا لیا تھا لیکن طلال ان دونوں ممالک کے ساتھ
دوستانہ تعلقات قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لئے اس نے سرکاری
طور پر سعودی عرب کا دورہ کیا۔ یہاں کی حکومت اور رعایا نے انہیں سر
آنکھوں پر بٹھایا۔ پھر شام کا دورہ کیا شام کے گلی کوچے طلال زندہ باد کے
نعروں سے گونج اٹھے
لیکن انگریز شاہ طلال کی اس مقبولیت کی بدولت انگاروں پر لوٹ
رہا تھا۔ اسلئے کہ یردن میں انگریز کا مفاد خطرہ میں تھا انگریز کا وجود خطرہ میں تھا
اور وہ کسی قیمت پر بھی یہ خطرہ مول لینے کو تیار نہیں۔
یردن کے سعودی عرب اور شام سے بہتر تعلقات کا قیام برطانوی
مفاد پر ایک ضرب کاری تھی۔ طلال نے برطانیہ پر جو دوسری چوٹ لگائی وہ
یہ تھی کہ اس نے عربوں کے باہمی معاہدہ تحفظ سلامتی کو منظور کر لیا شاہ عبداللہ
اس معاہدہ کے سرے ہی سے مخالف تھے۔ شاہ طلال کی ان سرگرمیوں نے
گلب پاشا کو خاموش نہیں بیٹھنے دیا۔ وہ بھی اپنے تمام حربوں اور طاقت
کو شاہ طلال کو پاگل ثابت کرنے میں صرف کرتا رہا۔

آخر کار شاہ طلال کی دیوانگی پر صاد کرنیکے لئے گلب پاشا کو اندرون ملک سے قابل اعتماد مہرے مل گئے اور ان کی سازشوں کے نتیجہ پر شاہ طلال کو بغرض علاج پیرس بھیج دیا گیا۔

شاہ طلال کی دیوانگی کے افسانوں کا ذرا گہری نظر سے مطالعہ کرنے والا ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ اس تمام داخلی انتشار کا صرف ایک ہی محرک ہے اور وہ عرب لیجن کا انگریز کمانڈر گلب پاشا۔ چونکہ شاہ طلال اپنے باپ کی طرح انگریزوں کے ہاتھ میں کٹ پتلی بننا نہیں چاہتا۔ اس لئے اس کے خلاف یہ محاذ قائم کیا گیا ہے اور اسے تخت سے محروم کرکے کسی انگریز نواز ہستی کو خواہ وہ شہزادہ نائف ہو یا کوئی اور تخت پر بٹھانا چاہتا ہے۔

شاہ طلال کے اس انجام سے عرب حکومتوں میں انتہائی افسوس کیا جا رہا ہے۔ سعودی عرب کے وزیر خارجہ امیر فیصل نے تو یہاں تک تصدیق کردی ہے کہ شاہ طلال پاگل نہیں اور اس کی صحت بہت اچھی ہے اور یہ کہ شاہ طلال کی بیماری ان کے دشمنوں کی سازش کا نتیجہ ہے جو مشرق کے امن کو قدیم سامراجی پالیسی کے تحت تباہ کرنا چاہتے ہیں۔

مشرق وسطی میں انتشار کے بیج بونے والا صرف گلب پاشا ہے اور جب تک اس زہریلے ناگ کا سر نہیں کچلا جاتا اس وقت تک نہ یردن میں امن قائم ہوگا اور نہ ہی مشرق وسطی کے ممالک چین سے بیٹھ سکیں گے لیکن گلب پاشا برطانوی استعمار کا ایک ایسا مضبوط ستون ہے جسے شکست دینا یردن کے بس کی بات نہیں۔ یردن دیگر عرب ممالک کی طرح ایک مختصر سی بظاہر ایک آزاد اور خود مختار سلطنت ہے جس کے ڈانڈے ایک طرف اسرائیل سے ملتے ہیں اور دوسری طرف شام اور سعودی عرب کے ممالک سے اس کی پسماندگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دیگر عرب ممالک کی نسبت برطانیہ نے یردن میں مضبوط قدم جما رکھے ہیں۔

یردن کی فوج عرب لیجن شام، سعودی عرب، عراق وغیرہ کے مقابلہ میں سب سے زیادہ منظم اور مسلح فوج ہے جس کی قیادت گلب پاشا کر رہا ہے۔ بعض مواعید کی رو سے یردن میں برطانیہ کو کافی سے زیادہ سیاسی اور فوجی مراعات حاصل ہیں۔ عرب لیجن کو سامان حرب زیادہ تر برطانیہ ہی دے رہا ہے اور اس کی تنظیم کا خرچ بھی کسی حد تک برطانیہ ہی برداشت کرتا ہے یردن کی خارجہ پالیسی اگرچہ بظاہر آزاد ہے۔ مگر وہ زیادہ تر برطانیہ کی مرہون منت ہے۔ ہنگامی حالات میں برطانیہ یردن کے فضائی مستقروں، بندرگاہ عقابہ اور تمام دیگر ذرائع کو استعمال کر سکتا ہے ملک کی داخلی سیاست میں بھی انگریزوں کا کافی دخل ہے۔

ملک میں برطانوی مفاد کو خطرات سے محفوظ کرنیکے لئے شاہ طلال کے خلاف آج یہ تمام محاذ قائم ہیں۔

ادھر انگریزوں کی وفاداری کا یہ عالم ہے کہ گذشتہ ۱۹۴۸ء میں یہودیوں کے خلاف عربوں کی جنگ کے انتہائی نازک دور میں گلب پاشا نے بڈا کے ہوائی مستقر اور راملے جیسے اہم فوجی مقامات سے عرب لیجن کو پسپا کرکے .... مجاہدین کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا تھا۔

شاہ طلال کے مستقبل کا فیصلہ تو کونسل کر چکی ہے اس سے یردن کی تاریخ میں آئندہ گیارہ ماہ بہت ہی نازک خیال کئے جاتے ہیں اس عرصہ میں شاہ طلال کا بڑا لڑکا شہزادہ حسین جو آج برطانیہ میں تعلیم حاصل کر رہا ہے سن بلوغ کو پہنچ جائے گا اور تخت نشینی کے قابل ہو گا اگر اس عرصہ میں شاہ طلال صحت یاب ہو گئے تو وہ حکومت کی زمام سنبھال لیں گے۔ (بشکریہ کوثر)

ہر قسم کی عمدہ کتابت اور جملہ سامانِ کتابت

یعنی

کتابت کی بہترین سیاہی، نبیں اور تمام مروجہ سائز کا نفیس ترین رنگے ہوئے مسطر
اور چربوں کے لئے بہترین کاغذ

دارالسلطنت پاکستان کراچی میں

ادارۂ فیض الکتابت

مرزا آدم خاں مارکیٹ، نزد مولوی مسافر خانہ، بندر روڈ،
سے طلب فرمائیے
تھوک خریداروں کے ساتھ خصوصی رعایت کی جاتی ہے
"ناظم ادارہ"

ح جھانگیر نوال •

پیدا کریں

آکہ ان تاریکیوں میں روشنی پیدا کریں دل کی سونی انجمن میں زندگی پیدا کریں

آسماں پر جو جھلکتی ہے ستاروں کے قریب آ دلِ برباد میں وہ روشنی پیدا کریں

پھر سفینے لے چلیں طوفاں کی موجوں میں ندیم موت کے سایہ میں حسنِ زندگی پیدا کریں

جل اٹھیں تاریکیوں میں پھر مسرت کے چراغ آکہ غم کی بستیوں میں پھر خوشی پیدا کریں

حسن پھر چھلکے جبینِ خاکِ ہستی پر رفیع

زلفِ گیتی میں کچھ ایسی برہمی پیدا کریں

نصاری •

چوٹ

رہِ حیات میں ہر اہلِ فن پہ چوٹ کروں کھلے خضر پہ چھپے راہ زن پہ چوٹ کروں

حکایتِ قد و گیسو سے بات کچھ نہ بنی! غرورِ منصبِ دار و رسن پہ چوٹ کروں

مری نگاہ میں ایسی کھٹک رہی ہے بہار یہ چاہتا ہوں کہ سرو و سمن پہ چوٹ کروں

جہاں گھرے ہوئے کانٹوں میں پھول ہنستے ہیں بھری بہار میں ایسے چمن پہ چوٹ کروں

مری نظر میں ہیں دشمن بھی دوست بھی اختر

سب ایک سے ہیں تو کس کے چلن پہ چوٹ کروں

آثم میرزا

پستی اور بلندی

مری جل بس اسٹینڈ پر اتر کر مجھے اپنے دوست عزیز ملک پہنچنے میں کوئی خاص مشکل پیش نہ آئی۔ عزیز اپنے کوارٹر کے دروازہ پر کھڑا تھا جیسے وہ میرا ہی انتظار کر رہا ہو۔ آگے بڑھ کر وہ مجھ سے لپٹ گیا۔ سامان اندر رکھ کر ہم دروازہ کے باہر ہی ٹاٹ پر بیٹھ گئے۔ میں نے مسعود کے متعلق پوچھا۔ عزیز بولا " مسعود اپنے والدین کے ساتھ ایک خوبصورت کوٹھی میں رہتا ہے پہلے پہل جب میں نے اسے یہاں پر دیکھا تھا تو وہ ہالی وڈ کا ایک عیاش باشندہ نظر آیا تھا۔ رنگینیوں اور مستیوں کا شیدا میں نے اسے پہچان لیا تھا لیکن وہ منہ پھیر کر پاس سے گزر گیا۔ اس نے نظر بھر کر بھی نہ دیکھا۔ اس کے ساتھ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ جس نے ایسے ڈھنگ سے لباس پہنا ہوا تھا جیسے وہ کوئی لونڈی ہو۔ جسے ریشم اور خوشبوؤں سے سجا کر منڈی میں بیچنے کے لئے لے جایا جا رہا ہو۔ اسے دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا۔ جی چاہا کہ بھاگ کر اسے گریبان سے پکڑ لوں۔ اور خدا کا واسطہ دیکر کہوں کہ جس راستے پر تم آنکھیں بند کئے بڑھ رہے ہو۔ اس کے آگے بہت بھیانک کھائی ہے آنکھیں کھولو اور سیدھے راستے کی طرف آجاؤ لیکن میرے پاؤں سڑک پر جم کر رہ گئے تھے۔ میں نے سوچا۔ یوں جوش میں آ کر اس سے کوئی بات کہی تو اس پر الٹا اثر ہوگا۔ وہ چڑ جائے گا۔ اس کے ذہن میں جو عیش پرستی کے دھندلکے پھیلے ہوئے ہیں وہ گہرے ہو جائینگے۔ اسے کسی مناسب طریقے سے سمجھانا چاہئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس واقعہ سے چند دن بعد وہ مجھے کلڈ نگا روڈ پر دکھائی دیا۔ چند آدمی ایک جگہ گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ قریب پہنچ کر مجھے ایک غصیلی آواز سنائی دی " یہ بھی تمہاری طرح کا ہی انسان ہے۔ اگر تم اس کی جگہ ہوتے اور تم سے ایسا نفرت انگیز سلوک کیا جاتا تو تم پر کیا بیتتی " میں نے آگے بڑھ کر دیکھا مسعود اپنے زانو پر ایک غریب پہاڑی کا سر رکھے اس کی پیشانی پر سے خون پونچھ رہا تھا۔ " مسعود " میری آنکھوں میں استعجاب کے سائے پھیل گئے۔ ایک چھبن سی ہونے لگی آنکھیں مل کر میں نے دوبارہ اس کی طرف دیکھا واقعی وہ مسعود ہی تھا۔ مسعود

چند دن پہلے جو مجھ سے بات کئے بغیر پاس سے گزر گیا تھا۔ اب ایک غریب مزدور کا سر زانو پر رکھے ہوئے تھا اور پاس کھڑی ہوئی عورت کو نگاہوں کے شراروں سے جھلسانے کی فکر میں تھا۔ میں بیٹھ کر اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔ اس نے گردن گھما کر ایسے چونک پڑا۔ جیسے اس کی آنکھوں پر پھیلے ہوئے دبیز پردے پھٹ گئے ہوں " عزیز تم یہاں! " میں نے اس کا جواب دینے کی بجائے مزدور کے متعلق پوچھا۔ وہ حسین عورت کی طرف اشارہ کر کے بولا اس عورت کے پیچھے ٹوکری اٹھائے آ رہا تھا کہ یکدم چکرا کر گر پڑا۔ ہمدردی کرنیکے بجائے مزدور کو ٹھوکر مار دی۔ اور گالیاں دیتے ہوئے دولت نے اسے اندھا کر دیا ہے۔ یہ کسی کمتر کو انسان ہی نہیں سمجھتی " وہ مسکرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑا کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا " عزیز آؤ۔ اسے اس کے گھر چھوڑ آئیں " آگے قدم اٹھاتے ہوئے میں نے پوچھا " مسعود۔ تم میں یہ انقلاب کیسے رونما ہوا۔ ابھی چند دن ہوئے میں نے تمہیں ایک لڑکی کے ساتھ پرکھوتے دیکھا تھا اور میرے پاس سے گردن اکڑائے گزر گئے " مسعود نے گہرا سانس لیکر کہا " اس وقت میں حسن کا پجاری تھا اور اب انسان کا۔ میں تمہارے سامنے نادم ہوں۔ میں تاریکیوں میں بھٹک گیا تھا۔ امارت کے جادو نے میرے ذہن سے تمیز کا احساس مٹا دیا تھا جو کوئی بہترین سوٹ پہنے ہوتا میری نظروں میں شریف تھا اور معمولی لباس دیکھ کر میں اسے غیر مہذب سمجھتا تھا۔ اور اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ شرافت لباس سے نہیں ناپی جاتی ہے اور ہمارے اعمال ہی ہمیں انسان اور شیطان بناتے ہیں۔ میں ناخدا شناس سوسائٹی کی رنگین وادیوں میں مست پھرنے کا عادی تھا اور سمجھتا تھا کہ انسان کسی قانون کا پابند نہیں رہ سکتا۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ صحت مند اصولوں کی پابندی انسان کے لئے لازمی ہے۔ حیوانیت انسانیت کو اپنے میں مدغم کر لیتی ہے۔ مسعود

کہنے ہی والا تھا کہ مزدور کے ایک ساتھی نے قریب آکر تشویشناک
پوچھا "کیا بات ہوئی ہے بابو جی" مزدور نے نیم وا آنکھوں سے اپنے
کی طرف دیکھا اور دھیمے لہجے میں بولا "میں گر پڑا تھا۔ انھوں نے
بہت مدد کی ہے۔ یہ بہت نیک انسان ہیں" اور پھر مسعود سے
ب ہوا "بابو جی اب میں گھر پہنچ جاؤں گا۔ خدا آپ کو اچھا رکھے" مسعود
یب میں ہاتھ ڈالا اور بند مٹھی مزدور کے ہاتھ میں کھول دی۔ مزدور نے
سے پوچھا "یہ کیا بابو جی!"۔ لیکن مسعود بغیر جواب دیئے میرا بازو پکڑ
ے بڑھنے لگا مسعود کی کوئی حرکت ہی اب دکھاوا نہ تھی۔ چوک میں وہ مجھ
یدا ہو گیا۔ اسے اپنے ایک بیمار رشتہ دار کی مزاج پرسی کے لئے جانا تھا
مجھے بھی دفتر میں کچھ کام تھا۔ اب اس سے تقریباً ہر روز ملاقات ہوتی ہے
اس سے مل کر بہت خوش ہو گئے"۔ ....

عزیز نے مسعود کا ذکر ختم کرتے ہوئے کہا — "آؤ پہلے کھانا
کھائیں۔ پھر باتیں ہوں گی ....

کھا کر جب فارغ ہوئے تو اس نے کہا "آؤ تمہیں نئی تہذیب کی
ی جھلکیوں کا منظر دکھاؤں" ——— ہم دونوں مال روڈ کی
بڑھنے لگے۔ مال روڈ پر پہنچ کر مجھے محسوس ہونے لگا جیسے میں مری یا کے
ے یورپ کی کسی حسین ترین "تفریح گاہ" میں آگیا ہوں۔ جو لوگ یہاں
ت جانے آتے ہیں وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ یہاں صحت نہیں ملتی۔ اخلاق
حسن و جوانی کے عریاں رقص کو دیکھ کر جذبات میں آگ لگ جاتی ہے اور
جسم کی کثرت سے خود کو بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔ مال روڈ ایک شو روم
جہاں پر فیشنوں کے رنگین ماڈل سجے ہوتے ہیں جسم کے مخفی زاویوں کا
ہوتا ہے۔ دولت کے پرستار اپنی بہو بیٹیوں کے انسانیت سوز مظاہرو
محسوس کرتے ہیں ——— مال روڈ پر خصوصاً عورتوں کا ایک
ب لگا ہوا تھا۔ اور میری سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ یہ لوگ کہاں کے رہنے
ے میں کم از کم پاکستان کے تو نہیں ہو سکتے۔ ان کا پہناوا، فیشن، چال
کہیں تو یہاں دکھائی نہ دے رہا تھا۔ یوروپین بھی ان سے کچھ مختلف تھے
——— نہ یہاں کے نہ وہاں کے ——— نہ زمین والے نہ آسمان
— پھر کہاں کے تھے یہ لوگ؟ ——— شاید اندھی حلاؤں میں بسنے
لے تھے جو نہ آسمان والے کی مانتے ہیں۔ نہ زمین والوں کی سنتے ہیں .....

مری کے آس پاس زندگی سسکتی رہتی ہے آہوں اور سسکیوں کا غبار
پھیلتا رہتا ہے لیکن مری کی بلندیوں پر رنگ رلیاں منانے والے بڑے آدمیوں
کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ ان کی عیاشیوں میں ذرا بھی فرق نہیں
پڑتا ——— عزیز نے میری آنکھوں میں نفرت اور غصے کے ملے جلے
رنگوں کو ابھرتے دیکھ کر کہا "آؤ اب چلیں۔ زیادہ دیر تک ٹھہرنا اچھا نہیں ہے"
میں بھی زیادہ دیر تک یہاں پر ٹھہرنا نہ چاہتا تھا۔ میں نے واپس پلٹتے ہوئے
ہوئے پوچھا "مسعود کہاں پر ملے گا؟" ——— عزیز نے جواب دیا۔
پہلے وہ اسی جگہ کا ہیرو بنا ہوا تھا۔ مگر اب وہ اس طرف نہیں آتا امید ہے
وہ کوٹھی ہی پر ملے گا۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور روشنیاں مقیش تاروں
کی مانند لہرا رہی تھیں۔ اور ان کی جگمگاہٹ میں نیم عریاں جسم بے حیائی کی
تبلیغ کر رہے تھے۔ اور شکاریوں کی نظریں بے باک بنتی جا رہی تھیں —
مسعود کی کوٹھی پر پہنچ کر عزیز نے نوکر سے اس کے متعلق دریافت کیا۔ نوکر بولا
مسعود صاحب ابھی تک واپس نہیں آئے۔ کچھ بتا کر بھی نہیں گئے۔ واپس
پلٹنے کی بجائے ہم سامنے کی طرف چل پڑے ——— عزیز یہاں بہکے
ہوئے بڑے لوگوں کے معاشقوں کے قصے بیان کر رہا تھا۔ ذلیل
کاروبار کے متعلق بتا رہا تھا جسے اونچی سوسائٹی کے روپے رواں بازار حسن
سے نکال کر مہذب بنانے کی خاطر اپنی سوسائٹی میں لے آئے تھے ...
ایک جگہ رک کر اس نے دائیں طرف جگمگاتی کوٹھی کی طرف اشارہ کرتے
ہوئے کہا۔ آج اس ہوٹل میں کوئی خاص پروگرام ہے "خاص پروگرام
ہے" "خاص پروگرام!" میں نے حیرانی سے پوچھا "ہاں خاص پروگرام
ہر روز کسی نہ کسی ہوٹل میں خاص پروگرام ہوتا ہے" وہ بھویں سکیڑ کر کہتا گیا
ہوئے بولا "خاص پروگرام بے حیائی کے مظاہرہ کا دوسرا نام ہے انسان
ننگا ہو جاتا ہے۔ شرم و حیا احساس مٹ جاتا ہے۔ عزت و ناموس کو
ایک کھلونا سمجھ کر توڑا پھوڑا جاتا ہے۔ باپ نوجوان کنواری بیٹی کو نہیں پہچانتا
بیوی اپنے خاوند کے لئے اجنبی بن جاتی ہے اور بھائی بہن کو دوسروں
کی آغوش میں دیکھ کر ناچنے لگتا ہے ——— اپنی اخلاقی موت پر
سب ہی خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اندھیرے کے پجاری نور کی کسی کرن
کو اپنانے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ خاص پروگرام انسانیت کے دامن
پر ایک بدنما دھبہ ہے" ——— عزیز کی رگیں تن گئی تھیں۔ وہ یہاں

کسی ہوئی مٹھیوں کو ہلا رہا تھا۔ جیسے وہ شیطان کی اس شعبدہ بازی کا پول کھول کر رکھ دینا چاہتا ہے۔ گھر کی طرف واپس آتے ہوئے وہ خاموش رہا۔ رات میں نے بڑی بے چینی سے گزاری۔ پاک دیس کی معصوم شگفتہ مسکراہٹوں کو نگلنے والے خونی اور وحشی قہقہے مجھے بار بار چونکا دیتے تھے دوسرے دن عزیز کی چھٹی تھی۔ چائے پینے کے بعد ہم مسعود سے ملنے کے لئے اس کی کوٹھی کی طرف چل پڑے۔ مسعود اپنی کوٹھی سے باہر نکل رہا تھا مجھے دیکھ کر وہ ایک شدید احساس کے تحت مجھ سے لپٹ گیا۔ اس سے بغلگیر ہو کر مجھے ایک عجیب خوشی محسوس ہوئی تھی۔ جیسے میں نے اپنی کھوئی ہوئی عزیز ترین شے کو پا لیا ہے۔ میں نے مبارکباد دی۔ وہ عزیز کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اس کی مسکراہٹ میں منزل مقصود پر پہنچنے والے مسافر کی مسرتیں تھیں، شادمانیاں تھیں اور مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں باطل کے قلعوں کی طرف بڑھنے والے حق کے سپاہیوں کے ساتھ جا رہا ہوں۔ کوٹھی میں آدھ گھنٹے تک بیٹھ کر ہم کشمیر پوائنٹ کی طرف چل پڑے۔ میں نے مسعود سے پوچھا "مسعود! کیا تم بتا سکتے ہو کہ تم میں یہ تبدیلی کیسے رونما ہوئی ہے؟" وہ کچھ دیر تک خاموشی سے چلتا رہا۔ اور پھر ہم دونوں پر نظر ڈال کر کہنے لگا "جب میں یہاں پر آیا تھا تو میری طبیعت بہت رومان پسند ہو گئی تھی یہاں پر فیشن اور حسن کو دیکھ کر مجھ جیسے سیاہ کار کی آنکھیں بھی چندھیا گئی تھیں وہ نوجوان لڑکیاں جن کی طرف دیکھنے کی بھی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اب یہاں پر نشیلی آنکھوں کے بے باک اشاروں سے مجبور کر دیتی تھیں کہ انہیں حسن پرستی کیا جائے۔ رقص و سرود کے نئے نئے پروگرام۔ یہی تھی انسانیت کو بھی سمجھا رہے تھے۔ اور نہ جانے میں گمراہیوں کی دلدل میں کتنا دھنس جاتا کہ قدرت کو مجھ پر ترس آ گیا اور میں دلدل کی ہولناکیوں سے آگاہ ہو کر اور پورا زور لگا کر اس میں سے نکل آیا ———— ایک دن میری طبیعت کچھ اداس تھی اور میں اپر مال جانے کی بجائے اسی طرف نکل آیا تھا۔ موسم خوشگوار تھا۔ اور ہوا کی نرم لہروں میں حسین شعروں کی مٹھاس رچی ہوئی تھی لیکن میری افسردگی دور نہ ہوئی تھی۔ یونہی محسوس ہو رہا تھا جیسے میری روح کسی شکنجہ میں کسی جا رہی ہے۔ اس خلاف معمول حالت پر میں خود بھی حیران تھا قریب آتی ہوئی شام مجھے دعوت دے رہی تھی کہ میں ریشم اور خوشبوؤں کے ماحول میں خود کو گم کر دوں لیکن طبیعت کی افسردگی مجھے کشمیر پوائنٹ کی طرف لئے جا رہی تھی۔ میں بہت دور نکل گیا جب تھکاوٹ سے نڈھال ہو گیا تو پگڈنڈی سے ہٹ کر ایک بڑے پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا آنکھیں بند کئے دیر تک وہاں پر بیٹھا رہا تھکاوٹ کم ہو گئی تھی اور ہوا کی لہریں میری افسردگی کو کم کرنے لگی تھیں۔ اور دل اب کسی رنگین فضا میں جانے پر مصر تھا۔ میں اٹھنے ہی لگا تھا کہ پگڈنڈی پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی کوئی میری طرف آ رہا تھا۔ پتھر کی اوٹ کی وجہ سے میں اسے دکھائی نہ دے رہا تھا۔ پتھر سے پرے ہی کوئی رک گیا۔ میں نے ذرا سر اونچا کر کے دیکھا۔ وہ ایک نوجوان عورت تھی۔ ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھیلے زمین پر رکھ کر سر سے ڈھلکی ہوئی چادر کو ٹھیک طرح سے اوڑھ رہی تھی ایک ہی نظر میں میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اس کے حسین خدوخال میں بے پناہ جاذبیت تھی۔ وہ حسن سادگی کا مرقع تھی۔ میرا دل اس سے باتیں کرنے کے لئے بے چین ہو گیا لطیف گدگدی سینے میں مچلنے لگی۔ اور میں نے ارادہ کر لیا کہ شگفتہ زندگی کو نمارآلود بنانے کی خاطر میں اسے ضرور اپنا پارٹنر بنا کر رہوں گا اپنی خوبصورتی اور دولت کا غرور میرے ہونٹوں پر فتحمندانہ مسکراہٹ کو ابھار رہا تھا۔ ایکدم کھڑا ہو گیا۔ اور اس نے جلدی سے چادر اوڑھ کر تھیلا پکڑ لیا۔ اپنے شکار پھانسنے کے آزمودہ نسخوں پر ناز تھا۔ اس نے آگے بڑھنے کے لئے قدم اٹھایا اور میں اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "ذرا ٹھہرئیے!" اپنے قریب آتے دیکھ کر بولی "فرمائیے۔ بھائی جان" ———— "بھائی جان" میں نے دل ہی دل میں اس کے الفاظ دہرائے۔ اور محسوس ہوا جیسے ذہن پر کسی نے کھولتا ہوا پانی ڈال دیا ہے۔ میں جھنجھلا اٹھا اپنی چلنے والی حسین عورتوں سے میں نے کبھی ایسے الفاظ نہ سنے تھے اور کبھی وہم ہوا تھا کہ کوئی مجھے ایسے نام سے پکارے گی۔ وہ عورتیں سگے بھائیوں کو بھی اس نام سے پکارتے ہوئے ہچکچاتی تھیں اگر ان کا بس چلتا تو وہ بھائیوں کو بھی اپنے عشاق میں شامل کر دیں۔ اس لئے اس کا بھائی جان کہنا مجھے بہت ناگوار گزرا۔ لیکن اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا اس نے دوبارہ پوچھا "فرمائیے بھائی جان کیا بات ہے؟" ———— "بھائی جان" کی تلخی مٹانے کی خاطر کہا "آج موسم کیسا سہانا ہے" "موسم سہانا ہو گا لیکن اس سے آپ کا مطلب؟" میں نے

ایسے رومان پرور موسم میں آپ کہاں جا رہی ہیں" اس نے سخت لہجہ میں جواب دیا "انسانوں کے پاس" ——— "میں بھی تو انسان ہوں" وہ مجھے ہنستے ہوئے بولی "بغیر پرکھے میں کیسے یقین کر لوں" میں نے کہا "یہ شام کی ٹھنڈی تنہائی تمہیں بہت جلد یقین کرا دے گی" میں ذرا آگے بڑھا وہ تیز لہجے میں بولی "بھائی جان پاگل مت بنئے۔ پہلے میرے چند سوالوں کا جواب دیجئے۔ پھر میں آپکے ارادوں کا جواب دونگی" میں نے سمجھا تیر نشانے پر بیٹھ گیا۔ اب وہ مجھ سے میری دولت اور کار کے متعلق پوچھے گی۔ محبت میں ثابت قدم رہنے کا وعدہ لے گی۔ اور پھر اپنی فرمائشوں کا جال پھیلا دیگی ——— میں سمجھتا تھا کہ حسین عورتوں کے پاس پوچھنے کے لئے اور کوئی سوال ہی نہیں ہوتا لیکن میرے سر پر جیسے بھاری پتھر گر پڑا ہو۔ اس نے پوچھا "کیا آپ مسلمان ہیں؟" اور میں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ سوال میرے لئے تعجب خیز تھا۔ مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا اس نے دوبارہ پوچھا "آپ دنیا میں کن اصولوں کے تحت زندگی بسر کرنا افضل سمجھتے ہیں"؟ میرے پیش نظر کبھی کوئی اصول تھا ہی نہیں میں کیا جواب دیتا۔ وہ حیرانی سے میرا منہ دیکھنے لگی "آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟" میں نے ہمت کر کے جواب دیا "میں یہیں کا رہنے والا ہوں" اس نے میرا پہلا سوال دہرایا "آپ مسلمان ہیں؟" ——— "جی ہاں" میری جھجک کچھ دور ہوئی۔ وہ بولی "کبھی آپ نے اسلام کے متعلق کچھ جاننے کی کوشش کی ہے" میں نے اس کی باتوں سے اکتاتے ہوئے کہا "یہ کیا روکھی پھیکی بحث چھیڑ دی ہے۔ یہ سہانا موسم ہم سے میٹھی اور رسیلی باتوں کی بھیک مانگ رہا ہے ہوا کی مدھر لہروں میں محبت کے پیغام رچے ہوئے ہیں۔ اس کی آواز غصیلی ہو گئی "یہ ہوا کی لہریں جنہیں آپ مدھر سمجھ رہے ہیں ان مجبور انسانوں کی ہچکیاں ہیں جو ظلم کی چکی میں بری طرح پسے جا رہے ہیں۔ آپ ماحول کو اس لئے سہانا سمجھ رہے ہیں کہ آپ کی جیب دولت سے بوجھل ہے۔ آپ کا لباس بہت قیمتی ہے۔ موسم کا حال ان دکھی انسانوں سے پوچھیں جن کے دل ٹوٹے ہوئے ہیں۔ ان کنواریوں سے پوچھیے جن کی لاچارگی سے فائدہ اٹھا کر آپ انہیں معصیت کے خونی جبڑوں میں پھنسا کر بھاگ گئے ہیں۔ آپ خود کو انسان سمجھ رہے ہیں۔ مگر میں پوچھتی ہوں کبھی آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ آپکے رنگین محلوں کے آس پاس گھری ہوئی آہیں کیا مانگتی ہیں۔ آپ نشہ میں سرشار ہو کر وہی کام کر رہے ہیں جو خدا سے بے خوف انسان کیا کرتے ہیں آپ سمجھتے ہیں کہ آپ نے دنیا پر مسلط کیا ہوا ہے یہ جم جمودیوں ہی قائم رہے گا ——— ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ——— شاید آپ نے کبھی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا قوموں کے عروج زوال کی حکایات نہیں پڑھی ہیں ——— اس نے گہرا سانس بھرا۔ اور مجھے پہلی دفعہ محسوس ہوا کہ ؏

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

اس کی باتوں سے میرے بدن میں سنسناہٹ کی تیز لہر دوڑ گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں رسیوں سے جکڑا ہوا گرم ریت پر پڑا ہوں اور حبشی جلاد مجھے کوڑے مار رہا ہے "اُف۔ خداوند" غیر شعوری طور پر میں نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ میری اس حرکت سے اس کی آواز میں شفقت ابھر آئی۔ آپ نوجوان لڑکیوں کو اپنے نفس کا کھلونا بنا کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ شراب کے نشہ میں اچھائی برائی کو پرکھنے کا شعور مٹ جاتا ہے۔ اگر آپ انسان ہوتے تو آپ خود سوچتے کہ جس راستہ پر آپ گامزن ہیں وہ کتنا بھیانک ہے۔ کبھی آپنے یہی غور کیا ہے ..... آپکے وطن میں حق و باطل کی کش مکش ہو رہی ہے اور آپ اپنی مسرتوں میں مگن ہیں۔ زبان سے آپ اپنے مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور آپ کا کردار اسلام کے زریں اصولوں کا بدترین دشمن بنا ہوا ہے۔ اس پر بھی اگر آپ اپنے آپ کو انسان کہیں تو آپ سے بڑھ کر شاید ہی کوئی ریاکار دنیا میں ہو" پھر پتھر پر بیٹھ کر میں نے نظریں جھکا لیں۔ وہ تھیلا نیچے رکھ کر بولی "آج کی بچی کل کی ماں ہے آپ اس حقیقت کو جانتے ہوئے بھی ماں کو اس کی ذمہ داریوں سے بے نیاز بنا کر اس کے ذہن میں عیش پرستی کی گندگی پھیلا رہے ہیں۔ جب کوئی قوم مٹنے لگتی ہے تو اس کے نوجوانوں میں گمراہیوں کے جراثیم پھیل جاتے ہیں خدا اس پاک سرزمین کو آسمانی عذاب سے بچائیے۔ ورنہ آپ کا کوئی نشان باقی نہ رہے گا۔ اس کے لہجے میں آنسوؤں کی تڑپ سما گئی تھی میں نے بولنا چاہا اور الفاظ حلق میں ہی اٹک کر رہ گئے۔ بھاری آواز پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ بولی "بھائی جان۔ آپ نوجوان ہیں صحت مند ہیں۔ ملک اور قوم آپ سے رحم کی بھیک مانگتے ہیں۔ اپنے ذہن کو تعمیری کاموں کی طرف موڑیئے۔ تمام دنیا آپ کی انسان دوستی کو فخر سے یاد کرے گی" وہ تھیلا پکڑ کر چلنے لگی۔ میں سنبھل گیا تھا۔ اسے آنے

بڑھتے دیکھ کر میں نے پوچھا "کیا آپ اپنی جائے رہائش اور نام بتلانے کی تکلیف گوارا فرمائیں گی؟" میرے سہمے ہوئے لہجے سے متاثر ہو کر وہ رک گئی "میرا نام رضیہ ہے" وہ تھیلا نیچے رکھکر بولی "میں اپنے والدین اور بچے کے ساتھ وہاں رہتی ہوں" اس نے پستی کی طرف اشارہ کیا "ان جھونپڑیوں میں رہتی ہیں آپ؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔ وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔ "یہ پستی آپ کی بلندی سے ہزار درجے بہتر ہے۔ اباجان پہلے بھی یہاں آیا کرتے تھے لیکن وہ کبھی بھی مری ہل کے خوبصورت بنگلوں میں نہ ٹھہرتے تھے ان جھونپڑیوں میں سسکنے والی مخلوق کو خدا پرستی اور انسانیت کا سبق پڑھانے کی خاطر وہ انھیں کے ساتھ رہتے تھے۔ اور میں بھی اسی جگہ پر رہتی ہوں بچوں اور عورتوں کو پڑھاتی ہوں اور مجھے اپنے قریب دیکھکر ان کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی۔ اب یہ انسان اسلام کی ذمہ داریوں سے آگاہ ہوتے جا رہے ہیں اور ایک نہ ایک دن صحت مند نظام حیات کو قریب تر لانے کی خاطر ان کی جد و جہد رنگ لا کر رہے گی۔" مجھے استعجاب کے نرغے میں پھنسا چھوڑ کر وہ اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ میں بہت دیر تک وہیں پر گم سم سا کھڑا رہا۔ میرا کچلا ہوا ضمیر حساس ہو چلا تھا اور ندامت کے تیز کچوکے میری روح کو لرزا رہے تھے ——— رات کو میں بالکل نہ سو سکا۔ مجھے ایک ان دیکھی ہستی مجبور کر رہی تھی کہ یوں گھلنے کی بجائے میں خدمت خلق کے لئے کمربستہ ہو جاؤں۔ میں نے گھر والوں کو اپنے ارادہ سے آگاہ کر دیا۔ پہلے وہ میرا تمسخر اڑاتے رہے اور جب مجھے اپنے مقصد پر ثابت قدم دیکھا تو آہستہ آہستہ انھیں بھی میرے خیالات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی علالت پڑ گئی اور اب وہ بھی جان گئے ہیں کہ جس راستہ پر وہ گامزن ہیں وہ انتہائی خطرناک ہے۔ میرے بعض دوست تو سنجیدگی سے میری باتیں سنتے ہیں اور بعض ابھی تک میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ مجھے اب لوگوں کی تعریفوں کی کوئی آرزو نہیں ——— اور رضیہ باجی کے اباجان سے انسانیت کا سبق پڑھ کر میرا دل مادی طاقتوں کے خوف سے آزاد ہوتا جا رہا ہے" مسعود خاموش ہو گیا اور مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے کائنات کا ہر ذرہ اس کی ایمانی قوت پر تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کر رہا ہے۔ مسعود نیچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "آؤ رضیہ باجی کے اباجان سے تمھاری بھی ملاقات کرا دوں۔ ان سے مل کر یقیناً تم خوشی محسوس کرو گے" ——— ہم تینوں پگڈنڈی پر آہستہ آہستہ پاؤں رکھتے نیچے اترنے لگے ——— اور مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے پستی کی بجائے ہم بلندی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

FEMALENE
General Tonic
FOR WOMEN
REMEDY FOR
IRREGULAR
MENSES
HAZIQ

فیمیلن (نسائی خاص)

یہ گولیاں عورتوں کی پوشیدہ شکایتوں کو دور کرنے میں اکسیر ہیں۔ سیلان ماہواری کی بے قاعدگی اور اسی قسم کی دوسری زنانہ شکایتوں سے پیدا شدہ جملہ نقائص کو دور کرنے میں اکسیر ہیں!

استقرار حمل کو مدد دیتی ہیں؛ گویا عورتوں کے لئے ایک جنرل ٹانک ہے جسکا متواتر استعمال عورتوں کے نظام عصبی کو درست کرتا ہے جن عورتوں کو اسقاط حمل کی بار بار شکایت ہوتی ہے ان کے لئے بیحد مفید ہے قیمت فی شیشی: دو روپے بارہ آنے

ساختہ: حاذق دواخانہ بندر روڈ، کراچی

بیکل یزدانی •

مشورہ

خود گرد خود فریب آقاؤ اے فرنگی صفات مولاؤ
ہم غریبوں کا خون پانی ہے جس طرح چاہو کام میں لاؤ
کر بھی گذرو خدائی کا دعویٰ اب تو پروردگار بن جاؤ
بادہ و جام کا زمانہ ہے ساز عشرت پہ رقص فرماؤ

لطف جب ہے شراب پینے کا
غرق جام شراب ہو جاؤ

چند روزہ ہے زندگی کی بہار آؤ ساقی سے دل کو بہلاؤ
تم مسجد سے واسطہ ہی کیا میکدہ میں شراب چھلکاؤ

مٹ رہا ہے چمن تو مٹ جائے
تم ترانے بہار کے گاؤ

پھر کوئی کفر ساز ہنگامہ پھر کوئی بات یاد فرماؤ
ہنس پڑے روح "جعفر و صادق" پھر وہی داستان دُہراؤ
پھر ہمیں بیچ دو ستم گارو پھر غلامی کا طوق پہناؤ
خون سے ہم نے آبیاری کی تم گلستاں میں آگ برساؤ
چوم لو پھر قدم فرنگی کے پھر عقیدت کا تاج پہناؤ
"دین احمدؐ" کی بیٹیو شاباش بزم "اپوا" میں رقص فرماؤ
سر پہ رکھدو غریب کے الزام اپنا دامن مگر بچا جا

قلب ملت میں غدبن کے چبھو　　حق میں دشمن کے پھول بن جاؤ

یہ تمھاری پرانی عادت ہے
کام کی بات گول کر جاؤ

تم بباطن تو خار تھے ہی مگر　　تم بظاہر بھی خار بن جاؤ

سر اٹھائیں اگر یہ اہل حق　　اختیارات کام میں لاؤ

مختصر یہ کہ ہر خباثت میں　　آپ اپنی مثال بن جاؤ

ساتھ دیگا معلم الملکوت!
تم اکیلے نہیں نہ گھبراؤ

روح اسلام جس سے ہو بیکل　　ایسی تدبیر اور فرماؤ

افاداتِ مسیحُ الملک

مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب مرحوم کا مکمّل

"دستورُ العلاج"

جس میں سر سے پاؤں تک کثیر الوقوع بیماریوں کا بیان معہ تشخیص اور علاج حکایات کی صورت میں بیان کیا گیا ہے قابل قدر اور مفید کتاب ہے!

فی جلد تین روپے آٹھ آنے

حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی نمبر ۱ سے خریدیں

شمیم عابدی •

اخبار کا خالی کالم !

کئی سال گزر گئے مگر صحیح معنوں میں آج تک کوئی اس
راز کو سر نہ کر سکا کہ ٹیکس (TEX) کے زیرِ ادارت نکلنے
والے ہفتہ وار جریدہ میں کیوں گاہے گاہے خالی کالمس واقع ہوتے
رہتے ہیں ؟ کئی لوگ اس راز میں سر مار چکے ہیں۔ لیکن کوئی اس
سے زیادہ نہ کہہ سکا کہ ٹیکس کا دماغی توازن بگڑ گیا ہے ....
وہ منحرف المرکز ہو گیا ہے ....

اس کے باوجود یہ عجیب واقعہ ہے کہ ٹیکس کی عزت اکثر دلوں
پر گھر کر چکی تھی ...... وہ چالیس سال تک سٹی نیوز پیپر میں کام کرتا
رہا۔ اور جب کاروانِ حیات نے ساٹھ پر پانچویں منزل کا ڈیرہ تان
دیا تو وہ خود اپنا ایک ذاتی ہفتہ وار نکلوانے لگا...... ٹیکس کے
اداریے خاص و عام دونوں طبقوں کے مطالعہ کا مرکز بنے رہے
...... لیکن ناظرین تازہ شمارے میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ کیوں
ہر مرتبہ دوسرے صفحہ پر خالی کالم واقع ہوا ہے ؟ لیکن جب ہر سال
تین دفعہ خالی کالمس کبھی پہلے اور کبھی دوسرے صفحہ پر اپنا حصہ پانے
لگے تو ہر ایک یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا کہ ہو نہ ہو ان خالی کالمس کے پس پشت
کوئی راز کارفرما ہے ، ہر ایک ذہن اس نادیدہ راز کا طواف کرنے
لگا اور جتنی زبانیں تھیں اتنی باتیں ہونے لگیں .... لیکن کسی
کا ذہن مطمئن نہ تھا .... کوئی بھی کامیاب جستجو نہ تھا۔

ٹیکس اپنے چھوٹے سے دفتر میں اکیلا بیٹھا ہوا اداریہ کی تیاری
میں مصروف تھا ...... دفتر کی تنگ فضا میں سگرٹ کا دھواں
حلقے لگا رہا تھا۔ ٹیبل پر کاغذات ، رسائل اور کئی خطوط بکھرے
پڑے تھے ۔ سورج کی شعاعیں کھڑکی کی راہ دفتر میں داخل ہو رہی
تھیں ، دفتر کی دنیا پر خاموشی چھائی ہوئی تھی کہ کسی کے پاؤں کی
آہٹ نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

کون .... ؟ اوہ ! گانزالس آئیے ... تشریف رکھیے ،
اس نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ...... میرے لائق
کوئی خدمت ہو تو فرمائیے .... لیکن .... یہ آپکا چہرہ کیوں
تمتما رہا ہے ؟ ٹیکس نے گانزالس کی دکھتی رگ پر انگلی رکھدی ۔

"ٹیکس !"

گانزالس کے لہجے میں غصّہ کی لہر اٹھ رہی تھی ۔

" آج کے شمارے میں پھر آپ نے ایک کالم خالی رکھا ....
ٹیکس میرا دل تمہارے احترام سے لبریز ہے لیکن لوگ تمہاری ہنسی
اڑا رہے ہیں .... کوئی تمہیں خبطی کہتا ہے تو کوئی سڑی بتاتا ہے ،
کوئی تمہیں پاگل بتاتا ہے تو کوئی منتشر الخیال تصور کرتا ہے ۔ ٹیکس تم
کیا جانو کہ جب یہ زہر میرے کانوں میں پڑتا ہے تو میرے جذبات
کا کیا حشر ہوتا ہے ، تمہاری خاموشی نے تو دوسروں کی زبانیں دراز
کر دی ہیں ، ٹیکس ! آخر تم اپنی طرف سے کوئی صفائی کیوں پیش نہیں
کرتے ؟" جوش کھاتے ہوئے دریا کی لہروں کی طرح گانزالس کی
زبان سے الفاظ نکل نکل کر کمرے کی دیواروں سے سر پھوڑ رہے تھے

" ٹیکس ! " گانزالس نے سانس لیتے ہوئے کہا " بتاؤ ٹیکس کیا
یہ سب کچھ سچ ہے ، واقعی کیا تم پاگل ہو ؟ کیا ان خالی کالموں کے
پیچھے تمہارا جنون کام کر رہا ہے ؟ بتاتے کیوں نہیں ٹیکس ! " کوہِ
آتش فشاں کے دہانے سے انگاروں کی طرح گانزالس کی زبان سے الفاظ
برس رہے تھے ... اور اب وہ سانس پھولنے لگا تھا ۔ ٹیکس خاموش بیٹھا
ہوا گانزالس کے الفاظ کو اپنے ذہن میں جذب کر رہا تھا ، گانزالس
خاموش ہو گیا اور ٹیکس کے چہرے کا مد و جزر دیکھنے لگا ۔

" آخر صبر بھی تو کوئی چیز ہے " ٹیکس نے بڑھتی ہوئی خاموشی
کو توڑتے ہوئے کہا ۔ " مارنے والے کی لکڑی تو پکڑ سکتے ہیں مگر کہنے وا

کی زبان کون پکڑ سکتا ہے کانسٹرالس!" ٹیکس کے ہونٹوں پر ایک طنز آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی، "کانسٹرالس میں آپ کی ہمدردی کا شکریہ ادا کرتا ہوں، لیکن آپ خواہ مخواہ میرے لئے اتنے پریشان نہ ہوں، لوگ مجھے سودائی کہیں یا دیوانہ خیال کریں ..... بہرحال مجھے ان بے بنیاد باتوں کی کوئی پرواہ نہیں ..... " ٹیکس کے الفاظ سے سنجیدگی ٹپک رہی تھی: "میں جھوٹے پروپیگنڈوں اور رکیک حملوں سے ڈر کر اپنے ہتھیار نہیں ڈال سکتا۔ اگر میں چاہتا تو یہ راز اب تک راز نہ رہتا اور یہ غلط فہمیاں کبھی کی اپنی موت آپ مرگئی ہوتیں!"

ٹیکس خاموش ہوگیا اور پھر ایک مرتبہ خموشی نے اپنے پیر پھیلا دیئے!

یہ راز، جس نے سارے شہر کو پریشان و سرگرداں بنا رکھا تھا یونہی سربستہ رہتا، اگر ایک غپ شپ مارنے والی عورت اسکو فاش نہ کرتی، اس نے یہ خبر ہوا کے دوش پر اڑا دی کہ ٹیکس ایک بے ایمان مدیر ہے' لوگوں سے ناجائز دولت اکٹھا کر رہا ہے۔ شریفوں اور مالداروں کے ذاتی معاملات کو پیش کر دینے کی دھمکی دیکر انہیں پریشان کر دیتا ہے، سادہ لوح اس کی دھمکیوں میں آکر اس کی جیب بھر دیتے ہیں ٹیکس ان کالموں کو خالی چھوڑ کر در اصل ان بیچاروں کو دھمکی دیتا ہے کہ سیدھی طرح دولت کا دہانہ کھول دو۔ ورنہ یہ خالی کالمس!!

اڑتی اڑتی یہ خبر میرے نانا کی قوت سماعت سے ٹکرائی اور ان کے جذبات کا نازک ترین شیشہ غم و غصہ کے پتھروں سے ٹکرا کر چور چور ہوگیا اور دوسرے لمحے وہ ٹیکس کے دفتر کی طرف جاتے دکھائی دے رہے تھے۔

"میں جان گیا ٹیکس!" دفتر کی تنگ فضا میں میرے نانا کی فلک شگاف آواز نے تہلکہ مچا دیا۔

"اوہ! آپ!" ٹیکس کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا:

وہ میرے نانا کی غیر متوقع آمد پر کچھ سہما ہوا تھا لیکن چند ہی لمحوں میں وہ طوفان کی سمت کو تاڑتے ہوئے کہنے لگا۔

"مجھے امید ہے کہ جو مجھے اچھی طرح جانتے ہیں وہ ان بے بنیاد باتوں پر کان نہیں دھریں گے حقیقت بہرحال حقیقت ہی رہے گی اور پھر یہ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیوں لوگ اس غیر ضروری سمت پر اپنے دماغوں کو مرکوز کر دیتے ہیں اور کیوں اپنا عزیز وقت بیکار ضائع کر رہے ہیں"

"لیکن تم اپنی طرف سے صفائی پیش کیوں نہیں کرتے ٹیکس" نانا جان نے ایک سبے تکی ہانک دی اور ... جلانے میں ... ہوگئے۔

"مجھے آپ اس کے لئے معذور تصور فرمائیں!" ٹیکس کے ... میں عزم کی جھلکیاں نمایاں تھیں، "... مرتے دم تک اس راز کو زبان پر نہ لاؤنگا، آپ یقین فرمایئے کہ میں اپنے پیٹ میں دوزخ کی آگ نہیں بھر رہا ہوں، اگر واقعی میں زر پرست ہوتا، میرا صرف حصول زر ہوتا تو آج تک میں ہزاروں ... ایک ہوتا۔ عورتوں کی عریاں تصاویر پوری جاذبیت کے ساتھ شائع کرتا اور ... گرہوں کو کاٹ پھینکتا، شہوانیت سے بھرے ہوئے افسانے جنسی بھوک کو مشتعل کر دینے ... صف میں شائع کرتا اور زر کی نہریں بہا لاتا، اگر میں چاہوں تو یہ تنگ و تاریک دفتر ... ایک بڑے ... میں تبدیل کر سکتا ہوں ..... مگر ... میں ... اخلاق کو نہیں بیچ سکتا، میں ان جرائم کو ... کے لئے ... تصور کرتا ہوں ..... یہ میرا ایمان ہے"

جس طرح شبنم سے پیاس نہیں بجھ سکتی، قطرے ... کو بہا نہیں لے جا سکتے، اُسی طرح ٹیکس کی باتیں نہ تو لوگوں کی ... بجھا سکیں اور نہ ہی دلوں سے غبار کو دھو سکیں ..... یہ ... دھیرے دھیرے روز بروز بڑھتا ہی گیا یہاں تک کہ شہر کے بچوں اور ... کی زبانوں پر بھی ٹیکس کی بے ایمانی کے چرچے سنائی دینے ... سجھائی دیتا تھا کہ شہر کی ساری فضا ٹیکس کی مخالفت میں زہر آ...

...ہے!

اور شاید سارے شہر میں پیٹر ہی وہ آخری شخص تھا جس کے ذہن
...وں کی راہ یہ زہر پہنچایا گیا، زہر نے فوراً اثر کیا اور وہ اپنے دماغ
...یک نہ رکنے والی بےچینی محسوس کرنے لگا، اسکی بیوی جو داغ مفارقت
...گئی تھی وہ آبلہ ابھی مندمل بھی نہ ہو سکا تھا کہ ٹیکس کی پھیلی ہوئی بدنامی
...پھپھولوں پر انگارہ رکھ دیا، وہ درد اور کرب سے بے ساختہ چیخ اٹھا
...غلط ہے، یہ خبر سراسر افترا پردازی پر مشتمل ہے، یہ جھوٹا پروپیگنڈہ
...: اسکی بےچینی اس کے الفاظ کے چہروں پر رقص کر رہی تھی۔ ٹیکس
...ت پر تلے بولنے والی لوزشوں کی مخالفت میں پیٹر کی نحیف آواز نے
...یک قلعہ تعمیر کیا جس نے مخالفت کی ساری یورشوں کو ناکام
...کے واپس پھیر دیا، حق کے آگے جس طرح باطل بغلیں جھانکنے لگتا ہے
...سی طرح پیٹر کے بین دلائل نے تعصب زدہ مخالفتوں کو میدان چھوڑنے
...مجبور کر دیا۔

"لوگو!" اس نے غصہ سے پکارا۔ "ٹیکس ایک شریف اور
...ردی ہے، یہ سراسر ظلم ہے۔ افواہ ہے، افترا ہے، جھوٹ ہے
...اس پر باندھا گیا ہے کہ وہ ناجائز اور باطل طریقوں سے دولت اکٹھا
...روپیہ کماتا ہے اور ان خالی کالموں کو در اصل دوسروں پر اپنی گرفت
...کرنے کے لئے وجود میں لاتا ہے"

"بھائیو! میری سنو، وہ بے قصور ہے" پیٹر کی آواز میں حسرت
...کرسمس کر دی گئی تھی، دراصل!" اس نے کہنا شروع کیا "مجھے
...ان خالی کالموں کی پشت میں اپنی تصویر نظر آتی ہے" ایک ایک کرکے
...لوگ اس کے اطراف جمع ہو گئے، سب تعجب خیز نظروں سے
...تک رہے تھے، اور وہ اپنا واقعہ بیان کر رہا تھا، بڑھاپے کی بدولت
...کی زبان ایک شکستہ ساز کے ٹوٹے ہوئے تار کی طرح تھرتھرا رہی تھی

"آج سے چار سال پیشتر جب کہ اس کی عمر ستر سال کی تھی آٹھ...
...ت تک وہ ایک فرم میں کام کرتا رہا، بڑھاپے نے اسکی ملازمت
...رد روک لی اور اسکی جگہ ایک جوان سال نے پر کر دی۔ عدم ملازمت
...نے اور اسکی بیوی کے عرصہ حیات کو تنگ کر دیا ایک لڑکی تھی جو
...بیاہی جا چکی تھی، بیٹی کو پروان چڑھانے کے لئے اس نے اپنے آخری
قطرۂ خون تک کو نچوڑ دیا، اور اب وہ زہر کھانے کے لئے بھی پھوٹی
کوڑی تک کا محتاج ہو گیا، پیٹر اس بڑھاپے میں ایک فرم کی خاک
چھاننے لگا اور آخرکار کسی نے اس کے بڑھاپے پر ترس کھا کر ایک حقیر
معاوضے پر ملازم رکھ لیا، لیکن افسوس کہ اسکی ملازمت کچی ڈوری
کے بل پر ٹکی رہی تھی، وہ اپنے مستقبل کی طرف سے مایوس ہو چکا تھا،
مستقبل ایک گھناؤنے تاریک غار کی طرح نظر آ رہا تھا، اس نے اپنا
مستقبل بنانے کی ٹھان لی، روپیہ جمع کرنے کی خواہش نے حرام و حلال
پر پردہ ڈال دیا، اور وہ اپنی زندگی میں پہلی بار، پہلا جرم چوری کر بیٹھا
وہ اس فرم سے سامان چراتا اور دوسری دکانوں پر انہیں فروخت
کرنے لگا، بھلا چوری بھی کوئی چسکے سے چھوڑنے والی چیز تھی، یہ
ایسی کافر شراب ہے جو ایک بار منہ سے لگے جو چھٹنے کا نام نہیں لیتی،
کئی ہفتے گزر گئے۔ پیٹر اپنا کام بڑی صفائی کے ساتھ کرتا رہا
آخر شام ہارڈ جو اس فرم کا مالک تھا، پیٹر کے بدلے ہوئے تیور اور
بھٹکی ہوئی نیت کو تاڑ گیا اور اس کے گرد ایک غیر محسوس جال تان دیا،
جس میں پیٹر نے لاعلمی سے قدم رکھ دیا.. اور الجھ کر رہ گیا،

شام ہارڈ جتنا نرم دل تھا اتنا ہی سخت مزاج بھی تھا اس نے فوراً
ٹیکس کو کمپنی میں بلا لیا حاکم شہر بھی آموجود ہوا، تینوں نے پیٹر کو ساتھ
لئے ہوئے ان دکانوں کی چھان بین شروع کر دی جہاں پیٹر چوری کا
مال فروخت کرتا تھا۔ ٹیکس تیوری تیار کرنے میں مصروف ہو گیا، پیٹر
احساس شرمندگی سے سر جھکائے کھڑا تھا، کچھ سوچ کر دبے پاؤں
ٹیکس کے قریب آ کھڑا ہوا... ٹیکس نے پیٹر پر ایک نظر ڈالی۔ چہرے
پر بےشمار جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر پسینے
کے قطروں میں خلط ملط ہو رہے تھے، اور ان نالیوں سے ہو کر
داڑھی کے بالوں کو نم آلود کر رہے تھے۔ پیشانی پر ندامت کے تفکر
معانی کا پیغام سنا رہے تھے، اس کی نظریں رحم کی ملتجی تھیں اس کے
ہونٹ کرم کی بھیک مانگ رہے تھے، پیٹر کی ہیئت نے ٹیکس
کے دل کو پسیج دیا تھا.. اور جب پیٹر نے لرزتے ہوئے ہاتھوں
سے اپنا دل نکال کر ٹیکس کے روبرو پیش کیا، لڑکھڑاتی ہوئی زبان
سے اپنی داستان الم انگیز ٹیکس کے گوش گزار کی.. تو ٹیکس محسوس

کرنے لگا کہ اس کی آنکھیں اشک بار ہو رہی ہیں ، اور وہ کچھ کھویا جا رہا تھا ۔ اس نے اپنی نوٹ بک جیب میں ٹھونس دی اور آنکھیں بند کر کے کرسی پر بیٹھ گیا :

ولیتی ۔ پیٹر کی خوددار بیوی ، اس کے سامنے اپنا دامن پھیلا کر رحم کی بھیک مانگنے لگی ، خاندان کی عزت پر بٹہ لگنے سے موت پسند تھی ، وہ بار بار کہہ رہی تھی کہ للّٰہ اس شرمناک واقعے سے رسالے کے اوراق کو سیاہ نہ کرو ، خاندان کی عزت پر بٹہ نہ لگاؤ .... اور ٹیکس اب پتہ مجھے رونے لگا تھا ۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ پیٹر کی خوددار عورت موت کو ذلت پر ترجیح دے گی ، بھیک ، جس کے نزدیک ایک اخلاقی جرم تھا وہ مصیبت کے ایام میں بھیک سے زیادہ بھوک پسند کرتی تھی ، ٹیکس نے چند لمحوں کے بعد اپنے آپ کو کھو کر پایا ... اور کرسی سے اٹھ کر بارڈ اور حاکم شہر کو تخلیہ میں لے گیا ۔ آدھ گھنٹے بعد ٹیکس اکیلا باہر نکل آیا اسکے چہرے پر پُروقار سنجیدگی برس رہی تھی اس نے پیٹر کے قریب آتے ہوئے کہا ۔

" پیٹر ! تمہیں اس مرتبہ معاف کیا جاتا ہے ، حالات چاہے کیسے بھی ہوں لیکن جرم بہرحال جرم ہے ، لیکن تمہارا بڑھاپا اور تمہاری زندگی کے نشیب و فراز نے میری راہ روک لی ہے ۔ میں تو اس واقعہ کو ضرور شائع کر دیتا ... مگر ..... !!

بہرحال میں تمہارے لئے اپنے پیپر کو استعمال کرونگا " اس نے اپنے چہرے پر ایک بناوٹی رعب تماتے ہوئے کہا " میں تمہارے لئے کالم ایک کالم وقف کرتا رہونگا ، اگر تم نے دوبارہ اس قسم کی ناجائز حرکت کی ، تو یہ خالی کالم دیکھ لینا تمہاری عبرت انگیز داستان سے پُر ہوگا ۔ پیٹر ایسا خاموش کھڑا ہوا تھا کہ جیسے کوئی تصویر ہے لیکن پیٹر ! ٹیکس نے مکرر کہا ۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ تم سزا سے بچ نکلو گے ، تمہیں کسی طرح اس دھبہ کو دھونا پڑے گا اور اپنے مالک کا واجب الادا مطالبہ واپس کرنا ہوگا ، پیٹر ڈرینے نہیں ٹیکس نے ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا ، تمہیں دوبارہ ملازمت میں لے لیا جائے گا :

پیٹر کو دوبارہ ملازمت مل گئی لیکن اس شرمناک واقعہ نے اسکی بیوی پر ایسا ہتھوڑا مارا کہ بے چاری جانبر نہ ہو سکی ...... طبیعت گرتی ہی گئی مگر وہ خوددار عورت کیوں مرتے وقت کسی کی مقروض رہے ؟ وہ اپنی طبیعت سے بےخبر ہو کر ٹیکس کے بتائے ہوئے نسخہ پر ایک جام تیار کرنے لگی ٹیکس نے شاندار طور سے اس جام کو اپنے رسالے کے ذریعے مشتہر کر دیا اور ایک قلیل مدت میں پیٹر اس قابل ہو گیا کہ اپنے مالک کا چرایا ہوا مال واپس کر دے ۔

جب شہر والوں نے اس واقعہ کو سنا تو انہیں اپنے کانوں پر اعتبار نہ آرہا تھا لیکن زندہ ثبوت کو پیش نظر پا کر بھی شاید ہی کوئی ہٹ دھرمی پر قائم رہے ۔

جب ہر ایک پرانی حالی کالوں کے پس اپشیت کام کرتا ہوا جذبہ منکشف ہو گیا تو وہ اپنی انگلیاں دانتوں میں دباتے ہوئے اپنے پچھلے خیالات پر کف افسوس ملنے لگے ٹیکس کی بلند شخصیت پھر ایک مرتبہ سب کے دلوں پر حاوی ہو گئی ، دلوں سے ساری نفرت دھل گئی جس کا سیلاب بال کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے گیا ۔

ٹیکس اپنے دفتر میں خاموش بیٹھا ہوا تھا ، وہ حقیقت حال سے ابھی تک بہرہ مند نہ ہوا تھا ۔ تفکر کے بادل اس کے چہرے پر چھائے ہوئے تھے ۔ چہرے کو ہاتھوں سے تھامے کہنیوں کو ٹیبل پر جمائے تھا ، کمرے میں ہر طرف خاموشی تھی ٹیبل پر ایک چھوٹا سا لیمپ کمرے سے تاریکی دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا ۔

لوگ مجھے پاگل کہتے ہیں ۔ منتشر الخیال اور منحرف المرکز کہتے ہیں ۔ وہ مسکراتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا ، لوگ خواہ مجھے کچھ ہی کہیں لیکن پیٹر ! یہ کالمس تمہارے لئے ایک انتباہ ہے ۔ یہ میرے کو زائل کر رہے ہیں مگر خدا کا شکر ہے کہ یہ ایک بندہ کو معصیت سے بچنے کا پیغام دیتے ہیں ۔ پیٹر ! میں اپنے وعدہ کو مرتے دم تک نبھاؤنگا اور جب ٹیکس حقیقت حال سے واقف ہوا تو وہ پیٹر کی اس کا معترف ہوئے بغیر نہ رہ سکا ، مگر کسی صورت اسے اپنا وعدہ نبھانا تھا وہ مرتے دم تک اپنے وعدے پر قائم رہا ۔ (ترجمہ) بشکریہ کوثر

اعظم ادیب

محکوم اور حاکمیّت

اے قطرۂ بے مایہ ذرا اپنی خبر لے ڈرتا ہوں کہ تو اپنی حدوں سے نہ گزر جائے

دریا متلاطم ہے تری حرص و ہوس کا

بہتر ہے گرجتا ہوا طوفان اتر جائے

تو اپنے زرِ نقد کا ہے آپ ہی رہزن اے بھولے مسافر تری تقدیر کدھر جائے

احساس کی مدھم سی کرن تجھ میں ہے باقی صحراؤں کی تاریک فضا میں نہ بکھر جائے

آئینۂ خلوت میں کبھی اپنی ادا دیکھ

شاید کہ تری زلفِ پراگندہ سنور جائے

یہ ڈھلتی ہوئی چھاؤں یہ بڑھتے ہوئے سائے سورج کو نگلتی ہوئی راتوں کی سیاہی

پت جھڑ میں گل و لالہ کی افسردہ نگاہیں بپھرے ہوئے سیلاب میں شہروں کی تباہی

بھونچال کے چنگل میں فلک بوس تمدن گرداب کی آغوش میں سہمے ہوئے راہی

آیات و نشانات کی دنیا کے مسافر

کیا پوچھتی ہے تجھ سے تری کور نگاہی!

کیو ایس قیصر •

پیام اپنا

نجوم و شمس و قمر سے آگے بنا رہا ہوں مقام اپنا
فلک کی پہنائیوں نے قیصرؔ سنا تو ہوگا کلام اپنا

پروں پہ شہباز وقت کے ہر کتاب نظم جہاں منقش
جمود کی منزلوں میں تجھ کو نہ مل سکے مقام اپنا

کبھی شہنشاہیت نے لوٹا، کبھی امارت نے خون چوسا
سنا ہے صدیوں چمن چمن میں ہوا ہے نیلام

بہار کو جس نے تازگی دی، چمن کو جس نے یہ رنگ بخشے
بھریںگے گلشن پرست کب تک کلی کے اس خون سے

بریدہ شانوں کے جھرمٹوں میں نمایاں رنگین تیلیاں بھی
یہی چمن ہے قفس پرستو، تو اس چمن کو سلام اپنا

ہمارا ساغر، ہمارا بادہ، ہماری مینا، ہماری محفل
فضول ساقی سے اذن مانگیں، اٹھا نہ لیں بڑھ کے جام اپنا

عقاب جنگی سے اژدھے امن کے الجھتے رہینگے یونہی
مرا موذن اگر نہ جاگا نہ کہہ سکا گر پیام اپنا

شاہجہاں نسیم

کمہلائے ہوئے پھول

میں جب سے یہاں آیا تھا ہمیشہ اس لڑکی سے پھول لیا کرتا تھا یہ نہیں کہ مجھے اس لڑکی سے محبت ہو گئی تھی یا میں اس کے سوا کسی کو پھول فروخت کرنے والی ..... کو نہیں جانتا تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ اس کے پھول بالکل تازہ ہوتے اور ان میں تیکھی رنگ کا وہ پھول … ہوتا تھا جو مجھے بے حد پسند تھا۔ میں نے … سے کوئی بات نہیں کی تھی کیونکہ … تا تھا کہ وہ … غم … کی وجہ سے اس نے کسی … ابھی نہ ہوئی اسی … نہ پوچھا کہ کہاں سے پھول لا کر لاتی اور انہیں فروخت کرتی ہو … پہاڑی … تول پر کھو جاتی۔

ایک دن جب بہت دیر ہو گئی اور وہ نہ آئی تو میں نے سوچا شاید اس کی طبیعت خراب ہو گئی یا وہ بھول گئی ہو لیکن جب سورج غروب ہو گیا اور پہاڑی راستوں پر ہلکا ہلکا اندھیرا چھانے لگا تو میں نے دیکھا وہ آہستہ آہستہ آ رہی ہے۔ اس کی چال دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کو چلنے میں سخت تکلیف ہو رہی ہے۔ اس کا چہرہ بہت اداس تھا وہ بہت تھکی تھکی سی لگ رہی تھی۔ مجھ کو پھول دیتے ہوئے بولی — "بابو … سب پھول لے … " اس کی آواز کانپ گئی — میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے … — "کیوں … سب … کیا کروں گا" — "بات یہ ہے بابو جی وہ بچے … میں ان … بہت … رنگ … لیکن … نہیں خرید … اب … چھانے جا رہے ہیں اور اسی لئے …" یہ کہہ کر وہ رک گئی۔ اس کی آواز بھرا گئی اور بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میں نے چونکتے ہوئے کہا — "… کیا ہوا —"؟ وہ کچھ لمحہ خاموش رہی پھر کہنے لگی — "… یہ پھول نہیں بکے تو گھر میں کھانے کو نہیں تھا آج میرے … انہیں … اونچی پہاڑی پر بیچنے کو کہا جدھر بہت سے ایسے بابو لوگ رہتے ہیں جو مجھے دیکھ کر نہ جانے کیوں زور زور سے قہقہہ لگاتے ہیں اور اپنی ندیدی آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف جانے کیسے کیسے اشارے کرنے لگتے ہیں۔ مجھے وہاں بہت ڈر لگتا ہے جب میں نے وہاں جانے سے انکار کر دیا تو اس نے مجھے … بہت مارا ہے۔" یہ کہہ کر وہ سسکنے لگی مجھے اس کی حالت پر بہت رحم آیا میرا دل جیسے ڈوبنے لگا۔

"تمہارا شوہر خود کیوں نہیں بیچنے جاتا" — میرے اس سوال پر اس نے آنسوؤں کو دوپٹے سے پونچھ ڈالا یکایک اس کی آنکھوں میں ایک نئی چمک آ گئی۔ ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ کہنے لگی — "جب میرا بیاہ ہوا تھا تو میرے شوہر نے مجھے پھول بیچنے سے منع کر دیا تھا اس نے کہا تھا نازو اب تو پھول بیچنے مت جایا کر اتنی دور دور جانے سے تیرے نازک پیروں میں درد ہو جائے گا پھر تو تھک جائے گی" کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں حیا کی لہر سی دوڑ گئی اور اس کے گلابی رخسار بالکل سرخ ہو گئے — پھر وہ کہنے لگی "پھر میں کچھ مہینے تک پھول بیچنے نہیں گئی بابو جی وہ خود ہی بہت دور دور تک انہیں بیچنے جایا کرتا تھا۔ مگر ایک دن ......" یہ کہتے ہوئے اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور آنکھیں نم ہو گئیں۔ "ایک دن جب وہ ڈلیا لے کر ایک بڑے پتھر سے ٹھوکر کھا کر پھسل گیا اور وہ پاس کے کھڈ میں گر گیا۔ جب شام تک وہ نہ آیا تو میں نے سوچا شاید وہ میرے لئے کپڑے خریدنے بازار چلا گیا ہوگا — مگر — مگر جب بہت رات گئے اس کو کچھ لوگ اٹھا کر لائے تو وہ بے ہوش تھا۔"

… وہ کچھ لمحوں کی … میں نے اس سے پوچھا — "پھر کیا ہوا" — اس پر وہ … جیسے انداز سے کہنے لگی — "بابو اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ وہ چلنے سے بالکل مجبور ہو گیا۔ ڈاکٹر

نے کہا اس کے علاج میں بہت پیسہ لگے گا۔ پھر میں نے اپنی چاندی کی
چوڑیاں جو اس نے بیاہ کے کچھ دنوں بعد بڑے شوق سے بنوا کر دی تھیں
بیچ کر اس کا علاج کرایا۔ مگر وہ اچھا نہیں ہوا اور پیسے بھی ختم ہو گئے اب
تو بابوجی میں خود ہی پھولوں کو بیچتی ہوں پھر وہ شکایت کے انداز میں کہنے
لگی۔ پہلے تو وہ مجھے بہت پیار کرتا تھا یہ جھمکے دیکھو اس نے اپنے کانوں
پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ——— یہ اس نے ہی مجھے بنوا کر دیے تھے
جس دن میں نے انہیں پہنا تھا وہ بہت خوش ہوا تھا اس نے مجھ سے
کہا تھا تو بالکل رانی لگ رہی ہے مگر ——— مگر اب تو وہ پلنگ پر لیٹا
لیٹا دن بھر بڑبڑایا کرتا ہے پھر جس دن پھول نہیں بکتے اور اس کو زیادہ
بھوک لگی ہوتی ہے تو جھنجھلا کر مجھے مارنے لگتا ہے ——— یہ کہتے
ہوئے اس کی آنکھیں پھر بھیگ گئیں اور وہ دور جھیل کی طرف تکنے لگی۔
پھر کچھ سوچ کر بہت پرجوش لہجہ میں بولی ——— بابوجی اگر میرا
بابا ہوتا تو وہ مجھے کبھی مار پڑتے نہیں دیکھ سکتا تھا ——— مگر یکایک
اس کی آواز مدہم پڑ گئی چہرہ اداس ہو گیا آنکھیں ایک بار پھر بھیگ گئیں
اور وہ نہایت ہی آہستہ سے بولی ——— بابا نے تو میری وجہ
سے جان دی۔ میں اس کی اس بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا پریشانی سے
اس کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے پوچھا ——— ارے یہ کیسے
تمہارے بابا نے تمہاری وجہ سے اپنی جان دے دی ———؟
میرے سوال ہی پر وہ کچھ کھو سی گئی۔ پھر کچھ دیر بعد بہت ہلکی آواز میں جیسے
وہ بہت دور سے بول رہی تھی کہنے لگی ——— ہاں بابوجی میرا بابا
مجھے بہت پیار کرتا تھا کبھی کبھی جب میں اس کے ساتھ جانے کیلئے
ضد کرتی تو وہ مجھے شکارے پر بٹھا کر دور دور کی سیر کراتا وہ ہر سال مجھے
گرمی میں ایک ریشمی دوپٹہ لا کر دیتا تھا جسے اوڑھ کر میں اپنی سہیلیوں
میں خوب اتراتی تھی۔ جب میں بڑی ہوئی تو بابا نے سوچا کہ وہ میرا بیاہ
بہت اچھی جگہ کرے وہ چاہتا تھا کہ مجھے کسی بات کی تکلیف نہ ہو لیکن
میرے سسر نے بابا سے پورے دو سو روپے مانگے۔ بابا نے سوچا
کہ وہ رات کو بھی شکارہ چلایا کرے گا جس سے وہ جلدی سے روپے
اکٹھا کر لے یکایک وہ خاموش ہو گئی۔ پھر اپنی پلکوں کو نچاتے ہوئے
کہنے لگی ——— بابا بہت کمزور تھا بابوجی ——— اس کو

کبھی کبھی بخار آ جاتا تھا۔ سردی تو اس پر بہت جلد اثر کرتی تھی۔ اماں نے
جب اس کو منع کیا کہ وہ رات کو شکارہ نہ چلائے تو ہنس کر بولا میری
نازو تو چین سے رہے گی بس میں یہی دیکھنا چاہتا ہوں ۔
اس کے بعد وہ دن رات شکارہ چلانے لگا اس نے دو سو
اکٹھا کر لیے تھے مگر اس کو سردی سے کھانسی آنے لگی تھی اور سانس بھی پھو
لگی ——— پھر ایک شام جب وہ گیا تو رات ختم ہو گئی مگر وہ نہ
اسی طرح پورا ایک ہفتہ گزر گیا مگر وہ نہ آیا ہم سب بہت پریشان تھے
اماں تو بہت رات گئے تک جھیل کے کنارے بیٹھی رہا کرتی تھی۔
ایک دن ——— ہم نے دیکھا جھیل کے کنارے ایک
خالی شکارہ اور اس کے ساتھ دوسرے شکارے میں دینو چچا ایک آدمی کو
لٹا کر لا رہا ہے۔ ہم نے سوچا بابا کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہوگی مگر جب
دینو چچا نے روتے ہوئے بابا کے منہ پر سے چادر اٹھائی تو وہ ......
سردی سے اکڑ کر مر گیا تھا اور جب اس کی گٹھری کھولی گئی تو اس میں سے
پچاس روپے نکلے تھے۔ یہ کہتے ہوئے اس کے رخساروں پر دو موٹے
موٹے آنسو بہنے لگے اور ہونٹ بالکل خشک ہو گئے
پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ چونک کر کہنے لگی ——— ارے
بابو بہت دیر ہو گئی۔ اب مجھے چلنا چاہیئے جب وہ پھولوں کی ٹوکری لے
چلنے لگی تو اچانک مجھے کچھ خیال آیا میں نے اس کے سب پھول جو سب کے سب
مرجھا چکے تھے خرید لئے ان پیسوں کے علاوہ جب میں نے اس کو اور پیسے
دینے چاہے تو اس نے انکار کر دیا ——— جب وہ جانے لگی تو میں نے
دیکھا اس نے پیسوں کو مٹھی میں کس کر بھینچ رکھا تھا اس کے چہرے پر جو
سے چمکنے لگا تھا آنسوؤں کی نمی ابھی تک باقی تھی اور ڈوبتے ہوئے سورج
کی روشنی میں وہ ایک ایسے کمھلائے ہوئے پھول کی طرح نظر آنے لگی جسے
پانی میں بھگو کر تر و تازہ کر دیا گیا ہو لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ پانی کی بوندیں
پھولوں کو تازگی نہیں بخش سکتی اس وقت تک جب تک کہ چاروں طرف
ہوئی منحوس خزاں کو برکتوں والی دلفریب بہار شکست نہ دیدے
کشمیر کے ٹیڑھے ترچھے راستوں پر اس بہار کی آمد کا منتظر ہوں اور
ساتھ کشمیر کے تمام مجبور و بے بس باشندے بھی ——— میں ہر روز
خلاف یلغار کرنے والی بہار کے لشکروں کا انتظار کرتا رہتا ہوں اور اس عرصہ
میں مرجھائے ہوئے پھول خریدتا رہتا ہوں۔ میں انتظار کرتا رہونگا! میں مرجھاتے ہوئے پھول خریدتا رہونگا! اس مبارک و مسعود گھڑی کے آنے تک !!

فاامتھوی •

مشاھداتِ امروز

یہ دیکھتا ہوں کہ چشمِ گیتی میں غم کے آنسو چھلک رہے ہیں   بجھے ہوئے زہر میں مسلسل، دکھوں کے خنجر چمک رہے ہیں

بھلا کہاں تک یہ زندگانی، دبے دبے پاؤں بڑھ سکے گی؟

شرابِ غفلت کی پینے والے، ہنوز پی کر بہک رہے ہیں

شعاعِ اخلاص رفتہ رفتہ، دلوں کی تہ میں ہی بجھ رہی ہے   گھٹی گھٹی سی ہے روحِ فطرت، عجیب فتنے سسک رہے ہیں

رگیں حمیت کی کٹ رہی ہیں، خودی کے لاشے نکل رہے ہیں   ذلیل تر نفس کے شرارے، نگاہِ شر میں دہک رہے ہیں

نگارِ عصمت کو اُف یہ تہذیب، آج آنکھیں دکھا رہی ہے   عبادِ شیطان کے خوشی سے شریر چہرے دمک رہے ہیں

طرح طرح سے ہوس اپنی ہوس کی تکمیل پر ہیں مائل

یہ نیکیوں کو فریب دیکر، سرور میں ہیں، چہک رہے ہیں

یہ ظلم و قہاریت کے پتلے متاعِ صدق و خلوص کھو کر

مروتوں کے گلے دبا کر، خرد کے دامن جھٹک رہے ہیں

یہی بشر ہے؟ یہی وہ آدم؟ کہ آگ اور خوں سے کھیلتا ہے   اسی کے بچے بلک رہے ہیں؟ اسی کے بوڑھے سسک رہے ہیں؟

خدائے امن و سلامتی ہیں؟ مہیب عفریت سرکشی کے

جو مادیت کی ظلمتوں میں بھٹک چکے ہیں بھٹک رہے ہیں

عمارتِ آدم کی ڈھے رہی ہے اور اینٹ سے اینٹ بج رہی ہے

کراہ اٹھی ہے آدمیت، بقا کے سینے دھڑک رہے ہیں

کہ ہر سو موت کی چڑیلیں، حیات کا منہ چڑا رہی ہیں   عرق عرق ہے جبینِ ہستی، فنا کے شعلے بھڑک رہے ہیں

یہ کور چشموں سے کہدے کوئی، اٹھاؤ روحانیت کے پرچم

کہ ہے یہ تنظیمِ راہِ گیتی، جو چل رہے ہیں سو تھک رہے ہیں

ہر دلعزیزی کے راز پڑھنے کے بعد!

علی حیدر شاہ کی دلچسپ سرگزشت

• خود اس کے اپنے قلم سے

نیکی کا جذبہ برے سے برے انسان کے ذہن میں بھی مستور رہتا ہے لوگ برے آدمیوں کی برائی کو تو خوب اچھالتے ہیں لیکن وہ سلیقہ اور حکمت سے ان کے اندر چھپے ہوئے نیکی کے جذبہ کو ابھارنے کی کوشش نہیں کرتے۔ علی حیدر شاہ کے جیسے کتنے نیکی کا انسان ہوتے ہیں جو ذرا سی زحمت اٹھا کر نیکی کے راستہ پر ڈالا جا سکتا ہے تمام نیک کہلانے والوں کے ذمہ صرف یہی نہیں ہے کہ وہ خود نیک بنیں بلکہ ان کے ذمہ یہ بھی فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ بروں سے نفرت کرنے کے بجائے ان سے ہمدردی اور غم گساری کریں اور آہستہ آہستہ ان کے دل میں چھپی ہوئی نیکی کو جلا دینے کی کوشش کریں علی حیدر شاہ کی سرگزشت ہمارے لئے ایک دلچسپ اور سبق آموز تجربہ ہے۔ "ادارہ"

مجھے رسالے پڑھنے کا بہت شوق ہے مگر مجھے یاد نہیں کہ میں نے جوانی سے پہلے کبھی اپنی زندگی میں کوئی رسالہ اپنے پیسوں سے خرید کر پڑھا ہو۔ میری نگاہ میں رسالہ خرید کر پڑھنا ——— ایک فضول خرچی ہے جس طرح پان کھانا یا سگریٹ پینا جس طرح شمبو ڈاکوؤں کا سردار سندر، رشید دس نمبر بدمعاش اور طیفا ابزن کو اپنے کارناموں پر فخر تھا بالکل اسی طرح مجھے بھی اپنے کام پر ناز تھا

دنیا کی تفریح کے ساتھ ساتھ کراچی، لاہور، ہری پور ہزارہ اور سکھر کی جیلوں کی تفریح بھی کر چکا ہوں۔ لیکن میرا دل ایک دفعہ بھی پشیمان نہیں ہوا کہ میں نے گناہ کیا ہے میں اس گناہ کو اپنی بہادری ہی سمجھتا رہا۔ جب میں چوتھی بار جیل سے نکلا تو دل میں خیال آیا "بہت دن ہو گئے جوار کی روٹیاں کھاتے کھاتے ——— اب کچھ دن گندم کی روٹیاں کھا کے تازہ ہو جائیں۔ پھر کسی شکار کی تلاش کریں گے۔ اس دفعہ مجھے جیل میں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی جیل کے ڈاکٹر .... مجھ پر بہت مہربان ہو گئے تھے یہ میری خدمت کا نتیجہ تھا ——— جیل میں رہا جیل کے ہسپتال میں قیدی مریضوں کی خدمت کرتا رہا کی وجہ سے تمام قیدی مجھ سے خوش تھے یہی نہیں بلکہ جیلر، جیل سپرنٹنڈنٹ اور جیل کا تمام عملہ بھی مجھ سے مطمئن تھا ——— جب میں جیل میں آ گیا جیلر صاحب نئے قیدیوں کا معائنہ کرنے آئے مجھے دیکھتے ہی سوال کئے جن کے جواب میں میں نے کہا۔

"صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ جب باہر پولیس تنگ کرنا شروع کرتی ہے تو ہم جان بچانے کے لئے یہاں چلے آتے ہیں یہ ہمارا گھر ہے اور آپ لوگ ہمارے مائی باپ!!" جیلر صاحب ہنس پڑے اور کہنے لگے معلوم ہوتا ہے تم پرانے پاپی ہو۔ جب یہ الفاظ کہے تو میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ مجھے اپنے پاپی کہلانے پر بھی فخر تھا۔ پھر جیلر صاحب نے ازراہ مذاق میری ملاقات ہسپتال کے ڈاکٹر صاحب سے کرائی۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا "یہ آدمی تو اچھا معلوم ہوتا ہے" اور میری ڈیوٹی
ہسپتال میں لگادی گئی ———

آہستہ آہستہ دن گزرتے رہے ——— ایک دن ڈاکٹر صاحب
نے کہا ——— کہ میں شہر میں ایک ڈسپنسری کھول کر پرائیویٹ
پریکٹس کرنا چاہتا ہوں ——— تمہاری سزا بھی اب تھوڑی رہ گئی
باہر نکل کر ہمارے ساتھ کام کروگے تو ٹھیک رہو گے "تمہارا کیا خیال
ہے؟" میں نے کہا "اچھی بات ہے"

جب کلکٹر اور آئی جی صاحب جیل کا معائنہ کرنے آئے تو جیلر
اور ڈاکٹر صاحب نے میری سفارش کی اور جب میرا اچھا ریکارڈ ان کو دکھایا
تو وہ بہت خوش ہوئے اور کہا جیل میں ہر آدمی کو اسی طرح شرافت سے
رہنا چاہیئے لیکن یہ نہیں بتایا کہ باہر کی آزاد دنیا میں بھی آدمی کو شریف
بن کر رہنا چاہیئے؟ اور اس سفارش کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری ایک سال کی سزا
معاف کردی گئی اور میں اکیس مہینے کے بجائے ۹ ماہ میں رہائی پا گیا
——— باہر نکلتے ہی پرانے دوستوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ نئے
نئے پروگرام بنائے گئے ڈاکٹر صاحب کی مہربانیاں اس قدر زیادہ تھیں
میں ان کی ڈسپنسری کے علاوہ کہیں اور نہ جاسکا وہیں کام کرنے لگا
——— اور تمام پرانے دوستوں سے کنارا کرلیا ———
اس لئے نہیں کہ میں نے چوری کرنی یا جیب کاٹنی چھوڑ دی تھی بلکہ اس
لئے کہ کہیں یہ صاحب کوئی واردات کر کے میرے پاس آئیں اور پولیس
پیچھا کرتی ہوئی ڈاکٹر صاحب کے مکان پر آئے تو میری وجہ سے ڈاکٹر
صاحب پر اس کا برا اثر پڑے گا اور خواہ مخواہ مجھے بھی شرمندہ ہونا پڑے
——— ڈسپنسری میں ایک صاحب اور بھی کمپونڈر کی جگہ
پر کام کرتے تھے ——— رامپور کے تھے ——— بہت
اچھے آدمی تھے بے چارے ——— میں اپنی زندگی کے حالات
ان کو سنایا کرتا ——— وہ خوب غور سے سنتے اسی لئے وہ مجھے
بہت اچھے لگتے تھے ——— اور جب کوئی نئی بات ہوتی تو
میں فوراً ان کو بتاتا وہ بہت خوش ہوتے ——— ہمارے تعلقات
گہرے ہوتے چلے گئے جس روز کسی صاحبہ کا بیگ یا کسی جنٹل مین کا بٹوا
میرے ہاتھ لگ جاتا ——— اس دن میں کمپونڈر صاحب کو زبردستی
سینما کی طرف گھسیٹ کر لے جاتا ——— وہ کہتے بھائی چھوڑو میری
جیب میں پیسے نہیں ہیں میں کہتا جب تک میری دو انگلیاں سلامت
ہیں پیسوں کی کوئی فکر نہیں ——— تو وہ چونک سے پڑتے اور کہتے
بھائی یہ بہت بری بات ہے میں جواب دیتا اتنی بڑی دنیا میں اگر ایک
ذرا سی بات بری ہو بھی گئی تو کیا حرج ہے اور وہ خاموش ہو جاتے

ایک دن جب کہ میں بازار سے گزر رہا تھا ایک صاحبہ ایک دوکان
پر کھڑی ناخنوں کی پالش اور پاؤڈر کا ڈبہ خرید رہی تھیں ان کے ہاتھ
میں ایک رسالہ تھا جس پر لکھا تھا ——— ماہنامہ "مشیر"
یہ مئی ۱۹۵۱ء کا ذکر ہے اس سے پہلے میں نے اس نام کا رسالہ
کبھی نہیں دیکھا تھا ——— اس لئے اس رسالہ کو پڑھنے کا شوق
پیدا ہوا ——— میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ میری نگاہ میں رسالہ خرید
کر پڑھنا فضول خرچی ہے ——— جب وہ صاحبہ خریدی ہوئی
چیزوں کا بل چکانے کے لئے رسالہ دوکان کے ایک شوکیس پر رکھ کر اپنا
بیگ کھولنے لگیں ——— تو میری نگاہیں خود بخود رسالے سے
ہٹ کر اس بیگ میں چلی گئیں ——— مگر بیگ میں زیادہ رقم نہیں
تھی اس لئے زیادہ محنت کرنی فضول سمجھی ——— اور اپنی خاص
محنت سے وہ رسالہ حاصل کرلیا ——— اور چپکے سے اپنی راہ
لی میں نے آتے ہی اپنے دوست کمپونڈر صاحب کو بتایا کہ یہ رسالہ آج
ایک صاحبہ کا اڑا لایا ہوں - یہ سب کچھ میں نے بڑے فخر سے کہا اور میں
اس کا مطالعہ شروع کردیا ——— بہت سے مضمون پڑھے جو
اچھے تھے مگر عام رسالوں سے نرالے ——— لیکن جب "ہر دل عزیزی
کے رازوں" کو پڑھا ——— تو میری دنیا ہی بدل گئی ———
آج مجھے معلوم ہوا کہ انسان کو انسان بنانے والے راز خود انسان کے
ہاتھ، دل، دماغ اور زبان میں ہیں لیکن خود انسان کو خبر نہیں ———
انسان اپنی کامیابی دولت اور عزت کے لئے در بدر کی ٹھوکریں کھاتا
پھرتا ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ میرے پاس بھی کچھ ہے یا نہیں جو
اپنی منزل تک پہنچا سکے گا۔

ہر دل عزیزی کے راز پڑھنے کے بعد میرے دل میں زبردست
خواہش پیدا ہوئی اور میں نے سچے دل سے اقرار کرلیا کہ اب چوری وغیرہ

ں کرونگا ——— اور ایک شریف انسان بن جاؤں گا ———
پھر ہر دلعزیزی کے رازوں کا تجربہ شروع کیا ——— تو سب سے
لا تجربہ یہ تھا۔

ہمارے ڈاکٹر صاحب کی دختر نیک اختر کی شادی کی تیاریاں
رہی تھیں اور ڈاکٹر صاحب انکے لئے جہیز اکٹھا کر رہے تھے ———
ں میں بہت سا فرنیچر بھی تھا ——— انگلش فرنیچر ہاؤس جو کہ
مر (سندھ) میں فیریر روڈ پر واقع ہے ——— کو تمام فرنیچر کا ٹھیکہ
یا گیا ——— اور فرنیچر تیار ہو کر گھر پر آگیا ——— لیکن پالش
ر پر لا کر کرنی تھی ——— اس لئے کہ کہیں دوکان سے گھر تک لاتے
نت راستے میں پالش خراب نہ ہو جائے ——— دوسرے دن تین
می گھر پر فرنیچر کی پالش کے لئے آئے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے بڑے
ماحبزادے سے کہا۔

"جاؤ جو آدمی کام کے لئے آئے ہیں تم ان سے ٹھیک ٹھیک کام
——— کوئی کام باقی نہ رہ جائے ——— صاحبزادے
ئے اور ان لوگوں سے کہنے لگے ——— دیکھو ٹھیک ٹھیک کام
رنا کوئی کام باقی نہ رہ جائے ——— ان میں ایک آدمی بڑا بدتمیز
تھا اس نے باقی دو آدمیوں کو بھی اپنے ساتھ ملا رکھا تھا ——— جس
رح یہ کہتا اسی طرح وہ لوگ بھی کرتے ——— پھر صاحبزادے
نے کہا!

سنو اس سنگاردان میں جو پٹیاں لگی ہوئی ہیں ان میں ایک پر
لیو یعنی نیلا رنگ لگا ہوا ہے اور ایک پر سفید ——— اسی طرح
سب پٹیوں پر سے وارنش کا کام ختم کرنے کے بعد اس پر یہ دونوں
رنگ اسی طرح لگا دینا۔

اُنھوں نے کہا صاحب اس کے لئے ایک باریک برش کی
ضرورت ہے۔ برش کے بغیر ہم نہیں کرینگے۔ صاحبزادے نے کہا ہم اس
تھوڑے سے کام کے لئے تمہیں نیا برش لا کر نہیں دے سکتے۔ اُنھوں
نے کہا تو پھر رنگ بھی نہیں لگ سکتا ——— صاحبزادے نے
گرم ہو کر کہا ——— کیسے نہیں لگ سکتا۔ اس ذرا سے کام کے
لئے نیا برش کہاں سے آئیگا ——— اس نے کہا جہاں سے
بھی آئے ہم نہیں جانتے ——— آپ کو کام کروانا ہے تو سامان دو
رعب مت جماؤ۔ ہم تمہارے نوکر نہیں ہیں۔ ہم انگلش فرنیچر ہاؤس کی
طرف سے آئے ہیں ——— آپ کو جو کچھ کہنا ہے ان سے
جا کر کہو ——— یہ باتیں سن کر صاحبزادے اس کمرے سے نکل
کر دوسرے کمرے میں چلے گئے ——— اور آکر مجھ سے کہا ———
حیدر! تم جاؤ وہ لوگ جو کام کر رہے ہیں جا کر دیکھو۔ مجھے تو بہت
غصہ آرہا ہے بڑے بدتمیز آدمی ہیں کسی کی بات ہی نہیں سنتے
میرے ساتھ صاحبزادے کی بات چیت اچھی تھی کیونکہ میں ان کو ڈاکٹر
صاحب سے چھپا کر سگرٹ وغیرہ لا کر دیا کرتا تھا ——— میں نے
کہا اچھا ذرا سگرٹ کی پیکیٹ تو دیجئے ——— سگریٹ اور ماچس
میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے وہ باہر چلے گئے اور میں اس کمرے میں
جہاں کام ہو رہا تھا جاتے ہی پہلے السلام علیکم کر کے ایک طرف بیٹھ گیا
اور تمام کمرے پر ایک گہری نظر ڈالی۔ جو آدمی سب سے زیادہ بدتمیز تھا اس
کی طرف مخاطب ہو کر کہا "بھائی آپ لوگوں کا کام بھی بڑی ہنرمندی کا
ہے اگر ہر آدمی کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا ——— میں نے دیکھا کہ سب
آدمیوں کے ہاتھ بہت تیزی اور صفائی سے کام میں لگے ہوئے ہیں
پھر میں نے سگریٹ کی ڈبی نکال کر سب کی طرف بڑھائی ——— —
ان لوگوں نے سگرٹ لے کر جلائے اور ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے
پورے دو گھنٹے تک وہ کام کرتے رہے اور میں ان سے باتیں کرتا رہا
——— لیکن دو گھنٹے کے عرصہ میں میں نے ایک بار بھی ان سے
یہ نہیں کہا کہ کام اچھی طرح کرنا کوئی چیز رہ نہ جائے ——— جب
کام ختم ہونے کو آیا ——— تو میں نے ان سے کہا بھائی ہمارے پاس
چھوٹا برش نہیں ہے ——— ورنہ آپ کو ایک کام کی اور
تکلیف دیتا ——— وہ کہنے لگے :—

اجی صاحب کیا حرج ہے اگر چھوٹا برش نہیں تو ہم بڑے
برش ہی سے کام چلا لیں گے۔ کہئے کیا کام ہے ——— میں نے
سنگھاردان کی طرف اشارہ کیا ——— اور کہا بھائی! یہ
سنگھاردان کباڑی سے خریدا گیا ہے ——— ہے تو پرانا مگر مضبوط
ہے اسلئے اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو اس کی ان پٹیوں پر جو نیلا اور سفید

ـ لگا ہے اس پر دوبارہ یہی رنگ کردیں تو آپ کی بہت مہربانی
ی پرانا ہو جانے کی وجہ سے خراب معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا
——— اس میں مہربانی کی کیا بات ہم ابھی کئے دیتے ہیں اور پھر بڑی
انی سے سنگھاردان کی پٹیوں پر رنگ لگا دیا ——— جس کے لئے
دو آدمی دو گھنٹے پہلے ڈاکٹر صاحب کے صاحبزادے سے لڑ چکے
ے ——— لیکن میرے نرم الفاظ اور ان کے کام میں میری
یوں نے ان آدمیوں سے وہ کام خوشی سے کرا لیا ——— جب
ـ گئے تو بہت خوش تھے ——— وہ لوگ بڑی گرمجوشی سے ہاتھ
ر کے ان کے جانے کے بعد جب ڈاکٹر صاحب کے صاحبزادے
ـ تو یہ کام دیکھ کر بہت خوش ہوئے ——— کہنے لگے
انی وہ آدمی تو بڑے بدتمیز تھے۔ تم نے ان سے کس طرح کام لیا ———
ب انھوں نے یہ الفاظ کہے تو میرے دل میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی
——— جس کام کو ایک گریجویٹ نہیں کرسکا ——— اسے
ب جل نے کرلیا ——— اس کے بعد جب میں نے "مشیر"
ن کی خدمت میں پیش کیا ——— اور بتایا کہ ہردلعزیزی کے
ن اصولوں پر چل کر میں ہر جگہ کامیاب ہوتا ہوں ——— تو انھوں نے
س مضمون کو بڑے شوق سے پڑھنا شروع کیا۔ دن گزر گئے۔ شادی
ار وہ ختم ہو گیا ——— برات آئی اور چلی گئی میں نے ہر کام میں
ٹر صاحب کا پورا ہاتھ بٹایا ——— اس کے ایک ہفتہ بعد
ـ کہ میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا مشیر کا مطالعہ کر رہا تھا کسی نے باہر
ازہ ی ——— دروازہ کھولا تو دیکھا ایک جانے پہچانے ہوئے
ں افسر اور ایک سپاہی ساتھ کھڑے ہیں ——— دروازہ کھولتے
ندر گئے اور مجھ سے کہا ——— ہم کو تمھارے متعلق شکایت
ـ رات کو جو واردات ہوئی اور پستول کی گولی چلی ہے اس میں تمھارا
ہاتھ ہے اس لئے ہم تمھاری تلاشی کے لئے آئے ہیں میں گھبرا سا گیا
میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے پولس کو میرے خلاف
بوت ملتا ——— میں نے خود کو سنبھالا اور کہا جناب! کسی
ہی ہوئی ہے اس لئے آپ تک یہ خبر پہنچی میں اس معاملہ سے
ید ہوں ہاں اگر آپ تلاشی لینا چاہتے ہیں تو شوق سے لیجئے —

پولس آفیسر صاحب آگے بڑھے اور صندوق میں پڑے کپڑوں کو جھاڑ کر
دیکھا پھر سارے کمرے کی تمام چیزوں کو بغور دیکھا مگر وہاں کیا رکھا تھا
آخر میں اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا دیسی ریوالور نکالتے ہوئے بستر پر پڑے
ہوئے تکیے کے نیچے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولے "ہوں! یہ ہے وہ
ریوالور جس سے رات کو فائر ہوا" میں سارے معاملہ کو سمجھ گیا اور نرم الفاظ
و شیریں کلامی کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

جناب آپ یہ ریوالور میرا ثابت کر کے اور مجھے گرفتار کر کے اپنے
افسر اعلیٰ کے سامنے عزت حاصل کریں گے مگر اصلی مجرم کو گرفتار کرنے میں
آپ ناکام رہیں گے۔ پھر وہ صاحب بولے کیا یہ ریوالور تمھارے تکیے
کے نیچے نہیں تھا۔ میں نے کہا حضور! آپ اس بات کو اچھی طرح جانتے
ہیں۔ میں آپ کو کیسے بتا سکتا ہوں کہ یہ ریوالور کس کا ہے اور کہاں تھا
آپ کو اختیار ہے جو چاہیں کر سکتے ہیں ——— صاحب خاموش
ہو گئے اور تھوڑی دیر کے بعد بولے اچھا ابھی ہم تم سے کچھ نہیں کہتے
جب تم سے کچھ معلوم کرنا ہوگا تھانے بلا لیا جائے گا ——— اور
یہ کہہ کر چلے گئے ———

ہردلعزیزی کے اصولوں کا یہ دوسرا تجربہ تھا ——— اگر
اس وقت میں کہتا کہ یہ ریوالور میرا نہیں ہے۔ آپ مجھ پر ظلم کر رہے ہیں
آپ خواہ مخواہ ہمیں پھنسانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم نے کچھ نہیں
کیا، ہم بے گناہ ہیں ——— تو جانتے ہیں آپ کیا نتیجہ نکلتا
وہ مجھے زبردستی پکڑے جاتے ——— اور مجھے پانچویں دفعہ جیل
جانے کا فخر حاصل ہو جاتا ——— لیکن ہردلعزیزی کے اصولوں
کی بدولت میں پانچویں بار جیل جانے سے بچ گیا ——— اور میرے
دل میں رسالہ "مشیر" کی عزت اور بھی بڑھ گئی ——— ۲ جولائی ۵۱ء
کا وہ تاریخی دن ——— کبھی نہیں بھول سکتا جس روز میں نے
"مشیر" کا دوسرا پرچہ اپنی حلال کمائی سے خریدا ——— زندگی
میں یہ پہلا پرچہ تھا جسے میں نے خریدا ——— دو روز کے بعد مجھے
پھر تھانے بلایا گیا ——— اور چند الٹے سیدھے سوال کر کے
چھوڑ دیا ——— اور پھر کئی روز تک متواتر مجھے تھانے بلاتے رہے
——— یعنی تم کیا کام کرتے ہو؟ تمھارا یہاں کون ہے؟ کس کے

نے کماتے ہو؟ سکھر میں کب آئے ——— جیل سے کب نکلے؟
اور ڈاکٹر صاحب سے تمھاری ملاقات کیسے ہو گئی۔ میں ہر بات کا نہیں
تسلی بخش جواب دیتا رہا۔ پھر وہ کچھ پوچھ گچھ کے لئے ڈاکٹر صاحب کے
بھی آئے ڈاکٹر صاحب نے بھی انھیں مختصر سا جواب دے دیا ———
مگر میری طرف سے وہ کچھ بدگمان سے ہو گئے ——— دن گزرتے
رہے اور ڈاکٹر صاحب کی بدگمانیوں میں اضافہ ہوتا رہا ——— میں نے
ان کی ناراضگی کو محسوس کر لیا ——— ایک دن میں نے کہا! صاحب
اگر آپکے کام میں کوئی حرج نہ ہو تو مجھے اجازت دیجئے اب میں جانا چاہتا
ہوں کہنے لگے ——— کسی کا کام رک نہیں سکتا اگر جانا چاہتے ہو تو
جاؤ ——— مگر انھوں نے یہ نہیں پوچھا کہ کیوں جانا چاہتے ہو
دوسرے دن جب میری روانگی کا علم ان بیگم صاحبہ کو ہوا تو انھوں نے
وجہ پوچھی میں نے کہا ؎

کیا سمجھ کر ہم بنائیں شاخ گل پر آشیاں اپنا
زندگی گزرے گی کیونکر، ہو جہاں بے آبرو رہنا

چاہئے کہنے لگے "ہاں یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ صاحب آپ سے
کھنچے کھنچے رہتے ہیں ——— کیا وجہ ہے؟ ———
میں نے کہا ——— صاحب مجھ سے بدگمان ہو گئے ہیں
ایسی حالت میں میں یہاں رہنا نہیں چاہتا ——— دوسرے دن
میں نے سکھر سے نکلنے کی تیاری کی اور حیدرآباد سندھ چلا آیا لیکن دل
کو یہی خیال ستا رہا تھا کہ آپ سے ملاقات کروں ——— اور
پھر ۱۵ اگست ۱۹۵۵ء کی دوپہر کو آپکی خدمت میں حاضر ہوا —
آپکو یاد ہوگا کہ میں نے آپکے ہاتھ پر توبہ کی اور قسم کھائی کہ میں نہ اب چوری
کرونگا نہ جیب کاٹوں گا اور نہ کسی ایسی سازش میں شریک ہوں گا جو
انسانیت اور شرافت کے خلاف ہو آپ کی اس ملاقات کو میں زندگی
بھر نہیں بھول سکتا! یہی وہ الفاظ مجھے یاد ہیں آپ نے فرمایا تھا دوسروں
کو بھی نیکی کا سبق سکھلاؤ۔ جب میں آپ سے مل کر واپس حیدرآباد آیا
تو اسٹیشن پر اترتے ہی ایک ذات شریف بھائی نے میری جیب میں
اتنی صفائی سے ہاتھ ڈالا کہ مجھے اس وقت خبر ہوئی جب ایک دوسرے
آدمی نے اسے دیکھ لیا۔ بہت سے آدمی جمع ہو گئے دو پولیس کے سپاہی

بھی آگئے اور اس کو گرفتار کرنے لگے۔ مجھ سے مطالبہ کیا کہ آپ چل کر رپٹ
لکھا دیجئے میں نے کہا اس نے میری چوری کی ہے۔ میری مرضی میں
اسے پکڑوں یا چھوڑ دوں۔ لوگوں نے کہا آج آپ نے اسے چھوڑ دیا تو
اس کی ہمت بڑھ جائے گی اور کل یہ کسی دوسرے کی جیب کاٹے گا
میں نے کہا اس بات کو مجھ سے بہتر آپ نہیں جانتے وہ صاحب
ذات شریف حیرت سے میرا منہ تک رہے تھے میں ان کا بازو پکڑے
ہوئے چائے اسٹال کی طرف چلا گیا۔ پولیس کے دونوں سپاہی اس
میں باتیں کرتے ہوئے ہمارے پیچھے آ رہے تھے میں نے ان صاحب
نام پوچھا بولے "اقبال" میں نے کہا نام تو ماشاءاللہ بہت اچھا ہے
کہاں سے آ رہے ہیں بولے کراچی سے۔ میرے دریافت کرنے پر
بتایا کہ ان کے پاس ٹکٹ موجود ہے میں نے کہا بس کوئی فکر کی بات
نہیں۔ دو چائے اور بسکٹ منگائے! ——— دونوں نے ناشتہ کیا اور میں نے اقبال سے بڑی نرمی کے ساتھ کہا دیکھو بھائی
یہ زندگی بہت بری ہے آخر انسان کب تک اس طرح پیسے کمایا
کرے گا۔ جہنم کو بیچتا رہے گا اور دوسروں کی بد دعائیں اپنی آخرت کے لئے جمع
کرتا رہے گا ——— اقبال مڑ مڑ کر ان سپاہیوں کی طرف دیکھ
رہا تھا۔ میں نے کہا انکی اب تم فکر نہ کرو۔ وہ اب تمہارا کچھ نہیں کر سکتے بشرطیکہ
وعدہ کرو کہ آئندہ نیک راستے پر چلنے کی کوشش کرو گے۔ اقبال
نے کہا کہ آپکے اس دوستانہ سلوک نے مجھے اس قدر شرمندہ کر دیا
اگر تمام اسٹیشن کے مسافر میرے سر پر جوتے مارتے اور پولیس بھی
گرفتار کر لے جاتی تب بھی میں اتنا شرمندہ نہ ہوتا کہ وہ صدق دل سے
کہہ رہا تھا۔ میں نے اس کے کاندھے پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے
کہا بھائی اس میں شرمندہ ہونے کی کوئی بات نہیں اگر آپ نیک راستے
پر چلنے کی کوشش کریں گے تو امید ہے آپ کو کبھی بھی انشاءاللہ
شرمندگی نہیں اٹھانی پڑے گی۔ چائے پینے کے بعد ہم اسی طرح باتیں کرتے
ہوئے پلیٹ فارم پر آگئے اقبال کے دریافت کرنے پر میں نے
اس کو اپنا پتہ بتایا اسکے کچھ دیر بعد ہم ایک دوسرے سے رخصت ہوئے
دوسرے دن وہ میرے بتائے ہوئے پتہ پر آئے
گرمجوشی سے ملے ہم دونوں ایک ہوٹل میں چائے پینے چلے گئے

ن اتفاق سے میرے دو پرانے دوست جو میرے ساتھ لاہور جیل میں
چلے تھے مل گئے اور ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے
نے ان سے پوچھا آج کل حیدرآباد میں کیا کرتے ہو۔ بولے سینما۔
ں کی بلیک کرتے ہیں۔ میں نے کہا بزنس تو اچھا ہے۔ مگر یہ تو بتاؤ
بچت بھی ہوتی ہے یا سب ختم کر دیتے ہو کہنے لگے بھائی کیا بتائیں
ی کمائی پر تو لعنت ہے جو کماتے ہیں سب ختم ہو جاتا ہے۔ ایسی کمائی
پیسہ کسی کے پاس جمع بھی ہوا ہے۔ میں نے کہا جب یہ بات ہے
س دھندے میں کونسا فائدہ ہے جو آپ کو مجبور کرتا ہے کہ آپ
بلک کریں کہنے لگے بھائی اب آپ ہی بتائیں کہ ہم کیا کریں میں نے
ن کے سامنے ایک مثال پیش کی ——— بکری حلال جانور ہے
رسال بھر میں زیادہ سے زیادہ چار اور کم از کم ایک بچہ دیتی ہے اور
ن میں ہزاروں کے حساب سے مارکٹ میں ذبح بھی کی جاتی ہے لیکن
رھی دنیا میں بکریوں کی کمی نہیں ہے ہر طرف بکریاں ملتی پھرتی نظر
ں میں اس کے مقابلہ میں کُتی ایک حرام جانور ہے جو کم از کم پانچ چھ
ے دیتی ہے اور زیادہ سے زیادہ سولہ بیس پچیس اور کبھی کبھار ہی کوئی
ن آپ کو مری ہوئی نظر آئے گی۔ پھر بھی شہروں میں کتے بکریوں سے
ہی نظر آتے ہیں یہ حلال اور حرام کا فرق ہے حرام جتنا زیادہ ہو گا اتنا
ں سمجھو اور حلال جتنا کم ہو گا اتنا ہی زیادہ سمجھو ——— وہ بولے
ہ آپ کا مطلب سمجھ گئے ہم خود ایسی روزی سے بیزار ہیں پھر کہنے لگے
بھیا اب یہ بتاؤ کہ آج سے تین سال پہلے آپ نے لاہور میں کہا تھا

کہ آپکو ایک جرمنی پستہ
کہا اب مجھے پستول،
سے مجھے ایک ایسا
سے نرالا ہے اور اس
اشتیاق اور اصرار کے ا
ہتھیار پھیلانے شروع
احباب" "محبت او ... سے ساتھ" "ہنسی اور
مسکراہٹ" "آدمی کا نام اور اس کی اہمیت" "شیریں گفتاری
اور خوش بیانی" "دوسروں کو اپنا گرویدہ بنانا" غرض یہ کہ ان کے
نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے ان کو بہت کچھ بتا دیا جس سے
وہ بہت کچھ مطمئن ہوئے ——— محفل برخواست ہونے کے
بعد میں اقبال کے ساتھ اٹھ آیا اقبال نے پوچھا یہ لوگ کون تھے میں نے
لاہور کا سارا واقعہ اور اپنی پچھلی زندگی کے حالات پھر گنا ہوں سے توبہ
کرنا آپ کی ملاقات کا واقعہ اور رسالہ مشیر کا تعارف کرایا وہ بہت
متاثر ہوا۔ چند ہی دن میں ہم دونوں مل کر ایک دوکان پر کام کرنے لگے
اب ہمکو نہ تو کسی پر غصہ آتا ہے نہ کوئی ہم سے لڑتا ہے نہ ہمیں کسی سے شکوہ
ہے لیکن ایک بات کہدوں اب بھی جب میں دوکان سے اٹھتا ہوں تو
میرے پیر خود بخود اندھیری گلیوں کی طرف اٹھنے لگتے ہیں معلوم نہیں کیوں
اور دن میں بھی جب بہت سے آدمیوں کو دیکھتا ہوں تو دل چاہتا ہے
اس مجمع میں گھس جاؤں ——— میں سمجھتا ہوں یہ میری پچھلی
زندگی کی خطرناک عادت ہے۔ انشاء اللہ میں اس عادت کو بھی بھولنے کی کوشش کروں گا ——— (باقی حالات پھر کسی وقت)

چسٹا کیور

یہ دوا پرانی کھانسی کے جملہ امراض کے لیے اکسیر کا حکم رکھتی ہے پھیپھڑوں
کو طاقت دیتی ہے۔ نزلہ، زکام، کھانسی کے مریضوں کے لئے بجد مفید ہے
پھیپھڑوں سے خون آنا، ابتدائی سل اور بلغمی کھانسی کے واسطے نہایت مجرب دوا ہے۔
جن خاندانوں میں مرض سل موروثی ہو ان کے نوجوانوں کو اس دوا کا مستقل استعمال اس موذی مرض سے محفوظ رکھتا ہے
قیمت۔ ۲۰ یوم، چار اونس دو روپے آٹھ آنے

تیار کردہ:۔ حاذق دواخانہ بندر روڈ، کراچی نمبر ۱

سے ملاقات ہوئی؟ سکھر میں کب آ
اور ڈاکٹر صاحب
سلی بخش جواب
بھی آ

قوت، طاقت اور مردانگی

چوبیس ۲۴ گھنٹے میں تو نہیں مگر ہاں تیس ۳۰ دن میں ضرور حاصل ہو سکتی ہے

کیا آپ تھکاوٹ، پژمردگی، نقاہت اور کمزوری محسوس کرتے ہیں۔ کیا آپ کی قوت حافظہ کمزور ہے؟ کیا آپ ہر وقت خوف زدہ اور غمگین رہتے ہیں۔ کیا آپ کا جسم دبلا ہے اور آپ سستی اور کمزوری محسوس کرتے ہیں۔ کیا آپ احساس کمتری کے شکار ہیں ———— ؟ ———— اگر ایسا ہے تو یقین جانیے کہ آپ کے وہ غدود جو قوت مردانہ کے مخزن ہیں کمزور ہو گئے ہیں اور جب تک آپ ان غدود کو طاقتور بنا کر ان کی حفاظت نہیں کریں گے آپ کبھی بھی قوت و طاقت اور مردانگی کی صفات سے متصف نہیں ہو سکتے

خوش قسمتی سے امام طب حکیم سید نذر احمد صاحب دہلوی ــــ اپنے ۳۷ سالہ تجربہ کے بعد ایک ایسا نسخہ مکمل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو کہ مردانہ غدود کی جملہ کمزوریوں کو دور کر کے انھیں طاقتور بنانے کا تیر بہدف، مگر سادہ اور سہل علاج ہے ۔ طب یونانی کی اس جدید اور مایہ ناز ایجاد کا نام

حاذقی کورس

ہے جو تین مختلف ادویہ پر مشتمل ہے اور تیس دن کا مکمل کورس ہے جس کا ابتدائی استعمال آپ کے جسم میں طاقت قوت اور تندرستی کا صحیح احساس پیدا کر دے گا اور پورے تیس روز کے بعد آپ ایک مکمل نوجوان، تندرست و توانا اور طاقت ور مرد بن جائیں گے

"حاذقی کورس"

کا استعمال فوراً آپ کے غدود کو طاقت ور بنا کر اپنا اثر شروع کر دے گا۔ آپ کے بدن میں تازہ سرخ خون پیدا کر کے اس میں جولانی کا جوش پیدا کر دیگا اور جوں جوں آپ کے غدود طاقتور ہوتے جائیں گے آپ اپنے اندر زندگی کی ایک نئی لہر محسوس کرینگے اور آپ زندگی کے ہر شعبے میں حقیقی زندگی سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔ یعنی لطف شباب

حاذقی کورس مکمل برائے تیس یوم : قیمت بارہ روپے

ملنے کا پتہ:۔ حاذق دواخانہ، بندر روڈ کراچی ملا

Asmar

The TONIC FRUIT DRINK

REFRESHING
INVIGORATING
Excellent
With
SODA WATER
OR HOT OR
COLD WATER

اثمار

پھلوں
فرحت بخش اور مقوی
شربت سوڈا اور سادہ
پانی میں استعمال کیجئے

حاذق دواخانہ رجسٹرڈ کراچی

HAZIQ DAWAKHANA KARACHI

KAMIL

Regd. No. 5.

Monthly "MUSHIR" Karachi

یری داستان شائع کرتے رہو دیکھو کب تک سنی ان سنی ہوتی ہے"

میں نے عرض کیا اچھا تو یہی سہی شروع سے ساری باتیں بتلایئے

ای کہانی دنیا بھر میں نشر کریں گے۔ آزما کر دیکھ لیجئے!"

اردو سنبھل کر بیٹھ گئی اور لگی کہانی بیان کرنے۔

"میرا نام تو تم جانتے ہی ہو اردو ہے کسی زمانے میں ریختہ کہلاتی تھی

، دنوں ہندوستانی لقب دینے کی بھی کوشش ہوئی مگر پیدائشی نام کہیں بھلایا

سکتا ہے۔ اردو ہی میں جنم لیا اردو ہی میں پلی بسی اور اردو ہی کہلائی۔ کہنے کو

یب ہوں اور عام لوگوں کے گھروں میں پیدا ہوئی تھی مگر ایسے لاڈ و پیار میں

رش پائی کہ بڑی بڑی شہزادیاں عش عش کریں۔ گھر گھر ہاتھوں ہاتھ لی گئی

سنی ہی میں شمال سے لیکر جنوب تک میرے چرچے ہونے لگے۔ کیا ہندو کیا

لمان سب گرویدہ تھے۔ میں سب کی لاڈلی، سب کی پیاری تھی۔ بڑے بڑے

ل علم اور اہل فکر نے مجھے اپنے دل و دماغ میں جگہ دی۔ ولی اور سراج

میرے بناؤ سنگھار کئے، میر اور سودا نے میرے گیت گائے۔ دیکھتے دیکھتے

کوچوں سے لیکر شاہی محفلوں تک میری رسائی ہونے لگی۔ میں نے غریبوں

دلوں کو تو موہ لیا ہی تھا، بادشاہوں کے تخیل میں انگڑائیاں لینے لگی۔

شاء اللہ قلعہ معلّٰی کا زمانہ یاد کیجئے۔ وہ بھی کیا دن تھے۔ نام کو تو بہادر شاہ

دشاہ تھے مگر سکہ میرا ہی چلتا تھا۔ دوسرے ملکوں میں میری بہنوں نے بڑی

ترقی کی ہے مگر خدا بڑا بول نہ بلوائے، توبہ کرکے کہتی ہوں پروردگار نے جتنی

جلدی مجھے پروان چڑھایا اور جیسی مقبولیت مجھے بخشی اس کی مثال نہیں ملتی

ں نے خیالوں کو گویائی بخشی اور جذبات کو نطق سے ہم کنار کیا۔ اگر میں نہ

ہوتی نہ معلوم کتنے بلند افکار سینوں میں دفن رہتے، کتنے احساسات گھٹ

کر رہ جاتے۔ حسن و عشق کی نہ معلوم کتنی داستانوں پر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے پردہ پڑا

رہتا اور پھر اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ تمھاری متعدد نسلوں کو میں

نے اپنے کشف سے یکجا کیا۔ تم بکھرے ہوئے تھے میں نے تسبیح کے دانوں

کی طرح تمھیں پرو دیا۔ تمھاری تہذیب مجھ سے عبارت ہے میرے بغیر

تمھارا تمدن ہوتا ایسا ہوتا جیسے خوشبو کے بغیر پھول یا روح کے بغیر جسم!

ہاں تو میں قلعہ معلّٰی کی باتیں کر رہی تھی۔ ان دنوں میرے فرشتوں

کو بھی نہیں معلوم تھا کہ فلک کج رفتار میرے لئے کیسی کیسی بجلیاں چھپائے

موقع کی تاک میں ہے اگر وقت نے وفا کی تو یہ داستان تفصیل سے پھر

کبھی سناؤں گی۔ اب فی العجلت سے مختصر یہ کہ میں بڑے چین و آرام سے

پھل پھول رہی تھی کہ اتنے میں گورے گورے سوداگر آن دھمکے ان کے ساتھ

ہی انگریزی گٹ پٹ گٹ پٹ کرتی آئیں جس کی لاٹھی اس کی بھینس!"

پہلے ہی حکومت پر قبضہ جمایا پھر مدرسوں اور مکتبوں سے مجھے نکال باہر

کیا اور میم صاحبہ براجمان ہو گئیں۔ مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے خدا نے

میرے شیدائیوں کو بھی اس حملے کا مقابلہ کرنے کیلئے کس بل دیا کچھ اوچھے

دل پھینک تو میم کی گٹ پٹ اور کافر اداؤں پر ریجھ گئے مگر یہ دل پھینک

بھی دراصل تھے غرض کے بندے........! انگریزی اتنی پیاری نہ تھی

جتنی نوکریاں، اور خطابات خلعت اور اعزازات۔ چنانچہ اس زمانے میں بھی

میری مانگ نہ بگڑنے پائی اور بناؤ سنگھار میں فرق نہ آیا انگریزی آئی تھی

مجھے مٹانے کیلئے مگر میرے شیدائیوں نے اس کے گہنے آتارکے مجھے پہنا دیئے

تم نے سید احمد خاں اور الطاف حسین حالی کا نام ضرور سنا ہوگا یہ سہرا ان ہی

کی نسل کے سر ہے انھوں نے مجھ میں انگریزی کا مقابلہ کرنے کا دم خم پیدا کیا

پھر کروڑوں ہندو مسلمانوں نے شعر و ادب کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر میری

حفاظت پر کمر باندھ لی۔ دراصل نئی تہذیب کے اس ٹکراؤ نے مجھ میں بجلی کی

سی چمک پیدا کر دی۔ ایسی کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں چندھیا گئیں حکومت

تو گئی۔ مگر فکر و خیال پر راج میرا ہی رہا، آتش و غالب، ذوق و مومن

نے حسرت و اصغر، جگر و فانی کے روپ میں پھر جنم لیا۔ ادھر اقبال نعرہ تانا

ہوا اٹھا اور جوش نے زمین و آسمان کے قلابے ایک کر دیئے، عبدالحق

نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ انگریزوں نے عالیشان محلوں میں اپنی چہیتی

انگریزی کو سجایا۔ دفتروں میں مجھے لا بٹھایا مگر زبانوں سے مجھے نہ نکال سکے

گھروں اور جھونپڑیوں میں میری ہی عملداری رہی آزادی کی جنگ میں

طوفان بن کر اٹھی۔ بادل بنکر گرجی اور بجلی کی طرح اعدا کی صفوں پر ٹوٹ

پڑی غلامی کے زمانے میں بھی دیوبند، ندوۃ العلوم جامعہ عثمانیہ اور جامعہ ملیہ

میں میرا سکہ چلا۔ میں نے نئی نسل کو ذہنی غلامی سے بچایا۔ ان کے خیالوں

میں نئی آگہی اور دماغوں کو نئی روشنی بخشی یہ نسل میرے ہی جلو میں شانہ بشانہ

آزادی کی منزل کی طرف بڑھی۔ مگر ولائے ناکامی جیسے جیسے منزل قریب

آئی اپنے پرائے ہونے لگے، ہندی کو تو آپ جانتے ہی ہونگے ہم دونوں نگریزی

کے ستائے ہوئے تھے۔ میرا اس سے کوئی بیر نہیں تھا مگر فرنگی کا داؤ چل گیا

ان نادانوں نے اسے مجھسے لڑا دیا۔ وہ بیچ منجدھار میں مجھ سے الجھ گئی ——
انگریزی نے قہقہہ لگایا اور چنگاری ڈال جا لو الگ ہو گئی۔

میں نے لاکھ منت کی کہ میرا اور ہندی کا کوئی جھگڑا نہیں ہم دونوں ایک ساتھ زندہ رہ سکتی ہیں اور اس لڑائی سے اگر کوئی کچھ حاصل کریگا تو وہ موئی پردیسن ہے —— مگر جب دن بگڑتے ہیں تو بگڑتے ہی چلے جاتے ہیں۔ سچ پوچھو تو میری زندگی کے یہ سب سے منحوس دن تھے۔ ایک طرف دشمنوں نے گھیر رکھا تھا۔ تو دوسری طرف نادان دوستوں نے ناطقہ تنگ کر دیا تھا ہندی والوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ میری جڑیں کاٹنا شروع کر دیں اور یہ نہ سوچا کہ جب تک میم صاحبہ ڈٹی ہوئی ہیں مجھے نکال کر بھی وہ کیا پائیں گے

دوسری طرف میرے شیدائیوں کی صفوں میں بھی بوالہوس گھس آئے۔ ہندی کی لگام سنسکرت کے ہاتھ میں دیدی گئی تو دوسری طرف ان نادانوں نے میرے گلے کو موٹے موٹے لفظوں سے چھلنی کر دیا ...یں فرقہ واریت ست بلند اور آزاد تھی انھوں نے مجھے فرقہ بندی میں قید کر دیا اور ایسی کیچڑ پلید رچی کہ کہاں تو ہندو مسلمان سب ہی میرے گرویدہ تھے اور یہ سارا برِاعظم میرا وطن تھا۔ کہاں یہ الزام تراشا گیا کہ انگریزی کی طرح میں بھی پردیسی ہوں اور اسی سزا کی مستحق جس کی کہ وہ موئی نٹ کھٹ میم۔ میرے بابا عبدالحق حیران تھے کہ یہ کیا ہو گیا۔ انھوں نے مہاتما گاندھی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ پنڈت نہرو کو سمجھایا مگر سب نے مایوس کیا اور اگر...... نہرو لیاقت معاہدہ نہ ہو گیا ہوتا تو میں تفصیل کے ساتھ بتاتی کہ مذہبی تعصب اور فرقہ واریت کے جنون میں سمجھدار لوگوں نے کیسی کیسی پاگل پن کی حرکتیں کی تھیں۔ قصہ مختصر اس لڑائی جھگڑے میں خوب گند اچھالی گئی تنے میں قائدِاعظم نے مجھے ڈھارس دی کانگریس اور لیگ کی لڑائیوں میں میرا نام بہت آتا تھا۔

میں بھی مطمئن ہو گئی تھی کہ اگر پاکستان بن جائے تو کم از کم ایک ملک میں تو چین نصیب ہو جائیگا۔ ہند میں پھر شاید حالت سدھر جائے اس لئے کہ سارا جھگڑا پاکستان کے سوال پر تھا جب وہی سمجھوتہ سے طے پا جائے گا۔ تو پھر مجھے بھی کوئی کیوں تنگ کریگا۔ مگر تم جانتے ہی ہو یہ امیدیں سب پامال ہو گئیں۔ بھارت میں ایک منٹ کے لئے بھی میری صورت تک دیکھنا گوارا نہ کی گئی اور یہاں جہاں میں خوشی خوشی پہنچی تو عجیب منظر نظر آیا میں تو سمجھتی تھی کہ ہم انگریز کو انگریز کے ساتھ انگریزی بھی چلی گئی ہوگی اور یہاں یہ ماجرا ہوا کہ انگریز کم تھے مگر انگریزی زیادہ! شروع شروع میں تو میں نے دفتروں اور مدرسوں کا بلا کسی قسم کی جھجک کے رخ کیا اسلئے کہ وہاں بڑے بڑے لوگ بیٹھے تھے جو کبھی میرے نام کا وظیفہ پڑھا کرتے تھے اور میری طرف کوئی انگلی اٹھاتا تھا تو انگلی کاٹ لینے کیلئے دوڑ پڑتے تھے میں سمجھی کہ اب کیا ہے اب تو سب اپنا ہی راج ہے لیکن جب میں نزدیک پہنچی ٹکا سا جواب ملا کہ پہلے اپنی صورت دیکھو۔ پھر ادھر رخ کرو۔ موئی میم اتراتی ہوئی آئی اور دھڑسے دروازہ میرے منہ پر بند کر دیا۔

کہاں تو یہ امید تھی کہ بڑی بڑی یونیورسٹیاں بڑے بڑے دفاتر سب میرے نام الاٹ ہو جائینگے۔ سالہا سال تک جو آرزوئیں اور تمنائیں قائم کرتی رہی اب پوری ہونگی۔

اور کہاں اب یہ حال ہے کہ میں شاردا مندر میں پڑی ہوں میرے بابا جو ۸۲ سال کی عمر میں بھی بوڑھے نہ ہوتے تھے اب تین سال میں بوڑھے ہو چکے ہیں غیروں سے لڑتے لڑتے لگ گئی۔ اب اپنوں سے لڑنے کا نیا دور شروع ہوا ہے۔ میرے منہ پر کہا جاتا ہے کہ ابھی تم کسی قابل نہیں ہو ابھی تو انگریزی ہی سے کام چلے گا۔ کم بخت یہ بھی نہیں سوچتے کہ انگریزی سے مانوس کتنے لوگ ہیں اور پھر یہی نہیں ان ناسمجھوں نے بنگالی، سندھی اور پشتو سے میرے تعلقات بگاڑنے کی کوشش شروع کر دی۔ یہ سب میری بہنیں ہیں ان کے درمیان جو رشتہ ہے وہ میرے دم سے قائم ہے میری تمنا اور آرزو ہے کہ یہ سب پھلیں پھولیں اور میرے ساتھ یہ بھی پروان چڑھیں مگر کتنی عبرت کا مقام ہے کہ ناسمجھ لوگوں نے ان بہنوں کو بھی سوکن بنانے کی ٹھان لی ہے تمہیں تو پتہ ہے دلی اور لکھنؤ کے اجڑنے کے بعد لاہور میں میری کیسی آؤ بھگت ہوتی تھی لاہور ہی کیا موقوف۔ سندھ۔ سرحد اور بلوچستان کے شہر بھی میرے تھے مگر نادانوں نے میرے حق میں ہر جگہ کانٹے بوئے

ں تو قیامت برپا ہے اور یہ حال دیکھ کر مجھ بے چاری کے وسان خطا ہو گئے کہ وہی لیگ والے بڑے بڑے "خان بہادر" ڈ سر" جو اردو کیلئے جان دینے کو تیار رہتے ۔ اب عبارت میں میرا نام لیتے ہوئے ڈرتے ہیں میری ساری املاک متروکہ جائداد قرار دیدی گئی مجھے دیس نکالا ملا اور یہ لیگی کہتے ہیں کہ ہاں اب یہی ٹھیک ہے وہاں سے گئی تھی اور یہاں سے بھی گئی۔ اب بتاؤ میں کروں تو کیا کروں؟ ذرا یہ داستان ہی چھاپ دو شاید تم نہ بتاؤ کوئی اور بتائے یا مجھے ستانے والوں کو شرم ہی آئے!

(بشکریہ امروز)

مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

ادب دنی الاسلام	۸/۰	تفہیمات	۳/۸
رسالہ دینیات	۱/۸	حقیقت توحید	۱/۲
قوق الزوجین	۱/۸	حقیقت تقویٰ	-/۱۲/-
سئلہ قومیت	۱/۸	سود	۲/۸
سئلہ جبر و قدر	۱/۰	اشتراکیت اور نظام اسلام	۴/۸
تجدید و احیائے دین	۱/۰	نیا نظام تعلیم	-/۶/-
سلامی عبادات پر تحقیقی نظر	۱/۰	جماعت اسلامی کی دعوت	/۶/-
رآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۱/۴	حقیقت شرک	۲/۰
سیاسی کش مکش (حصہ اول)	۱/۴	تفہیمات (حصہ دوم)	۴/۰
سیاسی کش مکش (حصہ دوم)	۲/۸	رسائل و مسائل	۵/۴
سیاسی کش مکش (حصہ سوم)	۲/۸	مرتد کی سزا	-/۱۲/
سلام کا نظام حیات	-/۱۰/-	دعوت دین اور اس کا طریق کار	۲/۱۲
ردہ	۲/۸	تفہیم القرآن (جلد اول) مجلد قسم اول	۲۰/۱۲/
یحات	۲/۸	" " " دوم	۱۸/۴/-
طبات (نیا ایڈیشن)	۳/-	پاکستانی عورت دوراہے پر	۲/۱۲

مسئلہ ملکیت زمین - قیمت ایک روپیہ

مکتبہ جماعت اسلامی ۵ - الف ذیلدار پارک اچھرہ لاہور پاکستان

محمود فاروقی

ذہنی مجرم!

اس کا نام "مغیلان سوفو" تھا۔

دارالسلطنت کے بہت ہی کم لوگ ایسے ہونگے جو اس عجیب غریب نام کو جو روسی اور گردی الفاظ سے مرکب تھا، نہ جانتے ہوں۔

لیکن مجرموں کے گروہ میں وہ ہمیشہ "خارپشت" کے نام سے یاد کیا جاتا رہا۔ یہ خطاب جو اس کے اصل نام سے زیادہ مشہور ہو گیا تھا جس قدر عجیب و غریب تھا۔ اسی قدر اس کی شکل و صورت بھی مضحکہ خیز واقع ہوئی تھی ——— دبلا پتلا، لانبا قد، سوکھا ہوا سبز فام درشت چہرہ، قدرے اٹھے ہوئے کاندھے، گھنے اور جھکے ہوئے ابرو، سیدھے کھڑے ہوئے چوکنے کان، چہرہ پر بکھرے ہوئے سیاہ بال اس مضحک شکل کے بڑی حد تک ذمہ دار تھے۔ لیکن اس کی شخصیت جس پر "خارپشت" قسم کے خطابات چسپاں ہو سکتے ہیں نامکمل رہے گی۔ اگر اس کی جھکی ہوئی سرخ ناک اور لانبی لانبی پتلی انگلیوں اور سب سے زیادہ پیشانی میں اندر کو دھنسی ہوئی گہری آنکھوں کا ذکر نہ کیا جائے اس کی سرخ ناک بلاشبہ اسکو کارٹون بنائے رکھتی اور سامنے سے اس کا جھکاؤ اس کی طبعی سخت گیری اور درشتی کو ظاہر کرتا اور اس کی تیز چبھتی ہوئی بے قرار نگاہیں اس کو خطرناک اور پر اسرار بنانے کیلئے کافی تھیں۔ ان مشتعل آنکھوں میں ہمیشہ ایک چھپی چھپی سی تیز چمک پھیلی ہوئی رہتی۔ اسکی آنکھوں کیلئے تشبیہ ایسے گہرے کنویں کی ہو سکتی ہے جس کی تاریک تہہ میں گاہے گاہے پانی چمکتا ہوا نظر آئے۔

لیکن اس وقت جبکہ وہ کسی قاتل پر بحیثیت سرکاری وکیل کے جرح کرتا۔ تو یہ دبی دبی روشنی اسکی متحرک تپلیوں کے اطراف سے آنکھ کے گوشوں تک پھیل جاتی۔ ہر ایسے موقعہ پر اسکی سرخ ناک زیادہ جھکی ہوئی معلوم ہوتی۔ اور اسکی خطرناک نگاہیں تیر کی طرح مخاطب کے سینہ میں چبھتی ہوئی محسوس ہوتیں کان خرگوش کی طرح چوکنے ہو جاتے اور اس کی پتلی پتلی انگلیاں عدالت کی خاموش فضا میں بار بار تموج پیدا کرتی رہتیں اور وہ ایک ایک لفظ سنجیدگی کے ساتھ زور دیتے ہوئے ملزم کے کٹہرے کے سامنے ٹہلنے لگتا بحیثیت مجموعی وہ اس وقت عین اس گدھ کے مشابہ معلوم ہوتا جو کسی شکار پر حملہ کرنے کیلئے پر تول رہا ہو۔

اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ اس کی کامیاب جرح میں سلجھی ہوئی دلیلوں کے علاوہ اس کی پر وقار چال اور "شعاعی نگاہوں" کا بھی بہت زیادہ دخل ہے ——— درحقیقت عدالت کے سنگین فرش پر اس کا جچا تلا ایک ایک قدم اس کے سکون طبیعت کا بہترین آئینہ دار تھا۔ وہ تھا بھی انتہائی پرسکون کم گو اور گہری طبیعت کا آدمی!

ایسے شخص کو لوگ عموماً پسند نہیں کرتے اور ایک حد تک خوف زدہ بھی رہتے ہیں چنانچہ لوگوں نے اس کو کبھی کسی ہوٹل یا ڈانسنگ پارٹی میں شریک ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اور اس کے گھر کا دروازہ بھی کسی مہمان کے لئے کھلتا ہوا دکھائی نہیں دیا۔ باوجود ان خصوصیات کے مملکت کے اکثر لوگ اس کی قدر و منزلت بھی کرتے تھے۔ جب بحث ہوتی عدالت کا ہال عورتوں اور مردوں سے کھچا کھچ بھرا ہوتا عدالت میں اسکی آہنگ دار آواز ایک مخصوص اتار چڑھاؤ کیسا تھ کا سناٹا پیدا کر دیتی جس طرح کسی قدیم ویران عمارت میں اسرار کی گونج یا رات کو تاریکی میں کسی دور دراز گرجا کے گھنٹے کی پر اسرار آواز معلوم ہوتی ہے۔

عدالت کی خشک کارروائیوں میں اسکی آواز کا یہ تاثر، نگاہوں کا یہ رازدارانہ انداز اور بے قرار نگاہوں کی پر اسرار چمک سامعین کیلئے خاص دلچسپی کا سبب بن جاتی۔ وہ نہ تو بوڑھے وکیلوں کی طرح جملہ بازی اور مکرٹے کرنے کا عادی تھا اور نہ نوخیز بیرسٹروں کی طرح پر جوش بحث کا! بلکہ وہ انتہائی اطمینان اور ایک ہم آہنگ اتار چڑھاؤ سے اپنی گفتگو کو شروع کرتا اور کوئی نہ کوئی حیرت انگیز جملہ کہہ کر اس

موش ہوجاتا کہ اس کی یہ لمحاتی خاموشی' عدالت کی خاموش فضا میں ایک
یر محسوس مختصر سا فصل پیدا کر دیتی اور ایسا محسوس ہوتا کہ اس مختصر سے
یہ میں وقت ذرا سی دیر کیلئے رک گیا ہے ۔

ہر ایسے موقع پر عدالت کا سارا ماحول ——— سفید ٹوپی والے جج'
رخ فیتے والے اراکین جیوری ، سیاہ چغے پہنے ہوئے وکیل اور مسحور حاضرین
ی پراسرار گہرے دھند میں لپٹے ہوئے معلوم ہوتے ۔

اس لمحاتی وقفہ کے بعد ہی وہ مقدمہ کی کسی نہ کسی حیرت انگیز
ی کو نمایاں کرتا جو اب تک تمام نظروں سے اوجھل ہوتی اس غیر متوقع
لمشاف پر عدالت کے ہال میں ایک مدہم سا شور پیدا ہو جاتا اور مقدمہ کی سنگین
اموشی ایک مبہم جوش میں بدل جاتی اخبار کے رپورٹر بڑی تیزی سے اپنا قلم
لمپٹنے لگتے ۔ تماشائی اپنی سیٹوں پر آگے کی طرف غیر ارادی طور پر جھک جاتے
اور مختلف قسم کی دبی دبی آوازیں بھنبھنانے لگتیں ——— لیکن "مغیلان سوفو"
حسب عادت سیدھے تنے قدموں کے ساتھ سنگین فرش پر اطمینان سے ٹہلتا رہتا
جیسے عدالت کی اس فضا کا اس پر مطلقاً کوئی اثر نہیں پڑ رہا ہے چنانچہ اس کے
اس غیر معمولی سکون پر مملکت کی اکثر خواتین بری طرح جھنجھلا جاتیں ۔ ان کے
خیال میں مغیلان کو اس بات کا کوئی حق حاصل نہ تھا کہ وہ اپنے حیرت انگیز
جملوں سے سب کو پُر جوش کر دے ۔ اور خود بالکل ہی لاپرواہ اور برف کی
طرح سرد نظر آئے در اصل یہ عورتیں " انتہائی تحریک " اور " اہتزازی جوش "
کو زیادہ پسند کرتی ہیں .... لیکن انھیں کیا معلوم کہ برف
خواہ کتنا ہی سرد ہو اس کی پوشیدہ خاصیت گرم ہی رہتی ہے ۔

' مغیلان ' کے متعلق بھی یہ بات صادق آتی تھی ۔ بظاہر وہ نہایت
ہی ٹھوس اور سرد نظر آتا تھا لیکن اندرونی طور پر ..... ؟ کسی کو کیا معلوم
کہ اس کے دل و دماغ میں کس قدر التہاب اور اس کے ذہن میں کتنی بے چینی
موجود ہے ——— اس کے اس غیر معمولی سکون کے نیچے ایک اضطرابی
کیفیت اور ایک ہنگامی جذبہ پوشیدہ تھا ۔

ایک انوکھا اور خطرناک جذبہ جو ہمیشہ اس کو مضطر اور بے چین
رکھتا جب کبھی یہ مبہم جذبہ اس کے دل و دماغ پر مسلط ہو جاتا تو ——— اسکی
آنکھیں اچانک سرخ ہو جاتیں اور کنپٹی کی رگیں ابھر آتیں اور اس کے
ذہن پر ایک انوکھی اور خطرناک خواہش آہستہ آہستہ رینگنے لگتی ۔

' کسی انسان کو قتل کر دینے کی خواہش '

ہر ایسے وقت اسے ہر طرف خون کی سرخیاں جھلکتی ہوئی نظر آتیں ۔
اور عجیب و غریب خونی منظر فضا میں تیرتے ہوئے دکھائی دیتے ۔ عموماً
اس قسم کا دورہ اسے اس وقت پڑتا جب وہ اپنی تنہا خوابگاہ میں نیند کا
انتظار کرتا رہتا اس حالت کے لئے " دورہ " کا لفظ بھی کچھ مناسب نہیں
کیونکہ وہ کسی ذہنی بیماری کا مریض نہ تھا ۔ ایسے مواقع پر اس کے اعصاب
میں کسی قسم کی تشنجی کیفیت پیدا ہوتی اور نہ اس کے حواس منتشر ہوتے سب سے
بڑی بات یہ ہے کہ قتل کی یہ خواہش خود بخود غیر ارادی طور پر اس کے ذہن میں
پیدا نہیں ہوتی بلکہ وہ بڑی حد تک اپنی ہی مرضی اور خواہش سے اس کیفیت
کو پیدا کر لیتا ۔ اس طرح وہ حالت بیداری میں ایک خونی خواب پیدا کر لیتا
اور اسکی قوت متخیلہ نہایت تیزی سے اس کی شخصیت کو ایک ہوشیار قاتل
کی شکل میں تبدیل کر دیتی اور وہ اپنے آرام دہ صوفہ پر لیٹا ہوا ایک
خوفناک قاتل کی طرح قتل و خون کے متعدد کارنامے انجام دیتا رہتا ۔

اس نفرت انگیز عادت کی وجہ سے ممکن ہے ' مغیلان سوفو ' کی
شخصیت آپ کی نظروں میں پست تر ہو جائے ۔ لیکن ——— یہ ایک حقیقت
ہے کہ ہماری سوسائیٹی کے اکثر افراد اس قسم کے " ذہنی جرائم " کے مرتکب
ہوتے رہتے ہیں ۔ اگر انسانوں پر سے مصنوعی طور پر عاید کردہ قانونی
دباؤ کسی طرح زائل کر دیا جائے تو بہت سارے نامی گرامی شریف
اپنے اصل رنگ میں ظاہر ہو جائیں ۔

ایک زانی اگر عملاً زنا کا مرتکب ہوتا ہے تو مہذب دنیا اسے ایک
مذموم فعل قرار دیتی ہے اور یہ خود ساختہ قوانین اسے اپنی تعزیرات کا نشانہ
بنا لیتے ہیں لیکن کوئی نوجوان مجرد پادری اپنی چارپائی پر لیٹے لیٹے کسی
خیالی تصور سے قصداً ہم آغوش ہوتا ہے تو دنیا کی کوئی قوت سے
زانی نہیں کہہ سکتی ——— اور وہ مقدس پادری اپنی جگہ لیٹے لیٹے مملکت
کی کئی شریف زادیوں کو عصمت باختہ بنا دیتا ہے اور بڑے اطمینان
سے گناہگاروں کو بپتسمہ دینے کے لئے قربان گاہ میں پہنچ جاتا ہے اور لوگ
اس کے بے عیب تجرد کو تعریفی نظروں سے دیکھتے ہیں حالانکہ ......
خیر تو کہنا یہ تھا کہ بالکل یہی حال ہمارے عجیب و غریب دوست "مغیلان سوفو"

کا ہے۔

وہ ایک ذہنی قاتل ہے!

اسی لئے وہ اپنی آرام دہ خواب گاہ میں جس کی دیواروں پر
قتل، پھانسی، موت کی بھیانک تصویریں آویزاں ہیں ایک لانبی کوچ
پر لیٹا ہوا دوسرے عام قاتلوں کی طرح کسی نہ کسی کو قتل کرنے میں مشغول
رہتا ہو وہ انتہائی احتیاط سے اس شخص کیلئے جسے وہ قتل کرانا چاہتا ہے
ایک مرتب اسکیم تیار کرلیتا ہے اس اسکیم کو بناتے وقت وہ بطور پیش بندی کے
مقتول کی عادتوں اور روزمرہ کی مصروفیتوں کا ایک خاکہ بھی مرتب کرلیتا
ہو تاکہ اسے اپنے ناپاک ارادہ کو روبہ عمل لانے میں کسی طرح کی دشواری
پیش نہ آئے۔ دوسرے عملی قاتلوں کی بہ نسبت "مغیلان سوفو" کی اسکیم زیادہ
مرتب اور مبرا ہوتی ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہو کہ عملی قاتل اپنی اسکیم
میں کسی موقعہ پر بھی "اتفاقات" کے اہم جز کو جگہ نہیں دیتے۔ ان کی اسکیم اپنی
نوعیت کی ایک مکمل اسکیم ہوتی ہو لیکن اسکی سب سے بڑی خامی اس کا انتہائی مکمل
ہونا ہی ہے۔ چنانچہ اکثر مجرم اس ایک خامی اور غلطی کی وجہ سے قانون کی
گرفت میں آجاتے ہیں ——— ایک مکمل اسکیم پر عمل کرتے ہوئے جب کبھی
کوئی چھوٹا سا اچانک پیش آنیوالا اتفاق نمودار ہوتا ہے تو ہر عملی قاتل کیلئے
اس نئی صورتحال سے دوچار ہونا سخت دشوار ہو جاتا ہے۔ چونکہ اسکی
قوت فیصلہ تمامتر اس مکمل اسکیم کے دائرہ میں مرتکز رہتی ہے اسی لئے وہ
ہر نئے "اتفاق" کے پیش آنے پر کشمکش میں پڑ جاتا ہے

یہی وہ چھوٹا سا "اتفاق" ہے جسے سراغ رساں "بو گیر کتوں" کی
طرح سونگھتے رہتے ہیں۔ "مغیلان سوفو" کی قانونی مہارت کا تمامتر کمال
بھی انہی "اتفاقات" کی تلاش پر منحصر تھا۔ اس نے اسی مخصوص تجربہ
سے سلطنت کے نامی گرامی مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچایا تھا۔

چونکہ وہ اس راز سے واقف تھا اسی لئے وہ اپنی اسکیم میں اچانک
پیدا ہونے والے "اتفاق" کیلئے کافی گنجائش رکھتا تھا اور وہ اسکے
رد عمل کیلئے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قتل کی
ذہنی اسکیم میں عملی اسکیم کے برعکس بکثرت "اتفاق" خود بخود پیدا ہو جاتے
ہیں۔ غالباً تخیل کی بے راہ روی اس کا بڑا سبب ہے،

غرض یہ کہ "مغیلان سوفو" مملکت کا سرکاری وکیل ہو جسے
مجرم "خارشپت" کے گھناؤنے نام سے موسوم کرتے تھے، اور جسکی خدمات
عموماً قتل کے پراسرار مقدموں میں حاصل کی جاتی تھیں خود ایک خطرناک
ذہنی قاتل تھا ——— اس میں اور ان قاتلوں میں جن پر وہ بڑے اطمینان
سے جرح کرتا تھا۔ صرف اسی قدر فرق تھا کہ وہ اس محسوس دنیا میں اپنے
جرائم کا ارتکاب کرتے تھے اور "مغیلان" دوسرے ذہنی مجرموں کی طرح
ایک غیر محسوس دنیا میں۔ ارتکاب جرم کی حیثیت سے دونوں کا مقام
ایک ہی تھا۔ دونوں اپنے ناپاک ارادوں اور خواہشوں کو روبہ عمل لاتے
دونوں قانون اور سوسائٹی کے مقدس ضابطوں کو توڑتے۔ دونوں
نے گناہ انسانوں کا خون ایک طرح بہاتے تھے ——— لیکن ان کو پھانسی
کے تختہ پر لٹکایا جاتا تھا اور سوسائٹی ان کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتی
تھی۔ اس کے برعکس "مغیلان" اس طرح پرسکون حالت میں مجرموں
پر جرح کرتے ہوئے نظر آتا کہ کسی کو اسکے قاتل ہونے پر شبہ تک نہیں
ہوتا تھا۔ حالانکہ بسا اوقات اس نے اس بوڑھے جج کو عدالت کی
لائبریری میں قتل کیا تھا جسکے اجلاس پر اس نے اکثر کامیاب بحثیں کی تھیں

اسی طرح اس نے متعدد بار بھرے ہوئے سینما میں اپنے قریب
بیٹھی ہوئی خوبصورت لڑکیوں کا گلا گھونٹ دیا ——— لیکن نہ تو ان لڑکیوں
نے چیخ ماری اور نہ کوئی ہنگامہ پیدا ہوا جنکی وجہ لڑکیاں اپنے چاہنے
والوں پر جھکی ہوئی سینما دیکھنے میں مشغول رہیں۔

اگرچہ "مغیلان" نے متعدد مردوں، عورتوں اور بچوں کو
قتل کیا تھا لیکن اسے جس قدر لطف جوان لڑکیوں کو گلا گھونٹ کر
میں آتا تھا کسی اور کے قتل میں کسی وقت حاصل نہیں ہوا۔

سوائے ایک معصوم بچے کے ——— یقیناً یہ قتل نہایت
ہی لذت بخش اور بھیانک تھا۔

ایک مرتبہ اسے اپنے کسی عزیز کے پاس رات کے کھانے پر
میں جانا تھا۔ وہ قریبی ریلوے اسٹیشن سے ڈیزل کار پر سوار ہوا
اسٹیشن پر ایک ادھیڑ عمر کی عورت ایک خوبصورت بچہ کو لئے ہوئے
ڈیزل میں داخل ہوئی اور اس کی قریبی سیٹ پر اس نے بچہ کو گرم لحاف
میں سلا دیا معصوم بچہ آنکھیں بند کئے سو رہا تھا اور اس کی ماں اس
اونی سوئٹر بننے میں مصروف تھی۔ "مغیلان" تھوڑی دیر تک بچہ کو

بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ ایک خفیف سی مسکراہٹ بچہ کے نازک ہونٹوں پر مچل رہی تھی۔ جیسے دنیا بھر کی مسرت ان پھول کی نازک پنکھڑیوں میں سمٹ گئی ہو۔ بچہ کے سنہرے بال اس کی شفاف پیشانی پر بکھرے ہوئے نہایت ہی خوب صورت معلوم ہو رہے تھے

"مغیلان" کو ان مختصر لمحوں میں عجیب غریب خیال آتے رہے اسے اپنی گذشتہ خشک زندگی پر نہایت ہی افسوس ہوا......! زندگی میں پہلی مرتبہ اس کے دل میں بالکل ہی انوکھا خیال پیدا ہوا اور اس کی نظروں میں ایک عجیب منظر گھومنے لگا۔

دریائے سون کے کنارے چھوٹا سا خوب صورت مکان جہاں قانون کی خشک کتابوں اور وحشتناک سیاہ الماریوں کی بجائے مشرقی ممدر کے خوب صورت فوٹو اور چھوٹے چھوٹے ہشت پہلو میزوں پر "ارارٹ" کے بھینی بھینی خوشبو والے دیدہ زیب پھول اور نازک نقرئی گلدان ایک نیلے صوفہ پر بیٹھی ہوئی "سلونی ایبٹ"........ "سلونی" کے گود میں .... اس کی نظر مسکراتے ہوئے بچہ کے بند پپوٹے پر جم گئی۔

اسے اپنی مجرمانہ زندگی پر نہایت ہی تاسف ہونے لگا

"کاش" اس نے ایک آہ سرد کھینچی

"خوش نصیب" وہ بچہ کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

"لیکن"........ ایک خطرناک خواہش اس کے تحت الشعور میں آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔

"قتل"........ کیا سلونی ایک اچھی بیوی..... گلا گھونٹ کر...... اگر "سلونی" بانجھ نکلے .... بچہ چیخنے نہ لگے.... قتل...

باہر بارش ہو رہی تھی۔ ڈیزل نہایت تیزی سے بھاگا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ خطرناک "خارپشت" کے ذہن میں متضاد خیال انتہائی سرعت سے دوڑ رہے تھے

"سلونی"...... قتل ...... خوش نصیب ...... خون ...... "ارارٹ" کے پھول ...... بچہ کی خوب صورت گردن .... قتل ...... قتل .... قتل ......!

بالآخر قتل کی خواہش نے اچانک اس کے سارے حواس پر قبضہ کر لیا۔ بچہ اسی طرح مسکراتے ہوئے سو رہا تھا! اس کی ماں سویٹر بنتے بنتے اونگھنے لگی تھی۔

باہر بارش تیز تر ہو گئی اور ڈیزل کی رفتار بھی ــــ اس نے آہستہ سے فلالین میں لپٹے ہوئے بچہ کو اٹھا لیا

ایک ہلکا سا خوشگوار بوجھ اسے اپنے ہاتھوں پر محسوس ہوا اور اس نے جھک کر اپنی پوری عمر میں پہلی مرتبہ بچہ کے بند پپوٹوں کو چوم لیا اسے اسقدر سرور محسوس ہوا جیسے اس نے وائٹ جاسمین کا پیگ چڑھا لیا ہو۔

لیکن دوسرے ہی لمحہ اسکی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور اس نے بچہ کی دونوں ٹانگیں پکڑ لیں۔ گاڑی دریائے سون کے پل پر سے گذر رہی تھی۔ پل کے آہنی ستون نہایت تیزی سے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگے جا رہے تھے۔ وہ بچہ کو لئے ہوئے کھڑکی میں سے نصف جسم تک جھک گیا اور ہاتھ بڑھا کر اس نے نہایت بیدردی سے پوری قوت کے ساتھ معصوم بچہ کو ایک ستون پر دے مارا..... فضا میں ایک دل دوز چیخ اور ایک خوفناک قہقہہ بلند ہوا اور بچہ کا سر پاش پاش ہو گیا۔ "مغیلان" نے نہایت ہی نفرت سے بچہ کی لاش کو دریا میں پھینک دیا

جب گاڑی آئندہ اسٹیشن پر ٹھہری تو وہ چپکے سے پچھلے دروازہ سے اترا اور اس گاڑی میں سوار ہو گیا جو دوسری پٹری پر روانگی کیلئے تیار کھڑی تھی۔

چند ہی منٹ بعد دونوں گاڑیاں مختلف سمتوں پر روانہ ہو گئیں ایک میں مملکت کا سرکاری وکیل نہایت ہی اطمینان کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ دوسری میں بند فلالین میں لپٹا ہوا ایک معصوم بچہ مسکراتے ہوئے کہیں دور جا رہا تھا

اسی طرح اس نے کئی ایک نوجوان لڑکیوں کو اپنی اس خواہش کا تختہ مشق بنایا تھا۔ کئی لڑکیاں تو اس کی خوابگاہ کے پچھلے غسل خانہ میں قتل ہوئیں تھیں۔ کوئی ہفتہ ایسا نہیں جاتا تھا جس میں وہ کسی نہ کسی قتل کا مرتکب ہو لیکن باوجود اس مہارت کے وہ "سلونی ایبٹ" کو کبھی قتل نہیں کر سکا۔

"سلونی" اسکے دفتر کی ایک غریب صورت اور طرحدار ٹائپسٹ لڑکی تھی۔ وہ اکثر اسکے قتل کی متعدد تجویزیں سوچا اور ان تصوری قاتلانہ

ں میں وہ ان تجویزوں پر عمل بھی کرتا ـــــ "سلونی" کو جب کہ
ڈ ٹائپ شدہ کاغذات اس کے پاس پیش کرتی ۔ وہ بارہا پکڑ لینا
لی سخت اور لانبی انگلیاں سلونی کی مرمریں خوبصورت گردن پر جم جاتیں
سکی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہو جاتی جو عین ارتکاب جرم
ے وقت قاتلوں کے چہرے کو بھیانک بنا دیتی ہے لیکن عین اس
قت جبکہ "سلونی" کی خوبصورت آنکھیں باہر کی طرف ابل آتیں اور اسکے
ڈول جسم کا سارا خون چہرے پر آکر جم جاتا۔ اسکی ناک کے نازک نتھنے
پھڑپھڑانے لگتے اور اسکے گلے سے مدہم سی خرخراہٹ پیدا ہونے لگتی اسکے
بوں کی سرخ سطح پر زندگی اور موت کی پریاں ایکدوسرے کو نیچے دھکیلنے
یلئے باہم الجھ جاتیں ..... ہاں اس نازک وقت میں معلوم نہیں کیوں
سلونی مسکرانے لگتی ـــــ اس غیر متوقع دلفریب مسکراہٹ کو دیکھ
کر مغیلان کی قاتل آنکھوں میں ایک دھند سی چھا جاتی اور اس کے ذہن
میں قتل کی خواہش اچانک سرد پڑ جاتیں۔ وہ اسکے چہرے کو وارفتہ نظر
سے دیکھنے لگتا اس کی گرفت آہستہ آہستہ "سلونی" کی گردن پر ڈھیلی
پڑنے لگتی اور ـــــ دوسرے ہی لمحہ وہ اس کے مدہوش جسم کو اپنی آغوش
میں کھینچ لیتا اور ان سرخ چکتیوں کو بے اختیار چومنے لگتا جو اس کی
مرمریں گردن پر خون کے ابھار سے پیدا ہو جاتی تھیں۔

باوجود اس "تخیلی لذت" کے جو اسے اپنی اس خونی خواہش سے حاصل ہوتی
وہ اکثر اپنے آپ میں شرمندہ اور منفعل بھی رہتا ان لذتی لمحوں کے گزرنے
کے بعد وہ کسلمند اور نڈھال سا ہو جاتا ـــــ ایسے وقت میں اس کے
تحت الشعور سے ایک خوفناک آواز سنائی دیتی۔ قاتل..... قاتل ....
مملکت کا سرکاری وکیل بہت بڑا قاتل .....! یہ آواز بتدریج بلند ہونے
لگتی اور اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے کسی غیر محسوس عالم میں بہت سارے
سپاہی اسے گرفتار کرنے کے لئے دوڑ رہے ہیں۔ اور ہر طرف سے آوازیں
آرہی ہیں ... پکڑو ... قاتل کو پکڑو ...... دیکھو بھاگ نہ جائے...
"مغیلان سونو قاتل ہے .... سفاک قاتل! ..... اسکے کان بجنے
لگتے اور وہ ایک اضطرابی حالت میں اپنی خوابگاہ میں ٹہلنے لگتا بعض وقت اس
کے دل میں آتی کہ اپنے سر سے پستول لگا کر لبلبی دبا دے ـــــ اسکے یہ خیال
سوہان روح ہو جاتا کہ وہ بھی ایک قاتل ہے۔ اگرچہ کہ کم بین سوسائٹی اور
کوتاہ نظر عدالتیں اسے ایک پرامن اور معزز شہری سمجھتیں ـــــ

اس نے بارہا کوشش کی کہ کسی طرح وہ اپنی اس ناپاک خواہش
کو ترک کر دے جس سے اس کی زندگی بے کیف اور اداس ہو گئی تھی۔ باوجود
اسکے کہ دنیاوی آرام و آسائش کے سارے سامان اسکے لئے مہیا تھے وہ کسی
طرح اپنے آپ کو خوش اور مسرور نہیں کہہ سکتا تھا ـــــ زندگی کی سہانی اصلیت
جسے "سکون قلب" اور "اطمینان" کہا جاتا ہے۔ اسے میسر نہ تھی ـــــ

اکثر وہ سوچتا کہ یہ دنیا والے جو اسے پرسکون اور ضابطہ سمجھتے ہیں
اس سے سب کچھ چھین لیں اور ایک لمحہ کیلئے اسے "قلبی طمانیت" عطا
کر دیں ـــــ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا .... ! اور بیچارہ "مغیلان"
ایک عرصہ دراز تک اسی طرح اس "خونی خواہش" کے چنگل میں دبا رہا ـــــ
اس نے متعدد بار اس منحوس چنگل سے نکلنے کی کوشش کی لیکن بالکل اسی
طرح وہ اس کا شکار ہوتا رہا جس طرح صبح کو توبہ کرنے والا شرابی شام ہوتے
ہی نشہ کا شکار ہو جاتا ہے ـــــ بالآخر وہ اپنی اس خطرناک خواہش
سے بالکل ہی تنگ آگیا اور اس نے اپنے تئیں یہ طے کر لیا کہ وہ اپنے
آپکو قانون کے حوالے کر دیگا ایک مناسب تعزیری سزا ہی اسکو اس
الجھن سے چھٹکارا دے سکتی ہے

اس دن وہ "چاشت" سے فارغ ہو کر اپنی لائبریری
چلا گیا۔ جاتے ہوئے اس نے "سلونی ایبٹ" کو ہدایت کی کہ آج
وہ سارا دن لائبریری میں رہنا چاہتا ہے۔ کوئی اس کی تنہائی
مخل نہ ہونے پائے۔

اس نے اپنی لانبی میز پر قتل کے مقدمات سے متعلقہ تمام
اور رقی ہوئی کتابیں کھول کر رکھ دیں اور اپنے ہی خلاف رودادِ جرم کو مرتب
میں مصروف ہو گیا۔ پہلے اس نے اپنے جرائم کی ایک مکمل
لکھی۔ اس کے بعد اس نے نہایت محنت سے قانونی نکات
اور تعزیری دفعات مرتب کئے آخر میں اس نے عدالت
متوجہ کرتے ہوئے اپنے ہی لئے سزائے موت کی سفارش تو
جب وہ اس کام سے فارغ ہو گیا تو ایک مختصر سے وقفہ کے
وہ اپنی مرتبہ رپورٹ پر حسب معمول مخالف وکیل کے نقطہ
سے غور کرنے لگا۔ لیکن انتہائی کوشش کے باوجود
مقام پر بھی پیش نظر رپورٹ میں کوئی خامی نکال نہ سکا

....

اچانک اس کے ذہن میں مخالف وکیل کی آواز سنائی دی۔ مائی لارڈ
سرکار نے جو دلائل اور شہادتیں پیش کی ہیں ان سے کسی طرح بھی انکار
کیا جا سکتا۔ یہ سارا بیان نہایت ہی مکمل اور ناقابل شکست ہے
ہیں اپنے موکل کی پیروی کرتے ہوئے معزز اراکین جیوری کو اس
طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا کے کسی مقنن اور کسی عدالت نے
"ذہن انسانی کے مبہم ارتکابات" کو جرم قرار نہیں دیا ہے اور نہ
ملک کے دستور میں ان جرائم کے لئے تعزیری دفعات موجود ہیں اور نہ
اس کا کوئی قانونی ثبوت موجود ہے کہ دنیا کی کسی عدالت میں اس قسم
ذہنی قاتل" کو سزائے موت دی گئی ہو۔

"چونکہ میرے موکل سے اس محسوس دنیا میں کوئی جرم واقع نہیں
ہے اس لئے میں عدالت سے اپنے موکل کی رہائی کے لئے پُر زور سفارش
کروں گا۔"

"مغیلان" کو پہلی مرتبہ اپنی شکست کا احساس ہوا اس کو اپنے
سارے دلائل مخالف وکیل کے آخری حربہ کے سامنے ٹوٹتے ہوئے نظر آئے
لیکن وہ "مغیلان سوفو" مملکت کا سرکاری وکیل قتل کے
وارداتوں کا ماہر خصوصی جو ہمیشہ قانونی لڑائی جیتنے کا خوگر تھا آسانی سے
اس طرح اپنی ہار تسلیم کر لیتا ―――― بحث کے اختتام پر اس نے
ایک آخری نکتہ نوٹ کرایا۔

مائی لارڈ! عدالت فیصلہ سے پہلے اس امر پر بھی غور کرلے
کہ اگر اس قسم کے خطرناک "ذہنی مجرموں" کو سزا نہیں دی جائے گی
تو اس بات کا امکان ہے کہ ان کے "ذہنی ارتکابات" کسی نہ کسی وقت
عملی اقدام میں تبدیل ہو جائیں اور اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا
کہ ہر وقوع میں آنیوالا جرم سب سے پہلے مجرم کے ذہن ہی میں تکمیل پاتا ہے،
اور دنیا کی کوئی عدالت اس قسم کے جرائم کے لئے تعزیرات کو مرتب نہیں
کر سکتی تو میرے خیال میں اس سارے دستوری ڈھانچے کو یک لخت
منہدم کر دینا چاہیئے کیا معزز اراکین جیوری اس قسم کے جرائم کے لئے
کوئی مناسب سزا تجویز کر سکتے ہیں آڈر ...... آڈر...
......! "مغیلان" کی تصوری عدالت میں کچھ دیر
بعد جج کی آواز سنائی دی۔

فیصلہ سنایا جاتا ہے ―――― وکیل سرکار نے جس قدر شہادت
پیش کی ہے وہ مقدمہ کی نوعیت کے لحاظ سے نہایت ہی عجیب ہے
لیکن الذبات کے نقطۂ نظر سے کسی ایسے خیال کو اس وقت تک جرم
نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ وہ عملی صورت اختیار نہ کر لے اور کسی
فعال طاقت کے ذریعے وقوع میں نہ آئے اس قسم کے "ذہنی جرائم"
ذہن کی بے راہ روی کا نتیجہ ہیں اور اس محسوس دنیا میں ذہنی بے راہ روی
کے لئے کوئی قانونی گرفت موجود نہیں ہے لہٰذا میں بحیثیت مملکت
کے منصف اعلیٰ کے مجرم کی آزادی کا فیصلہ کرتا ہوں اور اراکین جیوری
کی رائے کے مطابق وہ آئندہ اس وقت تک آزاد رہیگا جب تک
کہ اس کی یہ قاتلانہ خواہش وقوع میں نہ آجائے اگر اس موقعہ پر مملکت
کا مایہ ناز سرکاری وکیل کسی ایسی فعال اور با اثر طاقت کا انکشاف کرے
جو انسانی اجسام سے گزر کر ذہنی ارتکاب پر بھی مستقل نگرانی قائم
رکھ سکے تو میرے خیال میں دنیا کی دستوری تاریخ میں یہ ایک قابل قدر
اضافہ ہوگا۔

"مغیلان" نے پہلی مرتبہ اپنی تصوری عدالت میں شکست کا
احساس کیا اور وہ منفعلانہ حالت میں ایک کوچ پہ گر پڑا۔

یہ چند لمحے "مغیلان" کے لئے ناقابل برداشت ہو گئے۔
اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس مختصر سے وقت میں اس کی زندگی
کے کئی سال گزر گئے۔

"درحقیقت زندگی کے دن کس قدر طویل ہیں۔ لیکن آہ
وہ کتنے مختصر بھی ہیں"!

کچھ دیر تک وہ ایک کھوئی ہوئی حالت میں لیٹا رہا پھر اچانک
وہ اٹھ کھڑا ہوا ایک نیا خیال اس کے ذہن میں سما گیا تھا۔
اس نے میز کی دراز سے پستول نکالا .... آخری علاج!

یقیناً وہ خودکشی کرنا چاہتا تھا۔
خودکشی ہی مجھے سکون بخش سکتی ہے۔ ایک ابدی اور دائمی
سکون، طویل بیداری کے بعد ایک میٹھی خوشگوار نیند ――――
موت کے خوشگوار تصور نے اسے نسبتاً خوش کر دیا...... لیک

میری زندگی کے یہ آخری لمحے نہایت ہی قیمتی ہیں ..... آخری بار
مجھے دنیا کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونا چاہئے۔

دنیا کی نعمتیں کیا ہیں ..... ؟

شراب ——— اور عورت !

"وائٹ جامین" کا ایک پیگ اور .... اور "سلونی"
کا گدرایا ہوا جسم !

اس نے پستول اپنی جیب میں ڈال لیا اور "سلونی" کو بلانے
کے لئے گھنٹی بجائی۔

"سلونی" جو بہت دیر سے اپنے آقا کے نہ نکلنے پر باہر متعجب
بیٹھی ہوئی تھی مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔

خلاف معمول "مغیلان" نے خندہ پیشانی کے ساتھ اس کا استقبال
کیا۔ "آؤ سلونی اس کرسی پر بیٹھ جاؤ میں کام کرتے کرتے تھک گیا
...... کیا تم "وائٹ جامین" پینا چاہتی ہو میں چند پیگ پینے
کے لئے کسی ساتھی کا خواہشمند تھا۔

یہ لو "سلونی" اس کا رنگ کس قدر خوشگوار ہے اس نے
ایک جام بھرتے ہوئے کہا اور اس کا ذائقہ ——— تمہارے شیریں
لبوں کی طرح نہایت ہی لذت بخش !

"سلونی" جس نے اپنی ملازمت کے طویل عرصہ میں "مغیلان"
کو ہمیشہ خشک اور چڑچڑا پایا تھا۔ آج اس حالت میں دیکھ کر نہایت
ہی حیران ہو رہی تھی ...... لیکن اس نے اپنی حیرت کو اس خیال آ
کہ کہیں اس کا آقا مکدر نہ ہو جائے بڑی خوبی سے چھپا لیا ———
وہ ایک ہنس مکھ شریف لڑکی تھی وہ نہیں چاہتی تھی — کہ اپنے مالک کو کسی
موقعہ پر بھی رنجیدہ کرے اس نے "مغیلان" کے پیش کردہ جام کو
بڑے ادب سے قبول کر لیا۔

"کیا تم گا سکتی ہو ——— !" مغیلان نے مدہوش کن لہجہ میں
کہا ——— "جی .... میں .... ہاں میں گا سکتی ہوں
آقا ——— "سلونی" گھبرا سی گئی۔

"بہت خوب" وہ اس کی طرف بہکی بہکی نظروں سے دیکھتے
ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو جاؤ اور مملکت کے
نشیبی علاقوں کا کوئی مست کن راگ سناؤ ——— گھبراؤ نہیں
میں ان اہم ترین مختصر لمحوں کو انتہائی خوشی کے ساتھ گزارنا چا
کیا تم ایک سمجھدار لڑکی کی طرح چند لمحوں کے لئے مجھے
نہیں رکھ سکتیں ؟ جبکہ میں اس کا ایک بہت بڑا صلہ دینے کیلئے
ہوں ——— جاؤ "سلونی" رکو نہیں میں تم کو حکم دیتا ہوں۔

سلونی نہایت ہی گھبرائی ہوئی کھڑکی کے قریب جا کھڑی
آہستہ آہستہ اس کی آواز بلند ہوئی اور اس نے نشیبی
کا ایک لطیف ترین راگ چھیڑ دیا۔ وہ دریچہ سے لگی ہوئی باہر
کو دیکھتے ہوئے اپنے وطن کا ایک متاثر کن راگ گا رہی تھی گ
بول اس قدر پر اثر تھے کہ تھوڑی دیر کے لئے سلونی راگ میں
کھو گئی۔ کہ اسے اپنے ماحول کا خیال ہی نہیں رہا عین ایسے و
مضبوط اور سخت ہاتھوں نے اسے اچانک دبوچ لیا ———
"مغیلان" تھا۔

اس غیر متوقع حرکت نے سلونی کو اس طرح حیران
کہ غیر پر ایک سکتہ سا چھا گیا۔

"مغیلان" نے اسے ایک کوچ پر لٹا دیا اور اس پر اپنی
تنگ کر دی اس وقت سلونی کو صورت حال کا صحیح احساس
اس نے چیخنا چاہا لیکن مغیلان نے پستول کی نالی اس کے منہ
لگا دی خبردار سلونی آواز نکلنے نہ پائے میں چند لمحوں بعد
سے خودکشی کر لونگا اور اس کے بعد تم میری تمام جائداد کی مالک
صرف اس شرط پر کہ تم ایک مایوس خودکشی کرنے والے مرد کو
آخری لمحوں میں اس نعمت سے لطف اندوز ہونے دو جس سے
عرصہ تک محروم رہا۔

کیا تم اتنے بڑے انعام کے عوض ایک مرنے وال
خوش کر سکتی ہو ؟

"نہیں" ! ——— سلونی نے غصہ سے تلملاتے ہو
میں ہرگز ایسا نہیں کر سکتی .... نہیں نہیں میں اپنے منگیتر سے
نہیں کر سکتی !

تم کو ایسا کرنا ہوگا سلونی ! ——— مغیلان غصہ سے

ے جنونانہ حالت میں اس کے جسم کو بری طرح جکڑ رہا تھا۔ سلونی نے
ں کی گرفت سے نکلنے کے لئے بہت ہاتھ پیر مارے لیکن کوئی
ئدہ نہ ہو سکا۔

چھوڑ دے درندے —— مجھے چھوڑ دے! وہ بری طرح
لائی۔ آہ میں کیا کروں، ذلیل انسان مجھ پر رحم کر۔۔۔۔ نہیں نہیں
یں ایسا نہیں کر سکتی کاش مجھے موت آجائے!

وہ نہایت بے بسی سے چلا رہی تھی لیکن "مغیلان" پر اس کا
وئی اثر مرتب نہیں ہوا اور نہایت ہی خوفناک انداز میں قہقہے لگا رہا تھا
قاہ قاہ قاہ —— خوبصورت تتلی میں تجھکو ہرگز نہیں چھوڑ سکتا
طویل مدت کے فاقوں کے بعد ہا ہا ہا میں ایسی لذیذ غذا کو
چھوڑ دوں میں اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں دنیا کی لذتوں سے محروم
رہنا نہیں چاہتا سلونی۔۔۔۔۔۔ اور دنیا کی ساری لذتیں قاہ قاہ
قاہ سلونی وہ صرف تیرے اس مچلتے ہوئے جسم میں پوشیدہ ہیں۔

سلونی کی نظروں میں دنیا تاریک ہو رہی تھی۔ اسکی خوبصورت
آنکھوں میں آنسو بھر آئے اس نے آخری مرتبہ نہایت ہی دلگیر آواز
میں کہا

"مجھے چھوڑ دو آقا۔۔۔۔۔۔۔ یہ بے عزتی میں برداشت
نہیں کر سکوں گی۔۔۔۔۔۔۔ آہ میرا بوڑھا باپ اس صدمہ سے
مر جائیگا۔۔۔۔۔۔۔ اور میرا منگیتر۔۔۔۔۔۔۔ اف میرے خدا
مجھے بچا! میرے آقا خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو صرف خدا کے لئے۔
میرے معبود مجھے بچا اس ناپاک درندے سے مجھے بچا —— وہ
نہایت رقت کے ساتھ گلوگیر آواز میں مغیلان کو خدا کا واسطہ
دے رہی تھی۔۔۔۔ ڈرو اس خدا سے ڈرو جو اس حالت میں بھی
ہمیں دیکھ رہا ہے۔ خدا کے عذاب سے ڈرو جو ظاہر و باطن کا
مالک ہے۔

خدا کے لئے چھوڑ دو۔۔۔۔۔۔ میرے آقا مجھے چھوڑ دو
۔۔۔۔ اور انتقام لینے والے بلند معبود گواہ رہ میں بےگناہ ہوں
۔۔۔۔۔۔۔ اچانک مغیلان کی حالت میں ایک عجیب
تغیر ہوا اس نے ایک جھٹکے سے سلونی کو چھوڑ دیا اور مدہوشانہ حالت
میں بڑبڑانے لگا۔۔۔۔۔ کیا کہا سلونی؟۔۔۔۔۔۔ ابھی تم نے کیا کہا؟
وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ سلونی اس کو نہایت
ہی حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

ظاہر و باطن کا مالک۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ ان ساری باتوں
کو جانتا ہے جو ہمارے ذہن میں چھپی ہوئی ہیں۔۔۔۔۔ وہ انتقام
لے سکتا ہے۔۔۔۔۔۔۔

مغیلان تھوڑی دیر تک پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس کو گھورتا
رہا اور اس کے بعد بے تابی کے ساتھ کہنے لگا ٹھیک ہے سلونی!
ٹھیک ہے وہی حاکم اعلیٰ ہے اسی کی طاقت باطن پر نگرانی رکھ سکتی
ہے۔ تم نے بہت بڑا انکشاف کیا ہے "سلونی" دستور کی تاریخ میں
ایک قابل قدر اضافہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میں اپنا مقدمہ اسی کے سامنے
پیش کروں گا وہی سچا فیصلہ کرنیوالا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ میں اس کے
پاس جاؤنگا "سلونی" تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔۔۔۔
مجھے معاف کر دو، مجھے خود نہیں معلوم میں نے یہ سب کچھ کس لئے کیا؟
اچھا تم جا سکتی ہو ——

"سلونی" سسکیاں بھرتی ہوئی خاموشی کیساتھ اس کے
کمرے سے نکل گئی۔

دوسرے دن ایک عجیب اطلاع شہر میں گشت لگا رہی تھی اخبار
بیچنے والے لڑکے چلا رہے تھے۔

"مغیلان سونو" کا مکان جل گیا!
مملکت کا سرکاری وکیل اچانک غائب ہو گیا!
شہر کے تمام لوگ مغیلان کے مکان کی طرف دوڑنے لگے!

سارا مکان جل چکا تھا۔ اس کی عظیم الشان قانونی
لائبریری جل کر سیاہ ہو چکی تھی۔ مشہور مقننوں کے قیمتی مجسمے پگھل کر
مسخ ہو گئے تھے۔ ان کے بھیانک چہرے شیطانی بھتنوں کی طرح ڈراؤنے
ہو گئے تھے۔ بہت ساری جلی ہوئی قانون کی موٹی موٹی کتابیں
بکھری پڑی تھیں۔ یہ سارا جلا ہوا منظر ایسا معلوم ہو رہا تھا۔
جیسے وہ انسان کی قانون سازی اور اسکے مصنوعی اقتدار کی ہنسی اڑا رہا ہے

(بشکریہ ماہنامہ معیار)

اسعد گیلانی

تھکی ہوئی روحیں

اکتاہٹ

وہ تھک گیا تھا۔ موجودہ تہذیب نے جس بیدردی سے انسانیت کی معصومیت کو غیر فطری قوانین فیشن، اصطلاحات تصنعات اور ظاہر پرستی میں جکڑ رکھا تھا وہ اس سے تھک گیا تھا ہر روز شام کے وقت وہ سیر و تفریح کے لئے نکلتا تاکہ گنجان شہر کے ڈربوں جیسے کمروں کی غلیظ ہوا سے تھوڑی دیر کے لئے چھٹکارا پا سکے۔ اور اس کے تھکے ہوئے پھیپھڑے خنک اور تازہ ہوا سے شگفتگی حاصل کر سکیں۔ بارونق بازاروں سے ہٹ کر غیر آباد گلیوں اور سڑکوں پر گھومنا وہ زیادہ پسند کرتا اس لئے کہ موجودہ جنسی ارزانی نے اس کے اخلاقی معیار کو صدمہ پہنچانے کی بجائے بلند کر دیا تھا۔ تیتریوں کی طرح بازاروں میں اڑتی پھرنے والی لڑکیوں سے بدظن ہو کر گویا وہ اپنے آپ کو ان سے زیادہ بہتر زیادہ اعلےٰ اور زیادہ مہذب اور فطرت کے قریب سمجھتا تھا۔

باغوں اور تفریح گاہوں کے بیباک نظارے بعض وقت اسے مجبور کر دیتے تھے کہ وہ مجرد رہنے کا قطعی فیصلہ کرے ایک چھوٹے سے کمرے کو اپنے واحد تصرف میں پاکر وہ بڑا اطمینان محسوس کرتا تھا کتنی مسرت کی بات تھی کہ وہ ایک حصہ کو مقفل کر کے اس کی چابی جیب میں لئے جہاں چاہے پھر سکتا تھا اور کوئی اس سے اس لاپروائی کے متعلق جواب طلبی کرنے والا نہ تھا۔ زندگی کا یہ رخ اس کے لئے بڑا ہی دلآویز تھا کہ وہ آپ اپنا مالک تھا اس کی عادات خود اس کی اپنی عادات تھیں۔ اس نے کبھی کسی کو خاص رنگ کی شیروانی یا خاص وضع کی ٹوپی پہنے ہوئے دیکھ کر ویسی ہی پہننے کی کوشش نہ کی تھی اس کا فیشن خود اس کی اپنی پسند تھی اور پھر اسے تو فیشن کے نام سے ہی چڑ تھی۔ یہی فیشن تو تھا جس نے ان ضروریات کا پاتال سے لیکر عرش معلےٰ تک ڈھیر لگا دیا تھا ج
نے پیٹ بھر کر کھا سکنے اور جسم کو چھپانے کی حد تک لباس پہ
والوں کو بھی بے اطمینانی میں مبتلا کر دیا تھا جس نے صنف نا
کو یہ بھلا دیا تھا کہ اس کے کچھ انسانی فرائض بھی ہیں اور ا
صرف یہی سکھایا تھا کہ حیوانیت کو مشتعل تیز تر اور آسودہ کر
کے کون سے ذرائع ہیں جس نے مرد کی زندگی کے سکون
ایک طوفان رنگ و بو پیدا کر دیا تھا جو اسے اس کی مرکزیت
بھی دور اڑائے لئے جا رہا تھا وہ جانتا تھا کہ یہ طوفان رنگ
انسانی زندگی کی اخلاقیات کے لئے کس قدر ہلاکت کا باعث
اور یہ کہ ابن آدم اپنی خلافت کے اس دور میں تھا جب وہ شہ
سنان سے گزر کر طاؤس و رباب پر آ گیا تھا۔ اور یہی طاؤس
و رباب تھا جو خدائی مخلوقات میں اس کے وقار کی قبر پر آ
اینٹ بننے والا تھا

یہ احساس اسے اتنا چوکنا رکھتا تھا کہ وہ شہر کے ا
حصوں سے کتراتا اور تفریح گاہوں سے بچ کر نکل جاتا کھلی
اور سنسان سڑکیں اس کے لئے سکون اور راحت کی
اس کے تلخ تجربات کچھ کم نہ تھے۔ سیر و تفریح کرنے والی ا
ماڈرن لڑکی کس طرح بے حیائی کے ہتھیار لگائے سڑکو
پھرتی ہے۔ اس کے قریب سے گزرتی ہوئی لڑکیوں کی
باتیں۔ ان کے اس کے قریب بلا ارادہ گرتے ہوئے رومال
کھنکھناتی ہوئی ہنسی میں چست کئے ہوئے فقرے، شو
دعوت نظارہ دیتے ہوئے ریشمی نقاب اور بے وجہ مسکرا
قریب سے گزرتے ہوئے اس کے جسم سے چھوتے ہوئے

روں کے دامن اور وہ اپنی کمزوری سے خوب واقف تھا ۔ وہ
تا تھا کہ ایسی صورتوں میں اس کے دل کی دھڑکن بڑھ جایا کرتی
اس کے جسم میں لرزہ آجایا کرتا ہے اور ایک کپکپاہٹ اس کی
ں میں بجلی سی بن کر کوند جایا کرتی ہے ۔ ایک تھرتھری سی اسکے
گٹوں سے سرگوشیاں کرکے انھیں بیدار کردیا کرتی ہے اور وہ
وس کرلیا کرتا ہے کہ خطرہ نزدیک ہے ۔ اسی لئے ایسے خطروں
ے وہ ہمیشہ دور ہی رہنے کی کوشش کرتا ... معطر دامنوں کی
شبوئیں وہ جانتا تھا کہ قسم قسم کے عشق مرکب کی گھلی ملی ہوئی
ہے ۔ ایک ایک رومال کتنی کتنی بار گرا کرتا ہے ۔ آنکھیں بار بار مسکرایا
رتی ہیں اور لب بار بار کھلا کرتے ہیں ۔ "مہذب طوائفیں" اس
نے اپنے دل ہی دل میں ان کے لئے ایک لفظ وضع کر رکھا تھا ۔ وہ
ن ناگنوں سے ہمیشہ دور رہا ۔ ان کے بے باک قہقہوں نے
اسے ہوٹلوں سے بھی بدظن کردیا تھا ۔ اس نے ندیم سے صاف
کہدیا تھا کہ "ان ہوٹلوں میں بھی ایک نسائی تعفن انسان کا دماغ
پراگندہ کردیتا ہے ۔ ہوٹلوں میں مردوں کے آمنے سامنے بیٹھ کر
آئس کریم ، فروٹ سلاد اور دوسری چیزیں لپڑ سپڑ کھاتی ہوئی
لڑکیوں سے اسے انتہائی نفرت تھی ۔ وہ کہا کرتا تھا کہ مردوں کی
سی وضع قطع اور طور طریق کو ترقی یا آزادی قرار دے کر عورت نے
اپنے وقار ، رعنائی اور دلکشی کو ایک ناقابلِ برداشت صدمہ
پہنچایا ہے جس کی تلافی وہ کئی نسلوں تک نہ کرسکے گی ۔

سرگوشیاں

قانون کی وہ بوجھل کتابیں جن کے مسلسل مطالعے نے حامد
کو چڑچڑا بنا دیا تھا آخر ایک دن پوری کامیابی کے ساتھ اس کی
گردن پر سے اتار دی گئیں جس مقصد کے لئے وہ اپنے چھوٹے
سے قصبے کو چھوڑ کر اس بڑے شہر میں اپنے غریب باپ پر بوجھ
بنا ہوا پڑا تھا ۔ وہ مقصد بھی پورا ہوگیا ۔ امتحان میں کامیابی
نے اس کے دماغ کو دھندلے دھندلے خوابوں سے بھر دیا ۔ ایسے
خواب جو ایک غیر واضح مقصد کے ساتھ اس کے دل و دماغ پر
سکون اور راحت کی بارش کرتے رہتے ۔ اس کی کامیاب واپسی
نے اس کے والدین کے دلوں کو ایک بڑے بوجھ سے ہلکا کردیا
آس پاس کے ان گھرانوں میں میٹھی میٹھی سرگوشیاں ہونے لگیں
جہاں جوان رشتے موجود تھے ۔ لیکن حامد کو اگر کسی چیز سے دلچسپی
تھی تو وہ اس کا مستقبل تھا اس کا بوڑھا باپ چاہتا تھا کہ اپنی زندگی
میں ہی اسے سوسائٹی کے ایک معزز فرد کی حیثیت سے دیکھے
اور اس کی ماں تو اس کے آگے پیچھے اپنی آنکھیں بچھاتی تھی ۔ کئی
لڑکیوں کے نام اس کے کانوں میں پھونکے گئے لیکن اس نے
صاف انکار کردیا ۔

بحثیں

رضیہ اس کا دماغ کھا جاتی ۔ آزادیٔ نسواں ، ترقیٔ نسواں
حقوقِ نسواں کی تکرار سن سن کر وہ چڑ گیا تھا ۔ آخر ان الفاظ کا بےحیائی
اور فحاشی کی تائید کے سوا اور کیا مفہوم تھا ۔ رضیہ کی باتوں سے
وہ تھک جاتا "نہ معلوم تمہیں یہ خبط کہاں سے ہوگیا ہے" ۔ وہ تھک
کر اپنی چھوٹی بہن سے کہتا ۔ لیکن رضیہ کی نسوانی زبان دن بدن
ترقی کررہی تھی ۔ وہ اور بھی بڑھ بڑھ کر اسے قائل کرنے کی کوشش
کرتی ۔

"آخر مجھے بھی تو پتہ چلے بھیا کہ مردوں میں وہ کون سے
سرخاب کے پر لگ گئے ہیں جو انکے دماغ کو عرش سے فرش پر
نہیں آنے دیتے اور وہ دنیا کی نصف آبادی کو زندگی کی ترقی یافتہ
قدروں سے جبراً محروم رکھنا چاہتے ہیں ۔"

"رجو ۔ میں تم پر اپنے خیالات کا اظہار کرچکا ہوں ۔ عورتوں
کی ترقی اور آزادی مردانہ پن نہیں ہے جو وہ سمجھ بیٹھی ہیں ۔
عورت اپنی معراج اگر مرد بن جانا سمجھتی ہے تو بخدا اس نے
اپنی فطرت کی انتہائی توہین کی ہے ۔ اس کا کام تو یہ ہے کہ وہ
زندگی کی دشواریوں کو اپنی ہمت افزائی سے سہل تر کرے
نہ کہ خود ہی ان میں الجھ کر زندگی کو پریشان تر بنا دے ۔ ترشے
ہوئے بال ، پالش شدہ نوکیلے ناخن ، بھڑکیلے اور ریشمی

دسات، لپ اسٹک اور اسنو کی شیشیاں پوڈر کے ڈبے اور
فرداں ہی تو اس کی زندگی کا واحد مقصد نہ ہونا چاہیے۔ یہ تو فروعات
ہیں یہ چیزیں تو عورت کی زندگی کو گھن کیطرح کھائے جارہی ہیں اور عورت چونکہ قوم
کی ماں ہوتی ہے اس لئے اس کے ساتھ قوم کا مستقبل بھی بہت
مشتبہ نظر آتا ہے

"لیکن بھیا کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ ان کو یہ چیزیں
سکھائیں کس نے؟ یہ تو مردوں کا اپنا ذوق اور اخلاق ہے جس کی
جھلک وہ عورتوں میں دیکھتے ہیں۔ دیوتا جس رنگ سے خوش ہوتے
ہیں۔ داسیاں اسی رنگ میں رنگ جاتی ہیں

اور یوں رضیہ حامد کو تھکا دیتی اس بیچارے کا اپنا تو کوئی نظریہ ہی نہ تھا اور وہ کسی
خاص اصول کا مدعی تھا اسے تو صرف اس لئے اس جنس سے چڑ سی
معلوم ہوتی کہ اسے تصنعات سے نفرت تھی اور یہی تصنع تھا جسے
وہ سوسائٹی کا گھن سمجھتا تھا اس کا خیال تھا کہ سادگی اور خلوص
ہی انسانیت کے وہ فضائل ہیں جو انسان کو دنیا کے لئے امن
کا علمبردار بنا سکتے ہیں لیکن رضیہ کی باتیں تو اسکے دکھ کا علاج سوچنے
کی بجائے اسے اور بے اطمینانی سے بھر دیتیں۔ وہ اس کی صاف گوئی
سے متاثر ہوتا اور اس کے نظریات سے غیر مطمئن رہتا لیکن کبھی کبھی
تو اس کی تشخیص اس کے دل میں اتر جاتی، وہ کہتی "اگر انسان اجتماعی
طور پر دونوں جنسوں کا پورے خلوص ہمدردی اور غائر نظر سے مطالعہ
کرے تو یہ حقیقت چھپی نہیں رہ سکتی کہ دل دونوں کے زخمی ہیں۔ اور
دماغ دونوں کے پریشان ہیں۔ ان زخموں اور ذہنی الجھنوں کا یکطرفہ
احساس دونوں کو ایک دوسرے سے بدظن کئے دیتا ہے۔ پھر یا تو بدظنی
کا جواب ایک تصنع آمیز خوش خلقی سے دیا جاتا ہے جس کے مظاہرے
آپ تفریح گاہوں پارکوں اور ہوٹلوں میں دیکھ چکے ہیں اور یا یہ
بدظنی، نفرت اور بے معنی عداوت کا رنگ اختیار کر لیتی ہے جس کا
نمونہ آپ خود ہیں" ——— رضیہ کہتی چلی جاتی ——— "اور
بھائی جان اس کا علاج میں تو یہی سمجھتی ہوں کہ مرد اور عورت ایک دوسرے
کو پھسلانے کی کوشش کرنے کی بجائے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش
کریں۔ پورے خلوص سے وہ فطرت کے دو بچوں کی طرح ایک دوسرے
سے ملیں۔ پوری پاکیزگی سے ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کر
سکیں۔ اور پوری فراخدلی کے ساتھ ایک دوسرے کو اپنا دوست
سمجھیں نہ کہ اپنا شکار۔ غلط فہمیاں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب
دونوں مخالف جنسیں ایک دوسرے سے حریفانہ اور صیادانہ ملنے
کی کوشش کرتی ہیں۔ اپنے اپنے دام اور جال پھیلائے ہوئے۔ نتیجہ
دو طرفہ بدظنی اور بے اعتمادی ہوتا ہے جو درمیان کی خلیج کو بڑھاتا ہی
چلا جاتا ہے۔ عورت چاہتی ہے کہ مرد صرف اس کے غازہ پوڈر اور رنگ
تک ہی رہ جائے لیکن اس کا دل نہ دیکھنے پائے کہ کہیں اس میں
چھپا ہوا چور اسے نظر نہ آ جائے اور مرد چاہتا ہے کہ عورت صرف اس
کی ظاہری چال ڈھال ہی پر نگاہ رکھے اور اس کے باطن کا بت خانہ
دیکھنے نہ پائے ——— بھائی جان ——— وہ درد بھری
آنکھوں سے حامد کی طرف دیکھتے ہوئے کہتی ——— دونوں کو اس
اعتماد اور خلوص کی ضرورت ہے۔ ورنہ یہ بے اعتمادی اور بدظنی
نسل انسانی کو بہت جلد دنیا سے ختم کر دیگی۔ آپ کا انجمن خواتین
پاکستان کے متعلق کیا خیال ہے۔ میں کہتی ہوں یہ تحریک عورتوں
میں شعور اور مردوں میں فراخدلی پیدا کرنے کی جدوجہد کر رہی۔
اور عورتوں کو قوم کے لئے مفید تر بنانے کے لئے مفید کوشش
کر رہی ہے۔

میں اس انجمن کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ اتنا جانتا ہوں
اس نے مختلف شہروں میں مینا بازاروں کے ذریعہ سے عورت
کی عزت و وقار کو بازار کی جنس بنانے کی مہم شروع کر رکھی ہے" وہ
چڑ کر کہتا۔

"ہو سکتا ہے کہ اس تحریک میں چند گندی مچھلیاں بھی ہوں
لیکن وہ انجمن کا مزاج نہیں بگاڑ سکتیں"

"اول تو تالاب گندہ کرنے کے لئے چند نہیں ایک ہی گندی
مچھلی کافی ہوتی ہے پھر اگر وہ محض چند ہی ہوں تو کوئی مضائقہ
نہیں۔ لیکن یہاں تو اس کی ساری تاریخ ہی غلاظت نامہ ہے" حامد کہ
"میری یہ رائے نہیں ہے دراصل آپ کے ذہنی تعصب نے گھر۔
باہر کوئی کام کرنے والی ہر عورت کو مشتبہ بنا رکھا ہے میں سمجھتی

عورت کو ناگزیر حالات کے لئے تیار رہنا چاہیئے - ورنہ میں خانہ ویرانی کی قائل نہیں ہوں "

" تمھارے خیال اور عالم واقعات میں بہت فرق ہے نتائج تو عمل کرنے سے برآمد ہوتے ہیں - خیال کے ماتحت نہیں ہوتے تمھارے قائل نہ ہونے کے باوجود اگر عورت بیرونی کاموں کا کچھ حصہ اپنے ذمے لے گی تو خانہ ویرانی لازمی ہے ——————

—— ایک بہتر گھر کے اندرونی اور بیرونی معاملات کی اگر ذمہ دارانہ تقسیم کرلی جائے تو گھر کے لئے سکھ چین کے زیادہ مواقع مہیا ہو سکتے ہیں. بہ نسبت اس کے کہ بیوی چند دن کے لئے دفتر چلی جایا کرے اور شوہر گھر میں کھانا پکائے یا پھر چند دن کے لئے شوہر گھر میں جھاڑو دے لیا کرے اور بیوی خرید و فروخت کا کام انجام دے کام کی یہ تقسیم یقیناً گھر کے امن کا توازن قائم نہ رہنے دیگی - اور غیر متوازن سوسائٹی کا تم کیا تصور رکھتی ہو " حامد کہتا -

موہوم انتظار

ان بحثوں کے باوجود حامد اپنی چھوٹی بہن کے مطالعے کو احترام سے دیکھنے لگا تھا - اگرچہ بعض اوقات وہ اس کی گفتگو سے تنگ آ جاتا وہ کوئی ہمخیال اور ہمدرد چاہتا تھا نہ کہ نقاد ، اُسے فلسفۂ حیات یا فلسفۂ عمل سے کوئی دلچسپی نہ تھی - دلچسپی تھی تو کسی ایسے شخص کے وجود سے جو اس کی باتوں کو بھی عقیدت کے کانوں سے سن سکے رضیہ سے تو وہ ایک حد تک گریز کرنے لگا تھا - وہ خواہ مخواہ اسے زندگی کے مختلف پہلوؤں میں لئے لئے بھٹکاتی رہتی - اسے تو صرف اپنے معاملہ سے دلچسپی اور اپنے درد کی کسک یاد تھی - وہ بیزار تھا کہ اسکے چھوٹے سے قصبہ میں لڑکیاں مروجہ فیشن پر الف سے ی تک عمل پیرا تھیں - اس کے لئے یہ حقیقت ایک تلخ سبق تھا کہ حوا نے آدم کا ساتھ چھوڑ کر شیطان کی پیروی شروع کردی تھی - اس کی جبین کسی بلند آستانہ پر سجدہ کرنا چاہتی تھی ایسا آستاں جو اپنی جگہ پر پوری خودداری ، وقار اور اخلاقی بلندی کا حامل ہو - چھچھوری لڑکیوں کے لئے جن کی افراط تھی - اس کے پاس ہتک آمیز الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا - تھوڑے ہی دنوں میں قصبہ کی لڑکیوں میں سے اس کا تذکرہ بھی خشک اور سڑی ہونے کی وجہ سے ختم ہوگیا - رضیہ کی باتوں میں اس کے لئے لایعنی طولانیاں تھیں اور قوم وملت کی اہم ضرورتوں کے قصے تھے یہ ایک ناقابل عمل فلسفہ ..... تھا - نہ معلوم کیسی کیسی معاشرتی اصلاحات - کے خواب وہ دیکھا کرتی تھی - قصبہ کی لڑکیوں میں وہ بھی کچھ ایسی مقبول نہ تھی - اب اس کے سامنے اس کے سوا اور کوئی راہ نہ تھی کہ وہ قریبی شہر میں جاکر اپنی پریکٹس شروع کردے -

شہر کے ایک مشہور وکیل کے ساتھ اس نے ایک نوآموز کی حیثیت سے کام شروع کردیا - شام کو دفتر سے واپسی پر لڑکیوں کی ٹولیاں اس کے پاس سے خوش گپیاں اور چہلیں کرتی ہوئی گزر جایا کرتیں - تیز ہوا میں اڑتی ہوئی ساڑیاں اور پھڑپھڑاتے ہوئے غرارے ، مائل بہ پرواز کالی کالی لٹیں اور چوٹیاں اور پھر وہ خون آلود ہونٹ - کراہت سے منہ پھیر کر وہ گزرتا چلا جاتا - نسائیت کی لطافت کو "مہذب تربیت" نے کس بری طرح مسخ کردیا تھا - آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورنے والی لڑکیاں - پناہ بخدا - اس کا دماغ چکرا جایا کرتا - وہ ایک ایسی شریک زندگی کی طرف سے قطعی مایوس ہو رہا تھا جسے وہ ایک باوقار لڑکی کہہ سکے - سڑک پر نظریں سامنے خلا میں جمائے وہ یوں گزرا کرتا جیسے ادھر ادھر بڑے بڑے غار ہوں جو اسے بے رحمی سے اپنی طرف کھینچ لیں گے اس ایک ہی سڑک پر اس کی آمد و رفت اور نستعلیق چال نے آس پاس کے رہنے والوں کے لئے اس کی شخصیت کو ایک خاص وضع کی حامل بنا دیا تھا وہ ایک ایسا شریف اور خاموش نوجوان سمجھا جانے لگا تھا جس کی خاموشی ہی اسے معزز بنا دیتی ہے -

آمد بہار

تانک جھانک سے بلند سامنے کی طرف دیکھتی ہوئی اسکی آنکھوں کو شبہ سا ہوا کہ روزانہ کوئی سفید سا سایہ اس کے قریب سے اسی جیسی چال اور ماحول سے غیر دلچسپی کے ساتھ گزرنے لگا

ہر ادر شب کے اس تواتر نے یقین کی صورت اختیار کرنی شروع کر دی۔ سفید سا نسوانی سایہ اپنی خصوصیت کے لحاظ سے اسے اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ خصوصیت جو تہذیب و تمدن کے اس دور میں نسوانی دنیا میں اس کے لئے مفقود ہو رہی تھی۔ پھر وہ ایک اضطرابی کیفیت کے ساتھ چلتے چلتے آنکھیں چرا کر دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک اچھے سے قد و قامت کی لڑکی معمولی لٹھے کی سفید شلوار قمیص اور ایک ہلکے سے گھونگھٹ والے دوپٹے میں ملبوس اس کے قریب سے گزر رہی تھی۔ اس کے چہرے کی سنجیدگی اور چال کی متانت اسے شرمندہ کئے بغیر نہ رہی۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ اپنی اس حرکت پر شرما گیا۔ پھر ایک مردہ سی مسرت نے اس کے دل سے ایک بے معنی سی سرگوشی کی۔ سفید کشادہ پیشانی کے نیچے متین گھنے ابرو اور پوری سنجیدگی اور وقار کے ساتھ سامنے خلا میں جھانکتی ہوئی آنکھیں ماحول کے گھٹیا پن سے بلندی کا اعلان کر رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں ایک خود اعتمادی اور خودداری غنودگی کی سی کیفیت میں نظر آ رہی تھی۔ اس کے بھینچے ہوئے ہونٹ اس کی مستقل مزاجی اور عزم کے گواہ تھے۔ آنکھوں کے خفیف سے سیاہی مائل حلقے صاف ظاہر کر رہے تھے کہ وہ اپنی زندگی کے تمام فرائض اپنے ہی کاندھوں پر لادے ہوئے ہے۔ اسے احساس ہوا کہ ایسی لڑکی کا وجود باعث فخر ہونا چاہیئے جو زندگی کے نشیب و فراز کے ساتھ پروقار پاکیزگی اور باعظمت استقلال کے نبھا رہی تھی۔ روزانہ وہ سایہ اس کے قریب سے گزرتا رہا اور روزانہ وہ سایہ اس کے دل پر ایک پرمسرت اضطراب اور ایک بے چین خمار کی سی کیفیت طاری کرتا رہا۔ اسے احساس ہونے لگا تھا کہ اس کی بیقراریوں کی پناہ گاہ اس سے اتنی ہی قریب ہے جتنا اس کا اپنا دل۔ آہستہ آہستہ بالکل آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے بات چیت کئے بغیر۔ ایک دوسرے کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے بغیر وہ نزدیک تر ہوتے چلے گئے

"میں، میں آپ کا نام دریافت کر سکتا ہوں" ایک دن اس نے لڑکھڑاتی ہوئی سی جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

ایک سرد نگاہ اور پیشانی کی طنزیہ شکنوں کے ساتھ آگے نکل گئی۔ وہ جھینپ کر رہ گیا۔ عورت کے متعلق اس کے نظریئے ایک مجسم صورت میں اس کے سامنے تھے۔ خاموش، ذفار، خوددار، پاکباز اور باحیا۔

کئی دن تک وہ پھر ایسی جرأت نہ کر سکا جب تک کہ تیور پھر اسے نرم اور شگفتہ نظر نہ آنے لگے۔

"میں۔ معاف فرمایئے گا میں محض ایک دوست سے آپکے ساتھ گفتگو کر سکتا ہوں" اس نے پھر ایک دن کی ——————

"جی! کہیئے" مختصر اور شیریں سا جواب تھا۔ وہ پھول اور اسکے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میرا آپ سے یوں گفتگو کرنے صرف یہ ہے کہ　　میرا مطلب　　مجھے امید۔ آپ میری یوں سر راہ گستاخی قابلِ عفو قرار دینگی"۔

اس نے لڑکھڑاتے ہوئے کہا

لڑکی خاموشی سے چلتی رہی

"میں کیا آپ کا نام دریافت کر سکتا ہوں" سنبھل کر پوچھا۔

"زہرہ" لڑکی نے اس کی طرف دیکھے بغیر سر گھورتے ہوئے کہا۔

شہروں میں مینا بازار و ... محض ایک شریف دو طرح آپ ... کو بازار کی جنس ... چاہتا تھا" اس نے پھر کہا

"جی" اس نے جواب دیا۔

"کیا آپ ابھی تعلیم حاصل کر رہی ہیں؟" حامد

"جی نہیں"

تو پھر کیا آپ بیکار ہی رہتی رہیں؟" حامد کو سوجھ سکی لڑکی اس نے بڑے بے تکے انداز میں کہہ دیا۔

جی نہیں۔ معاش اور بے کاری کی دشمنی ہے غریب لڑکی ہوں۔ اپنی بیوہ ماں کے ساتھ رہتی ہوں خواتین کے دفتر میں ملازم ہوں"۔

"اوہ آپ ملازمت کرتی ہیں" حامد نے درد آمیز لہجہ
[میں] کہا۔
"جی اس میں تعجب کی کونسی بات ہے" لڑکی نے
[...] کے ساتھ کہا۔ دل ہی دل میں حامد اس سے مرعوب سا
[ہو] گیا۔
سامنے ہوٹل آگیا۔ حامد نے کہا "آیئے تھوڑی سی چائے
[پی] لیں اور اطمینان سے باتیں بھی کر سکیں گے"
"معاف فرمائیے گا میں ہوٹلوں کی قائل نہیں" اور
آگے بڑھ گئی۔ حامد محجوب سا ہو کر کھڑا رہ گیا۔ دوسرے دن
[پ]ھر ویسے ہی ملے۔ حامد نے معافی چاہی۔
"کوئی بات نہیں۔ لوگ غلط اندازوں کی وجہ سے بہت
[سی] غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں" زہرہ نے کہا
حامد شرم سے پانی پانی ہو گیا
"خاتون بخدا آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔ میں نے ایک مخلص
[دوس]ت کی حیثیت سے آپ سے ربط ضبط پیدا کرنا چاہا
[...] واقعہ یہ ہے کہ میں اس شہر میں اجنبی ہوں۔ مہذب
[کہلا]نے والی سوسائٹی سے مجھے نفرت سی ہے۔ اس لئے
[کہ ت]ہذیب کے پردے میں بدتہذیبی کا کھیل کھیلا جاتا ہے
[تصن]ع، بناوٹ اور ظاہر [...] ایک بڑے طبقے کے دماغوں کو
[...]ی خلوص اور سادگی سے [...] کے کانوں سے آپ سے
[...]ہوں یہ تکلیف دہ تنہائی اور لوگوں [...]" تھا۔ وہ خواہ [...] ہی
[...] نے مجھے آپ سے گفتگو کرنے پر مجبور کر دیا [...] اس لئے کہ
[آ]پ میں فیشن کی وہ تباہ کاریاں نظر نہ آئیں جنہوں نے ان
[...] عورتوں کی ہر فطری صفت لوٹ لی ہے۔ اگر میرے طرز عمل
[سے آ]پ کو صدمہ پہنچا ہو تو میں تہ دل سے معافی چاہتا ہوں" یوں حا[مد]
[ا]س سے باتیں کرتا رہا۔
اور پھر یہ ایک روزمرہ کی بات ہو کر رہ گئی

[اند]یشہ ہائے دور و دراز

زہرہ نے اسے بتایا کہ
موجودہ دور میں لڑکیوں کی یہ خالی خولی فیشن پرستی والدین کی ناقص
تربیت کا نتیجہ ہے اور یہ کہ جنس کے متعلق نوجوانوں کی گھناونی اور
کردہ ذہنیت سے تو اُسے اُبکائی آتی ہے۔ اپنے قدموں پر مضبوطی
سے کھڑا رہنا اور زندگی کے حوادث کا دلیرانہ مقابلہ کرنا ہی وہ عورتوں
کی ترقی سمجھتی تھی۔ اگر اس حیثیت سے عورتیں پیچھے ہیں تو ان کی معنوی
حیثیت ایک بکری اور بھیڑ سے بھی کم ہے جو اپنے طور پر چپہ اگا ہوا
میں جا کر چر بھی نہیں سکتیں۔ اپنی غریب بیوہ ماں کے ساتھ رہ کر باغوں،
ہوٹلوں یا سینماؤں کا طواف کرنے کی بجائے وہ اپنے وجود کو محنت
پر زیادہ آمادہ پاتی تھی۔ حامد اتنی ملاقاتوں کے باوجود زہرہ میں
بے تکلفی کی گرمی اور شوخی نہ پیدا کر سکا۔ حامد جیسے شخص کے لئے زہرہ
کا یہ طرز عمل انتہائی تعریف کا مستحق تھا۔ اپنے دوستوں میں اس بات
کا اعلان وہ پوری شدت سے کر چکا تھا کہ جلد کھل جانے والی لڑکیوں
کی اخلاقی بنیادیں کمزور ہوتی ہیں اور اس حیثیت سے زہرہ اپنی
شدید اور سنگین سرد مہری کے ساتھ حامد کی نظروں میں بہت بلند
درجہ رکھتی تھی۔
دو ایک بار وہ زہرہ کے گھر بھی گیا اور اس کی بوڑھی ماں سے
بھی ملا۔ اس کی ماں جس خوش خلقی سے پیش آئی وہ حامد کے لئے
انتہائی مسرت اور خوشی کا باعث ہوئی۔ اس کی گھٹی گھٹی زندگی
اس کے خوابوں کی دنیا میں ایک کچی کلی کی طرح جھوم رہی تھی جیسے
اب نسیم کے خوشگوار جھونکوں نے اپنی گود میں جھلانا شروع کر دیا تھا
اپنی متاہلانہ زندگی کے آسمان میں جس ستارے پر وہ ٹکٹکی لگائے
ہوئے تھا وہ اس کی آرزوؤں کے باغ میں زہرہ کی شکل میں نمودار
ہو کر ایک پھول کی مانند جھوم رہا تھا۔
حامد کے والدین یہ سن کر کہ وہ ان کی آرزوئیں پوری کرنے
پر تیار تھا، خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ زہرہ کو دیکھنے کے لئے
رضیہ بھی اپنی ماں کے ساتھ آئی۔ بوڑھے اور جوان الگ الگ کمروں
میں خوش گپیاں کرتے رہے۔ اس دن زہرہ نے اپنے دفتر سے
چھٹی لے لی تھی اور حامد کے لئے تو وہ روز عید تھا جب اسکی ماں
منگنی کی تمام رسومات ادا کر کے شادی کی تیاریوں کے لئے رضیہ

کے ساتھ واپس گھر جا رہی تھی سٹیشن جانے کے لئے ماں اور رضیہ
کو تانگے میں بٹھا کر حامد پھر ٹوپی لینے کے بہانے واپس زہرہ کے
کمرے میں گیا جو اطمینان سے بیٹھی ایک میز پوش کاڑھ رہی تھی۔
"اف زہرہ میں کتنا خوش قسمت ہوں" حامد نے جو مسرت
سے بوکھلا یا تھا اچانک اس کا ہاتھ تھام کر کہا
"حامد صاحب آپ اتنے بوکھلائے ہوئے کیوں ہیں رضیہ
آپ کا انتظار کر رہی ہوگی" زہرہ نے ایک خشک اور برفیلے لہجہ میں
کہا۔ حامد کی مسرت پر جیسے کسی نے برف کا بڑا سا ڈلا رکھ دیا لیکن
اسے فوراً ہی اپنی چھچھوری جلد بازی کا احساس ہوا۔ اور یہ سوچ کر کہ
زہرہ ایک با اصول لڑکی ہے دل ہی دل میں شرمندہ ہو کر کمرے
سے باہر آگیا
"بھائی جان" گھر پہنچ کر رضیہ نے حامد سے کہا "آپ برا
نہ مانئے گا۔ ایک بات کہوں؟"
"احمق کہیں کی تمہیں بھی تکلفات سوجھتے ہیں"۔ حامد نے
مسرت سے کہا
"زہرہ آپ کے لئے موزوں نہیں ہے" اور حامد دھک سے
رہ گیا۔ وہ آب حیات جو اس نے عمر بھر میں قطرہ قطرہ جمع کیا تھا
کوئی کہہ رہا تھا کہ اس میں زہر ملا ہوا ہے۔ یہ جملہ کنکھجورے کی طرح
اس کے دماغ پر چمٹ گیا۔ اس نے بے بسی سے رضیہ کی طرف
سوالیہ نظروں سے دیکھا لیکن رضیہ نے پرواہ نہ کرتے ہوئے کہا
"اس کی آنکھوں میں ایک تجربہ کارانہ سختی اور درشتی ہے جو مجھے بڑی
ناگوار محسوس ہوئی۔ بخدا آپ برا نہ منائیں۔ وہ تو مجھے عجیب سی لڑکی
معلوم ہوئی۔ بس یوں جیسے برف کی ایک قاش۔ خون کو جما دینے
والی سردی اور سختی لئے ہوئے۔ ممکن ہے یہ میرا وہم ہو۔ لیکن پھر بھی
یہ میری اپنی رائے ہے۔ اس میں وہ ہمدردی اور خلوص کا وہ جذبہ
نظر نہیں آتا جو انسان کے لئے زندگی میں ازبس ضروری ہوتا ہے
میری اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ بری ہے یا وہ کوئی خطرناک شخصیت
ہے لیکن اگر میرے دل سے پوچھیے تو میں یہی کہوں گی کہ میرا احساس
اسے ایک جونک کی شکل میں دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک
ایسی گرسنگی ہے جو معمولی آمدنی کے شخص کے لئے باعث راحت
نہیں ہو سکتی۔" حامد ایک سوچ میں پڑ گیا۔ لیکن پھر جلد ہی اس کا
ذہن ان شکوک سے صاف ہو گیا۔
"رضیہ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ ایک شریف
لڑکی ہے۔ اگر اس کی خاموشی اور بے زبانی کو تم کسی دوسری سمت
میں لے جاؤ تو تمہارا ظلم ہوگا۔ ابھی ایک فراخ اور کشادہ زندگی
اس نے قدم ہی کب رکھا ہے"
آخر وہ دن آ ہی گیا جس کا رضیہ کے سوا سب کو انتظار
"خدا میرے بھائی کی زندگی کو کامیاب کرے" رضیہ
آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔
"ہمیں اپنے مالک سے بہتری کی امیدیں ہیں" حامد
بوجھل آواز میں کہا۔
"رضیہ بہن میری سہیلیوں کے آرام کا خیال رکھنا"
یاقوتی انگوٹھی انگلی میں پھراتے ہوئے کہا۔

جن پہ تکیہ تھا

زندگی کی تمام جمع کردہ مسرتوں کے ساتھ حامد ز
کمرے میں داخل ہوا وہ ایک بیر بہوٹی کی طرح کرسی پر بیٹھی
دیکھ رہی تھی۔ حامد کی آمد کے باوجود کتاب اس کی آنکھوں
سامنے رہی ایک ناخوشگوار سا احساس حامد کے دل سے
اور پھر وہ مسکراتا ہوا اس کے قریب جا کھڑا ہوا
"زہرہ مجھے کتاب سے رقابت پیدا ہو رہی ہے"
کہا ـــــــ
"دیکھیے لالٹین تو ٹپک رہی ہے۔ میز پوش کا ستیا
ہو گیا ہے" جواب ملا۔
وہ پتھر کی ایک مورتی کی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔
"زہرہ" حامد نے بہت گہری آواز میں کہا۔
"دیکھیے مردانے میں لوگ کس طرح شور مچا رہے ہیں
کوئی انسانیت ہے" گویا اجنتا کے غار کی کوئی تصویر بول

"وہ ہماری مسرتوں میں شرکت کا اظہار کر رہے ہیں" حامد نے بھٹکے ہوئے جذباتی انداز میں کہا اور اٹھ کر اس کے قریب آ گیا کپڑے میں الجھ کر لالٹین فرش پر اوندھی ہو گئی۔

"آپ اس قدر بدحواس کیوں ہو رہے ہیں۔ دیکھئے فرش خراب ہو جائے گا" زہرہ نے اکتاہٹ سے کہا

سنگ مرمر کے ایک بت کیطرح وہ کرسی پر پڑی تھی

حامد خاموش رہا اور کرسی کے عقب سے اس کے کندھوں پر جھک کر اس پر بوجھ ڈال دیا۔

"اُف کتنی شدید حیوانیت ہے" زہرہ نے مردنی سے کہا اور وہ ایک لاش کی سی مردنی اور افسردگی کے ساتھ کرسی پر پڑی تھی۔ اس کے دل و دماغ کی سردی نے اسے ایک ممی بنا دیا تھا۔

"شدید حیوانیت" الفاظ حامد کے دل میں ایک برف کی سلاخ کی طرح گھس گئے۔ اسے جیسے کسی نے اعصاب شل کر دینے والا ٹیکہ لگا دیا تھا۔ زہرہ کی تمام سردمہریاں اور مردنیاں خشکی اور بے معنی کج آمیزی برف کے ایک پہاڑ کی طرح اس کے اور زہرہ کے درمیان کھڑی ہو گئیں۔ اس کی اکتاہٹ اس کی بے اعتنائی، اس کی خشکی اور سردی ایک بامعنی عبارت بنکر اسکے سامنے آ گئیں۔ مختلف شبہات حامد کی رگ رگ میں برف کی طرح پگھل پگھل کر داخل ہو رہے تھے۔ سردی اور مردنی اس کی زندگی کی دو ناقابلِ فراموش حقیقتیں بنکر رہ گئی تھیں اور پر مسرت زندگی کے خوشگوار خواب منجمد ہو ہو کر کسی گلیشر کی طرح منزل یاس کی طرف بہے چلے جا رہے تھے۔ اسے احساس ہوا کہ جیسے اس کے خوابوں کے گلیشر میں سے بہہ کر ایک برف کی بڑی بھاری سِل اس کے سارے وجود معنوی پر آ پڑی تھی جو اس کے روئیں روئیں کو سن کئے دیتی تھی اور اس سردی سے اس کے بازو اس کا سینہ اور اس کا سارا وجود اکڑا جا رہا تھا اور پھر وہ چپکے سے آ کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

راکھ ہی راکھ

بھائی کی اداس نظریں اور پژمردہ چہرہ رضیہ سے پوشیدہ نہ تھا۔ اس نے زہرہ کا گہرا مطالعہ کیا تھا زہرہ کے جسم میں جس شخصیت کی جھلک اس نے دیکھی تھی وہ ایک جونک سے بہت مشابہ تھی جو دوسرے کا خون تو پینا جانتی ہے۔ لیکن اس کے اپنے جسم میں خلوص کی گرمی نہیں بلکہ خودغرضی اور مکاری کی سردی اور بے اعتنائی ہوتی ہے لیکن وہ مجبور تھی۔ اب اس کا بھائی تنقید سے گزر کر رحم کی حدود میں داخل ہو گیا تھا۔ وہ ایسے معاشرے میں زندہ تھے جہاں نکاح بھی مشکل تھا اور طلاق بھی مشکل تھی۔ اگر آسان تھی تو بے عدلی اور بے انصافی۔ اس لئے وہ زیادہ تر یا تو خاموش رہتی یا اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتی۔ وہ خود ایک ایسے زخم کو سینہ سے لگائے ہوئے تھی جس کی خبر اس کے سوا شاید کسی کو نہ تھی۔ اکرم اس کے چچازاد بھائی کے الفاظ جو شاید اسے سب سے زیادہ عزیز تھا اسے ابتک یاد تھے جو اس نے ایک بار کہے تھے کہ "عورت تو مرد کے پاؤں کی جوتی ہے۔ اگر ایک موزوں یا دل پسند نہ ہو تو بڑی آسانی سے دوسری پہنی جا سکتی ہے" شاید ایسے الفاظ وہ کسی دوسرے کی زبان سے سنتی تو بُرا نہ مناتی۔ لیکن اکرم کے الفاظ اس کے سینے میں بھالے کی طرح گڑ گئے تھے۔ نہ معلوم کیوں وہ خواہ مخواہ اس سے بعض ایسی توقعات رکھتی تھی جو اسے دوسروں سے نہ تھیں۔ اکرم نے تھوڑے ہی دنوں بعد اپنے الفاظ کو ثابت کر دیا تھا اور بیچاری رضیہ کی زندگی کا ایک خاص حصہ اس کے اس قول کا تختہ مشق بن کر رہ گیا تھا۔

حسرت و یاس کے گہرے جذبات نے حامد کی زندگی پر آلام کا ایک خول چڑھا دیا تھا جس خول میں لپٹا لپٹا یا وہ زندگی کی تمام تر بے کیفیوں کے ساتھ بڑی مردہ دلی سے نبھا رہا تھا وہ وقت اس کی زندگی میں سے نوچ کر نکال لیا گیا تھا جب وہ زندگی کے لئے رنگینیوں اور پھولوں کے خواب دیکھتا تھا جب ازدواجی زندگی کے خواب اسے ایک پر مسرت جھولے میں جھلایا

تے تھے اور کیف و سرخوشی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اسے اپنی طرف
ھتے ہوئے محسوس ہوا کرتے تھے۔ اب زندگی کی حقیقت اس
منے ایک مسلسل توجہ تھی۔ جس کا نہ کوئی انجام اسے نظر آتا تھا
آغاز کی اسے خبر رہ گئی تھی پر تصنع سوسائٹی کے پیچ در پیچ
ناضوں نے اسے آہستہ آہستہ ایک ریشمی جال میں جکڑ لیا تھا
ن کی نرم لیکن مضبوط گرفت میں وہ پوری بے بسی کے ساتھ جئے جارہا
تا چھوٹے سے شہر کے چھوٹے چھوٹے مقدمات میں الجھا ہوا وہ
ری مستعدی سے اپنے ان فرائض کو ادا کیے جاتا جو حالات اور
حول نے اس کے گلے میں زنجیر کی ایک نہ ختم ہونے والی لڑی کی
رح ڈال دیتے تھے۔ آٹھ نو ہزار روپے کی سالانہ آمدنی ایک معقول
مدنی تھی۔ لیکن وہ دیکھ رہا تھا کہ کس طرح زہرہ اس کے آبائی مکان
ی کہنگی سے اکتائی ہوئی ایک نئے شاندار مکان کے خاکے بنا
ہی تھی۔ یہ ذرا بھی محسوس کئے بغیر کہ حامد کی روح کو اس نے
روند دیا تھا۔ زہرہ اس سے نئے نئے مطالبات کیا کرتی۔

"دیکھئے حامد صاحب یہ نقشہ دیکھیے۔ یہ میں نے سیمنٹ
مارکیٹنگ کمپنی سے تیار کروایا ہے۔ کتنا عمدہ مکان بن سکتا ہے
اس پرانے جھونپڑے سے تو میں اکتا گئی ہوں"

"دیکھئے اس کے سامنے باغیچہ لگوانے کے لئے میں نے
ڈائنا سیڈز کمپنی کا کیٹالاگ منگوایا ہے۔ دیکھئے یہ پھلواری
کیسی رہے گی"

حامد کی سوختہ روح کے پاس اتنی ہمت ہی نہ تھی کہ نہیں
کے لئے بحث کرسکے اور مردہ دل میں وہ شگفتگی ہی نہ تھی کہ دلائل
آسکتے۔ زہرہ کی طرف نظر بھر کر دیکھے بھی اسے ایک عرصہ ہوگیا
تھا۔ زہرہ کی بھوکی نظر میں وہ جھونپڑہ اب خار کی طرح کھٹک
رہا تھا جسے حامد کے بوڑھے والدین ان کے حوالے کرکے قبر میں
جا سوئے تھے۔ بوڑھا باپ اپنے عزیز بیٹے کو سوسائٹی کا معزز
فرد دیکھ کر ہی اس دنیا سے رخصت ہوا تھا لیکن شاید وہ یہ
نہ جانتا تھا کہ اس کا عزیز بیٹا سوسائٹی کا ایک معزز فرد تو ضرور
تھا لیکن وہ اس اعزاز اور زندگی کے اس سنہری جوئے کو
کتنا دل گرفتہ تھا۔ وہ بہت کچھ وہ کرتا تھا جو دل سے نہ چاہتا
تھا ــــــ

زہرہ کو ایک شاندار بنگلے کی ضرورت تھی۔ چند تقاضوں
حامد کی انتھک کوششوں اور محنتوں کے بعد وہ بھی بن گیا۔
بنگلہ کی آراستگی کے لئے مختلف فرنشنگ کمپنیوں سے معاہدے
طے کئے گئے۔ اگرچہ قرض کی ایک چھوٹی سی دیوار میں حامد گھٹنوں
تک چن دیا گیا۔ پھر پھلواری بھی لگ گئی۔ ان چھوٹے چھوٹے
پودوں سے زہرہ کو حامد سے کہیں زیادہ محبت تھی۔ حامد کے
افسردہ چہرے پر اس نے کبھی غور کرنے کی زحمت بھی گوارا نہ
کی تھی۔ لیکن پودے کی ایک پتی بھی مرجھا کر اسے تشویش میں
ڈال دیتی۔ ننھا سا ایک پھول بھی زہرہ کو گھنٹوں فکر میں رکھتا
کہ اسے کیسے زیادہ سے زیادہ شگفتہ رکھا جائے تاکہ وہ اپنی
سہیلیوں کو اس کی شگفتگی دکھا سکے۔ نئے مکان کی خوشی
میں زہرہ نے اپنی سہیلیوں کو ایک بڑی دعوت دی اور میز
کے ایک سرے پر میزبان کی حیثیت سے بیٹھ کر اس نے
انتہائی مسرت حاصل کی تھی۔ اسے اس بات کا ذرا بھی احساس
نہ تھا کہ حامد کئی دن سے مضمحل سا نظر آرہا تھا۔ جب اس کی سہیلیوں
اور سوسائٹی کی معزز خواتین نے اس کے نئے مکان اس کی
پھلواری اس کی صفائی اور اس کے سلیقہ کی تعریف کی تو
وہ خوشی سے پھولی نہ سمائی اور اپنے بالوں میں لگے ہوئے پھول
کی پتیوں کو نرمی سے چھو کر بڑی متانت سے تن کر بیٹھ گئی۔ گویا
مشرقی بادشاہ اپنی کلغی درست کرتے ہوئے خوشامدی دربار
کے درمیان اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ جلوہ فرما تھے
جب کہ حامد دوسرے دروازے سے داخل ہوکر ان سب
یوں محو نشاط دیکھ کر چلا جاتا اپنے کمرے میں کپڑے بدلنے کی
کوشش کر رہا تھا۔

بیگم خان اور بیگم قریشی کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک چھ
سی کار کی بھی ضرورت تھی۔ کار کے بغیر وہ اونچے طبقہ میں کس
سر اونچا کرکے گھل مل سکتی تھی۔ پارٹیوں اور دعوتوں میں مانگے

دقیانوسی سواری پر جانا کھلی ہوئی توہین نہیں تو اور کیا تھی کاروں کی بھر بزانہ گھر رگھر رمیں تانگے کی فرہادانہ ٹک ٹک اسکے لئے انتہائی احساس کمتری کا باعث ہوتی تھی اور پھر بنگلے کی شان کو برقرار رکھنے کے لئے اس گیرج کا آباد ہونا بھی ضروری تھا جو اس نے خاص طور پر پہلے ہی بنوا لیا تھا۔

" حامد صاحب کسی پیشہ کو کامیاب بنانے کے لئے زیادہ سے زیادہ سرمایہ لگانا ضروری ہوتا ہے اور پھر وکالت جیسے پیشہ کے لئے تو ایک معزز طرز بود و باش کی ضرورت ہے۔ معزز اور مہذب لوگوں میں نشست و برخاست کے لئے کار کا ہونا بھی ضروری ہے" زہرہ نے ایک دن کہا۔

نفرت نے حامد کے دل کو بھڑوں کا چھتہ بنا دیا تھا جس میں ہر وقت سینکڑوں ڈنک چبھتے رہتے اور پریشان خیالات اس کے دل میں بھنبھناتے رہتے۔ لیکن اس کی بڑھی ہوئی نفرت کٹ مٹ کا دامن تھامے ہوئے تھی جس میں دشمنی سے کسی کا پیچھا کرنے کی بجائے پیچھا چھڑانے کی تمنا ہوتی ہے۔ حامد کا دل زہرہ کے متعلق کچھ ایسے جذبات کا حامل تھا جن کی نوعیت عجیب سی تھی۔ ازدواجی ناکامی کا نوحہ کرنے کی بجائے وہ اس ناکامی کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا تھا۔ ایک یاس آمیز برفانی کیفیت نے اس کے دل و دماغ کو بے حسی اور بددلی کے تلے کچل دیا تھا۔ جیسے اس کے جسم کی ساری حرارت اس کی ہڈیوں میں گھس کر اس کا گودا کھا گئی تھی بے حسی اور بددلی کے انبار کے نیچے سے نکلنے کا اُسے خواب میں بھی کبھی خیال نہ آیا تھا۔ زندگی کے ایک خاص مشینی ڈھب نے اسے اپنا لیا تھا اور وہ اس ڈھب سے غیر ارادی طور پر نبھائے جا رہا تھا۔ اس کی نفرت اور کراہت بلکہ بے غرض سی لاپروائی اور غیر دلچسپی اسے اتنی اجازت بھی نہ دیتی تھی کہ زہرہ کے مطالبات کو رد کر کے اسے زیادہ سے زیادہ تقاضا کرنے، باتیں کرنے اور دماغ کھانے کا موقعہ دے سکے۔ اپنے وجود کے بے معنی پن کے احساس نے اسے ہر اندرونی اور بیرونی دلچسپی سے ہٹا کر صرف معاش کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ ایک ہوٹل میں زندگی بسر کر رہا ہے جہاں کی کوئی چیز بھی اس کے ذوق کے مطابق ہونا ضروری نہیں سمجھی گئی تھی۔

پھر کار بھی آ گئی۔ قرضہ کی دیوار میں حامد کو تک چن دیا گیا آئے دن معززین کو دعوتیں دیتی ہوئی پروقار زہرہ، آئے دن مینا بازاروں کے انتظامات میں مشغول شہرت پسند زہرہ۔ آئے دن نئی نئی فرمائشیں کرتی ہوئی خرانچ زہرہ، آئے دن بہتر سے بہتر انداز سے سوسائٹی میں اپنی ناک کو اونچا کرنے کی کوشش کرتی ہوئی پُر رعونت زہرہ حامد کی ویران راہِ حیات پر پتھر کوٹنے والے انجن کی طرح چلی جا رہی تھی جس کے آہنی دباؤ کے نیچے حامد کی تمام آرزوئیں اور تمنائیں سنگریزوں کی طرح کچلی جا رہی تھیں اور اس کی تمام آمدنی بھی اس کی ناک کو سوسائٹی میں زیادہ سے زیادہ اونچا کرنے میں ناکام ہوئی جاتی تھی۔ ایک سنگدل خودغرضی، ایک بے زبانی بےبسی، ایک سنگین جمود اور ایک ظالم بے اختیاری کے نیچے دبا ہوا وہ صرف یہی خدمت انجام دے رہا تھا کہ ایک شہ نشین کی سی فرماں برداری کے ساتھ وہ دیوی کے قدموں کے نیچے پڑا اسے اور بھی بلند کر کے اس کی ناک سماج میں سب سے بلند کرنے میں مدد ہو سکے

آگ لگ گئی

اور پھر اخبارات سنسنی خیز خبروں سے بھر گئے۔ جنگ کے موہوم خطرے حقیقت بن کر اس کے ملک کی سرحدوں پر آ بیٹھے۔ مشرق میں آگ لگ گئی۔ دھوئیں اور آگ اور گرد و غبار کے ستون آسمان اور زمین کے درمیان بلند ہو گئے۔ انسانی زندگی کے سکون اور جمود میں ہل چل مچ گئی۔ عالم حیات کے وسیع سمندر کو گویا کسی نے بلونا شروع کر دیا اور چھوٹے چھوٹے خاندانوں کی تالابی زندگیوں میں بھی ایک کھولاؤ پیدا ہو گیا۔ ایک تند و تیز آواز نے بڑی گہری گہری نیند والوں کو جگا دیا اور انسانی زندگی کا جمود ایک حرکت اور اضطرابیت میں تبدیل ہو گیا۔ حالات حامد کو بھی جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جمودی زندگی کے افسوں سے بیدار کر رہے تھے اور اس کا دماغ بھی دو مخالف رووں میں آہستہ آہستہ منتشر حواس مجتمع کر رہا تھا

پھر ایک رات اس میں وہی بے چینی وہی اضطراب اور وہی بے
[illegible]دی سے گرائی جو کبھی اسکے عالم بیداری کا حصہ تھی۔ اس میں ویرانی
[illegible]ح پھر زندہ ہو رہی تھی۔ اس کا وہ نشہ جو سوسائٹی نے اس کی
[illegible]وں میں بھر دیا تھا اتر رہا تھا اور پھر اس نے کئی سال بعد اپنے
[illegible]ود کو اپنے سے ایک الگ صورت میں دیکھا کتنا مختلف، کتنا الگ
[illegible]و کتنا بدل گیا تھا۔ زندگی نے اسے کتنا کچل دیا تھا۔ اس نے سوچا
[illegible]س کی زندگی کیا تھی۔ گھر سے دفتر۔ دفتر سے گھر۔ اس کی شادی ایک
المیہ تھی جو معاشرے کے اس طبقے میں جس کا وہ فرد تھا ایک عام سی
بات تھی۔ لیکن اس عام سی بات نے ہی اس کی زندگی تباہ کر دی
تھی۔ وہ کس طرح اس کے ساتھ نبھا رہا تھا۔ کام اور بے بسی جب
تک وہ مر نہ جائے۔ سوسائٹی اسے چھوڑنے کے لئے کسی صورت آمادہ
نہ تھی۔ اف اسے احساس ہوا کہ مرنے کے بعد اس کا جسم بھی اگر کسی کے
کام آسکتا تو ظالم دنیا والے اس کی لاش بھی قبر میں سے گھسیٹ کر
لے آتے۔ اس نے اس طویل زندگی میں اپنی بڑی سے بڑی اور حقیر
سے حقیر ایک آرزو بھی کبھی پوری نہ کی تھی۔ وہ اپنے ماضی میں، اپنی
ساری زندگی میں ایک کولہو کا بیل رہا تھا جس کی پیٹھ دوسروں
کے گھروں میں روشنی مہیا کرنے کے لئے زخمی ہو رہی تھی اور اس کا
اپنا اثاثہ ایک بے حسی اور بے خبری کا لامتناہی سلسلہ تھا۔

ایک بے نام گونج

اس کی ساری بے چینیوں کی پناہ گاہ رضیہ تھی وہ اسکے
خیالات سے متفق نہ تھا لیکن اس کے "آزادیٔ نسواں" کی تائید
میں دلائل کا اس کے پاس کوئی توڑ نہ تھا۔ بس اس کا ذوق اور جمال
ہی تھا جو اسے ان دلائل سے غیر مطمئن رکھتا۔ ترقیٔ نسواں کے
نعروں کو وہ بے معنی ڈھونگ سمجھتا لیکن اسے ڈھونگ ثابت کرنے
کے لئے اس کے منہ میں زبان نہ تھی۔ جنگ کے نعرے نے پوری قوم
کی رگوں میں خون کو گرما دیا اور گلی کوچوں میں نیشنل گارڈ کے دستے
مارچ کرنے لگے جن میں مردوں سے زیادہ عورتوں کی پریڈیں ہوتیں
اس کا دل اس صورتِ حال سے غیر مطمئن تھا لیکن وہ بے دلیل تھا
عورتوں کے پہلے ہی امدادی دستے میں رضیہ پیش پیش تھی" بھائی
یہ ہنگامی حالات ہیں۔ بس اپنا فرض آگے بڑھ ادا کروں گی" یہ کہکر
رضیہ حامد سے جدا ہو چکی تھی۔ اس کے الفاظ کی ہمدردی اب بھی
اس کے کانوں میں گونج جاتی تھی" بھائی شادی سے قبل میں نے
آپ کو روکنے کی کوشش کی تھی لیکن ایک آبشار کو میں اپنے دامن
سے کیسے روک سکتی تھی"۔ حامد کے دماغ میں ایک بے نام سی گونج
پیدا ہو رہی تھی اور اس کا جمود گھول کر اس کی زندگی کے آتش [illegible]
کو لاوے کی صورت میں بہا دینا چاہتا تھا۔ ایک نئے احساس
زندگی نے اس کی روح پر تازہ چرکے لگانا شروع کر دیئے تھے۔
اُف ایسا اس کے ساتھ کبھی نہ ہوا تھا۔ ازدواجی المناکی نے اس
روح کو کھا لیا تھا۔ وہ کبھی اتنا مایوس اتنا رنجیدہ اور اتنا دلگرفتہ
نہ ہوا تھا۔ وہ اس زہر سے اس ڈنک سے بھاگ جانا چاہتا
جس نے اس کی رگوں میں سے انسانی روح کھینچکر مشینی روح
بھر دی تھی۔ کام۔ کام اور کام اور اس کام کا زہر اس کی رگ
میں سرایت کر گیا تھا وہ ایک مسحور کی طرح کام کرتا رہا تھا اس
کام کیا۔ اس میں محنت کی۔ اس میں اپنی پوری قوت صرف کی
اور جب تک وہ اس زہر کو سمجھ سکتا وہ اسے اپنا غلام بنا چکا
وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں کامیاب تھا اور اسی کامیابی
اس کے چاروں طرف قیدخانہ تعمیر کر دیا تھا اور وہ خاموشی
داری اور پوری بزدلی کے ساتھ اس کے سامنے جھک گیا
ایک شخص اپنا لائحہ عمل بناتا ہے اور پھر وہ اسی لائحہ عمل
بن جاتا ہے۔ وہ عوام کی ایک مشین بن جاتا ہے جس سے
کام نکالتے ہیں۔ وہ تجارت اور خودغرضی کی مشین کا ایک
ہو جاتا ہے اور سوسائٹی بھوکے بھیڑیوں کے غول کی طرح
تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی جب تک اس کی ہڈیوں پر
کی ایک بوٹی بھی ہوتی ہے۔

ایک جھرجھری لے کر وہ بیدار ہو رہا تھا اس
عملیت کی لہریں رہ رہ کر اٹھ رہی تھیں۔ یہ کیا مشغولیت
نے اس کی رگوں میں دوڑنے والا زندہ خون بھی جما دیا تھا ز

ں دیکھ کر اس کے جسم میں ایک سرد تھرتھری ایک بے معنی
دوڑ جاتا۔ اسے اعصابی اختلاج سا محسوس ہوتا۔ اور اب وہ
ی سردی اس کی زمہریری عادات، اس کی برفانی سنجیدگی اور
ں کی روح کو جماد بنے والی خاموشی سے دور بھاگ جانا چاہتا
تنی دور جہاں زہرہ کی ہوا بھی اس تک نہ پہنچ سکے۔

وٹ گیا

اور پھر اس نے اپنے کمیشن ملنے کی خبر زہرہ کو اس وقت
ب وہ ٹریننگ کے لئے جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ شاید
بار زہرہ نے اپنی زندگی میں ایک دھچکا محسوس کیا ایک ایسا
جو شکاری کو اس وقت لگ سکتا ہے جب اس کے ہاتھوں
سے شکار بڑی صفائی کے ساتھ نکل جائے۔

"تو آپ مجھے کس کے سہارے چھوڑ جائیں گے" زہرہ نے
دں میں مشغول حامد سے کہا۔

"بیگم میرے وجود سے سہارے کا مضحکہ خیز خیال تمہیں کیسے
۔ یہ تو نہ کبھی کسی گنتی میں تھا اور نہ ہے۔ رہا روپیہ کا سہارا
مداد کے ساتھ کسی صورت کام چلاؤ۔ ٹریننگ کے بعد میں
عدہ تمہیں بھیجتا رہوں گا۔" حامد نے اس کی طرف دیکھے
کہا۔

"لیکن اس سے کیسے گزارہ ہوگا۔ ٹینس کورٹ جو بن رہا
س کا بھی کافی خرچ ہوگا۔ انشورنس کمپنی کے بل بھی ادا کرنے
نے ہیں۔ گلنار کلب کی ممبری ہے۔ آپ آخر ایسی غیر ذمہ دارا
ت کیسے کر رہے ہیں۔ شرفا میں وقار رکھنے کے لئے آخر اس
دلی آمدنی سے کیا ہوگا۔" زہرہ نے کہا۔

"سنو زہرہ" آخر حامد کا بند ٹوٹ گیا "بخدا تم ہی اپنے
ہر کی پوری صفائی کے ساتھ کہو کہ اس تمام عرصے میں جب سے
ری شادی ہوئی ہے تم نے کبھی کبھی اپنے فرائض محسوس کئے
ں یا صرف اپنے حقوق کی طویل فہرست ہی تمھارے سامنے
ہی ہے کبھی تم نے بھی میرے جذبات میرے احساسات، میرے
آرام و آسائش کا احساس کیا ہے؟ زہرہ اگر تم نے اس تمام عرصے
میں میرے دل کو دیکھنے کی کوشش کی ہوتی تو تمہیں معلوم ہوتا
کہ اس سینے میں کتنے زخم ہیں جنھیں عمر بھر ہمدردی کا پھایہ میسر
نہ آسکا۔ میں نے اپنی زندگی کو خود اپنے ہاتھوں تباہ کیا اور اس
کی تباہی کا تماشہ خاموشی سے دیکھتا رہا۔ میں نے خود اپنے آپ
کو آگ لگا دی اور اس کے شعلوں میں اپنی روح کو جھلستا رہا
میں نے اپنی گزشتہ زندگی کا ہر سانس، اپنی محنت کا ہر ثانیہ،
اپنے پسینے کا ہر قطرہ اپنا سب کچھ تم پر نثار کر دیا۔ لیکن کیا تم نے
ہمدردی کا ایک لفظ بھی کہا؟ کیا ایک لمحہ کے لئے بھی محسوس کیا
کہ تم میری بیوی ہو کبھی زندگی کا ایک سانس بھی تم نے میرے
دکھ یا سکھ معلوم کرنے کے لئے صرف کیا؟ زہرہ گزشتہ
ساری زندگی میں میں نے ایک مسحور شخص کی طرح تمہاری خدمت
کی ہے۔ تمہاری ہر آرزو پوری کی ہے۔ تمھاری ناک کو اونچا کرنے کے
لئے اپنا خون پسینہ ایک کیا ہے۔ لیکن تم نے پوری بیدردی سے
مجھے اچھے اوقات میں سے خارج رکھا۔ تمھاری توجہ میرے سوا ہر چیز
پر مرکوز رہی۔ تمہاری سردی، تمھاری بے اعتنائی۔ تمہاری زمہریریت
نے میری رگوں کو مفلوج کر دیا تھا۔ اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں
میں اپنی زندگی کو یوں ایک خود غرض اور مکار عورت کی بھینٹ نہ
چڑھاؤں گا۔ مجھے تم ہرگز نہیں روک سکتیں۔ میدان جنگ میں
سنسناتی ہوئی گولیوں کی سرگوشیوں میں میرے لئے تمہارے الفاظ
سے زیادہ شیرینی ہوگی ——— تمہارا شوہر میں نہیں تمہاری
ناک ہے۔"

حامد اضطراب میں کہتا چلا گیا۔ زہرہ خاموشی سے سنتی رہی
"آپ پر بھی آپ کی بہن کا سایہ پڑ گیا ہے۔ لیکن یاد رکھئے
میں آپ کی قانونی بیوی ہوں اور میرا مہر ایک لاکھ روپیہ ہے"
اور یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

"اونہہ قانون کی دھمکی دیتی ہے ——— ظالم عورت"
حامد بڑبڑایا۔

مختلف ذرائع سے روکنے کے باوجود حامد نہ رکا جب وہ

اسٹیشن پر گیا تو اسے رخصت کرنے کے لئے کوئی بھی موجود نہ تھا۔
اس کی تمام گزشتہ زندگی تالاب کی سی تھی۔ جس میں اس کی طرح
کو جیسے آبی مینڈوے نے اپنے جال میں جکڑ کر پانی کی تہہ میں بٹھا
دیا تھا اور اب ——— زمین اور آسمان کی وسعتیں اسے
اپنی ایک جست کے سامنے سرنگوں نظر آتی تھیں۔ خوشی سے وہ
پھولا نہیں سما رہا تھا۔ جیسے ایک قیدی ایک طویل عرصے کے بعد
جیل سے رہا ہوکر ایک وسیع دنیا میں آتا ہے۔

پرواز

ٹریننگ کے چھ ماہ میں گویا اسکے خون کا قطرہ قطرہ کھولایا
اور چھانا گیا۔ اس کے جسم کے ایک ایک مسام میں سے اس کی گزشتہ
زندگی کا جمود خارج کیا گیا۔ دن رات کی پریڈیں مارچ۔ پی۔ ٹی
اونچی اور لمبی چھلانگیں۔ باقاعدگی اور تنظیم کی زندہ تصویریں۔ ڈ
مارچ کرتے ہوئے دستے۔ زندگی ایک حرکت، ایک اضطراب، ایک
سیمابیت اور ایک رقص بے ہنگام ہو کر رہ گئی جنگل وار فیر کا مضمون
اس کے لئے سب سے زیادہ دشوار تھا۔ لیکن وہ تو آنکھوں کی سوئیاں
تھیں۔ ایک دن مسٹر حامد کو لفٹیننٹ۔ حامد بنا کر شاہی پاکستانی توپخانے
میں بھیج دیا گیا۔

آخر اس کا رسالہ بھی تراڑ خیل کے محاذ کیلئے منتخب ہوا ....
..... اسے محسوس ہوا جیسے وہ اس انسانی بارود کا جو انقلاب
زمانہ کی توپ میں بھرا جا رہا تھا ایک بے بس ذرہ تھا۔ اس کے سینے میں
مجاہدانہ ولولہ تھا لیکن مجاہدانہ شب و روز نہ تھے اس محاذ پر جنگ کی شدت
تھی اور ان کا رسالہ خندقوں میں پڑا ان جانے ان دیکھے دشمنوں پر گولہ
باری کر رہا تھا۔ بارش اور گرمی نے خندقوں میں اس کے لئے کھولتا
ہوا کیچڑ مہیا کر رکھا تھا۔ کئی دنوں کی مسلسل جنگ نے اسے اور
اسکے سارے دستے کو نیم مردہ اور نیم وحشی بنا دیا تھا۔ کیچڑ میں لت
پت کپڑے۔ پانی اور کیچڑ میں پڑی ہوئی کٹیں سوکھے اور سیلے
بسکٹ اور سگرٹوں کے ٹکڑے۔ ٹخنوں پر چڑھائے ہوئے بھاری
بھرکم بوٹ اور بڑھی ہوئی ڈاڑھیاں۔ دستے کے سپاہیوں میں گولہ

آمیز اضطراب کی دوڑتی ہوئی لہر اور حامد کا پریشان دماغ۔ خند
کے کیچڑ میں سنا ہوا حامد ان اذیت ناک لمحات میں بھی دنیا کے کسی معطر گو
تصور اپنے ذہن میں نہ رکھتا تھا۔ ایک طرف زہرہ کی سردی او
اعتنائی کا احساس اور دوسری طرف ادائے فرض کا جذبہ خند
کے کیچڑ میں بھی اسے اپنی موجودہ حالت پر قانع کر دیتا تھا۔ وہ زند
کے اندھیرے گہرے اور ساکن کنوئیں سے نکلا تھا اور اب ایک بھ
میں آ پڑا تھا۔ اس کی کشتی حیات کو پانی کا دھیما اور مترنم دھارا کبھ
میسر نہ آسکا تھا۔ زندگی کا نور، نرمی اور خوشبو اس کی قسمت سے
خارج تھے۔ اف اب تک وہ ایک حیوان کی طرح دنیا میں رہا تھا جس
نے دنیا کوئی بھی معطر اور منور گوشہ نہیں رکھتی اس کا دل ایک ج
ہوئے کوئلہ کی طرح اس کے سینہ میں بے چین ہو رہا تھا۔ ایسا بجھا
کوئلہ جس کے سینے میں ایک چھوٹی سی چنگاری ہر وقت اسے بھڑکا
کے لئے موجود رہتی ہو۔ زہرہ کے کبھی کبھی آنے والے خطوط اس کے
خشکی اور کاروباری ذہنیت کا انتشار لاتے جس سے اسے نفرت
رضیہ کے متعلق وہ اتنا ہی جانتا تھا کہ وہ زنانہ امدادی دستوں
اسی محاذ پر کسی جگہ موجود تھی ——— رضیہ کا تصور اب
اس کے دل کی گھٹن بن گیا تھا۔

گزشتہ شب بارانی شبخون کے بعد جبکہ حامد کا سارا د
صبح کے وقت دھیمی دھیمی دھوپ میں اپنی سیلی ہوئی وردیاں اور را
خشک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گولیوں کی بے پناہ بوچھاڑ
دشمن کے طیاروں کی دھائیں دھائیں نے انھیں اپنا نشانہ بنالیا
نے بڑی چالاکی اور تیزی سے انھیں اپنی زد میں لے لیا تھا۔
شور و غل چیخ و پکار اور دھواں دھار میں انسانی لاشے لڑھک
تھے۔ اس چھوٹی سی قیامت کا شکار ہونے والے فنا کے اس ط
میں بقا کی جستجو میں ادھر ادھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ کیچڑ اور
سے لبریز خندقوں میں پناہ نہ رہی تھی۔ گولیوں کی باڑ نے بیسیوں
غریبوں کو بے مانگی شہادت عطا کر دی تھی۔ اس تباہی اور
اس ہلاکت اور موت کی فراوانی نے محاذ کے اس چھوٹے سے
کا صفایا کر دیا تھا۔ کمانڈنگ مر گیا تھا۔ میڈیکل آفیسر خود موت

یں آگیا تھا اور حامد ایک مردہ صوبیدار کی لاش کی پناہ میں
ں پڑا تھا۔ وہ صوبیدار زندگی میں اس کا دوست رہا تھا
دار دوست مر کر بھی اسے دشمن کی گولیوں سے بچا رہا تھا۔
ہسپتال میں جب اس کی آنکھیں کھلیں تو جسم پر بندھی ہوئی
نے اسے اطمینان دلایا کہ وہ اب خندقوں کی محبوس اور غیر
زندگی سے نکل کر محفوظ اور پر امن جگہ میں آگیا تھا۔ صفائی
ی اور ہلکی پھلکی مستعد آوازوں نے اسے زندگی کا احساس
اسے محسوس ہوا کہ موت اسکے قریب سے گزر کر بہت دور نکل
ب وہ پھر زندگی کو اپنا رفیق بنا سکتا تھا۔

ردوام

سوسائٹی میں عورت کے جس تصنع آمیز استعمال سے حامد کو
علمی کے دنوں میں نفرت تھی اس کا وجود ہسپتال میں بھی اسے
ت سے محسوس ہوا اور اس کی وہ نفرت پھر عود کر آئی وہ اس فضا
ب گ جانا چاہتا تھا جہاں ایک کرائے کی عورت مکروہ مسکراہٹ
چہرے پر لئے اس کا بستر صاف کرنے کے لئے اسکے کمرے میں
تھی۔ وہ تن درست ہوا تو اسے محاذ سے پیچھے محکمۂ رسد میں بھیج
یا۔

فوجی زندگی کا لہو بھرا پہلو اس نے دیکھ ہی لیا تھا۔ اب
ون بھرا پہلو بھی اس کے سامنے تھا۔ اپنے دفتر میں کام کرنے
لڑکیوں کو وہ روز دیکھتا تھا۔ ان کی بات چیت انکی دلچسپیاں
کردار۔ ان کی تاجرانہ مسکراہٹیں انھیں دیکھ دیکھ کر اسے رضیہ
کرتی اور اس کا دل ڈوبنے لگتا وہ کہا کرتا کہ کاش رضیہ ان سے
ف ہو۔ وہ یقین رکھتا کہ رضیہ ان سے ضرور مختلف تھی اس کی
تو بڑی خوددار اور بلند اخلاق تھی۔ ان کے کیمپ کے نزدیک
زنانہ امدادی دستوں کا کیمپ تھا اور وہ دن شاید حامد کی
گی کا ایک نرالا سا خوشگوار دن تھا۔ جب ایک فوجی ٹرک اور
ایمبولنس کار ایک جھٹکہ کے ساتھ مخالف سمتوں سے آنے
ے ایک بھدی اور کھردری سڑک پر رکے اور حامد اور رضیہ
ڈرائیوروں کی سیٹوں پر سے اچھل کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے
اس کی عزیز بہن فوجی لباس میں اس کے سامنے تھی۔ امتیازی
خدمات کا خوب صورت بیج اس کے سینہ پر لگا ہوا تھا اور دو
چمکتے ہوئے استار اس کے شانوں پر جگمگا رہے تھے۔ طویل جدائی کے
بعد اس ملاقات نے دونوں کی آنکھوں سے چشمے بہا دیئے ایک خاندان
کی دو آوارہ نشانیاں اپنے گھر سے سینکڑوں میل دور گلے مل رہی
تھیں۔ حامد کے چہرے پر پریشانیوں اور بیماریوں کے آثار رضیہ
کے سامنے تھے۔ اس دن رضیہ نے اپنے کیمپ میں بھائی کے
اعزاز میں ایک شاندار پارٹی دی۔

رضیہ کو پا کر حامد نے جہاں اجنبیت اور بیگانگی کے ایک غبار
کو اپنے چاروں طرف سے چھٹتے ہوئے محسوس کیا وہیں ایک بے کلی اس کے
سینے میں در آئی۔ اس نے اپنے دل سے پوچھا "حامد کیا تو قدامت پسند
ہے"۔ لیکن اس کے دل نے کہا "نہیں، بلکہ تو انسان ہے"۔ فوجی وردی میں
یوں مردوں کی طرح رضیہ کو دیکھ کر اس کے سینے میں ایک پھانس
سی اٹک گئی پسینے کے چند منفعل قطرے تھے جو اسکی پیشانی سے لڑھک
کر سیدھے اس کے دل پر گرے تھے۔ اس نے فوجی زندگی کے
شب و روز دیکھے تھے ان شب و روز میں رضیہ کا تصور بھی اس
کی حمیت کو زخمی کر دینے والا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ قدامت
پسند نہ ہونے کے باوجود بھی رضیہ کو اس ماحول میں پا کر خوش نہ تھا
ناگفتہ اندیشوں نے اس کے دل میں ایک غبار بھر دیا تھا۔ اسی شب
رضیہ کے ہاں اس کی پارٹی تھی۔

پارٹی میں حامد کے روبرو بیٹھی ہوئی لڑکی سروری سے
جب رضیہ نے اس کا تعارف کرایا تو حامد نے اپنی پریشانیوں
کے مخلوط غبار میں ایک نکھار سا محسوس کیا اور "مجھے آپ سے
مل کر مسرت ہوئی" کا رسمی جملہ کہنے کی بجائے وہ کچھ بوکھلا سا گیا
سروری نے ایک دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ چائے کی پیالی
اپنی طرف سرکالی۔

"حامد صاحب پھر تو آپکے جنگی تجربات ہمارے لئے
بڑی ہی دلچسپی کا باعث ہوں گے" سروری نے حامد کی طرف

دیکھے بغیر کہا۔

اور حامد جیسے چونک پڑا۔ پیالی تھرتھرا کر طشتری میں رکھ دی گئی۔

"اوہ آپ کے مراقبے میں خلل ڈالنے کی معافی چاہتی ہوں"۔ سروری نے کہا۔ اور ایک دبا دبا سا قہقہہ میز کے چاروں طرف گونج گیا۔ حامد نے ایک اضطرابیت اپنے جسم میں محسوس کی خندقوں میں پڑے پڑے گویا اس کی حس کسی چیز کی لطافت کی طرف سے مردہ سی ہو گئی تھی۔ لڑکیوں کے دبے دبے قہقہوں کے درمیان اس کا دل خندقوں میں حملے کے خطرے سے بھی زیادہ کانپ گیا۔ وہ قہقہے گویا اس کے دل کے شل گوشوں پر اضطراب کی بمباری کر رہے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ خطرہ اس کے چاروں طرف تھا۔ اسے زبردستی نور اور موسیقی کے چشموں میں ڈبویا جا رہا تھا۔ اس کے رونگٹے ایک طویل خواب سے بیدار ہو رہے تھے۔ لیکن ایک بے معنی سا اضطراب اسے شراب کی مستی کے ساتھ اس کی تلخی کا احساس بھی دلا رہا تھا۔

"ہمیں امید ہے کہ بھائی جان ہمیں اپنی بہادری کے واقعات سنائیں گے"۔ رضیہ نے کہا اور حامد نے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ بتکلیف وہ خاموشی ٹوٹ سکی۔

پارٹی کے بعد حامد کو وہاں کی فضا میں کچھ دل بستگی سی محسوس ہوئی۔ کم از کم اس نے اپنے آپ کو اس دل بستگی سے کنارہ کشی پر آمادہ نہ پایا۔ رخصت ہوتے وقت رضیہ نے بھائی سے دوسرے دن پھر آنے کا وعدہ لیا۔ پھر سروری سے یہ کہہ کر کہ "انھیں ذرا کیمپ کے گیٹ تک چھوڑ آؤ مجھے ضروری کام ہے" خود واپس چلی گئی۔

"وکالت کرتے کرتے آپ آخر اس سکون ٹھکرا کر اس ہنگامے میں کیوں چلے آئے؟" سروری نے چلتے چلتے پوچھا

"محترمہ سکون تو شاید انسانی زندگی میں ہے ہی نہیں۔ ایک گردش ہوتی ہے جو انسان کے پاؤں میں ایک بے بسی کی زنجیر بن کر پڑی رہتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انسان کو گھسٹنا پڑتا ہے۔ میں اس ہنگامے میں گھر کی رونق تلاش کرنے آیا"

حامد نے سنجیدگی سے کہا

"مجھے تعجب ہے کہ بے بسی کا رونا آپ ایک مرد ہو[کر] روتے ہیں۔ جہاں تک میرا مطالعہ ہے یہ تو محض ہم عورتو[ں] کا ہی حصہ سمجھا جاتا ہے" سروری نے کہا

حامد کے دل پر جیسے کسی نے انگارا رکھ دیا۔ زند[گی] کے گزشتہ سالوں کے زخموں پر سروری کے الفاظ نے [illegible] خراش لگا دی تھی۔

"محترمہ آجکل عورتوں کی بے بسی کی حقیقت تو اتنی ہی ہے کہ وہ ایک زندہ انسان کے گلے میں بندھے ہوئے کسی [illegible] اور بے حس پتھر کی طرح اسے تباہی کی تہ میں بٹھا دیتی ہے۔ اگر آپ برا نہ منائیں تو میں یہ کہنے کو تیار ہوں کہ عورت نے موجودہ نسل انسانی کی بربادی اور ہلاکت میں بہت بڑا [illegible] لیا ہے" حامد نے کہا۔

"غالباً آپ کے ضمیر کا عکس آپ کے سامنے ہے" [illegible] نے اطمینان سے کہا۔

"خاتون آپ کا مطالعہ یکطرفہ ہے"، حامد نے [illegible] کرتے ہوئے کہا۔

"شاید آپ کی طرح اُس نے بھی چپکے سے کہا

"ممکن ہے ہم دونوں کا مطالعہ ناقص ہو"۔ حامد نے غور سے سروری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اطمینان [illegible] انگلی کے گرد یونہی رومال لپیٹتی اس کے ساتھ ساتھ چلی جار[ہی] [illegible] اس کے چہرے کی سنجیدگی میں ایک حزن و ملال تھا جو اس خد و خال میں جیسے سما کر رہ گیا تھا۔ اس کے داہنے ابرو پر کے ساتھ ساتھ ایک لمبا سا کسی پرانے زخم یا خراش کا نشان تھا جو اس کے حزن و ملال میں بامعنی پن پیدا کر رہا تھا۔ اس [illegible] ہوئی آنکھوں اور بھینچے ہوئے ہونٹوں سے ظاہر ہوتا تھا [illegible] بڑی پر سکون ہے لیکن گہرائیوں میں طوفانوں نے ڈیرے رکھے ہیں اور اس کی آواز کا گہراؤ بھی کسی تھکے ہوئے عزم [illegible]

دیتا تھا۔ اس کے الفاظ حامد کو چڑانے تھے اور اس کی شکل وصورت اور اس کا مدہم لہجہ اس کے اضطراب اور ہیجان کو تھپکیاں دے رہے تھے۔

چنگاری سلگ پڑی

وہ رات اس نے ایک عجیب سے یاس انگیز اضطراب میں گزاری۔ کوئی غیر شعوری حس اسے منزل کی قربت کا پتہ دے رہی تھی۔ لیکن وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کی کوئی منزل ہی نہ تھی۔ جہاں وہ اپنی منزل سمجھ کر کبھی رکا تھا وہ اس کے لئے سراب ثابت ہوئی اور اب وہ اپنی منزل سے بھی آگے نکل آیا تھا۔ وہ جس کی زندگی کا لنگر بھنور میں آلوٹا تھا اور وہ اپنے آپ کو مکمل طور پر یاس کی لہروں کے حوالے کر چکا تھا۔ لیکن کوئی جذبہ تھا کہ پھر اسے ابھار رہا تھا "اٹھ اور آنکھیں کھول کر دیکھ منزل اب خود تیری تلاش میں ہے تیری کشتی کے بادبان اب بنات البحر کے لطیف نغمے ہوں گے اور تو زندگی کی بے پایاں مسرتوں میں اپنی کشتی کھیئے گا" لیکن مایوسیاں اس کے دل و دماغ کی مالک ہو چکی تھیں۔ مسرت اور خوشی کا احساس بھی اس کیلئے اجنبی سا تھا۔ اس کی نظریں گھوم پھر کر اس کے خیالات بھٹک بھٹک کر ایک نقطہ پر جمع ہونے کی کوشش کرتے تھے اور وہ انھیں مٹھیاں بھر بھر کر بکھیر دیتا تھا اس کے احساسات ایک سائے کو رنگ وروغن، اور نزاکت و لطافت کا لبادہ اڑھانا چاہتے تھے اور وہ انھیں نوچ نوچ پھینکتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ پھر برفستانوں میں بھٹکتا پھرے اس کے روئیں روئیں میں برفانی تھرتھری کا احساس اب بھی باقی تھا وہ اب ... کسی مرکز سے وابستگی نہ چاہتا تھا۔ مرکز میت نے پہلے ہی اس کی زندگی کو تحت الثریٰ کی بے حس فضا میں ایک عرصے تک مقید رکھا تھا۔ وہ اب کسی قیمت پر بھی مقید ہونے کے لئے تیار نہ تھا لیکن چند خدوخال میں بسا ہوا حزن وملال اسکے ذہن کے گوشوں میں چپکے چپکے داخل ہو رہا تھا۔ حزن وملال سے اسے محبت تھی۔ ہمیشہ رہی تھی۔ لیکن ——— اُف لیکن کے لئے اس کے پاس کوئی وجہ نہ رہ گئی تھی۔ دل کی ہلکی ہلکی دھڑکن کے ساتھ حزن ملال ہم آہنگ ہو رہا تھا۔ یہ ہم آہنگی اس کے لئے کوئی نیا مرکز تلاش کر رہی تھی۔ کوئی ایسا مرکز جس سے اس کا دل آشنا تھا اور دماغ انکار کئے جاتا تھا اور اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی مردہ جوانی کے سائے کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس کی رگوں میں جیسے کسی نے راکھ بھر دی تھی اور وہ راکھ اب ہلکے ہلکے شعلوں کی شکل میں تبدیل ہو رہی تھی۔

سنگ وخشت

دوسرے دن پھر وہ رعنیہ سے ملنے گیا۔ ایک مضطرب سی اس کے جسم میں رعشہ بن کر گھسی جا رہی تھی۔ اسے تعجب ہو رہا تھا کہ جس شخص نے ایک عرصے تک ضبط اور برداشت کو اپنی طبیعت ثانیہ بنائے رکھا وہ اس قدر بے قابو کیوں ہوا جا رہا تھا۔ اِدھر اُدھر گھومنے والے مختلف اجسام پر کسی خاص جسم کا شبہ با ... کیوں ہو رہا تھا؟ کیوں بار بار اس کا دل دھڑک جاتا تھا۔ اور پشت سے ایک آواز نے اس کے حواس کو ایک لمحہ کے لئے تتر بتر سا کر دیا۔

"شام بخیر لفٹیننٹ حامد صاحب ہمیں آپ کا انتظ...

"اوہ سروری صاحبہ آپ! شام بخیر۔ کہیے رعنیہ کہاں" حامد نے سنبھل کر کہا۔

"گھبرایئے نہیں۔ چلیئے آپ کو ان کے کمرے تک پہنچا دوں ذرا کمانڈنگ کے دفتر میں گئی ہیں" سروری نے مسکرا کر کہا "تقسیم سے قبل کیا آپ کا تعلق یو۔پی سے رہا ہے" گفتگو کے لئے ...... موضوع تلاش کیا۔

"جی ہاں"

"میرا بھی یہی خیال تھا .... کل آپ نے جس انداز میں اشارہ کیا اس نے مجھے کافی دیر تک پریشان رکھا۔ سچ پوچھیے تو نہ صرف پریشان بلکہ متعجب بھی کیا اس سے آپ کا مقصد کسی مخصو...

طرف اشارہ کرنا تھا؟ حامد نے پوری معصومیت سے کہا
"شکر ہے کہ یہ موضوع آپ کو پریشان کر سکا لیکن مجھے
بتانا پڑتا ہے کہ متعجب ہونا آپ کے یکطرفہ پن کا کھلا ہوا ثبوت ہے
مخصوص واقعات کی طرف اس وقت اشارے ہوا کرتے ہیں جبکہ
واقعات کی کمی ہو۔ لیکن جب ہر زندگی ایک حادثہ اور ہر سانس ایک
زخم ہو تو مخصوص واقعات کی تلاش مجرمانہ حقیقت پوشی سے
زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے"۔ سروری نے کہا

"اپنے ہی دکھ کو روئے جانا بھی سب سے بڑا یکطرفہ پن ہوتا ہے
اور پھر سنے سنائے دکھوں کا اظہار تو اور بھی مضحکہ خیز امر معلوم ہوتا
ہے مس سروری" حامد نے کہا۔

"معاف کیجئے آپ مجھے آتش نمرود کی تلاش میں نہ سمجھئے۔
جو شعلوں سے کھیل چکا ہو وہ ان کی سوزناکی بھی خوب جانتا ہے"
سروری نے بڑے دکھ سے کہا۔

حامد کے دل کی تمام گرمی اور بیداری جو وہ پچھلے چوبیس گھنٹوں
میں جمع کر سکا تھا بجھ گئی اور اسے احساس ہوا کہ ہر تازہ زخم چاہے
وہ ہزار زخموں کے بعد ہی کیوں نہ ہو اپنے دکھ درد اور کسک کی نوعیت
الگ رکھتا ہے۔ یاس کی ایک لہر نے حامد کو تھوڑی دیر کے لئے خاموش
کر دیا۔

"ایسی گفتگو سے میرا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ میں دیدہ دانستہ
آپ کو مطعون کروں۔ البتہ یہ کہوں گی کہ ہماری عائلی زندگی اس
مخلوق پر بہت تنگ ہے جسے قوم کی مائیں کہا جاتا ہے۔ ہر نئی نسل
مظلوموں اور ظالموں کے دو گروہ لیکر اٹھتی ہے اور ہر پرانی نسل
ان دونوں گروہوں کے قہر اور صبر کی داستانیں لیکر قبر میں جا
لیٹتی ہے۔ آپ نے شاید اس خونی مطالعہ کی کبھی تکلیف گوارا
نہ فرمائی ہوگی۔ جہاں مرد جوانی سے بڑھاپے تک بتدریج عورت
کے متعلق وہی نظریہ رکھتا ہے جو اپنے بار بار بدلے جانیوالے کوٹ
کے متعلق۔ کیا اس آسمان کے تلے ہماری وقعت یہی رہ گئی ہے کہ
ہمیں کوٹ کی طرح استعمال کر کے پھینک دیا جائے اور جب بازار
میں کوئی نیا ڈیزائن یا نیا فیشن آجائے تو پہلے کو ایک کونہ میں ڈال
دیا جائے"۔ سروری کی آواز میں درد تھا۔

"سروری صاحبہ زندگی نے آپکو کچھ تلخ اسباق پڑھائے ہیں
لیکن ان تلخ اسباق سے بھاگ کر آپنے تلخ تر زندگی کو مول لے لیا ہے
میں تو آپ کی موجودہ پناہ گاہ سے بھی مطمئن نہیں ہوں میں تو سمجھتا ہوں
کہ آپنے کنوئیں سے نکل کر دلدل میں چھلانگ لگائی ہے۔ حامد
نے کہا۔

سروری خاموش رہی۔ پھر اس نے موضوع بدلنے کی
کوشش کی۔

"حامد صاحب فوج میں آتے ہوئے زہرہ نے آپ کو روکا
نہیں تھا" اس نے کہا۔

حامد کو دکھ ہوا کہ سروری موضوع بدلنے پر اپنے آپ کو مجبور
پاتی تھی۔

"اپنے ذاتی مفاد کی حد تک اس نے مجھے یقیناً روکنے کی
کوشش کی تھی لیکن میرے نہ رکنے کی صورت میں وہ میری
پروا بھی کیا کرتی تھی چاہے میں زندہ لوٹ کر آؤں یا مر جاؤں بلکہ
وہ خوش ہوتی اگر میں دشمن کی ایک گولی اپنے سینے پر روک لیتا
وہ اطمینان سے میری پنشن اور جائداد سے سوسائٹی میں اپنا وقار
قائم رکھتی" حامد نے بددلی سے کہا۔

"حامد صاحب میں نے آپکی پریشانیوں کا حال رضیہ آپا سے
سنا تھا اس لئے میں چاہتی تھی کہ اچھی طرح مقابلہ کروں کہ ہم
دونوں میں کس کے زخم زیادہ گہرے اور کس کے گھاؤ زیادہ زہر
ناک ہیں کس کے آنسو زیادہ تابناک اور کس کی آہیں زیادہ پر
سوز ہیں کس کا جگر زیادہ چھلنی اور کس کا سینہ زیادہ تیروں کا ہدف
ہے کس کے دکھ زیادہ نوکیلے اور کس کا ماضی زیادہ خونچکاں ہے

آپ نے تو زیب داستان کے لئے بھی بہت کچھ بڑھا دیا
ہوگا۔ بُرا نہ منائیے گا خاتون۔ یو۔پی والوں کا مکاری کی حد تک بڑھا
ہوا اخلاق آمیز تصنع اور تکلف بعض اوقات ناقابل برداشت
ہوتا ہے۔ مبالغے کا مفہوم تو آپ لوگوں کی باتیں سن کر ہی سمجھ
میں آتا ہے" حامد نے مسکرا کر کہا۔

"برا منانے کی کوئی بات نہیں حامد صاحب کیا یہ واقعہ نہیں کہ پنجابیوں کی بدخلقی اور بدتمیزی کی حد تک بڑھی ہوئی بے تکلفی اور اخلاص بھی کبھی کبھی بار ہو جایا کرتا ہے"۔ سروری نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا

"سروری صاحبہ عورتوں نے اگر کوئی لفظ یاد کیا ہے تو وہ "حقوق" ہے اور جو لفظ ان کی لغت میں داخل نہیں ہے وہ "فرائض" ہے اس چیز نے بھی انھیں بے اطمینانی کا شکار کر دیا ہے انھیں جو کچھ بھی حاصل ہوتا ہے وہ ہمیشہ اس سے مزید چاہتی ہیں اور نہ پاکر روتی اور شکایت کرتی ہیں"۔ حامد نے کہا۔

"بات یہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ مردوں نے عورتوں کو صرف عطردان مٹھائی کے ڈبے اور پھولوں کی ٹوکریاں سمجھ رکھا ہے جن سے وہ اپنی اشتہائے کا ذب دور کرتے ہیں"۔ سروری نے کہا۔

"اس لئے کہ مٹھائی کے ڈبے اور عطردان بن کر وہ خود بازار میں آپڑی ہیں۔ یہاں آپ نے اپنے ملک کی سڑکوں، باغوں اور تفریح گاہوں میں مہذب اور شریف کہلانے والی بہو بیٹیوں کی تیرتی ہوئی پلکیں نہیں دیکھیں جن میں حیا کی نرمی کی بجائے بے باکی و بے حیائی کی جھلک ہوتی ہے جہاں باغوں کے جھنڈوں اور سینماؤں کے اندھیروں میں ان کے بے غیرت قہقہے خود ان کی توہین کرتے ہیں"۔ حامد نے کہا۔

"بات یہ ہے حامد صاحب کہ مردوں نے دنیا کو بہت عرصے تک چلایا ہے اور عورتوں نے ان کی چاکری کی ہے۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ انھیں اپنی مرضی سے چلائیں۔ ان سے اپنے گھروں میں اپنے کلبوں میں جھاڑو دلوائیں"۔ سروری نے حامد کو چڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا

اور راستے میں رضیہ آگئی۔

سانپ ہی سانپ

دوسرے دن حامد پھر زنانہ دستے کے کیمپ میں جا رہا تھا آج وہ کچھ زیادہ ہی موڈ میں تھا۔ پوری فوجی وردی میں اس کے تیز تیز قدم کیمپ کی طرف اٹھ رہے تھے۔

لفٹ رائٹ لفٹ۔ اب وہ منظم قدم اٹھانے کا عادی ہو چکا تھا۔ کیونکہ وہ کوئی بے ہنگم غیر مربوط عادت کا شہری نہ تھا وہ تو منظم و مرتب مشینی حرکات والا فوجی تھا۔

اس کی نظریں کسی خاص جسم کے لئے آوارہ نہ تھیں اور نہ ہی کسی کا نقش یا دھڑکن بنکر اس کے دل میں سما رہا تھا۔ کمانڈنگ آفیسر کے دفتر کے عقب میں سے گزرنے والی سڑک پر سے ہو کر وہ سیدھا رضیہ کی رہائش گاہ کی طرف جا رہا تھا۔ رضیہ کا کوارٹر بند تھا اور پھر سروری کے کوارٹر کی طرف مڑ گیا۔ آج اس کیمپ میں نئے خصوصی انتظامات نظر آ رہے تھے۔

کھٹ کھٹ کرتا ہوا وہ سروری کے کوارٹر کے سامنے جا رکا۔

"السلام ———" لیکن اس نے دیکھا کہ کوارٹر بند تھا "تھانک گاڈنس۔ آج ان لوگوں کو کیا ہوا ہے"۔ وہ بڑبڑایا اور واپس مڑا۔

"صاحب آج بڑا صاحب بہادر آ رہا ہے"۔ چوکیدار نے بتایا۔

"یہ کون ہے بڑا صاحب" وہ بڑبڑاتا ہوا چوکیدار کے پاس سے پھر رضیہ کے مکان کی طرف چل دیا

رضیہ کے کمرے کی ایک چابی اس کے پاس بھی تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ اس صاحب بہادر کا ذکر سن کر ہی جائے گا انتظار ہی کرلیں اور وہ قفل کھول کر کمرے میں بیٹھ گیا۔ کمرے کی عقبی کھڑکی ایک وسیع پریڈ گراونڈ کی طرف کھلتی تھی جس کے درمیان ایک چبوترہ بنا ہوا تھا۔ اس چبوترے پر ایک جھنڈا نصب تھا۔ یہ زنانہ امدادی دستے کا فوجی نشان تھا وہ اس کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"ارے"، اسکی زبان سے اچانک نکل گیا سامنے چند سو گز کے فاصلے پر زنانہ دستے کی پریڈ ہو رہی تھی۔ قطار اندر قطار خاکی وردیوں میں گل بوٹے کھلے ہوئے تھے۔ حامد کوئی تماشا

ں نہ تھا لیکن اس کے نزدیک اس پریڈ کے مشاہدے میں کوئی
ب بھی نہ تھا البتہ عیب تھا تو یہ کہ وہ یوں دیکھتا ہوا پکڑا نہ
جائے اس نے اچک کر ایک کھونٹی سے رضیہ کی دوربین
رلی۔ کھڑکی کے پٹ نیم وا کئے۔ ایک کرسی کھینچ کر وہ اس پر
ٹھ گیا۔

اچانک زنانہ امدادی دستے کھنچ کر اس کے سامنے آگئے
رف چند ہاتھ کے فاصلے پر
چست فوجی لباس میں عورتوں کی قطاریں، ایک رنگ
بساں اور یک لباس۔ پہلے اس نے ان کا سرسری جائزہ لیا
بوترے کے عقب میں فوجی بینڈ دھیمے سروں میں بج رہا تھا
بوترے پر ہاتھ پیشانی تک اٹھائے سلیوٹ کے پوز میں ایک فوجی
فسر کھڑا تھا۔

"یہ فوجی افسر کون تھا" حامد کے ذہن نے سوچا اور پھر اس
نے دوربین کی آنکھ کو اس کے چہرے پر مرتکز کر دیا۔

"اوہ برگیڈیر شاہد" اس کی زبان سے نکلا "یہ بدمعاش
ہے" وہ بڑبڑایا "اس غنڈے کو کس احمق نے زنانہ دستے کے معائنے
کے لئے بھیج دیا جو دن کے کم از کم سولہ گھنٹے شراب میں مخمور رہنا
ضروری سمجھتا ہے جس کے نزدیک شراب نہ پینا شدید قدامت
پرستی ہے جس نے BASE کیمپ میں سیکنڈ لفٹننٹ جمال کو شراب کا بل ادا
کرنے کے جرم میں کورٹ مارشل کیا تھا۔ یہ حیوان یہاں کہاں گھس آیا۔"

حامد کے ذہن میں اچانک ایک شرارہ سا سلگنے لگا ایک بےچینی
نے اس کے اعصاب میں ہلچل سی شروع کر دی۔ بینڈ بج رہا تھا
ایک دستہ مارچ کرتا ہوا برگیڈیر کے سامنے سے گزر رہا تھا۔

"آئیز رائٹ" ایک غیر محسوس آواز وہ سنتا اور پورے دستے
کا رُخ دائیں طرف مڑ جاتا۔ ان رخوں میں جو دائیں طرف مڑ جاتے تھے
کتنی بےبسی، بےکسی اور بےچارگی تھی، بےرونق چہرے بےآب
چہرے، بےنور چہرے، ان چہروں کا نور کون اڑا لے گیا تھا،
کدھر گیا تھا۔ اور پھر اچانک بینڈ رک گیا۔ دستے چلتے چلتے تھم گئے
اور برگیڈیر چبوترے سے اتر کر ایک ایک دستے کی انسپکشن
کرنے لگا۔

دوربین کی آنکھ برگیڈیر کے ساتھ ساتھ گھوم رہی تھی۔
اچانک ایک بےبس چہرے کے پاس برگیڈیر رک گیا جس پر ابھی
رونق باقی تھی جس کے چہرے پر سرخی کی کوئی رمق اب تک بھی رنگی
برگیڈیر نے کچھ کہا۔ لڑکی کے کندھے کو چھوا۔ پھر مسکرایا
پھر اس کی ٹھوڑی کو پکڑ کر اوپر اونچا کیا۔ اور آگے بڑھ گیا۔ حامد کے
دماغ میں جیسے کسی نے گرم گرم راکھ بھر دی ہو۔ کراہت، نفرت
اور غصے کے ساتھ اس نے اپنا ہونٹ دبایا۔ اور دوربین کی آنکھ
برگیڈیر کے ساتھ آگے بڑھ گئی اور ستے ہوئے چہرے دوربین کی آنکھ
اور برگیڈیر کے سامنے سے گزرتے رہے اور پھر اچانک جیسے حامد کا
دل دھڑک کر اس کے حلق میں آ پھنسا۔ دوربین کانپ کر اس کی
آنکھوں کے سامنے سے ہٹ گئی۔ اضطرار میں اس نے کھڑکی کا
پورا پٹ کھول کر برہنہ آنکھوں سے پریڈ گراؤنڈ کی طرف دیکھنا چاہا
اور اضطراب سے پھر دوربین آنکھوں کے سامنے لگا لی۔ ایک شیطانی
سی مسکراہٹ چہرے پر بکھیرے برگیڈیر سروری کے سامنے کھڑا تھا
وہ کچھ کہہ رہا تھا جسے حامد سن نہ سکتا تھا۔ کاش دور سے دیکھنے کے
ساتھ وہ سن بھی سکتا۔ اس نے ہلتے ہوئے ہونٹوں کی حرکات سے
نکلنے والے الفاظ کی ساخت اور معانی سمجھنے چاہے لیکن ذہنی خلفشار
نے اسے کچھ سمجھنے نہ دیا۔ برگیڈیر کا ہاتھ اٹھا اور سروری کی جبیں
کے نشان زخم پر اس کی انگلی پھر گئی اور پھر جیسے یوں ہی اس کا ہاتھ
کھسک کر سروری کے کندھے پر آ گرا اور وہیں ٹک گیا۔ وہ غالباً
کی پیشانی کے نشان کے متعلق بات کر رہا تھا یا اس کے لباس کے
متعلق ہدایات دے رہا تھا یا اس کی پریڈ پر ریمارک کر رہا تھا
اور یا ـــــ یا اس کا جی چاہا کہ اس کی کمر میں لٹکا ہوا پسٹل
نکو دیر برگیڈیر کی خبر لے ڈالتا یا سروری کا ہاتھ لپک کر برگیڈیر کے
پہلو میں لٹکا ہوا پسٹل چھین لیتا لیکن نہ یہ ہوا اور نہ وہ۔ اس
کہ آتش فشاں تو صرف حامد کے سینے میں بھڑک رہے تھے۔ برگیڈیر
نے اطمینان سے اپنی نوٹ بک میں کچھ درج کر رہا تھا اور پھر حامد اس
زیادہ کچھ نہ دیکھ سکا

وہ اٹھ کر بھاگا۔ وہ کمرے میں سے یوں باہر نکل آیا۔ جیسے کسی
کالی بلاؤں کو دیکھ لیا ہو۔ وہ پیچھے دیکھے بغیر تیز تیز چلا جا رہا تھا
چور کے پیچھے پولس چلی آ رہی تھی۔ کمانڈنٹ کے دفتر کے قریب سے
نے ہوئے اچانک اس کی نظر کھڑکی کے اندر چلی گئی۔ اسے یقین
اس کی نظر کچھ دیکھ رہی تھی۔ اسے وہم ہوا کہ شاید وہ جذبات
رت میں فریب نظر کا شکار ہو گیا تھا۔ یا اس کا تخیل بگڑ گیا تھا
کے قریب اس کی جانب نیم رخ کئے دو انسان کھڑے تھے
کمانڈنٹ تھا اور دوسرا ——— اور دوسرا۔ دوسرا وہ تھا
کے متعلق اس کے وہم میں بھی برائی پرورش نہ پاتی تھی۔ اس کی چوٹی
خوب پہچانتا تھا۔ اس کے کندھوں کے جھکاؤ سے بھی وہ پوری
واقف تھا اس کے ساتھ اس نے عمر گزاری تھی۔ اس کے ساتھ
کی تھیں۔ اس کے انداز گفتگو سے بھی وہ پوری طرح آگاہ
س لئے کہ وہ اس کا بڑا بھائی تھا اس کا تصور بھی رضیہ کو دہ
کے لئے آمادہ نہ تھا۔ پھر اس طرح کہ ایک مرد کا ہاتھ رضیہ کے
ں پر ہو۔ ایک شعلہ اس کے دل سے اٹھا اور اس کے دماغ کو
لپیٹ میں لے لیا۔ ایک دھواں اس کے سارے وجود معنوی پر
ہو گیا وہ ایک کر دفتر کے گیٹ کی طرف مڑ گیا وہ کچھ نہیں سوچ
تھا لیکن اس کے قدم اٹھ رہے تھے

"ہالٹ" ایک کرخت آواز نے اس کے اعصاب کو جیسے
میں لے کر جھٹک دیا۔

"مجھے کمانڈنٹ سے ملنا ہے" حامد نے بمشکل الفاظ ادا کئے
ز جیسے اپنی آواز پہچان نہ سکا۔ اسے تھوڑی سی دیر میں کیا ہو گیا
وہ کتنا بدل گیا تھا۔ اس کے سامنے سے کتنے پردے اٹھ
گئے۔ اف وہ کتنی دردناک ٹریجیڈی سے دوچار ہو گیا تھا

"حکم نہیں ہے۔ دو بجے کے بعد ملنا" سنتری نے جواب دیا
ر کا جی چاہا کہ اس حکم کے غلام کو الٹ کر رکھ دے۔ لیکن اسکے
میں بھری ہوئی رائفل تھی جس میں ۳۰۳ کی گولی تھی جو انسانی پنجر
ڑ کر گذر جانے کی طاقت رکھتی ہے۔ پھر رائفل پر ایک تیز سنگین
ہوئی تھی جس کی نوک جسم کو چیر دیا کرتی ہے حامد شاید اس کی پروا

نہ کرتا لیکن اچانک اس کے حواس سمٹ کر اسے بتانے آئے
کہ وہ غلط کر رہا تھا۔ جرم کا علاج غیر منظم تشدد نہ تھا بلکہ منظم
جدوجہد تھی۔

اس کے قدم مڑ گئے۔ وہ تیز تیز قدموں سے فوجی احاطے کے
باہر نکل آیا اور جیسے اسے محسوس ہوا کہ وہ آگ کے جہنم سے نکل آیا
تھا۔ جیسے اسے محسوس ہوا کہ وہ سمندر کے گہرے پانی میں دو عزیز
ہستیاں ڈبو آیا تھا۔ جن کے ڈوبنے کا رنج اس کے دماغ کو تھا
دل کو نہ تھا۔ جیسے وہ ایک متعفن دنیا سے نکل کر ایک صاف شفاف
اور سیدھی سادی دنیا میں آ گیا تھا لیکن ایک کھولاؤ اس کے اندر
پھر بھی کھول رہا تھا۔ تیز تیز چلنا اسے دوبھر ہو گیا۔ قدموں کی تیزی
اس کے جذبات کی تیزی کے ساتھ ہم آہنگ نہ تھی۔ وہ دوڑنے
لگا۔ وہ باہر کھیتوں کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا
کہ وہ اپنے پہلو میں جھولنے والے بے غیرت بے حمیت پستول
کو نکال کر دور پھینک دے جس نے سب کچھ دیکھا تھا اور خاموش رہا
تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اتنی گولیاں چلائے کہ دنیا میں ہر
برگیڈیر اور ہر کمانڈنٹ کا سینہ چھلنی ہو جائے۔ اس کا جی چاہتا
تھا کہ وہ جھکے ہوئے کندھوں والی اور پیشانی پر نشان زخم رکھنے
والی ہر لڑکی کو چوٹی پکڑ کر اونچے شیشم کی شاخوں سے باندھ دے
اور پھر قدرت کی میونسپلٹی کے جمعدار گدھوں کو بلا لائے کہ وہ
آ کر ان کی بوٹیاں نوچیں۔ نامعلوم کیا کیا کچھ لاوے اس میں ابلتے
رہے اور وہ ایک کھیت میں گھاس پر پڑا بڑبڑاتا رہا۔

پت جھڑ

امن میں اس نے گھر کا سکون کھو دیا تھا تو جنگ میں اس نے
اپنی ہستی کے تمام پاکیزہ تصورات کا مرکز کھو دیا۔ ایسی سوسائٹی
میں جہاں زہرہ اور رضیہ اور سرودی پرورش پاتی تھیں جہاں
کمانڈنٹ اور برگیڈیر بنائے جاتے تھے یہاں کا امن بھی غیرت سوز
تھا اور یہاں کی جنگ بھی رسوا کن تھی۔ انسانیت کے لئے بہر
حال یہاں پناہ نہ تھی۔ یہ جونکوں کا معاشرہ تھا جس میں ہڑنی روح

ماں چوسا جارہا تھا اور ہر دی روح خون چوستا تھا۔ وہ کہاں جائے دھر جائے۔ کون اس کا رفیق تھا۔ اس معمور و معروف دنیا میں عافیت کا وہ معطر گوشہ کہاں تھا جو اسے بھی اپنی گود میں لینے پر تیار ہوتا۔ یہاں کا امن کیا تھا۔ جنگ زرگری اور عنبر توں جیتوں ضمیروں اور عزتوں کے سودے۔ یہاں کی جنگ کیا تھی جو اتبت کا رقص بے ہنگام۔ انسان کے لئے اس معاشرے میں پناہ نہ تھی اور اگر پناہ تھی تو اس کی انسانیت شدید خطرے میں تھی۔ وہ شکستہ دل، شکستہ ذہن شکستہ جسم کے ساتھ گھاس پر پڑا انسانیت کے مستقبل کے متعلق سوچتا رہا۔ اس کی کمر پر عمر کا ایک طویل بوجھ دھرا ہوا تھا جس سے وہ غیر مطمئن تھا۔ لیکن اس کے سامنے نئے بناؤ کا کوئی نقشہ نہ تھا حادثے اسکی ہڈیاں چور چور کر دی تھیں اور وہ تصور کی الجھی ہوئی رنگینیوں میں کسی بہتر مستقبل کے خواب دیکھتا رہا۔

"کاش وہ کسی ایسے مقصد کا معمولی سپاہی ہوتا جو انسان کو اس کی انسانیت واپس دلا سکے تو یہ سوال بار بار اسکے سامنے آیا لیکن اس کا ذہن اس کو حل کرنے سے قاصر تھا وہ ایک ایسا یا تھا جو پانی کا نام نہ جانتا تھا ——— وہ آرزوں کے شکستہ ڈھیر کی طرح نہ معلوم کب تک وہاں پڑا رہا۔

حاذقی کورس

کیا آپ تھکاوٹ، پژمردگی، نقاہت اور کمزوری محسوس کرتے ہیں کیا آپ کی قوت حافظہ کمزور ہے کیا آپ خوف زدہ اور غمگین رہتے ہیں کیا آپ کا جسم دبلا ہے اور آپ سستی کمزوری محسوس کرتے ہیں کیا آپ احساس کمتری کے شکار ہیں

اگر ایسا ہے تو یقین جانیے کہ

آپکے وہ غدود جو قوت مردانہ کے مخزن ہیں کمزور ہو گئے ہیں اور جب تک آپ ان غدود کو طاقت ور بنا کر ان کی حفاظت نہیں کریں آپ کبھی بھی طاقت ور اور قوت مردانگی کی صفات سے متصف ہو سکتے۔

حاذقی کورس تین مختلف ادویہ پر مشتمل ہے اور تیس دن کا مکمل کورس ہے جو مردانہ غدود کی جملہ کمزوریوں کو دور کر کے انکو طاقت ور بنانے کا تیر بہدف مگر سادہ اور سہل علاج ہے جس کا ابتدائی استعمال آپکے جسم میں طاقت اور تن درستی کا احساس پیدا کر دے گا اور پورے تیس روز کے بعد آپ ایک مکمل نوجوان تن درست توانا اور طاقتور مرد بن جائیں

حاذقی کورس

فوراً ہی آپکے غدود کو طاقت ور بنا کر اپنا اثر شروع کر دیگا۔ آپکے بدن میں تازہ سرخون پیدا کر کے اس میں جوانی کا جوش پیدا کر دیگا اور جوں جوں آپکے غدود طاقت ہونے جائیں گے آپ اپنے اندر زندگی کی ایک نئی لہر محسوس کرینگے اور زندگی کے ہر شعبہ میں حقیقی زندگی سے لطف اندوز ہو سکیں گے ——— یعنی ——— "لطف شباب"

قیمت حاذقی کورس مکمل برائے تیس یوم: بارہ روپے

حاذق دواخانہ، بندر روڈ، کراچی نمبر ا

Asmar

The TONIC FRUIT DRINK

REFRESHING
INVIGORATING
Excellent
with
SODA WATER
OR HOT OR
COLD WATER

اثمار

پھلوں
فرحت بخش اور مقوی
شربت۔ سوڈا واٹر یا ٹھنڈے
پانی میں استعمال کیجیے

حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی

HAZIQ DAWAKHANA KARACHI

Regd. No. S. 13

Monthly "MUSHIR" Karachi

کراچی
نومبر ۱۹۵۲ء
3 (۱۱)
PRICE
-/8-
دفتر ماہنامہ "مشیر" بندر روڈ-کراچی

چالیس سال کے بعد عورت اپنے جسم میں ایک قدرتی اور فطری تبدیلی محسوس کرتی ہے جس کی وجہ سے دوران سر بے خوابی، دھڑکن، جسم میں موٹاپا اور بدن میں سستی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسے اپنی جوانی ڈھلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہ عصبی کمزوری کی نشانیاں ہیں جو بڑھتی ہوئی عمر کا فطری تقاضا ہیں۔ اور اس کا بہترین علاج **حاذق نروائن پلز** حب خاص کا متواتر اور مسلسل استعمال ہے۔

سونا، فولاد، مشک، عنبر اور مروارید جیسے قیمتی اجزا کا یہ بے نظیر مرکب جدید ترین اصولوں کے مطابق تیار کیا گیا ہے صحیح عصبی خوراک اور عصبی ٹانک ہے۔ حکما نے اسے سراہا ہے اور اپنے نسخوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اس کے متواتر استعمال سے آپ چالیس سال کے بعد بھی جوان نظر آئیں گی اور جسم میں جوانی کا سا چھریلا پن محسوس کریں گی۔

80 گولی کے پیکٹ کی قیمت 7/ روپیہ علاوہ محصول ڈاک ہے جو 40 یوم کی خوراک ہے اور سال بھر تک آپ کی طاقت اور قوت کو بحال رکھنے کے لئے کافی ہے

نمونے کے لئے 20 گولی اور 40 گولی کا پیکٹ بھی مل سکتا ہے جس کی قیمت 2/ روپیہ اور 3/12 بالترتیب ہے

آپکے شہر کے بڑے بڑے دوافروشوں سے مل سکتی ہیں۔ یا براہ راست

حاذق دواخانہ۔ بندر روڈ۔ کراچی سے طلب کیجیئے

نوٹ: مفصل فہرست ادویہ حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی نمبر 1 سے مفت طلب کیجئے!

محمود فاروقی •

نذر

دیوی نے تھال سجایا
ناگ راجہ کے لئے
اس کا دل عقیدت و محبت سے پُر تھا!
دیوی نے تھال پروسا
ناگ راجہ کے آگے
لیکن؟
وہ کانپ اٹھی قدم ڈگمگانے لگے
کہیں ناگ دیوتا ڈس نہ لیں؟
کتنا ہیبت ناک
اور کیسا دل ہلا دینے والا خیال تھا
تاہم وہ پوجا کرتی رہی
اپنے من مندر کے پٹ کھولے
اس کا سر ناگ راجہ کے آگے جھکا ہوا تھا!
"یہ تھال ہٹاؤ دیوی"
ناگ راجہ نے غصہ سے کہا
میں خدا نہیں ہوں.........!
دیوی اپنی دُھن میں
ناگ راجہ کی بات سن نہ سکی
وہ پوجا کرتی رہی بے سنے اور بے سمجھے!
میں خدا نہیں ہوں
"یہ تھال ہٹاؤ دیوی!"
ناگ راجہ نے غصہ سے پھنکار ماری
اور پھر.........؟
ناگ راجہ نے!
دیوی کو ڈس لیا ......!
لیکن ——— آہ
لوگ اب تک یہی کہتے ہیں
ناگ راجہ نے
"نذر قبول کرلی"

ایک خدا، ایک انسان، ایک نظام

ماہنامہ شیر کراچی
فہرست مضامین نومبر ۱۹۵۲ء

جلد ــــ ۳ ، شمارہ ــــ ۱۱

بدل اشتراک: پاکستان ۔ سالانہ تین روپے ۔ فی پرچہ چھ آنے
بھارت ۔ سالانہ ساڑھے چار روپے ، فی پرچہ آٹھ آنے

ترتیب دینے والے:-

• عبد الغفور بیگ
• محمود فاروقی

طابع و ناشر: عبد الغفور بیگ، مطبع: مشہور آفسٹ لیتھو پریس ـــــ مقام اشاعت: بندر روڈ کراچی نمبر (۱)، کتبۂ عابد سعید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ادیب اور مسئلہ معاش

شاعروں اور ادیبوں کے متعلق عام طور سے کہا جاتا ہے کہ ـــــ وہ کسی کام کے نہیں ہوتے!

یہ کوئی مسئلہ خیال تو نہیں ہے کہ اسے ہر ادیب اور شاعر پر چسپاں کر دیا جائے لیکن جہاں تک معاش کا تعلق ہے یہ بات بڑی حد تک ادیبوں اور شاعروں پر پوری طرح چسپاں ہوتی ہے ـــــ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ جو شخص بدقسمتی یا خوش قسمتی سے ادب کی زلف گرہ گیر میں گرفتار ہو جاتا ہے، پھر وہ دنیا میں کسی اور کام کا رہے یا نہ رہے روٹی کپڑے کے کام کا تو ہرگز نہیں رہتا ـــــ ادیبوں کی اس پریشان حالی کی خاص وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کی تمام صلاحیتیں اور قوتیں اپنی تخلیقات پر مرکوز رہتی ہیں اور ان کے لئے یہ مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی توجہات ادب سے پھیر کر کسی اور طرف لگائیں یہی وجہ ہے کہ اگر وہ اپنا پیٹ بھرنا چاہتے ہیں تو ان کا ادب فاقہ کرنے لگتا ہے اور اگر اپنا پیٹ کاٹ کر ادب کو شکم سیر کرتے ہیں تو پھر ان کا معدہ دہائیاں دینے پر آجاتا ہے اور لطف یہ ہے کہ ادیب کی اس دلچسپ مشکل کو لوگ حل بھی نہیں کرنا چاہتے چنانچہ آج تک کبھی یہ سننے میں نہیں آیا کہ ادیبوں کی کوئی یونین بنائی گئی ہو اور ان کے لئے روٹی کپڑے کا مطالبہ کیا گیا ہو وجہ یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو ادیبوں سے کوئی خاص قسم کی عداوت ہوتی ہے کہ وہ الن کی یونین بنانے کے حامی نہیں ہوتے بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ لوگوں کے ذہن میں کسی نہ کسی طرح یہ خیال جما ہوا ہے کہ بغیر آشفتہ سری اور پریشان حالی کے نہ تو شعر پیدا ہو سکتے ہیں اور نہ ہی افسانے وجود میں آسکتے ہیں اس لئے ادیبوں کی معاشی پریشانیوں کو رفع کرنا غالباً بارگاہ ادب میں سوء ادبی کے برابر سمجھا جاتا ہے اور ان کی پریشان حالی کو لازمہ ادب سمجھ کر اس پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا جاتا۔ دوسری طرف ایک سچے اور مخلص قلم کار کے لئے یہ بات انتہائی مشکل اور دشوار ہوتی ہے کہ وہ اپنے ادب کو وسیلۂ معاش بنائے، وہ بھوکوں مرنا پسند کرے گا لیکن روٹی کے لئے اپنے قلم کو خط لگانا پسند نہیں کرے گا۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ ادیب ادب تو تیار کرے اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے لیکن لوگوں کی قدر شناسی کی وجہ سے کوئی نہ کوئی کھیل اڑ کر اس کے منہ تک بھی پہنچ جائے۔

ابھی کچھ دن قبل مولانا مودودی نے غالباً ایک تقریر میں فرمایا تھا۔

"معاش کے لئے ادب پیدا کرنے سے بہتر ہے کہ آدمی اینٹیں ڈھولے"

یہ بات ایک سچے اور صحت مند ادب کو پیدا کرنے کے لئے ہر پہلو سے صحیح ہے کیونکہ جب کوئی ادیب اس نچلی سطح پر آجاتا ہے کہ وہ ادب کو محض روٹی کمانے کے لئے تیار کرنے لگ جاتا ہے تو وہ ادیب نہیں رہتا بلکہ وہ ایک ایسا دلال بن جاتا ہے جو ادب کی عصمت و پاکیزگی کو اہل غرض گاہکوں کے ہاتھ فروخت کرتا اور اس ناجائز ذریعۂ معاش سے اپنا پیٹ پالتا ہے ـــــ اس لئے مولانا مودودی کے قول کے مطابق ادب کو مال تجارت بنانے سے بہتر تو یہ ہے ادیب قلم رکھ دے اور پیٹ بھرنے کے لئے اینٹیں ڈھونا شروع کر دے

اس لئے ہم یہاں ان ادیبوں کی ہرگز ہرگز وکالت نہیں کرنا چاہتے جو اپنے قلم سے عصمت ادب کو چاک کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے بلکہ ہم ان ادیبوں کی معاشی مشکلات پر غور کرنا چاہتے ہیں جو اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر پڑھنے والوں کے لئے دعوت فکر کا اہتمام کرتے ہیں اور معاوضہ میں کچھ طلب نہیں کرتے حالانکہ ان کی احتیاجات ان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے رہتی ہیں۔ ادب کو چھوڑ کر اینٹیں ڈھونا

ممکن ہے کہ آسان ہوجائے لیکن یہ بہرحال مشکل ہے کہ ایک آدمی بیک وقت اینٹیں بھی ڈھوئے اور ادب بھی تیار کرے کیونکہ اینٹیں ڈھونے
کیلئے ہاتھ کا سخت اور کرخت ہونا ضروری ہے اور ادب کی تیاری کے لئے نرمی اور گدازی لازم۔ اس لئے ایک ادیب نہ تو اینٹیں ڈھو سکتا
ہے اور نہ ہی وہ اپنے ادب کو فروخت کر سکتا ہے اس کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ کار نہیں رہتا کہ وہ مشکلات و مصائب کو صبر و شکر
کے ساتھ برداشت کرتا رہے اور اپنا فریضہ انجام دیتا رہے۔

ادیب تو یہ کرتا آیا ہے اور یہ کرتا رہے گا لیکن اس کی جو ذمہ داری سوسائٹی پر عائد ہوتی ہے وہ بہرحال کسی طرح ساقط نہیں ہو سکتی۔ لوگوں
کا یہ سمجھنا کہ ادب کے لئے پریشان حالی ضروری اور لازمی ہے سراسر غلط اور پرفریب خیال ہے۔ پریشان حالی تو ادیب کی ادبی صلاحیتوں
کو گھن کی طرح کھا جاتی ہے اور اس کی تخلیقات میں بار بار " آرد نماند " کا روایتی جملہ غیر محسوس طریقہ پر گھس آتا ہے اور اس کے تخلیقی حسن کو
گہنا دیتا ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔ کسی ادب پارہ کو تیار کرنے کے لئے خیال اور توجہ کی یکسوئی کی ضرورت پڑتی ہے اگر ادیب کا خیال [illegible]
فکر معاش سے منتشر ہو جائے تو پھر اس کے لئے یہ مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے ادب پارہ میں حسن اور تاثر پیدا کر سکے۔ اس لئے لوگوں کا اس
مقدس فریب میں مبتلا رہنا کہ ادیب کو خوش معاش بنانے سے ادب کی توہین ہو جاتی ہے انتہائی بد عقلی اور ادب دشمنی ہے۔ ان کو
تو یہ سوچنا چاہئے کہ اگر وہ اس شخص کو ضروریات زندگی فراہم کر کے نہیں دیتے ہیں جو اپنا خون پسینہ ایک کر کے ان کی دعوت فکر کا سامان
مہیا کرتا ہے تو یہ ان کی انتہائی خود غرضی نہیں تو اور کیا ہے کہ وہ اس غریب سے اس کی روح حیات تو کھینچ لیتے ہیں۔ لیکن اس کو زندہ رکھ
سکنے کے لئے قوت لایموت فراہم نہیں کرتے اور اگر کرتے بھی ہیں تو اس طرح کہ اس کی معاشی چادر میں اس کی احتیاجات پوری طرح
سر اور پیر ڈھک نہیں سکتیں۔ درحقیقت ادیبوں کی یہ معاشی مشکلات ہمارے اس خدا ناشناس معاشرہ کا لازمی نتیجہ ہیں۔ جو زندگی کے
مسائل کو حق اور انصاف کے خدا پرستانہ معیار پر نہیں بلکہ نفع و نقصان کے مادی تصور پر حل کرنے کا عادی ہو ہمارے
ملک پر بھی چونکہ ابھی تک انہی لوگوں کو زندگی کی اجارہ داری حاصل ہے جو خدا ناشناس ماحول کی پیداوار ہیں۔ اس لئے زندگی کے دوسرے
شعبوں کی طرح ادب میں بھی خود غرضی اور استحصال بے جا کا سکہ چل رہا ہے یہی وجہ ہے کہ آئے دن ادب کا معیار برابر گرتا جا رہا ہے
جو مخلص اور سچے قلم کار ہیں۔ ان کی تخلیق کے سوتے برابر سوکھتے چلے جا رہے ہیں اور جو پیشہ ور دلال ہیں وہ اپنے گاہکوں کے سفلی مذاق کے لئے سستا
جاپانی مال تیار کرنے میں لگے ہوئے ہیں ———

اس صورت حال کو بدلنے کے لئے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ہمارے ملک کے اہل وسعت ایسی تدابیر پر غور کریں
نتیجہ میں ایک طرف تو ادیبوں کے قلم برسر اقتدار طبقہ کی مصاحبت اور ملازمت سے بے نیاز ہو کر قومی اور ملی فلاح و بہبود کے لئے آزاد
کام کر سکیں اور دوسری طرف صالح اور صحت مند ادب کی تخلیق میں خوددار اور غیور قلم کاروں کو زیادہ سے زیادہ معاشی سہولتیں حاصل
رہیں تاکہ ان کی تحریروں کا حسن اور تاثر مخلصانہ اور بے لاگ اظہار کے ساتھ جلوہ گر ہو سکے۔

اوپر کی سطور میں ادیبوں کی معاشی حالات کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ادیبوں کا منہ اس طرح زر
سے بھر دیا جائے کہ وہ زندگی کی اس گزرتی ہوئی چھاؤں میں اپنی جنت بنا کر بیٹھ جائیں اور درد کی اس متاع گراں بہا سے ان کا دل
ہو جائے جو درحقیقت ادب کی تخلیق کا اصل سرچشمہ ہے بلکہ میرا مطلب صرف اس قدر ہے کہ ان کی بنیادی ضروریات زندگی کی اس طرح
ہوتی رہے کہ روٹی کپڑے کا سوال ان کی ذہنی استعداد اور ادبی صلاحیتوں کو متاثر نہ کر سکے۔ اسی لئے میں نے اپنے اس مضمون میں
خوش معاشی کے الفاظ استعمال کئے ہیں نہ کہ خوش حالی کے۔ (بقیہ صفحہ ۱۲ پر دیکھئے)

سد ملتانی ●

نیا ادب

نہ پاسِ خلق نہ خوفِ خدا نہ شرمِ نبی　　نیا ادب ہے کہ سعئ فروغِ بے ادبی

ہوائے نفس کی تصویرِ شوخ و عریاں کو　　کہیں حیات کا آئینہ، وائے بوالعجبی

بیانِ حال میں پنہاں ہے آرزومندی　　ہے احتساب کے پردے میں مدعا طلبی

یہ چاہتے ہیں کچھ ایسی مکمل آزادی　　کہ جس کے دور میں کوئی بدی رہے نہ دبی

ہے سر میں ہوش بہ اندازۂ پریشانی　　ہے دل میں جوش بمقدار بادۂ عنبی

یہ زندگی ہے کہ دنیائے دل کی بربادی　　یہ روشنی ہے کہ فکر و نظر تیرہ شبی

وہ بوالہوس بھی جنھیں جرأتِ گناہ نہیں　　ادب میں ڈھونڈ رہے ہیں علاجِ تشنہ لبی

نئے ادب میں چمک اور تپش سہی لیکن　　وہی کہ اصل ہے جس کی شرارِ بولہبی

جدید بھی تو نہیں یہ ادب کہ ہے اس میں　　وہی قدیم ہوس جوئی و طرب طلبی

پھر ایکبار بہ فیضِ فرنگ ابھرا ہے　　دبا ہوا ادبِ جاہلیتِ عربی

اسدؔ ادیبِ "ترقی پسند" سے کہہ دو

رہے تجھی کو مبارک فریبِ خوش لقبی

(حلقہ ادبِ اسلامی کراچی کے اجلاس عام منعقدہ ۷ ستمبر کی پیش کش)

ماہر القادری

ضرورت ہے

امیروں کی ضرورت ہے نہ سلطاں کی ضرورت ہے
زمانہ کو فقط مردِ مسلماں کی ضرورت ہے

حنین و بدر کے پھر معرکے دُہرائے جائیں گے
زمیں کو سُرخیٔ خونِ شہیداں کی ضرورت ہے

"ترقی"[1] لے گئی ہے بے یقینی کے اندھیروں تک
ادب کی محفلوں کو شمعِ ایماں کی ضرورت ہے

بدلنا ہے خدا نا آشنا دورِ قیادت کو
علیؓ و خالدؓ و فاروقؓ و سلماںؓ کی ضرورت ہے

حسینی قافلہ میں آنے والے جلد آ جائیں
کہ پھر اسلام کو خونِ رگِ جاں کی ضرورت ہے

حدود "لذت و پاکیزگی" پہچاننے والے
اِدھر آئیں کہ اُن کے علم و عرفاں کی ضرورت ہے

قبائیں قیصر و کسریٰ کی ثابت رہ نہیں سکتیں
مری وحشت کو بھی چاکِ گریباں کی ضرورت ہے

زمانہ آگیا جھوٹے خداؤں سے بغاوت کا
مکمل اتباعِ حکمِ یزداں کی ضرورت ہے

ادب کب تک رہے گا جاہلیت کے شکنجوں میں
گرفتارِ قفس کو اب گلستاں کی ضرورت ہے

زمانہ مضطرب ہے کس قدر ضربِ کلیمی کا
جہاں کو پھر کسی موسیٰ عمراں کی ضرورت ہے

وہ مشرق ہو کہ مغرب ہر طرف ہے فتنہ سامانی
نظامِ زیست کو منشورِ قرآں کی ضرورت ہے

دعا کے ساتھ تدبیریں عمل کے ساتھ تدبیریں
خدا کی راہ میں بھی ساز و ساماں کی ضرورت ہے

جہاں پر اتحادِ کفر و ایماں کی ضرورت تھی
وہاں اب امتیازِ کفر و ایماں کی ضرورت ہے

خدا کا دین کفر و جاہلیت کے ہے نرغے میں
غزلخواں کی نہیں ہے اب رجزخواں کی ضرورت ہے

(حلقۂ ادبِ اسلامی کراچی کے اجلاس عام مورخہ ستمبر کی پیش کش)

[1] نام نہاد ترقی پسندی

"حلقہ ادبِ اسلامی"

ادب کی محفلیں مسموم تھیں افکار حاضر سے — یکایک ان فضاؤں میں حقیقت کی کرن پھوٹی
شعورِ عہدِ نو میں نفرتوں کے "سُرخ شعلے" تھے — بجھے یہ "سُرخ شعلے" جب محبت کی کرن پھوٹی

نئے فن کار اٹھے۔ ایک نئی محفل سجانے کو — "فراعینِ ادب" کو طیش آیا اس جسارت پر
حکومت نے ادھر "احکامِ خفیہ" کر دیئے جاری — ادھر مُلاؤں کو حیرت تھی کچھ بندوں کی جرأت پر

ادب کے محتسب بولے یہ سب رجعت پسندی ہے — کسی نے دے دیا فتویٰ "یہ سب فن کار کافر ہیں"
"ادب کا ربط اور اسلام سے توبہ! معاذ اللہ" — حکومت نے کہا "در اصل یہ غدار حاضر ہیں"

بگولے تلملائے آندھیاں لپکیں بڑھے طوفاں — مگر بے باک فن کاروں کی محفل جم گئی آخر
چلی بادِ مخالف، جیسے اب تھمنے نہ پائیگی — مگر، حق کی صدا گونجی یہ آندھی تھم گئی آخر

..... اور اب یہ محفلیں آباد ہیں ہر شہر و قریہ میں — نئے روشن دماغوں کے لئے دار البقا بن کر
جہالت کے اندھیرے رفتہ رفتہ چھٹتے جاتے ہیں — بکھرتی جا رہی ہیں ان کی تحریریں ضیا بنکر

یہاں پر مصرف لوح و قلم وقفِ مشیت ہے — یہاں افکار ہیں پابند الہامی اصولوں کے
یہاں افسانہ و شعر و سخن بھی اک عبادت ہے — مہکتے ہیں یہاں گلشن حقائق رنگ پھولوں کے

Divine Principal 905 - Ans

یہاں شاعر گھنی زلفوں کی چھاؤں میں نہیں سوتے
یہاں دنیا سے اکتائے ہوئے انساں نہیں ہوتے
وہ مستقبل کی صبحوں کے مقدس گیت گاتے ہیں
مصائب میں بھی یہ مردانِ غازی مسکراتے ہیں

یہاں بھیگی ہوئی راتوں میں مے نوشی نہیں ہوتی
اک آوازِ اذاں ہے - بزم جس سے چونک اٹھتی ہے
یہاں انساں حسیں چہروں کے دیوانے نہیں ہوتے
یہاں مینا کی قلقل - اور پیمانے نہیں ہوتے

یہاں پر عشوہ و ناز و ادا - بے معنی سے ہیں
یہاں کوئی "کسی کے" ہجر میں تارے نہیں گنتا
یہاں پر تیغ ابرو، تیر مژگاں بھی نہیں ہوتے
یہاں پر "کوئے جاناں" "روئے جاناں" بھی نہیں ہوتے

یہاں پر طنز کے نشتر نہیں "تنقید" میں پنہاں
یہاں مجبور انسانوں پہ ہنستا بھی نہیں کوئی
یہاں "تضحیک" کے پہلو نہیں ہیں "دلنوازی" میں
نمک پاشی نہیں ہوتی یہاں کی چارہ سازی میں

یہاں شہرت کی خاطر کوئی فن پارے نہیں لکھتا
یہاں پر "لذتِ جنسی" نہیں محور فسانوں کا
یہاں دولت کی خاطر علم و فن بیچے نہیں جاتے
یہاں ناموس و غیرت کے کفن بیچے نہیں جاتے

یہاں فکر و عمل میں بعد اور دوری نہیں ہوتی
"یقیں محکم - عمل پیہم - محبت فاتح عالم"
یہاں ہر زندگی اسلام کے سانچے میں ڈھلتی ہے
یہ وہ آتش ہے جس سے شمع اس محفل میں جلتی ہے

یہ اک چھوٹی سی دنیا ہے انہی باغی ادیبوں کی
یہ تیرہ سو برس پہلے کے انسانوں کا پرتو ہے
بجز خالق نہیں جھکتی کسی در پر جبیں جن کی
ابھی تک نقش ہے تاریخ پر فتحِ مبیں جن کی

(حلقہ ادب اسلامی کراچی کے اجلاس عام منعقدہ ، ستمبر کی پیشکش)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ●

اسلامی حکومت کے بنیادی اصول

اسلامی حکومت کی اولین بنیاد قرآن مجید میں یہ بیان کی گئی ہے :-

یاایہا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیئ فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تومنون باللہ والیوم الآخر۔

"اے لوگو، جو ایمان لائے ہو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان حکم رانوں کی جو تم میں سے ہوں، پھر اگر تمہارا آپس میں کسی معاملے میں اختلاف ہو جائے تو اس کو پھیر دو اللہ اور اس کے رسول کی طرف، اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو!"

اس آیت میں چار اہم دستوری نکتے ارشاد ہوئے ہیں:-

اوّل یہ کہ خدا اور رسول کی اطاعت مقدم ہے اور اولی الامر کی اطاعت اس کے بعد۔ دوّم یہ کہ اولی الامر صرف وہی ہو سکتے ہیں جو مسلمانوں میں سے ہوں۔ ایک غیر مسلم اسلامی حکومت کا رکن تو ہو سکتا ہے مگر کارفرما (اولی الامر) نہیں ہو سکتا۔ سوّم یہ کہ پبلک کو حکام سے نزاع کا حق حاصل ہے۔ افراد کو بھی اور بحیثیت مجموعی قوم کو بھی حکام کی بے چون وچرا اطاعت کا حق نہیں پہنچتا، یہ حق صرف خدا اور رسول کے لئے خاص ہے۔ چہارم یہ کہ جب پبلک اور احکام کے درمیان نزاع ہو تو اس کا فیصلہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے مطابق ہونا چاہئے یعنی اصل فیصلہ کن قانون خدائی قانون ہے، کوئی انسانی قانون نہیں!

یہ چار نکتے بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے کہ اگر تم خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو یہ عمل اختیار کرو یعنی اگر تم یہ طرز عمل اختیار نہیں کرتے تو نہ تم مسلمان ہو نہ تمہاری حکومت اسلامی ہے۔ اس بات کو آگے چل کر اور بھی زیادہ سخت الفاظ میں یوں بیان کیا گیا ہے:

فلا وربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینہم ثم لا یجدون فی انفسہم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما۔

"نہیں اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے رب کی قسم لوگ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں تم کو اپنا حکم نہ بنائیں پھر جو فیصلہ تم کرو اس پر اپنے دل میں تنگی تک نہ محسوس کریں بلکہ سر تسلیم خم کر دیں۔"

اس کے معنی یہ کہ جب تک رسول خدا کو حکم (Final Authority) نہ مانا جائے، کوئی شخص مومن ہو ہی نہیں سکتا، یہ بات جس طرح ایک فرد کے معاملے میں صحیح ہے اسی طرح ایک حکومت کے معاملے میں بھی صحیح ہے جس حکومت کے دستور میں رسول خدا کے حکم کو آخری فیصلہ کن سند نہ تسلیم کیا گیا ہو وہ ایک اسلامی حکومت نہیں ہو سکتی۔

دوسرا اُصول

اسلامی حکومت کا دوسرا بنیادی اصول یہ ہے کہ حکومت کے احکام اور ملک کے قوانین سب کے سب خدا کی نازل کردہ شریعت پر مبنی ہونے چاہئیں اس اصول کو قرآن ان الفاظ میں پیش کرتا ہے :-

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک هم الکافرون .... هم الظالمون .... هم الفاسقون

"جو لوگ خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں، وہی کافر ہیں ...... وہی ظالم ہیں ...... وہی فاسق ہیں۔"

دوسری جگہ سورۂ نحل میں ارشاد ہوا ہے :-

"اپنی زبانوں سے جھوٹ موٹ نہ کہا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام"

یعنی جن معاملات میں اللہ اور اس کے رسول نے فیصلہ دیدیا ہو ان میں ہم کو قانون سازی کا کوئی حق نہیں ہے ہمیں اگر کسی معاملے میں قوانین بنانے کا حق ہے تو وہ وہ معاملات ہیں جن میں خدا اور اس کے رسول نے کوئی واضح حکم نہیں دیا ہے ۔

تیسرا اصول

اسلامی حکومت کا تیسرا اصول یہ ہے کہ اس میں نہ کوئی پہلے کا چلتا ہوا ایسا قانون جاری رہ سکتا ہے نہ آئندہ کے لئے کوئی ایسا قانون بنایا جا سکتا ہے، اور نہ حکومت کوئی ایسا حکم دے سکتی ہے جو قرآن و سنت کے خلاف ہو اس معاملے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بالکل صاف ہے کہ :-

"خالق کی معصیت میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں ہے"

اور یہ کہ :-

"خدا کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت نہیں ہے اطاعت اگر ہو سکتی ہے تو صرف معروف میں ہو سکتی ہے"

چوتھا اصول

اسلامی حکومت کا چوتھا اصول یہ ہے کہ اس میں لوگوں کو جان و مال اور عزت کے تحفظ کی جو ضمانت دی جائے گی وہ کسی فرد یا گروہ کی طرف سے نہیں بلکہ خدا اور رسولؐ کی طرف سے دی جائے گی اور قانون خداوندی کے سوا کسی دوسرے قانون کے تحت کسی شخص کے ان بنیادی حقوق پر ہاتھ نہ ڈالا جا سکے گا اس دستوری قاعدے کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے :-

"جس شخص نے وہ نماز ادا کی جو ہم کرتے ہیں، اس قبلہ کی طرف رخ کیا جس کی طرف ہم رُخ کرتے ہیں اور ہمارا ذبیحہ کھایا وہ مسلمان ہے جس کے لئے اللہ اور اسکے رسول کا ذمہ ہے۔ پس تم اللہ کے دیئے ہوئے ذمے میں اس کے ساتھ دغا بازی نہ کرو"

اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اسلامی حکومت میں شہریوں کو بنیادی حقوق کی جو ضمانت دی جاتی ہے وہ دراصل خدا اور رسولؐ کی طرف سے دی جاتی ہے اور اگر کوئی حکومت یہ ضمانت دینے کے بعد قانون الٰہی کے سوا کسی دوسرے طریقے پر شہریوں کے اس حق کو چھینے تو وہ دراصل خدا کے ساتھ دغا بازی کی مجرم ہے ۔

ایک اور حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دستوری مسئلے کو یوں بیان فرمایا ہے ۔

"مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں پھر جب وہ ایسا کر دیں تو وہ مجھ سے اپنی جانیں بچا لیں گے الا یہ کہ اسلام کے حق کی بنا پر ان سے تعرض کیا جائے اور ان کے باطن کا حساب اللہ کے ذمے ہے"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اسلامی حکومت کے فرمانروا کی حیثیت سے ہے۔ لہٰذا آپ کے بعد آپ کے نام پر جو حکومت بھی بنے اس کا یہی قانون ہوگا۔ یعنی وہ اگر کسی کو تحفظ کے اس حق سے محروم کرے تو حق الاسلام کی بنا پر کرے گی اور وہ لوگوں کے باطن کا حساب ہاتھ میں نہ لے گی بلکہ اللہ پر چھوڑ دے گی اس کا معاملہ لوگوں کے ساتھ ان کے ظاہری اعمال کے لحاظ سے ہوگا۔ وہ یہ نہیں دیکھتی پھرے کون کیا سوچ رہا ہے کیا کرنا چاہتا ہے اور کیا کرنے والا ہے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر ایک لاکھ زیادہ مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"تمہاری جانیں، تمہارے دل، تمہاری آبروئیں ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں جس طرح آج کا دن"

یہ الفاظ قیامت تک کے لئے اسلامی حکومت کی رعا[illegible] بنیادی حقوق کا چارٹر ہیں ۔

اس کے ساتھ حضرت عمرؓ کا یہ قول بھی یاد رکھنے کے لائق

"اسلام میں کسی شخص کو عدل بغیر قید نہیں کیا جا سکتا"

عدل کا لفظ یہاں وہی معنی رکھتا ہے جو امریکی دستور میں (Due Process of Law) کا مفہوم ہے یعنی عملی باضابطہ کارروائی۔

پانچواں اصول اسلامی حکومت کا پانچواں بنیادی اصول یہ ہے کہ قانون کی نگاہ میں سب لوگ یکساں ہیں حکمران اور رعایا، امراء اور غرباء، بڑے لوگ اور چھوٹے آدمی سب کے لیے اسلام میں ایک ہی قانون ہے کسی کے لئے کوئی مخصوص امتیازی حقوق نہیں ہیں اس سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح حدیث ہے

"کسی شخص کو کسی شخص پر کوئی فضیلت نہیں اگر ہے تو صرف دین وتقویٰ کی بنا پر ہے"

اس بات کو حضرت عمرؓ نے اپنے خطبے میں یوں ارشاد فرمایا ہے

"سب لوگ اللہ کے دین میں یکساں ہیں ان کے بڑے بھی اور انکے چھوٹے بھی"

اسلامی حکومت میں خود صدر حکومت کو بھی ایک عام آدمی کی نسبت زیادہ حقوق حاصل نہیں ہیں۔ ہر شخص حکومت کے ہر عہدہ دار اور ہر وزیر اور امیر پر بلکہ خود امیرالمومنین پر بھی دعویٰ کر سکتا ہے اور اس کو عدالت میں گواہ یا مدعا علیہ یا ملزم کی حیثیت سے طلب کرا سکتا ہے کوئی بڑے سے بڑا شخص حتیٰ کہ امیرالمومنین بھی اسلامی عدالت میں کسی امتیازی سلوک کا حق نہیں رکھتا اسے بالکل ایک معمولی شخص کی طرح قاضی کے سامنے حاضر ہونا پڑے گا اور تو اور اس معاملے میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس واشرف کے لئے بھی کوئی امتیازی حق نہ تھا۔ آپ نے لوگوں کو خود اپنے مقابلے میں دعوے اور استغاثے کا حق دیا۔ آپ نے لوگوں کو خود اپنے مقابلے میں قصاص کا حق دیا آپ نے اپنے قرض خواہوں کو خود اپنے مقابلے میں تقاضے کا حق دیا حتیٰ کہ اگر کسی نے تقاضا کرنے میں گستاخی و بے ادبی بھی کی تو اس سے کوئی باز پرس نہ فرمائی۔ آپ نے اپنی آخری بیماری کے زمانے میں اعلان فرمایا کہ جس کا جو دعوےٰ بھی میرے خلاف ہو وہ آئے اور مجھ سے اپنا حق وصول کرے اس طرح خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی ذات مقدس تک قانون سے بالاتر نہیں تھی تو کسی اور کی کیا ہستی ہے کہ وہ ایک اسلامی حکومت میں ایسے کسی امتیاز کا مستحق ہو سکے۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں مصر کے گورنر حضرت عمرو بن العاص نے ان سے درخواست کی کہ حکومت کے بڑے بڑے عہدیداروں کے خلاف اگر پبلک کا کوئی شخص دعوےٰ کرے تو انھیں حاضر عدالت ہونے سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ گویا ان کی خواہش یہ تھی کہ عام لوگوں کے لئے اور قانون ہو اور گورنروں اور سرکاری عہدہ داروں کے لئے اور لیکن حضرت عمرؓ نے یہ بات ماننے سے صاف انکار کر دیا انھوں نے لوگوں کا یہ حق برقرار رکھا کہ جس بڑے سے بڑے افسر کے خلاف انھیں شکایت ہو اس پر دعویٰ کر دیں اور کسی افسر کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ عدالت سے مستثنیٰ ہو سکے۔

حضرت علیؓ نے باوجودیکہ وہ امیرالمومنین (Head of The State) تھے عدالت میں دعوے دائر کیا کہ فلاں یہودی نے میری زرہ چرالی ہے۔ استغاثہ کرنے کیلئے انھیں خود عدالت میں جانا پڑا۔ یہ نہیں ہوا کہ امیرالمومنین ہونے کی حیثیت سے انھوں نے یہودی کو پکڑوا بلوایا ہو۔ یہودی عدالت میں حاضر ہوا اور حضرت علیؓ کو اس کے ساتھ بالکل مساویانہ حیثیت سے عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑا۔ یہودی نے واقعہ سے انکار کیا۔ عدالت نے حضرت علیؓ سے گواہ طلب کئے۔ انھوں نے اپنے بیٹے حسنؓ اور اپنے غلام قنبر کو بطور گواہ پیش کیا۔ قاضی نے کہا بیٹے کی شہادت باپ کے حق میں اور غلام کی شہادت آقا کے حق میں معتبر نہیں، میں ان دونوں شہادتوں کو نہیں مانتا، کوئی اور گواہ لائیے حضرت علیؓ مجبوراً اپنے دعوے سے دست بردار ہو گئے یہودی نے یہ کیفیت دیکھی تو فوراً پکار اٹھا کہ جس دین میں یہ انصاف ہے میں اس پر ایمان لاتا ہوں۔

چھٹا اصول اسلامی حکومت کا چھٹا اصول یہ ہے کہ اس کا مقصد وجود "معروف" کو قائم کرنا اور "منکر" کو مٹانا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"یہ مسلمان وہ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں حکومت عطا کریں تو نماز قائم کرینگے، زکوٰۃ دینگے، معروف کا حکم دینگے اور منکر سے منع کرینگے"

گویا اسلامی حکومت جس مقصد کیلئے وجود میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ نماز اور زکوٰۃ کا نظام قائم کرے بھلائیوں کو پروان چڑھائے اور برائیوں کو مٹائے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ قرآن کی زبان میں وہی بھلائیاں ہیں جن کو قرآن خود بھلائیاں قرار دیتا ہے اور برائیوں سے مراد وہی برائیاں ہیں جن کو قرآن برائی قرار دیتا ہے کسی اور کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ جس بات کو چاہے برائی قرار دے اور جسے چاہے بھلائی قرار دیدے۔ لہٰذا ایک صحیح اسلامی حکومت وہی ہو سکتی ہے جس نے اپنے ذمے یہ کام لیا ہو کہ وہ نماز اور زکوٰۃ کا نظام قائم کرے گی اور ان نیکیوں کو رواج دیگی جنہیں قرآن نیکی ٹھہراتا ہے اور ان برائیوں کو مٹائیگی جنھیں قرآن بدی قرار دیتا ہے۔

بقیہ اداریہ "ادیب اور مسئلہ معاش"

کیونکہ میرا خیال یہ ہے کہ جس طرح معاشی پریشانی ادیب کی ذہنی کیفیت کے لئے خطرناک ثابت ہوتی ہے اسی طرح معاشی فراغت بھی اس کے لئے مہلک ہے۔ معاشی پریشانی ایک ایسا آہنی شکنجہ ہے جو ادیب کے ذہن کو بیچ بیچ کر مردہ کر دیتا ہے اور معاشی فراوانی وہ زہر ہے جو آہستہ آہستہ اس کی تخلیقات کو اپنی نیند آپ سلا دیتا ہے، ان دو انتہاؤں کے درمیان "خوش معاشی" کی وہ کیفیت ہے ادیب کی تخلیقات کیلئے ایک مناسب اور متوازن ماحول کرتی ہے۔ اور ہم اس کے ادبی وجود کو زیادہ دنوں تک زندہ رکھ سکتے ہیں اور زندگی کی تعمیر میں اس کی صلاحیتوں سے بہتر سے بہتر اور زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں +

"محمود فاروقی"

سلورین پلز ——— مقویات کا سرتاج

مردوں کے لئے

ایک اچھا متوازن اور آج کل کا آزمودہ جنرل ٹانک ہے

جو

بھوک بڑھاتا ہے جسم میں تازہ سرخ خون پیدا کرتا ہے اور طاقت بڑھاتا ہے

سلورین پلز پر آپ بھروسہ کر سکتے ہیں

قیمت:- چالیس گولی، چار روپے بارہ آنے
اسی گولی، نو روپے
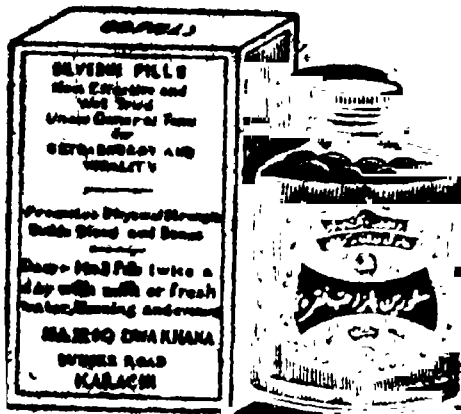
ساختہ:- حاذق دواخانہ، بندر روڈ، کراچی نمبر ۱

مولانا مسعود عالم ندوی ●

وہ چند مُفکّر اور مُجاہد

جو مصر کی تقدیر مستقبل بنانیوالے ہیں!

الاخوان المسلمون اور اس کی سرگرمیوں سے "تسنیم" کے پڑھنے
لے ناواقف نہیں ، یوں بھی مصر کی ہر جدوجہد اور انقلاب کے سلسلے
ں ان کا نام ضرور آتا ہے ' اب وہ مصر میں ایسی عوامی طاقت ہیں
کوئی فریق نظر انداز نہیں کر سکتا ، گو عراق ، شام اور شرق اردن
بر میں بھی اخوان کی سرگرم اور فعال جماعتیں ہیں ، مگر انتظامی
ر پر وہ اپنی مستقل حیثیت رکھتی ہیں ۔ مصر کی جماعت سے ان کا کوئی
ضابطہ تعلق نہیں اور یہ ان ملکوں کے سیاسی حالات کے پیش نظر
ملاہے ۔ آج کی صحبت میں ہم الاخوان المسلمون (مصر) کے صرف
ند ممتاز کارکنوں کا تعارف کرانا چاہتے ہیں ۔ ان کے نام تو اخبار ین
سامنے ہی رہتے ہیں ۔ یہاں ان کی صلاحیتوں اور سرگرمیوں سے
علق اپنا تاثر پیش کرنا مقصود ہے ۔ "سوانح حیات" لکھنا مطلوب
ہیں اور نہ اس کا موقع ہے ۔

۱ ۔ حسن اسماعیل الہضیبی

مصر کے مشہور قانون دانوں میں ان کا شمار ہے دو برس
پہلے تک محکمۃ النقض (عدالت عالیہ) کے قانونی مشیر تھے ۔ ان
کی ساری زندگی بے داغ اور بے لوث خدمت میں گزری ، قرآن
کریم سے خاص شغف ہے ، ان کا کوئی بیان کتاب اللہ کی تلاوت
و تدبر کی تاکید سے خالی نہیں ہوتا ۔ المسلمون (مشہور ماہنامہ
رسالہ جس کے ایڈیٹر سعید رمضان ہیں) میں "ھذا القرآن"
کے عنوان سے ان کا ایک سلسلہ مضامین شائع ہو رہا ہے جس سے
ان کے فکر و نظر اور کتاب اللہ سے شغف کا اندازہ ہوتا ہے حسن البنا
مرحوم کی زندگی ہی میں الاخوان کی دعوت سے متاثر ہوئے اور مرحوم

سے مراسلت بھی رہی پچھلے دنوں الدعوۃ کے خاص نمبر میں
المرشد الملہم (موہوب مرشد) کے عنوان سے انھوں نے
ایک مضمون لکھا تھا جس میں اپنے "تاثر" اور اخوان سے ابتدائی واقفیت
کی روداد قلم بند کی تھی ، اس نازک دور میں مرشد عام (امیر) کے
منصب کے لئے ان کا انتخاب ، الاخوان المسلمون کی مردم شناسی
کی دلیل اور دعوت کے لئے فال نیک ہے ، اس انتخاب پر
شیخ حسنین محمد مخلوف (مفتی الدیار المصریہ) جیسے محتاط اور سنجیدہ عالم
نے جن شاندار الفاظ میں الاخوان کو مبارکباد دی تھی ، ان سے ہضیبی
صاحب کے ساتھ ہماری بہترین توقعات بندھ گئی تھیں اور اب سال
بھر کے تجربے نے ان توقعات کو اور پختہ کر دیا ہے

۲ ۔ عبد القادر عودہ

حسن الہضیبی کی طرح یہ بھی قانون داں ہیں اور ڈیڑھ دو برس
پہلے تک الاخوان کی سرگرمیوں میں شریک نہیں ہوئے ایک ماتحت
عدالت میں جج تھے ۔ دعوت سے متاثر ہوتے ہی اسلامی قانون پر
مطالعہ شروع کر دیا اور حیرت انگیز طور پر اس پر جلد دسترس حاصل کر لی
کہ بہت تھوڑی مدت میں کئی گراں قدر کتابیں[1] لکھ ڈالیں ۔ ان کی
ایک کتاب (التشریع الجنائی الاسلامی) تو اتنی ضخیم اور قیمتی ہے کہ
بعض اہل نظر کی رائے میں صدیوں سے اسلامی قانون پر ایسی چیز
نہیں شائع نہیں ہوئی (ہمارے رفیق طالب صاحب اس کا
ترجمہ کر رہے ہیں) اب وہ ملازمت سے مستعفی ہو کر وکالت کرتے

[1] عبد القادر عودہ کی بعض کتابوں پر تبصرہ کرنے کے لئے ترجمان القرآن
کی تازہ اشاعت ملاحظہ کی جائے ۔

ہیں نئے انتخاب میں انہیں الاخوان کا وکیل (نائب امیر) منتخب کیا
گیا ہے یہ عجیب اتفاق ہے کہ "مرشد" اور "نائب مرشد" دونوں
اب تک الاخوان کی عملی جد و جہد سے الگ تھے - پھر بھی انکا انتخاب
عمل میں آیا حالانکہ قید و بند سہنے والوں اور مصائب سے دوچار
ہونیوالوں میں عبدالحکیم عابدین اور رالبہی الخولی جیسے ادیب اور
عالم بھی تھے - ہماری رائے میں یہ جذبات اور وجدان پر فکر
اور سوجھ بوجھ کے غلبہ کا اعتراف ہے یہ راقم کا ذاتی تاثر ہے جو
ممکن ہے غلط ہو - والعلم عند اللہ -

لیکن بایں ہمہ عبدالقادر عودہ کی شخصیت زیادہ موثر
نہیں معلوم ہوتی ، وہ سراپا قانون نظر آتے ہیں - خط وکتابت سے
بھی اس کی تصدیق ہوتی - ان کے برعکس حسن الہضیبی میں فکر وجدان
کا اچھا امتزاج ہے -

۳ - عبدالحکیم عابدین

حسن البناء مرحوم کے زمانہ سے یہ الاخوان کے جنرل سکرٹری
تھے اور نئے انتخاب میں بھی اپنے منصب پر برقرار رہے پختہ ادیب
اور قادر الکلام شاعر ہیں - ان کی بعض نظمیں اخوانی بچوں کا ترانہ
بن گئی ہیں ایک مشہور نظم میں وہ "مرشد" سے خطاب کرتے ہوئے
کہتے ہیں : "ہمیں پہاڑوں اور قلعوں سے ٹکرا کر دیکھ لیا جائے
انشاء اللہ پائے ثبات میں لغزش نہیں آئے گی - ہم جیلوں کے
لئے پیدا کئے گئے ہیں - آپ ہمیں نظربندی کے کیمپوں (معاقل)
اور قید خانوں کے لئے وقف کر دیجئے " وھبنا[1] للمعاقل والسجن
یہ نظم عرصہ کی ہے ، مگر ان کی پیشگی درخواست حرف بہ حرف
پوری ہوئی اور خود اس نازک خیال شاعر پر ایسی سختیاں کی
گئیں کہ پڑھکر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں -

حسن البناء مرحوم کے عزیز خاص یعنی ان کے بہنوئی بھی
ہیں - مرحوم کا کمال اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے خاندان کے
تمام افراد ان کے گرد سمٹ آئے اور دعوت کے سرگرم کارکن بن گئے

(۴) صالح عشماوی

دعوت کے آغاز سے یہ حسن البناء مرحوم کے
دست راست رہے تعلیم تو "کلیۃ التجارۃ" میں
مگر تحریک کے سلسلے میں صحافت کی ذمہ داریاں ان
آئیں - روزنامہ الاخوان المسلمون کے چیف ایڈیٹر بھی تھے
پر مرشد مرحوم کے بعد اخوان میں انہی کا درجہ تھا ، ا
ہے کہ جب پاکستان راہ حق جیلوں سے باہر آئے تو مر
صاحب سربراہ کار بن گئے یا بنائے گئے اور بڑی تن
ابتلاء و آزمائش کے دور میں جماعت کی قیادت کر
جب حالات سازگار ہوئے ، تو نیا انتخاب عمل میں آیا ،
مکتب الارشاد (مجلس شوریٰ) کے سب سے پرانے اور
ہیں - اور الدعوۃ (ہفتہ وار) کے ایڈیٹر - الدع
باضابطہ آرگن کے فرائض انجام دیتا ہے خود صالح
لکھنے والے نہیں ، مگر ان کا دل ایمان کی حرارت سے
اس لئے افتتاحیوں میں زبان و بیان کی کمزوری
زندگی محسوس ہوتی ہے ، آدمی سراپا اخلاص ہیں
جاذب شخصیت پائی ہے -

۵ عبدالعزیز کامل

نئے تعلیم یافتہ ، مگر بڑے متین اور سنجیدہ
مالک ہیں - مرشد مرحوم کے زمانہ میں تربیت گاہ
تھے - الدعوۃ میں ان کے قلم سے تربیت گاہو
موثر روداد نکل رہی ہے - اس سے معلوم ہوتا ہے
مرحوم دعوت میں قیام لیل اور انابت الی اللہ کو کس
دیتے تھے ، عبدالعزیز کامل کا بیان ہے کہ "تربیتو
جب بھی آخر رات میں بیدار ہوا ، مرشد مرحوم کو
کھڑا پایا - وہ تربیت کے قوانین اپنے آپ پر پہلے نا
افسوس کہ وہ کراچی آئے مگر ملاقات نہ ہو

---

[1] واو الگ ہے اور ھبنا الگ وھبنا ایک لفظ نہ پڑھا جائے

ر اندازہ ہوسکتا ہے اس سے عاجز کے دل میں ان کی بڑی قعت
نربیت گاہوں کے نظام کو وہ "نظام الکتایب" کے نام سے
دم کرتے ہیں ۔ کتیبۃ کے معنی "فوجی دستہ" کے ہیں۔ مختلف
دں کے لئے "کتائب" کا الگ نظام تھا اس مخصوص تربیت
.ود ادعبدالعزیز کامل قلمبند کر رہے ہیں ۔ اس شعبہ کا نام
یتبۃ انصار اللہ" تھا ۔ یہ بھی مکتب الارشاد کے رکن ہیں ۔

۶۔ محمد الغزالی

ازہر کے عالم ، اور غالباً اسی کے کسی شعبہ میں کام
تے ہیں ۔ الاخوان کے صاحب فکر و نظر لوگوں میں ان کا
رہے ان کی متعدد تصنیفات کا ذکر ترجمان میں آچکا ہے
رتازہ اشاعت میں بھی ان کی بعض کتابوں کا تعارف کرایا گیا
ہے ۔ آدمی سنجیدہ' بالغ نظر اور انداز بیان دلنشیں ہے اخوان
کے نوجوانوں میں ان کی کتابیں بہت مقبول ہیں ۔ یہ بھی مکتب الارشاد
کے رکن ہیں ۔

یہ چند نمایاں اور ممتاز کارکنوں کے متعلق سرسری خاکے
یا تاثرات ہیں ۔ ان کے علاوہ "مکتب الارشاد" کے باقی سات
ارکان کا تعارف راقم کے ذمہ رہ جاتا ہے ۔ انشاء اللہ پھر کسی
فرصت میں یہ کمی پوری کرنے کی کوشش کی جائیگی ۔

اگرچہ اخوان کے تمام نمایاں اور ممتاز کارکن مکتب الارشاد
کے اندر محدود نہیں (مرشد عام اور سیکرٹری کو ملاکر "مکتب الارشاد"
کے صرف تیرہ رکن ہیں) جماعت کا حلقہ اثر بہت وسیع ہے
اسی لحاظ سے نئے نئے کارکن میدان عمل میں آرہے ہیں ۔

(بشکریہ تسنیم)

افادات مسیح الملک

مسیح الملک حافظ محمد اجمل خان صاحب مرحوم کا مکمل

"دستور العلاج"

جس میں سر سے پاؤں تک کثیر الوقوع بیماریوں کا بیان معہ تشخیص اور علاج حکایات کی صورت میں
بیا گیا ہے ۔ قابل قدر اور مفید کتاب ہے ۔ قیمت فی جلد تین روپے آٹھ آنے

حاذق دواخانہ ، بندر روڈ کراچی نمبر ۱

سے طلب فرمائیے

محمد عثمان رمز •

غالب کا تصورِ مذہب

کیرڈ (Caird) نے کانٹ (Kant) اور ہیگل (Hegel) پر کتابیں لکھی ہیں۔ ایک جگہ کہتا ہے "انسان قبل اس کے کہ اپنی ذات کو دیکھے وہ اپنے خارجی ماحول کو دیکھتا ہے انسان قبل اس کے کہ وہ نیچے دیکھے اوپر کی سمت دیکھتا ہے" اس سے ظاہر ہے کہ یہ وسیع کائنات، کائنات کے چاند ستارے، کائنات کے پھول کانٹے، کائنات کے دریا اور پہاڑ اور کائنات کے شعبہ ہائے رنگ رنگ دعوت فکر و نظر دے رہے ہیں۔ یہی کائنات ہے جس میں وہ پروان چڑھتا ہے۔ پھر یہی کائنات ہے جس کے بارے میں وہ سوال کرتا ہے -- کیا اس کا کوئی پیدا کرنے والا ہے؟ اس سوال کے ابھرتے ہی اس کے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات جنم لیتے ہیں اور اس کے لئے یہی کائنات پریشانی کا باعث بن جاتی ہے لیکن سوال کرنے کے بعد اسے جواب دینا ہی پڑتا ہے۔ اس کے لئے دو ہی جواب ممکن ہیں۔ یا تو وہ یہ کہے کہ اس کائنات کا کوئی خالق نہیں یا یہ کہے کہ بغیر ایک خالق کے یہ مخلوق ناممکن ہے جو پہلا جواب اخذ کرتا ہے اسے ہم دہریہ (atheist) کہتے ہیں "دہریہ" اس لئے کہ وہ کائنات ہی کو سب کچھ مان لیتا ہے اور اس کا ادراک اس سے آگے نہیں بڑھتا اور دوسرا جواب پسند کرنے والے کو ہم خدا پرست یا (آستک) یا (Theist) کہتے ہیں۔

موخر الذکر صورت میں دو نظریے ممکن ہیں۔ اول یہ کہ کائنات خدا ہے اور خدا کائنات۔ اس نظریے کے ماننے والوں میں غزالی، ابن العربی کے علاوہ اسپینوزا (Spinoza) اور شنکر (Shanker) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اس نظریے کو غیر شخصی (Impersonal) نظریۂ خدا کہتے ہیں۔

دوسرا نظریہ ہے کہ انسان ہی کیا بلکہ کائنات کی ہر ہستی سے بالاتر ایک ہستی ہے جو دنیا کے نظام کو چلا رہی ہے اور یہ تصور مذہب میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ غالب کیا تھا اس کا جواب اس کے اشعار دیں گے۔ وہ خدا کے وجود کا منکر نہیں بلکہ بغیر اس کے وہ سمجھتا ہے کہ کائنات کی تخلیق امر ناممکن ہے لہٰذا وہ استفہامیہ انداز میں کہتا ہے ؎

کوئی مجھ بن اگر نہیں موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یا اس شعر کو ملاحظہ فرمائیے اس میں خدا کے وجود کو مانتے ہوئے شاعر کہتا ہے ؎

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

یا اس شعر کو دیکھیے ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا میرے ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا

رام بابو سکسینہ کا خیال ہے کہ غالب نے فلسفہ اور تصوف کا باقاعدہ مطالعہ کیا تھا لیکن اس کے باوجود اس کی فکر میں ایک مخدوش بھی ہے جسکو ہم تذبذب (Skepticism) کہتے ہیں اس لئے غالب کے کلام میں تضاد پایا جاتا ہے۔ یہ تضاد اس کے خطوط اور کلام دونوں میں موجود ہے۔ خطوط میں اس نے فلسفہ نشاط پر بجا زور دیا ہے مگر شاعری میں شمع سوزاں کی طرح عمر بھر گھلتا رہا کے عقیدت مندانہ جذبہ سے مجبور ہو کر وہ نعت رسولؐ اور مدح نظم کرتے ہوئے غلو کر جاتا ہے لیکن دنیائے فکر و نظر میں وہ جاتا ہے اور اس کا مذہب "ترکِ رسوم" ہو جاتا ہے۔ ایسا کیوں

ی سمجھتا ہوں کہ غالب کی فکر تشکیک اور تذبذب سے چھٹکارا
تک نہیں پہنچ سکی۔ ملاحظہ ہو کس فریب کارانہ خود اعتمادی کے
رہ کہتا ہے

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگا
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

ذ بہت کچھ ہے "کچھ بھی" نہ ہونے کا تو کوئی امکان ہی نہیں۔ ہمارے
ر فلسفی شنکر بھی دنیا کے کچھ نہ ہونے کا قائل تھا۔ وہ ثبوت دیا کرتا
ر دنیا کو آلات حواس کی مدد سے دیکھیں گے تو دنیا "کچھ" یعنی حقیقت
ہو گی لیکن اگر اس نظریہ کے تحت دیکھیں جو مافوق الحواس خمسہ
(Transcendent) ہو تو یہ دنیا "مایا" اور فریب"
(illusion) نظر آئے گی

یہ صحیح ہے یا غلط؟ اس کا جواب آجکل کی اس دنیا سے مانگئے
یت (Realism) کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ میرا
ب تو یہاں شنکر کی تصدیق یا تردید نہیں بلکہ غالب کے تضاد کو
رنا ہے۔ ایک جگہ وہ دنیا کو "کچھ" مانتا ہے دوسری جگہ وہ اسے رد کرتا ہے

غالب کے اس متضاد فکری رجحان پر تھوڑی سی روشنی ڈالنے کے
بعد میں غالب کے ایمان کے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔ ہمیں معلوم
غالب خدا کے وجود پر ایمان رکھتا ہے اور اس کا تصور خدا کے بارے
صوفیانہ ہے۔ تمثیلاً یہ شعر درج کرتا ہوں ؎

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں
حیران ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

وم ہو جانے کے بعد کہ غالب کا تصور خدا صوفیانہ ہے ہمیں اسکے تصور ایمان
پر کھنے میں آسانی ہو گئی ہے۔ خود غالب ہی کی زبان سے سنیئے ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

اعر کا مطلب بالکل واضح ہے وہ انسانیت کو گروہوں اور ملتوں میں
قسم دیکھنا نہیں چاہتا بلکہ برعکس اسکے وہ انسانوں کی عالمگیر برادری
نظریہ پیش کرتا ہے۔ اس جذبے کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے دنیا
ہر صلح پسند شہری یہی چاہتا ہے کہ انسانوں کے درمیان جغرافیائی حدود

نہ رہیں۔ انسان بجائے اس کے پاکستان یا ہندوستان کا شہری ہو
اسے دنیا کا شہری ہونا چاہیئے لیکن یہ بات اسی وقت صحیح معنی میں
کہی جا سکتی ہے جبکہ خدا کے صوفیانہ تخیلی تصور کے بجائے خدا کو احکم الحاکمین
لامحدود سمیع اور بصیر مانتے ہوئے یہ بھی تسلیم کریں کہ وہ ہماری حیات کا
خالق ہی نہیں بلکہ اس کا رہبر بھی

غالب نے تو صرف ملتوں کو ملا کر جزو ایمان تیار کیا لیکن ابن العربی
نے تو یہاں تک کہہ دیا:

"خدا کا مظہر چونکہ ہر شے میں موجود ہے اس لیئے انسان جس
شے کی چاہے پرستش کرے وہ پرستش خدا کی پرستش ہوگی" یہ تعلیم
زندگی کو سنیاس اور یوگ کا راستہ تو دکھا سکتی ہے لیکن زندگی کو عمل
اور حرکت کبھی نہیں دے سکتی۔

ان تصورات کے بعد ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ غالب کا تصور آخرت
کیا ہے اس لئے کہ یہی وہ تصور ہے جو انسانی عمل کو نیکی اور بدی کے
معیار پر پرکھتا ہے وہ اپنے ایک شعر میں کہتا ہے ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

یوں ٹال جائیں اس کی بات دوسری ہے ورنہ یہ شعر غالب
کے مذہبی میلان کی چغلی کھا رہا ہے اس شعر سے اور جنت اور دوزخ
کے دوسرے حوالوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالب آخرت کا قائل
ہے اور وہ یہ بھی مانتا ہے کہ اس دن حساب وکتاب ہوگا لیکن شعر کا تیور
صاف صاف یہ بتا رہا ہے کہ غالب کو خدا کے نگراں فرشتوں پر بھروسہ
نہیں۔ اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ خدا نے انسانی اعمال کے ریکارڈ
کا جو طریقہ اختیار کیا ہے اس پر غالب کا ایمان نہیں تو معاملہ مشتبہ
اور مذبذب ہی ہوگا۔

تصور آخرت کو شوخی سے ٹالنے کے باوجود بھی وہ خدا سے
خائف ہی رہتا ہے وہ جانتا ہے کہ اس کی گرفت بہت ہی سخت ہوتی
اور اس سے شاہ و گدا، امیر و غریب، اور ظالم و مظلوم کوئی بچنے والا نہیں
اس لئے وہ ملتجیانہ انداز میں کہتا ہے ؎

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

لیکن پھر ایک شعر میں اس کی پہلی سی شوخی واپس آجاتی ہے اور وہ کہتا ہے ؎

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

اوپر کی سطروں سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ غالب بنیادی طور پر آخرت پر ایمان تو رکھتا ہے مگر اسکے تذبذب (Scepticism) نے جابجا اس کے قدموں کو ڈگمگا دیا ہے۔

غالب جنت اور دوزخ کے بارے میں بھی ایک تصور رکھتا ہے اس کے اس مشہور شعر کو دیکھئے ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

اس جگہ بجائے کھل کر جنت کی حقیقت سے انکار کرنے کے اس نے شاعرانہ شوخی کا سہارا لے کر اسکے تصور کو دھندلا کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہاں غالب کے خیال میں پھر تضاد اور ٹکراؤ نظر آتا ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ مختلف فلسفیوں کے نزدیک جنت و دوزخ کا تصور مختلف ہو۔ مثلاً یہ کوئی تصور کرے کہ جب کوئی شخص عالم خوشی میں ہوتا ہے تو وہ جنت میں ہوتا اور جب دنیا کے غم میں تو دوزخ میں ہوتا۔ یا پھر کوئی مذہب کے اس تصور کو تسلیم کرے یعنی یہ کہ یہ بستیاں (جنت و دوزخ) زمان و مکان (Time and Space) سے باہر ہیں اور انسان اپنے عمل کے لحاظ سے جنت یا دوزخ کا مستحق ٹھہرتا ہو یا پھر غالب کی طرح کوئی کسی واعظ سے کہے ؎

کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ
خلد بھی باغ ہے خیر آب و ہوا اور سہی

یا یہ کہے ؎

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

لیکن یہ امر محال بلکہ ناممکن ہے کہ کوئی تصور آخرت پر ایمان تو رکھتا ہو لیکن جنت و دوزخ کا فلسفہ اس کی سمجھ میں نہ آئے۔ یہاں غالب کی غلطی یوں ثابت کی جا سکتی ہے کہ جب روزِ جزا کا ہونا ضروری ٹھیرا تو کیا رب العالمین لوگوں کو انکے اعمال کی پوچھ گچھ کے بعد یونہی چھوڑ دیگا میں سمجھتا ہوں کہ معاملہ ایسا نہیں ہے۔ خدا کو کوئی تفریح تو مقصود نہیں اس تصور کا تو واحد مقصد یہ ہے کہ انسانوں کو اس کے اعمال کے لحاظ سے جزا، یا سزا دی جائے۔

غالب کے تصور خدا اور تصور آخرت کی طرح اس کا تصور عبادت بھی الجھا ہوا ہے آج بیسوی صدی کا ہر مفکر کم ازکم اتنا ضرور جانتا ہے کہ عبودیت کا تصور جو عہد قدیم میں تھا وہ عہد متوسط میں نہیں رہا اور جو عہد متوسط میں رہا وہ عہد جدید میں نہیں۔

انسانوں کی عبودیت کا محرک پہلے استعجاب (wonder) ہوا کرتا تھا۔ کسی انسان نے کسی تعجب خیز چھوٹی یا بڑی شے کو دیکھا اور سر نیاز خم کر دیا اور اس کی پوجا پاٹ شروع کر دی۔ اس کے بعد استعجاب کی جگہ جذبات اور جوش (emotion) نے لے لی۔ انسانوں نے داخلی جذبہ سے متاثر ہو کر ان انسانوں کی پوجا شروع کر دی جن سے وہ مرعوب ہوئے۔ جذبات کو مٹانے والی شئے "عقل" تھی۔ انسان کی عقل جوں جوں ترقی کرتی گئی اور قوت ادراک تیز سے تیز تر ہوتی گئی اسے دریا، پہاڑ، جانور اور انسانوں کی پرستش مہمل نظر آنے لگی اور اس نے رفتہ رفتہ اس پرستش کو ترک کر دیا لیکن جو اب بھی جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں وہ اسی پرانی روش کے دلدادہ ہیں۔

عیسائیت اور اسلام کے ساتھ ساتھ مذہب کا عقلی تصور انسانوں کے سامنے آیا۔ انھوں نے یہ بتایا کہ کائنات کا پہلا انسان عقلی تصور مذہب رکھتا تھا۔ اس نے اس کی تبلیغ بھی کی۔ لیکن اس کے دوسرے ہم جنس اگر گمراہ ہو گئے تو اس کا اس میں کوئی قصور نہیں

غالب کا تصور عبادت عقل و جذبات کے امتزاج سے پیدا ہوا ہے۔ اس کے جذبات کا تقاضا ہے کہ روح محدود کو لامحدود میں فنا کر دیا جائے اور اس کی عقل یہ تقاضا کرتی ہے کہ خدا کی بے لاگ عبادت کی جائے۔ نہ تو اس میں جنت کی خواہش ہو اور نہ دوزخ کا خوف۔ اسی خیال کو وہ اپنے ایک شعر میں ظاہر کرتا ہے ؎

[illegible]ت میں رہ نہ جائے مئے وانگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

الب ہی نے تو یہ شعر بھی کہا ہے ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت وزہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ا ضمن میں میں صرف اتنا کہوں گا کہ یا تو غالب کو ثواب طاعت وزہد" لوم ہی نہ تھا کہ وہ صحیح اسپرٹ (spirit) کے تحت ں پر عمل کرتا یا پھر وہی تذبذب کارفرما تھا جو ہمارے فلسفہ کی حیثیت سے ں کے پورے کلام میں موجود ہے

اس مقام پر غالب کے تصور مذہب کی بابت کچھ حرف آخر ا حیثیت سے کہا جاسکتا ہے ۔ پہلی بات جو کہنے کی ہے وہ یہ کہ الب اس مسلمان کی طرح ہے جو "مسلم گھرانے" میں جنم لیتا ہے اور س سے زیادہ کچھ نہیں ۔ البتہ اس حیثیت سے وہ نعت رسول اور رح علی کرتا ہے ۔ لیکن اس کی قدر وہی ہے جو بادشاہ ظفر کی شان میں لے ہوئے قصیدے کی ۔ یہاں وہ صرف اپنے جذبہ —— (Sentiment) سے مغلوب نظر آتا ہے

دوسری بات یہ ہے کہ غالب فلسفی ہے اور اس کا مزاج صوفیانہ ر غالب کے یہ تصورات اپنے دور کی قدرتی پیداوار ہیں ۔ اس زمانہ کا ماحول تیزی سے بدل رہا تھا ۔ مسلمان پستی کی طرف جا رہا تھا ۔ انگریز حکومت ی باگ ڈور سنبھال رہے تھے ۔ ہندو بھی ابن الوقتی کی پالیسی کے تحت حکومت کا بوجھ اٹھا رہا تھا اور آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا ۔

غالب نے ان تبدیلیوں سے فرار اختیار کرتے ہوئے بغیر صوفیانہ تخیل آرائی میں پناہ لی ۔ کیونکہ یہی وہ واحد نظریہ ہے جو ہر مذہب وملت کے لوگوں کو یہ کہہ کر کہ خدا کا جلوہ ہر شے میں ہے خوش کرتا ہے کیونکہ یہی وہ نظریہ ہے جو دیر وحرم اور کفر وایماں کی کش مکش سے پہلو بچانے میں مدد دیتا ہے ۔

ہم یہ کہہ سکتے کہ غالب کا تصور مذہب ان روایات کی پیداوار ہے جو نسلاً بعد نسلٍ غالب کو ملی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ اس ماحول کا آئینہ دار ہے جس میں غالب سانس لیتے لیتے ایک دن دنیا سے سدھار گئے ۔

اس کشمکش میں نظر یقیناً مذہب کا سائنسی اور واقعاتی تصور نہیں تھا وہ پیدائشی مسلمان تھا لیکن اسے یہ کہاں معلوم تھا کہ دین اسلام " انسان کے ہر شعبۂ زندگی میں دخیل ہے ۔ اسے یہ کہاں معلوم تھا کہ دین اسلام " تخیل اور رہبانیت کی دنیا میں لے جانے کے بجائے وہاں سے انسان کو مادی دنیا میں لے آتا ہے ۔ اور " تکمیلِ زندگی " کے حصول ——

کیلئے زریں اصول دیتا ہے ۔ اسے یہ کہاں معلوم تھا کہ " دین اسلام " سیاسی ، معاشرتی اور معاشی پریشانیوں کا حل بھی رکھتا ہے ۔ یہ ہے اس زمانہ کے شاعر کا تصور مذہب جبکہ ہندوستانی سامراجیت اور غیر ملکی صنعت (Industrialization) کے درمیان پلاسی کے مقام پر جنگ ہو چکی تھی ، جبکہ دہلی کی آخری " کٹھ پتلی " بیٹھا برج بیچ دی گئی تھی جب کہ کشت وخون سے دہلی کے لالہ زار شرما رہے تھے جبکہ لوگوں کے اندر غدر کی ناکامی نے جذبۂ فراریت کو ابھار دیا تھا ——!!

نظام باطل کے خلاف اور نظام حق کیلئے جد وجہد کرنیوالا آپکا قدیمی ساتھی

ہفتہ وار **حیات نو** حیدرآباد دکن

نئی کاوشوں کے ساتھ پھر میدان عمل میں آگیا ہے

تعمیری ادب بے لاگ جائزے ، ملکی اور بین الاقوامی سیاست پر جامع تبصرے روح کو بیدار کرنے والی نظمیں اور تحقیقی مقالے ، انسانیت کو زندہ کرنے والے افسانے ، علوم قرآنی سے بہرہ ور کرنے والی تفہیم ، اسکے چند مندرجات ہیں —— اور جو دکن کے حالات ، تحریک اسلامی کی رفتار ، ادارہ ادب اسلامی کی سرگرمیوں سے اپنے قارئین کو ہمیشہ واقف رکھتا رہے گا ۔

پندرہ روزہ ایڈیشن — سالانہ چندہ چار روپے سکۂ ہند
ششماہی ، دو روپے آٹھ آنے

محمد بن عبداللہ مینجر حیات نو
غریب خانہ گوشہ محل ، حیدرآباد دکن

حسن ریاض ●

نیاز فتحپوری

نیاز فتحپوری مشہور آدمی ہیں۔ لکھنؤ سے رسالہ نگار شائع کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ ان کی تحریر کی رعنائی کے قائل ہیں۔ مگر وہ کیا رعنائی ہے جس کے لوگ قائل ہیں؟ وہ اپنے قلم کی کدال سے مسلمہ اخلاقی اقدار اور مہذب ترین انسانی تصورات اور عقائد کی بنیادیں کھودا کرتے ہیں۔ جن لوگوں کے دلوں میں ہوسیں بڑھی ہوئی ہیں اور نفسانیت کا زور ہو۔ نیاز کی تحریریں ان کی ترجمان ہیں اور مہذب سوسائٹی کے مقابلے میں ان کی دلیل مؤید اور پشت پناہ ہیں۔ نیاز انھیں سرکشی، تمرد، سرکشی اور بغاوت کے لئے پرفریب دلیلیں اور جھوٹی معلومات مہیا کرتے ہیں۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ کسی مسلمہ عقیدے کے خلاف اظہار رائے کرو یا کسی بڑی ہر دلعزیز شخصیت پر لعن طعن کرو، لوگ چونکہ پڑتے ہیں نہایت برائی اور غصے کے ساتھ اس کا نام زبان زد خواص و عوام ہو جاتا ہے۔ یہ بری شہرت ہے۔ مگر شہرت ہے۔ مخالفین بھی یہ دیکھنے کے لئے کہ اس شخص نے کیا لکھا اس کی تحریریں خریدتے ہیں جب مقصد صرف روپیہ کمانا ہو تو زر پرستوں کو اس کی فکر نہیں ہوتی کہ دنیا برا کہہ کر روپیہ دے رہی ہے یا تعریف کر کے۔ یہ سوقیت سہی مگر اس میں نفع ہے۔ نیاز فتحپوری کا ساری عمر یہی کاروبار رہا ہے۔

یہ شخص مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا۔ اس کا نام مسلمانوں کا سا ہے مگر ہمیشہ اس کا قلم اسلام اور مسلمانوں کے خلاف چلتا رہا۔ ہزار ہا کالجوں کے نوجوان طالب علم اس کی تحریروں سے گمراہ ہوئے اور اس کی تخریب کی آمدنی سے اس نے گلچھرے اڑائے۔ مسلمانوں کی تمام مقبول تحریکات کی انھوں نے مخالفت کی اور مسلمانوں کے دشمنوں کا یہ آلۂ کار بنے۔ مسلمان نہرو رپورٹ کے خلاف جنگ کر رہے تھے۔ نیاز فتحپوری کانگریس کی تائید کر رہے تھے اور مسلم کانفرنس کی مخالفت۔

مسلم لیگ پاکستان کے لئے جدوجہد کر رہی تھی نیاز فتحپوری مسلم لیگ اور پاکستان کی مخالفت میں مصروف تھے۔ دشمنوں کے کیمپ میں ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ یو۔ پی کے ریڈیو سے مسلمانوں کے موقف کے خلاف اور کانگریس کی حمایت میں ان کی تقریریں نشر ہوتی تھیں۔

پاکستان قائم ہو گیا، ایک آزاد اور خودمختار دولت کی حیثیت میں وہ پانچ سال سے دنیا کے نقشے پر موجود ہے۔ ہندوستان کے مسلمان مغلوب اور محکوم ہو چکے ہیں۔ ہندوستان میں اب کانگریس کو نیاز فتحپوری کے قلم کی ضرورت نہیں رہی لیکن اگر وہ پاکستان میں آ کر پاکستان کے بنیادی مقاصد کے خلاف پروپیگنڈا کریں اور مسلمانوں میں افتراق پیدا کریں تو پاکستان کے دشمنوں کو اب بھی ان کی بڑی ضرورت اور اس خدمت کا انھیں بڑا معاوضہ مل سکتا ہے۔ اس کے لئے ایجنٹوں سے نیاز فتحپوری گفت و شنید کر رہے ہیں۔ ادھر ہندوستان سے ادھر پاکستان کے ان لوگوں سے جو اسلامیت سے بیزار ہیں۔ پاکستان میں آ کر وہ ہندوستان کی خدمت کیسے انجام دے سکتے ہیں جب تک پاکستان میں ملا کر انھیں پناہ دینے والا کوئی موجود نہ ہو۔ انھیں خوب معلوم ہے کہ پاکستان میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ملائیت کے استیصال کے نام سے اسلامیت کے مخالف ہیں تاکہ ان کی آزاد روی میں فرق نہ آئے۔ ایک مشاعرے میں شرکت کے بہانے سے نیاز فتحپوری پاکستان آئے اور انھوں نے زمین ٹٹولی کہ کسی جگہ قدم جمتا ہے یا نہیں۔ سردست وہ واپس چلے گئے۔

نگار کی ستمبر کی اشاعت میں انھوں نے ایک مفروضہ لکھ کر شائع کیا ہے جو اسلامی دستور حکومت کے خلاف پروپیگنڈہ کا نمونہ ہے۔ اسی مفروضے میں انھوں نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ پاکستان کے قیام کے زمانہ میں انھوں نے کوئی ڈائری مرتب کی ہے وہ انکے پاس

ر وہ کسی وقت بھی شائع ہو سکتی ہے ۔ لہذا پاکستان کے بیرونی
سنوں کو چاہیئے کہ اس کا اس سے سودا کریں اور پاکستان کے ان بے
غیرت دوستوں کو چاہیئے کہ اس سے سودا کریں جو اسلامیت سے
بزار ہیں اور مغربیت اور لادینی پر فریفتہ ہیں ۔

ہم حکومت پاکستان کو متنبہ کرتے ہیں کہ اگر نیاز فتح پوری کو پاکستان
یں قیام کرنے کی اجازت دی گئی تو یہ پاکستانیوں کے اتحاد، دوسپلن
اور اعتقاد ہر چیز کے لئے نہایت مہلک ثابت ہوں گے اور یہ شخص
پاکستان میں رہ کر صرف کانگریس اور بھارت کے مقاصد کو تقویت دیگا
گزشتہ ۴۰ ، ۵۰ سال نیاز فتحپوری نے کانگریس اور اس کے بعد کانگریسی
حکومت کا پروپیگنڈا کیا ہے ۔ بالکل اسی مقصد کے لئے وہ اب
پاکستان آنا چاہتا ہے ۔ ہمیں اسکے اسلامی نام سے ہرگز دھوکہ نہیں
کھانا چاہیئے ۔ (بشکریہ مقاصد)

معدہ کی خرابیوں کو نظر انداز نہ کیجئے ـــــ کہیں
معدہ کی خرابیاں آپ کو نظر انداز نہ کردیں

ہضمی
ایک بہترین سفوف معدہ ہے
جو فعل ہضم کو فطری طور پر کام کرنے میں مدد دیتا ہے ۔ اور معدہ کو ہر خرابی
سے محفوظ رکھتا ہے
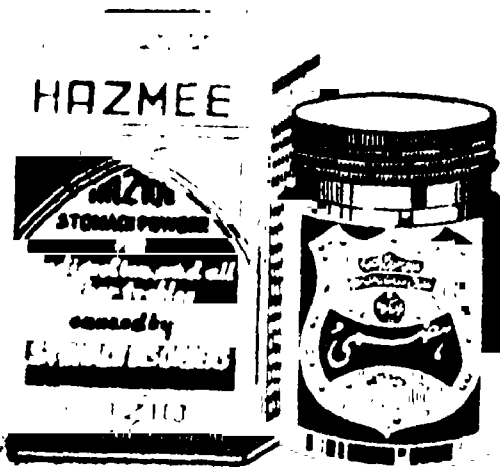
حفظ ماتقدم علاج سے بہتر ہے

اس لئے ہضمی استعمال کیجئے ۔ تاکہ آپ کا معدہ ہر خرابی سے محفوظ رہے
قیمت فی شیشی ایک روپیہ چار آنے

تیار کردہ
حاذق دواخانہ ، بندر روڈ ، کراچی نمبر ا

خدا تو ملتا ہے انسان ہی نہیں ملتا یہ چیز وہ ہے کہ دیکھی کہیں کہیں ہم نے

اس بربریت وحیوانیت کے دور میں ماہنامہ " انسان " ہی مرحوم انسانیت " کا واحد ترجمان ہے ۔ ہر پڑھے لکھے انسان کیلئے
اس کا مطالعہ بے حد ضروری ہے ۔ نمونہ کیلئے تین آنے کے ٹکٹ اور جواب طلب امور کے لئے جوابی خط لکھیے ۔

دفتر ماہنامہ " انسان " جامی روڈ ، گوجرانوالہ

عالم اکبرآبادی

اعتراف

ایک تصویر تخیل میں بنائی میں نے / اپنے جذبات کی لے اور بڑھائی میں نے

جس کی ادنیٰ سی کنیزوں میں حسینانِ جہاں / حسن سے جس کے ہوں مرعوب فقیہانِ جہاں

جس کی ہر جنبشِ ابرو سے جہاں برہم ہو / جس کی تمثیل شباہت بھی جہاں میں کم ہو

جس کی گفتار میں نغموں کا ترنم پنہاں / جس کی خاموش نگاہوں میں تکلّم پنہاں

جسکے چہرے سے ستاروں کی ضیا شرمندہ / وہ وفادار کہ سیتا کی وفا شرمندہ

وہی نجمہ، وہی عذرا، وہی سلمیٰ میری / نہ ہوئی آج تک آسودہ تمنا میری

مجھے اس درد نے رکھا ہے پریشاں برسوں / دیدۂ و دل رہے صرفِ غمِ جاناں برسوں

اس فسانے کو حقیقت نہ سمجھنا اے دوست / میری روداد محبت نہ سمجھنا اے دوست

آج سے عارض و رخسار کی باتیں موقوف / یعنی انکار کی اقرار کی باتیں موقوف

جاہلیت کے زمانے کی وہ باتیں نہ رہیں / یعنی وہ دن نہ رہے اور وہ راتیں نہ رہیں

شعر کی آڑ میں کردار بگاڑے میں نے / کتنے انسانوں کے اطوار بگاڑے میں نے

میں نے الفاظ کے پردے میں ہوسکاری کی / میں نے اخلاق کے منشور سے غداری کی

شعر سے قوم کی تقدیر بدل سکتی ہے / اب بھی گرتی ہوئی دیوار سنبھل سکتی ہے

آج انجام سے آغاز بدلنا ہے مجھے
اپنی تحریر کا انداز بدلنا ہے مجھے

(حلقہ ادب اسلامی کراچی کی ہفت روزہ نشست میں پیش کی گئی)

ظہر ادیب •

تضاد

خاتون کہیں پاس سے ہو کر گزریں
پھر مہک آئی مہک اُٹھی گذرگاہِ دماغ
پھر چھلک اُٹھے وہ بے صبر نگاہوں کے ایاغ
لو، وہ بجھنے لگے نوخیز تقدّس کے چراغ
ایک خاتون کئی تاؤ ڈبو کر گزریں

ل بات ہو کوئی، تو کوئی بات بھی ہے
ہم نے مانا کہ نگاہوں کا تصادم — لازم
کسی انبوہ میں باہوں کا تصادم — لازم
جیسے چوراہوں میں راہوں کا تصادم — لازم
دل - کہ انجان ہی، کچھ موردِ آفات بھی ہے

- کہ یوں موردِ آفات ہی، انجان ہی
مگر اس راہ میں آہوں کا تماشہ کیا ہے
حرص و تحریص کا سڑتا ہوا لاشہ کیا ہے
نوجواں عمر — مچلتا ہوا ارمان ہی
تم گذرتے رہے . . .

مہکے ہوئے گلزاروں سے
تم گذرتے رہے . . .
اثمار کے انباروں سے
تم گذرتے رہے . . .
تزئین کے بازاروں سے
تم گذرتے رہے . . .
تہذیب کے میناروں سے

رشک آیا تھا، ضرورت کا سوال آیا تھا
روح اور تن کے تقاضوں کا خیال آیا تھا
مگر آئینۂ عصمت میں نہ بال آیا تھا

تم گذرتے رہے تھامے ہوئے دامانِ وقار
اپنے پہلو میں لئے ایک گلستانِ وقار
جذبۂ حرص سے آلودہ نہ تھی شانِ وقار
ایک خاتون جو گذریں تو وہ آیا بھونچال
جیسے بیچارہ جوانوں کا نہ ماضی ہو نہ حال

(حلقۂ ادبِ اسلامی - کراچی کے اجلاس عام میں پڑھی گئی)

حاوی چشتی •

میر ساماں

ستارے چھپ گئے شب رنگ سایوں کا فسوں ٹوٹا
سحر کے دل نشیں آثار مشرق سے ہوئے پیدا
پیام زندگی دینے لگا ہر مست کن جھونکا
اشارے کر رہے ہیں دیکھ تجھ کو گلشن و صحرا
خدا خود میر ساماں است ارباب توکل را

عمل انساں کا صورت گر تقدیر ہوتا ہے
عمل سے تیرے قصر زندگی تعمیر ہوتا ہے
عمل پر انحصار عزم عالمگیر ہوتا ہے
خدا کا نام لے اٹھ اور میدانِ عمل میں آ
خدا خود میر ساماں است ارباب توکل را

اگرچہ ہر قدم پر ایک طوفان مصیبت ہے
غضب ہے ناخدا غافل ہے محوِ خواب راحت ہے
مگر ان مشکلوں سے کانپنے کی کیا ضرورت ہے
مصاف زندگی میں رکھ قدم مردانہ وار اپنا
خدا خود میر ساماں است ارباب توکل را

وہ شور کارواں اٹھا وہ آواز درا آئی!
کر آغاز سفر اپنا باندازِ گوارائی —!
نہ ہو زنجیر پا تیرے لئے احساس تنہائی
شریک کارواں ہو کر امیر کارواں ہو جا
خدا خود میر ساماں است ارباب توکل را

ہے راز کامیابی تیری بے برگ و نوائی میں
الجھ کر رہ نہ جانا تو خیال نارسائی میں
بڑھائے جا قدم تو اپنے دل کی رہنمائی میں
یقیناً ذرہ ذرہ رہنما ہو جائے گا تیرا
خدا خود میر ساماں است ارباب توکل را

بلا سے چلتے چلتے راہ میں جو شام ہو جائے
فضائے دہر گو گہوارہ آلام ہو جائے
مخالف تیری گرچہ گردش ایام ہو جائے
چلا چل حوصلہ فرسا موانع کی نہ کر پروا
خدا خود میر ساماں است ارباب توکل را

طلب امن و مسرت کی فریب آلودہ
یہ ایسا ہے کہ جیسے مانگنا پانی کا صحرا سے
براہِ راست رکھ قائم تعلق اپنے مولا سے
تجھے کیوں ہو غم امروز و اندیشۂ فردا
خدا خود میر ساماں است ارباب توکل را

فقیری میں بھی کی جاتی ہے شاہی بزم امکاں
فراز و پست کی نیرنگیاں ہیں چشم عرفاں
مثالیں جابجا موجود ہیں تاریخ انساں میں
جو ثابت کر رہی ہیں اس حقیقت کو سر دنیا
خدا خود میر ساماں است ارباب توکل را

جو حکم لیس للانسان الا ماسعیٰ سمجھے
حقیقت میں وہی مفہوم تسلیم و رضا سمجھے
نہ ہو جس کو شغف قرآن سے وہ راز کیا سمجھے
کہ جادہ کتنا ہی مخدوش ہو عزم و تجسس کا
خدا خود میر ساماں است ارباب توکل را

(بشکریہ عز

ترجمہ: فضل من اللہ

جب پاکستان برطانیہ پر حکمراں ہوگا

نیم سرکاری مراسلہ

نمبر ا۔ب۔ج/۵۴۳۲۱/دہ

اسپیرئل پاکستان سیکرٹیری ایٹ

قائد آباد

مورخہ ۱۴ اگست ۱۹۸۰ء

محترمی ع۔ک صاحب

محکمہ نوآبادیات نے آپ کو ضلع لنکا شائر (انگلینڈ) کا ڈپٹی کمشنر مقرر کیا ہے۔
آپ کو مبلغ بائیس سو روپے ماہوار تنخواہ ملے گی، پاکستان نوآبادیاتی سروس
رولز کے ماتحت مقررہ الاؤنس اور مبلغ چار سو روپے سمندر پار کھتہ اس کے علاوہ ہوں گے۔
آپ کو اجازت ہے کہ اس مکتوب کے اجراء سے ایک ماہ بعد تک اپنا عہدہ سنبھال لیں۔ آپ کے
اس تقرر کا اعلان گزٹ میں کیا جا رہا ہے

آپ کا مخلص
ب۔ا۔ شیخ
معتمد نوآبادیات : حکومت پاکستان

مابعد

میں "ڈیفنس آف برٹین رولز" کے تازہ ترین ایڈیشن کی ایک جلد حوالے کی آسانی
کی غرض سے اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ نیز "برطانوی باشندوں سے کیا سلوک کیا جائے"
نامی کتابچہ بھی ارسال ہے۔ یہ آپ کافی مفید پائیں گے۔

ب۔ا۔ش

مزید تفاصیل حاصل کرنے کے لئے میں اگلے دن ہی دفتر نو
آبادیات گیا۔ مجھے جلد از جلد لنکا شائر روانہ ہونے کے لیئے کہا گیا۔
کیونکہ وہاں غیر مطمئن شہریوں نے شدید انٹی پاکستان ایجی ٹیشن شروع
کر رکھی تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ انگریز باغیوں کی ٹولیوں نے تو پاکستانی

فوج نے متیم انگلینڈ کے خلاف باقاعدہ گوریلا جنگ شروع کر رکھی ہے ۔ان قانون شکن ٹولوں کی سرگرمیوں کا مرکز زیادہ تر لنکاشائر ہی تھا حکومت پاکستان اس فسادزدہ علاقے میں امن کی بحالی کے لئے انتہائی طور پر خواہش مند تھی۔ اس لئے اس نے اکیس تربیت یافتہ افسروں کا ایک گروپ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس عاجز کو بھی ان اکیس افسروں میں شامل کیا گیا تھا۔

دفتر نوآبادیات کے معتمد پاکستان سول سروس کے ایک پرانے اور تجربہ کار رکن ہیں ۔انھوں نے برطانیہ کے عام حالات اور مجھے جو فرائض وہاں سرانجام دینے تھے انکے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہا "آپ جانتے ہیں کہ ہم ایک عمدہ ثقافت رکھنے والی قوم ہیں ہماری روایات شرافت کا دلپذیر مرقع ہیں اور ہمارا تمدن دنیا کے قدیم ترین تمدنوں میں سے ایک ہے اہل برطانیہ کی برسر اقتدار جنگ بازمنڈلی کی وجہ سے بے شمار تباہ کن اور خونخوار جنگوں کا سامنا کرنا پڑا ہے جس سے انکی حالت حد سے بدتر ہوگئی ہے اور انکے حوصلے پست ہو گئے ہیں۔ اب ہمیں ان کے معیار ثقافت اور تعارف کو بلند کرنا ہے اور ان لوگوں کو جن کی پرورش تباہ جنگ اور حملہ آوری کے تخیل میں ہوئی ہے نئی قدروں کا احساس دلانا ہے جب آپ وہاں جائیں تو اپنے طرز عمل اور حسن سلوک سے ان لوگوں کو اس طرح متاثر کیجئے کہ وہ آپ کی اور آپ کے ملک کی عزت کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ آپ اس بات کو پیش نظر رکھیں کہ آپ ان پر اپنے ملک کی اپنے لباس اور زبان کی اور اپنے طرز زندگی کی برتری واضح کردیں اور وہ ہر چیز کے لئے آپ اور آپکے ملک کی جانب رجوع کریں۔

"میں ہر ممکن کوشش کروں گا جناب ——— مجھے معلوم ہے کہ ایک نومفتوحہ ملک میں مجھے کیا کرنا چاہیئے۔"

برطانیہ پر پاکستان نے قبضہ کیونکر کیا تھا؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ آج سے پچیس برس قبل جب تیسری عالمگیر جنگ کا خاتمہ مغربی اقوام کی شکست پر ہوا تو ایسا ہوا۔ اس جنگ کے سرآغاز امریکہ اور مغربی یوروپی قومیں ایک طرف اور روس اور چین دوسری طرف تھے۔ جاپان، بھارت، انڈونیشیا، مشرق وسطےٰ کے ممالک اور دوسری ایشیائی طاقتیں غیر جانبدار ہیں جنگ کے ابتدائی عرصہ میں وسیع جنگ کی گھمن گرج میں امریکنوں کو کوریا میں ایک دوسرا "ڈنکرک" نصیب ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جلدی روسی افواج غربی یورپ پر قابض ہوگئیں۔ ان واقعات کا ایشیائی "غیر جانبداروں" پر بڑا خوشگوار اثر پڑا۔ چنانچہ جاپان کوریا سے مغربی فوجوں کے انخلا کے بعد شرقی اتحادیوں سے مل گیا! ادھر جلدی روسی افواج نے غربی یوروپ کو روند ڈالا۔ اُدھر بھارت اور انڈونیشیا نے بھی جاپان کی پیروی کی۔ پاکستان تو صرف وقت کا منتظر تھا، وہ ملک بھر کی "خلاف غرب تحریک" سے متاثر ہوکر شرقی بلاک میں شامل ہوگیا۔ انگلستان کے روسی افواج کے ہاتھ سے چلے جانیکے بعد مشرق وسطےٰ کے ممالک نے شرقی بلاک کے ساتھ اتحاد کا اعلان کردیا اور پرانی حکومتوں کی جگہ عوامی نمایندوں نے لے لی۔

اب جبکہ مشرقی بلاک منظم ہوکر امریکہ کے خلاف صف آرا ہوا تھا جنگ چند سال اور جاری رہی۔ امریکی ایٹمی اور جراثیمی ہتھیاروں نے اگرچہ انسانی جان و مال کا بھاری نقصان کیا لیکن آخر کار مشرق کی "قوت ارادی" غالب آئی اور انھیں فتح ہوئی اور مشرق کو مغرب کی لوٹ کھسوٹ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نجات دلانے کے لئے اور ایشیا کو لوٹ کھسوٹ اور ناجائز ارتقاع کے ایک اور دور سے محفوظ کرنے کے لئے اور امریکی فتح کو شکست سے بدلنے کے لئے مشرق کی محدود اسلحہ کی مالک فوجیں ایک نیا اور اٹوٹ عزم لیکر ایک نئی حیات کے ساتھ میدان میں آئیں اور انھوں نے امریکہ کی مہیب جنگی مشینری کو شکست دینے کے لئے خون کی ندیاں بہادیں اور بے شمار قربانیاں دیں۔

مغربی اقوام کی کلی شکست کے بعد قبضہ ——— اور امن اور عمومی زندگی بحال کرنے کے لئے شرقی اتحادیوں کی مجلس نے مغربی ممالک اور انکی نوآبادیات کو تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور یوں چین نے ریاستہائے متحدہ (امریکہ) پر، روس نے مغربی جرمنی، ڈنمارک، ناروے، بلجیم اور ہالینڈ پر بھارت نے فرانس، اسپین اور سوئٹزرلینڈ پر قبضہ کرلیا، انڈونیشیا کو اٹلی اور یونان ملا اور پاکستان کو انگلستان اور آئرستان۔ شمالی امریکہ (کنیڈا) جنوبی امریکہ افر

اور آسٹریلیا جو غربی ممالک کی نوآبادیات تھیں خود مختار قرار دی گئیں۔

انگلینڈ میں قیام کے سلسلہ میں تیاریاں کرتے وقت مجھے اس بات کا انتہائی اشتیاق تھا کہ کپڑے کافی تعداد میں سلواؤں کیونکہ مجھے معلوم ہوا تھا کہ انگلینڈ میں ایسے اچھے درزیوں کا ملنا از قبیل محالات ہے جو اچھے پاکستانی کپڑے تیار کر سکیں۔ یوں چند درزیوں نے پاکستانی کپڑے سینے کا اہتمام کر رکھا تھا مگر ان کی سلائی معیاری نہ تھی۔ اس لئے میں نے تمام ضروری کپڑے (پگڑی، لمبی قمیص، گرم شلواریں، کشمیرے اور گرم پٹی کی بنی ہوئی اچکنیں، شام کو پہننے کے لئے تہبند اور دوسری مختلف چیزیں جو پاکستان میں بنتی تھیں) خرید لئے پاکستان نے پہلے ہی کپڑا تیار کرنا شروع کر دیا تھا جو نوآبادیات کو کثیر تعداد میں برآمد کیا جاتا تھا جو اس کے بدلے خام مال درآمد کرتی تھیں۔

مناسب تیاریوں کے بعد "شہر ملتان" نامی پاکستانی بحری جہاز پر سوار ہوا اور دو ہفتوں لورپول پہنچ گیا اور لورپول سے بذریعہ گاڑی صرف آدھ گھنٹہ میں مانچسٹر کے سب سے بڑے شہر لنکا شائر پہنچ گیا۔ ادھر گاڑی رکی، ادھر انگریزوں کا ایک ہجوم میرے ڈبے کی طرف لپکا۔ اس ہجوم میں شرفائے شہر، اعلیٰ عہدیدار، دفتری اسٹاف اور عوام تھے جو میرا استقبال کرنے آئے تھے۔ شرفا اور اعلےٰ عہدیداروں کی اکثریت پاکستانی لباس میں ملبوس تھی —— لمبی قمیص، بنڈیاں اور پگڑیاں —— کچھ لوگ اچکنیں اور جناح کیپ پہنے ہوئے تھے ماتحت دفتری اسٹاف اور چھوٹے افسر مقامی لباس میں تھے۔ کوٹ پتلون اور نکٹائیاں پہنے! اور یہ لوگ ایک کونے میں دبکے ہوئے تھے جیسے وہ اپنے ملکی لباس میں غیر مہذب نظر آ رہے ہوں اور جب وہ مجھے مبارکباد دینے آگے بڑھے تو ان کے طرز عمل میں "احساس کہتری" بطور خاص نمایاں تھا، ان میں سے اکثر بہت نیچے جھک گئے۔

جو لوگ پاکستانی لباس پہنے ہوئے تھے وہ پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے اپنے کپڑوں، پگڑیوں اور طرّوں کے مظاہرے میں جو (اکثر غلط باندھے گئے تھے اور جن کے زاویے غلط تھے) ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کر رہے تھے جب وہ مجھ سے ملنے آئے تو وہ جھک گئے اور انھوں نے مجھے اس طرح حیرت سے مبارکباد دی گویا انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ مصافحہ کرتے وقت وہ ٹپیکل لہجہ میں کہتے تھے "السلام علیکم" جو اس طرح سنائی دیتا تھا جیسے کوئی کہہ رہا ہو "اس .... م .... سلم لوکم" اسے سمجھنا بہت مشکل تھا۔ مگر تھوڑی دیر بعد میں اس کا عادی ہو گیا۔

تعارف کے بعد قائم مقام ڈپٹی کمشنر خدا بخش صاحب، مجھے شہر کے معزز رہنما سرجان گلبرٹ اور دوسرے سرکار کے ساتھ ایک اچھے منقش اسٹیشن تک لے گئے جس کے وسط میں دو فٹ چوڑا فسٹ کلاس سبز کپڑا نچلے زینے سے اوپر والے زینے تک لگایا گیا تھا .... اور پھر میں اس پر قدم رکھتے ہوئے اس حالت میں کہ سرکار دائیں اور بائیں تھے اپنے رولس رائس میں آ گیا جو دروازے کے پاس کھڑی تھی اور اس کے بونٹ پر سبز جھنڈی لہرا رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف بے پناہ ہجوم تھا اور جب میں کار میں داخل ہوا تو شہر کے انگریزی بینڈ نے جو وہاں موجود تھا، مشہور پاکستانی دھن "اے میرے چمن میں واری جاواں" شروع کی اور تماشائیوں نے "زندہ باد" کا نعرہ لگایا۔

خدا بخش صاحب مجھے ڈی۔سی کی سرکاری اقامت گاہ تک لے گئے جسے وہ خالی کر رہے تھے

اُنھوں نے مجھے مزیدار پاکستانی لنچ دیا

"بڑا شاندار کھانا ہے، کیوں بھئی پاکستان سے باورچی ساتھ لائے تھے؟" میں نے پوچھا

"نہیں صاحب" اس نے جواب دیا: "مجھے ایک انگریز باورچی مل گیا تھا جو پاکستانی کھانے خوب پکاتا ہے اور اس پر کیا موقوف ہے اس جیسے اور بہتیرے ہیں جنھوں نے پاکستانی طباخی سیکھ لی ہے ہاں یہ بات البتہ ہے کہ مقامی باورچیوں کی نسبت ہمیں انھیں زیادہ پیسے دینے پڑتے ہیں۔ یہ انگریزی نوکر فرمانبردار اور وفادار ہوتے ہیں اور تھوڑی سی تربیت سے بڑے مفید ثابت ہوتے ہیں

بھئی مجھے بڑی خوشی ہوئی" میں نے کہا "مجھے تو یہ فکر فاقتی شہر بنا ہوا تھا کہ مجھے پاکستانی کھانے کیسے ملیں گے"۔

"صاحب فکر کی کیا بات ہے" خدا بخش نے کہا "آپ کو یہاں پاکستان کی تقریباً ہر وہ چیز مل جائے گی جو آپ کو درکار ہوگی۔ انگریز آہستہ آہستہ پاکستانی طرز معاشرت اختیار کر رہے ہیں اور چند شاہ لپ بر خاندان جیسا کہ آپ مشاہدہ کریں گے، اپنے طور اطوار سے پاکستانیوں سے بھی زیادہ پاکستانی نظر آئیں گے"۔

شام کو سر جان گلبرٹ نے میری ایک ڈنر پارٹی سے تواضع کی۔ اس پارٹی میں شہر کے تمام شرفا مدعو تھے۔ اپنے مکان کے ایک بڑے کمرے میں اس نے موٹا فارسی قالین جس کے وسط میں ایک خوبصورت حاشیے والا دسترخوان بچھایا گیا تھا بچھا رکھا تھا۔ دسترخوان پر پاکستانی کھانوں ــــــ پلاؤ قورمہ، مرغ مسلم، آلو گوشت، زردہ، فرنی، کوفتے ــــــ کی متعدد طشتریاں رکھی ہوئی تھیں۔ ہمیں دسترخوان کے دونوں طرف جوتے اتروانے کے بعد بٹھایا گیا۔ ہنری ہشتم کے وقت کے چمکتے ہوئے سرکاری لباس میں ایک بیرا صابن، پانی، ہاتھ دھلانے کا باسن اور تولیہ لئے گھوم رہا تھا اور شرکائے مجلس نے باری باری ہاتھ دھوئے۔

"بھئی لیڈی گلبرٹ صاحبہ"

"جی"

"آپ لوگ چھری کانٹے کیوں استعمال نہیں کرتے؟"

اس سوال سے اس کا ذہن الجھ کر رہ گیا اور معذرت خواہانہ انداز میں اس نے کہا

"ہاں جناب! ہمارا نچلا طبقہ چھری کانٹے استعمال کرتا ہے یہ چیزیں ابتدائی انسان کا ترکہ ہیں جو کچا یا نیم پختہ گوشت چاقو سے کاٹتا اور کانٹوں سے کھایا کرتا تھا۔ ہمارے ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ خاندانوں میں نیم کچا یا نیم پختہ گوشت اب نہیں کھایا جاتا اور ہم اپنی انگلیاں استعمال کرتے ہیں جو کھانا کھانے کا یقیناً ایک قدرتی اور صاف ستھرا طریقہ ہے۔ صاحب ہم اپنے گھروں میں کبھی بھی چھری کانٹے کا استعمال نہیں کرتے۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انکے چھری کانٹے کے استعمال کا ذرا سا شبہ بھی انکے وقار کو کمتر کر دے گا اسی لئے وہ چھری کانٹے کے استعمال کے بیان میں بہت آگے بڑھ رہی تھی۔

ہم نے کھانا کھانا شروع کیا۔ جب میں نے روٹی کا لقمہ دائیں ہاتھ سے توڑا تو تمام شرفا نے میری پیروی کی لیکن لیڈی گلبرٹ کو اس کی لڑکی پریشان کر رہی تھی جس نے بائیں ہاتھ سے لقمہ توڑا تھا اس نے آہستگی سے اسے موڑا جس سے اس نے روٹی کو بائیں سے دائیں ہاتھ پر رکھ لیا۔ میں نے لقمہ آلو شوربے کی طشتری میں ڈبویا اور سب نے میری پیروی کی لیکن لقمے ذرا زیادہ ڈبو دیئے نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی آدھی آدھی انگلیاں اور انگوٹھے تر ہو گئے۔ سر جان گلبرٹ اور اس کی بیوی نے جب میری انگلیاں خشک دیکھیں تو انھیں تیزی سے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اب وہ چوری چوری نیپکن سے اپنے ہاتھ صاف کر رہے تھے

"کوئی بات نہیں لیڈی صاحبہ" میں گویا ہوا "یہ تو اس مشق کا معاملہ ہے اور تم جلد اسے جان جاؤ گی"۔

"کھانا مزے دار ہے" میں نے رائے دی۔

"شکریہ جناب عالی" سر جان گلبرٹ نے جواب دیا "میری بیٹی نے حال ہی میں پاکستانی طباخی میں ایک کورس پاس کیا ہے مطبخ کا انتظام اسی کے سپرد تھا"

میں تمہاری بیٹی کا شکریہ ادا کرنا پسند کروں گا، میں نے جواب دیا۔

"وہ جامے میں پھولی نہیں سمائے گی" لیڈی گلبرٹ نے کہا "کھانا ختم کرنے کے بعد میں اسے جناب کے حضور میں پیش کر دوں گی۔"

یہ ایک بہت بڑی پارٹی تھی اور مجھے یہاں شہر کے بہت سے معززین سے باتیں کرنے کا موقع ملا۔ بعض شہریوں نے مجھ سے اردو میں گفتگو کی، گو ان میں سے بعض ہی بے تکلفی سے اردو بول سکتے تھے۔ اکثر لوگ بڑی کوشش اور ہمت سے خود کو یہ فریب دینے میں کامیاب

رہے تھے کہ وہ اردو بول رہے ہیں۔ اکثر کے اردو کا مقامی لہجہ مضحکہ خیز
ہونے کے علاوہ نامکمل ہوتا تھا جب وہ کسی پاکستانی سے گفتگو کرتے
تو بری یا بھلی اردو بولتے تھے۔ آپس میں وہ مقامی زبان بولتے تھے
جو یہ بھی اردو الفاظ اور محاورات سے پُر ہوتی لیکن ایک پاکستانی
کی موجودگی میں وہ مقامی بولی بولنے سے اجتناب ہی کرتے تھے۔

اگلی صبح مجھے بتایا گیا کہ شہر کے اوّل اسکول نے میرے اعزاز
میں اسپورٹ ترتیب دی ہے اور مجھے وہاں تقسیم انعامات کا فرض
سرانجام دینا ہے۔ کھیلوں کے شروع ہونے سے ایک گھنٹہ قبل میری
[illegible] اسکول چلاری اور ہیڈ ماسٹر جو پاکستانی تھا میں اسکول کا معائنہ کروں
مجھے اسکول دکھایا۔ کمروں کو [illegible] سجایا گیا تھا اور ہر کمرے میں ایک تختہ
لٹک رہا تھا جس پر لکھا ہوا تھا "خوش آمدید"۔ جونہی کہ میں ایک کمرے
میں داخل ہوا تمام طلبہ [illegible] اور انھوں
نے بیک آواز "السلام علیکم" کہا [illegible]
کمرے سے نکلا تو استاد اور لڑکے ایک پیاری رفاقت کے ساتھ گا رہے
تھے "قائم رہے ہمیشہ [illegible]"۔

پھر ہیڈ ماسٹر مجھے اسٹاف روم [illegible] لے آیا اور
کہنے لگا "قبلہ عالم! یہ اطلاق اردو ہے۔ اردو لازمی مضمون ہے۔ ہر جماعت
باری باری اردو کی تعلیم حاصل کرتی ہے [illegible] اب طلبا
اتنا مشکل خیال نہیں کرتے کہ اسے سیکھ ہی نہ سکیں۔ جب میں کمرے میں
داخل ہوا میری نظر ایک بڑے بیہودہ، سیاہ ریش پاکستانی پر پڑی جس
کا لباس بھی [illegible] تھا۔ یہ حضرت یہاں انگریز لڑکوں کو اردو پڑھا
رہے تھے۔ اس نے مجھے مبارک باد دی اور مجھے اس کے ہونٹوں پر
ایک جانی پہچانی مسکراہٹ نظر آئی۔

"آپ یہاں کب آئے تھے" میں نے پوچھا

"یہی گزشتہ برس" اس نے کہا

"آپ کو کون سی چیز یہاں لائی؟"

"مجھے اردو پڑھانے کے لئے طلب کیا گیا تھا اور یہی میں اب
پڑھا رہا ہوں۔"

"یہ تو میں جانتا ہوں، لیکن کیا آپ تربیت یافتہ ٹیچر ہیں؟"

"ہاں۔"

"کیا آپ پاکستان میں بھی معلم ہی تھے اور
...... ویسے آپ کس ضلع سے تعلق رکھتے ہیں؟"

"میں ضلع جھنگ کا رہنے والا ہوں، وہاں میں پڑھایا نہیں
کرتا تھا۔

"کیا آپ کا کسی تعلیمی خاندان سے تعلق ہے؟"

"نہیں" اس نے آنکھیں نیچی کر کے کہا "میرا حجاموں کے
ایک گھرانے سے تعلق ہے لیکن یہاں میں پڑھانے آیا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں .... آپ حجاموں کے ایک گھرانے
سے تعلق رکھتے ہیں .... کوئی بات نہیں .... ذرا ادھر آیئے
(میں اسے ایک کونے میں لے گیا) آپ ان لوگوں کو مناسب تعلیم
کیونکر دیتے ہیں؟"

"اس کا فکر نہ کیجیے" اس نے کہا "اپنی ملازمت میں میں بہت
کامیاب ہوں، جن انگریز لڑکوں نے ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی جیسی
اونچی ڈگریاں لی ہیں وہ میری بڑی عزت کرتے ہیں۔ وہ اکثر میرے
پاس گھنٹوں بیٹھے رہتے ہیں اور مجھ سے اردو میں باتیں کرتے ہیں،
اور میرے [illegible] کی حرکات کو بڑے غور سے نگاہ میں رکھتے ہیں اور پھر
گھر جا کر [illegible] کے سامنے میری نقل اتارتے ہیں (اس بات کا خیال
کئے بغیر کہ اس [illegible] وہ کتنے بدشکل نظر آتے ہیں) پھر وہ واپس آتے
ہیں اور میرے سامنے جو کچھ انھوں نے مشق کیا ہوتا ہے اُسے دہراتے
ہیں لوگ میرے اردو کے علم کی بنا پہ مجھے بہت بڑا فاضل خیال
کرتے ہیں۔

"خوب! مطلب یہ کہ آپ اپنی ملازمت سے بہت خوش
ہیں .... ویسے آپ کو تنخواہ کیا ملتی ہے؟

"قریباً آٹھ سو روپے۔"

"اور انگریز معلموں کو کیا ملتا ہے؟"

"وہ بیچارے بہت مفلس ہیں اسّی سے
سو روپیہ تک ہر ایک کو مل جاتا ہے۔

واپسی پر میرے پی۔اے۔ ڈیول نے مجھے بتایا کہ ضلع کے چند معزز سلام کرنے کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔ میں نے اس سے کہا کہ ان لوگوں کو کہہ دے کہ اگلے ہفتہ کسی وقت مل لیں۔ میں اب اتنا تھک گیا ہوں کہ کسی سے مل نہیں سکتا۔

"کیا میں جناب سے عرض کروں" ڈیول نے کہا "آپ ان میں سے دو یا تین سے اسی وقت ضرور مل لیجئے، اس سے وہ اپنی عزت افزائی محسوس کرینگے۔"

"اچھا" میں نے جواب دیا "انھیں بلا لو۔ پر یہ ہیں کون لوگ؟"

ڈیول نے جواب دیا "خطاب یافتگان حکومت پاکستان کے بے حد وفادار لوگ ——— نواب ایلفریڈ جون اردن، خان خان جیفرے ڈی ماؤنٹ مورانسی، چودھری لانورڈ جیمس اور مسٹر ایڈیسن جان گلبرٹ"

"ٹھیک ہے۔ نواب اردن کو بلاؤ"

مختصر سے جسم اور متوسط عمر کا ایک شخص اندر داخل ہوا۔ موٹا بے ڈھب بڑی بڑی مونچھوں اور داڑھی والا ——— اندر داخل ہوتے وقت وہ قدرے جھک گیا اور میری میز کے قریب آکر "اسلام علیکم" کہتے ہوئے ایک بار پھر جھکا اور پھر آہستگی کی رفتار سے قدم اٹھاتے ہوئے میری جانب بڑھا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ پھیلا دیئے۔ اور پھر میرے دونوں ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے بڑی خوشی محسوس کرتے ہوئے تین بار مصافحہ کیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

"آپ کیسے ہیں نواب اردن صاحب؟" میں نے پوچھا

"میں بالکل خیریت سے ہوں قبلہ عالی! آپ کی ذرہ نوازش ہے ——— اور قبلہ عالی آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" اس نے دریافت کیا "اور جناب کے گھرانے اور بچوں کی ——— اور جناب کی قوم ——— اور ملک کی؟"

"سب ٹھیک ٹھاک ہے" میں نے جواب دیا "نواب اردن صاحب مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ ہماری سرکار کے وفادار دوست ہیں"

"شکریہ قبلہ عالی۔ میں آپ کی حکومت کا ایک عاجز خادم ہوں اور میرا سارا وقار، خوش حالی اور عزت آپ کی حکومت کی ذرہ نوازی کے طفیل ہی تو ہے۔"

"نواب اردن صاحب میں آپکے خاندان کے بارے میں کچھ سننا پسند کروں گا۔"

"حضور عالی" اس نے کہا "یہ عاجز ضلع کے سرکردہ لوگوں میں سے ایک ہے اور حکومت پاکستان نے ان خدمات کے صلے میں جو اس خاطی نے مقامی لوگوں کی حالیہ بغاوت فرو کرنیکے سلسلے میں سرانجام دیں اس گنہگار کو پانچ ہزار ایکڑ قطعہ آراضی سے نوازا۔ قبلہ عالی یہ ہیچمدان اپنے بھائی بندوں کے کرتوتوں کی بنا پر نادم ہے۔ ان لوگوں کو غنڈوں کے ایک گروہ نے گمراہ کر رکھا ہے ——— جان ٹیلر، تھمپسن اور ڈارٹ غنڈے ہی تو ہیں جو انھیں بہکاتے رہتے۔ فی الحقیقت یہ جان ٹیلر ایک بے مایہ شخص ہے جو پاکستان سرکار کے خلاف سستی ایجی ٹیشن اور نفرت پھیلا کر اونچا رتبہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ صاحب حق تو یہ ہے کہ یہ شخص تمام قومی جذبات کی سوداگری کر رہا ہے۔ اس عاصی کی رائے میں اس کے سب ساتھی بدمعاش اور گولی کے لائق ہیں۔

"فدوی کا خاندان اور برادری کے لوگ حکومت پاکستان کے وفادار ہیں۔ پاکستانی قوم بڑی شریف قوم ہے۔ ہم نے ایک پرائیویٹ دستہ ترتیب دے رکھا تھا جو باغیوں سے لڑتے اور ہم نے انھیں اپنے مورچے سے مار بھگایا۔"

"شاباش، شاباش!" میں نے شکریہ ادا کیا اور پوچھا "کیا اس خدمت کا صلہ ہے کہ آپ کو نواب کا خطاب ملا ہے؟"

"جی قبلہ عالی، مگر اس کی ایک دوسری اور بڑی وجہ یہ ہے کہ اس ناچیز نے پاکستانی افواج کے کمانڈر اعلیٰ جلالتمآب محمد خاں کی جان بچانے کے لئے جو ذاتی قربانی دی تھی وہ اس عزت افزائی کا باعث بنی۔ اس وقت جلالتمآب کا کیمپ باغیوں سے گھرا ہوا تھا اور اس بندہ بے دام کے سوا تمام اردلی فرار ہو چکے تھے۔ چنانچہ آپ کے خادم نے جلالتمآب کی جان بچائی۔"

"میں یہ سن کر بہت مسرور ہوا۔ مجھے امید ہے کہ آپ ہمیشہ اسی طرح وفادار رہیں گے۔"

وہ مجھے چند ایک ٹپ دے گا۔

میں ایک دوسری میز کی طرف رخ کرنے والا تھا کہ ایک جوان لڑکی آئی اور کہنے لگی "مداخلت معاف ہو مجھے اپنی بہن کیلئے پاکستانی جوتوں کا ایک جوڑا درکار ہے۔"

"مگر تم نے تو ایک عمدہ جوڑا پہن رکھا تو ہے" میں نے کہا

"یہ مجھے میرے منگیتر کے ذریعہ ملا تھا جو لاہور انفینٹری میں تربیت لینے گیا ہے۔"

"اچھا تو میں یہ کرتا ہوں کہ تمہیں ایک قابل اعتماد فرم کا ایڈریس دے دیتا ہوں لیکن کیا یہاں پاکستانی جوتے برآمد کرنے والی کوئی فرم نہیں ہے"

"ہے کیوں نہیں، میرے چچا مسٹر ونلڈ خود پاکستانی جوتوں کی دوکان چلا رہے ہیں لیکن وہ عام طور پر مردانے جوتے برآمد کرتے ہیں انھوں نے سستی قسم کے زنانہ جوتے درآمد کئے تھے وہ ایک دن میں ختم ہو گئے۔"

"تمھارے چچا کی دوکان کا نام ہے؟" میں نے دریافت کیا

"یہ پاکستانی جوتی گھر" کے نام سے مشہور ہے" اس نے جواب دیا۔

"ویسے ——— کیا تمہارا منگیتر لاہور سے واپس آگیا ہے"

"ہاں آں ——— بدقسمتی سے آن وہ کہیں دوسرے شہر گیا ہوا ہے" اس نے جواب دیا "میری خواہش تھی کہ آپ اس سے ملتے بڑا چاق و چوبند، مہذب اور جدید نوجوان ہے وہ۔"

میرا بھی خیال ہے، تمہارے جیسی چاق و چوبند لڑکی ویسا ہی چاق و چوبند شوہر تلاش کرے گی، "لیکن یہ تو بتاؤ تم ایک جدید نوجوان کہتی کسے ہو؟"

"ایک ایسا نوجوان جو قدیم وضع کا مالک نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ اس کا لباس اچھا ہے عمدہ پاکستانی کپڑے پہنتا ہے، چست طرّے والی پگڑی باندھتا ہے، اچکن اور شلوار پہنتا ہے اور جسے عمدہ پاکستانی تعلیم ملی ہے" اس نے کہا۔

"کیا تمہیں انگریزی سوٹ پسند نہیں؟"

"ہائے مجھے تو اس کمبخت سے نفرت ہے۔ یہ کتنا بدصورت ہوتا ہے، نکٹائی کتے کے پٹے کی طرح معلوم دیتی ہے یا غلامی کی نشانی کی مانند جو غلام لوگ قدیم ایام میں پہنا کرتے تھے اور یہ پتلون توبہ توبہ ——— قابلِ نفرت چیز۔ اس سے آدمی کی ٹانگیں ایسی بیہودہ نظر آتی ہیں جیسے انھیں دو حصوں میں کاٹ کے رکھ دیا گیا ہو اور پتلون پہنے ہوئے انسان لکڑی کی طرح سخت معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ عموماً عریاں ہوتی ہے اس لئے یہ ایک شریف آدمی کے لباس سے خارج ہے لیکن شلوار ——— اے صاحب شلوار کے کیا کہنے شاندار! مجھے اس سے الفت ہے۔ اس کے بل اس کو خوبصورت بنا دیتے ہیں اور اسے جاذب توجہ بھی بناتے ہیں۔ یہ انسان کے دقار کے اضافے کا موجب بنتی ہے اور جب اسے کلف اچھی طرح لگائی گئی ہو یہ دونوں طرف سے سخت ہو جاتی ہے اور انسانی شخصیت کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔ صاحب مجھے تو شلوار سے الفت ہے اور اس کی دل پسند کھڑکھڑاہٹ سے جو چلتے وقت پیدا ہوتی ہے۔ آہ صاحب یہ تو انسانی چال کو موسیقی سے بھر دیتی ہے اور مجھے اپنا خواہش مند بناتی ہے۔"

ابھی وہ پاکستانی لباس کے بارے میں رطب اللسان ہی تھی کہ مجھ سے مارلبرو کے ڈیوک سے ملنے کی درخواست کی گئی جو مجھ سے ملنے ہی آیا تھا، اور اس طرح اس چاق و چوبند لڑکی کو الوداع کہ کر میں ڈیوک کے ساتھ اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔

ہائی اسٹریٹ میں سے ہو کر جب ہم گھر واپس آ رہے تھے تو ہم تھیٹر کے قریب سے گزرے یہاں بکنگ آفس کے سامنے ایک بڑا ہجوم قطار میں کھڑا تھا "مسٹر ماؤنٹ بیٹن یہاں کیا چل رہا ہے؟" میں نے انگریزی سسٹم کے جو ڈرامہ کر رہا تھا پوچھا

"جناب یہ مشہور کھیل ہیر رانجھا ہے" اس نے جواب دیا۔ "یہ شہرۂ آفاق تمثیل نگار وارث شاہ کا شاہکار ہے یہ یہاں گزشتہ دس ہفتوں سے چل رہا ہے اور ہر شو کے لئے ہفتوں پہلے پیشگی بکنگ ہوتی ہے۔"

"بے نظیر!" میں نے کہا" پھر تو ہمیں چلنا چاہئے ......
...... کیا آپ نے شیکسپیر پڑھا ہے؟ میرا خیال ہے کہ ٓپکے
ا دہ بہترین تمثیل نگار ہے "
" ہاں جناب میں نے شیکسپیر پڑھا ہے لیکن وہ گھٹیا درجہ
ریں پیش کرتا ہے ۔ اس کے کھیل اکثر معمولی ہوتے ہیں اور عمدہ
ائٹی کے افراد انھیں پڑھنا پسند نہیں کرتے ——— اس کا
شاہ سے کیا مقابلہ جو خوبصورت زبان ——— موزوں دانش
بھرپور ——— ہوتی ہے ۔ کوئی بھی جو ہمارے شرفا میں کوئی رتبہ
اہے شیکسپیر پڑھنا پسند کرے گا" اور ہنستے ہوئے اس نے بات
تم کی " شیکسپیر تو واہیات ہے "
جب ہم تھیٹر میں داخل ہوئے تو مالک نے ہمارے سامنے
روگن پیش کرنے کی درخواست کی ۔ جب وہ لائی گئی تو اکیس سالہ
ن دچو بند لڑکی نظر آئی ——— چاق دچو بند اور انتہائی طور
خوبصورت ، صحت مند جسم اور خوبصورت بکھرے ہوئے بال !
" یہ مارگرٹ فلپ ہیں " مالک نے کہا " ہماری بہترین ممثلہ
ہیر کا پارٹ بڑی خوب صورتی اور قابل تعریف حد تک ادا کرتی ہے
لا یہ کی کوئی عورت اس میں اس کی ثانی نہیں ، یہی وجہ ہے کہ د
ارے برطانیہ میں مشہور ہے اور جب وہ کسی قصبے میں جاتی ہے
ہزاروں کا مجمع اسے محض ایک نظر دیکھنے کے لئے آموجود ہوتا ہے
" کھیل کب شروع ہوگا؟" میں نے پوچھا
" لوک ناچ کے بعد " جواب ملا
" یہ لوک ناچ ہوکب رہا ہے؟ کیا یہ انگریزی لوک ناچ ہوگا؟"
نہیں جناب یہ پنجابی رملتانی ، جھمر ہوگا یہ آپکے بائیں ہاتھ والے
رش پر ہوگا اور عوام میں سے نوجوان مرد اور عورتیں اس میں شامل ہوں گی
م ہر شام اس کا انتظام کرتے ہیں کیونکہ یہ زیادہ لوگوں کو لانے کا باعث
بنتا ہے
" آپ کے ہاں انگریزی بال ڈانس نہیں ہوتا کیا؟"
" نہیں جناب یہ نچلے درجے کے لوگوں کا ناچ ہے غیر مہذب
اور اعلیٰ طبقے کے لوگ ہی اس میں حصہ لیتے ہیں "

"خوب! پر اس میں برائی کیا ہے؟"
" برائی؟ صاحب یہ تو بالکل عامیانہ ہے ، یہ کتنا عریاں ہے
مرد اور عورت ایک دوسرے کے رو در رو کھڑے ہو کر اس طرح ناچتے ہیں
کہ منظر کریہہ عامیانہ ہو جاتا ہے ——— کوئی بھی عمدہ
مرد یا عورت ایسا گھٹیا قسم کا ناچ پسند کرے گا ۔ ہم تو پنجابی بھنگڑا
اور جھمر کے رسیا ہیں ——— یہ کتنے شاندار ہیں! ہمارے نوجوان
لڑکے اور لڑکیاں ——— عام طور پر جھمر پارٹیوں میں شرکت کرتے
ہیں لیکن آج ہم خٹک ناچ سے ابتدا کریں گے ۔ جھمر بعد میں ہوگا ۔
" بہت خوب! آؤ اسے شروع کریں ۔ جھمر بعد میں ہوگا "
" ابھی مقررہ وقت میں نصف گھنٹہ باقی ہے لیکن جناب شاید
یہ آپ کی بابرکت حاضری کا باعث ہے کہ ہال پہلے ہی فل ہے اور ہم
بڑے آرام سے اسے شروع کر سکتے ہیں "
پل بھر میں ڈھول اور شہنائی کی آواز نے ہال کو مینی موسیقی سے
بھر دیا اور خٹک ناچ شروع ہوا میں اسے بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہا ۔
جب جھمر شروع ہوا میں فرش پر چلا گیا میرا وہاں شریک ہونا تھا کہ آناً فاناً
فرش بھر گیا اور اس پر داخلہ بند کر دیا گیا ۔
جلد ہی جھمر اپنے عروج پر تھا ۔ دو ڈھول اور پانچ شہنائیاں
مختلف دھنیں بجا رہی تھیں اور لوک ناچ اپنے عظیم اسٹائل کے ساتھ
جاری تھا ۔ ادھر یہ اپنے منتہا کو پہنچا ادھر میرے بگ بن ٹائم پیس کا
الارم بجنے لگا ۔ میری آنکھ کھل گئی ۔ شہنائی کی آواز ابھی تک میرے کانوں
میں آ رہی تھی اور میرے بازو نغمگی کے ساتھ متحرک تھے حتیٰ کہ نوکر نے
مجھے گستاخانہ جھنجھوڑا اور کہا " صاحب کیا ہو گیا ، چائے ٹھنڈی
ہو رہی ہے " (پاکستان ٹائمز)

خریداران رسالہ مشیر کی خدمت میں التماس ہے
کہ خط و کتابت کے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ
ضرور لکھا کیجئے ۔ "مینیجر"

محمود ردونق •

شن چھالا کی سڑک!

(یہ ایک افسانہ نہیں حقیقت ہے اس کے کریکٹر آج بھی زندہ ہیں، ان کے دن اور ان کی راتیں آج بھی ایسی ہی گزرتی ہیں یہ اور بات ہے کہ ہند کی تقسیم نے ہمارے اور ان کے درمیان ایک حد فاصل کھڑی کر دی ہے۔ م۔ ر۔)

شن چھالا جانے والی سڑک کی عمر بہت طویل ہے، جب یہ نئی نئی بنی تھی اس وقت اتنی مسطح نہیں تھی جتنی آج ہے قریب کی بستیوں کے لوگوں نے آپس میں ایک ایک پائی کا چندہ کر کے اسکو بنایا تھا پشتارہ اور راساری کے بہت سے دیہاتی نوجوانوں نے بھی اس کی تعمیر کے لئے مٹی کے ٹوکرے اٹھائے تھے اس وقت شن چھالا کی سڑک نے سوچا تھا کہ "میں ان کے درمیان کتنی خوشی سے رہا کروں گی"۔ گو یہ نوجوان سیاہ فام ہوتے، اور انہوں نے شہر کے اونچے اونچے محلات کی تہذیب بھی نہیں سیکھی تھی، لیکن باوجود اس کے وہ مجسم انسانیت تھے، شن چھالا کی سڑک سوچتی کہ آج اسی چیز کی ضرورت ہے، وہ کہتی کہ "اس دنیا میں انسانیت کا کتنا کال پڑ گیا ہے، کئی کروڑ انسان اس دنیا میں رہتے بستے ہیں لیکن ان میں سے صرف چند ایسے ہیں جن میں انسانیت نظر آ سکتی ہے باقی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انسانوں کے روپ میں جانور پھر رہے ہوں"۔ اس سے بہتر تشبیہ بیچاری شن چھالا کے ذہن میں اور آ بھی کیا سکتی تھی؟ اسکا یہ خیال بھی تھا کہ انسانیت کے بچے کھچے آثار پشتارہ اور راساری جیسے دیہاتوں میں اب بھی مل جاتے ہیں ـــــــ یہ اسی زمانہ کا ذکر ہے جب کہ یہ تعمیر ہو رہی تھی۔ کہیں دور سے دو مسافر تھکے ہارے ادھر سے گذر رہے تھے۔ انہوں نے پشتارہ کے رندھیرے کچھ مانگا تو نہ تھا لیکن اس نے تاڑ لیا کہ یہ بیچارے بھوکے ہیں پشتارہ جیسے دیہات کے رہنے والے کو اتنا جاننا کافی ہوتا ہے چنانچہ وہ انکو اپنی خستہ جھونپڑی میں لے گیا اور جو کچھ تھا اس نے ان کے سامنے پیش کر دیا۔ بیچاروں کے ہاں ہوتا ہی کیا ہے؟ اس دن ر[illegible] کے پاس پچھلے دن کی روٹیاں اور دال رکھی تھی۔ جب یہ مسافر گئے تو پشتارہ کا سادہ رندھیر بڑا خوش تھا۔ حالانکہ اس کے [illegible] اس رات اسکو کچھ کھائے بغیر ہی سو جانا پڑا ــــــ شن [چھالا کی] سڑک سوچتی کہ لوگ بھوک، بھوک چلاتے ہیں۔ اگر لوگوں [کے] دلوں میں انسان دوستی اور خدا ترسی پیدا کی جائے تو پیٹ [کی] ہی نہیں انسان کی ساری بھوکیں مٹ سکتی ہیں۔

تو شن چھالا کی سڑک اس وقت بن رہی تھی جب کہ [دنیا] پر جنگ و فساد کے خطرناک جراثیم کلبلا رہے تھے۔ جنگ کے شعلے ساری زمین کو اپنی لپیٹوں میں لے چکے تھے انسانو[ں] جنگ کے شعلے ٹھنڈے ہوئے تو پیٹ اور روٹی کے [مسائل] خوفناک اہرمن کی طرح ناچنے لگے۔ ان حالات میں بھی شن چھالا کی سڑک میں بہت سی تبدیلیاں کر دی گئیں۔ اب وہ ایسی نہیں ہے جسکو کھردری اور نشیب فراز والی کہا جا سکے، اس کے کنارے ٹھنڈے سائے دینے والے کئی درخت لگا دیئے گئے ہیں، راساری کے قریب سے برسات میں گزرنے والے نالے پر پل نہ تھا اس زمانہ میں سڑک کا اتنا حصہ تو کیچڑ سے بھرا رہتا۔ ا[ن] دیہاتوں کے لوگوں نے اس کیچڑ میں چند پتھر رکھ دیئے تھے، انہی پتھروں پر سے چلے جاتے لیکن اب تو اس پر خوبصورت سا پل بنا دیا گیا ہے، پھر اس پر پچھلے دنوں کی طرح بھاری پوٹلیوں اور کاندھوں پہ بچوں کو اٹھائے قافلے بھی کم گذرا

ں۔ بجائے اس کے اکثر و بیشتر خوبصورت اور چمچماتی کاریں گزرا
ی ہیں۔ ان دونوں لیسا اوقات اس کے کنارے لوگ بیٹھکر
ردں میں رکھی ہوئی سوکھی روٹیاں وال بھات سے کھایا کرتے
، لیکن آج کل اس کے قریب بڑے مزیدار ناشتے اڑائے جاتے
ں۔ ان سب حالات کے باوجود شن چھالا کی سڑک کو
ں زمانہ پسند تھا۔ جس وقت پشتارہ اور راساری کی بستیاں
ں باقی تھیں اور جن میں ہمیشہ صاف و شفاف خلوص اور
ٹی میٹھی سی ہمدردی پائی جاتی تھی۔ اب نہ پشتارہ اور راساری
وہ بستیاں رہیں اور نہ ان بستیوں کی سی ہمدردی اور خلوص کہیں
ر آتا ہے یہ بستیاں اب ریاست کے ولی عہد نے خرید لی ہیں
ران کے مکینوں کو کہیں اور لبادیا گیا ہے۔ اور یہاں ان کا
سع و عریض بالگاہ اور خوبصورت محلات بنا دیئے گئے ہیں جن میں
ند کی سب سے بڑی ریاست کے ولی عہد کے لئے اس کے
ایانِ شان انتظام ہے۔

کہنے کو بعض اس کو اب بھی کچی سڑک کہا کرتے ہیں لیکن
جودہ حالت میں بھی بہت سے لوگ اس کو کنگ کو ٹھی جانیوالی
منٹ کی بنی ہوئی پختہ سڑک سے پسند کرتے ہیں جس پر وہ
الی وردی پہنے ہوئے مسلح سپاہی موٹی موٹی گالیاں دے کر
اموشی کے ساتھ چلنے کی تاکید کرتے ہیں۔ لیکن شن چھالا جانیوالی
ڑک ایک مخلص اور شفیق ماں کی طرح اپنے بچوں کی ہر آزادی کو
ہی آزادی سمجھا کرتی ہے۔ اسی سڑک پر تو ایک غریب اور بے بس
ا فقیر دن بھر ایک ایک پیسہ کے لئے چلاتا رہتا ہے۔ لیکن اس
سڑک نے اب تک اس سے کچھ نہ کہا بلکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ دوپہر
و جب اس پر سے آمد و رفت دھیمی پڑتی ہے تو یہ حسرت و یاس
سے اس فقیر کو دیکھتی ہے۔ غالباً وہ اس کی کسی نہ کسی طرح مدد
کرنا چاہتی ہو لیکن وہ خود بھی تو کچی سڑک ہے۔ البتہ وہ سوچا کرتی
ہے کہ اس پر سے زن کے ساتھ گذر جانے والی خوبصورت آسٹن
اس فقیر کی طرف کیوں توجہ نہیں دیا کرتی۔ یہ آسٹن اس پر سے
گذر جاتی تو وہ منہ سے کف نکال لینے والی کسی خوفناک ناگن کی طرح

بہت دیر تک دھول اڑاتی رہتی جیسے اگر اسکا بس چلتا تو یقیناً اس
خوبصورت کار کو الٹ کر رکھ دے گی حتیٰ کہ اسکے شیشے چکنا چور ہو کر
عزائی تیروں کی طرح ان کے جسموں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔

اسی آسٹن نے تو اس کے سکون کو غارت کر ڈالا تھا۔ پشتارہ
اور راساری کے مخلص دیہاتی اسی کی وجہ تو اس سے بہت دور
جا پڑے تھے اب بھی کبھی کبھی ان دیہاتوں کے لوگ اس پر سے گذرتے
ہیں تو اس سڑک کا جی چاہتا ہے کہ وہ انکو اپنے بچوں کی طرح سے
لپٹا لے، یہ دیہاتی بھی اس سے ایسی ہی محبت رکھتے ہیں جیسی
محبت کے غریب اور فرمانبردار لڑکے اپنی ماں سے کیا کرتے ہیں
پھر بھی واقعات ہی کچھ ایسے ہیں کہ شن چھالا کی سڑک کے نزدیک اس
آسٹن اور اپنے کنارے بیٹھے رہنے والے بوڑھے فقیر میں گہرا تعلق
ہونا چاہیئے۔ دوپہر کے وقت بوڑھے فقیر کے قریب آکر وہ
اس پر اکثر سوچا کرتی ہے۔ "ضرور ان دونوں میں گہرا تعلق ہے"
کبھی کبھی وہ بے چین ہو کر اپنے نزدیک فیصلہ کر لیتی ہے لیکن
بدقسمتی سے عین اسی موقع پر وہ مدقوق فقیر اپنے مخصوص راگ سے ہر
راہگیر سے ایک پیسہ مانگتا تو بیچاری کچی سڑک کہتی "آہ! ان میں ذرا
بھی تعلق نظر نہیں آتا"

اس کا خیال ہے کہ جب یہ آسٹن روز آنہ ادھر سے گذرا
کرتی ہے تو اس لاچار فقیر کی حالت میں بھی نمایاں تبدیلی ہونی چاہیے
ایک مدت سے وہ فقیر کو اونچے اونچے درختوں کے جھنڈ کے قریب
بیٹھے اور ایک لڑکی کو آسٹن میں گذرتے دیکھ رہی ہے لیکن اس
لڑکی نے کبھی بھی اس فقیر کی طرف توجہ نہیں کی اور نہ ہی فقیر میں
اتنی جرأت تھی کہ وہ کچی سڑک پر اس لڑکی کی مخصوص مصروفیات
کا سبھوں سے تذکرہ کرتا۔

پشتارہ اور راساری کی بستیاں اجڑنے کے بعد کچی سڑک
کا لڑکی اور فقیر کی شخصیتوں سے بڑا گہرا تعلق ہے اور یہ بھی عجب
اتفاق ہے کہ اس کے جذبات و احساسات ایک دوسرے کے لئے
متضاد ہیں۔ لڑکی سے اس کو جتنی نفرت ہے اتنی محبت فقیر سے ہے
یہ لڑکی جس سے اس کو روز بروز شدید نفرت ہوتی جا رہی ہے

باوجود زیادہ عمر ہونے کے ابھی تک کنواری ہے بڑھی سڑک اسکو اب بھی لڑکی ہی کہتی ہے اس کو وہ اس وقت سے جانتی ہے جب کہ وہ اپنی امی کا دیا ہوا بلیو برڈ ٹافی کا بکس لیکر باہر سڑک پر آتی اور ایک ایک کرکے ساری ٹافی ہضم کرنے لگتی۔ لیکن جب جمن چپراسی کا لڑکا اسکو دیکھکر اپنے باپ سے گھٹیا سا برف لڈو کھانے کے لئے پیسہ مانگتا تو وہ چٹاخ سے اندر چلی جاتی اس کو بچپن ہی سے جمن چپراسی کے لڑکے سے نفرت رہی ہے۔ لیکن وہ تھی بڑی ہوشیار ٹافی کھاچکتی تو جمن چپراسی کے لڑکے سے بڑی ہمدردی کرتی جمن کا بیوقوف سا لڑکا سوچتا کہ یہ لڑکی کتنی پیاری دوست ہے۔

اس لڑکی اور جمن چپراسی کے غریب لڑکے میں اتنا فرق تھا جتنا فرق کہ بلیو برڈ ٹافی اور ایک پیسہ والے برف لڈو میں ہو سکتا ہے لیکن جیسے جیسے یہ لڑکی بڑی ہوتی گئی ویسے ویسے یہ فرق بڑھتا چلا گیا۔ آج کل ان میں کسی رئیس زادے کے ناشتے اور کسی غریب کے گھر کے باسی دلیہ جتنا فرق ہے اور اس سے یہ بھی کچی اور غریب سی سڑک خوب واقف ہے کہ یہ لڑکی دن بدن بڑی تیز مزاج نکل چلی ہے ٹافی کھاکر وہ جمن چپراسی کے لڑکے کی بے بسی سے ہمدردی کرنے کی تو وہ بچپن ہی سے عادی رہی ہے اب وہ شاہی ٹفن کیریر صاف کرکے کئی ایک جمن چپراسیوں سے بڑے سے بڑے مجمع اور جلسہ میں ہمدردی اور محبت کا اظہار کرنے میں ذرا بھی باک محسوس نہیں کرتی۔ اس کی بے باک تقریروں اور آتشیں جملوں سے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ٹافی کھاتے رہنے والے سارے بچوں سے ٹافی چھین کر ان کے بچوں میں تقسیم کردینا چاہتی ہے جو ایک پیسے کے برف کے لڈو کے لئے ترستے رہتے ہیں۔

ابھی کچھ دن پہلے جب ایک مرتبہ اس نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ غریبوں کے لئے ہے اور غریبوں کے لئے جئے گی اور مرے گی تو شہر کے سارے غریب اور سارے مفلس مزدوروں نے اس کی جے کے نعروں سے فضا میں جنگامہ بپا کر دیا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ تو شہر والے جانتے والی سڑک سے متعلق تھا ورنہ اگر کسی دن یہ مزدور اور یہ غریب اس سڑک پر اس کی مصروفیات دیکھتے تو شاید اس سے اس کی روعمل کا کوئی نہ کوئی جواب اگلوائے بغیر نہ رہتے۔

ویسے شن چھاؤنی کی سڑک پر وہ صبح صبح ہی نظر آتی ہے لیکن یہی چند گھنٹے مزدوروں کی اس محبوب خاتون کو اس کے اپنے اصلی روپ میں پیش کرکے رکھدیتے ہیں اور اسی وجہ سے کچی سڑک اس سے شدید نفرت کرتی آئی ہے۔

جب سورج کی پہلی کرن زمین پر اترتی تو اس کچی سڑک کو اپنے پرسے ان دو شخصیتوں کو گذرنے دینا پڑتا ہے۔ جن کے لئے اس کے جذبات و احساسات متضاد ہیں، اس طرح سے اس بوڑھی سڑک کو صبح صبح ہی ان دو شخصیتوں کے تعلق سے اپنے جذبات کی کشاکش سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

اس سڑک کا مخصوص فقیر اپنی بیوی کے ساتھ سویرے ہی یہاں آجاتا ہے اس کی بیوی خود بھی ایک ہاتھ سے معذور تھی اسکے رخساروں کی دمک کو تھکا دینے والے خوفناک افکار دن بدن زرد کرتے جارہے تھے۔ اس کی آنکھیں غربت کے شدید احساس سے اندر ہی اندر دھنستی جارہی تھیں۔ جب یہ روز روز دسی یہ عورت بوڑھے فقیر کو یہاں بٹھاچکتی ہے تو اس کے لئے ناشتہ لانے وہ پھر واپس ہوجاتی ہے۔ اس وقت کچی سڑک اس کی بے لوث رفاقت کی وجہ سے اس کو بہت دور تک محبت و پیار سے دیکھا کرتی ہے باوجودیکہ اس کے بالوں میں کئی دن سے تیل نہ لگانے کی وجہ سے رکھائی آجاتی ہے، بہت دن پہلے پہنے ہوئے کپڑوں پر پسینے کے دھبے پھیلے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ اپنے اکیلے ہاتھ کو نہایت ہی بے ہنگم طور پر ہلاتے ہوئے جایا کرتی ہے—— عین اسی موقع پر ہلکے ارغوانی رنگ کے بادامہ کا جمپر اور چکنے ملائم شاہو کی شلوار پہنے ایک لڑکی کو لیکر ریاست کا ولی عہد اپنی خوبصورت آسٹن میں زن سے گذر جاتا ہے۔ اس لڑکی کی سرخ رنگ کی مہین اوڑھنی کبھی کبھار موٹر کی کھڑکی سے باہر ہواؤں میں لہرانے لگتی ہے، جیسے وہ بوڑھے فقیر سے یہ کہنے کی ناکام کوشش کرتی ہو کہ اس کو اس کے باوجود کہ وہ ایک ولی عہد کے ساتھ جارہی ہے غریبوں سے بڑی محبت ہے وہ غریبوں کے لئے جئے گی اور غریبوں

کے لئے مرے گی۔ لیکن فوراً ہی ولی عہد اسٹرنگ ایک ہاتھ میں سنبھال کر دوسرے ہاتھ سے اس کی اوڑھنی کو نہایت ہی شوخ انداز میں اڑا لیتا ہے شائد اس کو یہ پسند نہ آتا ہو کہ یہاں بھی اس کی اوڑھنی غریبوں اور مزدوروں سے سرگوشیاں کرے اور وہ لڑکی بھی اس پر ایک چنچل اور شگفتہ مسکراہٹ کے ساتھ ولی عہد کے چوڑے چکلے سینہ اور بھرے بھرے بازوؤں کو بالکل اسی حریصانہ نگاہوں سے دیکھتی ہے جن للچائی ہوئی نگاہوں سے اس کے بچپن میں جمن کا لڑکا اس کے ٹافی کے بکس کو دیکھا کرتا تھا اور وہ اس ٹافی کے بکس کو حاصل کرنے میں اس وجہ سے کامیاب نہیں ہو سکتا تھا کہ اسکو یہ لڑکی اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھامے رکھتی تھی۔ لیکن آسٹن کے اندر کی فضا یہ تھی کہ صرف ٹافی کا بکس تھا اور اس کو تھامے رکھنے والی لڑکی مغرب کی کہیں رنگین وادیوں میں چلی گئی تھی۔

اپنی بیوی کے ریاست سے باہر جانے کے بعد ولی عہد کی یہی مصروفیت ہوتی کہ وہ روز صبح گھوڑوں کی دوڑ کے لئے اپنے مخصوص ہالنگاہ میں پہنچ جاتے جو اسی شن چھالا کی سڑک پر واقع تھا۔ جاتے ہوئے وہ خود اس لڑکی کو جس سے شن چھالا کی سڑک کو نفرت ہے اپنی کار میں لے لیتے ہیں۔

جب سویرے سویرے فقیر کی "بابوجی ——— ایک پیسہ" کی رٹی رٹائی آواز کچی سڑک پر بھٹکنی شروع ہو جاتی ہے تو اسی وقت اس لڑکی کے نقرئی قہقہے رئیس زادے کے مسطح اور خوبصورت ہالنگاہ کی لطیف فضاؤں میں ابھرتے دکھائی دیتے ہیں اور جب انکے گھوڑوں کی دوڑ ختم ہو جاتی ہے۔ ولی عہد کے مخصوص خدام شاہی ٹفن کیریر ان دونوں کے سامنے کھول دیتے ہیں۔ اس وقت تک ایک زرد زرد سی عورت بھی اپنے شوہر کے لئے کہیں سے مانگا ہوا پچھلے دن کا باسی دلیہ لیکر پہنچ جاتی ہے جو کچی سڑک کے کنارے درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب گرد و غبار سے اٹا ہوا ایک ڈبہ لئے بیٹھا رہتا ہے۔

یہی وہ واقعات ہیں جن کی بنا پر شن چھالا جانے والی سڑک کو روز بروز اس لڑکی سے نفرت ہوتی جا رہی ہے۔ یہ سڑک اسکو قطعی پسند نہیں کرتی ہے یہ لڑکی ایک خونی جنگ میں فتح کی یادگار کے طور پر بنائے ہوئے کھیلنے کے میدان میں تو غریبوں اور بھوکوں کی تائید کرتے ہوئے ایک ہنگامہ کھڑا کر دے لیکن صبح صبح کائنات کے اس بھوکے قافلے سے دور یہی لڑکی ولی عہد کے ہالنگاہ میں نقرئی قہقہے لگاتی گھوڑے دوڑایا کرے اور مزیدار سا ناشتہ اڑاتے ہوئے اس کو نہ جمن کے اس لڑکے کا خیال آئے جو ایک پیسہ کے برف لڈو کے لئے اپنے باپ سے ضد کرتا ہے اور نہ اس فقیر کا خیال آئے جو اکثر سوچا کرتا ہے کہ کسی دن کوئی اس کی بیوی کو کچھ تازہ دلیا بھی عنایت کر دے تو کتنا اچھا ہو ——— تازہ دلیا کھائے ہوئے اس کو عرصہ ہو گیا ہے!

مفرح فولادی

نیا اور تازہ سرخ خون پیدا کرتا ہے۔ وزن بڑھاتا ہے۔ اور ہڈیوں کو مضبوط کرتا ہے۔ قوت و طاقت بخشتا ہے کھانا ہضم کر کے بھوک بڑھاتا ہے۔ خوراک:- کھانے کا ایک چمچہ روزانہ تین چار مرتبہ کھانا کھانے کے بعد استعمال کریں۔ بچوں کیلئے نصف خوراک۔

حاذق دواخانہ بندر روڈ، کراچی نمبر (۱)

رفت سہارنی •

یہ لے اَماں!

زخیز رقاصہ نے کہا...... اور وہ سوچنے لگا کہ ہم کتنے بلند
لاق ہیں جو اپنی بیٹیوں کا رقصِ عریاں دیکھکر خوشی سے جھوم رہے ہیں
— زخیز رقاصہ کی آمد سے قصبہ بھر میں مسرت کی لہر دوڑ گئی
. لوگ سورج غروب ہونے کے شدت سے منتظر تھے کہ نشیلی اور
ر چاندنی میں ایک زخیز رقاصہ رقص کرے گی . اور گیت گائے گی
یت جن کی مخمور کن موسیقی فضاؤں میں حسین ارتعاش پیدا کر دے گی
ص..... چاندکی روپہلی کرنیں جس سے لپٹ کر ایک لحن بے خروش
تخلیق کر دیں گی .... گیت...... فضاؤں کے گیت جن پر رشک
ریں گے ...... رقص..... ستاروں کے شہرے کارواں جس سے
ر زہتے سفر کریں گے ..... اور موسیقی کی بکھری ہوئی لہریں
دور دور تک پھیل جائیں گی اور کائنات بن کے مخملی پردوں میں
سو جائے گی . ....

اور وہ گوشہ نشین ادیب چارپائی پر لیٹا ہوا اپنے اندوہگیں
تصورات کی شیریں کش مکش میں کھو کر اپنی تخیلی دنیا میں نکل گیا تھا،
بہت دور.... ان دلدوز تنہائیوں میں جہاں اس کے دل کی
دھڑکنیں احساسِ تنہائی میں مبتلا ہوں - جہاں اس کے من کی اتھاہ
گہرائیوں سے اٹھنے والی آہوں کی لرزشِ خاموش کے سوا کچھ نہ ہو،
جہاں لیل و نہار ایک مضطرب سکوت سے دوچار ہوں - جہاں
وہ اپنے جذبات کی شدت سے ایک تعمیر کا اہتمام کر کے مسکراتا
ہو، کچھ ایسی مسکراہٹیں جن کے عمق میں — آنسوؤں کا ارتعاش
موجود ہو!

اور وہ بہت جلد چند احباب کے نرغہ میں تھا.. جو اسے
محفلِ رقص و سرود میں لے جانے کے لئے آئے تھے - اور وہ
سوچنے لگا تھا کہ وہ محفلِ نشاط میں جائے گا - تو اس کے سوزِ دروں
کی بیتابیاں تھم جائیں گی - اس کے تصورات کا انتشار سنبھل جائیگا۔
اس کی ذہنی خلفشار کی یورش رک جائے گی - اور وہ کچھ دیر کیلئے
آزاد ہوگا - آزادی! وہ سوچنے لگا - آزادی انسان کا پیدائشی
حق ہے - اور کیا آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ ہم محفلِ رقص و سرود
کے نشاط انگیز لمحات میں کھو جائیں ، مگر انسان آزاد ہو کر بیدار ہو جاتا
ہے اور اپنی گم گشتہ صلاحیتوں کو ڈھونڈنے لگتا ہے مگر مجھے آزاد
ہوئے تو پورے پانچ سال گزر گئے ہیں -

اس کے دوست اسے کشاں کشاں لئے جا رہے تھے ——
آگے اور پیچھے دوست —— اس کا احساسِ تنہائی کم ہونے لگا
تھا - اور وہ سوچ رہا تھا کہ دوستوں کی موجودگی بھی کس قدر نعمت ہے
یقیناً کئی دماغ مل کر اچھا سوچ سکتے ہیں - کئی ارادے مل کر ایک
ٹھوس عمل کی ایجاد کر سکتے ہیں - اور وہ بہت جلد اس محفل میں جائیگا
جہاں بہت سے ذہن ایک ہی فکر نشاط میں مستغرق ہونگے - جہاں
بہت سے ارادے ایک ہی کاوش میں مصروف ہونگے - جہاں
سب ایک ہی کردار کے تمنائی ہونگے - بے شک جب ساری قوم
ایک ارادہ لیکر اٹھتی ہے تو انسانیت ایسے حسین ارادوں کی یورش
سے شرما کر قصدِ تقابل چھوڑ دیتی ہے -

اور وہ بہت جلد محفلِ طرب میں پہنچ گیا تھا - جہاں اس کے
بیشمار ساتھی موجود تھے - اس نے نگاہ کے پردے پھیلائے کیا تھے
اپنے ساتھیوں کے چہرے پڑھے - جہاں شیریں بیتابیاں مچل رہی تھیں
وہ ایک کونے میں بیٹھ گیا - رقاصہ ابھی تک نہیں آئی تھی - جسکے
انتظار میں ہر لمحہ جنبشِ نظر بن رہا تھا

اور وہ بہت جلد زرق برق لباس پہنے نیم عریاں بدن
کے ساتھ وسطِ محفل میں کھڑی ہو گئی - جس کا شباب ہر احساسِ قلب کو

عوت پرستش دے رہا تھا۔ جس کا حسن لگاہوں میں چکا چوند پیدا کر رہا تھا۔ جیسے کسی سوتے ہوئے انسان کی آنکھ بوقت نیم شب اچانک کھل جائے۔ اور وہ چاندکی روپہلی کرنوں کو دیکھکر مدہوش ہوجائے۔ بہت جلد مجرا شروع ہو گیا۔ اور ٹھہری چاندنی کی شفاف سطح پر سنہرے گیت تیرنے لگے۔

ہم نے لاکھوں کے بول سہے ستمگر تیرے لئے ——
تیرے لئے! حسین انکھڑیوں نے ایک طرف اشارہ کیا اور ایک سرخ ہونٹ احترام جنبشِ نظر کے لئے باہر آگیا —— اور اس نے طلائی انگلیوں سے پکڑتے ہوئے —— محفل کے عین درمیان میں بیٹھی ہوئی ادھیڑ عمر کی عورت کے سامنے آکر کہا "یہ لے اماں"

—— "یہ لے اماں"! ادیب چونک پڑا۔ اور الفاظ اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئے۔ ایک چھوٹی سی آہ اس کے لبوں سے چھو گئی اور وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اٹھ بیٹھا۔ اور آہستہ آہستہ گھر کی طرف چل نکلا۔ بے وقوف اور بدنصیب ادیب! کمزور احساسات اور بے ذوق جذبات کا مالک ادیب —— اس کے دوستوں نے کہا۔ مگر وہ ان کی آوازوں سے بے خبر تھا —— بازار میں سکوت چھایا ہوا تھا۔ اور وہ ایک سنسان گلی میں چلتا ہوا سوچ رہا تھا۔

یہ لے اماں! یہ ہے میری آمدنی! تو نے مجھے پالا پوسا، تو نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں اپنا ضمیر اور ایمان سونے کے عوض بیچ دوں۔ تو نے مجھے جوان کیا۔ کہ لوگ میری جوانی کو خریدیں۔ تو نے مجھے گیت سکھائے کہ لوگ میری آواز کو خریدیں۔ تو نے مجھے رقص دیا کہ جسے دیکھکر انسانیت رقص کرے۔ ماں بے شک تو نے بہت بڑا کام کیا۔ تو نے مجھے نیک کردار سکھا کر انسانیت کی چوٹیوں پر کھڑا کر دیا۔ اور آج یہ لے تیری محنت کا صلہ۔ تیری کاوشوں کا انعام۔ آج میں عریاں بدن کے ساتھ ہزاروں کے بیچ میں کھڑی ہوں آج میرا ہر عضو فروخت ہو رہا ہے۔ میرا گوشت بیچنے والی مقدس ماں! میرے سنہرے گیتوں کی مستی میں تیرے دعائیں پنہاں ہیں میری پائل کی جھنکار تجھے مبارکباد کہہ رہی ہے۔ اور آج میرے ہی بھائی۔ میرا گوشت چاٹنے کے لئے بے قرار ہیں۔

آزاد قوم تیری حسین کاوشوں کی داد دے رہی ہے۔ اسلام کو تجھ پر فخر ہے۔ اور لے ماں! شوق سے لے! میں آج تیرے سامنے خود کو بیچ رہی ہوں۔ تو مسکرا رہی ہے اور خوش ہو رہی ہے کہ تیری بیٹی کی عصمت کے بہت سے خریدار ہیں اور تو کس قدر خوش نصیب ہے کہ تیری بیٹی کے گاہک بہت بڑے لوگ ہیں۔ خوش ہوجا کہ آزاد قومیں اپنی بیٹیوں کے رقص پر نازاں ہوتی ہیں۔

اور وہ بہت جلد گھر پہنچ گیا تھا۔ اور چارپائی پر پڑا —— اپنے ویران خیالوں کی دلدوز وسعت میں کھو گیا تھا —— دور سے —— ہوا کے دوش پر موسیقی کی نشیلی لہریں رقص کرتی آرہی تھیں اور وہ سوچ رہا تھا آخر یہ لہریں کب تک رقص کرتی رہیں گی..... کب تک؟

"چسٹا کیئر"

یہ دوا پرانی کھانسی کے جملہ امراض کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ پھیپھڑوں کو طاقت دیتی ہے۔ نزلہ و زکام کھانسی کے مریضوں کے لئے بیحد مفید ہے پھیپھڑوں سے خون آنا، ابتدائی سل اور بلغمی کھانسی کے واسطے مجرب دوا ہے جن خاندانوں میں مرض سل موروثی ہو ان کے نوجوانوں کو اس دوا کا مستقل استعمال اس موذی مرض سے محفوظ رکھتا ہے۔
قیمت بیس یوم ۔ چار اونس ، دو روپے آٹھ آنے
حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی

لب احمد رضوی ●

گھاگھرا کے کنارے

پہاڑ کے دامن میں جہاں گھاگھرا ندی ہمالیہ سے اترتی
د پیپل کے پیڑوں اور برگدوں کے درمیان سے لہراتی ہوئی پگڈنڈی
ام شنکل راجہ کے گاؤں اور راجو شاہ فقیر کی قبر کے پاس سے گزرتی ہے
لڈنڈی اور ندی تھوڑی دور تک ساتھ ساتھ جا کر راجو کی بوسیدہ
بر کے پاس سے الگ ہو جاتی ہے۔ گھاگھرا جھاگ اڑاتی، گنگناتی
دائیں طرف کو بل کھا جاتی ہے اور پگڈنڈی دور گھنے برگدوں میں
گم ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

سرسراتے ہوئے سرکنڈوں کے بیچ میں گزرتی ہوئی پگڈنڈی
پر سے دن بھر آس پاس گاؤں کو آتے جاتے رہتے ہیں صبح و شام کو اس پر
کافی رونق ہو جاتی ہے آدمیوں کی گفتگو کے علاوہ بیلوں کی گھنٹیوں
کی سریلی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ دوپہر کو اور خصوصاً گرمیوں کی دوپہر میں
کبھی ایک آدھ بھولا بھٹکا راہی دکھائی دیتا ہے اور پھر رات کو صرف
راجو کی قبر کے ٹمٹماتے ہوئے دیئے کی روشنی کی لکیر ...... !

راجو کی پسی ہوئی بوسیدہ قبر ایک برگد کے سائے میں پگڈنڈی
کے کنارے واقع ہے جس پر برگد کی گولریاں بکھری رہتی ہیں اور کبھی کبھی
چند پھول بھی کسی خوش عقیدہ کی مہربانی سے نظر آ جاتے ہیں۔ اب بھی
کبھی کبھی جب کوئی اجنبی گاؤں میں آتا ہے تو اس کی نظر پگڈنڈی پر سے
گزرتے ہوئے سب سے پہلے راجو کی شکستہ قبر پر پڑتی ہے اور وہ اکثر
سوچنے لگتا ہے ———— یہ کس کی قبر ہے؟ گاؤں کے قبرستان
سے باہر کیوں ہے؟ کہیں کوئی داستان تو اس سے وابستہ نہیں۔ ان میں
سے بڑی تعداد ———— "ہوں ہوگی کسی فقیر کی" کہنے پر
اکتفا کر لیتے ہیں۔ بعض کچھ دیر قیاس آرائیاں کرتے ہیں اور ان میں سے
کچھ گاؤں میں جا کر اس قبر کے متعلق دیہاتیوں سے پوچھ بھی لیتے ہیں۔
اور پھر اسی رات "ننگو دادا" کی چوپال میں "آلہا اودل"

کے ساتھ ساتھ ڈھول پر راجو بابا کا قصہ بھی گایا جاتا ہے۔ بچے چپ چاپ
توشکوں میں دبک کر نیند سے جھومتے رہتے ہیں۔ بڑے تاڑی پی کر
سر ہلاتے رہتے ہیں یا جانگوں پر ہاتھ مارتے رہتے ہیں اور گاہک کی
کی آواز رات کے سناٹے میں ڈھول کی ڈھم ڈھم ڈبگ ڈبک کے ساتھ
بلند ہوتی رہتی ہے جس کا مفہوم کچھ الاپ ہوتا ہے۔

"جب گھاگھرا میا اپنے سیوکوں سے ناراض ہو گئی"
"جب اس کے منہ میں غصے سے جھاگ بھر آئے"
"اور جب اس نے اپنا رخ گاؤں کی طرف کر لیا"
"موجوں نے بھپر بھپر کے گاؤں کے باسیوں کو اپنی خونی
موجوں میں سمیٹنا شروع کیا"
"کچی دیواریں بلبلوں کی طرح بیٹھنے لگیں"
"گاؤں والے گھبرا گھبرا کر پناہ کی تلاش کرنے لگے"
"گھاگھرا مقدس گھاگھرا گرجتی ہی رہی"
"رام شنکل راجہ کی بڑی حویلی پانی سے محفوظ تھی"
"گاؤں والوں کے لئے یہی آخری پناہ گاہ تھی"
"سب نے یہاں ہی بسیرے کی ٹھانی"
"لیکن راجہ نے صاف ستھری حویلی کو گندہ نہ ہونے دیا"
"گاؤں والے روئے، گڑگڑائے لیکن ان کو دھکے ملے۔
"پانی کچھ اور بڑھا۔ بڑھتا ہی رہا"
"ایسے میں بھگوان کو ترس آیا"
"راجو لمبی زلفوں والا تیرتا ہوا آیا"
"سب کو اپنی ٹیلے پر بنی کٹیا میں لے گیا"
"کوئی بچارا مدد کو چلایا۔ ایک بڑھیا ڈوب رہی تھی"
"تھکا ہوا راجو بے چین ہوا"

"وہ غراتے ہوئے دریا میں کود گیا"
"موجوں سے لڑتا رہا۔ بڑھیا کو بچا لیا"
"لیکن زمین پر قدم رکھتے ہی خود بے سدھ ہو گیا"
"اس کی لمبی زلفیں اس کے چہرے پر بکھر گئیں۔ گھنی ڈاڑھی بھیگ گئی اور وہ اس نرک کو چھوڑ گیا تھا"
اور اے اجنبی راہی یہ اسی نیک مرد کی قبر ہے"
اس طرح راجو کی داستان ختم ہوتی ہے کہ رات بھیگ چکی ہوتی ہے۔ بعض گاؤں والوں کی آنکھیں تر ہوتی ہیں اور بعض کے دامن ——— اور اجنبی سوچتا ہی رہ جاتا ہے کہ سدلوں کی حکومت کتنی دیرپا ہوتی ہے"
(بشکریہ جنگ)

نسوانی امراض کے لئے حاذق دواخانہ کی مایۂ ناز ایجاد
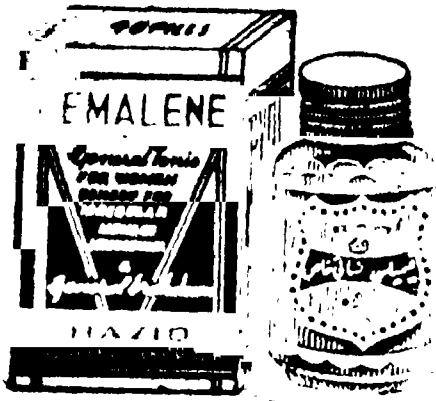
فیملن (نسائی خاص)

یہ گولیاں عورتوں کی پوشیدہ شکایتوں کو دور کرنے میں اکسیر ہیں
سیلان ماہواری کی بے قاعدگی اور اسی قسم کی دوسری زنانہ شکایتوں سے پیدا شدہ جملہ نقائص کو دور کرنے میں اکسیر ہیں
استقرار حمل کو مدد دیتی ہیں گویا عورتوں کے لئے ایک جنرل ٹانک ہے جس کا متواتر استعمال عورتوں کے نظام عصبی کو درست کرتا ہے جن عورتوں کو اسقاط حمل کی بار بار شکایت ہوتی ہے ان کے لئے بے حد مفید ہے
قیمت فی شیشی دو روپے بارہ آنے۔

تیار کردہ:۔ حاذق دواخانہ، بندر روڈ، کراچی نمبر ۱

• صحافتی دنیا کے لئے ایک سنگ میل ——— • عریانی اور فحاشی کی ظلمتوں میں ایک منارۂ نور ——— • صالح، پاکیزہ اور تعمیری اقدار کا حامل ——— • زندگی کے جلال و جمال کا آئینہ دار ——— • حیات افروز ادب کا دلکش مرقع

ماہنامہ **معیار** میرٹھ

ہر ماہ آپ کے ذوق کی سیرابی کے لئے اردو کا اعلیٰ ترین شعری، افسانوی اور تنقیدی ادب پیش کرتا ہے
دفتر ماہنامہ معیار میرٹھ سے طلب فرمایئے
زرتعاون:۔ سالانہ۔ پانچ روپے۔ ششماہی تین روپے۔ فی پرچہ آٹھ آنے (۸/)
پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:——— احمد نور صاحب۔ فیملی لائن۔ جیکب آباد

موپساں
ترجمہ: سید قاسم محمود

طوطا

شہر بھر میں پاٹن کی ماں کی داستان کا چرچا تھا۔ وہ واقعی بڑی بدنصیب عورت تھی۔ اس کا خاوند اسے اس طرح پیٹتا گویا کوئی دھان کوٹ رہا ہو۔

اس کا خاوند مچھلیاں پکڑنے والی کشتیاں چلایا کرتا۔ اسی نے جوانی میں اس عورت سے شادی کر لی تھی جو غریب ہونے کے باوجود خوب صورت اور صحت مند تھی۔ ان دونوں کا بیٹا پاٹن بھی ایک اچھا کشتی بان تھا لیکن بے رحمی کا پتلا۔ وہ روزانہ آبن نامی پادری کی سرائے میں جایا کرتا اور وہاں عام طور پر برانڈی کے چار پانچ گلاس چڑھا جاتا اور جب کبھی موج میں آتا تو آٹھ دس گلاس بلکہ اس سے بھی زیادہ ختم کر دیتا۔ گاہکوں کی ساقی گری پادری آبن کی بیٹی کے سپرد تھی جس کے بال بھورے تھے اور وہ اپنے دلکش چہرہ کی وجہ سے لوگوں کی کشش کا سبب بنی ہوئی تھی لیکن تعجب انگیز بات یہ ہے کہ دوسری جوان عورتوں کی طرح وہ لوگوں کی گپ شپ کا شکار کبھی نہیں بنی۔

پاٹن سرائے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اسے دیکھ کر اپنے دل کو تسکین دیتا اور پھر اس کے پاس پہنچ کر نہایت عاجزی سے سلام کرتا۔ جب اس کے ہاتھ سے برانڈی کا پہلا گلاس لیتا تو وہ اسے پہلے کی نسبت زیادہ حسین نظر آتی۔ دوسرا گلاس ہاتھ میں تھام کر اسے آنکھ مارتا۔ تیسرے گلاس پر وہ اپنی بے چینی کو نہ چھپا سکتا اور کہتا "پیاری ڈیزری! کاش تم رضامند .... اور اس کا فقرہ ہمیشہ ہی ادھورا رہتا۔ چوتھا گلاس پکڑتے وقت بوسہ لینے کے لئے اس کا دامن پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیتا۔ اور جب کبھی وہ دس گلاس پینے کے موڈ میں ہوتا تو چار کے بعد پانچواں گلاس پہنچانے کی زحمت پادری آبن کو اٹھانی پڑتی۔

سرائے کا بوڑھا مالک اپنی تجارت کو چمکانے کی ساری چالیں خوب جانتا تھا۔ اس نے اپنی بیٹی ڈیزری کو میزوں کے درمیان فروخت کے لئے ضرورت گھومنے کا کام بھی دے رکھا تھا تاکہ زیادہ سے زیادہ شراب فروخت ہو سکے۔ ڈیزری جو کہ پادری آبن کی ہوشیار بیٹی تھی۔ میزوں کے درمیان خراماں خراماں ادھر ادھر گھومتی رہتی۔ کبھی کبھی کسی گاہک سے مذاق بھی کر لیتی۔ اس کے ہونٹوں پر ہر وقت ایک خاص قسم کی شوخی کھیلتی رہتی جو بعض دفعہ مسکراہٹ کا رنگ اختیار کر لیتی اور اس کی آنکھوں میں ایک شوخ اور شریر چمک تھی۔

پاٹن اس کے حسین دل فریب چہرہ پر اس قدر متوالا ہو گیا کہ و
سمندر کے کنارے اسے نہ بھولتا۔ پانی میں جال پھینکتے وقت اسکی یاد تا
طوفانوں میں، اور خاموشیوں میں، چاند کی چاندنی میں اور رات کی تاریکی م
غرضکہ ہر دم وہی چہرہ اس کے سامنے گھومتا رہتا۔ دراصل پاٹن کے بے رح
دل میں بھی محبت کی نازک انگلیوں نے چٹکی لی تھی، وہ ہر وقت، ہر لمحہ
اور ہر جگہ اس کی یاد میں غرق رہتا۔ کشتی کے چپو چلاتے وقت، گھر واپس
لوٹتے وقت، دوستوں سے باتیں کرتے وقت، غرض کبھی اس کی یا
نہ بھولتی۔ وہ ایسا محسوس کرتا جیسے وہ سامنے کھڑی ہے اپنے مخصوص
انداز میں مسکرا رہی ہے، اپنے ہاتھوں کی عجیب حرکت سے پیلی شرا
گلاس میں انڈیل رہی ہے گلاس بھر گیا ہے۔ شراب ختم ہو گئی ہے او
واپس مڑ رہی ہے۔ اس موقع پر وہ کہتا "کیا خوب" زبان سے نکلے ہو
ان الفاظ کو جب کان سنتے تو اس کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے۔

وہ ڈیزری کا اتنا متوالا ہو گیا کہ بالآخر اس کے ساتھ شادی کی
کی زبردست خواہش نے اس کے دل پر قابو پا لیا وہ ا
خواہش سے اتنا مغلوب ہوا کہ زیادہ عرصہ تک انتظار نہ کر سکا اور ا
فوراً ہی اس کے باپ کے پاس شادی کا پیغام بھجوا دیا۔

پاٹن رئیس آدمی تھا، اس کے پاس اپنی کشتی تھی۔ مچھلی پکڑنے
جال تھے۔ رینو کی پہاڑی کے پاس ایک خوب صورت مکان تھا۔

ں پادری آبن کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ اسی لئے پیغام فوراً قبول کرلیا گیا
نادی اتنی جلدی کردی گئی جتنا کہ ممکن تھا۔ کیونکہ طرفین یہ معاملہ جلد از
تم کردینا چاہتے تھے آبن اپنی بیٹی ڈیزری کو گھر سے رخصت کرنے
لئے اور پاٹن ڈیزری کو بیوی کی حیثیت سے گھر میں لانے کے لئے سخت
بین تھے۔ کیونکہ یہی زمانے کی ریت ہے۔

شادی کے تین دن بعد پاٹن سوچنے لگا کہ اس نے ڈیزری کو
مری عورتوں سے مختلف کیوں سمجھا تھا؟ یہ یقیناً اس کی بے وقوفی
، غریب لڑکی سے شادی کرنا یقیناً زندگی کی بہت بڑی بے وقوفی کے
رادف ہے۔ اس نے ضرور شراب میں کوئی دوا ڈال کر مجھے ورغلانے
کوشش کی ہے ——— مجھے اپنا بنایا ہے ——— میرا یک
یس آدمی ...."

وہ تمام دن گالیاں بکتا رہتا باپ کو توڑ دیتا اور اپنی کشتی کے
لاح کو مارتے مارتے زخمی کردیتا۔ جو چیز اس کے سامنے آتی اسے سختی سے
یک طرف دھکیل دیتا۔ پھر بھی اگر کچھ غصہ باقی رہتا تو وہ بے چاری مچھلیوں اور
جھینگروں پر اتارتا رہتا۔ اور انھیں برا بھلا کہتے ہوئے ٹوکروں میں بیدردی
سے پھینک دیتا۔ مچھلیاں اور جھینگر اس نے تمام دن کی محنت کے بعد
سینکڑوں مرتبہ پانی میں جال پھینکنے کے بعد حاصل کیا تھا گھر پہنچنے پر وہ اپنی
بیوی کو، پادری آبن کی بیٹی کو گالیوں سے نوازتا۔ ایک وقت وہ آیا کہ اس
کے نزدیک دنیا کی ذلیل ترین شے کا نام ڈیزری تھا۔ وہ صبر و شکر کے ساتھ
اس کی گالیوں اور طعنوں کو برداشت کرتی اور خاموش کھڑی رہتی کیونکہ
وہ تشدد کو بچپن سے ہی برداشت کرنے کی عادی بن چکی تھی۔ پاٹن کو ڈیزری
کی اس خاموشی پر اور بھی غصہ آتا۔ ایکدن تو اس نے ڈیزری کو بری طرح مارا
اس دن کے بعد اس گھر میں زندگی اتنی تلخ ہوگئی کہ کوئی برداشت نہیں
کرسکتا۔

بیس سال سے تینو کے لوگوں میں گفتگو کا پسندیدہ موضوع ڈیزری
کی پٹائی تھا اور پاٹن کی لعنت ملامت جو وہ معمولی سی بات پر بھی کیا کرتا تھا
اس کے پاس گالیوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا جو ختم ہونے کا نام نہ لیتا تھا
اس کے پاس گالیاں دینے کا ایک خاص انداز تھا جو قصبہ بھر میں کسی کو نصیب
نہ تھا جب وہ مچھلیاں پکڑ کے واپس لوٹتا تو لوگ کشتی دیکھتے ہی اپنا اپنا

کام چھوڑ دیتے اور پل پر کھڑے ہوکر پاٹن کی گالیوں کی بوچھاڑ کا انتظار
کرنے لگتے جو وہ اپنی بیوی کی سفید ٹوپی کو پہچانتے ہی شروع کردیا کرتا
جوں ہی پاٹن اپنی بیوی کو ——— پادری آبن کی بدنصیب
بیٹی کو پہچانتا شدید ہوا کے تند جھونکوں اور سرکش لہروں کے
غضبناک شور و غوغا کے باوجود اس قوت اور تیز رفتاری سے گالیوں
کی بوچھاڑ شروع کرتا کہ سب لوگ ہنسنے لگتے حالانکہ وہ ڈیزری کے ساتھ
ہمدردی رکھتے تھے۔ گودی پر پہنچنے کے بعد مچھلیاں اتارتے وقت وہ
اپنی گالیوں کو اور نمایاں کردیتا۔ اور ایسے عجیب انداز میں کہ پڑوس کے
تمام بدمعاش ان کے گرد کھڑے ہوجاتے۔ اس کے منہ سے الفاظ اس
طرح نکلتے جیسے بندوق سے گولیاں ——— مختصر اور خوفناک بعض
دفعہ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے بادل گرج رہے ہوں یا جیسے اس کے
پھیپھڑوں میں گالیوں کے سینکڑوں طوفان پوشیدہ ہیں جن میں سے
ایک طوفان یہ بھی ہے جو اس وقت اپنی تمام غضبناکیوں کے ساتھ بیچاری
ڈیزری پر ٹوٹ پڑا ہے۔

جب وہ اپنی کشتی سے باہر آتا اور بیوی اس کے سامنے کھڑی ہوتی
اور پڑوس کے تمام لوگ ان کے گرداگرد گھیرا ڈالے کھڑے ہوتے تو وہ ان
کو لعنتوں اور گالیوں کا ایک عجیب تماشا دکھاتا ——— بیوی کی چوٹی پکڑ کے
اس کا چہرہ لوگوں کی طرف کردیتا اور خود اسکے پیچھے کھڑے ہوجاتا۔ وہ پھوٹ
پھوٹ کر رونے لگتی۔ وہ چیختا چلاتا رہتا اور لوگ عجیب عجیب آوازوں
سے قہقہے بلند کرتے۔

اور جب وہ اپنے مکان میں اکیلے ہوتے تو پاٹن اسے معمولی معمولی
سی بات پر مارنے لگتا۔ ذرا سی بات پر وہ غصے میں آگ بگولا ہوجاتا اس
پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کردیتا اور ایک مرتبہ شروع ہونے پر ٹھہرنے
کا نام نہ لیتا وہ اسے اس طرح دیکھتا کہ اس کے غصے کی اصل لہریں بیوی کی
آنکھوں میں جذب ہوجاتیں اور اس کا غصہ عارضی طور پر فرو ہوجاتا۔ ہر
گھونسے پر وہ چیختا ذلیل ——— کمینی ——— محتاج کہیں کی کونسی
خوش قسمتی تھی وہ ——— جب میں نے تیرے ذلیل باپ
کی خوشامدوں پر زہر میں گھلی ہوئی شراب کو منہ لگایا۔"
بیچاری عورت کی زندگی اس طرح کٹ رہی تھی کہ اس کے جسم

اور سدا پر ہر وقت کپکپی رہتی۔

اس طرح دس سال گزر گئے اور وہ اس قدر ڈرپوک ہو گئی تھی کہ جب کسی سے کوئی بات کرتی تو اس کا رنگ زرد پڑ جاتا۔ سوائے اپنے خاوند کی مار پیٹ کے، لعنت ملامت کے، لاتوں اور گھونسوں کے کوئی چیز اس کے تصور میں نہ آتی۔ رومان اور مسرت تو اس سے کوسوں دور تھے۔ وہ نہایت دُبلی ہو گئی۔ رنگ بالکل پیلا پڑ گیا اور وہ دھوپ میں سکھائی ہوئی مچھلی سے بھی زیادہ خشک ہو گئی۔

—— (۲) ——

ایک رات اس کا شوہر سمندر پر گیا ہوا تھا کہ وہ زبردست طوفان کی خوف ناک آواز پر چونک اٹھی۔ وہ بستر پر بیٹھ گئی اور مارے خوف کے تھر تھر کانپنے لگی۔ جب کوئی اور آواز سنائی نہ دی تو دوبارہ لیٹ گئی لیکن فوراً ہی چمنی سے ہوا کا ایک زبردست جھونکا آیا کہ سارا گھر ہل گیا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خونخوار جانور اپنے نتھنوں سے آوازیں نکالتے ہوئے گزر رہے ہیں۔

وہ اٹھی اور دوڑی بندرگاہ پر گئی جہاں ہر جانب سے عورتیں گھبرائی ہوئی پہنچ رہی تھیں اور ان میں سے ہر ایک کے پاس روشنی تھی مرد بھی کثیر تعداد میں پہنچ رہے تھے۔ یہ سب مرد اور عورتیں خاموش کھڑے ہوئے جھاگ دار موجوں کا نظارہ کر رہے تھے جو ہوا کی طاقت کے بل پر ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔

یہ زبردست طوفان مسلسل پندرہ گھنٹہ تک جاری رہا۔ گیارہ کشتی بان نہ لوٹے جن میں سے ایک پاٹن بھی تھا۔ ڈیپ کی پہاڑی کے پاس اس کی غرق شدہ کشتی کا بچا کھچا سامان دستیاب ہوا اس کے ملاحوں کی لاشیں بھی مل گئیں۔ لیکن اس کی لاش برآمد نہ ہوئی۔ شاید اس کی کشتی کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے اور اسی خیال سے اس کی بیوی کافی عرصے تک اس کا انتظار کرتی رہی اور ڈرتی رہی —— اس کا خیال تھا کہ وہ کسی اور ملک پہنچ گیا ہوگا۔ اور کبھی نہ کبھی ضرور واپس آئے گا۔

لیکن بتدریج اس کا یہ خیال پختہ ہو گیا کہ اب وہ نہیں آئے گا لیکن وہ جوں ہی ایسا سوچتی اسے فوراً کوئی پڑوسی یا کوئی فقیر یا کوئی پھیری والا اپنے گھر میں گھستا معلوم ہوتا جس کے بھیس میں اس کا شوہر چھپا ہوا ہوتا ——

اپنے شوہر کی گمشدگی سے تقریباً چار سال بعد وہ ایک دن کے وقت بازار سے گزر رہی تھی کہ ایک بوڑھے کپتان کے گھر کے سامنے کھڑی ہوئی جس کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا۔ اور اب اس کے گھر کا سامان نیلام کیا جا رہا تھا۔ اس وقت ایک طوطے کی بولی دی جا رہی تھی جس کے پر سبز رنگ کے تھے اور سر بالکل نیلا تھا اور ہر شخص کو غصے کی حالت میں گھور گھور کر دیکھ رہا تھا "تین فرانک" نیلام کرنے والا چیخ رہا تھا تین فرانک ایک —— تین فرانک دو —— کہنے بولنے میں دکیل —— تین فرانک ایک —— تین فرانک

پاٹن کے ایک دوست کی بیوی نزدیک ہی کھڑی تھی اس نے کہنی مار کر اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا "تم تو امیر لوگ ہو جت طوطا ایک اچھے دوست کی مانند ہوتا ہے اور یہ تو ویسے بھی بڑا خوبصورت ہے۔ تیس فرانک سے کم کا نہ ہوگا اور پھر تم جب وقت چاہو پچیس فرانک میں بیچ سکتی ہو"

پاٹن کی بیوہ نے آدھے فرانک اضافہ کر دیا اور بولی اس کے نام میں بول دی گئی۔ ایک چھوٹا سا پنجرہ اس نے تھاما اور گھر لے آئی۔ ابھی اس نے پانی پلانے کی غرض سے پنجرہ کا دروازہ کھولا تو طوطے نے اس کی انگلی پر اس زور سے کاٹا کہ خون نکلنے لگا۔

"اف۔ شریر کہیں کا" اس کی زبان سے نکلا۔

لیکن وہ ناراض نہیں ہوئی اور تکلیف کے باوجود اس کی پیالی میں کچھ دال اور بیج ڈالے اور کرسی پر بیٹھ کر محبت سے طوطے کو دیکھنے لگی عجیب انداز سے ادھر ادھر گردن ہلا کر نئے مکان اور نئی مالکن کو تیکھی نظروں سے گھور رہا تھا اور اپنی چاقو جیسی تیز چونچ سے اپنے پر کھجا رہا تھا

——————

دوسرے دن صبح ابھی پو پھٹ رہی تھی کہ پاٹن کی بیوی نے گرجدار آواز سنی "ورتم ابھی تک سو رہی ہو۔ کاہل"

وہ اس قدر خوف زدہ ہوئی کہ اس نے اپنا سر چادر میں چھپا لیا اور ان لمحوں کا انتظار کرنے لگی، جب وہ اپنی آنکھیں کھولے گی تو اس کے سامنے کھڑا ہوگا اور آنکھیں چار ہوتے ہی اسے دبی پرانی

رگالیاں دے رہا ہوگا جب اسے ان گالیوں کی آواز کا احساس
اس کے کان جھنجھنانے لگے اور شدت سے کانپنے لگی اس نے
ٹانگوں کو سکیڑ لیا، اپنے ہاتھوں سے پیر کے پنجوں کو زور سے پکڑ لیا
س طرح لپٹ کر گیند کی مانند گول ہوگئی۔ اس نے ایک کروٹ سی
ر اوندھی لیٹ گئی تاکہ اپنے شوہر کی مار پیٹ کے لئے تیار ہو جائے
کی وہ عرصہ سے توقع رکھتی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ تکیہ کی نرم روئی میں
ھانس لیا اور بڑبڑانے لگی۔

"خدا ——— میرے خدا ——— وہ یہاں ہیں ———
یہاں ہیں ——— خدایا ——— وہ واپس آگئے ہیں"

کئی منٹ گزر گئے لیکن کمرے کی گہری خاموشی کو کسی چیز نے نہ
یا۔ خلاف توقع اس کی پٹائی شروع نہ ہوئی۔ اسے ابھی تک ... کوئی
لوکر یا گھونسہ نہیں لگا اسے سخت تعجب ہوا۔ اس نے آہستہ سے اپنا سر
دپر اٹھایا اور کن انکھیوں سے شوہر کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن کھڑکی
یں سے چھنتی ہوئی سورج کی ایک شعاع کے سوا اسے کچھ نظر نہ آیا وہ اٹھ
بیٹھی اور اپنے آپ سے آہستگی سے کہنے لگی: "وہ ضرور یہیں کہیں چھپے
ہوئے ہیں"

وہ سخت پریشانی کی حالت میں کافی دیر تک سہمی ہوئی بیٹھی رہی
اس نے ذرا ہمت باندھی اور کہنے لگی "یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے
——— میں نے ضرور کوئی خواب دیکھا ہوگا۔"

اپنے آپ کو یقین دلانے پر وہ دوبارہ لیٹ گئی اور اپنی آنکھیں بند
کرلیں ——— کہ اچانک نزدیک ہی سے ایک گرجدار آواز سنائی
دی۔ "تم پر خدا کی لعنت، آخر کب اٹھو گی؟ نحوست پھیلا رکھی ہے"

وہ بستر سے ایک دم اچھل پڑی اور اپنے شوہروں سے پٹنے
کی عادی عورتوں کی طرح بادل ناخواستہ تابعداری کے ساتھ آگے کو جھک
کر کہنے لگی "میں یہاں ہوں پاٹن! آپ کیا چاہتے ہیں؟"

لیکن پاٹن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے زبردست احساس
شکست کے ساتھ کمرے کے چاروں طرف نظر دوڑائی، چارپائی کے
نیچے، روشن دان میں، چمنی میں اور آخر کار لڑکھڑاتے ہوئے اپنے آپ کو
ایک کرسی میں گرا دیا ——— تھکن سے چور، خوف سے لرزاں

اور غم سے پریشاں ——— اسے یقین ہوگیا تھا کہ پاٹن نہیں تو
پاٹن کی روح یہاں ضرور گھوم رہی ہے اور مجھے شدید جسمانی اذیت
دینے کے لئے واپس لوٹ آئی ہے"

اسے اچانک لاشعوری طور پر اپنا کوٹھا یاد آیا جس پر چڑھنے کے
لئے سیڑھی کی ضرورت ہے۔ وہ سوچ رہی تھی۔ شاید وہ اسے حیران و پریشان
کرنے کے لئے کوٹھے پر چڑھ بیٹھا ہو۔

اسے یقیناً دور ——— بہت دور ساحل کے جنگلی لوگوں
نے پکڑ لیا ہوگا اور اس دوران میں وہ رہائی نہ پا سکا ہوگا ——— اب
وہ فرار ہو کر آگیا ہے اور مجھ بدنصیب سے انتقام لینا چاہتا ہے۔ وہ ضرور
میرے ساتھ پہلے سے زیادہ وحشیانہ سلوک روا رکھے گا ———
بے شک یہ آواز پاٹن ہی کی تھی ——— یہ آواز یقیناً ......"
اس نے اوپر کی طرف دیکھا اور بلند آواز سے پوچھا "پاٹن! کیا آپ کوٹھے
پر ہیں؟"

لیکن پاٹن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک دہشتناک خوف سے اس
کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے جرأت مندی سے کام لیتے ہوئے
سیڑھی لگائی اور اوپر چڑھ گئی۔ روشن دان کھولا، دیکھا کچھ نظر نہ آیا ———
اندر داخل ہوئی، چاروں طرف دیکھا لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ گھبرا کر
چٹائی پر بیٹھ گئی اور ہانپنے لگی ——— ایک شدید اور ناخوشگوار اضطراری
خوف سے مغلوب ہو کر ٹپ ٹپ آنسو بہانے لگی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے
لگی۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ پاٹن نچلے کمرے میں باتیں کر رہا ہے اس قدر طوفانی موسم
——— تیز ہوا ——— سخت آندھی اور میں بھوکا ———
اتنی دیر تک ——— بیوقوف کہیں کی"

اس نے چھت سے چیخ کر جواب دیا "پاٹن میں ابھی آتی ہوں،
آپ کے لئے کھانا تیار کر رہی ہوں ناراض مت ہوجئے"

وہ دوڑی دوڑی نیچے گئی، کمرے میں آدم نہ آدم زاد۔ اس نے
سخت کمزوری محسوس کی۔ جیسے موت اس کے قریب ہو۔ وہ پڑوسیوں کی مدد
کیلئے زور سے بھاگی۔ ابھی دو قدم بھی نہ اٹھائے ہونگے کہ بائیں کان کے
عین برابر سے آواز آئی "میں نے ابھی تک ناشتہ نہیں کیا ——— خدا کی ...."
طوطا اپنی گول گول، چالاک اور شریر آنکھوں سے گھور رہا تھا۔

اس نے بھی خوف زدگی کے عالم میں کانپتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور اس کے ہونٹ کھلے "تو یہ تم ہو ——— میاں مٹھو"

اس نے جواباً اپنا سر ہلایا اور کہا "اچھا ——— ذرا ٹھہرو ——— میں تمہیں اس طرح گھومنے کا مزہ چکھاتا ہوں ——— آوارہ"

اس کے دماغ میں خیالات کا ایک طوفان امنڈ آیا۔ اور وہ اس طوفان کے درمیان ہچکولے لینے لگی "یہ وہی ہے ——— وہی مردِ انسان جو واپس آگیا ہے جو اس طوطے کے روپ میں مجھے ستانے کیلئے پھر نمودار ہوا ہے۔ جو پہلے کی طرح سارا سارا دن مجھے گالیاں دے گا جو مجھے مارے گا پڑوسی آئیں گے، مفت کا تماشہ دیکھیں گے اور قہقہے لگائیں گے ——— قہقہے ——— قہقہے"

وہ تیزی سے پنجرے کی طرف دوڑی اور طوطے کو پکڑ لیا جس نے اپنی پنجوں اور چونچ سے اس کے ہاتھ کی انگلیوں کو لہولہان کر دیا لیکن اس نے اپنی پوری طاقت سے اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان بھینچ لیا اس نے زور سے زمین پر دے مارا اور دیوانگی کی سی حالت میں پیروں سے کچلنا شروع کر دیا اس نے ایسا کچلا کہ چند لمحوں میں وہاں ہرے رنگ کی ایک ڈھیری کے سوا کچھ باقی نہ تھا، جو نہ بول سکتا تھا نہ بول سکتا تھا اس نے طوطے کی اس لاش کو ایک کپڑے میں لپیٹا جیسے اسے کفن پہنا دیا ہو اور شب خوابی کے لباس میں ہی ننگے پاؤں باہر نکل آئی۔ گودی کو عبور کر کے بندرگاہ کے اس کنارے پر چلی آئی جہاں بڑی سے بڑی تونوں کا رخ بدل دینے والی موجیں جوش و مستی میں سرشار تھیں اور ساحل کو کی حد سے پیچھے ہٹانے میں کوشاں تھیں۔ اس نے کپڑا ہلایا اور اس چھوٹے سے مردہ کو جو گھاس کی مانند نظر آتا تھا پانی میں ڈال دیا ——— لاش سمندر میں بہہ گئی اور کفن اسکے ہاتھ میں رہ گیا۔

وہ واپس گھر آئی اور خالی پنجرہ کی فولادی تیلیوں کے سامنے گھٹنوں کے بل گر پڑی ——— اپنے کئے پر پشیمان ——— وہ اٹھی، پنجرہ کو سینے سے لگایا دونوں ہاتھ بلند کئے اور معافی کیلئے دعا مانگی جیسے اس نے کوئی خوفناک جرم کیا ہو ——— کوئی بہت بڑا گناہ...... گناہ۔

(بشکریہ امروز)

حاذق نروائن پلز ——— (حب خاص)

ایک جنرل ٹانک۔ ہے جو عصبی اور دل و دماغ کی کمزوریوں کا مجرب علاج ہے

یہ گولیاں دماغی کام کرنے والے حضرات یعنے وکیل، بیرسٹر اور طالبعلم صاحبان کے واسطے آبحیات کا کام دیتی ہیں

اور جسم انسانی کی جملہ عصبی کمزوریوں کو بحال کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں

دواخانہ ہذا کے خاص مجربات میں سے ہیں۔

خوراک ۱۰ یوم، ۲۰ گولی، دو روپے

تیار کردہ:-

حاذق دواخانہ، بندر روڈ کراچی نمبر ۱

یلانی بی، اے •

اے نونی مس انڈیا

ANONYMOUS INDIA

موٹر گھر گھرائی پھر ایک جھٹکے کے ساتھ کھڑی ہوگئی ——

فادر پیٹرسن کا ہاتھ غیر ارادی طور پر صلیب کا نشان بنانے کے لئے اٹھ گیا۔ ڈرائیور خفیف جھنجھلاہٹ کے ساتھ اپنی نشست سے اٹھا لیکن فادر پیٹرسن کی نیلگوں آنکھوں اور بلند پیشانی پر اضطراب کی کوئی علامت نمودار نہ ہوئی۔ یہ موٹر اس کی بیس سالہ رفیق تھی۔ اس پر اس نے ہزاروں میل کا دورہ کیا تھا۔ وہ اس پر مدراس اور بنگال کے سیلے اور گنجان جنگلوں میں پھرا، کانگڑا اور کلو کی پرخطر ڈھلانوں پر گھوما کشمیر کے گل گشتوں میں گشت کی اور سندھ اور راجپوتانہ کے ریگستانوں میں دھنسا۔ ہمیشہ اس نے اس کی وفا اور مروت پر نگاہ رکھی اس کے عیوب پر توجہ نہ کی۔ اسے کئی بار اس ازکار رفتہ کار کے گاہک ملے لیکن اس کی طبیعت نے اس سے جدا ہونا گوارا نہ کیا۔ وہ ہمیشہ کہتا، "اسے فطری موت مرنے دو میں اسے بیچوں گا نہیں۔ جب یہ جوان تھی تو اس نے مجھے اپنے کندھوں پر اٹھایا اب یہ بوڑھی ہوگئی ہے تو میں اسے اپنے کندھوں پر اٹھاؤں گا"

ڈرائیور نے کھٹ سے بونیٹ بند کیا۔ اس کا چہرہ بیزاری کے احساس سے پرشکن تھا اس کی مایوسی بالکل ظاہر تھی۔

"کیا ہوا ہے؟"

"ڈائنمو بگڑ گیا ہے!"

"پھر؟" فادر نے اسی سکون سے پوچھا۔

"پھر کیا؟" ڈرائیور نے اپنی غالب جھنجھلاہٹ کو دباتے ہوئے کہا "جنگل میں رات گزارنی پڑے گی فادر"

فادر پیٹرسن موٹر سے اتر آیا اس نے اپنی آنکھوں پہ ہاتھ سے سایہ کر کے ادھر ادھر دیکھا۔ موٹر عین سنگ میل کے برابر رکی تھی۔ پتھر پر کندہ تھا ~~اٹاری — امرتسر~~ ۴ میل — ۱۴ میل سڑک کے کنارے ایک کھیت میں ایک بہت بڑا پیپل کا درخت کھڑا تھا جس کی چوٹی کو سورج چھو رہا تھا اس کے تعطل کرتے ہوئے پتے ہوا کے نرم جھونکوں سے کھڑکھڑا رہے تھے۔ اس سے پرے کپاس اور اکھ کے کھیت افق تک پھیلے ہوئے تھے سڑک کی دوسری جانب تین کھیتوں کے فاصلے پر درختوں کے ایک جھنڈ میں دو کوٹھے کھڑے تھے جنہیں اکثر کاشتکار اپنی سہولت اور ضرورت کے لئے اپنی زمین میں بنا لیتے ہیں۔ اگرچہ یہاں بھی دھوئیں کا کوئی نشان نظر نہ آتا تھا۔ تاہم فادر پیٹرسن کی آزمودہ سفر نگاہوں نے فوراً اپنی آسائش کا انتظام سوچ لیا۔ یہ ممکن تھا کہ گاؤں بھی قریب ہی ہو لیکن اسے سر چھپانے کو جگہ مل گئی تھی۔ وہ رات ان کوٹھوں میں بسر کر سکتے تھے۔ اور جب تک ڈرائیور امرتسر سے ڈائنمو بنوا کر لائے گا یہ کوٹھے اس کے لئے ریسٹ ہاؤس کا کام دیں گے۔ اس کے پاس چائے بنانے کیلئے اسٹوو اور کھانے کیلئے بسکٹ تھے اس کے سوا اسے کسی چیز کی ضرورت نہ تھی۔ اگر روشنی مل گئی تو وہ کتاب بھی پڑھ سکتا ہے۔

فادر پیٹرسن نے اپنا اٹیچی کیس اٹھا لیا اور ڈرائیور نے وہ صندوق جس میں اسٹوو اور دوسرا ضروری سامان تھا۔ کوٹھوں کے ایک طرف مکی کا کھیت کھڑا تھا جس میں جنگلی چڑیاں پھڑپھڑا رہی تھیں کوٹھے دو نہیں تین تھے۔ ایک کوٹھا دو کوٹھوں کے عقب میں تھا اور ان کے آگے بیٹھنے کو ایک چھپر تھا جسے شیشم کی ٹیڑھی ٹیڑھی ٹہنیوں سے سہارا دیا گیا تھا چھپر کے برابر میں مٹی کی ایک لمبی ناند تھی جس میں بیک وقت تین ڈنگر چارہ کھا سکتے تھے۔ کوٹھے باقاعدہ لپے پتے ہوئے تھے اور خلاف معمول ان کوٹھوں کے کواڑ بھی لگے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں باقاعدہ رہائش کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ کوٹھوں کے آگے

ٹم کے نوخیز درختوں کا جھنڈ تھا جس کے بائیں مرچوں کے پودے
سبزی کی کیاریاں لگی ہوئی تھیں۔ایک بوڑھا سکھ ان کیاریوں کو
رہا تھا۔

جب فادر پیٹرسن اور ڈرائیور ذخیرے میں داخل ہوئے تو
ھے نے سرگران کی طرف دیکھا وہ اس وقت تک انکے استقبال کے
نہیں اٹھا جب تک کہ اس نے اپنی دھندلی آنکھوں سے انکی شخصیتوں
ری طرح جائزہ نہیں لے لیا۔پھر اس نے اپنی کھرپی نرم زمین میں گاڑ
ا اور یوں آہستہ آہستہ اٹھا گویا اس کے گھٹنوں میں ریح ہے۔وہ نہ
گے بڑھا اور نہ منہ سے بولا۔ڈرائیور کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ فادر پیٹرسن
ں اٹھا"بابا زی کیا ہم آج کی رات تمہارے یہاں رہ سکتے ہیں؟" فادر
رسن نسلاً فلیمش تھا۔اگرچہ ہندوستانی اور برطانوی علاقے میں رہتے
ے ایک مدت گزر چکی تھی اس کے باوجود وہ "ج" اور "ٹ" کو صحیح
یسے ادا نہ کر سکتا تھا۔اگر وہ کر بھی سکتا تو وہ کرنا نہیں چاہتا تھا وہ امتیاز
اس نشان کو مٹانا نہیں چاہتا تھا۔یہ اس کی خودی تھی۔

بڈھا اس پر آگے بڑھا اور صاحب کے قریب آگیا۔پھر اس نے
وہ مجبوری کے لہجے میں دھیمی آواز میں کہا۔"ہاں صاحب آپ
رہ سکتے ہیں۔

ڈرائیور نے اس کے خوف کو دور کرنے کے لئے کہا "بابا، یہ پادری
حب ہیں۔ہماری موٹر خراب ہو گئی ہے اس لئے مجبوراً یہاں رکنا پڑا
یہ تمہیں انعام دینگے" فادر پیٹرسن ڈرائیور کو روکنا چاہتا تھا۔وہ
یں چاہتا تھا کہ بڈھے کو یہ معلوم ہو کہ وہ پاکستان کا عزم کئے ہوئے
ا۔ہندوستان میں مدت العمر رہنے کے بعد وہ ہندوستانیوں
فسیات سے خوب آگاہ ہو چکا تھا۔

بڈھے نے ڈرائیور کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھا۔اگرچہ اس کے
ے مٹی اور پسینے سے مٹیالے ہو رہے تھے تاہم اس کی نگاہیں یہ بتا
رہی تھیں کہ وہ کوئی کمینہ نہیں تھا۔اس نے اسی لاپروائی سے جواب
"مجھے کسی لالچ کی ضرورت نہیں۔میں تو گھر آئے مہمان کی خدمت
کرونگا۔"

فادر پیٹرسن نے کشادہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر اس

کی تائید کی

چھپر کے ساتھ والے کوٹھے میں موٹے مونج کی دو چار پائیاں
بچھی ہوئی تھیں۔ڈرائیور نے ہولڈال کھول کر ایک پر فادر کے لیے بستر
بچھا دیا۔پھر دوسرا سامان لینے چلا گیا۔فادر پیٹرسن یہ حوالات دیکھ کر
پہلے تو گھبرا گیا لیکن راضی بہ رضا ہونے کی وجہ سے اس سے تھوڑے
ہی عرصہ میں مانوس ہو گیا۔ایک دیوار میں دو چھوٹے چھوٹے موکھے بھی
ہوا کے لئے بنے ہوئے تھے اور ان میں اتنی روشنی اندر چھن رہی تھی کہ
دیوار کے ساتھ گڑا ہوا کھونٹا نظر آرہا تھا۔شاید اس کوٹھے میں بوقت
ضرورت ڈنگر بھی باندھے جاتے ہوں۔

دھوپ اب ذخیرے سے رخصت ہو رہی تھی اور ہوا میں
شام کی خنکی پیدا ہو چلی تھی۔ڈرائیور کافی عرصہ کے بعد لوٹا۔وہ موٹر کو
دھکیل کر کوٹھوں کے قریب لے آیا تھا۔شاید اس میں بوڑھے نے
بھی اس کا ہاتھ بٹایا ہو۔اس نے آتے ہی اسٹوو کو دیا سلائی دکھا دی
اور صندوق فادر کی چارپائی کے اس طرح برابر جما دیا کہ تپائی معلوم ہو
اس پر قرینے سے چائے کے برتن رکھ دیئے۔اتنے میں بڈھا دیئے
کی بجائے صاف شدہ لالٹین لے آیا۔اس عرصہ میں فادر نے اتنا آرام
کر لیا تھا کہ وہ نئے ماحول سے لطف اور حظ اٹھانے کے قابل ہو گیا۔

بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ بڈھے کی بے اعتنائی قدرے کم
ہو گئی ہے۔شاید اب وہ ان کو بلائے بے درماں نہ سمجھتا ہو یا شاید
اس کی بے اعتنائی کی کوئی اور وجہ ہو؟ فادر پیٹرسن یہ جاننے کے
لئے مضطرب تھا کہ بڈھا اس کی وجہ سے کوئی تکلیف تو نہیں محسوس
کر رہا۔وہ اس پر جتا دینا چاہتا تھا کہ وہ اس کے لئے زحمت بن کر نازل
نہیں ہوا تھا اور اگر وہ غریب آدمی ہے تو وہ اس تکلیف دہی کا معقول
معاوضہ تک دینے کو تیار ہے لیکن قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہرگز
مفلس نہیں ہے۔فادر پیٹرسن مناسب موقع کی تاڑ میں تھا

بڈھا آیا اور دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا۔اس کے ہاتھ میں ایک
بدھنا تھا جس میں بکری کا دودھ تھا۔یہ وہ اپنے مہمان کی چائے کے
لئے لایا تھا۔فادر پیٹرسن کے پاس جما ہوا دودھ موجود تھا لیکن وہ اس
تحفہ کو قبول کر کے اس سے مزید بے تکلف ہونا چاہتا تھا۔

فادر پیٹرسن نے اپنا خلجان دور کرنے کے لئے پوچھا "بابا جی
تکلیف تو نہیں دیتا۔ ہم اس کی معافی چاہتا ہے۔ ہم سخت مجبور
ہو گئے تھے۔ موٹر کا ڈائنمو خراب ہو گیا۔ اس وجہ سے ہم آپ کے پاس
"

بڈھے نے صاحب کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں بے
[illegible] کے بجائے اعتنا اور نفرت کی بجائے خدمت کی جھلک تھی یہ
اس کا چہرہ کھل گیا "نہیں صاب جی۔ مہمان رب کی برکت ہوتے
آپ جم جم رہیے۔ اگر آپ کو بھوجن بھاجی کی ضرورت ہو تو حکم
میں گاؤں سے منگوا لاؤں۔"

بڈھا اتنا کہہ کر کھانسا اور اس کی [illegible] اس طرح کھڑکھڑائی کہ
پیٹرسن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ بڈھا سانس نہیں لے
رہا [illegible] اپنے ڈوبے ہوئے سانس کو بلغم کی تہہ سے نکال رہا تھا
ان کا بدلہ دینے کا اب موقع تھا

فادر پیٹرسن نے بڈھے سے پوچھا "کیوں بابا جی تم کو یہ شکایت
سے ہے؟"

بڈھے نے فادر پیٹرسن کی طرف اس طرح دیکھا گویا وہ غنودگی
نکلا ہو۔ گویا پادری نے اس کی دکھتی رگ چھیڑ دی ہو "صاب جی
یہ شکایت تین سال سے ہے۔ اس سے پہلے تو پتہ بھی نہ تھا کہ [illegible]
کا روگ کسے کہتے ہیں۔ جب یہ کھانسی نامراد چھڑتی ہے تو راتوں
تیں گزر جاتی ہیں مجھے آنکھ جھپکنی نصیب نہیں ہوتی۔ آج تیسری
[illegible] ہے مجھے سوئے ہوئے۔"

فادر پیٹرسن نے اپنے بیگ میں سے ایک شیشی نکال کر اسے
گولیاں چائے کے ساتھ کھلا دیں اور اس سے پھر مصروف گفتگو
[illegible] وہ اس مدھم روشنی میں پڑھ نہیں سکتا تھا اس کے علاوہ بڈھے سے
کی واقفیت بہم پہنچانے کا یہ بہترین موقعہ تھا۔ جلد ہی اسے معلوم
ہوا کہ اس کا قیاس درست تھا۔ بڈھا دو صد بیگھہ آراضی کا مالک
اس کا باپ کسی زمانہ میں مہاراجہ پٹیالہ کا وزیر تھا لیکن خود اس
[illegible] کی سرستیوں سے بیدار ہو کر فوجی ملازمت کی بجائے زمینداری
[illegible] کر لی۔ اس طرز زندگی سے اسے جو لطف حاصل ہوا وہ کسی اور

طور سے نصیب نہ ہوا۔ یہاں مٹی میں مٹی ہو کر اسے فنا کا سرور ملا جب سے
اس کے لڑکے جوان ہوئے ہیں اس نے اپنا ڈیرا باہر ہی ڈال لیا تھا
اب وہ کسی سے ملنا نہیں چاہتا تھا جس کو ضرورت ہوتی ہے یہاں آ جاتا
[illegible] دونوں وقت گھر سے پکا پکایا کھانا پہنچ جاتا ہے اس سے زیادہ
اسے کسی چیز کی طلب نہ تھی۔

وہ کافی دیر تک اس کی داستان زندگی سنتا رہا جب باہر کسی
پانی کا [illegible] والے کی آواز آئی تو بڈھا اٹھا "اچھا صاب جی، آپ آرام
کیجئے کسی چیز کی ضرورت ہو تو آواز دے دیجئے۔"

ڈرائیور دیر ہوئی سو رہا تھا۔ فادر پیٹرسن نے حسب عادت دعا
پڑھی اور لیٹ گیا۔ خاموشی اس قدر گہری تھی کہ وہ گھاس کی ننھی ننھی
تیلیوں تک میں ہوا کی سرسراہٹ سن سکتا تھا کبھی کبھار جھینگر کی تیز
آواز سناٹے کو اس طرح چیرتی چلی جاتی گویا [illegible] ریشم چیرا جا رہا ہے اس کی
آنکھیں لگ رہی تھیں کہ یکایک اس نے کسی مریض کی کراہ بھری درد میں
ڈوبی ہوئی طویل آہ سنی۔ وہ چونکا اور بستر میں بیٹھ گیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ
کر اندھیرے میں [illegible] دیکھنے لگا۔ یہاں سے یہ آواز آ رہی تھی
یہ بوڑھے کی کراہ نہ تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک درد ناک چیخ اٹھی گویا کسی
بے پناہ [illegible] نے مریض کے گرد [illegible] جھنجھوڑ دیا ہو۔ یقیناً بوڑھے
کی چیخ نہ تھی اس میں عورت کے درد اور مدد کی پکار تھی وہ کہہ رہی تھی۔
"خدارا مجھے چھوڑ دو [illegible] جان لے کر تم کیا کر دو گے؟" اسکے
آخری الفاظ سسکیوں میں ڈوب گئے۔ اس کے بعد بوڑھے کی نرم ملائم
آواز سنائی دی اس کے الفاظ واضح نہ تھے کیونکہ وہ ہولے ہولے بول رہا
تھا۔ مگر لہجے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسے ڈھارس بندھا رہا ہے اسے مٹی
میں مٹی ہو جانے کی تلقین کر رہا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ کراہ اور درد میں ڈوبی
ہوئی طویل آہ سناٹے میں ڈوب گئی پھر وہی گھاس کی ننھی ننھی تیلیوں
میں ہوا کی سرسراہٹ اور جھینگر کی تیز ترنم۔

فادر پیٹرسن کا دل ہمدردی سے معمور ہو گیا۔ وہ ضرور مدد کرتا
لیکن کسی کے خانگی معاملہ میں بن بلائے دخل دینا خلاف شیوہ تھا اسلئے
خاموشی طاری ہونے کے بعد وہ بھی سو لیا۔

دوسرے روز ڈرائیور صبح سویرے ہی چلا گیا۔ فادر پیٹرسن نے حقیر

میں آبیٹھا۔ اس نے کار سے ایک گدا نکال کر درخت کے نیچے بچھا لیا۔ اور فادر پیٹرسن کے جذباتی سفر سے محظوظ ہونے لگا۔ لارنس اسٹرن اسے اس لئے محبوب تھا کہ وہ اپنے چچا ٹوبی کی پلیٹ پر بیٹھی ہوئی مکھی تک کو حقیر نہ جانتا تھا۔ بڑھا بھی اپنی ٹھرکی لئے آن موجود ہوا۔ اس کا چہرہ آج کھلا ہوا تھا۔ وہ سیدھا فادر کے پاس آگیا۔ فادر پیٹرسن نے کتاب الگ رکھ دی۔ اور اسے اپنے قریب گدے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا مگر بوڑھا اس کے سامنے کیاری کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔

"بابا جی آج کیا حال ہے تمہاری کھانسی کا؟"

بوڑھے نے مسکرا کر ہاتھ جوڑ کر کہا "صاحب جی یہ بھلی دیا ہے۔ رات بڑے آرام سے گزری تین برس کے عرصہ میں یہ پہلی رات ہے کہ میں سکون سے سویا ہوں۔ بھگوان آپ کا بھلا کرے۔ مجھ کو دوائی لکھ دیجئے۔"

فادر پیٹرسن کھل کھلا کر ہنس پڑا وہ خوش تھا کہ اس نے احسان کا بدلہ دے دیا ہے۔ اب اس کا وجود بجائے زحمت کے رحمت بن گیا تھا۔

بڑھا چپ ہو گیا۔ یک بیک اس کے چہرے پر بشاشت کی بجائے افسردگی اور سنجیدگی چھا گئی۔ اس نے صاحب جی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا گویا وہ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر فیصلہ نہیں کر سکا کہ کیسے بات کہے۔ پھر اس نے بات کہہ ہی دی۔ صاحب جی، ہماری ایک لڑکی بیمار ہے۔ وہ سوتے میں بڑبڑاتی ہے بہتیرا علاج معالجہ کیا لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا ایک سیانا کہتا تھا کہ یہ پرانا سرسام ہے۔ دوسرے وید نے کہا اس کے دماغ میں پانی بھر گیا ہے۔ ہمیں تو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اصل مرض کیا ہے میں تو سمجھتا ہوں کہ بچی پر آسیب ہو گیا ہے۔

فادر پیٹرسن رات کا واقعہ چھپانا چاہتا تھا لیکن اس نے لاعلمی ظاہر کرنا ہی بہتر جانا۔

"تو بابا جی مجھے وہ لڑکی دکھاؤ۔ میں جتنا کچھ کر سکتا ہوں کروں گا"

بڈھا پادری کو تیسری کوٹھری میں لے گیا جو دو کوٹھریوں کے عقب میں تھی۔ یہ کوٹھری اسی کوٹھری کی طرح بند اور گھٹی ہوئی تھی جس میں وہ رات گزار چکا تھا۔ اس میں صرف ایک موکھا تھا جو چھت میں نکالا گیا تھا۔ اس سے روشنی ایک نالی کی صورت میں لیٹے ہوئے مریض کے گہرے سرخ لحاف پر پڑ رہی تھی۔ کوٹھری کی دیواروں سے سیلہ کی گلا گھونٹنے والی بو آرہی تھی۔ جب فادر پیٹرسن مریض کے قریب ہوا تو اس کے حساس نتھنوں نے تاڑ لیا کہ یہاں سے بول و براز کی صفائی کی تکلیف بھی نہیں کی گئی۔ کواڑ کھلنے سے کوٹھری میں اندھیرا قدرے کم ہو گیا اور ہوا کا سلسلہ شروع ہونے سے موکھے میں لگا ہوا مکڑی کا جالا جھولنے لگا۔

بوڑھے نے مریضہ کے چہرے سے لحاف ہٹایا اور وہ چونک کر چیخی "مجھے مت مارو، میں نے تمہارا کیا نقصان کیا ہے؟"

بوڑھے نے دشتی سے کہا "چپ رہ، ڈاکٹر صاحب آئے ہیں۔"

مریضہ نے فادر کی طرف دہشت اور وحشت سے پھٹی نگاہوں سے دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حرارت غریزی کے ساتھ آنکھوں سے روشنی اور نور بھی رخصت ہو چکی تھی جس سے آنکھیں بولتی ہیں۔ اس کے خشک اور موٹے بال اس کے ماتھے پر ایک گچھے کی صورت میں گرے ہوئے تھے اس کے ہونٹ بے خون تھے اور اس کے چہرے پر یرقان کی زردی جھلک رہی تھی۔ وہ کوئی پچیس برس کی ہوگی۔ اس کی ستواں ناک کتابی چہرے اور نیم جان غزالی آنکھوں میں گزری ہوئی بہاروں کے نقوش اور نعاش ابھی تک موجود تھا۔ اس کے خدوخال نے یک بیک اس کے ذہن میں سرزمین اسپین کی دوشیزاؤں کی یاد تازہ کر دی۔ لیکن وہ تو حسن گمشدہ کی ایک یادرہ گئی تھی۔ اس کی کلائیوں میں دھانی بانکوں کی بجائے لوہے کا ایک کڑا تھا اس کے کھردرے اور بوسیدہ قمیص کا چیکٹ سے سیاہ ہو چکا تھا لیکن اس کی گردن میں راج ہنس کی اور ملائمت ابھی تک موجود تھی۔

جب فادر پیٹرسن نے اس کا ہاتھ چھوا تو وہ پھڑک کر دیوار کی طرف ... بڑھے نے اس کے سر پر پیار سے تھپکی دی "ارے بیٹی تجھے بالکل ہو جائے گا شاباش۔ شاباش۔ میری بچی ڈاکٹر صاحب جو پوچھیں" ساتھ ہی ساتھ بڈھا کبھی کبھار گویا چونک کر دروازے کی طرف بھی دیکھ لیتا جیسے اسے کسی دشمن کا خوف ہو۔ درجہ حرارت کم تھا مگر حالت ظاہر تھا کہ بخار اترا بالکل نہ تھا۔ فادر پیٹرسن بھانپ گیا کہ اس کی بیماری کی وجہ صرف جسمانی نہیں اس کے اعصاب بری طرح مجروح ہو چکے ہوتے تھے۔ شاید وہ کسی نفسیاتی زلزلے کا شکار ہوئی ہو اور یہ کوئی سوت کا قضیہ ہوگا یا خاوند کی بے رخی کا غم۔ عورت کو ان

مگر کوئی چیز صدمہ نہیں پہنچا سکتی۔ مگر اب تو وہ چٹان کے اس کنارے پہنچ چکی تھی جہاں سے لوٹنے کا راستہ منقطع ہو چکا تھا اور سامنے سیاہ کھڈ منہ پھاڑے کھڑا تھا۔

فادر پیٹرسن نے بغور معائنے کے بعد بوڑھے سے پوچھا "اس کی یہ حالت کب سے ہے؟"

فادر پیٹرسن مریضہ کے متعلق سوچ رہا تھا لیکن بڈھے نے لڑکی کے چہرے پر لحاف ڈال دیا اور یہ کہتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھا کہ صاب جی باہر چل کر بات کریں گے اس کی یہ جلد بازی پادری کی سمجھ میں نہ آئی۔

اتنے میں باہر سے کسی کی آہٹ سنائی دی۔ بڈھا کچھ اس آہٹ سے بدحواس ہو گیا۔ اس نے دہلیز سے بمشکل باہر قدم رکھا ہو گا ایک متوسط قد کا جوان شخص دروازہ روک کر کھڑا ہو گیا اس نے اپنی تیز نیلگوں نگاہوں سے بڈھے کی طرف دیکھا لیکن جب ایک انگریز کھڑا پایا تو دہلیز سے ہٹ گیا۔ بڈھے نے اپنی سراسیمگی چھپانے کیلئے [illegible] سے کہا "رنبیر، یہ پادری صاحب ہیں، یہ ڈاکٹر بھی ہیں —— بیماری ساری رات تڑپتی رہی"

وہ کوئی جواب دیئے بغیر ہٹیلی نگاہوں سے بڈھے کی طرف دیکھتا رہا۔ فادر پیٹرسن نے بڈھے کی طرف دیکھا۔ وہ گم سم کھڑا اپنی [illegible] اپنی بھنچی ہوئی انگلیوں کو مسل رہا تھا جوان شخص انگوری رنگ کی [illegible] باندھے ہوئے تھا اس کا رنگ سرخ و سپید تھا۔ اس کے ہونٹ بچے کے ہونٹوں کی مانند پتلے اور پیشانی بلند تھی۔ اس نے اپنی داڑھی پٹیالوی فیشن کے مطابق بٹ رکھی تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں بڈھے کی آنکھوں سے بالکل برعکس تھیں۔ بڈھے کی آنکھیں سیاہ تھیں اگرچہ [illegible] دھندلی ہو کر ملگجی ہو گئی تھیں لیکن اس کی آنکھیں نیلگوں تھیں ان میں ایک تیز شعلہ لپکتا تھا جو اگرچہ غیر مرئی تھا تاہم بخوبی محسوس ہوتا تھا۔ ان میں سٹھیاپن اور ضد تھی۔ ان میں رحم اور تپاک نہ تھا۔ مگر بڈھے کی آنکھوں میں اطاعت اور خدمت کی جھلک تھی وہ نرم و ملائم تھیں

فادر پیٹرسن اپنے سینے پر غیر ارادی طور پر صلیب کا نشان بنانا چاہتا تھا۔ مگر اس کی بجائے اس نے بڈھے کی سراسیمگی دور کرنے کے لئے کہا "بابا جی، یہ تمہارا بیٹا ہے؟"

بڈھے نے سر ہلا کر جواب دیا "جی صاب جی، یہ میرا ہی بیٹا ہے"

فادر پیٹرسن نے اس کی طرف دیکھا وہ شکل و شباہت اور رنگ ڈھنگ سے پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا مگر وہ اتنا کرخت کیوں تھا؟ اس کا رویہ اپنے باپ کے ساتھ ایسا کیوں تھا

لیکن کسی کے معاملات میں بن بلائے دخل دینا خلاف شیوہ تھا

فادر پیٹرسن نے اس کے سامنے اپنی مجبوری بیان کرتے ہوئے تکلف دہی کی معافی چاہی اس پر اس کا چہرہ صاف ہو گیا اور اس نے جواب دیا "کوئی مضائقہ نہیں" پھر وہ پلٹا اور مکی کے کھیت کی پرلی جانب ہو لیا۔

بوڑھا اپنی کیاری کی طرف چلا گیا۔ اور فادر پیٹرسن اپنی سایہ دار نشست پر آ گیا اس نے پھر کتاب اٹھالی اور [illegible] کے ساتھ سیر باطن میں محو ہونا چاہا۔ لیکن لڑکی کا مجبور چہرہ، بڈھے کی سراسیمگی اور جوان کی کرخت اور ہٹیلی نگاہیں اس کے خیالات میں بار بار ہیجان پیدا کر رہی تھیں اس کا تجسس بے قرار تھا مگر - - - کسی کے شخصی معاملات میں بن بلائے دخل دینا خلاف شیوہ تھا۔

اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ایک بج گیا تھا۔ اس کو پاکستان کی سرحد میں کل ہی داخل ہو جانا چاہیئے تھا۔ فادر چارلس بے چارہ اس کے انتظار میں پریشان ہو رہا ہو گا وہ نہ تو یہاں سے تار بھیج سکتا تھا اور نہ فون کر سکتا تھا۔ اسے توقع نہ تھی کہ کار کی مرمت میں اتنی تعویق ہو جائے گی۔

دوپہر کے قریب بڈھا اس کے لئے بدھنے میں دودھ لایا۔

"صاب جی میں آپ کی اچھی طرح خدمت نہیں کر سکا معافی دیجئے گا"

فادر پیٹرسن نے مسکرا کر جواب دیا "بابا جی کوئی مضائقہ نہیں"

پھر وہ اس کے پاس بیٹھ گیا اور کھرپے سے زمین کریدتے ہوئے بولا "میرا بیٹا اس لڑکی سے ناراض ہے"

فادر پیٹرسن نے اس کی [illegible] دور کرنے کے لئے کہا "بابا جی [illegible] اپنی بیوی سے اچھا سلوک نہیں کرتا تو [illegible] کا

دل دکھتا ہے میں تمہیں تھوڑی سی گولیاں دے دونگا ہر روز رات کو دو گولیاں سوتے وقت اسے دودھ کے ساتھ کھلا دینا امید ہے اسے صحت ہو جائے گی۔ تم فکر مت کرو۔"

مگر بڈھا گویا اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے کہا "صاحب جی، یہ لڑکی پوری تین برس سے بیمار چلی آ رہی ہے۔ پھول سا چہرہ کمہلا کر سوکھ گیا ہے۔ اب تو صرف جان نکلنے کی کسر باقی ہے۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو امڈے چلے آ رہے تھے۔ اس نے اپنی آنکھیں ہاتھ سے پونچھتے ہوئے کہا "میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں اب مجھ سے کسی کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی۔"

اس کا یہ فقرہ فادر کے دل میں ترازو ہو گیا۔ فادر نے اس کی تائید میں ٹھنڈی آہ بھری وہ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ زندگی بوجھ ہے یہ دکھ بھرا ناسور ہے جیسے آدمی اپنی گردن پر لعل شب چراغ کی طرح اٹھائے ہوئے ہو۔ صرف موت ہی اس کو دور کر سکتی ہے

چار بجے کے قریب ڈرائیور آ گیا۔ اس وقت تک فادر پیٹرسن نے "جذباتی سفر" ختم کر لیا تھا۔ وہ آیا اور آتے ہی موٹر کا بونیٹ اٹھا کر اپنا سر اس میں چھپا لیا۔ آدھ گھنٹے کے بعد جب اس نے بونیٹ سے اپنا سر نکالا تو اس کا چہرہ پسینے کے قطروں سے چمک رہا تھا اس نے شکر کا سانس لیا اور فادر سے روانگی کے متعلق دریافت کیا۔

اگرچہ سورج ڈھل رہا تھا اور شام کے بعد سرحد عبور کرنا صرف دشوار ہی نہیں پرخطر کام بھی تھا تاہم وہ اس جگہ ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایسے مقام پر ہرگز ہرگز سکون قلب کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا جہاں کسی بات کی وجہ جواز سمجھ میں نہ آ سکے اور جہاں کا ہر شخص تیوری کو تیوری چڑھا کر دیکھتا ہو۔ عادتاً اس نے ڈرائیور کی رائے بھی معلوم کرنا چاہی۔

اس نے اپنی ٹوپی سر پر رکھتے ہوئے کہا "فادر جیسے آپ کا حکم ہو میں ہر طرح حاضر ہوں لیکن اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ شام کا سفر پسند نہیں کرتا۔

بڈھا ان کو تیار دیکھ فادر کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ صاحب جی میں آپ کو ہرگز جانے کی اجازت نہیں دونگا۔ اب وہ پہلا سا وقت نہیں رہا کہ راتوں کو سونا اچھالتے چلے جاؤ کوئی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے اب تو ذرا اندھیرا ہوا گولیاں چلنی شروع ہو جاتی ہیں۔ آئے دن سرحد پر سکھوں مسلمانوں کی جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔"

حکم کا منتظر ڈرائیور فادر کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا جو درخت سے ٹیک لگائے کوٹھوں کی طرف دیکھ رہا تھا اس کا دل یہاں ایک لمحہ مزید ٹھہرنے کو نہیں چاہتا تھا لیکن بعض اوقات آدمی کو مجبوری کے سامنے جھکنا بھی پڑ جاتا ہے اس کے علاوہ وہ اپنے میزبان کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا اسے بابا زی سے انس سا ہو گیا تھا کیونکہ وہ ایک خدمتگذار اور بھکتی آدمی تھا۔

"اچھا بابا زی، جیسے تمہاری مرضی۔"

دھوپ زخیرے سے رخصت ہو رہی تھی اور شام کی ہوا میں خنکی پیدا ہونے لگی ڈرائیور نے فادر کا بستر کھول کر بچھا دیا۔ اسے کو دیا سلائی دکھائی اور میز نما صندوق پر چائے کے برتن جما دیے۔ بڈھا اتنے میں بکری کا تازہ تازہ جھاگ دار دودھ لے آیا۔

ڈرائیور رامسر سے اپنے لئے کھانا اور صاحب کے لئے ڈبل روٹی اور مکھن لے آیا تھا۔ دونوں نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ سیر شکمی سے نا کی آنکھ بھی جھپکنے لگی۔ بڈھا دودھ دیکر چلا گیا تھا اور پھر نہیں لوٹا۔ کھانا کھا کر جونہی چارپائی پر لیٹا پھر کروٹ تک نہ لی۔ فادر بستر پر لیٹ لیکن دعا کے بعد پندرہ منٹ تک سر کو ہاتھ سے ٹیک دیکر اونگھتا رہا کوٹھری سے مریضہ کی کراہ گاہ گاہ سنائی دیتی تھی اس کراہ کو ایک طرح ٹھنڈا کر دیتی گویا مریضہ ہوش میں نہیں عالم بے ہوشی میں سب کچھ تھی۔ مریضہ کی حالت کا تصور کر کے فادر پیٹرسن کا دل بیٹھ گیا۔ وہ سے لیکر شام تک بوسیدہ اور بودار لحاف میں منہ چھپائے کس خیال کس کیفیت میں ڈوبی رہتی ہو گی؟ کم از کم اسے تو ایسی کیفیت کا ہی آمادہ خودکشی کر دے۔ اس برعظیم میں بیس برس رہنے کے باوجود ہنوز اسکے اسرار سے ناواقف تھا۔ اس کے خاوند نے اسے کم میں ایسی قید سخت کی سزا دے رکھی ہے؟ کیا وہ کسی اور سے کرتی ہے یا اس کا خاوند کسی اور کی زلف کا اسیر ہو کر اس سے بے ہو چکا تھا۔ اگر ایسا تھا تو وہ اپنے میکے کیوں نہ چلی گئی وہ اپنے

کے پاس اس حالت میں کیوں پڑی ہے؟ شاید اس کا اس دنیا میں کوئی بھی عزیز و اقرب نہ ہو۔

جھینگر کی تیز ترنے اس کے خیالات کو چیر دیا اور وہ نیند سے بوجھل پلکوں کے ساتھ دماغ کو بیدار نہ رکھ سکا اس نے تکیے پر سر رکھ دیا اور سو گیا۔ کوئی آدھی رات کے قریب اس نے کسی کو ــــ پکارتے سنا "صاب جی، صاب جی" اس نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں بڈھا لالٹین لئے اس کے سرہانے کھڑا تھا۔ اس نے ملتجیانہ لہجہ میں کہا "صاب جی مدد کی دینا۔ لڑکی سخت بیمار ہے۔ ذرا دیکھیے تو" فادر پیٹرسن اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا اور اسکے پیچھے ہو لیا۔

لڑکی لحاف میں لیٹی پڑی تھی۔ جب بڈھے نے لحاف کا پلہ اس کے چہرے سے ہٹایا تو اس نے دیکھا کہ لڑکی تشنج کے دورے میں مبتلا تھی اس کے چہرے کے عضلات اینٹھے ہوئے تھے۔ دانت بھینچے ہوئے تھے۔ آنکھوں کے ڈھیلے گھوم گئے تھے اور چہرے کی رنگت نیلی پڑ چکی تھی۔ بڈھے نے اس پر جھک کر اسے پکارا "کاکی او کاکی ڈاکٹر صاحب آئے ہیں۔" فادر پیٹرسن نے بڈھے کو بلانے سے منع کیا۔ کوٹھڑی کی سیلی گھٹن سے فادر کا سانس رکنے لگا لالٹین کی زرد روشنی میں مریضہ کا چہرہ بری طرح خوفناک دکھائی دے رہا تھا فادر پیٹرسن نے اپنے محدود طبی علم اور ادویات سے جتنی مدد بہم پہنچا سکتا تھا پہنچائی مگر مکمل افاقہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا اسے مزید مایوسی اس وقت ہوئی جب اسے بوڑھے کے ذریعہ معلوم ہوا کہ نزدیکی ہسپتال یہاں سے چھ میل دور ہے۔ فادر پیٹرسن چپ ہو گیا۔ وہ بخوبی سمجھ گیا کہ اگر طبی امداد یہاں پہنچ بھی سکتی ہو تو بھی کوئی نہیں لائے گا اور یہ محمدل بوڑھا ایک معزول بادشاہ تھا جس کے اختیار میں سوائے منت سماجت اور دلی جذبات ہمدردی کے اور کچھ نہ تھا۔

گھنٹہ بھر کی کوشش کے بعد اس کے دانتوں کا تالا ٹوٹا اور اینٹھن کم ہوئی۔ اس کے سانس میں بھی یکسانی آگئی۔ جب وہ ہوش میں آئی تو وہ ایسی نحیف آوازیں کراہی کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے پھیپھڑوں میں کوئی سکت باقی نہ رہ گئی تھی۔ پھر اس نے آنکھ کھول کر فادر کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں جاندار تھیں۔ اس کی نگاہیں کچھ کہہ رہی تھیں فادر پیٹرسن اسکے اوپر جھکا اور اس کے سر پر پیار سے تھپکی دیتے ہوئے "بیٹی ــ مت گھبراؤ۔ آسمانوں کا خدا دیکھ رہا ہے وہ اپنے بندوں کو نہیں بھولتا۔"

لڑکی کی زبان ہل رہی تھی مگر بے صوت الفاظ فادر کی سمجھ میں نہ آئے۔ بوڑھا آگے بڑھا اور بولا "کاکی کیا کہتی ہے تو اب مجھے آرام ہو جائے گا مگر وہ بدستور زبان ہلاتی رہی جب دونوں کچھ نہ سمجھے تو اس نے آہ بھر کر اپنا منہ دیوار کی طرف پھیر لیا بوڑھے کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ اس نے فادر کی طرف دیکھتے ہوئے "صاب جی، میں جانتا ہوں وہ کیا کہتی ہے؟"

بوڑھے کی آواز آنسوؤں سے گھٹ رہی تھی "صاب جی، وہ اپنا بچہ مانگتی ہے مگر اس کا ظالم باپ اسے نہیں دکھاتا۔"

پھر اس نے صاب جی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے باہر لے آیا۔ ذخیرے کے اوپر صبح کی سفید دھاری ہویدا ہو رہی تھی۔ فادر نے دیا سلائی جلا کر گھڑی دیکھی۔ تین بج رہے تھے۔ روانگی کا یہ بہترین وقت تھا اس نے ڈرائیور کو جگایا اور دونوں نے جلدی جلدی سامان لپیٹا۔ بڈھا پادری کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا "صاب جی، آپ بڑے بھاگوان ہیں ہم سے کوئی قصور ہو گیا ہو تو معافی دینا۔"

فادر نے ہنس کر بوڑھے کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "نہیں بابا زی، ہم نے تم کو بہت تکلیف دی۔ ہم اس کی معافی چاہتا ہے۔ پھر اس نے پوچھا "کیوں بابا زی تم پڑھ سکتے ہو؟"

"جی ہاں، کچھ کچھ حرف اٹھا لیتا ہوں۔"

فادر پیٹرسن نے اپنے دستی بیگ سے لوقا، متی اور یوحنا کے تین چھوٹے چھوٹے پمفلٹ نکال کر بڈھے کو دیئے "انھیں پڑھنا، یہ خدا کا کلام ہے جو ایک دن جب زمین سے اٹھائے گا اور ہم سے پوچھے گا۔ بتاؤ تم نے دنیا میں کیا کچھ کیا؟"

بوڑھے نے کتابیں چوم کر ماتھے سے لگائیں "سب دھرم سچے ہیں، صاب جی"

فادر پیٹرسن موٹر میں بیٹھ گیا۔ اس نے بڈھے سے پھر ہاتھ ملائے۔ وہ ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ فادر پیٹرسن نے کوٹھوں کی طرف دیکھا اور غیر ارادی طور پر اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا وہ خوش تھا کہ وہ سیلی گھٹن والی بو اور ناقابل فہم اسرار کی بھول بھلیوں سے

نکل رہا تھا۔ جب موٹر چلی تو وہ آہستہ سے بڑبڑایا "اے نونی مس انڈیا"

Anonymous India

بڈھا پادری کو وداع کرکے تیسری کوٹھری میں آیا۔ لڑکی بدستور حالت غنودگی میں تھی اس کا سانس اگرچہ یکساں تھا تاہم اس میں کھڑکھڑاہٹ تھی۔ اس کی ایک بھنچی ہوئی مٹھی سینے پر پڑی تھی جیسے اس میں اس نے کوئی چیز دبا رکھی تھی۔ بڈھے نے آہستہ سے مٹھی کھول کر دیکھی اس میں چاندی کا ایک تعویذ تھا۔ بڈھے نے اس کی بے جان مٹھی کو بند کر کے ویسے ہی اسکے سینے پر رکھ دیا اور باہر نکل آیا۔

آسمان پر سفیدی پھیل رہی تھی اور ٹکی کے ٹانڈوں میں چڑیاں پھدک رہی تھیں۔ طوطوں کی ایک ڈار اسکے سر پر سے پھر سے گزر گئی بڈھے نے آسمان کی طرف دیکھا اور آہ بھر کر کہا "پربھو، مجھ میں اب زیادہ تڑپنے کی تاب نہیں۔"

لڑکی تین برس سے اس کے پاس رہ رہی تھی اس لئے قدرتی طور پر بڈھے کو اس سے ایک گونہ انس سا ہو گیا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ مرض کا سبب کیا ہے اور اس کا علاج کیا ہے؟ مگر وہ کسی سے نہ کہہ سکتا تھا۔ اس لئے کہ اس راز کی تہ میں خود اس کا اپنا لخت جگر تھا اور وہ کچھ کر نہ سکتا تھا اس لئے کہ اس کی حیثیت ایک مقہور قدسی کی سی تھی۔

اس لڑکی کا نام نذیراں تھا اور وہ چودھری نقو کی لڑکی تھی یہ دوسرے گاؤں میں رہتے تھے یہاں اکثریت مسلمانوں کی تھی اور یہ گاؤں خالص سکھوں کا تھا لیکن دونوں کے تعلقات قدیمی تھے وہ ایک دوسرے کو سگے بھائیوں کی طرح جانتے تھے ان کی برات سکھوں کے بغیر مکمل نہ ہوتی اور وہ اس وقت تک آرسی نہ دکھاتے جب تک کہ مسلمان بھائی موجود نہ ہوتے۔ جب انکے ہاں چٹائی بچھتی تو انکے ہاں بھی سوگ بیٹھ جاتا۔ ان کے ماتم ہوتا تو یہ غمگسار ہوتے۔ جب بلوہ مچا تو سکھوں نے ان کو اپنے ہاں بلا لیا کہ یہ آخری موقع تھا بھائی بندی کی صداقت دکھانے کا سارا گاؤں مع دوسرے قریبی دیہات کے ایک قافلے کی صورت میں اٹھ کر اس گاؤں کے باہر پڑی ہوئی زمین میں آن اترا۔ سکھوں نے بڑی مدارات کی۔ ہر طرح کی چارے اور جنس کی سہولت بہم پہنچائی دو تین دن تو بڑے سکون سے گزرے۔ یہاں تک کہ پورے قافلے کو گمان ہونے لگا کہ یہ آندھی بس عارضی ہے شاید کہ یہیں بیٹھے بیٹھے گزر جائے مگر چھٹے روز ان کو اطلاع مل گئی کہ انکے بوڑھے بھائی بند ان کی حفاظت کی ذمہ داری سے دست برداری پر مجبور کئے جا رہے ہیں قافلے کے بوڑھوں اور عورتوں نے یک بیک بے چینی کا اظہار شروع کر دیا لیکن قافلے کے سربرآوردہ لوگوں نے سکھوں کی جانب سے قطعی اور صاف جواب مل جانے کی صورت ہی میں اس کا اظہار مناسب سمجھا۔ اگرچہ بے رخی کی علامات ہویدا ہو چکی تھیں لیکن وہ متوقع طوفان کو اتنا قریب نہ سمجھتے تھے۔ اس کے تین روز بعد رات کو یک بیک حملہ ہو گیا۔ غنیم چاروں طرف سے ٹوٹ پڑا جنکو مقابلہ کرکے جان دینی تھی وہ اپنی مراد پا گئے جن کو کہیں اور قتل ہونا تھا وہ یہاں سے بچ نکلے حملہ آوروں نے دو ہی گھنٹے میں صفایا بول دیا اور عورتوں اور بچوں میں سے جن جن کو انکے نفسوں نے پسند کیا رکھا باقی کو تہ تیغ کر دیا۔ بوڑھے کے لڑکے زنبیر سنگھ کا گاؤں کے دلیر جوانوں میں شمار ہوتا تھا وہ خون کی ہولی کھیلتا ہوا ایک چھکڑے کے پاس پہنچا تو دیکھا ایک مردہ سفید چادر میں گٹھری بنے چھکڑے کے نیچے پڑا ہے اس کی تلاشی کے لئے جب اس نے چادر کا پلو پکڑ کر کھینچا تو مردہ چیخ مار کر اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ تو ایک لڑکی تھی حسین و جوان، خوب رو و خوش شکل۔ اس کا چہرہ خوف کے مارے گلاب سے کنول بنا ہوا تھا۔ زنبیر سنگھ مبہوت رہ گیا۔ لڑکی نے اس کے پاؤں تھام لئے "گورو نانک کے واسطے تمہیں گورو گوبند سنگھ کی قسم مجھے مت مارنا۔"

زنبیر سنگھ حسن مجبور کی ادائیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے سب کچھ دیا اور وہ صرف اس متاع کو اپنے گھر لے آیا۔ اس نے اسے خاص گھر گاؤں میں نہیں رکھا بلکہ ان کوٹھوں میں رکھا جو گاؤں سے باہر زمین میں بنائے ہوئے تھے۔ اس کو اگرچہ اپنے باپ کا خوف نہ کہ وہ بڈھا ہو چکا تھا اور سب خیالات اس سے منتقل ہو چکے تاہم اس کا ایک بھائی تھا جو فوج میں لیس نائیک تھا۔ اس کی تھی۔ اسکے دیگر چچے تائے تھے اس کی بیوی اور اس کے میکے تھے سارے اپنے گاؤں کے پنچ اور نمبردار تھے۔ ان کا خوف نہیں تو کم از کم پاس ضرور تھا اس کو اپنی زندگی سے محبت نہ تھی ممکن ہے وہ دوسرا

نگاہوں میں قبول صورت ہو لیکن وہ کوشش کے باوجود اپنے آپ
اس کا فریفتہ نہ بنا سکا۔ وہ زیادہ دیر تک اس کے پاس بیٹھتا تو
اس کا جی گھٹنے لگتا۔ وہ متعجب تھا کہ لوگ کیوں اپنی عورتوں کی صحبت
میں پہروں رہتے ہیں اور بیزار نہیں ہوتے۔ وہ اسے بلاتی مگر یہ اس سے
کتراتا۔ مگر جب وہ نذیراں کے پاس بیٹھتا تو اس کے سانس کی خوشبو
سے مست ہو جاتا وہ گویا اپنی جگہ پر پتھر کا بت بن کر چپک جاتا۔ وہ
اس کے سامنے خوف سے گٹھری بنی رہتی۔ وہ جب اس سے کوئی
بات کہتا یا پوچھتا تو وہ اس عجز سے جواب دیتی گویا وہ ایک جابر بادشاہ
ہے۔ حالانکہ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ چارپائی پر بیٹھے تو میں اس کے
قدموں میں بیٹھوں۔ وہ مجھے ایک رانی کی طرح حکم دے اور میں ایک
غلام کی طرح بجا لاؤں، وہ جب آتا اسے روتا پاتا۔ اس کی غزالیں
آنکھیں سوج جاتیں۔ پھر وہ اپنی گود میں بٹھا کر اس کی سُرخ آنکھوں
کی طرف دیکھ کر کہتا "جیراں رو رو کر اپنی جان کیوں ہلکان کر رہی ہے"
اور اس کی لال لال آنکھیں اسے گلگلوں سے بھرے دو جام
دکھائی دیتے جن کو پی جانے کی بے پناہ خواہش کی تاب لانے کی اس میں
ہمت نہ تھی۔ مگر وہ نظریں جھکائے جواب دیتی "بہت اچھا سردار جی"
یہ جواب اس کے دل کو چیر دیتا۔ وہ محبت چاہتا تھا۔ بے جان ندامت نہیں
چاہتا تھا۔ اسے شوخی چاہیئے تھی۔ ٹھنڈی اطاعت گزاری نہیں۔ وہ اس
کے دل کی ہر خواہش پوری کرنی چاہتا تھا کہ اس کی خوشی اسی میں تھی۔ مگر
ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے اندر خواہش اور تمنا سوکھ چکی تھی۔ پھر وہ
جھنجھلا کر اسے پرے پھینک دیتا اور چلا کر کہتا "میں تمہارا گلا گھونٹ
دوں گا۔ حالانکہ وہ خوب سمجھتا تھا کہ زندگی کے اس انقلاب کو ذہن سے
اس وقت تک محو نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ دماغ میں عقل و خرد
کی بجائے بھس نہ بھر دی جائے۔ آدمی کا دل گوشت کا لوتھڑا ہے کوئی
پتھر کا ٹکڑا نہیں۔ وہ اس مٹی کو کیونکر بھول سکتی تھی جس میں اس کا تخم بارور
ہوا اس کی کلی چٹکی اور پھول بنی۔ اس اجنبی زمین اور اجنبی فضا میں وہ
جڑ پکڑتے ہی پکڑے گی۔

لیکن چند ماہ بعد رنبیر کا اخلاص متاثر ہونے لگا۔ نذیراں کے
آنسو خشک ہونے لگے اور تبسم اس کے چہرے پر گاہ گاہ لہرانے لگا۔ وہ
ہونٹوں سے نہیں اپنی غزالیں آنکھوں سے مسکراتی تھی اور جب کبھی جھانک
کر وہ ان کے اندر دیکھتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا گویا ان آنکھوں میں صبح
ازل انگڑائیاں لے رہی ہے اس کی موٹی موٹی پلکیں آنکھوں کے اوپر
جھکی ہوئی تھیں جیسے شفاف جھیل کے اوپر کھجوروں کے جھنڈ جھکے
ہوئے ہوں۔ نذیراں نے بھی اس کی وارفتگی محسوس کر لی۔ اس نے اپنی
حالت پر غور کر کے اپنی کشمکش کی ناکامی کو تسلیم کر لیا۔ اب اس رن کے
نشانات بھی مٹ چکے تھے جو اس گاؤں کے باہر کھلے میدان میں پڑا تھا
اب ان لاشوں کی ہڈیاں بھی گل چکی تھیں جو اس روز مقابلے میں کام آئی
تھیں۔ اس میدان میں اب [illegible] کے پودے اگے ہوئے تھے جو اپنے
وجود سے بتا رہے تھے کہ دنیا کا کارخانہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا! پس نذیراں
کے لئے صرف ایک ہی راستہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو اسی سانچے میں ڈھال
لے۔ اس کے علاوہ کوئی بھی راستہ کم از کم اس کے تصور میں ممکن یا قابل
عمل نہ تھا۔

وہ رنبیر کی خدمت گزاری بدل کرنے پر آمادہ ہو گئی جو اس پر
احسان کر رہا ہے۔ اسے اس کا مشکور ہونا چاہیے۔ اس لئے آہستہ
آہستہ ان کوٹھوں میں اپنا گھر بنانا شروع کر دیا۔ وہ دونوں وقت چولہا
پھونکتی اور جب رنبیر کھیتوں کو آتے ہوئے دور سے کوٹھوں سے
دھواں اٹھتا دیکھتا تو اس کا دل خوشی سے جھوم اٹھتا اس کی محنت
رائیگاں نہ گئی تھی۔ وہ دونوں وقت اسی کے ہاں سے کھاتا۔ اگرچہ
اس کے کام و دہن اس ذائقے کے عادی نہ تھے جس کی نذیراں عادی
تھی اس نے رفتہ رفتہ محسوس کر لیا کہ دونوں قوموں کے درمیان کوئی
سطحی نہیں بنیادی فرق ہے ان کے خیالات ان کے احساسات ان کے
کام و دہن ہر چیز میں فرق تھا۔

نذیراں نے زن و شوہر کے نئے تعلق کو اس طرح قبول کر لیا
جس طرح ایک زخمی حادثے کی واقعیت کو قبول کر لیتا ہے۔ اب وہ اس
سے کوئی چیز طلب کرنے میں جھجک محسوس نہ کرتی۔ جب وہ دیکھتی کہ رنبیر
حکم برداری ہی میں خوش ہے تو اس نے احکام صادر کرنے شروع
کر دیئے۔ وہ ان احکام کو بالخصوص اس لئے پسند کرتا تھا کہ وہ سب کے
سب آرائش و جمال کے متعلق تھے۔ وہ طبعاً نفاست پسند تھی

اسے گندگی اور ژولیدگی سے نفرت تھی۔ وہ جس طرح اپنے برتن چمکدار رکھتی۔ اپنے آنگن میں کوڑے کا ایک تنکا تک دیکھنا گوارا نہ کرتی۔ اسی طرح وہ رنبیر سے بھی اپنے بدن کی صفائی کی توقع رکھتی۔ وہ طبعاً لاپرواہ تھا لیکن اب وہ ہر روز نہاتا اور ہمیشہ صاف ستھرا رہتا۔

اس طرز زندگی پر ایک برس بیت گیا

ایک دن رنبیر نے کہا "نذیراں، آج شام کو جتنے بھی عمدہ سے عمدہ کھانے تم بنا سکتی ہو بنانا میرا چھوٹا بھائی چھٹی پر آیا ہے وہ شام کا کھانا یہیں کھائے گا"

اس کے لئے اپنا ذوق دکھانے کا یہ بہترین موقعہ تھا۔ اس نے وہ تمام کھانے پکائے جو کبھی اس کا باپ کسی مہمان تھانیدار یا اپنے سمدھی کو کھلانے کے لئے پکوایا کرتا تھا۔ گوشت کا پلاؤ، آلو گوشت اور سوجی کا حلوا جس پر بادام کا آٹا اور الائچی دانہ چھڑکا گیا ہو۔ شام کے وقت رنبیر اپنے بھائی سنت سنگھ کو لیکر آیا۔ نذیراں اس وقت چولھے پر بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی۔ آگ سے اس کے رخسار تپ کر انار کی کلیاں بن گئے تھے۔ اس کی غزالیں آنکھوں میں شفق کی سرخی پھول رہی تھی اور اسکی پیشانی پر پسینے کے چند قطرے افشاں کے ریزوں کی طرح چمک رہے تھے۔ رنبیر سنت سنگھ کو نذیراں کے پاس چھوڑ کر کنوئیں پر کسی سے ملنے چلا گیا۔ نذیراں نظریں جھکائے روٹیاں پکاتی رہی جب وہ روٹیاں پکاتے پکاتے کسی کام کے لئے اٹھی تو اس نے چرائی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا اس میں اور رنبیر میں بڑا فرق تھا۔ یہ بھی رنبیر کی طرح سپید تھا لیکن اس کی رنگت میں اتنی تیز سرخی تھی اس کی آنکھیں رات کی مانند سیاہ تھیں جبکہ رنبیر کی کرنجی تھیں۔ اس کا بدن چھریرا تھا۔ رنبیر کا گٹھیلا اس کی ڈاڑھی کے بال سیاہ ملائم اور ریشمیں تھے جیسے بھٹے کے بال جب کہ رنبیر کے بال کرخت اور نوکیلے اور بھورے تھے۔ اس کی مونچھیں اسکے ہونٹوں کو چھپائے ہوئے تھیں لیکن اس کے بھائی کی پتلی پتلی مونچھیں اور اسکے نازک اور پتلے ہونٹوں کی رعنائی کو اور بھی نمایاں کر رہی تھیں۔

وہ اس کی نگاہوں کا مفہوم تاڑ گئی۔

کھانے کے بعد دونوں بھائی دیسی سنگترہ پینے لگے۔ رات کی سیاہی گہری ہونے تک انھوں نے تین بوتلیں خالی کر دیں۔ سنتو نے رنبیر کا گلاس دکھاتے ہوئے نذیراں کی طرف اشارہ کیا۔ مگر رنبیر نے کہا "بھائی سنتو نہیں، میں کسی کا دھرم نشٹ کرنا پسند نہیں کرتا۔ وہ تو پنجرے کی چڑیا" مستی رنبیر کے دماغ پر مسلط ہو رہی تھی۔ اس کی زبان لڑکھڑانے لگی اور بکنے لگا "بھائی سنتو مجھے واہگورو اور دربار صاحب کی قسم، میرا گھر ا بنا ہے۔ واہگورو نے تو میرے لئے اوتار بھیج دیا ہے۔ بس میرا تو یہی دھ ہے۔" مگر سنتو بدستور ہوش میں تھا۔ اس کے مضبوط اعصاب شراب کی تـ اور خون کے جوش کو پیاسی ریت کی طرح جذب کر گئے تھے۔ صرف ہلکی سی سرخوشی کی علامات ظاہر تھیں۔ وہ ایک گھونٹ بھرتا اور لالٹین نیچے بیٹھی ہوئی نذیراں کی طرف دیکھ لیتا۔ جب وہ اس کی طرف دیکھ تو اس کی رات کی مانند سیاہ آنکھوں میں لالٹین کی زرد لو کا عکس جگنو کی طرح بھڑک اٹھتا۔ آدھی رات ہونے کو آئی تھی۔ ہوا میں ٹھنڈک ا سکون آچکا تھا۔ رنبیر بھدے سروں میں "جگا" گا کر وہیں چت ہو گیا جب وہ خرّاٹے لینے لگا تو سنتو اٹھا اور اس نے نذیراں کا ہاتھ پکڑ نذیراں کپکپائی۔ اس نے غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ چھڑانے کی ہلکی کوشش کی۔ لیکن اس کی نگاہوں اور گرفت میں ایسا تحکم اور جادو کہ وہ اس کے پیچھے کشاں کشاں ہو لی۔ وہ کھیتوں سے گزرتے ہوئے سڑک کے پار بڑے پیپل کے نیچے آن کھڑے ہوئے جس کا چھتر آسمان پر کالی روشنائی کا بہت بڑا داغ دکھائی دے رہا تھا۔ چار جانب سیاہی اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پتوں کے درمیان ستارے یوں جھلک رہے تھے گویا پتوں میں جگنو الجھے ہوئے ہ وہ اس کے قریب ہو گیا۔ اس کے منہ سے دیسی سنگترہ کی تیز بو کے انگریزی لیونڈر کی بھینی بھینی خوشبو نذیراں کے گلے کو گھونٹنے لگی اسے کچھ نہیں معلوم ہوا کہ وہ کس خلا میں ڈوب گئی۔ جب وہ جاگی تو ا میں اپنی چارپائی پر پڑی تھی اور سنتو غائب تھا۔

ان کے درمیان ایک ایسی مفاہمت پیدا ہو چکی تھی جو ا درمیان میں منتقل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ اپنی زبانوں سے بولتے نہ اپنی نگاہوں سے، انکے وجود ایک دوسرے سے بولتے تھے ایک دوسرے کے عندیہ کو اس طرح پا لیتے جس طرح پپیہا

بارش کی آمد کو پالیتا ہے۔ سنتو بہت ذہین تھا ظاہری افعال یا
ں نے کبھی بھول کر بھی اپنے باطن کی جھلک نہ پڑنے دی۔ ظاہری
ں جول میں وہ رنبیر اور نذیراں سے اس طرح ٹھٹھا مذاق کرتا جیسے
ر اپنی بھاوجوں سے کرتے ہیں۔ نذیراں نے خود بخود اپنا رویہ اس
مطابق بنا لیا۔ وہ کبھی رنبیر کے ہوتے ہوئے سنتو سے نہیں کھلی اس وقت
پورے اخلاص سے اس پر طاری ہوتی بعض وقت اسے ایسا محسوس
نے لگتا گویا دونوں دو ایسی ہستیوں میں بٹ چکے ہیں کہ جن کے
میان کوئی ربط و تعلق نہیں۔ جب وہ رنبیر کی بیوی بنتی ہے تو پورے
لاص سے بنتی ہے۔ جب سنتو رنبیر کا بھائی بنتا ہے تو اس میں بھی
ئی منافقت نہیں ہوتی۔ لیکن جب وہ پیپل کے منڈپ کے نیچے
تے ہیں تو وہ کوئی اور ہوتے ہیں جن کا تعلق ہنگامہ و شور میں بسنے والی
نیا سے نہیں ہے۔

چند دن کے بعد سنتو اپنی نوکری پر واپس چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد نذیراں نے ایکا ایکی محسوس کیا گویا
سنتو نہیں اس کا اپنا خاوند پردیس گیا ہے۔ یہ کو ٹھے اور در خیر سے
سے کاٹ کھانے لگے۔ وہ جگہ جہاں بیٹھ کر وہ اپنے ماضی کو یاد کرتی
در اپنے تصور کی چھاؤں میں اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے
تی اب بھائیں بھائیں کرنے لگی۔ اس کا تخیل بنجر اور سنسان ہو گیا
ں ایک ہی بت اس کے تصور کے طاق میں جما ہوا تھا۔ اور وہ سنتو
ار یشمین بت تھا۔ لیکن وہ اتنی سمجھدار اور محتاط ضرور تھی کہ اپنے دل کی
یرانی کو اپنے چہرے، رویے اور رنبیر کے ساتھ تعلق پر اثر انداز نہ ہونے
دیا۔ وہ اسی طرح اس کے بالوں میں اپنی حنائی انگلیوں سے کنگھی
رتی جس طرح پہلے کیا کرتی تھی۔ اگرچہ کبھی کبھی مشاطگی کرتے ہوئے
س کا احساس بہک جاتا اور رنبیر کی بجائے سنتو کا دھوکہ کھا جاتا۔ رنبیر
پہلے کا ویسا تھا بلکہ اس کی نگاہوں میں اور زیادہ پھیکا پڑ گیا تھا اس
ی محبت میں وقت اور جگہ کا احساس شدت کے ساتھ رہتا سب کہ
وہ لامکانی و لازمانی کے سمندر میں غواصی کر چکی تھی۔

اس کے باوجود اس کا ضمیر بعض بعض وقت اسے باولے کتے
کی طرح کاٹنے لگتا۔ کیا سنتو اس کی ہستی پر اتنا غالب آچکا تھا کہ اس کا
نسلی جذبہ اور رنبیر کی شکر گزاری کا احساس بھی غبارِ راہ کی طرح اسکے
سامنے دب گئے۔ کیا وہ واقعی اس لائق ہے۔

ایک دن اچانک اس نے سنتو کو درختوں کے ذخیرے سے نکلتے
دیکھا۔ وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کی پہلی ہستی
چونک پڑی اور وہ منجمد اپنی جگہ پر بیٹھ کر ٹھنڈی نگاہوں سے اس کی
طرف دیکھنے لگی۔ وہ ہنستا ہوا آیا اور اس نے بتایا کہ اس نے فوج سے
ڈسچارج لے لیا ہے۔ وہ اس وقت تنہا تھے اس کے باوجود ان کی
سمجھ داری نے ان کو اپنی اپنی جگہ پر جمائے رکھا۔ ان کے وجودوں نے
وقت ملاقات مقرر کیا۔

رنبیر سنگھ بھی کوئیں سے آگیا۔ اس نے بھائی کے گلے میں پیار سے
باہیں ڈالتے ہوئے نذیراں سے کہا "آج پھر سنتو کی ضیافت کرنی ہے
بس ویسا ہی کھانا پکانا۔"

نذیراں نے کھانا تیار کیا اور اب کی بار وہ نہیں اس کا دل کھانا
تیار کر رہا تھا۔ اس نے پلاؤ سالن اور حلوے کے علاوہ فرنی بھی تیار
کی جس پر زعفران بھری انگلیوں کے نشان تھے۔ جب وہ حلوہ ختم
کر چکے تو نذیراں نے فرنی کی تھالیاں آگے بڑھا دیں۔ رنبیر دیکھتے ہی
چلایا "نذیراں، یہ کیا اس پر خون بھری انگلیوں کے نشان ہیں۔"

نذیراں نے ہنس کر جواب دیا "بھولے سردار جی، تم نے
کبھی زعفران نہیں دیکھی ہے؟"

دونوں نے فرنی کی دو دو تھالیاں کھائیں۔ آج سنتو کھانے
کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ رنبیر نے کہا "دیکھا سنتو، مسلوں کا
کھانا کتنا جان آور ہے؟"

سنتو نے بوتل کا کاک اس انداز سے کھولا کہ زور سے کھٹ ہوا
"رنبیر، تم یوں نہیں کھول سکتے!" رنبیر نے دوسری بوتل لے کر
اس کا کاک اسی انداز سے کھولنا چاہا لیکن کھٹ کی بجائے سسکی
کی آواز آئی۔ سنتو زور سے ہنسا۔ انگریزی میں ایک محاورہ ہے جس کا
مطلب یہ ہے کہ عورت اور بوتل پکڑنے کا ایک ہی طریقہ ہے جسکو بہت
کم لوگ جانتے ہیں۔ سب اسے نہیں جان سکتے۔"

رنبیر نے تیسری بوتل کا کاک کھولنے کی بجائے اس کا منہ اپنے

زور سے کھاٹ کے پائے پر مارا کہ گردن دھڑ سے جُدا ہو کر رہ جا رہی۔ "ہم تو جاٹ کا وار جانتے ہیں۔"

نذیراں لالٹین کے سائے میں بیٹھی انھیں پیتے دیکھ رہی تھی رنبیر بار بار ایک ہی فقرہ دہراتا "ہم کسی کا دھرم نشٹ نہیں کرتے" یہ کہتے ہوئے وہ یک بیک سسکیاں بھر کر بچوں کی طرح رونے لگا۔ سنتو خاموشی سے گلاس سے چسکیاں بھرتا رہا۔ وہ رنبیر کی طرح ایک ہی جرعہ میں گلاس خالی نہ کرتا بلکہ ضبط کے ساتھ پیتا اور اس کے آخری قطرے تک سے حظ اٹھاتا۔

پھر رنبیر اپنی پگڑی سرھانے رکھ کر لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کے خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ سنتو اٹھا اور اس نے لالٹین کی لو دھیمی کر دی۔ اندھیرا دو قدم آگے بڑھ آیا۔ نذیراں کا دل دھڑ دھڑ کانپ رہا تھا۔ اسکا وجود اسکے وجود میں مدغم ہونے کے لئے پھڑ پھڑا رہا تھا لیکن اس کے ساتھ خوف کا احساس کیوں تھا؟ آسمان پر ستارے کے پیچھے افشاں کے ریزوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے وہ اس طرح جھلملا رہے تھے گویا آنسو پلکوں کے کناروں پر جھلملا رہے ہوں۔ نذیراں کا دل خوف سے بیٹھ رہا تھا۔ لیکن وہ جان نہ سکتی تھی کہ یہ خوف، خوف امید تھا یا کسی پوشیدہ خطرے کا خوف۔ اس کا بدن جوں جوں اس کے بدن کے قریب ہو رہا تھا۔ اس کی روح میں تنہائی و ویرانی کی طنابیں کھلتی جا رہی تھیں۔ اس نے اس کیفیت کو اپنی نسائی حسیت سے بھانپ لیا لیکن وہ بتا سکتی تھی کہ ایسا کیوں ہے؟ اس وقت تو اس کی زمام اسکے بدن کے ہاتھ میں تھی۔

یک بیک پیپل کے پتے کھڑکے۔ اس کے مدہوش ہاتھ کسی گرم گرم چیز کے لمس سے بیدار ہو گئے۔ سنتو کا سارا بوجھ اسکے اوپر گر رہا تھا۔ اس نے احساس خودی سے اسے زور سے کھینچ لیا لیکن وہ سنبھل نہ سکی اور اس سمیت لڑکھڑا کر گر پڑی۔ وہ ابھی سنبھلنے نہ پائی تھی کہ ایک مضبوط ہاتھ نے اس کی کلائی پکڑ لی۔

"اگر بولی تو یہی خنجر تیرے بھی سینے کے پار ہو گا۔ کتیا" یہ رنبیر کی آواز تھی یہ دوسرا انقلاب تھا۔ وہ پہلے انقلاب میں اپنی جان پر نہ کھیل سکی تو یہاں کیسے کھیلتی۔ اس نے زور کی سسکی بھری، گویا اسکی ماں مر گئی ہے اور اسکے پیچھے پیچھے ہولی۔

دوسرے دن گاؤں میں مشہور ہو گیا کہ سنتو کو سانپ نے ڈس لیا ہے کوئی معالج علاج کے لئے نہ بلایا گیا اس کی لاش جلانے میں اتنی سرعت سے کام لیا گیا کہ بہت سے رشتہ دار اس کی صورت دیکھنے سے محروم رہ گئے۔

وہ بھی جانتی تھی اور رنبیر بھی جانتا تھا کہ وہ پیٹ سے تھی اس کو یہ بھی معلوم تھا اور رنبیر کو بھی معلوم تھا کہ وہ پیٹ کس کا تھا۔ دونوں منتظر تھے وہ آتا اور دیکھ کر چلا جاتا۔ اسکے چہرے پر کرختگی اور نفرت سے گہری شکنیں پڑ گئی تھیں گو وہ نفرت اور کینے کا زندہ لاوا ہے۔ نذیراں اسکی آہٹ سن کر یخ بستہ ہو جا[تی] اس کی جرأت نہ تھی کہ اس کے سامنے دم مارتی مبادا وہ لاوا اپنی ہمہ گیر غضب سے پھٹ کر اسے بھسم کر دے۔

جب بچہ پیدا ہوا تو اسکے منہ سے پہلی چیخ نہ نکلنے پائی تھی کہ وہ اس سے جدا کر لیا گیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ رنبیر پہ جھپٹی "ظالم میرا بچہ مجھے دے ظالم میرا بچہ مجھے دیدے"۔ وہ کسی جنون سے کھول رہی تھی۔

رنبیر نے الٹے ہاتھ کا ایک ایسا تھپڑ اس کے چہرے پر مارا کہ وہ منہ کے بل کھاٹ پر گر پڑی "کتیا یہ بچہ تمہیں ہرگز نہیں ملے گا۔ تم تڑپو گی لیکن تمہیں نہیں کرونگا تمہیں یونہی سسک سسک کر مرنا ہو گا۔ مجھ کو اب معلوم ہوا کہ تم میں اور سانپ کے جائے میں کوئی فرق نہیں۔"

لخت جگر اس کا ہوا اور وہ اس کی صورت تک نہ دیکھ سکے! اس کے نرم و نازک ننھے ننھے ہونٹوں کی لس اپنے پستانوں پر محسوس نہ کر سکے۔ اس کے بعد وہ چارپائی پر ایسی پڑی کہ اٹھ نہ سکی۔ رنبیر نے اپنا انتقام لیا تھا۔ اس نے پنجرے کا دروازہ کھول دیا تھا لیکن وہ اڑ نہ سکتی تھی اس پر اسکے ہاتھ میں تھے اس نے اسے پاکستان جانے کی بھی اجازت دیدی اس نے کہا "میں تم ایسی ناگن کو یہاں دیکھنا نہیں چاہتا" لیکن اسے معلوم تھا کہ وہ جا نہ سکتی تھی وہ موت سے ڈرتی تھی وہ بدن کی پیر تھی لیکن دین سے زیادہ خون عزیز تھا وہ نہیں جانتی تھی کہ بدن کے سوا کسی اور کا پجاری بھی ہو سکتی ہے۔ وہ جو یوں عزت، غیرت اور اپنے دین کے لئے جنون ہوتے ہیں۔ ہوشمند وہ ہیں جن کو بدن اور اسکے خون سے وہ اتنی جلدی اسے کھونے پر راضی نہیں ہو سکتے۔ وہ قربانی نہیں کرتے سے مجبور ہو سکتے ہیں۔ سڑک پر کئی بار اس نے پاکستان کو جانے والے قافلے دیکھے وہ انکو ایک اشارے سے روک سکتی تھی اور کوئی اس کو منع کرنیوالا نہ تھا لیکن اپنے خون کے لوتھڑے کو پیچھے چھوڑ کیونکر چلی جائے۔ جگر کے ٹکڑے سے نگاہیں پھیر لینے

…ابد مگھیانوی بی، اے

تاثرات

(۱)

«خزاں» کا خوف بہاروں کو کھائے جاتا ہے — «غمِ حیات» گلستاں کو خوں رُلاتا ہے
«شگفتہ پھول» مہکنے سے ہچکچاتے ہیں — چمن «جمودِ مسلسل» سے کپکپاتا ہے

(۲)

دلوں پہ چھایا ہوا ہے خمارِ شعر و شراب — سرورِ عیش و طرب میں پھنسا ہوا ہے شباب
ابھی یہ «قصۂ تیر و سنان» رہنے دو — «نگاہِ مردِ مجاہد» کے سامنے ہی «رباب»

(۳)

ابھی تو گردشِ «شام و سحر» پہ پہرے ہیں — ابھی تو ہمتِ قلب و نظر پہ پہرے ہیں
خودی ہیں عرش کی رفعت پہ کوئی کیا پہنچے — جنون و عشق کی ہر رہگذر پہ پہرے ہیں

(۴)

یہ الجھی الجھی سی راہیں، تھکے تھکے سے قدم — کہ کھل کے رہ گیا کمزور حوصلوں کا بھرم
«حصولِ منزلِ مقصود؟» یہ بھی خوب کہی — بچے جو قافلے والوں کی جاں، خدا کا کرم

حادثے

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

دلہن شرما کر رخ سے جب گھونگٹ اٹھاتی ہے یہ منظر دیکھ کر اس کی جوانی کانپ جاتی ہے
چلی آتی ہے زندہ لاش پھولوں کا کفن پہنے کہ جس سے ساٹھ برسوں کی پرانی باس آتی ہے

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

طوائف کے مکاں پر نصف شب رنگ رلیاں ہیں شرابی سیٹھ بولا "لب ہیں یا مصری کی ڈلیاں ہیں"
وہیں بیٹا بھی آپہنچا "ارے تم؟" سیٹھ للکارا حضور ابا قسم لے لیں، بڑی تاریک گلیاں ہیں

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

سینما ہال اچانک قمقموں سے جگمگاتا ہے تو پہلو میں کوئی اپنی بہن کو دیکھ پاتا ہے
"ثریا تو یہاں؟" جب بھائی استفسار کرتا ہے تو اک بانکا جواں سگرٹ کا پینا بھول جاتا ہے

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

گلی کے موڑ پر جب کوئی سایہ آ کے رکتا ہے تو اک مجبور والد کا جگر اس غم سے پھٹتا ہے
کہ بے بس ہو کے بہہ جاتا ہے وہ چاندی کے لاوے میں اور اس کی چاند سی بیٹی کا آخر مول چکتا ہے

(بشکریہ امروز)

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

زبیدہ

بزم خواتین

جب گھر گندہ ہو جائے

قابلِ مبارکباد ہے تمہارا یہ خیال کہ " آپا کام کرنے کو جی تو
ا ہے مگر کیا کروں ماحول بڑا گندہ ہے " شکر ہے کہ تمہیں
ں کا احساس تو پیدا ہوا۔ میں جانتی ہوں ماحول بڑا گندہ ہے اور
بڑا مشکل! مگر میری منی بہن یہ تو بتاؤ اگر گھر صاف ستھرا ہو تو
ئی کی ضرورت ہی کیوں پیش آئے ؟

مگر جس وقت گھر کا یہ حال ہو کہ جا بجا کوڑا کرکٹ پھیلا ہوا
دیواروں پر دھوئیں کے کثیف بادل چھائے ہوئے ہوں
ں پر مکڑیوں نے جالے تان رکھے ہوں اور گھر کا اعلیٰ فرنیچر
غبار سے اٹا ہوا ہو، گھر کے افراد نہ خود صفائی کریں نہ کسی
رائیں نہ کرنے والوں کا ساتھ دیں۔ بلکہ اسی جگہ کھانا پکائیں
جگہ آرام کریں، اسی جگہ نہائیں دھوئیں اسی جگہ کوڑا کرکٹ
یں اور یہ خیال دل میں لیں کہ یہاں تو پہلے ہی بڑی گندگی ہے
ی گندگی پھیلانے سے اتنا زیادہ کیا فرق پڑ جائے گا۔ کوڑے
رد و غبار کے ڈھیروں کو اور زیادہ بڑھاتے جائیں تو بتاؤ کہ
مر کی کیا کیفیت ہو گی ؟ کیا وہاں بیماریوں کے جراثیم نہ
ں گے اور وہاں کے لوگ گوناگوں امراض میں گرفتار نہ ہو جائیں گے
ایسی حالت میں اگر کوئی یہ مشورہ دے کہ آؤ انسانوں کو
لاکت سے بچانے کی کوشش کریں تو کیا اس کا یہ جواب ہو گا
ں بھئی بیماری بہت پھیل چکی ہے اب ہمارے کئے کیا
کتا ہے ؟

ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوتا، بیماری کتنی ہی کیوں نہ
پھیل چکی ہو اس کی روک تھام کی کوشش کی جاتی ہے...
ری پیاری بہن یہی صورت اس فضا کی گندگی کی بھی سمجھو
ا زیادہ خراب ہو چکی ہے تو ہماری ذمے داری بڑھتی ہی
ہے، گھٹتی نہیں ہے۔ ہم ان غیر اسلامی رویوں اور شیطانی طاقتوں
کو دیکھ کر کیوں ہراساں ہوں کیا اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس بات کا
احساس نہیں دیا کہ اس موجودہ زندگی کا ایک انجام بھی ہے اور یہاں
کی کوششوں کا ایک نتیجہ بھی ہے ؟ کیوں نہ ہم اس راہ میں جانیں
لڑائیں اور انجام کو خدا ہی پر چھوڑ دیں ؟

جب تم اپنی کوششوں کو بظاہر رائگاں جاتے دیکھو تو
کبھی ایک منٹ کے لئے بھی دل میں ناامیدی کو جگہ نہ دینا اس
راہ کی کوششیں صرف اس وقت رائگاں جاتی ہیں جب دل میں
خلوص نہ ہو اور خدا کی رضامندی کے سوا کسی اور شے کا خیال ہو
ورنہ یہ راہ ایک ایسی راہ ہے جہاں شکست کھانے کا کوئی سوال
ہی نہیں اٹھتا۔ انشا اللہ۔

تم نے بچپن میں شاید وہ نظم پڑھی ہو گی کہ خشک زمین
کو دیکھ کر بارش کا ہر قطرہ ڈر رہا تھا کہ میں ایک ناچیز قطرہ ہوں اس
جھلسی ہوئی خشک زمین کو کیسے سیراب کر سکوں گا سب قطرے
اپنی اپنی جگہ جھجکتے رہے تا آنکہ ایک بہادر قطرے نے پیش قدمی
کی اور اپنی جان فدا کرنے کے لئے زمین کی طرف چل پڑا اس کے
بعد دوسرا آیا پھر تیسرا پھر چوتھا۔ آخر موسلا دھار بارش شروع
ہو گئی جس نے جل تھل بھر دیئے۔

بے شک ہم حقیر و ناچیز قطرے ہیں اور دنیا کی فضا باطل
کی تپش اور بگولوں سے جل کر خاک ہو رہی ہے مگر ہمیں اس
خشکی اور ہوست کو دیکھ کر ڈرنا نہیں چاہیئے، تم ٹپک پڑو۔
انشاء اللہ تمہارے پیچھے ایک تار بندھ جائے گا جو اس زردی
کو لہلہاتے ہوئے ہریالے پن سے بدل کر رکھ دے گا۔
انشاء اللہ اس اجڑے چمن پر پھر بہار آئے گی۔ شگفتہ

ندیاں گیت گاتی ہوئی بل کھاتی بہیں گی۔ درخت اور پودے ہرے لباس زیب تن کرینگے، ہوا اٹکھیلیاں کرتی چلے گی، اور پھول جھوم جھوم کر سر ہلائیں گے۔

اگر ہم نے وہ وقت نہ بھی دیکھا تو کیا حرج ہے۔ ہمارا فرض تو یہی ہے کہ چمن کی آبیاری میں کوتاہی نہ کریں۔ ہم نہیں تو آنے والی نسلیں انشاء اللہ اس منظر کو دیکھیں گی جو آنکھوں کو نور اور دلوں کو سرور بخشے گا۔

شکست یہ نہیں ہوتی کہ انسان کھیلتے کھیلتے ہار جائے بلکہ اصل شکست یہ ہے کہ ہار کر دل چھوڑ بیٹھے۔ تم دل نہ چھوڑو۔ یہ عارضی شکستیں کوئی پائدار چیز نہیں ہیں۔

حاذق ہسٹریا پلز (گولیاں)

یہ مرکب گولیوں کی صورت میں خالص اور کمیاب جڑی بوٹیوں سے جدید طبی اصول پر تیار کی گئی ہیں جو "ہسٹریا"

جیسے موذی مرض کو جو ہماری نوجوان بہنوں میں آج کل عام ہو گیا ہے سو فیصدی کامیاب ثابت ہو چکی ہیں۔

علاوہ ازیں یہ دوا عورتوں کی دیگر شکایات، اعصابی کمزوری، ضعف ہضم، اختلاج قلب کے لئے بید مفید ہے اور بچوں کی مرگی کے لئے لاثانی دوا ہے

40 PILLS
HAZIQ
HYSTERIA PILLS
FOR
HYSTERIA, INSOMNIA
EPELEPTIC FITS
AND OTHER
ALLIED DISEASES

حاذق ہسٹریا پلز

قیمت چالیس گولی (فی شیشی) پانچ روپے علاوہ محصول ڈاک

ساختہ: حاذق دواخانہ بندر روڈ، کراچی نمبر (۱)

قوت، طاقت اور مردانگی

چوبیس گھنٹے میں تو نہیں

مگر ہاں تیس دن میں ضرور حاصل ہو سکتی ہے

کیا آپ تھکاوٹ، پژمردگی نقاہت اور کمزوری محسوس کرتے ہیں۔ کیا آپ کی قوت حافظہ کمزور ہے۔ کیا آپ ہر وقت خوف زدہ اور رہتے ہیں۔ کیا آپ کا جسم دبلا ہے اور آپ سستی اور کمزوری محسوس کرتے ہیں کیا آپ احساس کمتری کے شکار ہیں؟

اگر ایسا ہے تو یقین جانیے

کہ آپکے وہ غدود جو قوت مردانہ کے مخزن ہیں کمزور ہو گئے ہیں اور جب تک آپ ان غدود کو طاقت ور بنا کر ان کی حفاظت نہیں کرینگے آپ کبھی بھی قوت و طاقت اور مردانگی کی صفات سے متصف نہیں ہو سکتے۔ خوش قسمتی سے

امام طب حکیم سید نذیر احمد صاحب دہلوی

اپنے ۳۷ سالہ تجربے کے بعد ایک ایسا نسخہ مکمل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو کہ مردانہ غدودوں کی جملہ کمزوری کو دور کر کے انھیں طاقتور بنانے کا تیر بہدف مگر سادہ اور سہل علاج ہے طب یونانی کی اس جدید اور مایہ ناز ایجاد

حاذق کورس

ہے جو تین مختلف ادویہ پر مشتمل ہے اور تیس دن کا مکمل کورس ہے جس کا ابتدائی استعمال آپکے جسم میں قوت طاقت اور تن درستی کا احساس پیدا اور پورے تیس روز بعد آپ ایک مکمل نوجوان تن درست وتوانا اور طاقت ور مرد بن جائیں گے

حاذق کورس کا استعمال فوراً آپکے غدود کو طاقت ور بنا کر اپنا اثر شروع کر دیگا آپکے بدن میں تازہ سرخ خون پیدا کر کے اس میں جوش پیدا کر دیگا۔ اور جوں جوں آپ کے غدود طاقتور ہوتے جائیں گے آپ اپنے اندر زندگی کی ایک نئی لہر محسوس کرینگے اور آپ زندگی کے ہر شعبے میں زندگی سے لطف اندوز ہو سکیں گے یعنی لطف شباب۔

حاذق کورس مکمل برائے ۳۰ یوم قیمت، بارہ روپے

ملنے کا پتہ:۔ **حاذق دواخانہ، بندر روڈ، کراچی نمبر**

Asmar
The TONIC FRUIT DRINK
REFRESHING
INVIGORATING
Excellent
with
SODA WATER
OR HOT OR
COLD WATER
ALWAYS DRINK
Asmar
ثمار
پھلوں کا
فرحت بخش اور مقوی
شربت۔ سوڈا واٹر یا ٹھنڈے
میں استعمال کیجئے
حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی
HAZIQ DAWAKHANA KARACHI